دیے کے خط ——— [مراسلے]

■ مصطفےٰ کمال صاحب!

السلام علیکم۔

"شگوفہ" کا شمارہ اکتوبر ۹۶ء نظر سے گزرا بہت خوب ہے۔ دلیپ سنگھ کی آخری تحریر "ڈرامہ کا آخری سین" ان کی اچھی تحریرات میں شمار ہوگی جو اپنی جگہ مکمل ہے گو وہ بقول آپ کے اس کا کلائمکس بدلنے والے تھے۔ مجتبیٰ حسین کا مضمون "دلہوے گوڑہ۔ بال ٹھاکرے۔ بات چیت" دلچسپ اور طنز سے بھرپور ہے۔ سید طالب حسین زیدی کی تحریر "جان منالے سے نوے پل تک" خاصے کی چیز ہے۔ ڈاکٹر معز عابد کا بیٹھکی خطبہ صدارت دلچسپی کا حامل ہے۔ پرویز مہدی کا مستقل سلسلہ "یہ ہے بابے میری جان" حسب معمول اچھا ہے۔ حصہ نظم میں ڈاکٹر محبوب راہی کی غزل نما نظم "بے چارے نرسمہا راؤ" نے بے حد متاثر کیا۔ سپٹمبر کا "شگوفہ" دلیپ سنگھ نمبر تھا آپ نے بہت کم وقت میں ان پر ایک مکمل اور حوالے کا نمبر شائع کر دیا اس کے لیے مبارکباد۔ فقط

رشید الدین، حیدرآباد

■ آداب و نیاز

نومبر کا شمارہ ملا۔ تمام مشمولات "شگوفہ" کی سابق روایت کے مطابق معیاری اور کارآمد ہیں۔

آپ کا اداریہ پڑھ کر افسوس ہوا کہ ممتاز بزرگ مزاحیہ شاعر اسمٰعیل ظریف اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ خدا ان کو غریقِ رحمت کرے۔ آمین۔

آپ کے اداریہ کا یہ جملہ دل میں اتر گیا ہمارا ملک سیاسی سماجی اور معاشی بدعنوانیوں کی گرفت میں ہے۔ جو ہماری تہذیب کو پامال کئے دے رہی ہیں۔

اس ضمن میں مجھے پاکستان کے مرحوم شاعر رئیس امروہوی صاحب کے قطعہ کا یہ شعر یاد آرہا ہے۔

فقط اردو کے ماتم سے نتیجہ
جو رونا ہے تو پاکستان کو رو

یہی شعر آج کے حالات کے پیش نظر ہندوستان کے لیے بھی قابلِ غور ہے۔ خیر۔ بقول

روشن جی کر لیجیے ہر مشکل آسان
خیر سے اب آزاد ہے اپنا ہندوستان

میری غزل میں تیرا شعر غلط شائع ہوگیا بہرحال شعر یوں شائع فرمادیں نوازش ہوگی۔

بات سو فی صدی کھری لیکن
آپ کے دل میں کھوٹ ہے صاحب

نیازمند روشن لال روشن بناری

■ مکرمی ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال صاحب!

شگوفہ بابت ماہنامہ نومبر ۹۶ء شرف افروز ہوا۔ کلام سبھی شاعروں کا بہت اچھا لگا، "مالِ مفت" میں مجتبیٰ حسین صاحب، ڈاکٹر بانو سرتاج اور ڈاکٹر محمد یونس صاحب کی تحریریں بہت پسند آئیں۔ اس شمارے کی جو چیز سب سے زیادہ پسند آئی وہ گوشۂ مظفر مجاز ہے لیکن صاحب اگر آپ برا نہ مانیں تو عرض ہے کہ یہ گوشہ مختصر اور تشنہ ہے۔ تاہم نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر کے مصداق یہ بھی بسا غنیمت ہے۔ مخلص

اثر بدایونی

■ شگوفہ کی بلاناغہ اشاعت کو دیکھ کر ادبی دنیا کے بڑے بڑے دعوے دار مدیر حیرت میں پڑ گئے ہیں خدا آپ کے حوصلوں کو مزید قوت عطا کرے آمین

شگوفہ کا دلیپ سنگھ نمبر دلیپ سنگھ سے آپ کی محبت کا کھلا ثبوت ہے۔ آنجہانی دلیپ سنگھ کی کمی اردو ادب میں برسوں محسوس کی جاتی رہے گی۔

منظور وقار گلبرگہ

■ مکرمی ایڈیٹر صاحب

تسلیمات! اس ماہ کا شگوفہ پڑھنے میں آیا۔ میں ہمیشہ اس کو

تلاش کر کے حاصل کرتا ہوں اور پچھلے سات آٹھ سال سے پابندی سے پڑھتا ہوں۔ اپنی خاص طرز کا یہ رسالہ پڑھکر آپکی محنت اور لگن کی تعریف نہ کرنا کفر ہوگا۔ دُعا کرتا ہوں کہ اس کو اللہ اور ترقی دے اور آپ کو حوصلہ عطا کرے کہ اسے خوب سے خوب تر کے سفر میں منزل سے ہمکنار کرے۔ یوں تو اس کے طنز و مزاح کے مضامین دلچسپ ہوتے ہیں اور تھکے ہوئے ذہنوں کو آسودگی ملتی ہے مگر ادھر چند شماروں سے اس میں جناب طالب حُسین زیدی کو بھی اس کی محفل میں آپ نے شریک کیا ہے جن کے مضامین پڑھ کر بے حد لُطف آتا ہے اس مرتبہ چار مینار سے نیا پُل کا سفر پچاس سال پہلے کا آنکھوں دیکھا حال ہے ان کا مخصوص انداز، الفاظ کے استعمال کی شوکت اور طنز سے بھرپور مٹھاس دلوں کو چھولیتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ منجھے ہوئے قلم کی نوک سے یہ گل افشانیاں ہورہی ہیں اور پھول جھڑ رہے ہیں۔ ہر مضمون بڑا ہی جاندار ہوتا ہے قرآن کے ایک واقعہ سے استنا کر کے "چہ درست است" نے جو گل کھلایا ہے اور جو نتیجہ نکالا وہ حد درجہ لائق تعریف ہے میں تو سمجھ رہا تھا کہ اس نازک مسئلہ کو چھیڑ کر کہیں کوئی گستاخی سرزد نہ ہو جائے۔ ہوٹر کا بیان۔ ہوتری اور کرشنا ٹاکیز واقعی اس دور میں ناڈیا جان کاوس کا نام بچوں میں جوش پیدا کرتا تھا غالب کے اشعار پر تضمین خوب ہے ڈاکٹر سکینہ کا بیان خیالات کے پیچھے ذہن رسا کی داد دینے کو جی چاہتا ہے اس لیے خط لکھ کر آپکو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپکی کاوش اور سعی تلاش ہمیشہ اچھے لکھنے والوں کو پیش کرتی رہتی ہے۔ اردو کی اس ناگفتہ بہ حالت کے زمانہ میں جو اپنے ہی ہاتھوں ہو رہی ہے ایسے اہل قلم کو پیش کر کے ہم کو مایوس ہونے سے بچا رہے ہیں۔ ہماری زبان یتیم نہیں ہے اسمیں اب بھی دم خم اور زور ہے اور اسکو سنبھالنے والے موجود ہیں۔ تنزیل الرحمن اربابی
اکبر باغ حیدرآباد

اِداریہ

بزرگ شاعر جناب اسمٰعیل ظریف کے اِنتقال کے بعد بیشتر تعزیتی قراردادوں اور انفرادی بیانات کے ذریعہ مرحوم کے مجموعہ کلام کی عدم اشاعت پر تعلق خاطر کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ یقیناً بڑے دُکھ کی بات ہے کہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ پر محیط تخلیقی سفر کا شاعر اپنے دیوان کی اشاعت سے محروم رہا۔ اس ضمن میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ زندہ دلان حیدرآباد کے زیرِاہتمام ۱۹۶۸ء میں مطبوعات کی اشاعت کے کام کا آغاز ہوا تھا۔ بے شمار کتابیں شائع ہوئیں۔ لیکن کتابوں کی نکاسی ہمیشہ مسئلہ بنی رہی۔ چنانچہ بعد میں مکمل طور پر خرچ برداشت کرنے کی بجائے جزوی مالی امداد دینے کا فیصلہ ہوا۔ اب یہ صورتِ حال ہے کہ کتابوں کی اشاعت اور نکاسی میں شخصی طور پر خود مصنف یا اس کے چاہنے والے دلچسپی لیں تو کتاب کی اشاعت کے ساتھ اس کی نکاسی کے مراحل بھی آسان ہوجاتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ ظریف صاحب کے کلام کی اشاعت کی طرف توجہ کی جائے گی ـــ زیرِ نظر شمارہ کے ذریعہ ہم نے جناب اسمٰعیل ظریف کی شخصیت اور فن کے چند پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ ہم ظریف صاحب کے ارکان خاندان اور ڈاکٹر عقیل ہاشمی اور جہاندار افسر صاحب کے قلمی تعاون کے ممنون ہیں جن کی مدد کے بغیر خصوصی گوشہ کی اشاعت ممکن نہ تھی۔

▫ بڑی تاخیر کے بعد محترمہ فاطمہ عالم علی خاں کے ذریعہ یہ افسوس ناک اطلاع ملی کہ نامور طنز و مزاح نگار جناب وجاہت علی سندیلوی کا گزشتہ مہینے لکھنؤ میں انتقال ہوگیا۔ موصوف کئی کتابوں کے مصنف تھے اردو تحریکات سے بھی ان کا تعلق تھا۔ طنز و مزاح کے علاوہ بچوں کیلئے بھی انہوں نے کتابیں لکھیں شگوفہ سے انھیں خاص قلبی لگاؤ تھا۔ اپنا ہر مضمون وہ شگوفہ میں اشاعت کے لیے بھیجنا ضروری سمجھتے تھے۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کی سالانہ تقریبات میں بھی وہ شریک ہوچکے تھے۔ وجیہہ و شکیل دلنواز شخصیت کے مالک وجاہت صاحب اردو کے فروغ اور ترویج سے بھی خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ اترپردیش اردو اکیڈیمی سے بھی وہ منسلک تھے انکے انتقال سے ایک منفرد طنز و مزاح نگار، باثر اردو کے سپاہی اور خلیق و ہمدرد انسان اور شگوفہ کے مستقل قلمی معاون سے ہم محروم ہوگئے۔ دعا ہے کہ اللہ انھیں جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ■

R.No. 15822/68
Vol. 29 Copy : 12

SHUGOOFA
HYDERABAD
Phone : 595716

Postal Regd. No. H/HD-6
December 1996

شگوفہ
حیدرآباد
سالنامہ ۱۹۹۶ء
Reservations
MILK
ENRON
HINDUTVA
U.P.
قیمت ۱۵ روپے

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

سالنامہ

جنوری - فبروری ۱۹۹۶ء

جلد ۲۹ شمارہ ۱، ۲

قیمت فی پرچہ: ۱۵ روپے
سالانہ خریداری: ۹۰ روپے
بیرونی ممالک سے: ۱۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ:

۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد۔ ۱

فون آفس: 595716 رہائش: 521064

غیر مقیم ہندوستانی اصحاب

اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد

کی جانب سے قائم کردہ

ایک خصوصی این آر آئی برانچ

سے

استفادہ کریں، جہاں این آر آئز کے لیئے

تمام سہولتیں دستیاب ہیں۔

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے

(فہرست)

چُورن

(منظومات)

ہندوستانی صحافت اور کارٹون

(اے کے میتھیو)

ہندوستانی صحافت میں آج کارٹون، ماضی کے مقابلے میں اپنی کشش اور تاثیر کھوتے جا رہے ہیں۔ سیاسی طنز کے اس میڈیا میں وہ پہلی سی چبھن نظر نہیں آتی۔ شنکر جیسے نامور کارٹونسٹ سے ہندوستانی کارٹونوں کی دنیا محروم ہے۔ نہرو جیسی شخصیتیں بھی عنقا ہیں جنھوں نے شنکر سے کہا تھا کہ ان پر کارٹون بنانے سے کبھی احتراز نہ کریں۔ حال میں ٹامل کے ہفتہ وار کے مدیر کو ایک وزیر نے کارٹون بنانے پر گرفتار کروادیا —— بزرگ کارٹون سازوں میں آر کے لکشمن نمایاں ہیں جو ہم عصر معاملات پر اپنے تنقیدی شعور کا طنز کے ذریعہ خوب اظہار کرتے ہیں۔ آج کے کارٹونسٹوں میں میریو میرانڈا، ابوابراہام —— اجیت نینن، سدھیر دار اور کیشو موضوع کے برتنے کے اپنے اپنے طرز کی وجہ سے ممتاز مقام حاصل کرچکے ہیں۔ کیشو کے اخبار 'ہندو' میں شائع ہونے والے اسکیچز وہ تاثر پیدا کرتے ہیں جس کی ترسیل میں الفاظ ناکام رہتے ہیں۔ اجیت نینن کی "انڈیا ٹوڈے" سے "آؤٹ لک" کو منتقلی یقیناً اول الذکر ادارے کی ایک مخصوص طنز کی دنیا سے محرومی ہے —— میرانڈا کا کردار بنڈل داس اور اس کی سکریٹری مس فاتیکا ہماری زندگی کی حقیقی تصویریں پیش کرنے میں کامیاب ہیں اور استہزاء کی ایک نئی دنیا میں ہمیں لے جاتے ہیں۔ ان تمام کارٹون بنانے والوں کی وجہ سے قارئین کو سیاسی طاقتوں کے خلاف ان کے اندر چھپے ہوئے غصے اور ردِعمل کے اظہار کا موقع ملتا ہے۔ کارٹون سازوں میں آج اکثریت جنوبی ہند سے تعلق رکھتی ہے۔ ہم عصر صحافت کی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کارٹونسٹ نئے طرز اپنانے پر مجبور ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ کارٹونسٹ کی' حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر ہو۔ اسی صورت میں بروقت کارٹون بنائے جاسکتے ہیں جس میں چھپے اشاروں کی حقیقت تک قاری آسانی سے پہنچ جاتا ہے۔

ہندوستان میں کارٹونسٹ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ نازک مذہبی جذبات کو نہ چھیڑے ورنہ اس کی زندگی اور اس کی ملازمت خطرے میں پڑسکتی ہے —— اندرا گاندھی نے ایمرجنسی نافذ کی تو کارٹون سازی پر بہت بڑا اثر پڑا تھا۔ لیکن اس کے بعد سے کارٹونسٹ آزاد فضا میں سانس لے رہا ہے —— کارٹونسٹ کے لیے ضروری ہے کہ وہ سماجی اور تہذیبی متنوع کیفیات سے واقف ہو ورنہ اس کے کارٹون کو سمجھنا مشکل ہوگا اور کارٹونسٹ اپنے خیال کی ترسیل میں ناکام رہے گا۔

ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں آج کل قومی اخباروں کے مقابلے میں زیادہ موثر اور خوبصورت کارٹون شائع ہورہے ہیں۔ یہ کارٹون فوری دل کو چھو لیتے ہیں۔ انگریزی میڈیا کے مقابلہ میں یہ کارٹون ضرب لگانے اور تاثر پیدا کرنے میں زیادہ کامیاب ہیں۔

۱۹۹۵ء کے چند منتخب کارٹون آگے کے صفحات میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

←

۱۹۹۶ء کے منتخب کارٹون ۱۹۹۶ء کے منتخب کارٹون
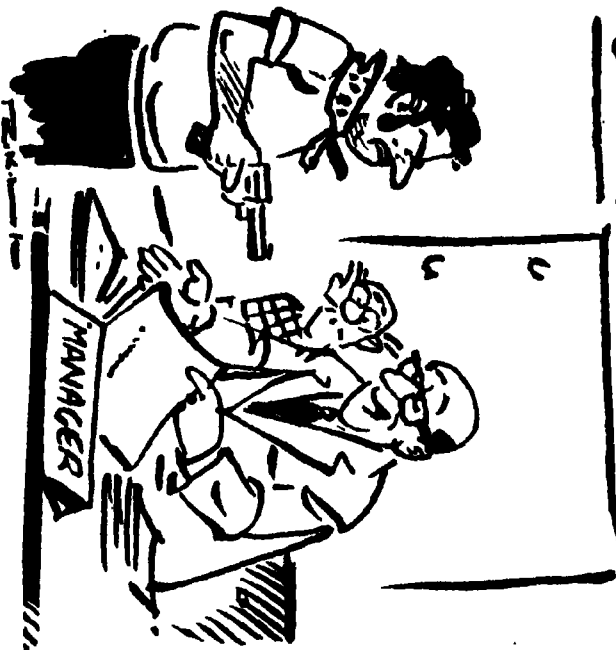
ہمارے ہاں ایک لون اسکیم ہے ۔ اتنی ہی مفید ایسا کرنے کی بجائے اس اسکیم کے لیے کوشش کیوں نہیں کرتے ؟

R K LAXMAN

تم کنفیوز ہو، میں نہیں ہوں

KAAK
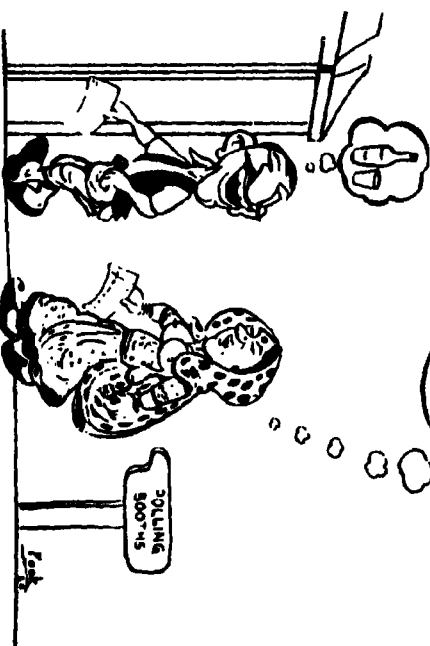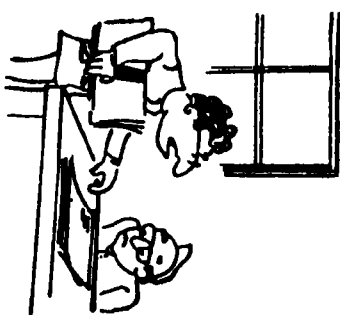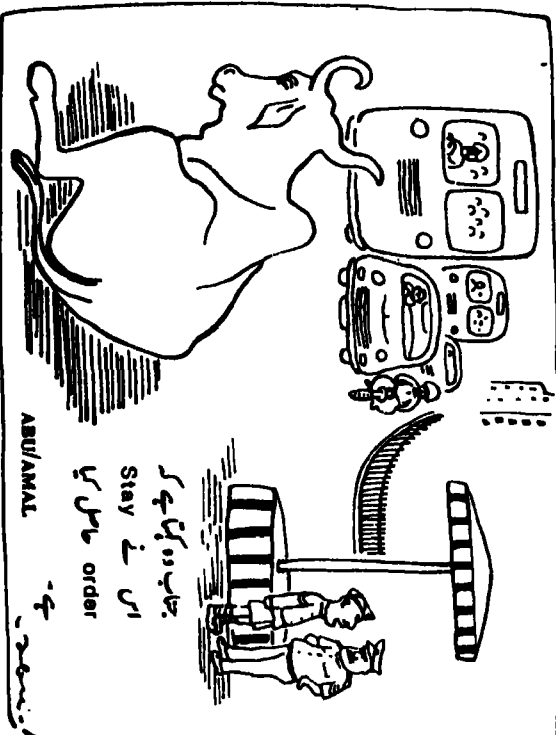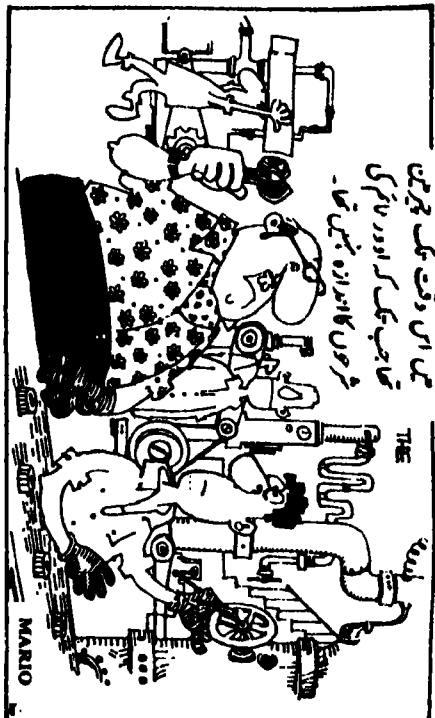
نہیں جناب ایمان دار عہدہ دار اس کے لیے
موزوں نہیں۔ یہ ایک اہم عہدہ ہے۔
JASPAL BHATTI

مینیجر کچھ دیر میں ملیں گے ۔ جب
تک آپ اس سیفٹی والٹ میں
انتظار کیجیے ۔
MARIO

مجھ پر پہلا پتھر وہ پھینکے جس سے کبھی کوئی گناہ ، سرزد نہ
ہوا ہو ۔
CORRUPTION
ABU

BIRDS
SNAKE
TIGER PROJECT
CROCODILE
DEER PARK
BEAR PARK

AMAL
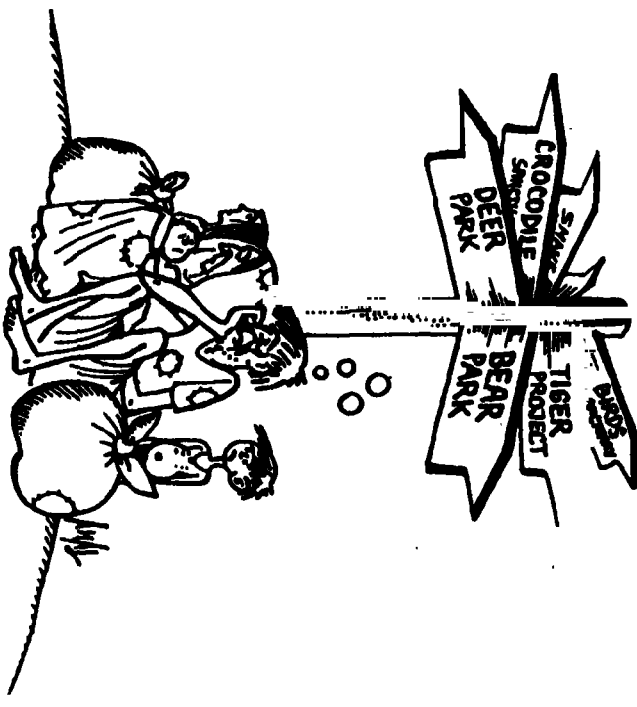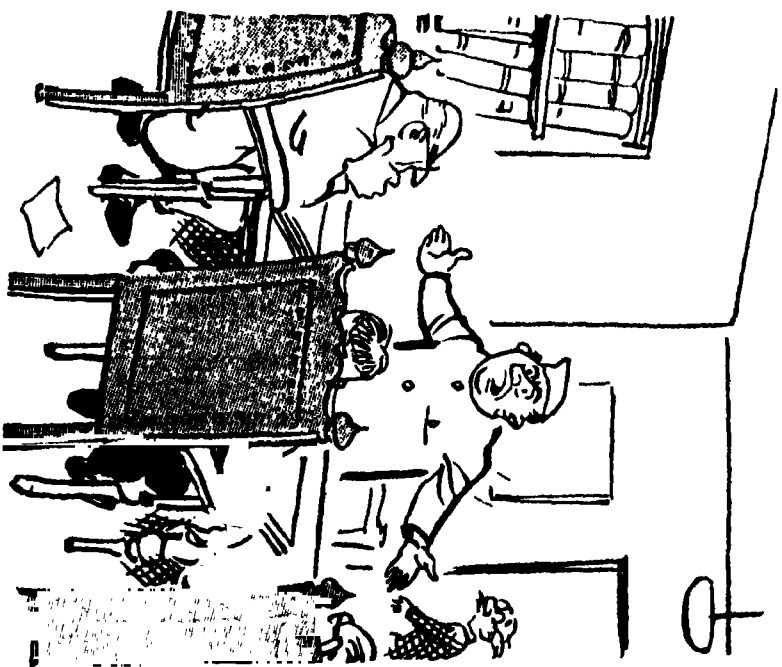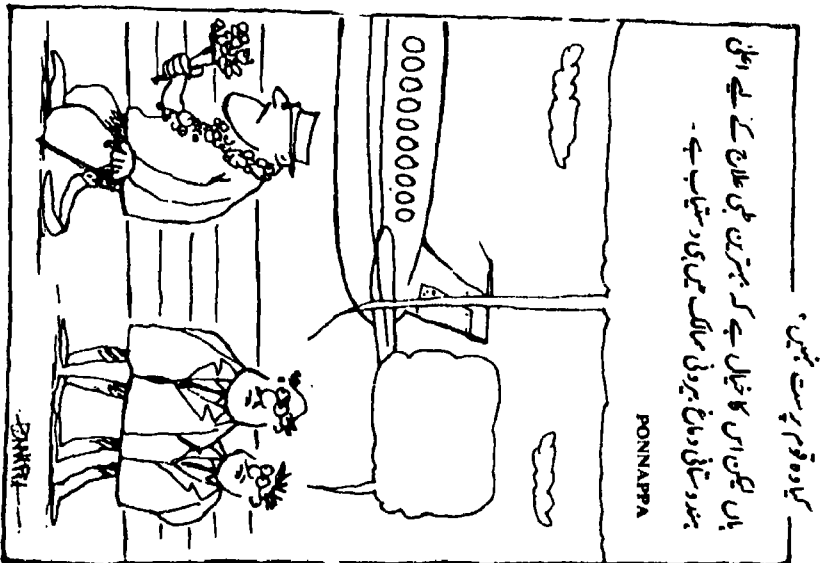
یہ صحیح ہے کہ میں نے کئی غلطیاں کیں بدعنوانیوں میں ملوث رہا لیکن یہ سب حکومت کے مفادات کے لیے ضروری تھا۔

R K LAXMAN

تبادلہ کے لیے اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، جاؤ اور کسی کو خوب پیٹ دو، مسئلہ حل ہو جائے گا۔

GAFFOOR
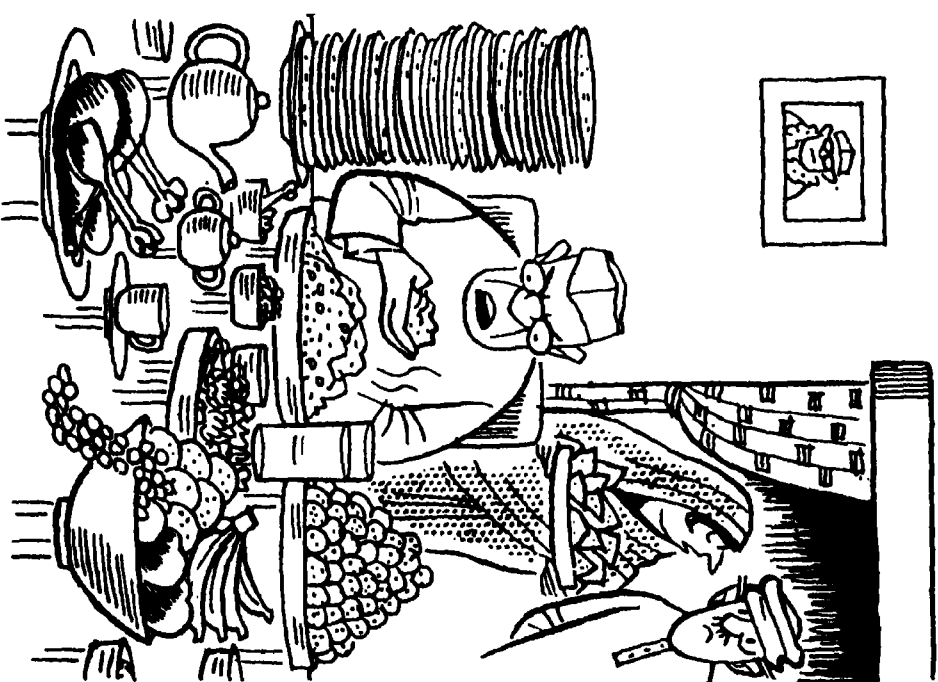
صاحب کل سے غیر معینہ مدت کی بھوک ہڑتال میں حصہ لے رہے ہیں

SUDHIR DAR
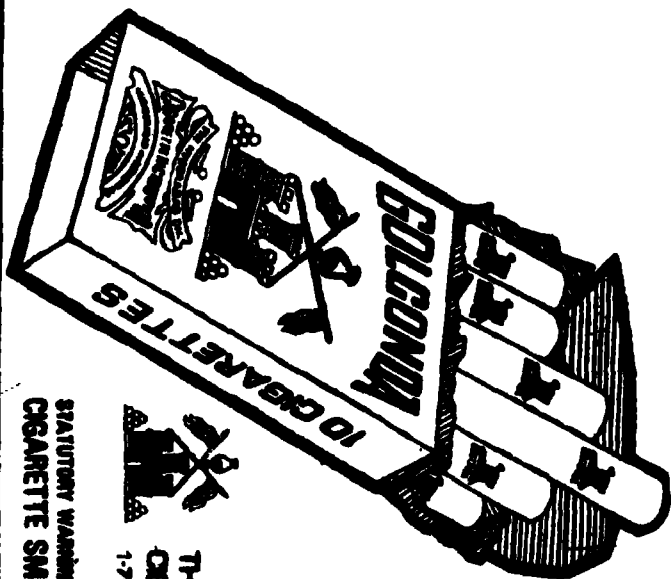
GOLCONDA
10 CIGARETTES
THE HYDERABAD DECCAN
CIGARETTE FACTORY PVT. LTD.
1-7-140, MUSHEERABAD, HYDERABAD, INDIA.
STATUTORY WARNING
CIGARETTE SMOKING IS INJURIOUS TO HEALTH

مجتبیٰ حسین

مسقط کی صفائی اور قصہ اردو شاعر کا

خلیج میں ہمارا سب سے زیادہ قریبی ملک عمان ہی ہے اس قربت کی وجوہات جہاں جغرافیائی ہیں وہیں سماجی تجارتی اور سیاسی بھی ہیں (ادبی وجوہات کا ذکر بعد میں آئے گا۔) عمان برسوں انگریزوں کی زیر نگرانی علاقہ رہا ہے اور جب تک انگریز ہندوستان پر حکومت کرتے رہے اس کے بہت سے امور دہلی ہی طے پاتے رہے۔ ہندوستان سے عمان کی جغرافیائی قربت کو دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ ہم دہلی سے ایک گھنٹہ پندرہ منٹ میں احمدآباد پہنچے تھے۔ اور یہاں سے عمان کی طرف چلے تو دو گھنٹوں کے اندر اندر ہی عمان کے دارالخلافہ مسقط جا پہنچے۔ یوں لگا جیسے ہم دہلی سے حیدرآباد آئے ہوں جب مسقط کے عالیشان اور خوبصورت ہوائی اڈہ پر اترے تو رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے اور مسقط کا ہوائی اڈہ بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ ہم نے تھوڑی بہت دنیا پہلے بھی دیکھ رکھی ہے۔ خلیجی ممالک میں بھی جا چکے ہیں۔ مسقط کی وسیع، کشادہ اور آرام دہ سڑکوں پر ہمارے میزبان ہمایوں ظفر زیدی کی گاڑی دوڑنے لگی تو اندازہ ہوا کہ ایسا صاف ستھرا اور خوشنما شہر ہم نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ شہر کیا ہے کسی باذوق رئیس کا سجا سجایا ڈرائنگ روم لگتا ہے۔ اس بے پناہ صفائی کی وجہ ہم نے پوچھی تو ہمایوں ظفر زیدی نے کہا کہ اس صفائی کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عمان کے بادشاہ سلطان قابوس کو آرائش و زیبائش کا بے پناہ شوق ہے اور ان کی حس جمالیات بہت تیز ہے۔ جیسا راجہ ویسی پرجا کا اصول تو آپ جانتے ہی ہیں۔ لہٰذا سارے عمانی نفاست پسند بن گئے ہیں۔ ہم نے کہا "مگر یہاں ہم جیسے غیر عمانی بھی تو آتے رہتے ہیں" بولے "آپ جیسے لوگوں کے لیے حکومت نے ایک قانون بنا رکھا ہے کہ جو کوئی بھی اس شہر میں غلاظت پھیلاتا ہے اس پر پچاس ریال کا جرمانہ عائد کیا جاتا ہے"۔ (عمان کا ریال لگ بھگ نوے 90 روپیوں کا ہوتا ہے اور یوں جرمانے کی رقم 4500 روپے قرار پاتی ہے) اس پر انہوں نے ایک واقعہ سنایا کہ اردو کے ایک شاعر کو 60 ریال معاوضہ دے کر مسقط بلایا گیا تھا۔ شاعر سے کہہ دیا گیا تھا کہ بھلے ہی وہ اردو شاعری اور مشاعروں میں غلاظت پھیلاتا رہے لیکن مسقط میں کوئی غلاظت نہ پھیلائے اور حفظ ماتقدم کے طور پر ہمیشہ اپنے ساتھ پچاس ریال رکھا کرے کیونکہ پتہ نہیں کب جرمانہ

ادا کرنے کی لذت آجائے۔ شاعر نے اس نصیحت کو اور پچاس ریال کو اچھی طرح گرہ میں باندھ لیا۔ باقی دس ریال میں کچھ چھوٹا موٹا سامان خریدا۔ کچھ پان بھی خرید لیے کہ اردو شاعر پان نہ کھائے تو اس کی شاعری بدرنگ اور بے مزہ لگتی ہے لیکن شاعر جب پان کھاتا ہے تو اس کی پیک تھوکتا بھی ہے۔ اور بعض شاعر تو ایسا فی البدیہہ تھوکتے ہیں کہ ان کے تھوکنے پر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ شاعر مذکور کو ایک مرحلہ پر یہ یاد نہیں رہا کہ وہ لکھنؤ میں نہیں بلکہ مسقط میں ہے چنانچہ اس نے چلتی گاڑی میں سے پان کی پیک اچانک سڑک پر منتقل کی تو عمان کی پولیس نے اسے دھر لیا اور پچاس ریال کی وہ رقم جو شاعرہ پڑھنے کے لیے بطور معاوضہ اسے دی گئی تھی، بطور جرمانہ وصول کرلی۔ بعد میں شاعر نے منتظمین کے آگے منت سماجت کی کہ اسے تھوکنے کے جرمانے کے علاوہ شاعرہ پڑھنے کا معاوضہ الگ سے دیا جائے۔ منتظمین چونکہ اردو تہذیب سے واقف تھے اس لیے شاعر پر ترس کھا کر شاعرہ پڑھنے کا معاوضہ الگ سے دیدیا۔ لیکن مشکل یہ ہوئی کہ بعد میں جتنے شاعر مسقط آئے انھوں نے یہ مطالبہ کرنا شروع کردیا کہ انھیں شاعرہ پڑھنے کے علاوہ تھوکنے کا معاوضہ بھی دیا جائے۔ اس واقعہ کے پس منظر میں ہمایوں ظفر زیدی نے ہمیں تاکید کی کہ تھوکنے وغیرہ کے معاملہ کو ہم وطن عزیز کو واپس ہونے تک موقوف رکھیں۔ چار دن کی تو بات ہے اس کے بعد تھوکنے کے لیے تو بھی کچھی ساری عمر پڑی ہے۔ اس واقعہ کا ہم پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ تھوکنا تو تھوکنا سانس لینا تک دوبھر محسوس ہونے لگا۔

مسقط کی صفائی تو اب سارے عالم میں مشہور ہے۔ اس کی کسی بھی شاہراہ سے گزر جائیے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ آپ کے پہنے ہوئے لباس سے کہیں زیادہ صاف ستھری ہے۔ عمان کی صفائی کی ایک وجہ تو یہ بھی ہے کہ تین لاکھ مربع کیلومیٹر کے رقبہ پر پھیلے ہوئے اس ملک میں مقامی آبادی صرف بیس لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ عمان کی ساری ترقی کی داستان ۱۹۷۰ء سے شروع ہوتی ہے۔ جب عمان کے موجودہ حکمران سلطان قابوس تخت نشین ہوئے۔ سلطان قابوس نے انگلستان میں تعلیم حاصل کی۔ پھر وہ ایک کیڈیٹ کے طور پر سنڈھرسٹ کی رائل ملٹری اکیڈیمی سے وابستہ ہوئے۔ مشرقی روایات کی پاسداری اور جدید مغربی تعلیم کے امتزاج نے ان کے مزاج میں ایک ایسا سلیقہ پیدا کردیا ہے جس کی جھلک مسقط کی ہر عمارت، ہر شاہراہ اور اس کے ہر چوراہے پر دکھائی دیتی ہے۔ تخت نشینی کے فوراً بعد انہوں نے نہایت منصوبہ بند طریقہ سے تیل کے ذخائر سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے ملک کی ترقی کا خواب دیکھا۔ مسقط میں آج جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ پچیس برس پہلے تک نہیں تھا۔ پچیس برس پہلے مسقط میں صرف آٹھ کیلومیٹر لمبی پکی سڑک تھی۔ اب سارے عمان میں ہزاروں کیلومیٹر لمبی شاہراہوں کا جال پھیل گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ خلیج کے امیر ملکوں میں عمان کو اب بھی ایک غریب ملک سمجھا جاتا ہے۔

ہمارا قیام مسقط کے نواحی علاقہ الخویر میں تھا۔ دوسرے دن صبح میں جب ہم الخویر سے مسقط کے مرکزی علاقہ کی طرف روانہ ہوئے تو ہمیں بتایا گیا کہ جس سڑک سے ہم گزر رہے ہیں وہ دنیا کی سب سے قیمتی سڑک ہے۔ قیمتی اس اعتبار سے کہ اسے جگہ جگہ اونچے اونچے پہاڑیوں کو کاٹ کر بنایا گیا ہے۔ جس طرح اس وسیع و کشادہ سڑک کو تعمیر کیا گیا ہے اسے دیکھ کر آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ مسقط کی طرف جاتے ہوئے ہمارا گزر مطرح کی بندرگاہ سے ہوا جو عمان کی سب سے مشہور بندرگاہ ہے۔ ایسی خوبصورت اور دلفریب بندرگاہ ہے کہ اسے دیکھ کر ہی آدمی سرشار

ہو جاتا ہے۔ سمندر ہم نے بہت سے دیکھے ہیں لیکن نیلے پانیوں والا ایسا صاف و شفاف سمندر ہم نے کہیں نہیں دیکھا۔ ایسا صاف ستھرا سمندر ہے کہ لگتا ہے یہاں تھوکنے پر پابندی ہے۔ پرانا مسقط بھی اب ویسا نہیں رہا کیوں کہ اب اس پر ترقی کا کلف چڑھادیا گیا ہے۔ مسقط کا پرانا قلعہ بھی دیکھا۔ سارے عمان میں تین سو پرانے قلعے ہیں۔ سمندر کے کنارے سلطان قابوس کا جدید ترین عالیشان محل العلام فورٹ پیلیس دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا طرزِ تعمیر بالکل مختلف اور انوکھا ہے۔ اس محل کے اندر سے ہماری گاڑی چلتی رہی لیکن ہمیں سیکیورٹی کے کسی عہدہ دار نے نہیں روکا۔ ہمیں بتایا گیا یہاں سیکیورٹی کا وہ بکھیڑا نہیں ہے جو ہمیں اپنے ملک میں نظر آتا ہے۔ سلطان قابوس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ عموماً اپنی گاڑی خود چلاتے ہوئے سڑک پر آجاتے ہیں۔ نہ سیٹیاں بجتی ہیں نہ راستے بند کیے جاتے ہیں۔ ایک بادشاہ جمہوری حکمران کی طرح رہنے لگے تو یہ بڑی بات ہے۔ ایسا بادشاہ ان جمہوری نیتاؤں سے بدرجہا بہتر ہے جو جمہوریت کی آڑ میں بادشاہوں کی سی زندگی گزارتے ہیں۔ ہم نے محسوس کیا کہ نہ صرف عمان کے مقامی باشندے بلکہ بیرونی باشندے بھی سلطان کی فہم و فراست کے گن گاتے ہیں۔ سلطان کے محل کی سیر کے بعد ہم البستان پیلیس ہوٹل گئے جو مسقط کا سب سے پرشکوہ اور عالیشان ہوٹل ہے۔ اس ہوٹل کو سلطان قابوس نے بنایا ہے۔ خود اس ہوٹل کے اندر بھی چھ محل بنے ہوئے ہیں جو مختلف بین الاقوامی کانفرنسوں اور اجتماعوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس ہوٹل کی تعمیر پر اتنا زرکثیر صرف ہوا ہے کہ ایک سو سال تک بھی اس ہوٹل کے سارے کمروں میں مسافر قیام کریں اور کرایہ ادا کریں تو اس کی تعمیر کا خرچ نہ نکل آئے! اس ہوٹل کی لابی دنیا کی سب سے بڑی لابی سمجھی جاتی ہے۔

چاروں طرف پھیلے ہوئے بے آب و گیاہ پہاڑوں اور بنجر زمینوں کے درمیان آباد مسقط کا وجود ایک عجیب دلفریب نظارہ پیش کرتا ہے۔ مسقط میں جیسی خوشنما اور پرشکوہ مسجدیں ہیں ویسی مسجدیں ہم نے کہیں نہیں دیکھیں۔ سماجی اعتبار سے مسقط میں ہمیں ذرا بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا کیوں کہ سارے مسقط میں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ مشہور ہے کہ مسقط میں جو عرب باشندہ یہ کہے کہ وہ اردو نہیں جانتا تو اس کے عمانی ہونے پر شبہ کیا جا سکتا ہے۔ ہم جس جگہ گئے، جس دکان میں بھی گئے وہاں لوگوں کو اردو بولتے ہوئے پایا۔ خود سلطان قابوس کے بارے میں کسی نے بتایا کہ وہ بہت اچھی اردو جانتے ہیں۔ یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سلطان کے والد سلطان سعید بن تیمور نے بہت عرصہ پہلے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے کیا تھا۔ مسقط میں ڈھائی لاکھ ہندوستانی اور پچھتر ہزار پاکستانی آباد ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف قومیتوں کے لوگ بھی یہاں کام کرتے ہیں۔ اکثر گجراتی یہاں کئی نسلوں سے آباد ہیں۔ بلکہ انہیں یہاں کی شہریت بھی ملی ہوئی ہے۔ غرض ہمیں عمان کی سماجی تہذیبی اور تجارتی زندگی پر ہندوستانیت کا عنصر زیادہ غالب نظر آیا۔

بابائے مسقط، گلبرگہ کے رہنے والے ہیں

صاحبو! ہم ملک سے باہر جہاں بھی جاتے ہیں وہاں اردو زبان کے حوالے سے ہی جاتے ہیں۔ اسی مظلوم و بے کس زبان کے حوالے سے بیرونی ملکوں میں گلچھرے اڑاتے ہیں اسی نادار اور مفلس زبان کے وسیلہ سے ہوائی جہازوں میں سفر کرتے ہیں اور موج مناتے ہیں۔ اسی بے بس اور دکھیا زبان کی آڑ میں فائیو اسٹار ہوٹلوں میں رہتے ہیں اور قیمتی تحفے تحائف قبول کرتے ہیں۔ گویا ہمارا شمار اس غریب زبان کے امیر ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ اپنے ملک میں یہ زبان جتنی مظلوم اور بے کس نظر آتی ہے وہ بیرونی ملکوں میں نظر نہیں آتی۔ اس کے جلسوں میں پاکستان، بنگلہ دیش، ہندوستان اور نہ جانے کن کن ملکوں

کے لوگ چلے آتے ہیں اندرون ملک بھلے ہی کچھ لوگوں کو اس زبان سے بیر ہو لیکن بیرونی ملکوں میں یہ زبان جس طرح کے انواع واقسام کے شائقین ادب کو اکٹھا کر دیتی ہے اس سے لگتا ہے کہ یہ برصغیر ابھی تک تقسیم نہیں ہوا۔ ہمارا تو خیال ہے کہ لگ بھگ نصف صدی گزر جانے کے باوجود اس زبان نے تہذیبی اور جذباتی سطح پر اس برصغیر کو تقسیم ہونے نہیں دیا۔ ہم یہ جو پچھلے دنوں مسقط گئے تھے تو اسی زبان کے حوالے سے گئے تھے۔ مسقط میں آئے دن مشاعرے اور موسیقی وغیرہ کے پروگرام تو ہوتے رہتے ہیں لیکن طنز و مزاح کی کوئی باضابطہ محفل یہاں کبھی آراستہ نہیں ہوئی تھی۔ ہمارے دوست ہمایوں ظفر زیدی کا عرصہ سے اصرار تھا کہ ہم مسقط ضرور آئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ مسقط کے ادب دوست حضرات اب شعروں پر داد دیتے دیتے تھک چکے ہیں۔ اب وہ ذرا ہنسنا بھی چاہتے ہیں۔ اس بات پر کہ آخر اتنے دنوں تک وہ بلا وجہ ہی شعروں پر داد کیوں دیتے رہے دیارِ غیر میں آرام و آسائش کی ساری سہولتیں تو میسر آجاتی ہیں لیکن ڈھنگ سے ہنسنے کے مواقع ذرا کم ہی میسر آتے ہیں۔ ہمایوں کوئی انجمن وغیرہ تو نہیں چلاتے البتہ اپنی ذات سے خود ایک انجمن ضرور ہیں۔ تاہم طنز و مزاح کی یہ محفل انڈیا اسوسی ایشن آف عُمان کے زیرِ اہتمام منعقد ہوئی جس میں ہندوستان سے یوسف ناظم اور دلیپ سنگھ کے علاوہ ہم نے اور پاکستان سے انشائیہ نگار اور شاعر منظر علی خاں نے شرکت کی! اس اعتبار سے مزاح نگاروں کا یہ ایک ہند پاک اجتماع تھا: جس میں مسقط میں مقیم ہندوستان اور پاکستان کے شائقین ادب نے بھاری تعداد میں شرکت کی لیکن اس محفل کے انعقاد سے پہلے ہمیں ایک اور محفل شعر و سخن میں شرکت کرنے کا موقع ملا جس کا اہتمام حبیب بینک کی مسقط شاخ کے منیجر نذیر حسین بھٹو نے اپنی قیام گاہ پر کیا تھا۔ مسقط کے مقامی شاعروں سے ہماری یہیں ملاقات ہوئی۔ حبیب بینک پاکستان کا مشہور و معروف بینک ہے۔ چنانچہ اس محفل میں زیادہ تر حبیب بینک کے ملازمین اور کھاتہ داروں نے شرکت کی۔ بڑی دلچسپ بات یہ تھی کہ اس محفل میں حبیب بینک کی مسقط شاخ کے جنرل منیجر واعظ الرحمٰن کے علاوہ پاکستان سے آئے ہوئے مزاح نگار منظر علی خاں بھی شریک تھے جو خود بھی حبیب بینک کے بہت بڑے افسر یعنی اس بینک کے سینیر وائس پریسیڈنٹ ہیں بلکہ وہی اس محفل کے صدر بھی تھے۔ نتیجہ میں بینک کے ملازمین نے اس دن شعروں پر "بھتر و برابر چینل" داد دی اور خوب داد دی۔ پہلے بینک کے وائس پریسیڈنٹ منظر علی خاں داد دیتے تھے۔ بعد میں بینک کے جنرل منیجر واعظ الرحمٰن کی داد سنائی دیتی تھی۔ تب کہیں یہ داد بینک کے منیجر نذیر حسین بھٹو سے ہوتی ہوئی بینک کے درجہ بدرجہ نچلے ملازمین کے منہ سے سنائی دیتی تھی۔ ایسی باقاعدہ اور باضابطہ داد ہم نے کم ہی سنی ہے۔ منظر علی خاں تو خیر ہمارے پرانے دوست ہیں۔ ان سے کراچی میں ہماری کئی ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ واعظ الرحمٰن سے البتہ ہم مسقط میں پہلی بار ملے۔ بتایا ہندوستان سے پاکستان کو ہجرت کرنے سے پہلے ان دونوں حضرات کا تعلق صوبہ بہار سے رہ چکا ہے۔ اور ان دونوں بہاریوں کا شخصی کارنامہ یہ ہے کہ جو کوئی بھی ان سے ملتا ہے بہاریوں کے بارے میں اپنی رائے کو تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے (بلکہ رائے بری ہو تو اچھی کر لیتا ہے)۔ واعظ الرحمٰن مسقط کی اردو محفلوں کی جان ہیں۔ بے حد ملنسار، خوش اخلاق اور مخلص آدمی ہیں۔ مسقط کی محفل طنز و مزاح کے انعقاد میں بھی وہ اپنے بینک اور بینک بیلنس دونوں کے ساتھ شریک تھے۔ چونکہ ہمارا تعلق حبیب بینک سے نہیں تھا اسی لیے ہم اس محفل میں "بھتر و برابر چینل" داد دینے کے پابند نہیں تھے۔ اس لیے ایسے شعروں پر بھی بے ساختہ داد دیتے رہے جو بحر سے خارج تھے۔ ہمایوں نے دو ایک بار ٹوکا بھی کہ حضرت آپ بے وزن شعروں پر داد دے رہے ہیں۔ ہم نے کہا اردو ماحول سے ہزاروں میل دور لق و دق صحرا میں کہے جانے والے شعروں پر وزن اور بحر کی پابندی اچھی نہیں لگتی ہے اس محفل میں محترمہ صدف جعفری صدف ملک، عابد فاروق، مقبول احمد شیخ، سید سعید واحد، فرزانہ اعجاز،

عارف انوارالحق، شکیل کاظمی، یوسف شکیل، جاوید اقبال، جاوید اقبال رشید، بابائے مسقط کیفی حسینی، ہمایوں ظفر زیدی، یوسف ناظم اور صدر مشاعرہ منظر علی خاں نے کلام سنایا۔ اس محفل میں جب کنوینر مشاعرہ نے کیفی حسینی کو دعوت سخن دیتے ہوئے کہا کہ" اب آپ کو بابائے مسقط کلام سنائیں گے"، تو ہمارے کان کھڑے ہوگئے۔ اردو والے جہاں بھی جاتے ہیں وہاں اپنا ایک" بابائے اردو" یا" ملک الشعراء" یا" شمس العلماء" ضرور ایجاد کرلیتے ہیں اور متعلقہ حضرات بھی ان القاب کو ہنسی خوشی برداشت کرلیتے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی نے ایک کردار کے بارے میں کہیں لکھا ہے کہ وہ اپنے نام کے ساتھ بربنائے انکسار و خطاکاری "عاصی ظہورالدین" لکھا کرتے تھے۔ ان کے لکھے پر لوگوں نے بھی انہیں "عاصی ظہورالدین" پکارنا شروع کردیا۔ کیفی حسینی غزل سرا ہوئے تو ہمیں ان کے ترنم میں سے دکن کی بو آنے لگی۔ یوں لگا جیسے ہم مخدوم محی الدین اور سعید شہیدی کا کلام ترنم سے سن رہے ہوں۔ جب بابائے مسقط کلام سناچکے تو ہم نے پوچھا" قبلہ! آپ کا تعلق کس علاقہ سے ہے؟ بولے" ویسے تو پچھلے چالیس برسوں سے پاکستان میں مقیم ہوں لیکن میرا تعلق حیدرآباد دکن سے ہے"۔ ہم نے پوچھا "حیدرآباد دکن کے کونسے علاقے سے ہے؟" بولے" گلبرگہ شریف سے"۔ ہم نے جب گلبرگہ شریف سے اپنے تعلق کا اظہار کیا تو بہت خوش ہوئے۔ پوچھا۔ گلبرگہ میں کہاں رہتے تھے؟ بولے" محلہ جگت میں رہتا تھا"۔ ہم نے کہا" ہم بھی محلہ جگت میں رہتے تھے"۔ پھر اس کے بعد ہم نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ محلہ جگت کے کس مکان میں رہتے تھے کیوں کہ ہمیں اندیشہ ہوگیا تھا کہ کہیں وہ ہمارے سوال کے جواب میں یہ نہ کہدیں کہ وہ بھی اسی مکان میں رہتے تھے۔ ہم نے کہا" بابائے مسقط ہمیں یہ تو پتہ تھا کہ دنیا بہت چھوٹی ہے لیکن یہ اتنی بھی چھوٹی ہوسکتی ہے اس کا ہمیں اندازہ نہیں تھا۔ کیفی حسینی (اصلی نام مصطفےٰ حسینی) بیجاپور کے مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں بیجاپور اور گلبرگہ کی کئی ہستیوں کا ذکر کیا ہے۔ حسینی شاہد اور زینت ساجدہ سے بھی اپنی رشتہ داری بتائی۔ پولیس ایکشن کے وقت یہ حیدرآباد کے سنگلپورہ میں مقیم تھے۔ بابائے مسقط اب بھی ان گلیوں کو یاد کرتے ہیں جن میں چلنے کا انہیں کم کم ہی موقع ملا تھا۔ اس مشاعرہ میں ہمایوں ظفر زیدی نے ایک خوبصورت شعر سنایا۔ آپ بھی سن لیجئے۔

مرے خدا مجھے پردیس میں سکوں دیدے ؛ کہ اب تو لوٹ کے جانے کا حوصلہ بھی نہیں

دوسرے دن طنز ومزاح کی یادگار محفل، جس میں شرکت کے لیے ہم گئے تھے۔ انڈین اسوسی ایشن کے ہال میں منعقد ہوئی۔ یہ ایک مخلوط محفل تھی جس میں ہندوستانی، پاکستانی، گجراتی، پنجابی، حیدرآبادی اور سندھی باشندے شریک تھے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں کے سفارت خانوں کے اعلیٰ عہدہ دار بھی شریک تھے۔ طنز ومزاح کی یہ ایک یادگار محفل تھی۔ ابتداء میں ہمایوں ظفر زیدی نے طنز ومزاح کے بارے میں انگریزی میں ایک مدلل تقریر کی۔ اس کے بعد منظر علی خاں، یوسف ناظم، دلیپ سنگھ اور ہم نے مضامین سنائے۔ لوگوں کا اشتیاق کچھ اتنا زیادہ تھا کہ ہمیں اور دلیپ سنگھ کو تین تین مضامین سنانے پڑے۔ یہ پہلا موقع تھا جب مسقط میں نثری مضامین نے اتنی داد حاصل کی۔ ہال کے باہر تک سامعین کا ہجوم تھا۔

تیسرے دن ہمارے ایک اور میزبان واعظ الرحمٰن، جنرل منیجر حبیب بنک نے اپنے گھر پر ایک خوبصورت محفل آراستہ کی جس میں مسقط میں متعینہ پاکستانی سفیر جناب خالد محمود نے بطور خاص شرکت کی۔ مسقط کے سب خوبصورت

علاقہ قرم میں واعظ الرحمن کی کوٹھی شائقین ادب سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ مزاح نگاروں سے بھر مضامین سُنے گئے اور مسقط کے سارے شعراء نے جی کھول کر کلام سنایا۔ واعظ الرحمن نے مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مہمانوں کو تحفے تحائف سے بھی نوازا گیا۔ واعظ الرحمن نہ تو شعر کہتے ہیں نہ مزاح لکھتے ہیں لیکن ہمیں بتایا گیا کہ اردو کے حوالے سے کوئی بھی محفل آراستہ ہو تو وہ نہ صرف اپنے گھر کے دروازے بلکہ اپنے بینک کے دروازے بھی کھول دیتے ہیں۔ ہم تو اپنے مضامین سنا کر اردو کی خدمت کرتے ہیں لیکن واعظ الرحمن کچھ سنائے بغیر ہی اردو کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ صحیح معنوں میں اردو کے خاموش خدمت گزار ہیں۔ واعظ الرحمن نے کہا کہ طنز و مزاح کی یہ محفل بہت ڈرتے ڈرتے رکھی گئی تھی لیکن جس طرح یہ محفل کامیاب رہی اس کے چرچے مسقط میں جگہ جگہ ہو رہے ہیں۔ اب انشاء اللہ ایسی محفلیں ہر سال ہوا کریں گی۔ ہم نے بھی انھیں مستقبل میں بھرپور تعاون کا یقین دلایا ہے کیوں کہ اردو کی خدمت کے لیے ہم ہردم ہوائی جہاز میں بیٹھنے، فائیو اسٹار ہوٹلوں میں قیام کرنے اور قیمتی تحفے قبول کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ کوئی ہمیں آزما کے تو دیکھ لے۔ □□

رضا نقوی واہی
(پٹنہ)

مہمانِ خصوصی

بقول مجتبیٰ حسین "مہمانِ خصوصی" کا "اہل" بننے کے لیے
اعلیٰ درجے کی "نااہلیت" کا ہونا ضروری ہے۔

ایک دن حضرتِ حافظ نے یہ دیکھا منظر
اور چھکڑے میں جُتا رینگ رہا ہے تازی
تھے جو مرحوم بڑے سادہ دل و نیک مزاج
وہ تو اس غم کو لئے خلدِ بریں میں پہنچے
آج ہم پہ بھی مگر، جبرِ نظارہ ہے وہی
وہ چراگاہِ سیاست ہو کہ میدانِ ادب
اختیارات کی کرسی پہ خرانِ فربہ
ایک کرسی پہ کسی طرح اُچک کر پہنچے
پھر تو بقراط و ارسطوئے زمانہ ہیں وہ
پھر تو صحرائے جہالت بھی ہے دریائے علوم
خواہ دو حرف بھی تعلیم نہ حاصل کی ہو
کوئی جلسہ ہو وہ "مہمان خصوصی" ہوں گے
وہ زمیں کے ہوں مسائل کہ خلا کی باتیں
عالم و فاضل و دانش ور و اہلِ حکمت

"طوقِ زریں" سے مزیّن ہے "ہمہ گردن خر"
زخم ہی زخم ہے کوڑے کا زِ سر تا بہ کمر
"ایں چہ شوریست" کہا اور گرے چکرا کر
کئی صدیوں کا زمانے نے لگایا چکر
وہی نیرنگِ تماشہ، وہی نیرنگِ نظر
طوق زریں ہے وہی اور وہی گردنِ خر
متمکّن نظر آتے ہیں بہ صد کرّ و فر
اور پھر دھڑلے سے کھلے کشف و کرامات کے در
علم و حکمت میں نہیں پھر کوئی اُن کا ہم سر
پھر تو بے ہنری میں بھی ہیں ستوا ستو جوہر
"طوقِ زریں" کے کرشمے سے بنے دانشور
کوئی موقع ہو دھڑلے سے وہ دیں گے لکچر
مثلِ مقراض زباں چلتی رہے گی فر فر
سب نظر آئیں گے قدموں پہ جھکائے ہوئے سر

"طوقِ زریں" کا جو اس کو نہ کرشمہ کہیئے
"ناطقہ سر بہ گریباں، کہ اسے کیا کہیئے"

شکاگو کے نام

طالب خوندمیری

کیا دریافت امریکہ کو جب مسٹر کولمبس نے
تو کچھ اردو کے شاعر آگئے ہوں گے یہاں بسنے
اسی کارن یہاں بھی شاعری کا بول بالا ہے
ملیں جس شخص سے وہ شعر میں کچھ کہنے والا ہے
یہاں اک شہر ایسا ہے شکاگو نام ہے جس کا
ہمارے ملک کے شہروں میں چرچا عام ہے جس کا
یہی جس کی زمیں میں حیدرآبادی اثر بھی ہے
پریشاں بستیاں بھی ہیں یہاں دلسکھ نگر بھی ہے
یہاں دکھنی تمدن ہر طرف چھایا ہوا بھی ہے
یہاں تو پارکس بھی، چوک بھی چنچل گوڑہ بھی ہے
"یہاں دکھن کے لوگاں سختیاں بھی جھیل لیتے ہیں"
ہوں کتیچ مشکلاں، کھیلاں سمجھ کو کھیل لیتے ہیں"
دکن کے ماسوا ہے عکس اس میں اور شہروں کا
تلاطم گومتی کا، زور بھی گنگا کی لہروں کا
شکاگو ہے دکن بھی، لکھنؤ بھی اور دلی بھی
یہی اردو کا دل بھی ہے، جگر بھی اور تلی بھی
کراچی بھی یہی، لاہور سا شہر معظم بھی
یہی ہمسائے ملکوں کی محبت کا ہے سنگم بھی
جو آپس کے روابط ہم وطن میں بھول جاتے ہیں
نہ جانے کیوں شکاگو میں اچانک یاد آتے ہیں
یہاں جو بس گئے، وہ رچ گئے باہم محبت میں
انھیں معلوم ہے، کیسے جیا جاتا ہے ہجرت میں

یہ ہندو ہیں نہ مسلم ہیں، نہ ہندی ہیں نہ پاکی ہیں
بس اتنا یاد رکھتے ہیں کہ سب انسان خاکی ہیں
خوشی ہوتی ہے، یہ سب جان کر یاروں کے بارے میں
مگر کچھ بھائی اپنے بہہ رہے ہیں اور دھارے میں
یہاں کی زندگی پر جب ذرا گہری نظر ڈالی
دکھائی دی کچھ اپنوں کے بھی بائیں کان میں بالی
یہاں سب کے دلوں میں یوں تو ہے جوش اخوت بھی
مگر آکر یہاں بھی ہے وہی غیبت کی عادت بھی
شکاگو شہر میں ہر رنگ کے جھگڑوں کی خو بو ہے
کہیں انگلش میں تو تو ہے، کہیں اردو میں تو تو ہے
انھیں رنگوں سے اس کا حسن بھی ہے بانکپن بھی ہے
وطن سے دور ہے لیکن یہی مثل وطن بھی ہے
یہاں اس وقت بھی رہتے ہیں سب اردو کی گرمی میں
کہ جب منہ سے نکلتے ہی غزل جم جائے سردی میں
کبھی تو خود کو گرمی اس طرح بھی لوگ دیتے ہیں
لحافوں کی جگہ غالب کا دیوان اوڑھ لیتے ہیں
برتتا ہے تغافل جس زباں سے خود وطن اس کا
دیارِ غیر میں بڑھنے لگا ہے اب چلن اس کا
یقیناً ایک دن پوری مری یہ آرزو ہوگی
کہ اردو میں کسی ریڈ انڈین سے گفتگو ہوگی
یہ خواہش بھی کبھی پوری مرے معبود تو کر دے
کہ مائیکل جیکسن کے نطق میں اردو زباں بھر دے

○

کہا جب ہم نے اپنے میزباں سے
اگر ٹکنے کا ساماں آپ کردیں
کہا سن کر ہمارے میزباں نے
یہاں ٹکنا تمھیں مہنگا پڑے گا

پسند آیا بہت شہرِ شکاگو!!
رہیں گے آپ کے حق میں دعا گو!!
میاں طالب ذرا خوابوں سے جاگو
کلام اپنا سناؤ، اور بھاگو

یوسف ناظم

وجودِ زر سے......

ہمیں تو ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ ہمارے روپے پر ہماری پیاری زبان اردو کی چھاؤں پڑ گئی ہے اس کی یعنی روپے کی کوئی عزت ہی نہیں رہی۔ کسی نے ہمیں بتایا تھا کہ عزت کا تعلق قدر و قیمت سے ہوتا ہے۔ روپے کی قیمت ہی کچھ نہیں رہی تو عزت کیا آسمان سے ٹپکے گی۔ ہم نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ جس طرح زمین بنجر ہوتی جا رہی ہے اسی طرح آسمان بھی خشک سے خشک نہ سہی خشک مزاج ضرور ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارا روپیہ، موجودہ صورت حال یہ ہے کہ دنیا میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ گیا ہے چھوٹے ملکوں کی بات چھوڑیئے۔ ہم چونکہ آ ملک کے رقبے کے حساب سے بڑے شمار ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم جب بھی بات کریں گے بڑوں ہی کی بات کریں گے اور بڑے ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ملک کا رقبہ بڑا ہو۔ مالی اور جنگی اعتبار سے جو ملک بڑے جانے جاتے ہیں ان میں ہمارا روپیہ کس گنتی میں ہے۔ ہم روپیہ بنا سکتے ہیں یعنی سکے ڈھال سکتے ہیں۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ دارالضرب میں مشینیں لگی ہوئی ہیں۔ ان میں سکے ڈھالیے اور نوٹ چھاپتے رہیے۔ اس کا کوئی مادی یا معاشی فائدہ نہیں ہوتا۔ روپے جن کی کوئی قیمت نہیں ہوتی انھیں ملبہ کہا جاتا ہے۔ خستہ اور سوختہ مکانوں کا ملبہ۔ روپے کی یہ حالت ہوتی تو نہیں چاہیے تھی کیوں کہ ابھی حال میں ہم نے پانچ روپے کا جو گول سکہ تصنیف کیا ہے قد و قامت اور جسامت میں سابقہ سکے کے مقابلے میں کافی بڑا ہے لیکن اس سکے کی قیمت تو اس چھوٹے سائز کے سکے سے بھی کم ہو گئی۔ اس کی قیمت صفر تھی اور اس بڑے سکے کی قیمت صفر سے بھی کم۔ کیا من موہن روپیہ ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک لوگ روپے کی صورت دیکھتے تھے تو کم سے کم ان کے چہروں پر خوشی کی ایک ہلکی سی جھلک آتی تھی۔ اب لوگ اسے دیکھ کر ہنس دیتے ہیں۔ روپیہ ایک مزاحیہ خاکہ بن کر رہ گیا ہے بلکہ اب اس کا نام ہی انشائیہ پڑ گیا ہے۔ (تھوڑے دنوں میں یہ ہنسی گریہ و زاری میں تبدیل ہونے والی ہے) روپے کی قیمت کو لوگ اب اپنی قسمت سمجھنے لگے ہیں جس پر ریزرو بنک کی مہر لگ چکی ہے ہمارے کرنسی نوٹ پر بیسیوں زبانوں میں چھپا ہوتا ہے کہ اس خوب صورت نوٹ کی قیمت یہ ہے۔ ان مبالغہ آمیز اور مغالطہ انگیز زبانوں میں اردو بھی شامل ہے۔ اسی لیے ہم نے کہا کہ ہمارے روپے پر اردو کی چھاؤں پڑ گئی ہے۔ روپیہ بازار میں چلنے

فالی چیز نہیں رہ گیا ہے۔ اسے بمبئی میں پرنس آف ویلز میوزیم اور حیدرآباد میں سالار جنگ میوزیم میں نمائش کے لیے رکھ دیا جانا چاہیے۔ روپیہ کو اب آثارِ قدیمہ کا بھی درجہ دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ کسی زمانے میں اس کی واقعی کوئی قیمت تھی اب قیمت کا لفظ اسے زیب نہیں دیتا روپیہ آن دنوں انسانوں کے خون اور عورتوں کے ناموس کی طرح بلاقیمت استعمال میں ہے اور یہ استعمال دن بدن مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ بس تھوڑی سی انتظامیہ کی مدد درکار ہے۔ انتظامیہ جب ان کارناموں میں ہاتھ بٹاتا ہے تو ناموس اور تشدد کے شعلوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا عجیب بات یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر یہی "بے قیمت" روپیہ کام آتا ہے۔ وقت وقت کی بات ہے۔

چند سال پہلے تک ضرورت کے موقعوں پر روپیہ بریف کیس میں سلیقے سے جما کر پیش کیا جا سکتا تھا۔ اب بریف کیس چھوٹے پڑ رہے ہیں۔ سوٹ کیس کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔ یوں تو ٹرنک اور تھیلے بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں لیکن ان دونوں چیزوں کا چلن رہا نہیں ہے مطلب یہ کہ ٹرنک اور تھیلے آؤٹ آف فیشن ہو گئے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ فیشن کے خلاف کوئی چیز استعمال کرنا ایسا ہی ہے جیسے نیشن (Nation) کے خلاف کوئی کام کرنا۔ سوٹ کیس مہذب اور متمدن سامان ہے اور جو شخص بھی اسے استعمال کرتا ہے اسے پڑھا لکھا آدمی مانا جاتا ہے حالانکہ وہ خود نہ کچھ لکھتا ہے نہ پڑھتا ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کا بھی اب ادب بہت کیا جانے لگا ہے۔ سب انھیں سلام کرتے ہیں لیکن دور سے کیونکہ انھوں نے تعلیم بھی اسی روپیے کی بدولت حاصل کی ہے۔ جس کی آج یہ حالت ہو گئی ہے کہ پھرتا ہے نوٹ خوار کوئی پوچھتا نہیں۔ روپیے کو اس حال پر پہنچانے کے لیے ہم نے محنت بھی بہت کی ہے۔ غیر ملکوں سے کتنے قرضے لیے ہیں۔ کتنے ساہوکاروں پر... خطے لیے ہیں۔ اور کتنے پروجیکٹ بنا کر انھیں رد کیا ہے اور رد کرنے کے بعد انھیں بحال کیا ہے اور بحال کرنے کے بعد انھیں پھر مسترد کیا ہے۔

وہ تو بہت اچھا ہوا کہ ہمارے انتظامیہ نے کافی روپیہ سنبھال کر سرکاری خزانے میں جمع کر رکھا ہے۔ مثلاً بھوپال گیس المیے کے متاثروں میں جو روپیہ تقسیم کیا جانا چاہیے تھا پچھلے ۱۱ سال سے جمع کا جمع ہے۔ زلزلے کے المیے میں جو لوگ متاثر ہوئے تھے ان کے ورثا کا روپیہ بھی جمع کا جمع ہے۔ اسی روپے سے ہماری ساکھ قائم ہے اگر یہ روپیہ بھی خرچ کر دیا جاتا تو روپیہ کی قیمت اور زیادہ گر جاتی۔

ہمارے یہاں جب یہ مغربی ملکوں کے کھیل رائج نہیں ہوئے تھے تو ایک کھیل بہت مقبول تھا "چوسر" یہ کوڑیوں کی مدد سے کھیلا جاتا تھا۔ سنا جا رہا ہے اب یہ کوڑیاں بھی اتنی قیمتی ہو گئی ہیں کہ لوگ چوسر کا نام تک نہیں لیتے۔ ان کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ ویسے روپے کی ریل پیل کم نہیں ہوئی ہے اور نہ کم ہونے والی ہے۔ ۱۹۹۶ء میں جب پورے ملک میں الیکشن کی تقاریب منعقد ہوں گی تو یہی روپیہ ابل کر سامنے آئے گا اور ان لوگوں کے منہ بند ہو جائیں گے جو یہ کہتے تھکتے نہیں تھے کہ فلاں .... خاتون نے اپنے منہ بولے بیٹے کی شادی پر اتنا روپیہ خرچ کر دیا۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

وجودِ زر سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

دلیپ سنگھ
(دہلی)

شاعرِ طنز و مزاح کو سلام

رضا نقوی واہی صاحب سے میں زندگی میں کبھی نہیں ملا۔ ہاں میں نے ان کی تصویر ضرور دیکھی ہے۔ جسے دیکھنے کے بعد جو تھوڑا بہت اشتیاق انھیں دیکھنے کا تھا وہ بھی جاتا رہا۔ پتہ نہیں مزاح نگاروں کی صورتیں ایسی کیوں ہوتی ہیں جنھیں دیکھ کر بے اختیار ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔ کئی دفعہ تو میں سوچتا ہوں کہ مزاح نگاروں نے جو دوسروں پر ہنسنے کو اپنا شعار بنا لیا ہے، اس کے پیچھے بدلہ لینے کی خواہش کارفرما ہے۔ آپ ہماری شکل پر ہنستے ہیں۔ ہم آپ کی حرکات پر ہنسیں گے۔

میں نے تو مزاح نگاروں میں آج تک کوئی خوب صورت آدمی نہیں دیکھا۔ اس کے باوجود ان کی خواہش رہتی ہے کہ ان کی تخلیق کے ساتھ ان کی تصویر ضرور شائع ہو۔ ہمارے بزرگ اور محترم مزاح نگار یوسف ناظم صاحب اس میں پیش پیش ہیں۔ سر کے بال اڑ چکے ہیں۔ چہرے پر ان کے خدوخال سے زیادہ جھریاں دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے باوجود اپنی تصویر چھپوانے سے باز نہیں آتے۔ اس میں شک نہیں کہ دل کے بہت اچھے ہیں لیکن تصویر میں دل تو نظر نہیں آتا نا۔ میں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن ہو سکتا ہے تصویر کے ذریعے اپنے قارئین کو یہ پیغام دینا مقصود ہو کہ دیکھیے۔ اگر آپ نے میرا مضمون توجہ سے نہ پڑھا تو آپ کا بھی وہی حال ہوگا جو میرا ہوا ہے۔ مجتبیٰ حسین اس معاملے میں زیادہ ہوشیار واقع ہوئے ہیں۔ وہ اپنے مضامین کے ساتھ اپنی جوانی کے دنوں کی تصویر شائع کرواتے ہیں اور جوانی میں تو آپ جانتے ہیں تقریباً ہر کوئی حسین لگتا ہے۔ مزاح نگار بھی۔

میں بھی دوسرے مزاح نگاروں کی تقلید میں اپنے مضامین اور اپنی کتابوں کے کور پر اپنی تصویر ضرور شائع کرواتا ہوں لیکن میں کم از کم تصویر میں تو خوب صورت لگتا ہوں۔ میرے اصلی چہرے اور تصویر میں اتنا فرق ہے کہ ایک شخص نے میری کتاب پر میری تصویر دیکھ کر مجھ سے پوچھا تھا کہ آپ نے اپنی کتاب پر کسی اور کی تصویر کیوں چھپوا دی۔

میرا ادبی سفر قریب تیس سال تک ریڈیو اور پھر ٹی وی تک محدود تھا۔ ۱۹۸۴ء میں جب میں نے باقاعدگی سے رسائل کے لیے لکھنا شروع کیا تو میرا پہلا مضمون بمبئی کے "شاعر" میں شائع ہوا تھا بعنوان

یہ معذرت نامہ مضمون کے ساتھ حسب روایت میری تصویر بھی تھی۔ مضمون کے شائع ہونے کے فوراً بعد مجھے ظ انصاری مرحوم کا ایک پوسٹ کارڈ ملا جس میں انھوں نے مضمون کی بہت تعریف کی تھی لیکن اس تعریف کی نوعیت ملاحظہ فرمایئے، لکھا تھا:

من کہ یک تبصرہ نگار

میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کون ہیں اور کیوں ہیں۔

پہلی چیز آپ کے نام کے ساتھ معذرت نامہ پڑھی اور شاعر میں تصویر بھی دیکھی۔ دونوں کو ملا کر دیکھا تو کوئی مطابقت نہ پائی مگر ایک چیز پائی۔ آپ ضرور اس وضع کی چیزیں لکھتے رہتے ہیں اور میری بے خبری کہ ایسے جوہر قابل سے آگاہ نہیں ہو پایا۔ خیر اب سہی۔

ظ انصاری صاحب اچھا بھلا خط لکھ رہے تھے لیکن یہ لکھنا کیا ضروری تھا کہ "مضمون اور تصویر کو ملا کر دیکھا تو کوئی مطابقت نہ پائی"۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ یہ تعریفی خط میں نے سنبھال کر تو رکھا ہوا ہے لیکن کسی کو دکھاتا نہیں ہوں کہ دیکھنے والوں کی نگاہ فوراً اسی جملے پر جاتی ہے۔

ایک رسالے میں میرا مضمون اور تصویر دیکھ کر مجھے ایک لڑکی نے عشقیہ خط بھی لکھا تھا۔ مضمون کی تعریف کرنے کے بعد لکھا تھا کہ آپ کی تصویر دیکھ کر میں آپ کو دل دے بیٹھی۔ سچی بات یہ ہے کہ نہ صرف آپ بلکہ مجھے سارے سکھ بھی اچھے لگتے ہیں۔ میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ میں نے جواب میں لکھا کہ بہتر ہوگا آپ کسی اور سکھ سے مل لیں تاکہ آپ کو مایوسی نہ ہو۔

رضا نقوی واہی سے یا بلکہ ان کی تصویر سے میری پہلی ملاقات ان کی ایک کتاب سے ہوئی۔ حیدرآباد میں کتابوں کی ایک دوکان پر میں "آبیں" دیکھ رہا تھا کہ میری نظر ایک کتاب پر پڑی جس پر واہی صاحب کی تصویر دیکھی۔ تصویر دیکھ کر مجھے لگا کہ اگر صورت ایسی ہے تو لکھتے ضرور اچھا ہوں گے چنانچہ کتاب خریدلی اور پڑھنے کے بعد خوشی ہوئی کہ میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔

اردو میں عام طور پر دو قسم کے لوگ مزاحیہ شاعری کر رہے ہیں۔ ایک وہ جنھیں شعر لکھنا نہیں آتا اور دوسرے وہ جنھیں مزاح لکھنا نہیں آتا۔ جنھیں شعر لکھنا نہیں آتا وہ بے چارے یوں کام چلا لیتے ہیں کہ کہیں سے ایک لطیفہ سنا اور اسے الٹا سیدھا کر کے بظاہر نظم کی شکل دے دی۔ لیکن اس شاعر کے قاری سے اگر پوچھا جائے کہ بتا تیری رضا کیا ہے تو وہ یقیناً کہے گا کہ وہ یہ لطیفہ نثر میں ہی پسند کرے گا اور جنھیں شاعری کی تھوڑی سوجھ بوجھ ہے انھیں موضوع نہیں ملتے۔ مجبوراً وہ اپنی بیوی کو ہی تختۂ مشق بنا لیتے ہیں۔ مزاح نگار شاعروں نے اپنی بیویوں پر اس قدر شاعری کی ہے کہ ان بے چاریوں کا کوئی پہلو باقی نہیں بچا۔ بہت کم شاعر ہیں جو شاعری اور مزاح نگاری کے ساتھ نباہ کر رہے ہیں۔ فوری طور پر جو نام سامنے آتے ہیں وہ ہیں ضمیر جعفری، دلاور فگار اور رضا نقوی واہی۔

اب چوں کہ میں نے ایک بیان دیا ہے اس لیے آپ چاہیں گے کہ اپنے بیان کو معتبر بنانے کے لیے ثبوت پیش کروں۔ ثبوت مانگنے والے تو زنا بالجبر کے سلسلہ میں بھی ثبوت مانگتے ہیں اور میں تو صرف شاعری کی بات کر رہا ہوں۔ لیجیے ثبوت حاضر ہے۔ واہی صاحب کی ایک نظم ہے محقق۔ دیکھیے واہی صاحب اس کو کس طرح

بیان کرتے ہیں ۔

سونگھتے ہیں دیر تک مرحوم کی خاکِ لحد
پھر یہ فرماتے ہیں اٹھ کر عالمانہ شان سے
طول و عرضِ قبر سے یہ صاف چلتا ہے پتہ
گورکن آئے تھے اطرافِ بلوچستان سے

یعنی حضرت قبر "مرحوم" کی سونگھ رہے ہیں اور فیصلہ گورکنوں کے بارے میں دے رہے ہیں ۔ اس سے بہتر طنز محقق پر کیا ہوسکتا ہے ؟

تبصرہ نگاروں کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ وہ لوگ کتاب پڑھے بغیر تبصرہ لکھنے کے فن میں مہارت حاصل کرچکے ہیں ۔ اب ذرا ملاحظہ ہو یہی بات وا ہی کہتے ہیں ۔

بلکہ اکثر ہوا ہے ایسا بھی ۔۔۔ جو کتابوں کی دور سے سونگھی
اور جھٹ سے سنبھال کر خامہ ۔۔۔ فکر کو فن کا دے دیا جامہ
اب بھی مشہور ہے کہ آپ کا فن ۔۔۔ ان کتابوں پہ بھی ہے خامہ زن
طبع ہونے کی بات دور رہی ۔۔۔ بطنِ فن کار میں جو گم ہیں ابھی

عام مزاحیہ شاعر شاید "فکر کو فن کا دے دیا جامہ" لکھنے کے بعد سمجھ لیتا کہ اس نے تبصرہ نگاروں پر بھرپور طنز کردیا ہے اور اب کچھ کہنا باقی نہیں ۔

رضا نقوی واہی کا کمال فن ہے کہ انھوں نے اگلے چار مصرعوں سے نظم میں طنز کو عروج بخشا ۔

"میں اس نظم سے جس کا عنوان تبصرہ نگاری ہے اتنا متاثر ہوا کہ کتاب ہاتھ میں لے کر ایک پیشہ ور تبصرہ نگار کو سنانے چلا گیا ۔ اُن کے ہاں پہنچا تو وہ کچھ لکھ رہے تھے ۔ میں نے نظم سنائی تو مسکرائے ضرور لیکن اپنا کام کرتے رہے ۔ میں نے کہا حضور ایسا کیا ضروری کام ہے کہ آپ واہی صاحب کی نظم توجہ سے سن نہیں رہے ۔ کہنے لگے ایک کتاب پر تبصرہ لکھ رہا ہوں ۔ میں نے پوچھا کون سی کتاب پر ۔ کہنے لگے نام تو اس وقت یاد نہیں ۔ تبصرہ مکمل کرلوں پھر نام بھی دیکھ لوں گا ۔"

یہ بھی ایک مسئلہ ہے جس کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا ۔ جب میں سرکاری ملازمت کے سلسلے میں اسٹریلیا کی راج دھانی میں تھا تو ایک دن میں نے وہاں ایک اخبار میں مندرجہ ذیل اشتہار پڑھا ۔ اشتہار اخبار والوں کی طرف سے تھا :

"ہمیں اپنے دفتر میں صفائی کرنے والی ایک عورت کی ضرورت ہے ۔ عورت بہت محنتی ہونی چاہیے ۔ ہم منہ مانگی تنخواہ دیں گے ۔ ہمیں صفائی کا کوئی خاص شوق نہیں ہے ۔ ہم تو صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہمارے دفتر کے فرش کا رنگ کیا تھا ۔"

اشتہار پڑھ کر مجھے بہت لطف آیا ۔ کچھ دنوں کے بعد اس اخبار کے ایڈیٹر سے میری ایک پارٹی میں ملاقات ہوگئی ۔ میں نے پوچھا اس اشتہار کے سلسلے میں کتنی عرضیاں آئیں ؟ کہنے لگا " ایک بھی نہیں ۔" ایسا کیوں ؟" میں نے پوچھا ۔ کہنے لگا ۔ "اشتہار چونکہ مزاحیہ انداز میں لکھا گیا تھا اس لیے لوگوں نے اسے پڑھا ۔ قہقہہ

لگایا اور اخبار پرے رکھ دیا۔ عرضی کسی اللہ نہ دی"۔ یہی حال ہم مزاح نگاروں کا ہے۔ واہی ناقدین، محقق اور ریسرچ پہ تنقید کرتے ہیں۔ ناقد، محقق احمد ریسرچ ان کی نظمیں پڑھ کر ہنستے ہیں قہقہے لگاتے ہیں، دوسروں کو سناتے ہیں۔ اور پھر اپنا کام اسی طرح کرتے رہتے ہیں جیسے صدیوں سے کر رہے ہیں۔

اس سلسلے میں مجھے ایک دل چسپ واقعہ یاد آتا ہے۔ ایک بار جامعہ ملیہ کے شعبۂ ابلاغ کے صدر قدوائی صاحب نے ٹیلی ویژن پر لکھنے والے کچھ ادیبوں کو اپنے دفتر بلایا اور پروگرامز لکھنے کی فرمائش کی۔ ادیبوں میں فکر تونسوی مرحوم بھی موجود تھے۔ وہ قدوائی صاحب کی درخواست سن کر بول اٹھے "میں نہیں لکھوں گا"۔

قدوائی صاحب نے حیران ہو کر پوچھا "فکر صاحب آپ کیوں نہیں لکھیں گے؟" فکر نے جواب دیا۔ "پہلے لکھے پر کوئی ساعمل ہو رہا ہے جو میں اور لکھوں"۔

چنانچہ میں عرض کردوں کہ واہی صاحب لاکھ کوشش کریں کہ ان کی نظمیں پڑھنے کے بعد ناقد، محقق اور تبصرہ نگار سدھر جائیں لیکن ایسا ہوگا نہیں کہ بیچوں کا گیا سر ماتھے پر لیکن پرنالہ وہیں رہے گا۔

اس سلسلے میں انتہائی معذرت کے ساتھ ایک واقعہ کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ حال ہی میں ہریانہ اردو اکیڈمی نے رضا نقوی واہی صاحب کو انعام سے نوازا۔ انعام تو ان کے ادبی مرتبے کو مدِ نظر رکھ کر دیا گیا لیکن ان کا نام اس ناچیز نے تجویز کیا تھا۔ میری تجویز تمام ممبران نے بخوشی مان لی کہ اس میں عزت واہی کی نہیں بلکہ انعام دے کر اکیڈمی اپنی عزت میں اضافہ کر رہی تھی۔ لیکن حیرانی کی بات تھی کہ کسی کو واہی صاحب کا پتہ معلوم نہیں تھا۔ میں نے اگلے ہی دن پتہ مہیا کر دیا کہ میں اپنی ڈائری میں انہی لوگوں کے پتے رکھتا ہوں جو میری طرح شکل و صورت میں حسین نہ سہی لیکن فنی اعتبار سے بہت حسین ہیں۔

رضا نقوی واہی صاحب نے نظم کی ایک نئی صنف کو جنم دیا۔

یہ ہے منظوم خط۔ وہ موڈ میں ہوں تو دوستوں کو کبھی کبھی منظوم خط لکھتے ہیں۔ یہ خط نہ صرف اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ واہی صاحب کی شعری فن پر قدرت ہے بلکہ یہ بہت موثر ثابت ہوتے ہیں۔ مجھے انھوں نے زندگی میں ایک ہی منظوم خط لکھا ہے جس میں انھوں نے ایک کتاب کی فرمائش کی تھی۔ میں نے نہ صرف وہ کتاب انھیں فوراً بھجوا دی بلکہ وی پی سے بھجوائی کہ انھیں یہ خیال نہ ہو کہ منظوم خط لکھنے کتنے مفت میں ہو جاتے ہیں۔

نقوی صاحب کا وہ خط آپ کی نذر ہے:

بھائی دلیپ سنگھ سری ست اکال جی
بعد اس کے حکم دیں تو کروں عرضِ حال جی
یہ ڈرتے ڈرتے ایک گزارش ہے آپ سے
کر دیجے ایک کام سفارش ہے آپ سے
ساہتیہ اکیڈمی نے نکالی ہے اک کتاب
انگلش زبان میں جو چھپی ہے بہ آب و تاب

زیدی علی جواد کی تالیف کی ہوئی
مختصر وہ اردو ادب کی ہے ہسٹری
اس ہسٹری میں باب جہاں ہے بہار کا
واہی کی واہیات کا ہے اس میں تذکرہ
پٹنہ میں دستیاب نہیں ہے وہ ماہ رو
اور اس کی دید کی ہے بہت دل کو آرزو
دو چار دوستوں کو لکھے خط ادھر اُدھر
نوٹس مرے خطوں کی کسی نے نہ لی مگر
اب آپ سے یہ عرض ہے لے کر گرو کا نام
اک جلد بھیجیے کہ مرا دل ہو شاد کام
ساہتیہ اکیڈمی سے ملے تحفتہً اگر
دوں گا دعائیں آپ کو دن رات عمر بھر
اک جلد ورنہ وی پی سے بھجوائیے شتاب
ممنون ہوں گا اس کے لیے آپ کا جناب

میں نے عرض کیا کہ منظوم خط پہ فوراً عمل کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اس لیے میں بھی رضا نقوی واہی صاحب سے ایک منظوم درخواست کرنا چاہوں گا۔ حالاں کہ یہ منظوم درخواست لکھتے ہوئے میری جو حالت ہوئی ہے، وہ میں ہی جانتا ہوں:

سنیے جناب واہی گزارش ہے آپ سے
کر دیجیے ایک کام سفارش ہے آپ سے
سنتے ہیں آپ استی کے پھیرے میں آ گئے
یعنی بزرگواروں کے گھیرے میں آ گئے
اس جشن پر قبول ہو میرا سلام بھی
اب کیجیے خفیف سا اک میرا کام بھی
میں یہ نہیں کہوں گا جیو اک ہزار سال
کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ یہ کام ہے محال
البتہ ایک بات کہوں گا یہ محترم
اک سنچری بنانی ہے حضرت کو کم سے کم
ہم آپ کا وہ برتھ ڈے مل کر منائیں گے
ہم بھی شریک ہونے کو دلّی سے آئیں گے

...شگوفہ پڑھا کرو

ڈاکٹر راہی قریشی
(گلبرگہ)

خوشیاں اگر ہوں کم تو شگوفہ پڑھا کرو
غم سے ہو آنکھ نم تو شگوفہ پڑھا کرو

بیوی کرے ستم تو شگوفہ پڑھا کرو
اولاد کا ہو غم تو شگوفہ پڑھا کرو

ابّا قریب ہوں تو پڑھو مذہبی کتاب
نزدیک ہو صنم تو شگوفہ پڑھا کرو

عقدِ سعیدِ دخترِ شائستہ کے لیے
مل جائے ابنِ عم تو شگوفہ پڑھا کرو

"اک بیوی پر ہی صبر کروں گا تمام عمر"
یاد آئے یہ قسم تو شگوفہ پڑھا کرو

اولاد میں اضافے کے ہمراہ ہر برس
انکم ہو کم سے کم تو شگوفہ پڑھا کرو

گھر کو محاذِ جنگ بنانا فضول ہے
بیگم ہو ٹائم بم تو شگوفہ پڑھا کرو

لکھنے سے کس کو فائدہ پہنچا، جو تم کو ہو
کھو جائے جب قلم تو شگوفہ پڑھا کرو

اِس دورِ نامراد کے حبسِ دوام میں
گھٹنے لگے جو دم تو شگوفہ پڑھا کرو

یہ آگ، یہ لہو، یہ تعصّب، یہ اضطراب
عالم کا ہو اَلم تو شگوفہ پڑھا کرو

راہی! شگفتگیٔ طبیعت کا شہر میں
رکھنا ہو کچھ بھرم تو شگوفہ پڑھا کرو

چچا جان

ڈاکٹر محبوب راہی
(اکولہ)

خاوند ہو اور جورو سے ڈرتے ہو چچا جان
جیتے ہو قرینے سے نہ مرتے ہو چچا جان

جس روڈ پہ ہر روز پڑا کرتے ہیں جوتے
اس روڈ سے کیوں روز گزرتے ہو چچا جان

بھیجے کبھی کھاتے ہو کبھی بھیل سموسے
کھاتے نہیں، لگتا ہے کہ چرتے ہو چچا جان

چچی کی قسم میں نہیں چچی سے کہوں گا
یہ تو کہو کس شوخ پہ مرتے ہو چچا جان

ڈاڑھی میں خضاب آنکھوں میں سرمے کی لکیریں
بنتے ہو چچا جان سنورتے ہو چچا جان

رہتے ہو جو جھرمٹ میں ستاروں کے ہمیشہ
چندا کی طرح کیسے نکھرتے ہو چچا جان

وہ کون ہے کس شوخ کے چکر میں پڑے ہو
کس کے لیے اس درجہ سنورتے ہو چچا جان

بہتر ہے کہ گھر ہی میں سمیٹے رہو خود کو
کیوں لوٹ کے آنگن میں بکھرتے ہو چچا جان

چڑھنے کو تو چڑھ جاتے ہو تم بانس پہ لیکن
یہ تو کہو کس طرح اترتے ہو چچا جان

ضد میں تو سگے باپ کی بھی پھر نہیں سنتے
ہوتا ہے جو دل میں وہی کرتے ہو چچا جان

بے پیندے کے لوٹے ہو کہ بے دال کے بودم
خود کہتے ہو اور خود ہی مکرتے ہو چچا جان

باز آتے نہیں اپنی حماقت کے چلن سے
الزام مگر راہی پہ دھرتے ہو چچا جان

مسیح انجم
(حیدرآباد)

مجھ سے ملیے۔

میں ووٹر ہوں!

جی ہاں! مجھ سے ملیے۔ میں ووٹر ہوں۔ آزاد بھارت کا آزاد ووٹر۔ میں جمہوریت کا سرچشمہ بھی ہوں۔ دستور ہند نے مجھے ووٹ کی شکل میں اقتدار اعلیٰ سونپا ہے۔ میں حاکم بھی ہوں اور محکوم بھی۔ میری گھٹی میں سیکولر ازم پڑا ہوا ہے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ سیاست دانوں نے مجھے رام، رحیم، کرپال سنگھ اور ڈی سوزا جیسے الگ الگ خانوں میں بانٹ رکھا ہے۔ لیکن اس طبقاتی تقسیم کے وقت یہ نہیں سوچا کہ میں انسان بھی ہوں۔ اور ایک عظیم جمہوریہ کا شہری بھی۔ میں ہر رنگ میں رنگا ہوا ہوں۔ لیکن بہروپیہ نہیں ہوں۔ بہروپیے تو ہمارے لیڈر ہیں جو الیکشن کے موسم میں دجال کی شکل میں یونہۃ اوڑھے نمودار ہوتے ہیں اور پھر گرگٹ کی طرح رنگ بدل بدل کر "دَل بدلی" اور "دلی بدلی" کے کاروبار میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ آخر میں اپنا ووٹ کس کو دوں؟

الیکشن کے دنوں میں میری حیثیت بادشاہ گر کی سی ہو جاتی ہے اور وہ سارے لیڈر جو کل تک "ایک ووٹ کا سوال ہے بابا" کی صدا لگایا کرتے تھے میرے ووٹ کی بدولت مابہ دولت کا لقب اختیار کر کے منسٹر بن جاتے ہیں اور پھر میرے حصے میں صرف وعدے چھوڑ جاتے ہیں اور یہی وعدے اگلے پانچ سال تک میرا اوڑھنا بچھونا بن جاتے ہیں ـــــ وعدے اوڑھو ـــــ وعدے بچھاؤ ـــــ وعدے کھاؤ ـــــ وعدے پیو۔ یہاں تک کہ لنگوٹی کے نام پر وعدے کو لپیٹ لینے کی نوبت آجاتی ہے۔ پھر تو میں اس ٹریجڈی کو کامیڈی میں بدل لیتا ہوں۔

ووٹر ہونے کے ناتے میرے غریب خانے پر ہر پانچ سال میں ایک بار انتخابی امیدواروں کی قطار سی لگ جاتی ہے جس میں قابل اور پڑھے لکھے کم اور کندۂ ناتراش زیادہ ہوتے ہیں۔ ان میں بہت سارے آزاد امیدوار بھی ہوتے ہیں جنھیں تھالی کے بیگن یا بے پیندے کے لوٹے کہا جاتا ہے۔ ان امیدواروں کی قطار

کی بنیاد پر جو بیلٹ پیپر تیار کیا جاتا ہے بعض اوقات اس کی لمبائی اور چوڑائی کچھ اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ ووٹر کو حیران ہو کر پوچھنا پڑتا ہے کہ یہ بیلٹ پیپر ہے یا بوریا، یا کپڑے کی تھان۔ اس طرح کے بیلٹ پیپر کی وجہ سے ووٹروں کو یہ سہولت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ بڑی آسانی سے شکست خوردہ امیدوار کو اسی میں لپیٹ کر انتخابی حلقے میں گشت کروائیں۔ امیدواروں کی اس بھیڑ میں میں حیران رہ جاتا ہوں کہ آخر اپنا ووٹ کس کو دوں؟ اور کس کو نہ دوں؟ تب میں کینویسنگ کے لیے آئے ہوئے امیدوار سے چند بنیادی سوال کرتا ہوں۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ جمہوریت کی بقا کے لیے ووٹر کو رجھانے اور پھسلانے کے لیے کینوسنگ نہایت ضروری ہے۔ جب کنویسنگ ہوتا ہے تو کنویسر کا ہونا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ کنویسر کے بغیر انتخابی امیدوار کی حیثیت اس خود ساختہ دولہا کی سی ہو جاتی ہے جو بغیر باراتی کے ہول میرج کرنے چلا ہو۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انتخابات کے موسم میں ہر امیدوار کنویسر کے پیچھے پیچھے ہاتھ جوڑے یوں چلا آتا ہے جیسے وہ کوئی سدھایا ہوا بیل ہو۔ اس وقت امیدوار کی تائید میں کنویسر کی لن ترانی سننے سے تعلق رکھتی ہے۔

پچھلے انتخابات کی بات ہے کہ ہمارے غریب خانے پر امیدواروں کی اک کیوسی لگ گئی تھی۔ کیوں کہ ہمارے گھر میں کوئی سات ووٹر ہیں۔ ان سات ووٹوں کے لیے ہر امیدوار روزانہ ہمارے گھر کے ستر پھیرے لگایا کرتا تھا۔ امیدواروں کے پھیروں اور سلاموں کو دیکھ کر ہماری کالونی والے ہمیں ایک وی آئی پی قسم کی مخلوق سمجھ کر آتے جاتے راستہ دینے اور بازو ہٹ جانے میں اپنی سعادت مندی سمجھنے لگے تھے۔ ایک امیدوار کے کنویسر نے تو حد ہی کر دی تھی۔ اس نے ہمارے گھر پر ہی باضابطہ ایک منی انتخابی جلسہ منعقد کر ڈالا تھا اور وہاں تقریباً امیدوار کی شان میں تشبیہات اور استعاروں کے دریا بہا ڈالے تھے:

"ہمارا نیتا ایک سورج ہے —— ہم اس کی کرنیں ہیں۔"

"ہمارا نیتا ایک اونچا گگن ہے —— ہم ستارے ہیں۔"

"ہمارا نیتا ایک وشال سمندر ہے —— ہم اس کی لہریں ہیں۔"

"ہمارا نیتا ایک ...... ایک...... ایک...... "

"ہمارے فرزند نے جھٹ لقمہ دیا" وہ ایک دیگ ہے اور تم چمچے ہو۔"

وہ تماشا دکھا کر رخصت ہوئے تو ایک اور امیدوار تشریف لائے اور بعد نمسکار بولے:

"میں لوک سبھا کے چناؤ میں کھڑا ہوں۔ آپ کے حلقے کا امیدوار ہوں۔"

ہم نے کہا "کو یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی۔ لیکن یہ بتایئے کہ آپ چناؤ میں کیوں حصہ لینا چاہتے ہیں؟"

امیدوار بولا: آپ سوالات کر کے شرمندہ کر رہے ہیں۔"

ہم نے کہا "جی نہیں، شرمندہ آپ نہیں ووٹر ہوں گے۔"

امیدوار نے اطمینان کی سانس لے کر کہا:
"ڈیموکریسی خطرے میں ہے۔ میں ٹوٹل ڈیموکریسی کو بچانا چاہتا ہوں۔"
ہم نے دریافت کیا "آپ کا ٹوٹل مطالعہ کیا ہے؟"
امیدوار نے کہا: "ایک سے ایک چنندہ گالی مجھے یاد ہے۔ اگر اجازت ہو تو نمونتاً دس بیس ابھی عرض کر دوں۔ ریہرسل بھی ہو جائے گی اور آپ میری ذہانت کے قائل بھی ہو جائیں گے۔"
ہم نے کہا "میرے پیارے لیڈر آپ کی ذہانت اور لیاقت تو جمہوریت کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔"
امیدوار بولا "ذرا اوف بول گیا تھا۔ میرے معزز ووٹر۔ سوری۔ آپ کو شرافت کا واسطہ ہے کہ مجھے ووٹ دینا نہ بھولیے۔"
وہ شرافت کا واسطہ دے کر چلا گیا تو ایک محترمہ تشریف لائیں۔ وہ خاتون امیدوار تھیں لہٰذا ان کے ساتھ ان کی کچھ ہمجولیاں اور چند لیڈیز ورکرس بھی تھیں۔ ان کی کینوسنگ سے جمہوریت کو تو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ البتہ ووٹروں کی شرافت خطرے میں پڑ گئی تھی اور ووٹ بھی خطرے میں پڑ گئے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی ہمارے منہ سے یہ شعر پھڑپھڑا کر نکل گیا۔

ان کے آنے سے جو آجاتی ہے مکھ پر شوبھا
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

شعر سنتے ہی محترمہ نے پوچھا "کیا آپ شاعر ہیں؟"
ہم نے کہا "میں شاعر نہیں، کائر ہوں۔ اور عورتوں سے ذرا ڈرتا ہوں۔"
وہ بولیں "میں لڑنے نہیں، ووٹ مانگنے آئی ہوں!"
"کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"
"مجھے مس چمپا کلی کہتے ہیں۔"
ہم نے حیرت سے کہا "مس چمپا کلی اور پھر سے گلی گلی! حیرت ہے۔ میں مس کے مقابلے کے لیے اپنی میڈم کو لاتا ہوں۔ کیوں کہ میرا ووٹ خطرے میں پڑ گیا ہے اور ووٹ سے کہیں زیادہ ازدواجی تعلقات کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔"
اس سے پہلے کہ مس چمپا کلی کچھ فرمائیں ہم نے اپنی بیوی کو مس کے مقابل پیش کر دیا۔
مس چمپا کلی کو نیلام کر کے ہماری بیگم واپس ہوئیں تو ایک اور صاحب دندناتے ہوئے آ گئے۔ ان کو دیکھتے ہی یاد آیا کہ یہ وہی آزاد امیدوار ہیں جن کی ہر الیکشن میں ضمانت ضبط ہو جایا کرتی تھی۔ اب تک ہزاروں کے مقروض ہو چکے تھے لیکن پھر بھی انتخابی میدان میں اترنے ---- اترنے کیا کودنے سے باز نہیں آتے تھے۔ گزشتہ الیکشن میں تو اپنی زبردست شکست کے بعد وہ اچانک کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ ان کے ایک ستم ظریف قسم کے قرض خواہ نے اپنے ذاتی خرچ پر اخبار میں اس مضمون کا ایک اشتہار چھپوایا تھا:
"اے میرے پیارے قرض دار تم ہم سے منہ کیوں چھپاتے ہو؟
کیا تم نہیں جانتے کہ دنیا کی چہل پہل اور دنیا کی ساری رونق قرض داروں کے دم قدم سے ہی ہے

نہیں بلکہ دنیا کے سارے بڑے ملکوں کی ساری معیشت تک ادھار پر قائم ہے۔ لہٰذا اس اشتہار کو پڑھتے ہی فوراً چلے آؤ اور ہم کو شرمندہ ہونے کا موقع عطا کرو۔ اصولاً تو آپ کو نہیں، ہمیں روپوش ہو جانا چاہیے تھا۔"

اس سے پہلے کہ وہ آواز دیتے ہم اپنے باتھ روم میں روپوش ہو گئے۔

یہ روداد تو پچھلے انتخابی دنوں کی تھی لیکن اب جوں جوں اگلے انتخابات کے دن قریب آتے جا رہے ہیں، برسرِ اقتدار پارٹی نے ایک نئے انداز سے کنویسنگ شروع کر دی ہے۔ اس نے ایک بالواسطہ طریقے سے ووٹروں کو رجھانا اور راغب کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہماری ریاست میں "شرم دان" کے عنوان سے صفائی کے جو کام مختلف نیتاؤں سے کروائے گئے ہیں، ان کے پیچھے بھی ایک ڈپلومیسی اور انتخابی حکمتِ عملی پوشیدہ ہے۔ پرسوں جب ہم صبح صبح بیدار ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مہاشہ کھدر کی پوشاک میں ملبوس ہاتھ میں جھاڑو لیے ہمارے گھر کے سامنے والی سڑک پر کچرے کی صفائی میں مصروف تھے۔ ہم سمجھے کہ بلدیہ کے عملے کا کوئی فرد ہوگا جو نیا نیا تقرر ہو کر آیا ہے۔ چوں کہ وہ الٹی جھاڑو کو پکڑے ہوئے تھے۔ اس لیے ہم سے رہا نہ گیا۔ قریب جا کر رازدارانہ انداز میں پوچھا "کیا تم بلدیہ میں نئے نئے بھرتی ہوئے ہو جو ڈھنگ سے جھاڑو پکڑنا نہیں جانتے؟"

بولے "بدتمیز کہیں کا! جانتا نہیں کہ میں اس حلقے کا ایم ایل اے ہوں اور شرم دان پروگرام کے سلسلے میں اپنے حلقے کے ووٹروں کو صفائی کی ترغیب دینے کے لیے آیا ہوں۔"

ہم نے کہا "معاف کرنا شریمان جی! پہچاننے میں تھوڑی سی غلطی ہو گئی۔ پانچ سال میں ایک مرتبہ منہ دکھائیں تو ظاہر ہے یہی حشر ہوگا۔

عابد معز
(ریاض)

انکل اور آنٹی

دو دن شہر سے باہر رہ کر میں گھر لوٹا تو بچے میری غیر حاضری کے دوران انجام پانے والے کارناموں کی تفصیل بیان کرنے کے ساتھ احباب کے فون اور ان کی آمد کی رپورٹ دینے لگے۔

"ڈیڈی، پڑوسی انکل آپ کو پوچھ رہے تھے"

"پپھی نے آنٹی کا میک اپ باکس توڑ دیا۔"

"ہم انکل کے ساتھ آئس کریم کھانے گئے تھے۔ خوب مزا آیا۔"

میں نے استفسار کیا "کون سے انکل کے ساتھ۔"

جواب ملا۔ "اپنے انکل۔" بچوں کا اشارہ میرے چھوٹے بھائی کی طرف تھا۔

"چار انکل نے فون کیا تھا۔ ڈاکٹر انکل، مجھے گڑیا بیٹی کہنے والے انکل، حامد انکل اور ایک انکل جن کے پاس ماروتی ہے۔"

"کون حسین؟" ہم نے دریافت کیا۔

"نہیں ڈیڈی، EIGHTY EIGHT ماڈل والے نہیں، ان کے پاس NINETY THREE ماڈل ہے۔"

چھوٹی بیٹی ایک کتاب ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہنے لگی "انکل آئے تھے اور یہ کتاب دے گئے ہیں۔"

میں نے پوچھا "کون سے انکل؟"

لڑکی کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر کاندھے اچکا کر "نہیں معلوم" کہہ دیا۔

"پپھی کی ممی دو آنٹی کو ساتھ لائی تھیں۔ ایک آنٹی کے لڑکے نے آپ کا چشمہ توڑ دیا اور دوسرے آنٹی کی بیٹی نے میری بائیسکل کی ہوا نکال دی۔"

"بمبئی سے انکل کا فون آیا تھا۔ آپ کو فون کرنے کے لیے کہا ہے۔"

بچے باتیں بکتے جا رہے تھے لیکن میرا ذہن انکل اور آنٹی کی بہتات میں الجھا رہا۔ بچوں کے اتنے سارے انکل اور آنٹیاں ہیں کہ انھیں پہچاننے کیلئے باضابطہ تفتیش کرنی پڑتی ہے۔ کون سے انکل ؟ کیا نام ہے۔ ناک نقشہ کیسا ہے۔ کہاں رہتے ہیں۔ کیا کام کرتے ہیں۔ بچوں کو تفصیلات کا علم ہوتا نہیں ہے۔ مبہم اشارے ملتے ہیں۔ "وہ انکل جن کے سر پر بال نہیں ہیں"۔ "شاعر انکل"۔ "چائے نہیں پینے والے انکل"۔ "چاکلیٹ آنٹی"۔ "لپ اسٹک کھانے والی آنٹی"۔ یا پھر آنٹی کی نقل اتاری جاتی ہے کہ وہ یوں چلتی ہیں۔ اور انکل کے ٹیڑھے منہ کی طرح منہ بنایا جاتا ہے۔

مغرب کی اندھی تقلید نے ماں، باپ بھائی اور بہن کے بعد سارے رشتوں کو انکل، آنٹی اور کزن میں سمیٹ لیا ہے۔ تایا، چچا، پھوپھا، ماموں خالو، پڑوسی پڑوسن اور دوست احباب کو بلا تفریق و امتیاز انکل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تائی، چچی، پھوپی، ممانی، خالہ کے ساتھ ملنے جلنے والی خواتین کو آنٹی کا لیبل چسپاں ہو گیا ہے۔ انکل اور آنٹی کی بہ نسبت کزن میں بلا کی وسعت ہے۔ تایا زاد چچا زاد، پھوپی زاد، ماموں زاد، خالہ زاد بھائی بہن اور ہم عمر رشتہ دار سے لے کر محبوب و محبوبہ تک کزن کی چھایا تلے جمع ہو گئے ہیں۔ میرے ایک دوست نے اپنی محبوبہ کو ایک عرصہ تک کزن بنائے رکھا۔ ان کا نام جب "کزن عاشق" پڑ گیا تو وہ اپنی محبوبہ کا تعارف گرل فرینڈ کے طور پر کروانے لگے۔ ہم مشرقیوں نے انکل آنٹی اور کزن کو اپنا لیا لیکن پتہ نہیں کیوں گرل فرینڈ اور بوائے فرینڈ کو چھوڑ دیا۔ شاید اس لیے کہ ابھی ہم "DATING" نہیں کرتے، محبت کرتے ہیں اور عشق بگھارتے ہیں۔

بات زیادہ پرانی نہیں ہے۔ چالیس پچاس برس پہلے رشتہ داروں کو مخاطب کرنے کے لیے ڈھیر سارے القاب ہوا کرتے تھے۔ خاندان وسیع ہوا کرتا تھا اسی حساب سے مخاطب کرنے کے کئی انداز تھے۔ آج خاندان چھوٹا ہونے کے باوجود تنگ دامنی کا یہ حال ہے کہ والدین جیسے چار چھ بزرگ بھی انکل اور آنٹی پکارے جاتے ہیں۔ والد کے بڑے بھائی تایا ہوا کرتے ہیں۔ تایا حضرت، تایا جان، تایا ابا یا تایا حضور کہہ کر ان کی عزت اور توقیر میں اضافہ کیا جاتا تھا۔ چچا سے بھتیجے گھل مل جاتے تھے۔ چچا میاں، چچا پاشا، چچا جان، چاچا اور چاچو جیسے القاب سے والد محترم کے چھوٹے بھائی نوازے جاتے تھے۔ والدہ محترمہ کی ہمشیرہ آنٹی کے علاوہ خالہ، خالہ ماں، خالہ امی، خالہ جان، خالہ بی، بی خالہ اور خالہ پاشا ہوا کرتی تھیں۔ اسی طرح تائی، چچی، ممانی، پھوپی، پھوپا، ماموں اور خالو مختلف القاب سے یاد کیے جاتے تھے۔

تہذیب نو پرانی قدریں مٹانے لگی۔ سوٹ بوٹ کے دل دادہ چچا حضرت اپنے آپ کو چچا کہلوانے سے شرمانے، ، ، ، جھجکنے لگے۔ بھتیجوں سے کہا کہ انھیں انکل پکاریں۔ بھتیجے جب انھیں انکل کہتے تو ان کی گردن جو تانی سے اکڑی ہوئی تھی مزید اکڑ جاتی۔ بچپن میں جب میں نے ایک بزرگ کو چچا کہا تو انھوں نے سمجھایا۔ "جب تم مجھے چچا کہتے ہو تو لگتا ہے کہ میں پرانے خیالات اور پرانی وضع کا کوئی خرانٹ بوڑھا ہوں۔ محسوس ہوتا ہے کہ ہم ماڈرن نہیں ہیں۔ زمانے سے دس سال پیچھے چل رہے ہیں۔ ابھی گاؤں سے شہر آئے ہیں اور ہمیں انگریزی نہیں آتی۔ تم مجھے انکل کہا کرو۔ اور میں تمھیں بیٹا کے

بجائے سن کہوں گا۔"

میں انھیں "آداب چچا جان" کہنا چھوڑ کر "ہیلو انکل" کہنے لگا۔ جواب میں وہ مجھے "ہائے سن" کہنے لگے۔

بعض درمیانی عمر کے مرد و عورت انکل یا آنٹی کہنے پر ناراض ہو جاتے ہیں۔ لیکن کس کس پر خفا ہوتے رفتہ رفتہ ان الفاظ سے کان آشنا ہو جاتے ہیں۔

وقت کے ساتھ تایا، پھوپا اور خالو سبھی انکل کے سانچے میں ڈھلتے گئے۔ اب تو چچا کے معنی بھی بدل گئے ہیں۔ اگر آپ کو "چچا" کا مفہوم نہیں معلوم ہے تو کسی کو چچا کہہ کر مخاطب کیجیے۔ دورِ حاضر کے چچا کے معنی جان جائیں گے۔

چچا نے چولا بدلا تو خالہ ہی کیوں کر پیچھے رہتیں۔ خالہ، پھوپی، تائی اور چچی آنٹی بن کر لیٹسٹ فیشن کے ساتھ قدم ملانے لگیں۔ آنٹی کہلانے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ رشتہ ظاہر نہ ہونے سے عمر چھپی رہتی ہے۔ آنٹی کم عمر ہوتی ہے اور "اینٹی" یا "آنی" تو آنٹی سے بھی کم عمر، جبکہ خالہ عمر رسیدہ اور بھاری بھرکم شخصیت کی مالک ہوتی ہے۔ آج کے دور میں کسی خاتون کو خالہ اماں یا خالہ جان کہنا کسی مرد کو چچا کہنے سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

○

انکل اور آنٹی بننے کی وبا کا مقابلہ کچھ حد تک ماموں اور ممانی نے کیا۔ ہمارے درمیان چچا، تایا، خالو یا پھوپا کی بہ نسبت ماموں مل جاتے ہیں۔ وہ شاید اس لیے کہ ماموں بھانجوں سے بہت زیادہ گھل مل کر رہتے ہیں لیکن انکل اور آنٹی کے دور کے ماموں پہلے جیسے خالص ماموں نہیں رہے۔ بے چاروں کو "ماما" بن کر اپنی شناخت اور رشتہ کو قائم رکھنا پڑا۔ ماموں بدل کر ماما ہوئے تو ممانی "ممی" ہو گئیں۔

بچوں کو اپنے بزرگوں کے نام معلوم نہ تھے لیکن رشتہ داروں کا بخوبی علم تھا۔ بڑے ہونے تک بھی مجھے اپنے چچا کا نام معلوم نہ تھا۔ تب اور اب بھی میں انھیں چچا جان ہی کہتا ہوں۔ انکل اور آنٹی کی بہتات نے بچوں کو اپنے بزرگوں کے نام بتلا دیے اور رشتوں کو بھلا دیا۔ آج بچوں کو اپنے چچا، ماموں، خالو اور پھوپا کے ناموں کا علم ہے لیکن ان کے رشتوں کا انھیں خاص اندازہ نہیں۔ نام کے ساتھ انکل کا دم چھلّہ لگا کر سبھی کو مخاطب کر لیتے ہیں۔ بعض چھوٹی عمر کے "انکل"، انکل سے مخاطب ہونا بھی نہیں چاہتے، صرف نام سے پکارے جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ میرے ایک دوست کہتے ہیں کہ انکل اور آنٹی نے GENERATION GAP کو بڑی حد تک کم کر دیا ہے۔ چچا اور بھتیجہ ایک ساتھ بیٹھے سگریٹ پھونکتے ہیں اور آنٹی اور بھانجی مل کر فلمیں دیکھتے ہیں اور تفریح کے پروگرام بناتے اور اپنے اپنے دلوں کی کیفیت بیان کر لیتے ہیں۔

انکل اور آنٹی کی بہتات سے بیزار ہو کر ایک دن میں بچوں کو رشتہ داریاں اور ان کا ادب و لحاظ سمجھانے لگا۔ انھیں بتایا کہ چچا اور تایا باپ جیسے ہوتے ہیں۔ پھوپا اور خالو کون ہیں؟

ماموں کسے کہتے ہیں۔ خالہ، چچی اور پھوپی میں کیا فرق ہے۔ انگریزی میڈیم میں تعلیم پانے والے بچے کچھ دیا اردو میں رشتہ داریوں کے نازک فرق سے واقف ہونے اور انھیں یاد رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ چھوٹی بیٹی تم کو مختلف رشتوں کی بہ نسبت انکل اور آنٹی میں تو آسانی نظر آئی تو اس نے سوال کیا "لیکن ڈیڈی ہم چچا اور ماموں کو انکل کیوں نہیں کہہ سکتے ؟"

"اس لیے کہ چچا کی ذمہ داری الگ ہے اور ماموں کے فرائض دوسرے ہیں۔" بچوں کے سامنے اپنی اور مستعار تہذیب کے فرق کو واضح کرنے کے بجائے میں نے سادہ تشریح مناسب سمجھی۔

اسی دوران میرے ایک دوست ملنے آئے، بچوں اور ڈیڈی کو گمبھیر مسئلہ میں الجھا پایا تو ماجرا دریافت کیا۔ تفصیل بتائی تو انھوں نے مجھے ڈانٹا "کیوں اپنا اور بچوں کا وقت ضائع کر رہے ہو۔ انکل کہنے میں کیا قباحت ہے۔ مجھے تو لگتا ہے تم میں کوئی سو برس پرانی روح بسی ہوئی ہے۔ آج کی نسل باپ کو ابّا یا ابّو نہیں کہتی تو وہ چچا کو چچا کیا کہے گی۔ شکر کرو کہ بزرگوں کو نام سے مخاطب کرنے کا وقت نہیں آیا۔"

"لیکن اس کا ذمہ دار ..." میں نے بحث کا پٹ کھولنے کی کوشش کی۔ انھوں نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا: "تم سے خدا ہی سمجھے۔" پھر بچوں سے مخاطب ہوئے۔ "چلو بچو! ہم کارٹون فلم دیکھتے ہیں۔" اور بچے انکل کے پیچھے چل پڑے۔!

۵۵

محمد طارق غازی
(جدّہ)

فصل قحط الرجال

کہتے ہیں دنیا کی آبادی چھ ارب ہے۔
آدھوں آدھ نہ سہی، اس میں کچھ کم، کچھ زیادہ، آدھی تعداد تو مردوں ہی کی ہوگی۔ ہونی بھی چاہیئے، ورنہ شادیاں کیسے ہوں، عشق و محبت کی گرم بازاری کہاں رہے۔
مگر یہ شائد نظر کا پھیر ہے۔
یہ بھی تو کہتے ہیں کہ ان دنوں بڑا قحط الرجال ہے، یعنی مرد نہ رہے۔ تو پھر کیا ہوئے؟ کہاں گئے؟ کیا صنم کی کمر بن گئے؟ نظر تو یہی آتا ہے کہ مرد موجود ہیں اور ضرورت عشق مرد بھی۔ آج تک کسی سے قحط الاناث کا شکوہ نہیں سُنا۔ قحط الاناث ہوتا تو انسان زیادہ عملی ہوجاتا، ادب، شاعری کی فرصت کیسے ہوتی۔
یہ ساری بات بڑی عجیب ہے مگر ہے سچی۔ ہر سچی بات عجیب ہوتی ہے۔ عجیب نہ ہو تو سچی کیوں ہو۔ لوگ اسے مان ہی نہ لیں۔
اس عجیب اور سچی بات سے ہماری ذات کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ یہ نکتہ ایسی ہے کہ ہم نے ادب سے اس بات کا جوڑ ملا دیا، کیوں کہ ہماری خود ادب کے خربزوں کی آڑھت ہے، اور خربزوں کی ایک قسم کو پھوٹ بھی کہتے ہیں، اور پھوٹ ... جو تو ادب ... نہیں لکھا جاسکتا۔
یہ تو ہوئی اس بات سے ہماری ذات کے تعلق کی تمہید۔ تفصیل اس ایجاز کی یہ ہے کہ اب نوبت یہ آگئی۔ ایک ہفتہ کوئی مضمون لکھے یا شعر کہے بغیر گزر جائے تو دوران سر، اعضاء شکنی، خلوء معدہ کے ساتھ پیروں میں موچ بھی آجاتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے کہیں جاکر کوئی مضمون سُنانے کی نوبت آئی نہ کسی شعری دنگل سے بلاوا آیا، تو اب ان پیروں کا کیا استعمال کریں کہ لگتا ہے ادب پر بُرا وقت آگیا ہے۔ یہ اشتمالی قسم کا مرض ہے کہ حکیم اس کی تشخیص سے عاجز اور ڈاکٹر اس کا نام سُن کر آئینہ۔ انہیں کیا خبر کہ یہ فساد خون نہیں فساد مضمون ہے کہ نہ لکھیں تو خود روگی، اور لکھ دیں تو ساری خدا سوگی۔ اس مرض میں تخم منڈی مفید نہ املتاس کارگر نہ خوش رنگ بدذائقہ گولیاں مؤثر۔ حکیم بہت کریں گے تو دوا بتا دیں لکھ دیں گے، ڈاکٹروں کو خط شکستہ یا یں نسخہ نویسی اور خط گلزار نسیم میں کھاتہ نویسی سے فرصت نہیں۔ یہ تو وہ گپت روگ ہے کہ اس کی دوائی عطائی بتائی گیا کے اشتہاری کلینک میں بھی دستیاب نہیں۔
چنانچہ خود کردہ را علاجے خود یعنی قیلولۂ شب کے بعد خواہ دو چار صفحے کا مضمون لکھا، خواہ پانچ سات شعر

کیسے اور آئینہ کو جا سناد۔ یئے کہ باقی رات نفخ معدہ کی شکایت نہ ہو۔
خود غلاجی کے عادی ہوئے تو علاج ہی مرض بن گیا۔ کچھ تو لوگوں نے سن گن لی، کچھ ہم نے بھی مصلحتاً، اشارتاً کنایتاً ہی یاد کرایا کہ ہمیں مغتنم جانو۔ لوگ شریف تھے، جان گئے، یعنی از راہ شرافت ہماری بات مان گئے۔ چنانچہ وظیفہ حل المشکلات کے طور پر ایک ہفتہ بعد ایک ہفتہ کے دوران قوم کے تمام نامور مصلحین، ادب و شعر کے سب اساطین اور مشاعروں کے سارے بساتیں من جملہ خواتین کے لیے خراج تحسین کا اہتمام انگیز ہوا جہاں زبان خلق کا نقارہ پیٹا جا رہا ہو، اب عہال انکسار کا کیا محل۔ ایک ہم ہی تو تھے جنہیں ہر تقریب کا بلاوا تھا۔ یوں ہم ایسے سید ھے بھی نہیں کہ کسی جلسہ میں سامعین بن کر چلے جائیں۔

اوروں کو تو بے شک یقین تھا، اس دن ہمیں بھی عرفان ہوا کہ قحط الرجال کے اس دور میں عوام الناس ہوں کہ خواص الخواص، بدمست ہوں کہ بدحواس، ایک ہم ہی کو بسا غنیمت جانتے ہیں۔ تو اب کیا چھپانا، اللہ رکھے ابھی ہم سلامت بیٹھے ہیں جو دشمنوں کی ہزار کوشش کے باوجود ادب پر جمود طاری نہ ہو سکا۔ ہم ہیں کہ ادب کو دوڑائے جا رہے ہیں، خود بھی پسینے پسینے اور ادب بھی عرق عرق۔ ہمارا کام لکھنا ہے سو لکھے جا رہے ہیں خواہ اس کے نتیجہ میں مرزا نوشہ کے کلیجہ جو سر میں ایک حدیث کی صحت پر شک میں پڑ جانے والے حکیم آزردہ زبان کی صحت پر آزردہ ہوں یا شبہ کرتے رہ جائیں، روزمرہ کے سینے پر داغ پڑ جائیں، محاورہ کا پنیدہ کسی کمہار بنیارہ میں بنکوی کے ہاتھوں میں بھی نہ آئے، فکر کے مضمون پر بے بسی غالب رہے، الفاظ کو معنی کا سودا نہ ہو اور درد و سوز و آرزو مندی کا خاور اقبال ایلیٹ کے آئی نیٹ میں رو بہ زوال نظر آئے۔

اس دن ادب میں جمود سے زیادہ سنگین مسئلہ اپنی آبرو کا تھا۔ ہفتہ بھر میں سات نہایت وقیع اور اعلیٰ پائے کے محققانہ مضمون نہ لکھے، طرحی مشاعرہ کے لیے بے طرح اشعار اور غیر طرحی مشاعرہ کے لیے طرح دار غزلیں نہ کہیں تو اس آبرو کا کیا ہوگا جو قحط الرجال کے ساتھ ہمارے نام کو لازم و ملزوم کر دینے کے نتیجہ میں ہاتھ آئی ہے۔ سچ کا چھپانا گناہ اور خود اپنی ذات سے متعلق کھلے سچ کی پردہ پوشی اور بھی بڑا گناہ۔ سچ یہ ہے کہ ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر، حقیر، فقیر، پرتقصیر، لائق تعزیر ہوئے، سب اپنی اپنی زندگی بھر اسی قحط الرجال اور اسی آبرو کو باقی رکھنے کے پھیر میں رہے کہ قحط الرجال نہ ہو تو کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی۔ اب اس تگ و دو کے دوران جو کچھ سرزد ہوا وہ ادب کہلایا، بلکہ کبھی کبھی ادب عالیہ کے زمرہ میں آیا۔ تو ہم کون کسی سے کم ہیں، وہ وہ پینترے دکھا رہے ہیں کہ بزم عقیقہ سے انجمن سالگرہ تک ہر مشہور ادبی ادارے کے وابستگان کی طبیعتیں جو رنگ ہیں۔ تو بس عہد غالب سے آج تک یہ حال ہے کہ ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے کہ حضرت کیا پتہ کب کسی چلتے پھرتے موضوع پر مضمون نگاری کا موقع آ جائے اور کہاں کسی جلوۂ طرح دار پر شعر ارشاد فرمانے کی نوبت ہو۔

مگر جی لگتی کہیے۔ آبروئے قحط الرجال پر ایسی بری گھڑی کب آئی تھی کہ مرزا قدیم شاہ کو امتحان سے گزرنا پڑے۔ سرحدی ہوتے تو قلم تان کر کہہ دیتے کہ جو امتحان لینے کی سوچے اسی کا سر قلم۔ کوہستان سے ذرا سواد دریا تک اتر نے ہوتے تو عرض کرتے بندہ پرور سائیں، جتنا بدن میں کس ہے مزدوری کرتے ہیں، جتنا قلم میں رس ہے لکھتے ہیں، باقی کسی اور سے کتابت کروا لو۔ مگر ہم کھلے میدانی، پیشۂ آبا سپہ گری نہ سہی، قلم کے کھرے کمیدانی کہ بات آبرو

کی آپڑے تو چار کیا چالیس مضمون دھر گھسیٹ دیں، شعر کہنے پر آئیں تو گویا اپنی والی پر آجائیں اور سو غزلے سے پہلے مجال ہے جو دَم لے لیں۔

بس یہی بات تھی کہ سامان پر قلم سجا کر عینک کی کمانی کو ذرا کھینچ کیا کہ راہ میں فعیل کے انہونی بھی پیش آجائے تو لوگ کہیں کہ ٹوپیاں اچھالی جارہی ہیں تو کیا، ان دماغوں کی کجی قائم ہے کہ اس سے کج کلاہی کا بھرم قائم ہے۔

اب شعر ہو کہ مقالہ، موضوع تو بہرحال درکار ہے۔ گھر میں کتابوں کا روگ پالا نہیں کہ بلا وجہ ایک کمرہ ضائع ہو جاتا ہے اور بچوں کو کھیلنے کی جگہ کم پڑتی ہے۔ رہے موضوعات تو دنیا بھر میں بکھرے پڑے ہیں۔ کیا ضرور ہے کہ بقچہ میں باندھ کر گھر میں رکھا جائے۔ ہمیں کونسا کسی دبیر الملک یا حکیم الامت کی شاعری اور سررشتہ تعلیم کے ڈپٹی صاحب اور تعلیم کے وزیر صاحب کی نثر پر کچھ لکھنے کا سودا ہے۔ ہم ٹھہرے زندگی کے عاشق۔ تو جیتی جاگتی، سڑکوں پر سرپٹ دوڑتی زندگی سے موضوع کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ بقالہ الاُدَبا سامنے آیا تو سمجھا خیال تازہ ہوا۔ زندگی تو یہاں ہے۔ ادب کی پیوار بازاروں میں ہے۔ اگلا زمانہ لد گیا۔ لائبریریوں پر تالے پڑے ہیں۔ کتب خانوں کو وقت کی گرد چاٹ گئی۔ اب تو تحقیق کا حق سرراہے ادا کیا جاتا ہے، جہاں انسان روتا ہے اور زندگی ہنستی ہے۔ اسی ازدواج آب و سنگ سے ادب کی تخلیق ہوتی ہے اور اسی رشتہ پر تنقید و تحقیق اپنی آنکھیں کھولتی ہے۔ بے ساختہ جی سے داد نکلی، بقالہ الادبا، غمزۂ غماز ہے۔

در موضوع کو وا ہوتے پایا تو اپنی ادبی صلاحیت کی بھی داد واجب ہوئی۔ سرشاری کے عالم میں اندر داخل ہوئے۔ چھوٹی سی میز کے پیچھے بڑی سی کرسی پر حاجی کٹی یوں تن کر بیٹھے تھے کہ ملیح آبادی کے بجائے ملیباری ہوتے تو جوش عین بین ایسے ہی ہوتے۔

حاجی کٹی نے املاں عین کے ساتھ و علیکم السلام کہہ کر نہایت فصیح زبان میں پوچھا:

"کیا مانگتا ہے؟"

ہم بنئے سے دھنیہ لینے تو گئے نہیں تھے کہ منٹوں میں جمع جوڑ کر کے دکان بندی کر دی جائے۔ قصیدہ کبھی حمد و نعت، تشبیب و گریز و مدح سے گزر کر ہی مطلب کی بات پر آنے کا فن سکھاتا ہے۔ سراپا میں سرتاپا سفر کرتے ہوئے گفتگو کے بڑے نشیب و فراز عبور کرنے پڑتے ہیں تب کہیں وعدۂ وصل کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ بات ادب کی تھی۔ ہم تقاریر لوہے کے چنے بھی چبا سکتے تھے۔ کوئی کچی گولیاں تھوڑی کھیلے تھے کہ ایک سوال میں مات کھا کر پلٹ جاتے۔

سلام کرنے میں قصیدہ کے ابتدائی مراحل طے ہو چکے تھے۔ اب حاجی کٹی پر تشبیب تو جھلا کیا کہتے۔ لیلیٰ رنگ ہونا تو دلیل حسن ہے۔ مگر مجنوں کی مونچھ کے قافیے کہاں سے لاتے۔ لہٰذا مدح سے گریز کرتے ہوئے پوچھا:

"ملاپورم کے سارے کٹی حاجی ہوتے ہیں، یا کوئی ہماری طرح الحاج بھی ہوتا ہے؟"

بلغل سے روایت کے ہمزاد نے ڈانٹ پلائی۔

"یہی بے ہودگی کم تھی کہ بازار میں ادب ڈھونڈنے نکلے ہو۔ یہ ہودگی بالائے بے ہودگی یہ کہ گفتگو کا آغاز بھی غیر ادبی ہے۔"

ادھر کوچۂ ترقی کے ساکن نے للکارا :

"ادب میں مذہب کی آمیزش کی تو لندن سے ماسکو تک وہ تہمتیں کسوائی جائیں گی کہ قاہرہ میں بھی پناہ نہ ملے گی"

ہمزاد سے عرض کیا :

"لیجیے، کفر نے ہمیں دین کی سند دی ہے۔ ہم خالص اسلامی مسائل پر گفتگو کر رہے ہیں"۔

ترقی زادے کو دلیل دی :

"حاجی اور الحاج دونوں کا راست تعلق پردلتاریہ سے ہے۔ یہ ایک عوامی معاملہ ہے۔ ہم نے خود کھلی آنکھوں بھرڈ بھونجوں کے بھاڑ پرچنوں کے ساتھ ادب 'بھننے' دیکھا ہے۔ گیتا عطائی کی سند لائیں تو گرمی کا دوسرا نام شباب ہے جو حاجی اور الحاج پر بھی تو آتا ہے۔ آخر ملیح آبادیں بھی تو مہترانی اور رانی کی مشترکہ مسکراہٹ میں جوانی کی فطرت کا سراغ لگایا گیا تھا تب کسی نے نہ کہا کہ رانی تو جاگیردارانہ نظام کی علامت ہے۔ کیا عجب جو حاجی کٹی سے گفتگو کسی جوانی کے بابِ ششم کا مزا دے جائے۔ اس سے ایرانی ادب کا فروغ مقصود ہے، وہاں قرۃ العین طاہرہ کی روح بے چین ہے۔ ممکن ہے اس کے لیے بھی کسی جوارش کا انتظام ہو جائے"۔

ہمارے مدلل اور محققانہ جوابات سے ہمزاد اور ترقی زادہ دونوں بہت خوش ہوئے۔ مگر اس مکالمہ کو حاجی کٹی ہمارا سکوت سمجھتے رہے۔ ہمارے سوال کے جواب میں بولے :

"اُم اوریجنل ادب ہے۔ اوریجنل کو ادبی بھاشا میں کیا بولتا؟"

عرض کیا، "اصلی"۔

بولے، "آں۔ دوئی، دوئی۔ ام دوئی ادب ہے۔ ام حاجی بولتا۔ تم ہندی بولتا۔ ہندی میں الحاج بولتا"۔

یہ لیجیے۔ لسانیات کا ایک بڑا مسئلہ نقالہ الادباء پر طے ہو گیا۔ ادب اگر عوام کی اس سطح پر نہ آتا تو زبان کے بے شمار مسائل کبھی حل نہ ہوتے۔ اگلے لوگوں نے پہلوانِ سخن کے تبرّے میں آکر زبان کو محاورہ اور روزمرہ اور ادب کو لغت اور قواعد کی چیستاں بنا دیا تھا۔ اسی لیے وہ لوگ ترقی نہ کر سکے۔ بس زبان کو کندھوں پر اُٹھائے پھرے۔ ادب بازار میں آیا تو معلوم ہوا اس ملباری کو آٹے دال کا بھاؤ بھی معلوم ہے اور آتی ہندی بھی آتی ہے کہ اردو کی اصلاح کی ہمہ وقتی ذمہ داری بھی لیے ہوئے ہے۔ بڑ چون کے مفلوں پر مسند ہے اور نقالہ الادباء کے نام کی لاج رکھے ہوئے ہے۔

دل ہی دل میں آفریں کرتے ہوئے ہم نے اب راست ادب کی طرف پرواز کی۔

"تمہارا علم بڑا شاعرانہ ہے۔ اردو میں ہوتے تو سکول کے بچے کٹی کو تمہارا تخلص سمجھا کرتے۔ اور تم سے شعر سُننے کی فرمائش کرتے"۔

قصیدہ میں مدح کے اس بے محل عنصر نے حاجی کٹی کو بہت خوش کیا۔ بولے :

"مرسینڈا پیئیں گا...؟"

پس ثابت ہوا کہ حاجی کٹی ادب کا نہایت لطیف ذوق بھی رکھتا ہے۔

گفتگو میں گرمی آئی تو جوانی کی طرف بات اور کچھ بڑھائی۔ پوچھا :

"تم نے کبھی غزل کہی ہے؟ شاعری کرتے ہو؟"

ذرا جھینپ کر بولے : "ٹیم نئیں ملتا"

ہم نے ہمدردی سے سر ہلایا، انہوں نے بات سے بات کا سرا ملایا :

"وو اونہ رام گزل سنتا۔ او نیظام کٹی بوت اچا گزل گاتا۔ تم بی گزل گاتا؟ آپ بولو تو ام نیظام کٹی کو لوبیگا او آپ کو بھی گزل دیں گا۔ آپ بی گاؤ۔ او ورنئیں تو ام ایدر گزل دیں گا آپ کو۔ ابی نیا سٹاک آیا"

ہم نے پوچھا غزل کا نیا سٹاک کہاں سے آیا ہے۔

"سب ادرر سے آتا۔ تھائی لینڈ سے آتا۔ ایدر یہ میگزین ہانگ کانگ میں پرنٹ ہوتا۔ اس میں اچا گزل ہوتا۔ دکی میگزین میں بی ہوتا۔ سب بوت اچا گزل ہے۔ ام کو پڑنے نئیں آتے۔ آپ لے کے جاؤ"

ہم نے سارے دساوری رسالے خرید لیے۔ مبادا حاجی کٹی ادب کے عروج و ترقی میں ہمارا ہاتھ بٹانے سے گریزاں ہو جائے۔ مگر ہمیں فی الحال مضمون کی تلاش تھی۔ پوچھا :

"آپ کے پاس مقالہ بھی ملتا ہے؟"

حاجی کٹی کا چہرہ شب تار کی طرح چمک اٹھا۔

"او فلم سونگ بولتا، "مکابلہ ہوئیں گا" موکالا ہوئیں گا"؟ بوت ونڈرفل سونگ ہے۔ اس کا کیسٹ حاجی کو پاکی دکان پر ملتا۔ امارے پاس نئیں ہوتا۔ گھر میں ہے۔ ام روز سنتا"

ہم نے کہا : "فلم سونگ کا منہ کالا ہم مقالے کی بات کر رہے ہیں"

بولے : "مکالے؟ کیا یہ بی نیظام کٹی گاتا؟"

ہم نے سوچا ابھی تک تو کوئی ایسا مغنی پیدا ہوا نہیں جو مقالے بھی گا سکے۔ ہوتا تو ہم بھی صرف مشہور شہر نہ ہوتے، میر و مرزا کی طرح مشہور زمانہ ہوتے۔ بلکہ مرزا غالب جیسے علمی ادارہ کی تحقیق کے مطابق میر تقی میر کو عہد غالب میں ایک نقیر اور مرزا نوشہ کو خود اپنے دور میں ایک ڈومنی نصیب تھی جن کی وجہ سے ارباب ادب کو بالآخر دونوں کا شعری مقام متعین کرنے میں مدد ملی۔ ہماری تو غزلیں بھی گائی جانے لگیں تو نقیر کو دھیلا ملے نہ ڈومنی کا دھندہ چلے۔

چنانچہ بقالہ الادبا سے ہم خود چلے کہ ادب جدید روایت کے مطابق بقالوں پر مگر قدیم آبرو مندانہ کلاسیکی روایت کے مطابق چائے خانوں میں پروان چڑھتا ہے۔

کئی ہوٹلوں میں قدم رنجہ فرمایا۔ مگر جز رنج کچھ ہاتھ نہ آیا کہ کوئی شاعر ادیب تھا وہاں نہ ان کا سایہ۔ شارع صحافہ سے محلہ صحیفہ تک ہر در آزمایا، کہیں ذائقہ مراد زبان کو نہ بھایا۔ بالآخر کار ایک تنگ گلی کے قافیہ تنگ چائے خانے میں بڑی شخصیتوں کو دنیا و مافیہا سے بے خبر مشغول بحث پایا۔ ش۔ ق۔ درستی، مستند فرمایادی، غلط سلطی، عروض ہجائی، ترقی کوچوی، ضدی لسانی اور کرب نزسیلی جیسے محترم شہر اساطین ادب کا جمگھٹا پایا تو پائے شوق نے لپک کر ہمیں ان کے درمیان پہنچایا۔

وہاں زبان پر زبانیں دراز ہو رہی تھیں۔

ہم پر نظر پڑتے ہی عروض ہجائی نے نعرہ لگایا :

"لو، وہ آ گئے۔ پکڑو انہیں"

مُستند فرمایادی نے فرمایا:

" اب انہی سے پوچھو"

یوں لگا کہ ہمارا غم پنہانی بلائے ناگہانی میں تبدیل ہوا۔ یعنی سب کو ادب کا ریچھ کمبل ہوا۔ پھر بھی گھبرا کے پوچھا "بات کیا ہے؟"

" اب جیت ہماری ہوگی"، غلط سلطی نے گویا جواب دیا۔

"جیت کیسے ہوگی، فیصلہ ہوگا" ش۔ق۔ درستی نے جوابی حملہ کیا۔

کرب ترسیلی اس پر اور بھی مکدر ہوئے:

" آپ کو فیصلہ کا اختیار کس نے دیا ہے۔ فیصلہ سب کریں گے"۔

ضدی لسانی نے اصرار کیا: پہلے یہ فیصلہ کیجئے کہ دلیل کہاں سے لائی جائے گی"۔

غلط سلطی نے کہا: "جہاں کے یہ ہیں، وہیں کی دلیل چلے گی"۔

"یہ تو بھٹنڈہ کے ہیں"، مستند فرمایادی نے کہا۔ "بھٹنڈہ دلیل نہیں ہے"۔

ترقی کوچوی چپ نہ رہ سکے۔ بولے: "علی گڈھ میں مُستند ہے۔ آل احمد سرور سے پوچھ لو"۔

ہم حیران، قدرے سر در گریبان، کچھ نہ سمجھے کہ ماجرا کیا ہے۔ آخر چیخ کر بول لے:

" سب اپنی اپنی ہانک رہے ہیں، کوئی منہ سے نہیں پھوٹتا کہ اصل معاملہ کیا ہے"۔

عروض ہجائی نے ہمیں گھورتے ہوئے اپنے لکھنوی ململ کے کرتے کا کالر یوں درست کیا جیسے ملزم کی طرف بڑھتے ہوئے وکیل استغاثہ کرتا ہے۔ قبل اس کے کہ وہ جرح شروع کرتے، مستند فرمایادی نے ہم سے سوال کیا:

"یہ آپ ہی کا شعر ہے نا"

ہرگز یہ ہنسنے والی وہ بات تو نہیں ہے　÷　اس مسئلہ کو لے کر پھر اک فساد ہوگا

جواباً عرض کیا، "بے شک یہ شعر ہم نے کہا ہے۔ ہم ہی کہہ سکتے تھے۔ اور اس شعر پر عقیقہ گیری کے مشاعرہ میں جو داد ہمیں ملی تھی وہ کام تمامی کو پورے دیوان پر بھی نصیب نہ ہوئی ابھی پوری غزل عرض کرتے ہیں۔۔۔"

ضدی لسانی نے کہا: "جناب غزل نہیں۔ اس شعر پر صبح سے تنقید چل رہی ہے"۔

مُستند فرمایادی نے وکیل استغاثہ بن کر فیصلہ سنایا:

"اس شعر میں محاورہ کی دو غلطیاں ہیں"۔

غلط سلطی نے فیصلہ رد کردیا۔ "اب محاورہ کا زمانہ نہیں رہا۔ جو کچھ ہم کہتے ہیں، جیسے کہتے ہیں وہ درست ہے۔ یہ صدی ہماری ہے۔"

کرب ترسیلی نے کہا: "یہ صدی کسی کی نہیں۔ پانچ سال بعد ختم ہوجائے گی"۔

ضدی لسانی نے دونوں کو ڈانٹا "چپ رہئے۔ تنقید کا ماحول خراب ہورہا ہے۔ ادب پر گفتگو

ادب سے ہونی چاہیئے:"

کرب ترسیلی نے ترکی بہ ترکی جواب ارسال کیا "مگر ہماری بات سُننی پڑے گی۔ یک طرفہ فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی:"

عروض ہجائی نے ہاں میں ہاں ملائی۔ "ہمارے اعتراضات بھی سُنے جائیں:"

ہم نے کہا: "اعتراضات کی بھی ایک ہی رہی۔ ارے بھئی اس شعر پر بے تحاشہ داد مل چکی ہے ہم عام لوگوں کے روزمرہ کے مسائل پر شعر کہتے ہیں کہ یہی آج کا روزمرہ ہے وہ عام لوگ اس شعر کو پسند کرچکے ہیں۔ ہم عوام کی عدالت کو مانتے ہیں۔ اب آپ لوگ کچھ بھی کہتے رہیئے:"

ہماری مدلل تقریر سن کر غلط سلطی نے تالیاں بجائیں۔ کرب ترسیلی ایلیٹ کا نام لے کر چُپ ہوگئے، غالباً یادداشت سے کوئی سند نکال رہے تھے۔ ترقی کوچوی مُستند فرمایادی کو منہ چڑانے لگے۔ مُستند فرمایادی بڑے طیش کے ساتھ پان چباتے ہوئے گرجے:

"شعر مہمل ہے۔ غلط محاورے نظم کیئے گئے ہیں۔ اسے برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ زبان بھی بگڑتی جارہی ہے اور یہاں ذہن بھی بگڑ رہے ہیں۔ کسی کو زبان کے دروبست کا ہوش ہے نہ مضمون کی چستی کا خیال۔ جس کے جو منہ میں آیا کہہ دیا اور اسے شعر اور ادب سمجھ لیا گیا۔ نہ قواعد کا لحاظ، نہ محاورہ کی خبر، نہ روزمرہ کا علم نہ اسلاف ادب کا مطالعہ، نہ اہلِ علم کے پاس اٹھنا بیٹھنا۔ ادب کی مٹی پلید ہورہی ہے اور پھر ہم سے اس کارنامہ کی داد بھی طلب کی جاتی ہے۔۔۔!"

ہم نے بات کاٹ کر ویسی ہی گرجدار آواز میں پوچھا: "غلطی بتایئے۔ ہم بھی تو دیکھیں زبان اور ادب کے فوجدار کیا کہتے ہیں:"

ش۔ ق۔ درستی نے اتنی ہی اونچی آواز میں کہا: "ضرور بتائی جائے گی، غلطی ضرور بتائی جائے گی۔ دونوں مصرعوں میں محاورہ غلط ہے۔ پہلے مصرع میں 'ہنسنے والی بات' غلط محاورہ ہے۔ ہنسی کی بات ہونا چاہیئے۔ دوسرے مصرعہ میں 'اس مسئلہ کو لے کر' کہا گیا ہے۔ یہ 'کو لے کر' کیا ہوتا ہے؟ 'اس مسئلہ پر' کہیئے۔"

"بس اتنی سی بات،" ہم نے کہا۔ "اول تو ہم محاورہ وغیرہ کی پرواہ نہیں کرتے۔ یہ سب دقیانوسی باتیں ہیں۔ لیکن آپ کی تسلی کے لیے ہم ایسی سند لائیں گے کہ سب کے منہ بند ہوجائیں گے۔ پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ تمام پاکستانی ٹی وی سیریلوں میں ہیروئنیں اسی طرح بولتی ہیں 'ہنسنے والی بات'، 'حیرانی والی بات' وغیرہ۔ دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یکم اگست کے مقبول عام ہندی روزنامہ سنسار میں پہلے صفحہ کی دوسری سرخی ہے: 'نیتا سامنی ہتیا کو لے کر راجیہ سبھا میں دنگا'، اب کہیئے کیا جواب ہے آپ کے پاس؟ ہم تو ہندوستان پاکستان دونوں جگہ سے سند لے آئے:"

ترقی کوچوی نے فوراً ہماری تائید کی مگر ساتھ ہی اصلاح بھی دی "آپ کی پہلی سند ٹھیک نہیں ہے ــ پاکستانی ٹی وی سیریلوں میں محاورہ 'ہنسنے والی بات' نہیں، بلکہ 'ہنسی والی بات' ہے۔ آپ کو اس مصرع میں ترمیم کرنی چاہیئے:"

ہم نے کہا: "کسی سے سُنا تھا کہ ضرورت شعری محاسن کلام میں داخل ہے۔ اس لیے شعر کا حُسن دو بالا کرنے کی غرض سے ہم نے دانستہ ضرورت شعری کے طور پر 'ہنسنے والی بات' باندھا ہے، ورنہ ہمیں اصل ٹی وی محاورہ کی خبر ہے۔"

ترقی کوچوی نے ہماری دلیل کو تسلیم کر لیا۔ اور اس کے ساتھ کہا: "آپ کی دوسری سند بالکل درست ہے۔ اردو ہندی میں کوئی فرق نہیں۔ بس رسم الخط اور لپی کا فرق ہے۔ وہ بھی نہ رہے تو اچھا ہے۔ اور اب تو بے شمار لفظ اردو ہندی میں گڈمڈ ہوگئے۔"

مُستند فرمایادی نے بات رد کر دی۔ "اردو اردو ہے اور ہندی ہندی۔ اب اگر ہندی والے غلط بولتے ہیں تو کیا ہم بھی غلط بولیں۔ وہ مخالفت کو خلافت بولتے ہیں۔ فلسفیانہ کو فلسفانہ کہتے ہیں۔ تو کیا ہم بھی یہی شروع کر دیں۔ اور کیا پاکستانی ٹی وی سیریلیں زبان کا کوئی دبستان ہیں۔ ہم نے تو دلی، لکھنؤ میں ایسے بے تکے فقرے نہیں سُنے۔ سند دِلّی یا لکھنؤ سے لائیے۔"

ضدی لسانی نے غصّہ سے بات کاٹ دی۔ "یہ کیا دِلّی، لکھنؤ بیچ میں لے آئے آپ۔ زبان زبان کی رٹ لگاتے آپ کی زبان سوکھتی بلکہ اینٹھتی جا رہی ہے تو جاکے حکیم مومن کی قبر کی مٹی چاٹ لیں۔ ہمارے منہ کیوں آتے ہیں۔"

غلط سلطی نے بات لپک لی۔ بولے: "ساری تنقید رد۔ ہم وہی زبان لکھیں گے جو پان کی دکان سے بقالہ الادبا تک مشاعروں اور مذاکروں میں استعمال ہوتی ہے۔ یہ جدید دور ہے۔ بڑی جدو جہد کے بعد غلط العوام کو فصیح تسلیم کروایا گیا ہے۔ اب دلی اور لکھنؤ کی ادبی ڈکٹیٹرشپ نہیں چلے گی۔ یہ کھلی دھاندلی ہے۔ ہم عوام کی بول چال میں عوام کا ادبی ذوق بنا رہے ہیں۔ اب کوئی ہمیں آگے بڑھنے سے روک سکتا ہے نہ عوام کو۔ مشکل الفاظ، مشکل مضامین عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اور نہ کسی کے پاس فرصت ہے انہیں سمجھنے کی۔ شعر سمجھ میں نہ آئیں تو ہمیں داد کہاں ملے گی۔؟"

کرب ترسیلی خودکلامی کے انداز میں گویا ہوئے: "محاورے فرسودہ ہو چکے ہیں۔ سرسید، محمد حسین آزاد اور ابوالکلام کا نثر فرسودہ ہو چکا ہے۔ غالب اور اقبال کے شعر فرسودہ ہو چکے ہیں۔ زندگی کی حقیقتیں اب زیادہ تلخ ہیں اور الفاظ گونگے۔ باتیں بہت ہیں، لفظوں کا قحط ہے۔"

ترقی کوچوی نے اعتراض کیا: "کلاسیکی روایت کے ۲۵ لفظ شاعری سے نکال دینے سے لفظوں کا قحط نہیں پڑ گیا۔ یہ جدید نسل کا عجز بیان ہے۔ ذرا کوچۂ ترقی میں آکر دیکھیے کیسی دھواں دھار انقلابی شاعری ہوئی ہے کہ . . . . .

" . . . کہ روس سے ترقی کا جنازہ اٹھ گیا۔" ش۔ ق۔ درستی نے ترقی کوچوی کا جملہ پورا کر دیا جس سے کرب ترسیلی بہت محظوظ ہوئے۔

ترقی کوچوی برہم ہوگئے۔ "ہم کو الزام دیتے ہیں۔ یہ جدید نسل بھی تو مغرب کی ادبی غلام ہے۔ ترقی کی تحریک پر ضرب لگانے کے لیے امریکہ میں جدیدیت کی سازش تیار ہوئی اور آسٹریلیا سے ساری دنیا میں لفظوں

کے قحط کی طرح پھیلادی گئی۔ آپ سے زبان چھین لی گئی۔ آپ کو گونگا کردیا گیا۔ آپ کے ادب کو فہم کے دائرہ سے نکال باہر کردیا گیا۔ آپ لوگوں کے پاس اب عجز بیان کے سوا کیا رہ گیا ؟"

مستند فرابادی نے ترقی کوچوی پر نیا حملہ کیا: "آج کا عجز بیان بھی تو آپ لوگوں ہی کی دین ہے۔ زبان کو علم سے عوام کی سطح پر لانے والے بھی تو آپ لوگ ہی تھے۔ زبان کو بازار میں برہنہ سر نچایا جائے گا تو سوائے مضامین کے سوا کیا ہاتھ آئے گا؟ لفظ کو ننگے نہیں ہوئے بلبلیں گونگی ہوگئیں۔ یہ جو نرسیلی کے کرب کا شکوہ ہے یہ اس کے سوا کیا ہے کہ شاعروں، ادیبوں کے پاس کہنے کے لیے لفظ نہ رہے، لوگوں کے پاس لفظوں کی پہچان نہ رہی۔ یہ سب کچھ آپ لوگوں کا کیا دھرا ہے ہم تو چیختے چلاتے رہے۔ کس نے سنی۔ اب یہ عذاب سب ڈھو رہے ہیں۔"

عروض ہجائی کو بات کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ شکایت کرنے لگے: "سب اپنی اپنی بولے جارہے ہیں۔ ہماری کوئی نہیں سنتا۔ ہمیں بھی شعر کے فنی سقم پر کچھ بولنا ہے۔"

غلط سلطی کو طرارہ آگیا: "شعر میں کوئی فنی سقم نہیں ہے۔ یہ بات ختم ہوچکی ہے۔ ویسے بھی جہاں فنی سقم کا اندیشہ ہوتا ہے، وہاں نثری نظم کام آتی ہے۔"

"نثری نظم ؟ یہ نئی بے ہودگی ہے۔" ش۔ ق۔ درستی بولے۔

کرب ترسیلی کو غصہ آگیا۔ لپاڈگی شروع ہوگئی۔ ہنگامہ ہوا۔ برہمی کے ساتھ سب باہر نکل گئے۔ چائے خانہ میں ہم تنہا رہ گئے۔

آئے تھے کہ کسی مضمون کی تحریک ہوگی۔ کسی موضوع کا سرا ہاتھ لگے گا۔

ایک ایک کرکے دن گزر گئے۔ کوئی مضمون نہ لکھا جاسکا۔

اب آبرو گئی تو اہل نظر کے شیوے کی کہ ہم سے مضمون لکھواتے ہیں۔ رہی ہماری آبرو تو وہ سلامت ہے کہ ہم بھی بے آبرو ہوگئے تو قحط الرجال نہیں خود ادب کا کال پڑ جائے گا۔ اور جیتے جی تو یہ ہم ہونے نہ دیں گے۔ اب نہیں پھر کبھی مضمون لکھ دیں گے۔ کیوں کہ فی الحال تو ہم شہر ہی میں نہیں ہیں کہ لوگ گرفت کریں۔ اور ہمارے پیچھے لوگ کہہ رہے ہوں گے کہ وہ گونگے لفظوں میں بولنے والا بھی ذرا ہوتا تو مزہ آتا کہ ایک وہی تو قحط الرجال میں ادب کا کاشتکار بھی ہے اور فصل بھی۔

□□

مصطفیٰ شہاب (لندن)

مشورے

استاد نے تب کھل کے بتایا مجھے احوال　　یہ شاعری کرتی ہے بہت سوں کا برا حال
اس شوق میں ہرگز نہ میاں جاں کو کھپانا　　مستور ہیں اس شعر گری میں کئی جنجال
اک زیر بڑھا دو تو بدل جائیں گے معنی　　اک پیش گرا دو تو بگڑ جاتے ہیں اشکال
شعروں میں قلابے جو ملاتے ہیں وہی لوگ　　تخلیق کے میدان میں رہ جاتے ہیں کنگال
خطروں بھرا جنگل ہے تو کانٹوں بھرا رستا　　تنقید کے غاروں میں چھپے بیٹھے ہیں دجال
اچھی ہے بلا قامتی استاد کی لیکن　　کب وقت بتاتی ہے میاں چوک کی گھڑیال
عرفان غزل کے لیے گھڑ لے کوئی معشوق　　تجھ جیسے قلندر کا نہ ماضی نہ کوئی حال
یہ سن کے کہا میں نے کہ اے شاعر مطلق　　اتنا نہ تکلف دے کہ بدل جائے مری چال
جاتی ہی نہیں میری نظر آپ سے آگے　　بس آپ ہی ہیں میر مرے آپ ہی اقبال
قابل تو نہیں ہوں میں کسی حسن کرم کا　　اک التجا اس کا پر ذہن میں ہے بہر حال

پہلے کریں اس شاعر نادان کی اصلاح
پھر شوق سے اوروں کی زمینیں کریں پامال

غزل

بلبل کاشمیری
(لندن)

بہت ہی تنگ دل ہیں وہ جو دل کو دل سمجھتے ہیں　　کشادہ دل اسے اک فکٹری یا مل سمجھتے ہیں
رخ محبوب کو تو لوگ سارے تل سمجھتے ہیں　　مگر کچھ پیپر نا بالغ اسے فلفل سمجھتے ہیں
ہمکاں کے لئے بل آتے ہیں بل کھاتے ہوئے اب تو　　کسی کا خط بھی آجائے اسے ہم بل سمجھتے ہیں
فرنگستان کے نالائقوں کا رنگ ہے ڈگری　　سیہ ملکوں کی ڈگری کو وہ اکثر نل سمجھتے ہیں
تصور میں وہ سیر آسماں کرتے ہیں لمحوں میں　　تو پھر ان شاعروں کو لوگ کیوں کاہل سمجھتے ہیں

وہی شاداب اور ہنستے ہوئے چہرے یہاں بھی ہیں
جبھی ہم ہنسلو[1] کو وادی کرگل[2] سمجھتے ہیں

[1] لندن بارو آف ہنسلو　　[2] بلتستان کا مشہور قصبہ

ڈاکٹر حبیب ضیا

ڈینگ بازی

ڈینگ بازی ایک خداداد عطیہ ہے جو بہت کم انسانوں کو نصیب ہوتا ہے۔ بعض دفعہ اس کے جراثیم ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتے ہیں۔ باپ ڈینگیں مارنے میں مشاق، تو بیٹا اس کا استاد ہوتا ہے۔ یہ فن جب شدت اختیار کرلیتا ہے تو انسان خبطی ہو جاتا ہے۔ اچھے اور برے، فائدے اور نقصان میں تمیز کرنے کی صلاحیت بھی اس سے چھن جاتی ہے۔

کمپیوٹر کے اس دور میں تعلیم کی اہمیت سے امیر غریب، عالم، جاہل سبھی واقف ہیں۔ آبائی پیشوں کو خیرباد کرکے بچے اعلیٰ ڈگریوں کے حصول میں کوشاں ہیں لیکن بعض خبطی جن کی جاگیریں تو چلی گئیں لیکن خود کو جاگیردار کہلوا کر گھمنڈ میں مبتلا رہتے ہیں۔ حصول تعلیم کو باعث تحقیر سمجھتے ہیں۔ ایک صاحب جنھوں نے اپنی زندگی کی آدھی سے زیادہ بہاریں دیکھ لیں، بفضل تعالیٰ نصف درجن بچوں کے باپ ہیں، اتفاق سے ان پڑھ ہیں۔ ہم نے ورغلا کر انھیں ایک ادارے میں شریک کروا دیا۔ ان کے خاندان والوں کو پتہ چلا تو بہت بھڑکے، ایک خاتون نے یوں تنبیہ کی:

"آج تک ہمارے خاندان میں کوئی پڑھا ہے؟ ہمیں یوں لگا جیسے وہ پوچھ رہی ہوں، آج تک ہمارے خاندان میں کسی نے چوری کی ہے؟"

ڈینگ باز آدمی یہ بالکل نہیں سوچتا کہ وہ کچھ کہہ رہا ہے۔ اس میں کتنا مبالغہ ہے۔ کتنی بکواس ہے۔

ایسے ہی ایک شیخی خور کا ذکر ہے جو اپنے زمانۂ طالب علمی کے بارے میں فخریہ سناتے پھرتے ہیں ہم اور اسکول مضحکہ خیز بات ہے ہم تو جانے کے بجائے دوستوں کے پیسوں سے ہوٹلوں میں موج اڑاتے تھے۔ اس عمر کو پڑھنے لکھنے میں کون برباد کرتا۔ نتیجہ یہ کہ یہ صاحب برسوں بے روزگار رہ کر ہندوستان سے باہر چلے گئے۔ اب انھیں کے خط سے معلوم ہوا کہ وہاں بہت بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ ثبوت کے لیے انھوں نے دو تصویریں بھجوائیں۔ ایک میں سفید لباس پہنے ٹھاٹ سے موٹر میں بیٹھے ہیں۔ دوسری میں موٹر پر ہاتھ رکھے کھڑے ہیں۔

موٹر کے مالک کا کہنا ہے کہ وہ سال میں چار جوڑ کپڑے ان کے لیے سلواتا ہے تاکہ صاف ستھرا

ڈرائیوران کے آگے ہو۔

ان کا امتیازی نشان ڈالر ہے۔ وہ ہندوستان آنے کے بعد جہاں بھی ملاقات کے لیے جاتے ہیں۔ جیب میں ڈالر رکھ کر جاتے ہیں اور انھوں نے اپنے بچوں کو سکھا رکھا ہے کہ کسی کے گھر جاتے ہی ڈالر دیکھنے کی ضد کریں۔ وہ اپنی گھڑی کا الارم بجاتے ہیں۔ یہ اشارہ پاتے ہی بچے بضد ہو جاتے ہیں۔ اس پر وہ بناوٹی غصے سے کہتے ہیں میں تم لوگوں کو کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ یہ حرکت اچھی نہیں مگر تم نامعقول لوگ باز نہیں آتے۔ یہ کہتے ہوئے وہ جیب سے 555 سگریٹ کی ڈبیہ نکال لیتے ہیں۔!

ایک بچہ پیٹھ پر جھولتا ہے۔ دوسرا جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہتا ہے۔ ڈیڈی! بتائیے نا ڈالر۔ اس پر وہ شان سے ڈالر نکالتے ہیں۔ پھر سوال ہوتا ہے۔ ڈیڈی! وہاں کا نوٹ کیسا ہوتا ہے؟۔۔۔ وہ باقاعدہ تیار ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور بیرونی کرنسی ایک طرف رکھ کر دوسری طرف سو کا نوٹ رکھ کر کہتے ہیں دیکھو! دونوں ممالک کی کرنسی کا فرق۔

یہ صاحب ڈینگ مارنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ایک دن کہنے لگے۔ میرا ایک بچہ جو تین مرتبہ ساتویں جماعت میں فیل ہو چکا ہے ضد کر رہا ہے کہ اس دفعہ تیسرے درجے میں بھی کامیاب ہو جائے تو اسے ویسپا دلائی جائے۔ پھر کہنے لگے۔ اب آپ ہی اسے سمجھائیے۔ کل تک وہ لونا مانگ رہا تھا آج ویسپا کا مطالبہ کر رہا ہے۔ ہم نے سنجیدگی سے مشورہ دیا۔ آپ نتیجے کا انتظار کیے بغیر لونا دلا دیجیے۔ فیل ہونے کی پرواہ مت کیجیے ورنہ وہ کل ہیلی کاپٹر مانگے گا۔

ایک لڑکا جس نے L C E میں تین چار مرتبہ ریکارڈ توڑ ناکامی حاصل کی ہے خود کو انجنیئر کہلوانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ حد یہ کہ وہ نامی گرامی انجینئروں اور آرکیٹکٹس کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ جس طرح خود غرض اور حاسد خواتین بنے بنائے، خوش حال گھروں میں پھوٹ ڈال کر افراد خاندان کو الگ کرتی ہیں۔ اسی طرح یہ خود ساختہ ماہر فن عمدگی سے بنائی گئی عمارت کے مختلف حصوں کو توڑ کر بنانے یا بنوانے کا مشورہ دے کر خوش ہوتا ہے۔

خواتین بھی اس فن میں حضرات سے کچھ کم نہیں۔ ایک صاحبہ اپنے نو دولتیے بیٹے کے بنائے ہوئے شان دار فلیٹ کا ذکر کر رہی تھیں۔ لاکھوں روپیے سے بنے ..... ، سجے سجائے مکان ہم نے بھی دیکھے ہیں۔ لیکن انھوں نے جو نقشہ پیش کرنا شروع کیا۔ وہ بالکل نادر تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ میرے بیٹے نے فلیٹ بنوایا ہے۔ اس کی لاگت کے بارے میں، میں کچھ نہیں کہتی اس لیے کہ آپ یقین نہیں کریں گی۔ بس صرف اتنا بتانا کافی ہے کہ اس گھر کا ایک ایک باتھ روم سات لاکھ کا ہے۔ ہم نے کہا یقیناً دیواروں میں ہیرے جڑے ہوں گے۔ وہ کہنے لگیں۔ ایسی بات نہیں۔ اس میں کارپٹ ہی پچاس پچاس ہزار روپے کے ہیں۔ ان کی بات کو کاٹتے ہوئے ہم نے انھیں مشورہ دیا:

باتھ ٹب میں سے کارپٹ اٹھوا دیجیے، بھیگ رہے ہیں۔

بعض لوگ ایک عجیب قسم کے احساس میں مبتلا رہتے ہیں۔ اسے احساس کم تری کہہ سکتے ہیں یا برتری بھی۔ بلکہ بے حسی کہیں تو زیادہ موزوں ہوگا۔

ایک ہندوستانی گھرانہ جس کی مادری زبان اردو ہے، انگریزی زبان اس کی بہت بڑی اور بری کمزوری ہے۔ اس گھر کے ہر فرد کے بارے میں یہی بات مشہور ہے کہ وہ انگریزی کا ماہر ہے۔ اس گھر کا ایک لڑکا دسویں جماعت کامیاب ہے۔ انھیں کی زبانی سنا کہ انگریزی میں اس کی قابلیت اتنی زیادہ بڑھی ہوئی ہے کہ وہ بی اے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا سکتا ہے۔ ماں باپ شاکی ہیں کہ ہندوستان میں اس کی قدر نہیں۔ اس لیے امریکہ کے لیے پر تول رہا ہے۔

اس خبط اور ڈینگ بازی نے انھیں کہیں کا نہیں رکھا۔ لڑکی کی شادی کی بات چل رہی تھی۔ لڑکے کے بارے میں دریافت پر پتہ چلا کہ شرابی اور جواری ہے۔ ہم نے مشورہ دیا کہ لڑکی کی زندگی اور اس کے مستقبل کا معاملہ ہے۔ ایسے لڑکے سے رشتہ ہرگز طے نہ کریں۔ والدہ صاحبہ نے کہا۔ ہاں ہم نے معلومات لی ہیں۔ لڑکا واقعی شرابی ہے۔ کبھی کبھی جوا بھی کھیل لیتا ہے۔ لیکن اس کی انگریزی بہت اچھی ہے۔ ایسے لڑکے ملتے کہاں ہیں۔

بہرحال دھوم دھام سے، ڈیڑھ لاکھ روپے میں اس لڑکے کو خرید لیا گیا۔ معلوم ہوا۔ لڑکی کے والدین بہت خوش ہیں کہ ان کی لڑکی مار اور گالیاں دونوں انگریزی میں کھا رہی ہے۔ انھیں اس بات کا بھی اطمینان ہے کہ اس جوڑے کی اولاد انگریزوں کے بھی کان کاٹے گی۔

مختصر یہ کہ ڈینگ باز سے ایک عام آدمی بر نہیں آسکتا۔ اس کا منہ ایک ایسا ڈینگ باز ہی بند کر سکتا ہے جو اس فن میں اس کا استاد ہو۔

ڈینوسار

اقبال شانہ

(مشہور امریکی فلم جراسک پارک کے ڈینوسار کی نذر)

ایکٹر بن گیا ہے ڈینوسار — ہینڈسم لگ رہا ہے ڈینوسار
میں نے فلموں میں اس کو دیکھا ہے — مغلِ اعظم بنا ہے ڈینوسار
اس طرح کر رہے ہو تعریفیں — جیسے اپنا چچا ہے ڈینوسار
چار دن تک پکا ہے دیگوں میں — مشکلوں سے گلا ہے ڈینوسار
اپنی مادہ سے عشق کرتا ہے — اور بہت باوفا ہے ڈینوسار
اب زمیں پر نشاں نہیں باقی — چاند پر اُگ رہا ہے ڈینوسار
میرے نانا نے اس کو پالا تھا — ساتھ ان کے پلا ہے ڈینوسار
جب سے شانہ غزل سنائی ہے — خواب میں آرہا ہے ڈینوسار

غزل

اقبال شانہ

عقد اپنا ابھی ہوا بھی نہیں — اپنے گھر میں کوئی بلا بھی نہیں
ہیں ابھی سے تمھارے یہ تیور — میں تو شوہر ابھی بنا بھی نہیں
دیکھ کر حسن کو ہوش اڑتے ہیں — ہوش اس کو مگر ذرا بھی نہیں
زندگی گھورتی کٹی جس کو — میری جانب وہ دیکھتا بھی نہیں
خط میں کیا خاک یار کو لکھوں — یاد اس کا مجھے پتہ بھی نہیں
آؤ تجدیدِ عاشقی کر لیں — دل میں اب کوئی دوسرا بھی نہیں
اپنا پنکھا عجیب ہے یارو — گھومتا ہے مگر ہوا بھی نہیں
تم نے پھینکا ہے مجھ پہ جو بیلن — وہ مرے جسم کو لگا بھی نہیں
اس زمانے سے فائدہ کیا ہے — جس میں انساں کوئی مرا بھی نہیں
کوئی میرا نہیں قصور مگر — مجھ کو حسرت ہے آپ کا بھی نہیں

میزباں گھورتا ہے یوں مجھ کو
جیسے شانہ کو جانتا ہی نہیں

ڈاکٹر بانو سرتاج
(چندر پور، مہاراشٹرا)

بُری نظر والے تیرا منہ کالا

ہماری موجودہ پڑوسن کی عظیم ہستی نے ہمیں محافظ یعنی دربان یعنی چوکی دار کی فکر سے آزاد کر رکھا ہے۔ اول تو ان کے فلک شگاف قہقہے ایک کلومیٹر کے دائرہ کار میں کسی چور اچکے کو پھٹکنے نہیں دیتے۔ دوسرے ان کی چوکس نظروں سے بچ کر کوئی غلط آدمی ہمارے گھر میں داخل نہیں ہو سکتا۔ دن رات کے چوبیس[؟] میں سے جن گھنٹوں میں وہ سوتی ہیں ان میں بھی، ہمارا خیال ہے کہ وہ ہمارے بنگلے کے پھاٹک پر آنکھ نہیں تو کان ضرور لگائے رکھتی ہیں۔

ہمارا ان کا semi twin یعنی جڑواں بنگلہ ہے۔ ایک طرف وہ، ایک طرف ہم۔ وہ اپنے ڈرائنگ روم میں دروازے کے سامنے کچھ اس اینگل سے کرسی ڈال کر بیٹھتی ہیں کہ کمرے میں رکھے ٹی وی کے پروگرام بھی دیکھے جا سکیں اور سر تھوڑا اونچا کر کے جھانکنے پر ہمارے آنگن کا پھاٹک بھی دکھائی دیتا ہے۔

کچھ لوگوں کو خصوصاً عورتوں، عورتوں میں بھی گھریلو عورتیں، گھریلو عورتوں میں بھی وہ جنھیں کوئی خاص مصروفیت نہیں ہوتی پڑوسی کے گھر میں تاک جھانک کرنے، دوسروں کے گھر کی رتی رتی خبر رکھنے جیسے دال میں لہسن کا بگھار لگا کہ زیرے کا...... وغیرہ، وغیرہ جاننے میں خاص دل چسپی ہوتی ہے۔ یہ خواتین ملازمت کرنے جاتی ہیں نہ گھر میں سلائی، کڑھائی، بنائی کرتی ہیں۔ مطالعہ تو بالکل بھی نہیں کرتیں۔ بس شوہر کے اندیشے میں دبلی ہوتی رہتی ہیں۔ گھر کا کام ملازمہ کی مدد سے پشتم پشتم نپٹا کر ٹی وی کے سامنے جم جاتی ہیں۔

ٹی وی نے آج کل اس طرح کی خواتین کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے رکھا ہے مگر دن میں پورے بارہ گھنٹے تو ٹی وی نہیں دیکھا جا سکتا۔ (ایک تو پروگرام اچھے نہیں بھی ہوتے ہیں) پھر کیا کریں۔ ہمارے متوسط طبقے کے گھروں کی خواتین؟ کوئی ہابی کوئی مشغلہ تو ہونا چاہیے۔ پڑوسی کی خیر خبر رکھنا پڑوسی دھرم کے عین مطابق ہے.... ہماری پڑوسن اس بات کا خاص خیال رکھتی ہیں۔

ہمارے پڑوس میں بھوتیا خاندان رہتا ہے۔ مسٹر، مسز دھر بھوتیا، لینڈ سروے ڈیپارٹمنٹ

میں ملازم ہیں اور عموماً دورے پر رہتے ہیں۔ تین میں سے دو بچے اپنی نانہال میں رہ کر پڑھائی کر رہے ہیں۔ ایک والدین کے پاس ہے مگر زیادہ وقت مٹرگشتی میں گزرتا ہے۔ شریمتی بھوتیا کچھ نہیں کرتیں (ہمارا مطلب کام سے ہے) مگر گہرائی سے دیکھا جائے تو بہت کچھ کرتی ہیں۔ (ہماری نیند چین حرام کرنے سے ہماری جاسوسی کرنے تک)

شریمتی بھوتیا کی شناخت ان کی کھنک دار اور پاٹ دار آواز ہے۔ ہمیں ان کے پڑوس میں رہتے ہوئے دو مہینے ہی گزرے تھے کہ ہمارے پھاٹک پر ان کی آواز کا اثر پڑ گیا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ اس متعدی مرض سے ہم، ہمارے شوہر اور بچے محفوظ رہے۔

ہمیں جو سرکاری بنگلہ الاٹ ہوا تھا وہ دراصل ان افسران کے لیے ہے جو با کار ہوتے ہیں۔ کار یا جیپ سرکاری ہو یا غیر سرکاری اُسے پورچ تک جانے کے لیے اس دروازے سے بڑا ایک گیٹ درکار ہوتا ہے۔ جتنا انسانوں کی آمد و رفت کے لیے چاہیے۔ مشکل یہ تھی کہ بڑا پھاٹک تو موجود تھا۔ ہمارے بنگلے میں مگر آمد و رفت کے لیے کوئی ذیلی دروازہ نہیں بنایا گیا تھا۔ بے کار لوگوں کو پھاٹک ہی کا استعمال کرنا پڑتا تھا۔ ہم نے گیٹ کے ایک حصے کو ایک بڑا پتھر لگا کر روک دیا۔ آدھا گیٹ کافی تھا آنے جانے کو۔

گیٹ تھا سرکاری بنگلے کا۔ چولیں ہلی ہوئیں، نٹ بولٹ ڈھیلے۔ کھولتے بند کرتے پر پُر شور آواز کرتا ہوا اپنی بیٹر ہاف سے جا گلے ملتا۔ ہم نے شوہر محترم سے کہا کہ ذرا علاج کروائیں تا کہ آواز کرنا بند کر دے۔ وہ بولے رہنے دو۔ تھوڑے دنوں میں عادی ہو جاؤ گی۔ مسٹر بھوتیا اپنی بیگم کی آواز کے عادی نہیں ہوئے ہیں؟ یہی پھاٹک فتنے کی جڑ تھا۔ ماہر نفسیات اسکنر (SKINNER) کی تھیوری خدا جانے شریمتی بھوتیا نے پڑھی ہے یا نہیں مگر اس تھیوری میں گھنٹی کی آواز کا چوہے کی غذا سے جو تعلق ہے وہی تعلق پھاٹک کھلنے کی آواز کا شریمتی بھوتیا کے تجسس سے قائم ہو گیا۔ (اسکنر کی Reinforcement theory کے شریمتی بھوتیا سے تعلق پر بآسانی ریسرچ کی جا سکتی ہے)..... ہم بتا رہے تھے کہ ادھر ہمارے مکان میں داخل ہونے کے لیے کسی نے پھاٹک کھولا ادھر انھوں نے جھانک کر دیکھا کہ کس کی تشریف آوری ہو رہی ہے..... ہمارے ملاقاتیوں پر ان کی خصوصی نظر ہوتی۔ صرف نظر رکھتیں تو کوئی بات نہ تھی۔ رکھنے والے تو آسمان پر نظر رکھتے ہیں۔ مگر شام تک ان کا پیٹ پھول جاتا اور وہ ہم سے ہمارے ملاقاتیوں کا شجرۂ نسب جاننے کو بے تاب ہو جاتیں۔ ہم شام میں پودوں کو پانی دینے آنگن میں نکلتے کہ وہ ہمیں گھیر لیتیں۔

"بھابی جی، ..... وہ نیلی شرٹ والا کون تھا؟ میں نے پہلے کہیں انھیں دیکھا ہے۔"

"آپ نہیں جانتیں انھیں۔ وہ اس شہر کے نہیں ہیں" ہم بے اعتنائی دکھاتے۔

"وہ شوخ رنگوں کی ٹائی والا سیلز مین تھا کیا؟ کوئی پون گھنٹہ بیٹھا وہ اندر۔ کیا خرید آپ نے؟"

"مراد آبادی برتن کا سیلز مین تھا۔ ہمیں کوئی چیز پسند نہیں آئی۔" ہم ٹال دیتے۔

وہ ہمت نہ ہارتیں، دُگنے جوش سے اپنا ہی ریکارڈ شروع کر دیتیں۔

"ڈی ایس پی صاحب کی مسز آپ کے گھر چوتھی دفعہ آئی ہیں۔ میں نے کتنی مرتبہ انوائٹ کیا مگر میرے

گھر نہیں آئیں ..... اچھا ..... "اچھا ..... "وہ الف کو کافی لمبا کھینچتی ہوئی حیرت کا اظہار کرتیں۔ "وہ آپ کا طالب علم تھا؟ مٹھائی لے کر آیا تھا شاید ..... ہاں وہ انگور بڑے پیکٹ میں کیا تھا جو ضلع مجسٹریٹ کا چپراسی آپ کو دے گیا ہے ..... انگور بہوں گے۔ وہ ناسک کے، ہمیں تلتے۔ آج آپ کے ہاں ایک بھی وزیٹر نہیں آیا، کمال ہے!

ہم ہوں ہاں کرتے جاتے۔ ناگوار تو بہت گزرتا تھا مگر ان سے کہتے تو کیا کہتے؟ ..... وہ کہہ دیتیں، میں اپنے گھر میں بیٹھ کر کیا کرتی ہوں اس سے آپ کو مطلب!! آپ کو تکوں، آپ کے پھاٹک کو تکوں! آپ کون ہوتی ہیں اعتراض کرنے والی؟ ..... ہم کو اور پھاٹک کو تو چھوڑیئے، اگر وہ ہمارے شوہر کو بھی اپنے گھر میں بیٹھ کر تکتیں تو ہم اعتراض نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے کبھی کیا بھی نہیں۔

ایک روز ہمارا چھوٹا بھائی ہم سے ملنے آیا۔ باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ ان کی کالونی میں دن دھاڑے ایک قتل ہو گیا ہے۔ ہم نے فوراً کہا ..... "خدا نہ کرے، کبھی ہمارے ساتھ ایسا حادثہ گزر جائے تو قاتل فوراً پکڑا جائے گا۔

بھائی تو ہمیں ایسے منحوس الفاظ منہ سے نہ نکالنے کا کہہ کر خاموش ہو گیا مگر ہمارے شوہر نے پوچھا ..... "کیسے؟ کیسے پکڑا جائے گا قاتل؟

ہم نے کہا "پولیس تحقیقات کا آغاز کرے گی۔ پڑوسیوں سے۔ شریمتی بھوتیا ہمارے پاس اس روز آنے والے تمام وزیٹرس کی مکمل فہرست مہیا کرا دیں گی ..... یہی نہیں، یہ بھی بتا دیں گی کہ کون کتنی دیر ہمارے پاس ٹھہرا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ وقت کا تعین کرے گی اور قاتل گرفت میں آ جائے گا۔"

بھائی نے شریمتی بھوتیا کے بارے میں تفصیل سے جانتے ہی کہا "میں کل ان کو ایک ڈائری تحفے میں دوں گا۔"

"کیوں؟"

کیوں کیا؟ بے چاری کتنی محنت کرتی ہیں۔ کہوں گا 'ہماری باجی کے وزیٹرس کے نام اور حلیے یاد رکھنے میں آپ کے ذہن پر بار پڑتا ہوگا۔ ایسا کریں ڈائری میں نوٹ کر لیا کریں۔ ..... پروفارما بھی بنا دوں گا۔ ——— ملاقاتی نمبر ۱ آمد نو بج کر دس منٹ۔ حلیہ: لمبا قد گیہواں رنگ، کھڑی پیشانی، بیٹھی ناک، سفید لباس، کالے جوتے۔ ہاتھ میں بریف کیس۔ ملاقات کا وقفہ: پندرہ منٹ ..... ڈیپارچر نو بج کر پچیس منٹ۔

اس وقت تو بات آئی گئی ہو گئی مگر دوسرے دن شوہر محترم کے آفس جاتے ہی اسے شرارت سوجھی بولا "باجی، آج دوپہر بھر شریمتی بھوتیا کو سونے نہیں دوں گا۔" ہم نے کہا وہ سوتی کب ہیں۔ ہماری نگرانی کرتی بیٹھتی ہیں۔" اطمینان سے بولا۔

بیٹھنے بھی نہیں دوں گا۔ سبق سکھاتا ہوں انھیں۔"

ہم نے دریافت کیا "کیا کرو گے؟"

بولا۔ دیکھتے جائیے۔"

اس نے ایک لمبا باریک تار پھاٹک سے باندھ کر دوسرا سرا ڈائننگ روم کی کھڑکی سے گزارا اور ہاتھ میں

لے کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد تار زور سے کھینچا۔ پھاٹک زوردار آواز کے ساتھ کھل کر بند ہو گیا۔ شریمتی بھوتیا نے جھانک کر دیکھا۔ کوئی نظر نہ آیا۔ مایوس ہو کر بیٹھ گئیں۔ تار کھینچا ..... آواز ہوئی۔ تاک جھانک ہوئی ..... مایوسی ..... پھر پھاٹک کھلا، بند ہوا ..... آواز ہوئی ..... ناامیدی ..... دو گھنٹوں تک یہ کھیل چلا۔ حیرت کی بات تو یہ ہوئی کہ ان دو گھنٹوں میں کوئی ملاقاتی ہمارے مکان پر نہیں آیا۔

شام کو دن کے آتے ہی ہم پودوں کو پانی دینے نکلے۔ بھائی ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ شریمتی بھوتیا اپنی سیڑھیوں پر وارد ہوئیں ..... "بھائی جی، آج تمام دن آپ کا پھاٹک ....."

ہم نے قطع کلام کر کے بتا دیا کہ ہمارا یہ شرارتی بھائی کھیل کر رہا تھا۔

"مگر کیوں؟ یہ کیسا کھیل تھا؟" وہ کچھ حیرت، کچھ ناراضگی سے بولیں۔

جواب دیا ہمارے بھائی نے "آنٹی ..... کھیل کھیل ہوتا ہے۔ ہمارا پھاٹک ہے۔ ہم دن میں چاہے سو بار ہلائیں۔ کوئی اس طرف دھیان کیوں دے؟ دھیان دے گا تو ہم کہیں گے۔ بری نظر والے، تیرا منہ کالا"

کہنا نہ ہو گا کہ شریمتی بھوتیا نے آج کل دروازے (ان کے) میں کرسی ڈال کر بیٹھنا موقوف کر دیا ہے۔ کھڑکی سے بھی نہ جھانکتی ہوں اس بابت ہم پُر یقین نہیں ہیں۔ بری عادتیں دیر سے چھوٹتی ہیں نا۔

مانک ٹالہ
(بمبئی)

تونگر حاجت مند

دولت متحدہ برطانیہ عظمیٰ کہ جس کی سلطنت میں کبھی سورج غروب نہ ہوتا تھا، اب وہاں کبھی کبھار ہی
...... سورج دیوتا کے درشن نصیب ہوتے ہیں۔ پہلے زمانوں میں بھی وہاں طوفان
بادو باراں اپنا ڈیرا ڈالے رہتے تھے۔ لیکن ان وقتوں میں موسم کی خرمستیوں کے باوجود خواص و عوام اپنے اندر ایک
ناقابلِ بیان قسم کی طمانیت کا احساس کیا کرتے تھے کہ ان کی زیرِ نگیں نوآبادیوں سے مال و دولت اور ہیرے،
جواہرات کی برسات ہوا کرتی تھی۔ یہ لوٹ کے ہیرے جواہرات شہنشاہوں اور ان کی ازواج کے بیش قیمت تاجوں
اور گراں بہا زیورات کی زینت بنتے رہے۔ اس قوم کے بنیاپن کی حد یہ ہے کہ پہلے تاجرین کر ہم سے اور ہمارے
ملک اور ملک ہتھیاتے رہے اور اب ہم سے چھینے ہوئے ہیرے جواہرات کے تاجوں اور زیورات کی نمائش لگا کر
ٹکٹوں کی صورت میں لاکھوں پاؤنڈ روزانہ وصول کر کے اپنے خزانے بھر رہے ہیں۔ لیکن ہم جیسے جہلا ٹاور آف لندن
کے قلعے میں لمبی لمبی قطاریں لگا کر بڑی بڑی رقوم کی ٹکٹیں خرید کر ان کا دیدار کر کے خوش ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ خوش
ہونے کا نہیں بلکہ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ اس قلعے سے ملحق دریائے ٹیمز بھی بہتا ہے لیکن آج تک کسی ماں کے لال
نے ڈوب مرنے کے لیے چلو میں پانی نہیں بھرا۔

اگرچہ وہاں کے موسم میں اب بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی لیکن دولت کی بارش بند ہو جانے سے وہاں کے
عوام الناس کو موسم میں کچھ زیادہ ہی شدت کا احساس ہونے لگا ہے۔ اس شدت سے برطانیہ کی ملکہ عالیہ بھی شدید طور
طور پر متاثر ہوئی ہیں۔ ایک طرف ناخلف ولی عہداور بے لگام بہو سربازار لکھنو کے کنجڑیوں کی طرح تو تکار کر رہے
ہیں اور دوسری طرف ان کا ایک نہایت ہی عزیز اور گراں قدر محل ونڈسر پیلیس، سن بانوے میں نذرِ آتش ہو گیا۔
خدائے بخشندہ ملکہ معظمہ کو نظرِ بد سے محفوظ رکھے!

اس محل کی تعمیر نو بھی گرانی بہت ضروری تھی کیوں کہ یہ عزت اور ... کا سوال تھا۔ لیکن بے چاری ملکہ کی
چارہ جوئی کے لیے کسی مردِ میدان نے مدد کا ہاتھ نہیں بڑھایا۔

آخر بڑے تذبذب اور دماغ سوزی کے بعد ملکہ معظمہ کو ایک طریقہ سوجھا ـــــ لندن میں ان کا رہائشی محل بکنگھم پیلس ہے۔ جو صرف چھ سو کمروں پر مشتمل ہے۔ ہر مجسٹی نے دل ہی دل میں آٹھ آٹھ آنسو بہاتے ہوئے، اس کے آٹھ آٹھ یعنی کل سولہ کمروں کے دیدار کے لیے آٹھ پاونڈ فی نفر کے حساب سے پانچ سال تک لیکن ہر سال دو ماہ کے لیے عوام الناس کے لیے دروازے کھول دیئے ہیں۔ اس طرح پونڈ پونڈ کر کے سمندر بھرے گا اور ساڑھے تین کروڑ پاونڈ (دو سو کروڑ روپیہ محض) اکٹھا کر کے ونڈسر پیلس کی تعمیر کی جائے گی۔

بہت پہلے جب شاہ فاروق مصر کی سلطنت پر حکومت فرمایا کرتے تھے ـــ حکومت کیا فرماتے تھے، برطانیہ اور فرانس کے ہاتھوں میں پتے دے کر رمی کی بازی کھیلا کرتے تھے ـــــ تو ایک روز اعلیٰ حضرت نے وسکی کے ٹب میں ڈبکی لگا کر پیشین گوئی فرمائی کہ دنیا میں صرف پانچ بادشاہ بچ رہیں گے ـــ ایک برطانیہ کا اور باقی تاش کے ـــ اس پیشین گوئی کی گونج ابھی فضاؤں کے چکر ہی کاٹ رہی تھی کہ جنرل نجیب نے انہیں تاش کی گڈی میں دھکیل کر مصر کی حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ اب کے محل کی شان و شوکت اور جاہ و جلال دیکھنے کے لیے عوام و خواص ٹکٹ خرید کر آتے ہیں۔ اس محل میں ملکی اور غیر ملکی فلم کمپنیاں بھی شوٹنگ کی غرض سے آتی ہیں۔ اسی محل سے ملحق ان کا ذاتی کلب جس میں امرا و وزرا اور خاص الخاص مہمانوں کے ساتھ ظلِ سبحانی موج، مستی اور خرمستی فرمایا کرتے تھے۔ آج کل وہ کلب بھی عوام و خواص کے لیے کھل گیا ہے۔ اس طرح حکومتِ مصر کے خزانے بھی بھرپور رہنے لگے۔

برطانوی سرکار کے زیر سایہ ہمارے ملک کی دیسی ریاستوں کے راجے مہاراجے، شاہ و نواب بھی شاہ فاروق کی کاربن کاپی تھے۔ ان کے رن واسوں اور حرموں میں انواع و اقسام کی دیسی اور دساوری رانیوں اور بیگمات کی بھرمار رہتی تھی لیکن جب برطانوی سرکار کے لیے آسمان دور اور زمین تنگ ہوگئی تو وہ بھی انہیں آتش زیر پا چھوڑ کر اپنے دیس کو سدھاری ہوگئی۔

ان دیسی ریاستوں کی بھی عجیب داستان ہے۔ کچھ ریاستیں تو اتنی طویل و عریض تھیں کہ اگر ان کی زیارت کے لیے پیدل چلیں تو ایک چھور سے دوسرے چھور تک پہنچنے کے لیے مہینوں لگ جائیں لیکن کچھ ریاستیں ایسی بھی تھیں کہ جن کا سارا حدود اربع ہاتھی کے پاؤں میں سما جاتا تھا۔

ہماری مدبرانہ سرکار نے انھیں طرح طرح سے بھرما کر باقی ملک کے ساتھ ملا دیا۔ عوض معاوضے میں پیار محبت کے علاوہ ان سب کے لیے پانچ کروڑ روپیہ سالانہ کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ ان کے لیے انکم ٹیکس سمیت سبھی ٹیکس معاف کر دیئے۔ ان کے محل ماڑیوں، رن واسوں اور حرموں کو نہ چھونے کا وعدہ بھی کر لیا تاکہ ان کے عیش و عشرت اور خرمستیوں میں کسی قسم کا خلل نہ پڑے۔ کچھ بڑی بڑی ریاستوں کے مہا مورکھ حکمرانوں کو راج پرمکھ بھی بنا دیا۔ لیکن ان کے اختیارات بس اس قدر تھے کہ ان کا قلم چل تو سکتا تھا لیکن ان کا حکم کسی کا سر قلم نہیں کر سکتا۔

ان بے چاروں نے ہوا کا رخ پہچانا اور جو کچھ ملا سر تسلیم خم کر لیا۔ اس زمانے میں پانچ کروڑ کی رقم بہت بڑی رقم تصور کی جاتی تھی کیوں کہ اس وقت غریبی ہٹانے کے لیے ترقیاتی منصوبوں کے جھکڑ نہیں چلے تھے لیکن کچھ عرصہ بعد اندرا گاندھی کی آندھی چلی تو بے چاروں کے وظیفے ہوا ہو گئے اور غریبوں نے تالیاں بجا بجا کر اپنے ہاتھ لہولہان کر لیے لیکن نہ غریبی ہٹی نہ غریب دور ہوئے۔ اس زمانے میں سالانہ پانچ کروڑ کی بچت ایک بڑا کارنامہ

تسلیم کیا گیا تھا لیکن آج کل چھٹ بھیّے سے چھٹ بھیّا وزیر بھی سال بھر میں پانچ کروڑ بنا لیتا ہے لیکن بے چارہ حکمران طبقہ اپنے محلوں میں پانچ ستارہ ہوٹل کھول کر اپنا پیٹ کا تغار بھر رہا ہے۔

چلیے اب پھر مراجعت فرماتے ہیں دولت متحدہ برطانیۂ عظمیٰ کی جانب ملکہ معظمہ کی حالتِ زار دیکھ کر وہاں کے عوام .. ہاتھوں میں آٹھ آٹھ پاؤنڈ لے کر بکنگھم پیلیس کے سولہ کمروں کا نظارہ کرنے کے لیے بلا دو باراں کے جھکڑوں میں بھی قطار باندھے کھڑے رہتے ہیں۔

ان سولہ کمروں کے اندر جو کچھ نظر آتا ہے اسے دیکھنے کے بعد ایک خفی سا اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے کہ بقایا پانچ سو چوراسی کمروں کے اندر کیا کچھ نہ ہو گا۔ البتہ اس آرٹ گیلری کا ذکر ضرور کرتے چلیں جس میں کچھ نادر آرٹ کے نمونوں کے علاوہ ایک نایاب مجسمہ بھی ہے۔ یہ مجسمہ ہے ایک من موہنی سی عورت کا جو ایک پیارے سے بچے کو انگلی سے لگائے کھڑی ہے۔ یہ مجسمہ ہے ولیم چہارم کی داشتہ کا جس نے اس کی تخت نشینی سے پہلے ہی گیارہ عدد بچے اس کی جھولی میں ڈال دیئے تھے۔ اس نے یہ مجسمہ اپنی محبوبہ کی مادری ممتا کے مظہر کا نمونہ بنا کر پیش کیا تھا۔ سبحان تیری قدرت ——— ! ایک طرف تو یہ حالت تھی اور دوسری طرف شہزادی ڈائنا کی زود رنجی ملاحظہ فرمائیے کہ پرنس چارلس پر سرِ عام بے وفائی کے الزامات اچھال اچھال کر سینہ کوبی فرما رہی ہیں۔ اب انھیں کون سمجھائے کہ اچھی بہو بیٹیوں کے یہ لچھن نہیں ہوا کرتے۔

محل کے باہر خوانچہ فروش بھانت بھانت کے یادگاری تحفے فروخت کرتے نظر آتے ہیں۔ ملکۂ عالیہ کو چاہیے کہ وہ محل کے باہر ان خوانچہ فروشوں کو خرید و فروخت کی ممانعت کر دیں اور محل کے اندر ہی ایک کمرے یا برآمدے میں یادگاری تحفوں کی ایک دکان لگا دیں۔ کیوں کہ محل کے ان سولہ کمروں کے زیارت کرانے کے لیے ایک سو ساٹھ نفروں کی ایک پلٹن پر اس مہنگائی کے زمانے میں نہ جانے کتنی بڑی رقم اڑ جاتی ہوگی۔ تحفوں کی فروخت سے ہونے والی آمدنی ان ملازمین کی تنخواہوں کا وسیلہ بن سکے گی اور اس طرح ونڈسر پیلیس جلد از جلد تعمیر ہو سکے گا۔

غزلیں

سید ولی قادری
(آرکیٹکٹ)
حیدرآباد

اب چھوڑ کے راہِ دیر و حرم عزم درِ میخانہ ہی سہی
اور تو تو ولی ہی کہلایا مشرب ترا رندانہ ہی سہی
اچھی کہیے یا کہیے بُری اس طرزِ روش کو کیا کہیے؟
ہیں ٹھاٹھ تو پورے شاہانہ انداز فقیرانہ ہی سہی
کچھ ایسے بھی ہیں میخانے میں بیہوش نہ رہنا میخوار و!
دشنام بکف جو پھرتے ہیں گھل ملنا یارانہ ہی سہی
ہم لاکھ جفائیں لاکھ ستم سہہ لیں گے بُت کافر کی قسم
پر عشق سے باز نہ آئیں گے سمجھو ہمیں دیوانہ ہی سہی
ساقی کی ہے مجھ پر نظرِ کرم کہتا ہے وہ خود ہی رشکِ صنم
آنکھوں سے پلائیں گے تجھ کو کہیو تو روزانہ ہی سہی
اے زندہ دلانِ شہر ہمیں بھاتا ہے تمہارا طنز و مزاح
باتیں جو پتہ کی کرتے ہیں انداز ظریفانہ ہی سہی

○

یہ دل کیا ہے کیسی دلبری ہے — محبت آج کل سوداگری ہے
خدا جانے دلوں کا حال کیا ہے — لگے ہے یہ تبسم ظاہری ہے
کہیں فاقے کہیں افراطِ زر ہے — کہیں خوشیاں کہیں نوحہ گری ہے
عنایت پر انہی کے جی رہا ہوں — نہیں کچھ کام بس چمچہ گری ہے
مری بپتا کو سن کر کیا کرو گے — غموں کی داستانوں سے بھری ہے
جو طوطا چشم اور اہلِ ہوس ہیں — وہ چرتے ہیں وہیں جس جا ہری ہے
نہیں آساں پرکھنا فی زمانہ — میاں کھوٹی ہے کیا اور کیا کھری ہے
جہاں والو توجہ چاہتا ہوں — غزل میری یہ شاید آخری ہے
نہ خود جاگا نہ دنیا کو جگایا
ولی صاحب یہ کیسی شاعری ہے

ڈاکٹر سید عباس متقی
(حیدرآباد)

بستر

ہماری شادی کو برسہا برس ہوگئے۔ یہ حادثہ کیا پرانا ہوا جہیز میں آئی ہوئی تقریباً تمام چیزیں پرانی ہوگئیں بعض چیزیں فقط یادِ ماضی کے طور پر استعمال میں آجاتی ہیں۔ اور بعض چیزیں تو آثار قدیمہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس لیے کہ ہماری بیگم کے جہیز میں بعض ایسی چیزیں بھی آگئی ہیں جو ان کی والدہ محترمہ کو ان کے والد نے اپنے والد کے سسرال کی نشانی کے طور پر عنایت فرمائی تھیں۔ روزمرہ کے استعمال میں آنے والی چیزوں میں ہمارا ایک بستر بھی ہے جو آج تک ہمارا ساتھ دے رہا ہے اگرچہ کہ وقت کے مد و جزر سے اکثر نبرد آزما بھی رہا ہے۔ ہمارا بستر ہی وہ واحد شے ہے جب ہم اس پر اپنے آپ کو لٹا دیتے ہیں تو موسم بہار سے موسم خزاں تک کی تمام راتیں یکے بعد دیگرے لنگا ہول میں بھر جاتی ہیں۔ اور ہم گنگنا اٹھتے ہیں کہ لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو ـــ ہم نوشہ و عروسہ اور موجودہ صرف میاں بیوی، کئی عدد بچوں کے ساتھ اپنے بستر کی گولڈن جوبلی منانے کا ارمان رکھتے ہیں۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدی ـــ آہ وہ بھی کیا دن تھے، نیا نیا بستر تھا جب ہم نے پہلی دفعہ اس پر خود کو لٹا دیا تھا تو ایسا محسوس ہوا تھا گویا خوابوں کے دلدل میں کود گئے ہوں، ہر طرف نرمی ہی نرمی تھی۔ روئی کے گالوں کی طرح نرمی یا پھولوں کے سیج کی طرح نرمی۔ کتنے پیارے دن تھے پلک جھپکتے یوں گزر گئے۔ اب جوان دلوں کو یاد کرتے ہیں دل کبھی شاد ہوتا ہے کبھی ناشاد ہوتا ہے۔ ایک نارمل زندگی میں شاید کچھ ایسی ہی ابنارمل کیفیات ہوتی ہیں، پیچھے مڑ کے دیکھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ ہم حجرۂ عروسی میں محض داخل ہو کر خارج ہو گئے ہیں بشکر ہے جنت میں ضعیفی نہیں ورنہ لاکھوں برس کی حیات لے کر کیا کرتے۔ بستر کچھ ایسا ہی تھا کہ پڑتے ہی آنکھ لگ جاتی تھی۔ رضائی میں اس قدر گرمی ہوتی کہ اوڑھ کر پنکھا جھلنا پڑتا دسمبر کے کڑکڑاتے جاڑے خود دانت پیستے ہوئے گزر جاتے۔ تکیے اتنے ملائم تھے کہ سر رکھ کر دو تو سرفرازی نصیب ہو جائے۔ کیا میٹھے سپنے دکھائی دیتے تھے۔ اب ان خوابوں کو خوابِ شیریں کہیے یا خوابِ خرگوش، بیدار ہو جانے کے بعد خواب محض خواب ہی تو رہ جاتے ہیں۔ حقیقت بس اتنی ہی ہے لیکن اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے پہلے خواب سے بیدار ہونا پڑتا ہے اور خواب سے بیدار ہو جانا ہر جاگنے والے کا مقدر نہیں۔ ہماری بیگم بھی بڑی سلیقہ مند

خاتون تھیں اب نیم ضعیفی نے انھیں قدرے نکما کر دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مرد عشق کے ہاتھوں اور عورت مالی عشق کے ہاتھوں نکمے پن کا شکار ہو جاتی ہے۔ ورنہ دودھ جیسے غلاف اور غلاف پر کڑھا ہوا خوابوں سے متعلق دل کش شعر، شعر کے اطراف بیل بوٹے اور جھالر کا تو جواب نہ ہوتا۔ واہ کیا تکیے تھے ہم تو ان پر تکیہ کرنے کو اپنا نکاحی حق متصور کرتے تھے۔

بستر بھی عجیب شئے ہوتا ہے۔ آدمی خواہ تمام چیزوں سے بے نیاز ہو جائے لیکن بستر سے بے نیازی اس کا مقدر نہیں۔ شاید وہ پیدا ہی بستر پر ہوا ہے۔ اور شاید مرے گا بھی تو بستر ہی پر، میدان جنگ میں مرنے کا ارمان اب مردوں میں کہاں، صورت معشوق پر ہی مرتے رہیں غنیمت است ورنہ لوگ اب صرف زندگی کے لیے مرتے ہیں۔ جس طرح ایک آدمی کے کئی روپ ہوتے ہیں بعینہٖ بستر کے بھی کئی روپ ہوتے ہیں۔ امراء کے بستر الگ، غرباء کے بستر الگ، جہلا کے بستر الگ، علماء کے بستر الگ۔ جب ہم امراء کے بستر دیکھتے ہیں تو ان کی دولت و ثروت پر رشک گزرنے لگتا ہے اور جب علماء کے بستر دیکھتے ہیں تو ان کے علم و فضل پر رشک آنے لگتا ہے۔ واقعی تعلیم و توفیق میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ اتفاقاً ہمیں ایک علامہ کی خواب گاہ میں باریابی کا موقع نصیب ہوا جس کی سجاوٹ اور طمطراق دیکھ کر مغلِ اعظم کے سیٹس یاد آ گئے۔ یا للعجب ٹاٹ کی گفتگو کرنے والے بھی کس ٹھاٹھ سے رہتے ہیں۔ یو فوم کے گدوں پر مخملی بستر اور جھالر دار تکیے، اسکرین ٹائپ چھپر دان، سرہانے خوبصورت بڈلمپ باندتیے دور کا ہاتف "ٹیلیفون" سیدھی جانب چھوٹی الماری جس میں ادبی اور غیر ادبی لٹریچر، اس کے داہنی جانب اسٹریو ٹیپ ریکارڈ اور اس کے اوپر پاکستان کی مشہور گلوکارہ کے تمام ہی کیسٹس۔ ادھر رخ کیجیے تو A.H.M.D.5 . T.V. اب ہم نے غور کیا کہ آخر موصوف نے اونیڈا ہی کا انتخاب کیوں کیا شاید اپنی ذات میں اور اس کے اشتہار میں کوئی دور کی مناسبت پاتے ہیں۔

غریبوں کا بستر کوئی لائق ذکر شئے ہے نہ اس کا سر نہ پاؤں، کبھی یہاں پڑ گئے کبھی وہاں۔ گرما تو ان کے بستر پر زیادہ مہربان نہیں ہوتا لیکن برسات اور جاڑوں کے موسم ان پر نہایت مہربان ہوتے ہیں۔ کچھ اس انداز سے ان کا مزاج پوچھتے ہیں کہ حکومت کو ان کا مزاج پوچھنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ ان کا بستر ان کے بستر کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ نہ دستر پر گوشت نہ بستر پر پوست، محض ہڈیاں ہیں کہ چٹختی رہتی ہیں اور چیخ چیخ کر قومی ترانہ سناتی ہیں۔ مائیں اپنے نونہالوں کو اپنے سینے سے چپکائے برسات بِتا دیتی ہیں تو باپ ٹپکوں کے طفیل جاگ جاگ کر ساری رات گزار دیتا ہے۔ ایک مزدور کو دیکھا گیا کہ وہ دعا کر رہا تھا اے خدا تو راج بھون، نیلایم اور راج محل جیسی عمارتوں کو ٹپکوں سے محروم رکھ۔ ہمیں حیرت ہوئی کہ یہ غالب کی زبان میں بددعا کر رہا ہے۔ شاید اس کے خیال میں یہ رہا ہو کہ معدوم چھت ہی ٹپکوں سے محروم ہو سکتا ہے گویا نا مہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں۔ بڑے تو مشکلات حیات سے شعوری نبرد آزمائی اختیار کرتے ہیں۔ مگر بچے بچے ہوتے ہیں نہ آفات سماوی سے واقف نہ سیاسی بلیات سے خبردار، آرام سے سو رہتے ہیں اور بعض دفعہ اس درجہ آرام سے سو رہتے ہیں کہ حضرت اسرافیلؑ ہی ان کے آرام میں خلل ڈال سکتے ہیں۔ تاہم غرباء و مساکین کو ایسی ابتلائے گیتی کے باوجود نیند کی گولیاں کھانے کی نوبت نہیں آتی۔ یہ آرام سے اخبار بچھا کر سو رہتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک

اخبار پڑھنے سے زیادہ بچھانے کی چیز ہے۔ لوگ منور رانا کے اس خیال سے اتفاق نہ کریں تب بھی ان مزدوروں کو ان کی میٹھی نیند سے ان کا اختلاف جگا نہیں سکتا۔ اور پھر مزدوروں کو جگانے کی ہمت بھی کون کرے، سبھی واقف ہیں کہ درحقیقت انہیں سورہنا چاہیئے اگر یہ جاگ اٹھیں تو ساری انسانیت جاگ اٹھے گی اور جبر و استبداد اور ظلم و استحصال بستر مرگ پر پہنچ جائیں گے۔

جب ہم بستروں کی انواع اور بستروں کے احوال پر غور و اقعی کرتے ہیں تو ان بدبخت بستروں کا بھی خیال آجاتا ہے جہاں مدتوں تکئے تبدیل نہیں ہوتے البتہ ان پر تکیہ کرنے والے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ شاید ان ہی بستروں پر ایڈس کے خبائث جنم لیتے ہیں۔ عوام اور عوام کے مہربان دونوں ہی پوری کوشش کرتے ہیں کہ ایڈس کا خاتمہ ہو لیکن یہ کوشش نہیں کرتے کہ ایڈس کے بستر ختم ہو جائیں کہ نہ رہے منحوس بانس اور نہ بجے بے سُری بانسری۔ لیکن جب دیوانگی بام عروج پر پہنچ جاتی ہے تو لوگ زہریلے درختوں کو جڑ سے اکھاڑ نہیں پھینکتے بلکہ محض کڑوے پھل توڑنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

ہم اپنے بستر کا حال رقم کر رہے تھے اور دوسروں کے بستر پہ پہنچ گئے۔ یہ بُری بات ہے آدمی کو صرف اپنے بستر ہی پڑے رہنا چاہیئے۔ اب جو ہم اپنے بستر کا جائزہ لیتے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کریں۔ توشک جس شئے کا نام تھا اب وہ گدڑی ہو گئی ہے۔ جس پر کئی میل کے پیوند مزاج کے الھڑپن کو واضح کرتے ہیں۔ رضائی میں کبھی روئی تھی اب کترن بھری ہے۔ تکئے چپک کر پیڑی ہو گئے ہیں اور ان کے بیچ نیم سیاہی مائل گڑھے ہیں۔ سر ٹیکتے ہی جیسے سانچے میں فٹ ہو جاتا ہے۔ کڑھا ہوا شعر ایک بھدی بل کھاتی لکیر بن گیا ہے۔ غالب کا شعر سر دیوان ہی سمجھ سے باہر ہوتا ہے بر سر تکیہ کیا پلے پڑے گا۔ ہمارے مہمان اسے سمجھنے کی کوشش میں رات کا کھانا بھول جاتے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہم نے بیگم کو تاکید کر رکھی ہے کہ مہمانوں کو رات کا کھانا کھلانے کی بجائے ہمیں انھیں تکیئے کے شعر سے بہلائے رکھوں گا تم ما حضر کھا کر سو جانا۔ یوں بھی جب سربراہ مملکت قوم کی قوم کو بہلا پھسلا کر سلا رہے ہیں تو کیا ہم اپنے مہمانوں کو بہلا پھسلا کر سلا نہیں سکتے۔ قوم کیا چیز ہے ساری دنیا سو سکتی ہے اگر اس لوری کے بول معلوم ہوں جسے سن کر وہ لوگ بھی سو رہے ہیں جن کے سپرد جگانے کا کام تھا ہمارا بستر ہمارے بچوں کے لیئے "بازیچہ اطفال" بنا رہتا ہے۔ میونسپلٹی کے میدانوں پر جب سے شریف زادوں نے قبضہ جمایا ہے ہمارے بچے مسہری کے پائیں کھڑے ہو کر تکیوں میں نشانے لگاتے ہیں اور گولیاں کھیلتے ہیں اس طرح آنگن میں اغل بنانے کی چنداں ضرورت نہیں رہتی۔ آنگن کا تصور اب دقیانوسیت کا آئینہ دار ہے، نئی تہذیب آنگن نہیں رکھتی۔ فلیٹس کے رہن سہن نے صحن کے تصور کو ایمانداری کی طرح نایاب کر دیا ہے۔ ہمارے بستر کی ایک اہم ترین شئے ہے "رضائی" اور یہ رضائی ہمیں اپنے شعروں سے زیادہ عزیز ہے کیوں کہ غربت و افلاس کا درد اور ناقدری کا کرب جس کا ابلاغ ہمارے اشعار میں نہیں ہو سکتا وہ ہماری رضائی سے اظہار کی راہ پا تا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ رضائی پر کمزور ساریاں ہی کیوں چڑھائی جاتی ہیں۔ چنانچہ ہماری رضائی مختلف ساڑیوں کے ڈیزائنوں کا اڈور ٹائزمنٹ ہے۔ عید برات کو جب بھی نئی ساڑی اتفاق سے آجاتی ہے تو ہم پرانی ساڑی کو اپنی رضائی پر چڑھتے پاتے ہیں جو ان کھولنے لگتا ہے کہ آخر کب تک ہم پر ساری مسلط رہے۔ ویسے ہمیں افسوس کرنے کی

چنداں ضرورت نہیں جب ساری ساری قوم و ملّت کی بلکہ اقوام و ملل کی تقدیر بن چکی ہو تو اب ساری سے فرار کیسا۔ اور پھر اس کوفت کے صحیح حقدار تو ہم سے زیادہ ہمارے بڑے ہی ہیں۔ افسوس مزید تو ہمیں اس امر پر ہوتا ہے کہ چند دنوں بعد ہی ہماری رضائی میں چھوٹے بڑے سوراخ نمودار ہو جاتے ہیں۔ ناک کے قریب ایک مختصر سا سوراخ ہے جس میں سے ہم اپنی ناک باہر نکالے رکھتے ہیں مقصد یہ نہیں ہوتا کہ ناک اونچی رہے بلکہ صرف تازہ ہوا کے جھونکے مقصود ہوتے ہیں اور جب بچے چلّاتے یا بیوی چیختی ہے تو ہم ایک نسبتاً بڑے سوراخ سے اپنی تھوتھنی باہر نکال کر غرّاتے ہیں پھر ایک چھوٹے سوراخ سے آنکھ نکال کر غراہٹ کے نتائج سے باخبر ہوتے ہیں۔ اگر اتوار نہ ہو تو دوسرے سوراخ سے گھڑی کی جانب دیکھ لیتے ہیں کہ آیا بیداری کا وقت ہوا کہ نہیں۔ پاؤں پھیلاتے وقت قدرے مشکل ہوتی ہے۔ اندرونی پیوند کے ٹانکے عموماً ڈھیلے ہوتے ہیں اس لیے چشم پا سے منزلوں کے تعین کا اندازہ کر لیتے ہیں کہ پاؤں اڑے پر ابھی پہنچا یا کچھ اور پاؤں پھیلانے کی گنجائش ابھی باقی ہے۔ ایک دفعہ ہمارے ایک دوست ہماری مرضی کے خلاف ہمارے دیوان خانے میں ٹھہر گئے کرفیو کی بدولت ایسا کبھی کبھی ہو ہی جاتا ہے۔ ازراہ کرم ہم نے انھیں اپنی رضائی پیش کر دی جسے انہوں نے خندہ پیشانی سے قبول کر لیا لیکن انھیں کیا پتہ کہ دراصل وہ خندہ پیشانی سے زیادہ نا عافیت اندیشی سے قبول کر رہے ہیں۔ فجر کی اذاں ہوئی تو انھوں نے ہماری رضائی کو غالباً اپنی رضائی سمجھ کر بے احتیاطی سے کروٹ لی ہوگی۔ ہم کروٹ لیتے وقت بڑی احتیاط برتتے ہیں۔ لی یا نہیں لی جیسے کوئی منظر ہمدردی تھا ایسے! فاحشہ بیار۔ صبح موصوف کا نقشہ ہی عجیب تھا۔ رضائی بیضہ آدم لگ رہی تھی اور اس میں سے ایک بالغ شخص برآمد ہونے کی جستجو کر رہا تھا۔ ہر سوراخ سے ان کی کوئی نہ کوئی چیز باہر تھی۔ جہاں سے ہم اپنی ناک باہر نکالا کرتے ہیں اس میں سے انھوں نے اپنے سر کو باہر کر لیا تھا۔ نیچے پاؤں پنڈلی کے ساتھ اور اوپر ہاتھ کہنی کے لہرا رہا تھا بشکر ہے ان کے دم نہیں تھی ورنہ وہ بھی کسی نہ کسی سوراخ کی خبر لیتی۔ شاید اس کیفیت میں کچھ ان کا دم بھی گھٹ رہا تھا۔ ہم جوں ہی ان کے قریب پہنچے انھوں نے اپنا ایک عدد نکلا ہوا ہاتھ لہرایا اور ہم نے خیال کیا شاید وہ ایک ہاتھ سے تالی بجانے کی مشق کر رہے ہیں۔ لیکن جب بدحواسی کے عالم میں انھوں نے اپنے منہ سے کچھ کرب انگیز اور عجیب الصوت الفاظ خارج کیے تو ہم نے ان کی دستگیری کی اور انھیں کھینچ کر آزاد کروالیا۔ ناشتہ پر انہوں نے روداد سنائی کہ فجر کے ساتھ وہ کس اذیت میں مبتلا ہیں اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی غربت، افلاس اور نکبت پر اچھا خاصا لکچر پلا دیا۔ آخر میں انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ ہمیں ایک اچھی سی واقعی رضائی لادیں گے مگر ہنوز ان کا وعدہ ہمارے نیتاؤں کے وعدوں سے بہت مماثلت رکھتا ہے۔

بستر کے آرام کی کوئی حد نہیں جس طرح آدمی کے دل میں حرص و طمع کی بے حد گنجائش پائی جاتی ہے بعینہٖ بستر میں بھی آسائش و تکلفات کے بے انتہا راستے ہموار ہو سکتے ہیں۔ تاہم ان تعیشات کے باوجود واقعی طمانیت حقیقی حاصل ہو جائے اس کی کوئی گیارنٹی نہیں، بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے بلخ کے شہزادے کو دس من پھولوں کی سیج پر بھی نیند نہیں آتی اور ایک تھکا ماندا ہندوستانی مزدور اخبار بچھا کر نہایت آرام سے سو جاتا ہے۔ واقعہ ہے بستر سے زیادہ نیند کی اہمیت ہے لیکن یہ نکتہ جاگنے والوں کی سمجھ میں آتا ہے سونے والے اس حکمت سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے۔

ایک دن ہم خواب میں روٹی کھا رہے تھے جاگے تو رضائی کی اندرونی دھجی ہمارے منہ میں تھی۔ بلّی کے خواب میں چھیچھڑے سنا تھا لیکن فنکار کے خواب میں روٹی بشکل رضائی کی دھجی پہلی دفعہ دیکھی! اور یوں بھی روٹی جس شئے

کا نام ہے وہ ہندوستانیوں کا خواب اول ہے اور اس کی تعبیر کو وہ حکام سے شرمندہ کرنا چاہتے ہیں لیکن ہر پانچ سال بعد ہندوستانیوں کا یہ خواب خود شرمندہ ہو جاتا ہے۔ آدمی کو شرم آنی چاہیئے یا رحم جب دونوں ہی آنے سے گریز کریں تو قیامت آجائے تو بھی کم ہے۔

بستر کی شان خوبصورت مچھر دانی سے ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے ہاں بھی ایک مچھر دان تنا کرتا تھا۔ مچھر کیا مچھر کے بچے بھی گھس نہیں سکتے تھے استداد زمانہ کہیئے یا مقدرات اب ہمارے بچے با آسانی گھس سکتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ صحیح راستہ نہیں ملتا تو ہم خود بھی اس کے روشن دانوں سے گھس بھس کر اپنے اڈے پر پہنچ جاتے ہیں۔ حالانکہ بلڈ منظر ہماری اس طرح کی انوکھی آمد پر بہت خفا ہوتی ہیں۔ یوں بھی جب اوروں کے مقامات پر جب لوگ غلط راستے سے پہنچ رہے ہیں تو ہمیں کیا پڑی ہے کہ اپنے اڈے پر پہنچنے کے لیے صحیح راستے کے انتخاب کو از بس ضروری گردانیں۔ ہم سردی کے دنوں رضائی کے ساتھ ساتھ مچھر دان بھی اوڑھ لیتے ہیں مگر بھلا ہو مچھر دان کے روزن ہائے مسلسل کا سردی مزید چھن چھن کر ہمیں آئی سے "زیڈ" ہو جانے پر مجبور کرتی ہے۔ ہم سلیقہ مندی کے شیدا ہیں چاہے ہماری رضائی ہی صرف ہماری ذات ہو کوئی شرکت ہمیں گوارا نہیں۔ بیگم طعنہ دیتی ہیں کہ یہ رضائی ہے کوئی کھتہ نہیں کہ دوسروں کا داخلہ ممنوع ہو۔ اشتراک سے ہم نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا لیکن ہم دیکھتے ہیں ہمارا کوئی نہ کوئی بچہ اس میں گھسا رہتا ہے۔ اور ہم غصے میں آکر الٹی دولتی مار کر رضائی کو خود سے جدا کر دینا چاہتے ہیں مگر پھر اس کی کھنگی ہمیں اپنے غصہ کو پی لینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ آدمی کو خود پر کہاں کہاں قابو پانا پڑتا ہے۔ اس کا تجربہ ہمیں اپنے بستر ہی پر ہوا۔

اسمٰعیل ظریف (حیدرآباد)

شاعری نامہ

ظریف کب تک مشاعروں میں سنا دُگے یوں کلام اپنا — کلام کا مجموعہ نکالو تو خوب چمکے گا نام اپنا
ادب نوازوں کی محفلوں میں عجیب رسہ کشی ہے جاری — اٹھا پٹک ہو نہ جائے اک دن مشاعروں کو سلام اپنا

میں کیوں شاعر بنا کیسے بنا یہ پھر بتاؤں گا — بھری محفل میں کوئی رازیوں کھولا نہیں جاتا
کسی مرحوم شاعر کی غزل تو مار سکتا ہوں — مگر مصرعے کو ڈنڈی مار کر تولا نہیں جاتا

تجھ سے رقیب اب تو نہ کھائیں گے مات ہم — رکھتے ہیں ان کے بھائی کو اب اپنے ساتھ ہم
جانِ غزل تھے پہلے اب آزاد نظم ہیں — جن کو بنا چکے ہیں شریکِ حیات ہم

کسی سے مشورہ کر کے کوئی برباد ہوتا ہے — کوئی شاعر بذاتِ خود مشیر آبا د ہوتا ہے
ظریف ان محفلوں میں آپ کو سنتے تو ہیں لیکن — وہی دس سال کا تازہ کلام ارشاد ہوتا ہے

شاعری سے کم سے کم یہ تو ہوا اک فائدہ — واہ واہ کے شور میں دادِ سخن پانے لگے
جاگنے سے بڑھ گئی شاعر کی بینائی حضور — اب تو دن میں بھی اسے تارے نظر آنے لگے

غزل

فیاض افسوس
(پارسی ٹاکلی)

خیال ہے اس کے دل میں شاید محبتوں کی بُرائی سا کچھ — نظر سے اپنی وہ جسم و جاں میں جو کر رہا ہے کھدائی سا کچھ
ہماری شامت ہمارے در پر پھر آج دستک کسی نے دی ہے — کرے خدا خیر کھا رہے ہیں وہ چیکے چیکے کھٹائی سا کچھ
کبھی جو مشتاق دید تھا میں ملا تو انجمن میں پھنس گیا ہوں — مجھے تو محسوس ہو رہا ہے قریب رہ کر جدائی سا کچھ
عجیب فطرت کا آدمی ہے کہ جیسے اردو اکادمی ہے — رویّہ اس کا رہا ہے ہم سے قتیل جیسا شفائی سا کچھ
تھی وصل کی شب تھا سرد موسم بری طرح کپکپا رہا تھا — اوڑھا دیا اس نے لا کے مجھ کو لحاف سا کچھ رضائی سا کچھ
ہمارے تیور ہماری حالت ہماری صورت یہ جاننے والو — بتائیں کیسے کہ اندر اندر دھڑک رہا ہے سلائی سا کچھ
دماغ و دل میں سرور جیسا، زباں پہ اپنے مٹھاس جیسی — عجیب بوسوں کا ذائقہ تھا شراب جیسا مٹھائی سا کچھ

ہے اس کے قبضے میں کھیتی باڑی کچھ ایسی اس نے فصل اگائی
دکھایا لا کر عجیب بھٹہ جوار کا سا کچھ مکائی سا کچھ

ڈاکٹر اختر بستوی
(صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی گورکھپور)

آگرہ کے تاج محل

سے

بمبئی کے تاج محل تک

"آگرہ میں آپ کو دو طرح کے تاج محل نظر آئیں گے۔ ایک تو جمنا کے کنارے ملے گا۔ جس کے متعلق گرو دیو ٹیگور نے فرمایا ہے کہ "یہ محبت کی آنکھوں سے ٹپکا ہوا آنسو ہے جو وقت کے رخسار پر جم گیا ہے"۔ اور دوسرا شہر کی دکانوں میں دستیاب ہوگا۔ جس کے بارے میں خاکسار اختر بستوی کہتا ہے کہ "یہ غربت کی چند ہی آنکھوں سے گرا ہوا قطرۂ حقیر ہے جو تاجروں کے شوکیسوں میں سج گیا ہے"۔ اول الذکر تاج محل کو دیکھ کر ترقی پسند شاعروں کو محسوس ہوتا ہے کہ "ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر غریبوں کی محبت کا مذاق اڑایا ہے" اور موخرالذکر تاج محل پر نظر کرکے رجعت پسند شعرا کہہ سکتے ہیں کہ "چند مفلس فن کاروں نے غربت سے تنگ آکر محبت کی عظیم یادگار پر طنز کیا ہے"۔

ان دونوں تاج محلوں کی تعمیر و تباہی میں بعض باتیں مشترک ہیں۔ شاہ جہاں کے تاج محل کو جن معماروں نے دودھ کی طرح سفید اور سبک بنایا تھا ان کے ناموں کو بھی شہرت کے دودھ سے مکھی کی طرح نکال پھینکا گیا تھا، اور دکان داروں کے تاج محلوں کو جو کاریگر چاندی کے اوراق کی طرح چمک دار بناتے ہیں ان کی زندگیوں میں بھی گم نامی کی دیمک لگی ہوئی ہے ۔۔۔ ممتاز محل کی محبت میں حیات ابدی کا پھندنا لگانے کے لیے جو تاج محل برسوں کے ریاض کے بعد وجود میں آیا تھا اس کے بنانے والوں کے ہاتھ بھی اس خیال سے کٹوا لیے گئے تھے کہ کہیں وہ اپنی کالی کلوٹی محبوباؤں کے عشق میں بھی کوئی ایسا ہی لافانی ستارہ نہ ٹانک دیں اور ریپیے کی: خندق کو روٹی کے ٹکڑوں سے پاٹنے کے لیے جو تاج محل تنگ و تاریک گلیوں میں روزانہ سیکڑوں کی تعداد میں ڈھالے جاتے ہیں۔ ان کے فن کاروں کے ہاتھ بھی قسمت یہ سوچ کر کاٹ دیتی ہے کہ کہیں وہ اپنے جھونپڑوں کو رئیسوں کی خواب گاہوں کی طرح خوب صورت نہ بنا لیں۔۔ تین صدی قبل تعمیر ہونے والے جس تاج محل کی پائیداری، جاہلوں کے ایمان اور عورتوں کی ضد کی طرح اٹل سمجھی جاتی تھی۔ وہ بھی اب جمنا کے تھپیڑوں اور

جمہوریت کے تھپیڑے سہتے سہتے اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ پی۔ ڈبلو۔ ڈی کی بنوائی ہوئی عمارتوں کی طرح کسی لمحہ بھی زمیں بوس ہو سکتا ہے اور بیسویں صدی میں بننے والے جن تاج محلوں کی کاریگری کو انگلینڈ کی بادشاہت اور ہندوستان کی سوشلزم کی طرح حیرت انگیز تصور کیا جاتا تھا وہ بھی اب عوام کی ناقدری اور بے توجہی کی وجہ سے اتنے کم یاب ہوتے جا رہے ہیں کہ غریبوں کی غیرت کی طرح کسی بھی وقت ختم ہو سکتے ہیں ——— تین سو سال پرانے تاج محل کے میناروں میں جو شگاف پڑ گئے ہیں انھیں دور کرنے کے لیے بھی محکمۂ آثار قدیمہ کے کچھ نااہل اشخاص اس قسم کی کوششوں میں مصروف ہیں جن کی بدولت وہ دن بدن زیادہ سے زیادہ بد صورت ہوتے جا رہے ہیں اور موجودہ زمانے کے تاج محلوں کی صفت پر جو زوال آگیا ہے اُسے ختم کرنے کے لیے بھی بعض ناسمجھ حضرات اخباروں اور رسالوں میں اس طرح شور و واویلا مچا رہے ہیں کہ ان کی ساری چیخ پکار صدا بہ صحرا ثابت ہو رہی ہے۔

اس بات کا فیصلہ انتہائی مشکل ہے کہ آگرہ کے دونوں تاج محلوں سے کون سا تاج محل زیادہ اچھا ہے۔ پروفیسر حبیب اور ڈاکٹر ایشوری پرشاد کا فیصلہ تو اس تاج محل کے حق میں ہو گا جسے بیرونی ممالک کے سیاح لندن کے عجائب گھر سے زیادہ قابلِ دید اور شمالی ہندوستان کے لوگ گھر کی مرغی سے زیادہ ناقابلِ اعتنا سمجھتے ہیں لیکن حقیر اختر بستوی ان تاج محلوں کی موافقت میں ہاتھ اٹھائے گا جو امریکن اسٹائل کے شاندار بنگلوں کی رنگ برنگی الماریوں میں بھی نظر آتے ہیں اور ہندوستانی طرز کے کھپریل کے مکانوں کے جالوں سے اٹے ہوئے طاقوں میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ مندرجہ بالا مورخین اپنے فیصلے کی حمایت میں یہ دلیل دیں گے کہ نقل ہر حالت میں اصل سے کم تر اور تخلیق ہر صورت میں پیروڈی سے بہتر ہوتی ہے اور مذکورہ بالا مدرس اپنی رائے کو درست ثابت کرنے کے لیے یہ نکتہ بیان کرے گا کہ اگر نقل اصل سے زیادہ کارآمد اور پیروڈی تخلیق سے زیادہ مفید ہو تو ہر سمجھ دار آدمی کو چاہیے کہ اسی کو پسند کرے۔ میں اگر اصلی تاج محل کو دیکھنے کے لیے بستی سے آگرہ جاؤں تو سو سو روپے خرچ کر کے صرف اس کی یاد اپنے دل میں بسا پاؤں گا لیکن اس سے کچھ کم ہی روپے دے کر اگر میں کسی دوست سے ایک عدد نقلی تاج محل منگوا لوں تو اسے اپنے گھر کے کسی گوشے میں سجا سکتا ہوں اور چونکہ موجودہ زمانے کی تہذیب میں کسی حسین چیز کو دل میں بسانے کے بجائے گھر میں سجانا اچھا سمجھا جاتا ہے اس لیے میں بھی دکان داروں کے تاج محل کو شاہ جہاں کے تاج محل سے بہتر تصور کرتا ہوں۔

آگرہ کے تاج محلوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ میرے لیے ضروری ہے کہ بمبئی کے تاج محلوں کے بارے میں بھی چند باتیں عرض کروں، ورنہ وہاں بسنے والے حضرات یہ سوچیں گے کہ میں بھی اسی علاقائی تعصب کا شکار ہو گیا جس کی وجہ سے شمالی ہند کے لوگ ہمیشہ ان مقامات کی اچھائیوں کو نظر انداز کرتے رہے ہیں جو ہندوستان کے نقشے میں نیچے کی طرف دکھائے جاتے ہیں ——— ہاں تو سنیے جس طرح آگرہ میں دو قسم کے تاج محل ملتے ہیں اسی طرح بمبئی والوں کے پاس بھی دو طرح کے تاج محل موجود ہیں۔ اول تاج محل ہوٹل اور دوم تاج محل فلم۔ یہ دونوں تاج محل کسی طرح بھی آگرہ کے تاج محلوں سے کم تر نہیں ہیں کیونکہ

تاج محل ہوٹل میں بہت سی ایسی خوبیاں ملتی ہیں جو تاریخی تاج محل میں پائی جاتی ہیں اور فلم تاج محل میں کئی ایسی خصوصیات موجود ہیں جن کی بنا پر "لیکاوستا تاج محل" سے اس کا مقابلہ جائز قرار دیا جاسکتا ہے ——— اس بات کو ذرا تفصیل بیان کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اب تک کسی نے بھی اسے احاطۂ تقریر و تحریر میں لانے کی کوشش نہیں کی ہے، حالانکہ اس "راز درون پردہ" کو عوام الناس پر ظاہر کرنا اتنا ہی ضروری تھا جتنا کہ پارلیمنٹ میں گرانی کی روک تھام پر بحث کرنا۔

تفصیل اس امر کی یہ ہے کہ آگرہ کے تاریخی تاج محل کی پشت پر بھی کافی دور تک پانی دکھائی دیتا ہے۔ جس کا نظارہ جرمنی اور جاپان جیسے ترقی یافتہ ممالک کے معماروں کو بھی چلو بھر پانی کی یاد دلاتا ہے اور بمبئی کے تاج محل ہوٹل کے پس منظر میں بھی حدِ نگاہ تک پانی کی چادر پھیلی ہوئی نظر آتی ہے جسے دیکھ کر فٹ پاتھ پر سونے والے غریبوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ شاہ جہاں کے تاج محل پر بھی ہمہ وقت غیر ملکی سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے جو عش عش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی سوچتے ہیں کہ اتنی عظیم الشان عمارتیں بنوانے والے بادشاہوں سے انگریزوں نے حکومت کس طرح چھینی ہوگی، اور تاج محل ہوٹل میں بھی چوبیس گھنٹے بیرونی ممالک سے آنے والے اشخاص کی ریل پیل رہتی ہے جو شام کو کاک ٹیل پارٹیاں اور رات کو عریاں رقص دیکھ کر اس عقدے کو بہ آسانی حل کر لیتے ہیں کہ ایشیائی ملکوں کے دسترخوانوں پر یورپی تہذیب کی مکھیاں اب تک کیوں بھنبھنا رہی ہیں۔ مغلوں کے عہد کا تاج محل بھی محاوراتی مرغے کی ٹانگ کی طرح ایک ہی ہے جس کے مقابلے میں اگر کسی درزی یا حجام نے اپنی دکان پر "تاج محل ٹیلرنگ ہاؤس" یا "تاج محل ہیر کٹنگ سیلون" کا بورڈ لگا رکھا ہے تو اس کو راشٹرپتی بھون میں پڑے ہوئے تنکے کی طرح ناقابلِ توجہ سمجھنا چاہیے اور انگریزوں کے زمانے کا تاج محل ہوٹل بھی کیتھولک عیسائیوں کے پوپ کی طرح ایک ہی ہے جس کے جواب میں اگر کسی غلیظ اور گمنام گلی میں جمن یا خیراتی نے اپنے میلے کچیلے چائے خانے کو "تاج محل ٹی ہاؤس" یا "تاج محل کیفے" کا نام دے رکھا ہے تو اسے گونگے کی زبان کی طرح ناقابلِ ذکر تصور کرنا چاہیے۔

اسی طرح آگرہ میں بکنے والے نمائشی تاج محل اور بمبئی میں تیار ہونے والی فلم تاج محل کی ملتی جلتی خوبیوں کو بھی نہایت آسانی کے ساتھ واضح کیا جاسکتا ہے۔ دکان داروں کے شوکیسوں میں نظر آنے والے تاج محلوں کی تجارت سے بھی ان کے اصل کاریگروں کو صرف اتنا ہی فائدہ پہنچتا ہے جتنا کہ بینک میں رکھے ہوئے روپیوں میں سے اس کی حفاظت کرنے والے چوکی داروں کو ملتا ہے اور فلم تاج کی آمدنی سے بھی اس کے اصل آرٹسٹوں کو صرف اتنا ہی منافع ہوتا ہے جتنا کہ اونچے گھرانوں میں استعمال ہونے والے دودھ کی مقدار میں سے بلی کا حصہ ہوتا ہے۔ نقلی تاج محل بناتے وقت بھی بعض کاریگر کہیں کہیں لال ہرے نگوں کا استعمال کر دیتے ہیں تاکہ وہ بچوں اور بوڑھوں کو یکساں طور پر پسند آسکیں اور فلم تاج محل کو بھی "خوبصورت رنگوں میں" بنایا گیا ہے تاکہ موجودہ زمانے کے رنگین مزاج نوجوانوں کو زیادہ سے زیادہ لبھایا جاسکے۔ لیکاوستا تاج محل بھی سینکڑوں کی تعداد میں بنائے جاتے ہیں جو آگرہ کی متعدد دکانوں میں بکنے کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے بڑے شہروں میں بھی فروخت ہوتے ہیں اور فلم تاج محل کی بھی سینکڑوں کاپیاں بنائی گئی ہیں جو بمبئی کے بہت سے سینما گھروں میں چلنے کے ساتھ ساتھ بھارت کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں دکھائی جاتی ہیں۔

جس طرح آگرہ کے دونوں تاج محل بعض باتوں کے اعتبار سے آپس میں مماثلت رکھتے ہیں۔ اسی طرح بمبئی کے دونوں تاج محلوں میں بھی بعض مشترک خصوصیات موجود ہیں جن کے بارے میں مہاراشٹر کی حکومت کو وظیفے دے کر ریسرچ کروانا چاہیے لیکن چونکہ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کافی عرصہ لگے گا اس لیے چند ایک باتیں میں ہی بیان کیے دیتا ہوں تاکہ وہاں کی تاریخ و تہذیب سے دل چسپی رکھنے والے اس معاملے میں بالکل ہی تاریکی میں نہ رہیں۔

اول یہ کہ بمبئی کا تاج محل ہوٹل بھی صرف نام کا تاج محل ہے ورنہ جمنا کے کنارے بنا ہوا حسین و جمیل مقبرہ دور سے جتنا ہی زیادہ خوب صورت نظر آتا ہے سمندر کے ساحل پر کھڑا ہوا یہ ضخیم ہوٹل دور سے اتنا ہی زیادہ بھدا دکھائی دیتا ہے، اور بمبئی میں بنائی جانے والی تاج محل فلم بھی صرف نام ہی کے اعتبار سے تاج محل کہی جا سکتی ہے ورنہ اس میں شروع سے آخیر تک اسی قسم کے عامیانہ نا چ اور گانے بھرے ہوئے ہیں۔ جیسے کہ "بہادر لٹیرا" اور "ظالم جادوگر" جیسی فلموں میں پائے جاتے ہیں۔ دوئم یہ کہ تاج محل ہوٹل کی تعمیر کا مقصد بھی صرف یہ ہے کہ دنیا کی حسین ترین عمارت کے نام کی آڑ میں مصنوعی تام جھام کا دام پھیلا کر ملکی اور غیر ملکی امیر زادوں سے پیسے اینٹھے جائیں اور فلم تاج محل کے بنانے کی غرض بھی صرف یہ ہے کہ محبت کی عظیم یادگار کے نام کو استعمال کر کے سرکاری افسروں سے لے کر سبزی فروشوں تک ہر خاص و عام کی جیب پر ڈاکہ ڈالا جائے۔ سوئم یہ کہ تاج محل ہوٹل میں بھی بور کے لڈوؤں کی سی خاصیت بھی پائی جاتی ہے کہ جو وہاں جا کر کھانا کھائے وہ بھی پچھتائے اور جو نہ جا پائے وہ بھی پچھتائے (جانے والا لٹی ہوئی جیبوں کا غم مناتا ہے اور نہ جانے والا ناکام حسرتوں کا ماتم کرتا ہے) اور فلم تاج محل میں بھی تجریدی آرٹ کے شاہکاروں جیسی خصوصیت ملتی ہے کہ جو دیکھے وہ بھی سر پیٹے اور جو نہ دیکھ سکے وہ بھی افسوس کرے (دیکھنے والا وقت کی بربادی کا خیال کر کے خود کو لعنت ملامت کرتا ہے اور نہ دیکھنے والا یہ سوچ کر کڑھتا ہے کہ اگر آگرہ جا کر اصلی تاج محل دیکھنا نصیب نہ ہو سکا تو کم از کم اپنے شہر کے سنیما ہال میں فلم تاج محل ہی دیکھ لی ہوتی)

اب ذرا چلتے چلاتے اس بات پر بھی روشنی ڈالتا چلوں کہ بمبئی کے دونوں تاج محلوں میں سے کونسا تاج محل بہتر ہے۔ اگر آپ اس سلسلے میں ڈالمیا اور دلیپ کمار کی رائے معلوم کریں تو وہ تاج محل ہوٹل کی موافقت فرمائیں گے کیوں کہ ان کی بے مزہ شامیں، اور بے لطف راتیں اس کی وجہ سے پُربہار بن جاتی ہیں لیکن اس کے برخلاف اگر بدھو چمار یا بھاتی کمہار سے پوچھا جائے تو وہ تاج محل فلم کو ترجیح دیں گے کیونکہ دو چار روپیوں کے عوض میں یہ چلتا پھرتا جادو ان کے جسموں سے محنت کی تھکن اور ذہنوں سے غربت کا غم دور کر دیتا ہے اور وہ اپنی بیویوں کے مدقوق چہرے بھول کر ممتاز محل کے حسن و شباب میں ڈوب جاتے ہیں ـــ اب رہی میری رائے تو مجھ جیسے افادیت پسند انسان کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ موخر الذکر حضرات کی ہاں میں ہاں ملائے کیونکہ ڈالمیا اور دلیپ کمار کی حمایت کرنے سے مجھے کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچ سکتا، جبکہ بدھو چمار اور بھاتی کمہار کی ذات سے میں کم از کم اتنی امید تو رکھ ہی سکتا ہوں کہ اگر کسی وقت مجھ کو جوتے گنٹھوانے یا صراحیاں بنوانے کی ضرورت پڑی تو ممکن ہے انعام میں دوسروں کے مقابلے میں مجھ سے وہ چار پیسے کم طلب کریں۔

غزل — اقبال ہاشمی
(حیدرآباد)

کچھ ہوا شادی سے پہلے کچھ ہوا شادی کے بعد
عقل کا پورا ہوا میں پوری بربادی کے بعد

نام شہزادی ہے اس کا، پر وہ شہزادی نہیں
آنکھ میں جچتی نہیں ہے کوئی شہزادی کے بعد

ہے غضب کا فارمولا آزما کر دیکھئے!
لوٹ آتی ہے جوانی دوسری شادی کے بعد

ایک آتی ہے تو آتی ہیں کئی بیماریاں
بڑھ گیا ہے خود بخود صفرا بادی کے بعد

میں غلامی میں رہا انگریز کا پٹھو مگر!
لوگ کہتے ہیں مجاہد مجھ کو آزادی کے بعد

پہن کر تو دیکھئے عقدہ بھی یہ کھل جائے گا
اپنے جامہ میں نہیں رہتا کوئی کھادی کے بعد

گولیاں تو گولیاں ہیں گولیوں کو کیا پتہ
اور بھی ہیں وادیاں کشمیر کی وادی کے بعد

شعر کہنا ہے کہو میر ہاشمی یہ سوچ لو!
آدمی بے کار ہو جاتا ہے اُستادی کے بعد

قطعات — نگار لکھنوی

گھس جاؤں گا محفل میں کسی روز میں کھٹ سے
"ہمت ہو تو منزل کوئی دشوار نہیں ہے"
بس دیکھتے رہ جائیں گے منہ پھاڑ سا کھولے
روکیں مجھے یہ جراتِ اغیار نہیں ہے

اس الیکشن کا نتیجہ کیا کہیں
کانگریس کا ہوگیا "کریا کرم"
بابری مسجد کے نیچے دب گئے
محترم المحترم المحترم

٥

لاولد کہتے نہیں ابلیس کو
جن کو یہ معلوم ہے شیطان ہوں میں
اِک الکشن کے لیے بیچوں ضمیر
تین کوڑی کا سیاست داں ہوں میں

جب ہو نہ پائے بزمِ محبت میں باریاب
جب بن سکا نہ کام کوئی رسم و راہ سے
دیوار سایہ تھے جو محافظ نکا کئے
دو پھول ہم نے چن لیے دستِ نگاہ سے

غزل — شبنم کارواری (کرناٹک)

ان کو پانے کے لیے سو سو جتن کرنے پڑے
حُسن کے مندر میں چاہت کے بھجن کرنے پڑے

نزع کے عالم سے گزرے اور زندہ رہ گئے
کینسل کتنے جنازے اور کفن کرنے پڑے

ان کے کوچے میں رقیبوں سے لڑے ہم بارہا
عشق میں طے مرحلے کتنے کٹھن کرنے پڑے

عشق میں چکی بھی پیسی بیلے پاپڑ بھی بہت
کام یہ مشکل نہیں اتنے کوہکن کرنے پڑے

اُلجھنیں سسرال کی سب مجھ کو سلجھانی پڑیں
دفعتاً جب بیوی کے سب رنج و محن کرنے پڑے

گھر سے بھاگے اور محبوبہ سے لو میرج بھی کی
فیصلے ایسے بھی کچھ آل آف سڈن[1] کرنے پڑے۔

(1-all of sudden)

غزلیں

رؤف رحیم (حیدرآباد)

حسینوں میں مرا چرچا بہت ہے
کہ میرے نام پہ ورثہ بہت ہے

بہت اچھی ہے مہ پاروں کی صحبت
مگر اس کام میں خرچہ بہت ہے

قیادت کھو رہی ہے قدر اپنی
کہ اس میں آج کل دھندا بہت ہے

سیاست کا بگھارا اچھا ہے یارو
مگر اس دال میں کالا بہت ہے

بہت اونچے سے ٹیلے پر کھڑے ہیں
بڑائی کا جنھیں دعویٰ بہت ہے

وہ اپنی جھرّیاں دیکھیں تو بولیں
ارے یہ آئینہ جھوٹا بہت ہے

وہ شوہر جس کی ہو طرّار بیوی
ہے خوش قسمت اگر بہرا بہت ہے

لکھا ہے جب سے دلبر کا قصیدہ
مرے اشعار میں سکتہ بہت ہے

رحیم اب تو بدل دے نام اپنا
کہ تیرے نام پر قرضہ بہت ہے

گھر کے باہر گھر کے اندر ڈھونڈتے رہ جاؤ گے
پاؤ گے مجھ سا نہ شوہر ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

چاہتے ہو تم اگر مخلص بھی ہو بے لوث بھی
زندگی بھر ایسا لیڈر ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

مادہ مل جائے تو چھٹی لے کے ہوگا وہ فرار
اور تم اپنا کبوتر ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

چاند کی مانند سر کرلیں گے وہ مریخ بھی
تم ہتھیلی میں مقدر ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

میہمانو! تم اگر اتنا ستاؤ گے مجھے
وہ پتہ دوں گا کہ تم گھر ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

بم دھماکے سے اڑا دے گا تمھیں ریموٹ سے
اور تم جیبوں میں خنجر ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

نشہ بندی ہوگئی ہے میکدے سب بند ہیں
شاعری میں جام و ساغر ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

دیکھ کر ٹی وی پہ عریاں تم کوئی منظر رحیم
راستوں میں پھر وہ منظر ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

لوگ جو بے ضمیر ہوتے ہیں!
ہوتے ہوتے وزیر ہوتے ہیں

زلف کے جو اسیر ہوتے ہیں!
شاعری میں وہ میر ہوتے ہیں

لڑتے رہتے ہیں جو میاں بیوی!
اُن کے بچے شریر ہوتے ہیں

سامنے ہوں اگر حسین چہرے
حادثے ناگزیر ہوتے ہیں

ہیں بھیانک بہت فرشتوں میں
وہ جو منکر نکیر ہوتے ہیں

عشق ایسی بلا ہے جس میں رحیم
لکھ پتی بھی فقیر ہوتے ہیں

واجد ندیم (شکاگو)

ملک سعیدی ایک باغ باغ شخصیت

روسٹنگ

(نوٹ :۔ روسٹنگ مُرادی معنوں میں اس محفل کو کہتے ہیں جس میں کسی کی کُھلے عام اور ببانگِ دہل ہجو کی جاتی ہے اور طرفہ تماشہ یہ کہ اس فنکشن میں اسے بھی خاص طور سے مدعو کیا جاتا ہے جس کی ہجو مقصود ہوتی ہے کچھ دنوں قبل غوثیہ سُلطانہ نے شکاگو میں ملک سعیدی کی روسٹنگ کا اہتمام کیا تھا اسی محفل میں یہ مضمون پڑھا گیا)

ایک دن صبح سویرے میں گھر سے نکلنے کی تیاری کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے سوچا اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ ضرور کسی کو کوئی ایمرجنسی ہوگی میں نے ریسیور اٹھایا تو ایک مانوس سی آواز تھی۔ "میں غوثیہ بول رہی ہوں"۔ "آپ ملک سعیدی صاحب کو جانتے ہیں نا"۔ میں نے کہا سعیدی صاحب کو کون نہیں جانتا۔ ان کا کہیں ایک مرتبہ نظر آجانا ہی کافی ہے۔ یہ ڈیل ڈول اور یہ تن و توش بھلا انھیں کون بھول سکتا ہے۔ وہ تو بدنامی کی حد تک شہرت رکھتے ہیں۔ کہیئے کیا ہوا؟ کیا ان کے گھر کوئی "خوشخبری" ہے (ان کے کوئی اولاد نہیں) غوثیہ نے قہقہہ لگایا اور کہا وہ دن بھی دور نہیں۔ اب جبکہ وہ وظیفہ پر علیحدہ ہو چکے ہیں تو ان کے پاس اور کام ہی کیا رہ گیا ہے"۔ پھر غوثیہ نے مزید کہا کہ آپ کو ان پر مزاحیہ خاکہ لکھنا ہے۔ اس وقت آپ جلدی میں ہوں گے۔ میں پھر کال کروں گی۔ بس تیاری شروع کر دیجئے۔"

میں اس بات کو تقریباً بھول سا گیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ غوثیہ مذاق کے موڈ میں رہی ہونگی اور وقتاً فوقتاً ایسی پھلجھڑیاں چھوڑنا ان کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد ان کا دوبارہ کال آیا اور پوچھا "کیا لکھا لیا؟" میں نے پوچھا "کیا لکھ لیا"۔ کہنے لگیں میں نے آپ سے ملک سعیدی کی ہجو لکھنے کو کہا تھا۔ میں نے کہا کہ میں آپ کا حکم کیسے ٹال سکتا ہوں۔ لیکن آپ جانتی ہیں ملک سعیدی میرے بڑے اچھے دوستوں میں ہیں۔ اور دو دوستوں کے درمیان آپ کیوں بگاڑ پیدا کرنی چاہتی ہیں۔ ملک سعیدی پر کوئی خاکہ لکھنے سے پہلے مجھے اس شہر کو چھوڑنے کی تیاری شروع کرنی پڑے گی۔ لیکن مجھے ابھی اس شہر میں رہنا ہے۔ کہنے لگیں "نہیں۔ نہیں کچھ نہیں ہوگا۔ ہم آپ کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں"۔ میں نے کہا "آپ کہاں تک کسی کی جان کی حفاظت کرسکتی ہیں۔ اگر وہ غلطی سے بھی کسی پر گر پڑے تو اس کی جان ویسے ہی نکل جائے گی"۔ پھر میں نے ان سے کہا کہ ان پر خاکہ

کیسے لکھا جا سکتا ہے وہ تو کاغذ کے کسی صفحہ پر سما نہیں سکتے۔ ہنستے ہوئے کہنے لگیں۔ "Equal size کا paper لے لیجیے۔ بڑی سائز کا لانبا ہوتا ہے۔" اس پر میں نے کہا "محترمہ میں ان کے طول کی نہیں عرض کی بات کر رہا ہوں" غوثیہ نے قہقہہ لگایا اور کہا "میں کچھ نہیں جانتی۔ یہ کام تو آپ کو کرنا ہے۔" پھر کہنے لگیں "میں نے سنا ہے کہ آپ نے مولانا سعید صدیقی کا خاکہ بھی لکھا تھا تو اب ملک سعیدی کا خاکہ کیا مشکل ہے۔ جب آپ نے ایسا بڑا قلعہ فتح کر لیا ہے تو پھر آپ کے لیے یہ کچھ بھی نہیں۔" میں نے کہا کہ "جس قلعہ کے کئی دروازے ہوں اس کا فتح کرنا آسان ہوتا ہے اور جس قلعہ کا ایک ہی دروازہ اور اس کا پہرہ دار ملک سعیدی جیسا آدمی ہو تو پھر اس کا سر کرنا کچھ آسان کام نہیں" غوثیہ نے اس پر ایک اور قہقہہ لگایا۔ جانے وہ ملک سعیدی سے کس بات کا بدلہ لینے پر تلی ہوئی تھیں۔ کہنے لگیں "پہرہ دار کے حسن و توش سے آپ واقف ہیں۔ بس بھگاتے جائیے آپ کا مسئلہ خود بہ خود آسان ہو جائے گا۔" پھر کہنے لگیں "میں نے کئی لوگوں کو کہہ رکھا ہے سبھی کچھ نہ کچھ لکھیں گے۔ دراصل سب کو میں نے ایک موقع فراہم کیا ہے اپنا اپنا قرض چکا لیں۔ ورنہ یہ کوئی ہاتھ آنے والی چیز ہیں؟" میں نے پوچھا کہ "بھئی آخر سلسلہ کیا ہے۔ کچھ تو پتہ چلے" کہنے لگیں "میں ان کی روسٹنگ کر رہی ہوں"۔ میں نے پوچھا کہ کتنے لوگوں کو بلایا ہے کہنے لگیں "سو، سوا سو ہوں گے"۔ ہم تو یہی جانتے تھے جو روسٹنگ کے لغوی معنی ہیں۔ یونہی مذاقاً کہہ دیا کہ ملک سعید کو روسٹ کر رہی ہو اور اتنے آدمیوں کو بلایا ہے کیا یہ سب کے لیے کافی ہو جائے گا؟" میرے مذاق کو بھانپ کر انہوں نے کہا "آپ نے موصوف کو دیکھا نہیں۔ آپ کافی ہونے کی بات کر رہے ہیں بچ جائے گا"۔ میں نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا "سچ ہے ملک سعیدی سے جیتنا مشکل ہے پھر غوثیہ نے مجھے "روسٹنگ" کے بارے میں واقف کروایا کہ روسٹنگ وہ پارٹی ہوتی ہے جس میں اس شخص کا جس کی روسٹنگ کی جا رہی ہے بھرپور مذاق اڑایا جاتا ہے ہجو کی جاتی ہے۔ ستایا اور تنگ کیا جاتا ہے میں نے ہنستے ہوئے پوچھا کہ روسٹ کرنے کے لیے کون سا چمن منتخب کیا ہے انہوں نے کہا "سادات بلڈنگ میں یہ ساری کارروائی ہوگی جس میں ملک سعیدی ثابت و سالم موجود ہوں گے"۔ میں نے پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "غضب خدا کا۔ ملک سعیدی کی برائی کرنا ہے اور وہ بھی ان کے سامنے۔ ان کے روبرو" میں نے مزید کہا "غوثیہ یہ کام آپ ہماری روایات کے خلاف کروا رہی ہیں پیٹھ پیچھے برائی کرنا ہماری روایات میں داخل ہے اور ایسا کر کے یا ایسا سن کر خوش ہونے کے ہم عادی ہیں۔ آپ ایسا نہ کیجیے، ہم کو پیٹھ پیچھے ہی برائی کر لینے دیجیے۔ پیٹھ پیچھے برائی کرنے میں جو مزہ ہے وہ روبرو کرنے میں کہاں"۔

ماحول پر ایک گونہ سنجیدگی طاری ہونے لگی تھی۔ بھلا یہ بات غوثیہ کہاں برداشت کرنے والی تھیں۔ آناً فاناً بحر میں یوں گویا ہوئیں۔ "ہم نے بس ایک بات کی اور آپ ـــ وعظ فرمانے لگے" پھر کہنے لگیں "دیکھیے حضرت۔ وعظ و نصیحت کا آپ پر کچھ اثر نہیں ہوا لیکن ہم پر ہوا ہے۔ اسی لیے تو یہ محفل منعقد کی ہے۔ برائی پیٹھ پیچھے نہ کریں منہ در منہ کر لیں" "جی ہاں" میں نے کہا "اور زندگی بھر کے لیے ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں۔ خود ملک سعید صاحب پوچھیے وہ ایک قطعہ پڑھتے ہیں جس کا مضمون ہے کہ جب کسی شعر پر کسی نے تنقید کی تو شاعر نے کہا تھا کہ یہی تنقید گلی کی موڑ پر کر کے دکھاؤ تو جانیں۔ آج اس محفل میں سبھی کچھ نہ کچھ پڑھنے والے ہیں۔ کوئی نظم کوئی نثر۔ سب کو ہمارا یہی مشورہ ہے کہ واپسی میں احتیاط سے کام لیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی موڑ پر ملک سعیدی سے آپ کا آمنا

سامنا ہوجائے اور آپ، کو اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔

ملک سعیدی بڑی ہی پہلودار شخصیت کے مالک ہیں۔ بچوں میں بچے، جوانوں میں بچے اور بوڑھوں میں بھی بچے بن جانا کوئی ان سے سیکھے۔ زندگی کا مقصد بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شعرخوانی، شعرگوئی، لطیفہ گوئی، ہنسنا ہنسانا اور بس۔ کریں بھی کیا۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے "بچہ نہ کچھ جی کو رکھے اچھا" یہی ان کی جوانی کا راز ہے۔ غالب کے قویٰ مضمحل ہوگئے تھے تو عناصر میں اعتدال سے وہ محروم ہوگئے تھے۔ لیکن ملک سعیدی کے قویٰ گو کہ مضمحل ہوگئے ہیں لیکن عناصر میں اعتدال ابھی باقی ہے۔

میری ان کی ملاقات آج سے ۲۳ سال قبل ڈاکٹر مہ جبیں کے مکان پر ہوئی تھی۔ بس اسی دن سے ہم ان کے گرویدہ ہوگئے۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ ان کے تن و توش میں اس قدر بے ہنگم ترقی ہوگی تو ہم ایسی غلطی نہ کرتے۔ عید کے دن آپ ان سے گلے ملنے کی کوشش کریں تو آپ کے دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے ملنے کو ترس جائیں گے اور ان کی توند آپ کو ان سے دور رکھے گی۔ یہ ۱۹۷۲ء کی بات ہے ڈاکٹر مہ جبیں کے والد محمد عبداللہ صاحب آئے ہوئے تھے جو کلکٹری کے عہدے سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ بہت قابل اور ذہین آدمی ہیں۔ عبداللہ صاحب سے ملاقات ہوئی وہیں ایک اور صاحب بھی براجمان تھے۔ براجمان کیا تھے لطیفوں کی پھلجھڑیاں بکھیر رہے تھے۔ درمیان میں مزاحیہ اشعار بھی سناتے جاتے جو سلیمان خطیب، سرور ڈنڈا، نذیر دہقانی اور دوسرے مزاحیہ شعراء کے تھے۔ پھر یہ سلسلہ رکتا تو سنجیدہ اشعار سنانے لگتے۔ چیدہ چیدہ اشعار بھی اور غالب، میر، فیض و جگر وغیرہ کی پوری غزلیں بھی۔ ہم ملنے تو گئے تھے عبداللہ صاحب سے لیکن واپس ہوئے ملک سعیدی سے مل کر۔ پھر یوں ہوتا رہا کہ کہیں کوئی فنکشن ہوتا۔ شادی بیاہ یا اور کوئی تقریب ملک سعیدی وہاں ضرور پائے جاتے۔ لوگوں میں گھرے بیٹھے ہیں۔ اور اپنی بذلہ سنجی اور ظرافت سے ایک اچھی خاصی محفل میں اپنی ایک چھوٹی سی مجلس سجائے لطیفوں کے گل کھلا رہے ہیں۔ بعض دفعہ تو یوں ہوا کہ شادی کی محفل ہے نکاح کی کارروائی چل رہی ہے۔ سارے لوگ اِدھر متوجہ ہیں۔ لیکن اسی ہال کے ایک حصے میں مدعوئین کا ایک گروپ نکاح کی کارروائی سے بے نیاز اپنی خوش گپیوں میں مصروف ہے۔ تحقیق کی تو پتہ چلا کہ درمیان میں ملک سعیدی موجود ہیں۔ اب تو میزبان بھی ملک سعیدی کو بلانے سے گھبراتے ہیں کہ یہ محفل در محفل اور تقریب در تقریب سے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ تخریب در تقریب سے رنگ میں بھنگ نہ ڈال دیں ان کے حافظے میں دنیا بھر کے اشعار کا، نظموں، غزلوں جس میں مزاحیہ اور سنجیدہ شامل ہیں اور "ہزلوں" کا ذخیرہ موجود ہے چیدہ چیدہ اشعار بھی سن لیجئے اور مکمل غزلیں بھی۔ اور بتلاتے بھی نہیں کہ کس کی غزل پڑھ رہے ہیں۔ سب یہی سمجھ رہے ہیں کہ ان ہی کی ہوگی۔ کیوں کہ مقطع میں "سعید" بھی موجود ہے۔ ایک دفعہ کسی جگہ جناب سعید صدیقی نے اپنی غزل پڑھی تو مرزا جو میرے برابر میں بیٹھے تھے کہنے لگے صدیقی صاحب نے تو ملک سعیدی کی غزل پڑھ دی۔ میں نے کہا کہ مرزا تم یہ کس بنا پر کہہ رہے ہو۔ کہنے لگے مقطع میں "سعید" تخلص استعمال ہوا ہے۔ میں نے کہا مرزا نام کا کچھ تو فائدہ ہونا چاہیئے۔ اب یہ تم جانو کہ سعید صدیقی نے ملک سعیدی کی غزل پڑھی یا ملک سعیدی نے سعید صدیقی کی۔ مرزا کہاں ماننے والے مجھے کہنے لگے میں تحقیق کروں گا۔ تحقیق کے بعد منہ لٹکائے ہوئے آئے اور

کہنے لگے ملک سعیدی نے کہا "تمہیں آم کھانے سے غرض ہے یا پیڑ گننے سے" میں نے مرزا کو سمجھایا کہ شاعری میں توارد تو ہو جاتا ہے۔

مشاعروں کی نظامت بھی خوب کرتے ہیں۔ بہت کم ناظم مشاعرہ ایسے ہوں گے کہ جن میں کسی مشاعرے کو بیک وقت کامیاب کرنے یا اسے فیل کرنے کی اتنی بڑی صلاحیت موجود ہو۔ اچھے خاصے مشاعرے کو لطیفہ گوئی کی محفل میں تبدیل کرنے کا فن کوئی ملک صاحب سے سیکھے۔ چلتے پھرتے جب تک آٹھ دس لطیفے نہیں سنا لیتے ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ اور پھر ختم کرتے کرتے دو چار کشیفون (جنسی لطیفے) کے بغیر ان کے منہ کا ذائقہ خراب رہتا ہے۔ مملکت لطیفہ گوئی کے یہ اپنے آپ کو بے تاج بادشاہ سمجھتے ہیں اور اپنی زمانروائی میں کسی کی مداخلت کو مداخلت بے جا سے کم نہیں سمجھتے۔ ان کی موجودگی میں آپ کوئی لطیفہ نہیں سنا سکتے۔ جیسے ہی آپ نے لطیفہ ختم کیا وہ کہیں گے "ارے میاں یہ لطیفہ ایسا نہیں ــــ ایسا ہے۔" عریاں اور جنسی لطیفے سنانا ملک سعیدی کا بڑا ہی پسندیدہ مشغلہ ہے اور اس معاملے میں وہ مساوات کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ enjoy کرنے کا حق سب کو یکساں طور پر ملنا چاہئے۔ بیچاری خواتین نے کیا ظلم کیا ہے کہ انھیں اس سے محروم رکھا جائے۔

ایک دن ان سے کسی صاحب کے حوالے سے گفتگو ہو رہی تھی اور وہ ان کو پہچان نہیں پا رہے تھے۔ میں نے ان کا حلیہ ان کی عمر اور اتا پتا بتانے کی کوشش کی اور وہ سوچتے رہے سوچتے رہے اور پھر لیکا یک "اچھا" کہہ کر اپنے مخصوص انداز میں اپنا دایاں ہاتھ ہوا میں بلند کیا اور ہماری ران پر دے مارا اور کہا "تم ان کا ذکر کر رہے ہو جن کی اپنی بیوی سے بڑی پاک محبت ہے۔" میں نے کہا "میں سمجھا نہیں" انھوں نے کہا "ارے بھئی وہی نا جن کے کوئی بچہ وچہ نہیں ہے" حالانکہ یہ خود بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔

گزشتہ دنوں ایک پروگرام میں جانے کا اتفاق ہوا۔ پروگرام آٹھ بجے شروع ہوا تھا۔ نو بج گئے اور لوگ بے چین ہو رہے تھے۔ تقریباً سوا نو بجے پردہ اٹھا تو لوگوں نے دیکھا کہ ایک لمبا تڑنگا شخص جس کا چہرہ داڑھی مونچھ سے اور سر بالوں سے بے نیاز ہے۔ گول مٹول شلوار اور شرٹ میں کھڑا ہے۔ میرے مہمان میرے ساتھ بیٹھے تھے۔ کہنے لگے یہ تو کوئی چراغ کا جن معلوم ہوتا ہے۔ ان کے بازو ان کا چھ سالہ لڑکا بیٹھا تھا۔ اس نے کہا "جن کے تو چوٹی ہوتی ہے۔ اس جن کا تو سر صاف ہے۔" میں نے کہا "بیٹے یہ ہمارے ملک سعیدی ہیں اور یہ بھی کسی جن سے کم نہیں۔ جس پر طاری ہو جاتے ہیں پھر اسے چھوڑتے نہیں۔ لطیفے اور اشعار سنائے بغیر اسے بخشتے نہیں۔" میں نے کہا "ہر سال یہ ایک انعام کے مستحق ہو سکتے ہیں اگر مقابلہ رکھا جائے۔ مہمان نے پوچھا کس قسم کا مقابلہ۔ میں نے کہا "بہترین لباس اور بدترین لباس زیب تن کرنے کا" یہ پاکستان کے عوامی درس کا چلتا پھرتا اشتہار ہیں۔ میں نے اس کے علاوہ کسی اور لباس میں انہیں نہیں دیکھا اور اس میں چن کر خراب ترین لباس کا انتخاب کرتے ہیں تو انھیں اس کا انعام ملنا ہی چاہیئے۔ میرے مہمان نے مجھ سے پوچھا کہ لباس کی بے شمار قسمیں ہیں۔ آخر انھیں شلوار اور شرٹ میں کیوں پسند ہے۔ میں نے کہا کہ شلوار اور شرٹ سے بہتر اور کوئی لباس نہیں جو ان کے ناہموار، نا تناسب، نا موزوں اور بے ڈول اور بے ہنگم جسم پر فٹ آئے۔ وہ لباس جو ان کے جسم پر فٹ آئے وہ کوئی measurement آج تک تیار نہیں کر سکا۔ اگر پتلون فٹ آ جائے تو کوٹ ڈھیلا پڑ جائے اور اگر کوٹ برابر آ جائے تو پتلون اوپر چڑھنے سے انکار کر دے۔

ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ انھوں نے کسی تقریب میں شرکت کے لیے سوٹ خریدنے کا ارادہ کیا اور ایک انھیں پسند بھی آگیا۔ انھوں نے سوچا کہ چلو ایک مرحلہ تو حل ہو گیا کیوں کہ ان کی پسند بھی نرالی ہے تم نے دیکھا نہیں کہ شلوار اور شرٹ میں کیسے کیسے "گدھے مار دو" قسم کے رنگ پسند کرتے ہیں۔ بہرحال جب انہیں رنگ پسند آگیا تو اس سوٹ کا ان کے جسم پہ فٹ ہونا باقی تھا۔ انھوں نے TRY کرنے والے کمرے میں جانے کی اجازت اس لڑکی سے طلب کی جو وہاں متعین تھی۔ پہلے تو اس نے انھیں اوپر سے نیچے تک دیکھا کیوں کہ وہ شلوار اور شرٹ میں تھے جس سے ان کے جسم کے خطوط غیر واضح تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے انھیں ایک ڈھیلے ڈھالے لفافہ میں رکھ دیا گیا ہو۔ ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر اس نے انھیں اجازت دے دی۔ وہ اس چھوٹے سے کمرے میں گئے اور سوچا کہ کوٹ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے پہلے پتلون پہن کر دیکھ لیتے ہیں پھر کوٹ TRY کریں گے۔ اور پھر انھوں نے شلوار سے اپنے آپ کو آزاد کیا اور پتلون چڑھانا شروع کی۔ جب پتلون گھٹنوں تک چڑھ گئی تو انھوں نے سوچا تین چوتھائی مرحلہ طے کر لیا ہے۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ جب گھٹنوں سے اوپر وہ چلے تو پتلون اور رانوں کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔ یہ پتلون اوپر کھینچنا چاہتے تھے اور رانوں نے NO ENTRY کا بورڈ لگا رکھا تھا۔ NO ENTRY کی خلاف ورزی کرنے والے کہاں نہیں ہوتے جبکہ ہم برصغیر کے رہنے والے تو اس کو ایک ADVENTURE اور بعض دفعہ تو اسے ایک فرض منصبی تصور کرتے ہیں اور اس کی حیثیت ان کے لیے ایک CHALLENGE یا ایک مہم سر کرنے کی ہو جاتی ہے اور سعیدی صاحب نے بھی ایک CHALLENGE تصور کیا۔ اور وہ کوئی ہار ماننے والوں میں سے ہیں۔ اچھے اچھوں کی بولتی بند کر دیتے ہیں اور یہ تو ایک بے جان دو پائنچوں والی پتلون تھی۔ یہ پتلون اوپر کھینچتے اور رانیں انھیں نیچے اتارتیں۔ اس کشمکش میں جب ان کی سانس پھول جاتی وہ کچھ دیر سستا لیتے۔ اور پھر ان کی توند بھی انہیں زیادہ دیر تک جھکنے نہیں دیتی۔ اور پھر یہ اپنی سانس کو پوری طرح روک کر پتلون اوپر کھینچتے۔ لیکن درمیان ہی میں سانس ٹوٹ جاتی۔ ذرا ذرا کر کے آخرکار انھوں نے رانوں پر فتح پالی اور اپنی کامیابی پر پھولے نہ سمائے۔ اور جب وہ کمر تک پہنچے تو دیکھا کہ اس کا گھیر ان کی کمر سے ۲،۳ انچ بڑا ہے۔ کہاں وہ کچھ رہے تھے کہ انھوں نے اپنی سائز سے چھوٹی پتلون کا انتخاب تو نہیں کیا اور کہاں ان کی کمر کہہ رہی تھی کہ وہ بھی کسی نازک اندام حسینہ کی کمر سے کم نہیں جبھی تو پتلون کمر تک پہنچ کر ۲،۳، انچ ڈھیلی پڑ گئی۔ پھر انھوں نے سوچا کہ مسئلہ رانوں کا تھا۔ کمر تو بلٹ کے ذریعہ کسی جا سکتی ہے۔ ورنہ اگر وہ اس سے کم سائز کی پتلون کا انتخاب کریں گے تو وہ بہ گھٹنوں تک ہی پہنچ کر رہ جائے گی۔ انہوں نے سوچا بس یہی ٹھیک ہے۔ اور کوٹ کی TRY کرنے کی زحمت نہ کی کیوں کہ پتلون کا ہی مسئلہ رہتا ہے اور وہ حل ہو چکا تھا۔ انھوں نے طے کر لیا کہ بس یہی سوٹ وہ خرید لیں گے۔ اب انھیں کیا پتہ تھا کہ آگے وہ کس مرحلے سے گزرنے والے ہیں۔ اور وہ مرحلہ تھا اس پتلون کو اتارنے کا۔ پتلون چڑھاتے چڑھاتے ویسے ہی کافی تھک گئے تھے انھوں نے سوچا ذرا سستا لیں پھر اتاریں گے۔ جب اپنا سانس درست کر لیا تو اتارنا شروع کیا لیکن معاملہ دوبارہ کشمکش میں آ گیا۔ وہ پتلون نیچے کھینچنا چاہتے تھے اور رانیں تھیں کہ اسے چھوڑنے تیار نہ تھیں۔ اور پھر جھک کر پائنچوں سے پتلون کھینچنے کا معاملہ تھا۔ جب وہ ذرا سی دیر جھک کر کوشش کرتے تو سانس پھول جاتی۔ پھر ذرا آرام کر کے اس کوشش میں لگ جاتے۔ اسی

کشمکش میں کافی دیر ہوگئی اور کمرے کے باہر اور لوگ بھی اس انتظار میں تھے کہ وہ بھی اپنی پسند کا لباس TRY کریں۔ جب ان کی پھولی ہوئی سانسوں کی آواز باہر بھی آنے لگی تو لگاتار لڑکی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور پوچھا ARE YOU OK۔ انھوں نے اپنی سانس دُرست کی اور کہا PRETTY GOOD۔ لڑکی نے اطمینان کا سانس لیا۔ جب کچھ اور انتظار کے بعد بھی یہ باہر نہیں آئے تو لڑکی نے پھر پوچھا DO YOU NEED ANY HELP انھوں نے مختصر الفاظ میں صورتحال سے آگاہ کیا اور کہا SEND SOMEBODY IN۔ اور پھر جب SECURITY کا عملہ پہنچا تو دیکھا کہ انہیں کسی طبی امداد کی ضرورت نہیں۔ صرف معاملہ پتلون اور ان کی کشمکش کا تھا۔ پتلون ان کو پسند آگئی تھی اور یہ پتلون کو۔ SECURITY والوں نے کہا کہ جب پتلون انھیں پسند ہے تو یہ اسے نہ اتاریں اور اس کی قیمت ادا کر کے اسے اپنالیں! انھوں نے سوچا کہ اس کمبخت پتلون سے نجات حاصل کرنے ہی میں ان کی اور ان کے گھر والوں کی بہتری ہے۔ انھوں نے سوچا کہ اس پتلون کا پہننا اور پھر اسے اتارنا ایک مرحلہ جانکاہ سے کم نہیں۔ اس لیے انہوں نے SECURITY سے کہہ دیا کہ وہ اِسے خریدنا نہیں چاہتے اتارنا چاہتے ہیں۔ آخر کار قصہ مختصر تین آدمیوں نے ان کی مدد کی۔ ایک نے ان کو بغلوں سے تھاما اور دوسرے دو آدمیوں نے پتلون کا ایک ایک پائنچہ اپنی گرفت میں لیا اور ہر ایک نے اپنا سانس روک کر ایک۔ دو۔ تین کی صدا بلند کی اور ایک ساتھ زور لگا کر کھینچا تو ملک سعیدی پتلون کی گرفت سے آزاد ہوئے اور اس کے فوراً بعد توبہ واستغفار کرلی کہ کبھی شلوار شرٹ کے علاوہ اور کوئی لباس نہیں پہنیں گے۔

اب آپ ان سے شلوار اور شرٹ کے اوصافِ حمیدہ کے بارے میں سن سکتے ہیں۔ سب سے عمدہ بات تو ان کی نظر میں یہی ہے کہ یہی وہ واحد لباس ہے جسے کبھی میاں پہنے اور کبھی بیوی۔ اب یہ اور بات ہے کہ ملک سعیدی کا شلوار اور شرٹ ان کی بیگم پہن لیں تو ایسی گم ہو جائیں کہ انہیں ڈھونڈنا اور تلاش کرنا پڑے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ شلوار ایسا عجیب و غریب لباس ہے کہ ایک ہی وقت میں چاہے ایک آدمی پہنے یا دو آدمی مل کر پہن لیں۔ یعنی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا گھیرا اتنا وسیع اور عریض ہوتا ہے کہ عام پائجاموں کے ۴ ازار بند بھی ناکافی ہوں اور اس کے باوجود اتنا ہلکا پھلکا ہوتا ہے کہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ کچھ پہنے ہوئے ہیں چنانچہ اسی دھوکے میں ایک مرتبہ اپنے بیڈروم سے باہر آگئے وہ تو اچھا ہوا کہ ان کی بیگم کی نظر ان پر پڑ گئی اور انھیں آگاہ کیا کہ ان سے کیا غلطی سرزد ہوگئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شلوار کی اور خوبیوں کے علاوہ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ FREE SIZE ہوتی ہے پتلی کمر پر بھی فٹ آجاتی اور تگڑی کمر پر بھی۔ اور سینے میں بڑی آسانی۔ کپڑے کے دو بڑے سے بڑے TUBE لے کر ان کو اوپر سے ملا دیں اور نیچے پائنچوں پر تنگ کر دیں۔ لیجئے شلوار تیار۔

ہاں تو ہم آپ سے اس پروگرام کی بات کر رہے تھے جس میں ملک سعیدی شلوار اور شرٹ پہنے اسٹیج پر کھڑے تھے اور اسی طرح شلوار اور شرٹ کا ذکر درمیان میں آگیا۔ خیر پروگرام آگے بڑھا۔ اب جہاں ملک سعیدی ہوں وہاں لطائف نہ ہوں۔ یہ تو ممکن نہیں۔ انھوں نے ایک لطیفہ سنایا۔ اور نہ جانے کیسے عین لطیفے کے کلائمکس پر ہی لطیفہ ختم کر دیا لطیفے سے ہنسی کا سارا عنصر ہی ختم ہوگیا۔ اور یہ پھر بھی سامعین کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ بلکہ لوگوں سے ہنسنے کا مطالبہ بھی کر رہے تھے۔ لوگ خاموش تھے۔

لیکن میرے پیچھے ایک صاحب بڑے زوردار قہقہے لگا رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا "بھئی آپ کو کس بات پر ہنسی آرہی ہے۔ جب کہ انھوں نے لطیفے کا سارا حلیہ بگاڑ دیا" انھوں نے جواب دیا "بگاڑ دیا یا سنوار دیا یہ تو ہم نہیں جانتے بلکہ سچ پوچھئے تو ہم نے لطیفہ سنا ہی نہیں" "پھر آپ کو کس بات پر ہنسی آرہی ہے" وہ بولے "آپ نے اس پروگرام کے لیے ۱۰ ڈالر دیئے ہیں اور ہم نے ملک صاحب کے لطیفے پر ہنسنے کے لیے ۱۰ ڈالر لیئے ہیں" اس دوران ملک سعیدی کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا اور انھیں اس کی تلافی کرنی تھی۔ ویسے وہ ایک لطیفہ پر ۵ کہاں ٹلنے والے تھے! انہوں نے اور کئی لطیفے سنانے اور سامعین کو خوب ہنسایا۔ دو تین لطیفوں پر میرے پیچھے ہنسی کی آواز برابر آتی رہی اور پھر یکا یک خاموشی طاری ہوگئی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ حضرت خاموشی کی تصویر بنے بیٹھے تھے کیا بات ہے آپ ENJOY نہیں کر رہے ہیں آپ کی ہنسی کی آواز نہیں آرہی ہے! انھوں نے کہا کہ انہیں تین لطیفوں کے پیسے ملے تھے۔ اب مزید کیوں ہنسیں۔

ملک سعیدی ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی صحبت میں وقت کے گزرنے کا پتہ نہیں چلتا آپ کا کبھی ان کا ساتھ ہو تو ان کے داہنے جانب نہ بیٹھیں۔ کیوں کہ ہر لطیفے کے بعد ان کا دایاں ہاتھ ہوا میں پرواز کرتا ہے اور اگر آپ نے اپنا ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تو ایک پٹاخے کی آواز کے ساتھ آپ کی ران پر LAND ہو جاتا ہے۔ اب ملک سعیدی نوکری سے ریٹائر ہوچکے ہیں لیکن ہم انھیں اپنی محفلوں اور مشاعروں سے ریٹائر نہیں کریں گے۔ کیوں کہ یہ وہ مکتب ہے جس کے دستور نرالے "اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا"، ان کو محفلوں کی جان بن جانے کا سبق خوب یاد ہے اور انہیں کسی قسم کی چھٹی نہیں مل سکتی ریٹائر ہونا تو دور کی بات ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ انھیں سلامت رکھے اور وہ اسی طرح محفلوں اور مشاعروں کی رونق بڑھاتے رہیں۔

آخر میں ملک سعیدی اور خصوصیت سے شہناز بھابی سے معذرت خواہ ہوں کہ اگر کوئی ناپسندیدہ بات ضبط تحریر میں آگئی ہو تو مجھے معاف فرمائیں اور جاتے ہوئے اپنی واپسی کا راستہ بتادیں۔ تاکہ میں اپنا راستہ بدل دوں اور گلی کے اس موڑ پر نہ مل جاؤں جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ ▪▪

ظفر کمالی (سیوان)

غزل

دور لوگ کہتے ہیں جس کو دورِ ہٹلر واد ہے — ہر کوئی اودھم مچانے کے لیے آزاد ہے

پھاوڑے کا نام سن کر نا فرمل جائے مگر — عشق کی دل میں ہوس ہے نام بھی فرہاد ہے

عمر نافرمانیوں میں جن کی ساری کٹ گئی — ہے انھیں شکوہ کہ ان کی ناخلف اولاد ہے

اپنی شادی میں سسر کا گھر رہن رکھوا دیا — جب ہوئی بیٹی سیانی کس لیے فریاد ہے

لوٹ کر لے جائے گا سارا اثاثہ ایک دن — کہہ نہیں سکتے کسی سے وہ مرا داماد ہے

کیسی شاگردی کہاں کا علم کیسا رعب داب — آج ہر شاگرد ہی استاد کا استاد ہے

اور کیا ہوگی ترقی اس نئی تہذیب میں — مدرسہ ویراں ہوا ہے مے کدہ آباد ہے

اس زمانے میں اٹھاؤں خرچ ماں اور باپ کا — یا الٰہی سر پہ کیسی آپڑی افتاد ہے

دشمنوں کا اس لیے کرتے نہیں کوئی گلہ — ہم کو اب تک دوستوں کی مہربانی یاد ہے

اے ظفر الفت نہ ہو کیوں مجھ کو رانی پور[1] سے
میری نظروں میں یہی اب مصر ہے بغداد ہے

غزل

مرزا کھونچ (بیتیا)

استاد بنے آپ مگر خاک بتایا — ادرک کی جمع پوچھی تو ادراک بتایا

جس کام سے ہوتا رہا حضرت کو منافع — اس کام کو میرے لیے ناپاک بتایا

دو چار دفعہ اس سے اکیلے میں الجھ کر — بیگم نے پڑوسن کو خطرناک بتایا

جو طے شدہ قیمت ملی دلہن کے یہاں سے — دولہے کے اقارب نے اسے پاک بتایا

ہر سال جو بہتی رہی رک رک کے مسلسل — مرزا نے اسی ناک کو غمناک بتایا

○

بینک میں کتنی رقم ہے پہلے اندازہ لگا — پھر کہیں بارات اپنی ان کے دروازہ لگا

وہ تو ہوٹل ہے مری بیگم کے والد کا جہاں — چار دن کا باسی کھانا بھی مجھے تازہ لگا

بچوں نے سہتا ستمک فلموں کی شوٹنگ کی ہے آج — اس لیے بکھرا ہوا کمرے کا شیرازہ لگا

ہر طرف بکھری ہوئی ہیں ایکتا کی دھجیاں — عہدِ پارینہ بھلانے کا یہ خمیازہ لگا

کالے چہرے پر شفق کی سرخیاں چھا جائیں گی — کھونچ کا بنوایا بندر مارکہ غازہ لگا

---

[1] شاعر کا آبائی وطن

سید رحیم الدین توفیق
(حیدرآباد)

مُردہ بدستِ زندہ

ایک مشہور کہاوت ہے۔ مردہ بدست زندہ۔ بے چارہ زندوں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ وہ جو چاہیں اس کا حشر کریں۔ انتہائے بے بسی کی ایسی مثال ملنی مشکل ہے۔ جتنا وہ بے بس ہوتا ہے اتنی ہی شدت سے لوگوں کی انسانیت جاگ اٹھتی ہے اور وہ بڑے احترام اور اہتمام سے اس کی آخری رسومات انجام دیتے ہیں۔ مردے پر مکھی تک بیٹھنے نہیں دیتے کہ یہ حقیر سی مکھی اس کے لیے پہاڑ کی طرح وزن ہو جاتی ہے۔ نہلانے سے پہلے پانی میں انگلیاں ڈبو کر تپش دیکھ لیتے ہیں۔ گویا مردے بھی سرد اور گرم محسوس کرتے ہیں۔ ایسے نازک اور لطیف احساسات انسانیت کی معراج ہیں جن کا اظہار صرف اسی دن اسی وقت ہوتا ہے۔ بعد میں یہ جذبات یوں بھاپ بن کر اڑ جاتے ہیں جیسے دھوپ سے شبنم ایسا رویہ زندوں کے ساتھ روا نہیں رہتا۔ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ وہی لوگ ہیں۔ شاید اس لیے کہ مرحوم ان سے اختلاف کرنے کی جراءت یا حماقت نہیں کر سکتے۔

جاہل اور ان پڑھ لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ مرنے والے کی روح آخری آرام گاہ پہنچنے تک اپنے مردہ جسم کے آس پاس منڈلاتی رہتی ہے اور اپنی تجہیز و تکفین کے انتظامات کا جائزہ بہ نفسِ نفیس پوری دلچسپی اور انہماک سے لیتی ہے اور انتظامات اس کی مرضی کے عین مطابق نہ ہوں تو تڑپ کر رہ جاتی ہے۔ یہ اور ایسے ہی بہت سے واقعات مشہور ہیں۔ ہم نے سنا بھی ہے اور کتابوں میں بھی ایسی حکایتیں پڑھی ہیں کہ مرنے کے بعد فلاں آدمی سخت عذاب میں مبتلا ہے فلاں آدمی جنت میں مزے اڑا رہا ہے۔ ایسے واقعات کا فائدہ یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً لوگوں کا ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ ہم تذبذب میں تھے کہ آخر موت کے بعد کی باتیں لوگوں کو کس طرح معلوم ہو جاتی ہیں۔ ہمارا خیال مردوں اور زندوں کے درمیان اس واحد ذریعہ معلومات و اطلاع دہی کی طرف گیا ہی نہیں جسے خو[illegible] کہا جاتا ہے۔ لوگ خوابوں میں آ کر اپنے دوست احباب، عزیز و اقارب کو خبردار کرتے ہیں ہماری طرح غفلت میں مت رہو جو کچھ تم سنتے ہو سب سچ ہے۔ ہم لاپرواہی کر کے عذاب میں مبتلا ہیں یا نیک کام کر کے ثواب کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ لوگ ان خوابوں کی تشہیر کرتے ہیں۔ ایسے واقعات پڑھ کر ہمارا ایمان تازہ ہوتا ہی ہے ساتھ میں

وہ زمانہ بھی یاد آتا ہے جب چند ہمدرد سائیکل سوار مخالف سمت سے آنے والوں کو خبردار کرتے تھے کہ آگے بغیر قندیل پکڑ رہے ہیں۔

خوش عقیدہ اصحاب مکّہ معظمہ یا مدینہ منورہ سے اپنے لیے کفن منگوا کر رکھتے ہیں۔ اپنے ملنے جلنے والوں، ہم خیال اور ہم عمر لوگوں کو صندوق سے نکال کر اس کا دیدار کرواتے ہیں۔ انھیں اپنے نیک اعمال سے زیادہ بھروسہ اس مقدس کفن پر ہوتا ہے کہ وہ اس کی بدولت عذاب سے چھٹکارا پالیں گے۔ دیکھنے والے بڑی عقیدت سے دیکھتے ہیں کہ پہننے کی نہیں تو کم از کم دیدار کی سعادت ہی حاصل ہو جائے۔ بعض لوگ عقیدت سے آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ بعض پہن کر جانے والے کی خوش قسمتی پر عش عش کرتے ہیں۔ بعض صرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ کر رہ جاتے ہیں۔ منگوانے کی فرمائش کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ایک دن ایک شناسا بہت ہی پریشانی کی حالت میں آئے۔ چہرے پر وحشت برس رہی تھی اور ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ہم نے خیریت پوچھی تو کہنے لگے۔ یار مجھ سے ایک بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا۔ دراصل قصہ یوں تھا کہ مکہ شریف کے کفن پر ان کی نیت خراب ہو گئی تھی۔ انھوں نے مالک کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر کفن بدل دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرحوم دیسی کفن میں زیرِ زمین ہو گئے۔ لیکن اسی رات مرحوم نے خواب میں آکر ان کی خوب فضیحت کی کہ انھوں نے مرحوم کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ان کے بھروسہ کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اس کفن سے ان کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کہ چوری کا مال بہرحال نا جائز ہے ہے۔ چاہے وہ کسی بھی مقدس جگہ کا ہو۔ چوری کے الزام میں قبر میں پہلے ان کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ ہم نے تسلّی دی جو ہو چکا اسے بھول جاؤ، اب اس کا ازالہ ممکن نہیں۔ نہ مرحوم باہر آسکتے ہیں نہ تم اندر جا سکتے ہو۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ تم ان کی قبر کو اس کفن سے ڈھانک دو، ان کی روح کو قرار آجائے گا۔ ممکن ہے وہ تمھیں معاف کر دیں انھوں نے کہا نہیں یار کفن چور اٹھالے جائیں گے اور جنت بھی ہاتھ سے جائے گی۔ تو پھر یوں کر لو اسے اپنے لیے رکھ لو اور کسی کو دکھاؤ مت۔ یوں بھی منکر نکیر کا تعلق CBI سے نہیں بلکہ شعبۂ امتحانات سے ہے اس لیے اب امتحان کی تیاری کرو۔ انھوں نے کہا تیاری کی کیا ضرورت ہے۔ پرچہ تو کئی سو سال پہلے ہی افشا ہو چکا ہے۔ چار پانچ سوال ہیں۔ ہر ایک سے وہی پوچھے جاتے ہیں۔ ہم نے کہا مگر جب وہ سوال کرنے آتے ہیں تو فلائنگ اسکواڈ سے زیادہ دہشت پھیلاتے ہیں اور اہلِ قبور پریشانی میں الٹے سیدھے جواب دے کر مفت میں عذاب قبر میں مبتلا ہو جاتے ہیں تم ایسا کرو ان کے آتے ہی الٹا ان سے سوال کرو۔ سب سے پہلے انھیں شناختی کارڈ دکھانے کو وہ بغلیں جھانکنے لگیں گے۔ معلوم نہیں انھیں بغلیں ہوتی ہیں یا نہیں لیکن کچھ نہ کچھ تو ضرور جھانکنے لگیں گے۔ یوں ہم نے ان کی دہشت دور کی۔

کلّ نفسٍ ذائقۃ الموت۔ جو پیدا ہوا ہے وہ مرے گا ضرور، لیکن اچانک فوت ہونے والے کی موت بے حد الم ناک ہوتی ہے۔ کیا ہوا تھا کیسے مرے۔ کچھ نہیں باہر سے آئے بولے جلدی کھانا لگاؤ بہت بھوک لگی ہے۔ ایک نوالہ بھی منہ میں نہیں گیا بس گرے اور روح پرواز کر گئی۔ اچھے خاصے ہنستے بولتے بیٹھے تھے اچانک ٹھسکہ لگا۔ پانی مانگا۔ بچے پانی لانے تک پیارے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ شہیدوں کا مرتبہ ملے گا۔ آج کل تو ہارٹ اٹیک سے مرنے والوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے توبہ کی فرصت بھی نہیں ملتی

طویل بیماری سے مرنے والوں کی موت کا لوگ زیادہ افسوس نہیں کرتے سوائے بیوی بچوں کے وہ بھی ذہنی طور پر اس حادثہ کے لیے تیار رہتے ہیں۔

جنازے میں شرکا کی تعداد کا انحصار مرنے والے کی شخصیت اور حیثیت پر ہوتا ہے۔ مال داروں، منسٹروں اور لیڈروں کے جنازے ایسی دھوم سے نکلتے ہیں کہ ان پر بارات کا گمان ہوتا ہے۔ عاشق کے جنازے کے بارے میں صرف سنا ہے، غالباً یہ صرف شاعر کی تمنا ہے جس کے پورے ہونے کے کوئی آثار نہیں۔

بعض حضرات داعیٔ اجل کو اس وقت لبیک کہتے ہیں جب اخبار میں اطلاع دینے کا وقت نہیں رہتا پھر بھی لوگ کسی طرح ایک دوسرے کو اطلاع کر دیتے ہیں۔ اگر مرنے والا صاحب حیثیت ہو تو تدفین میں دیر کی جاتی ہے تاکہ لوگ شریک ہو سکیں۔ ورنہ غریب کو جتنا جلدی ہو سکے ٹھکانے لگا دیا جاتا ہے۔ ہم نے ایک جنازہ جاتے دیکھا۔ صرف چار آدمی تھے۔ وہ بھی اس لیے کہ اس سے کم میں کام نہیں چل سکتا۔ بہت سے لوگوں کو کافی دیر سے اطلاع ملتی ہے کہ وہ ہانپتے کانپتے قبرستان پہنچتے ہیں۔ ایک بار ایسا ہی اتفاق ہمارے ساتھ بھی ہوا۔

ہم جب بھی جنازوں میں شریک ہوتے ہیں تو بے کار بیٹھنے کے بجائے لوگوں کی حرکات و سکنات اور چہروں کا جائزہ لینا شروع کر دیتے ہیں اور ان کی گفتگو سننے کی کوشش کرتے ہیں۔ عام شرکا یوں تو مجھے نظر آتے ہیں اور نہ کچھ کہتے ہیں لیکن رسماً چہرے ماتمی جذبات سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ سوگ کا ماحول ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ساری کسر زنانی محفل میں نکل جاتی ہے۔ بعض لوگ خائف بھی رہتے ہیں۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑتی دکھائی دیتی ہیں۔ شاید قربانی کے بکروں کی آنکھوں میں پھرنے والی چھریوں کی طرح موت کا منظر ان کی آنکھوں میں رقص کرنے لگتا ہے اور وہ مختلف انداز سے اپنے اپنے دلوں کو تسلی دیتے ہیں۔ کوئی اپنے نجی مسائل پر گفتگو کرتے ہیں جو زیادہ تر دفتری ہوتے ہیں تو کوئی موت کے فلسفہ پر اپنی قابلیت بگھارتے ہیں۔ خود کو تسلی دینے کے لیے ایک صاحب نے یہ شعر پڑھا:

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

ان کے سامنے جو صاحب بیٹھے تھے ان کا چہرہ فق ہو گیا۔ انھوں نے خوف زدہ آواز میں کہا حضرت میں دل کا مریض ہوں پہلے ہی ماحول سوگ وار اور ڈراؤنا ہے ایسے میں ایسا خطرناک شعر پڑھ کر اس کی دہشت میں اضافہ مت کیجیے۔ ایک زندہ دل نے شوشہ لگایا۔ حضرت آپ کہاں کی بات کر رہے ہیں۔ وہ دور گزر گیا۔ اس شعر کے خالق کی باری بھی کب کی آ چکی ہوگی۔ "اس کل" کو آپ بالکل بھول جائیے اور اس کی جگہ "اب" رکھیے اور شعر یوں پڑھیے:

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ اب ہماری باری ہے

آج کل ملک الموت بھی اتنا چست ہو گیا ہے کہ "کل کرے سو آج کر اور آج کرے سو اب" والے مقولے پر بڑی مستعدی سے عمل پیرا ہے۔ معلوم نہیں یہاں ہم میں سے کون بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہو کر پٹ سے گر پڑے اور جھٹ سے اللہ کو پیارا!

ہوسکتا ہے رنج و غم کے ماحول کو اور بھی سوگوار کرکے گھر والوں کے لیے مسئلہ کھڑا کر دے ۔ یہاں ایک سے بھلے دو والی مثل کا مطلب بالکل الٹا اور بہت ہی بھیانک ہوگا ۔ اس تحریر پڑھنے والے کو چپ سی لگ گئی اور دل کے مریض فوراً ہی کرسی سے اٹھ گئے یہ کہہ کر میں ذرا دیکھ کر آتا ہوں ابھی جنازہ اٹھنے میں کتنی دیر ہے ۔

ادھیڑ عمر کے مرحومین کے مسائل کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں ۔ کچھ حضرات ان ہی مسائل پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں ۔

ایک اور مرحوم کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی اور وہ تدفین سے کچھ دیر پہلے جب مزدور قبر کو Finishing touches دے رہے تھے ۔ ایک ہی لڑکا ہے وہ بھی ٹھیک نہیں نکلا ۔ آوارہ لڑکوں کی صحبت میں خراب ہو گیا ۔ دوسرے نے پوچھا ۔ آپ کو کیسے معلوم ۔ پہلے نے کہا میرے لڑکے کے ساتھ پڑھتا ہے تو گویا آپ کا لڑکا بھی اس کی صحبت میں خراب ہو رہا ہے ۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ کبھی اس کے ساتھ دیکھوں گا تو کھود کے گاڑ دوں گا ۔ مخاطب نے پوچھا ۔ کیا بغیر کھودے بھی گاڑ سکتے ہیں ۔ اس پر وہ صاحب سٹپٹا کر چپ ہو گئے اور مزید راز ہائے سربستہ آشکار ہونے سے رہ گئے ۔

ادھیڑ اور کم عمر لوگوں کے جنازے میں لوگ پھر بھی سوگ کا خیال رکھتے ہیں لیکن ستّر اسّی سال کی عمر کے لوگوں کے مرنے کا کوئی افسوس نہیں کرتے ۔ جنازوں میں یوں ہنسی خوشی شریک ہوتے ہیں گویا گیارھویں کی دعوت میں شرکت کے لیے آئے ہیں اور اب جنازہ نہیں اٹھے گا بلکہ دستر خوان بچھے گا ۔ ویسے نعش منوں مٹی کے نیچے دبا کر کچھ لوگ تو اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں لیکن زیادہ تر لوگ مرحوم کی غیر حاضری میں ان کی حاضری کھانے یا چکھنے ان کے گھر آ جاتے ہیں ۔ عام خیال ہے کہ حاضری کھانا یا چکھنا ثواب کا کام ہے ۔ ثواب اور عذاب کے درمیان لوگوں نے ایسی بال سے باریک لکیر کھینچی ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ عذاب کہاں ختم اور ثواب کہاں شروع ہوتا ہے ۔ خیر ثواب ہو نہ ہو مرحوم کی روح ضرور خوش ہوتی ہوگی کہ اس کی جیب سے کوئی پیسہ نہیں پڑتا ۔ سارا خرچ پڑوسی یا قریبی رشتہ دار برداشت کرتے ہیں ۔ حاضری کے مینو میں صرف کباب ہی ہوتے ہیں جو اتنے کم ہوتے ہیں کہ پہلی رات کے چاند کی طرح نظر آتے ہی غائب ہو جاتے ہیں کسی کو تو نظر بھی نہیں آتے ۔

جنازے میں شرکت کا دوسرا مرحلہ زیارت یا فاتحہ سیوم ہے ۔ اس فاتحہ میں لوگ برائے نام شریک ہوتے ہیں ۔ ایک زیارت میں ہم شریک ہوئے ۔ مسجد میں صرف دس پندرہ لوگ تھے ۔ زیارت میں کھانے کا انتظام بھی تھا ۔ چنانچہ گھر پر تین دستر خوان بچھے اور مسجد کی کسر پوری ہو گئی ۔ ان دعوتوں کا خیال ہوگا کہ کھانا کھا کر مرحومہ یا مرحوم کو ثواب پہنچا رہے ہیں ۔

یُوسف اِمتیاز (ٹورانٹو، کینیڈا)

نائی سے ہیئر ڈریسنگ تک

ہمارے سماج میں کچھ کاروبار یا پیشے ایسے ہیں جن کے بارے میں ہمیں پتہ ہے کہ ایک عام انسان کے لیے سوائے بھروسے کے اور کوئی چارہ نہیں ہے ۔ انسان مجبور ہو جاتا ہے ۔ بے بس ہے۔ پھر ان کے بغیر زندگی کی گاڑی اکثر اوقات ایکدم ٹھیر جاتی ہے۔ چاہے وہ ڈاکٹر ہو، آٹو میکانک، پلمبر، الیکٹریشن یا حجام ۔ موجودہ زمانے میں حجام کو نائی یا حجام کہنا ایک سماجی جرم اور گناہ ہے۔ نائی کے ساتھ زندگی کا سفر عقیقہ، منڈن سے شروع ہوتا ہے آج کل یہ ہیر ڈریسر کے نام سے پہچانا جاتا ہے چاہے وہ اول نمبر کا ہو یا کوئی گیا گزرا۔ بعض اوقات تو بستر مرگ پر بھی سر صاف کروانے پہنچ جاتا ہے۔ پجاری جوٹی کی گنجائش رکھ کر اور راہب ایکدم سر کی نفیس تلی سے مطمئن ہیں۔ ایک زمانے میں ہندو عورتیں بیوہ ہو جانے پر سر منڈھا دیتی تھیں۔ پھر حجامت کروانے کی خواہش صرف سر چکرانے اور دل ڈوبنے تک ہی محدود نہیں ہے۔ سائنسی ترقی، ویڈیو، ٹیلی وژن، دنیا اور فیشن کے بدلتے رجحانات تیزی سے کروٹ لیتے ہوئے اقدار نے نائیوں کو اب مودبانہ لباس پہنا دیا ہے اور وہ آج ہیر ڈریسر بن گئے ہیں۔ نائی اور حجام تو اب نظر بھی نہیں آتے سب ہی نے اپنے پرانے کباڑ خانوں کو نت نئے روپ رنگ روغن سے سجا لیا ہے ان لوگوں نے گرم اور ٹھنڈے پانی سے سر کے غسل کے لیے بیسن BASIN لگا لیے ہیں۔ بہت سوں نے اپنے اصلاح خانوں کو صرف عورتوں اور مردوں کے لیے مخصوص رکھنے کے بجائے یونی سیکس UNISEX ہیر ڈریسنگ سیلون میں تبدیل کر لیا ہے۔ خدا بھلا کرے تیزی سے بدلتے ہوئے فیشن کا کہ اب مردوں کے ہیر اسٹائل بھی بدلنے لگے ہیں۔ فوجی وضع کے بالشت بال اور کئی دہوں سے چلے آنے والے ہیر اسٹائل کو لمبے لمبے بالوں نے راستے سے ہٹا دیا ہے۔ پھر جان کینیڈی کے آئیوش مافیا نے سیاست دانوں کو بھی فیشن ماڈلز میں تبدیل کر دیا۔ پیٹر مرسوڈو کے لمبے لمبے قلم ایک فیشن بن گئے۔ فلم اسٹارز اور گانے بجانے والے ویسے بھی فیشن سٹ کرنے والے کل بھی تھے اور آج بھی ہیں جب ٹیڈیز TEDDIES اور ہپیز HIPPIES کا دور آیا تو بال کٹانا تو کجا نہانا بھی معمولات سے غائب ہو گیا۔ حفظان صحت کے سارے زرین اصولوں کو راتوں رات موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ پھٹے پرانے کپڑے پہننا اور سلام دعا کے بجائے امن کے نشان دو انگلیاں اٹھا کر بتلانا فیشن ہو گیا۔ سماج سے بغاوت کے ایسے ہی دور میں ان IN اور آوٹ OUT کی اصطلاح جانچ کا پیمانہ بن گئی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب ملک گئے سارے

نائی اور حجام ایک ایک کرکے اپنی دوکان بڑھانے لگے۔ حجاموں کی نسل جیسے ایکدم عنقا ہوگئی۔ لوگوں نے گھروں میں بازار میں ملنے والی حجامت کی مشینوں سے اپنی اپنی بیویوں اور خاتون دوستوں کو اس کارِ خیر کا ذمہ دار بنادیا۔ بیروزگاری اور بیکاری سے تنگ آکر بندروں کا سر مونڈھنے کی نوبت آگئی۔ بچوں کی کہانیوں اور مختلف داستانوں میں ہم حجاموں کے کارنامے، سازشوں، راز داری میں شرکت حتیٰ کہ جنگوں کے آغاز میں اہم رول ادا کرتے پڑھتے رہے ہیں۔ کہاوت ہے کہ حجام کے آگے بادشاہ بھی اپنا سر جھکاتا تھا۔ "سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے" کے مصداق نائی کو اپنے ماہرانہ اور غیر ماہرانہ فن کا مظاہرہ کرنے اور سر کو حضرتِ حجام کا تختۂ مشق بنانے کی آزادی رہی ہے۔

حجاموں، نائیوں اور موجودہ ہیئر ڈریسرز کی یہ قوم آج بھی بے تاج بادشاہ کی طرح دنیا کے ہر مسئلے پر اپنی ماہرانہ رائے، امورِ حکومت میں مشورے، کانا پھوسی، سازش، لوکل گاسپ LOCAL GOSSIP میں اب بھی مصروف ہے۔ جب استرے کی چمکتی دھار کسی کی شہ رگ سے قریب ہو اور موت نظروں کے آگے رقص کرتی نظر آئے تب اُسترا تھامے ہاتھوں سے اختلاف کون کرسکتا ہے چاہے بال کاٹنا ہو یا بالوں کو رنگ کروانا یہ سب ہیئر ڈریسر کے رہینِ منت ہیں۔ امریکہ کے سابق صدر ریگن ہزار بار انکار کرتے رہیں مگر یہ بات اپنی جگہ سچ ہے کہ وہ اپنی صدارت کے آخری دنوں تک وائٹ ہاؤز کی پرائیوٹ فضا میں اپنے بال رنگواتے رہے۔ ہیئر ڈریسر تو ارباب مقتدر کے ناک کا چڑھا ہمیشہ بال رہا جس کو نکالنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ہیئر ڈریسر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اہلِ غرض کو ہزار پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ جوتیاں سیدھی کرنی ہوں گی اور کام صرف ایک مخصوص شخص کا مخصوص اُسترا ہی نکال سکتا ہے۔

ہندوستان پاکستان کے شہروں اور گاؤں میں گھوم گھوم کر بال کاٹنے، داڑھی بنانے والے حجام یا پھر کسی پیپل، نیم، بڑ اور برگد کے درختوں کے نیچے چٹائی بچھاکر بیٹھنے والے نائی اب نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہوگئے ہیں۔ جب سے ان ملکوں سے سبزہ اور درخت غائب ہونے لگے ہیں حجام اب بڑی بڑی بلڈنگوں کے سائے میں بیٹھے نظر آنے لگے ہیں۔ معاوضہ مقرر نہیں ہے تھوڑا بہت چکانے کے بعد اپنا سر اتنا جھکا دیجیے کہ گریباں میں جھانکنے کا موقع ملے۔ جب کام ختم ہوگیا اور حجام نے اپنا کام تمام کرکے آئینہ آپکے ہاتھ میں تھما دیا تو پتہ چلا کہ حضرتِ حجام نے جیسے کوئی کٹورا سر پر رکھ کر سر کی صفائی کردی ہے اسی کو کٹورا کٹ کہا جاتا ہے۔ ذرا اس انداز کی بھی داد دیجیے کہ تالو پر حجام صرف ایک پان کا نمونہ بناکر چھوڑ دیتے تھے اور لوگ تالو پر گرمیوں کی حدت سے بچنے اور دماغ کو ٹھنڈک پہنچانے کے لیے مختلف مغزیات کا تکیہ سر پر رکھا کرتے تھے۔ پھر جب مونچھیں بنانے کی بات آئی تو ہمہ اقسام کے نمونے پیش نظر ہیں شمشیر کٹ، تلوار کٹ، ہٹلر کٹ، راجکپور کٹ، وغیرہ وغیرہ ساؤتھ انڈیا میں بننے والی ہندی فلموں کے تقریباً ہر ہیرو کو مونچھیں لگادی گئی تھیں بشکریہ دلیپ کمار، دیو آنند اور امیتابھ بچن نے کبھی اس شوق میں قسمت آزمائی نہ کی اور صرف اپنے ہیر اسٹائل ہی اپنے پروانوں کو بخش دیے ورنہ نہ جانے اور کتنے مونچھوں کے کٹ فہرست میں داخل ہوجاتے۔ مثل مشہور ہے کہ جس حجام کو کوئی کام نہ ہو تو وہ بندر کا سر مونڈھتا ہے۔ آپ کو یہ پسند نہیں تو آئندہ نہ آیئے مگر جائیں گے کتنی دور۔ یا پھر حضرتِ حجام کے لیے کیا پرواہ ہے تم نہیں اور سہی۔ سر بھی بہت ہیں

چہرے بھی بہت۔

مغربی ممالک میں تو اس پیشے کے نہ صرف ٹھاٹھ ہیں بلکہ اس کے آداب اور نخرے بھی۔ یہاں تو جیسے وہ کسی کے نکاح میں آجاتے ہیں کہ دوسرا نہیں ہاتھ بھی نہیں لگا تا محبوب کی موجودگی میں ہیر ڈریسر کی پانچوں انگلیاں استرے پر ہیں اور سر ویسے ہی کڑھائی میں۔ مرد ویسے عام طور پر صرف ایک مخصوص ہیر ڈریسر کے غلام تو نہیں ہوتے مگر دو ایک بار اگر کسی سے اصلاح کروالی تو سمجھئے کہ اس نے آپ کی جیب بھی ہلکی کر دی اور آپ نے غلامی بھی قبول کر لی۔ سر منڈھاتے ہی اولے پڑے اگر خدانخواستہ محبوب ہیر ڈریسر صاحب کا غصہ اتنا سخت ہوتا ہے کہ وہ آئندہ ہاتھ لگانے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے جیسے آپ راتوں رات اچھوت بن گئے یا نکاح ٹوٹ گیا۔ اول تو بطور آداب کوئی بھی اس ہیر سیلون کا نیا ہیر ڈریسر آپ کو ہاتھ نہیں لگائے گا کہ آپ بازار میں متاع غیر ہیں۔ اگر پیسے بچانے کی خاطر آپ نے بازار سے رنگ لا کر خود ہی استفادہ کر لیا تو آپ کے ہیر ڈریسر صاحب اصلاح کرتے ہوئے آپ کی وہ کلاس لیں گے اور رنگ کرنے والے کی غیر ماہرانہ حوصلے کی شکایتیں، نکتہ چینی ایسی تیسی کریں گے کہ تو بہ ہی بھلی۔ پہلے تو وہ کرسی پر بٹھا کر آپ کے اطراف کئی چکر لگائیں گے پھر منہ بنا کر انتہائی ناقدانہ انداز میں گویا ہوں گے "یہ بالوں کا کیا ستیاناس کیا گیا ہے، کونسا سستا رنگ لگایا ہے۔ کس اناڑی گنوار نے سر کو رنگا ہے" وغیرہ وغیرہ۔ بات یہاں تک ختم ہو جاتی تو پھر بھی ٹھیک تھا۔ مگر وہ اپنے دونوں ہتھوں پہ ہاتھ رکھ کر آخری فیصلہ دیں گے: "اتنا بے ہودہ کام ہے۔ معلوم ہوتا ہے کتے کا ناشتہ ہے"۔

اب وہ دن گئے جب کچھ پیسوں یا ایک آدھ روپے میں چٹائی پر درخت کے تلے یا پھر مقامی چھوٹے موٹے ہیر ڈریسنگ سیلون میں دو تین روپے دے کر اصلاح کروا لیا کرتے تھے اب تو جب سے نت نئے فیشن بازار میں آگئے یونی سیکس UNISEX ہیر ڈریسنگ سیلون کھل گئے، نئے ساز و سامان سے آراستہ ہیر ڈریسرز کی نسل آگئی ہے بال کٹانا یا داڑھی بنانا صرف اپائنٹمنٹ کے ذریعہ ہوتا ہے بعض دفعہ تو چاہے کتنے ہی اچھے قدیم اور کافی فراخ دل بخشش والے گاہک کیوں نہ ہوں جواب ملنے کے امکانات ہیں "جی ایک ہفتے تک فرصت نہیں ہے۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ جب ہزار گالیاں کھا کر بھی منہ بے مزہ ہو یا نہ ہو کام کے خاتمے پر پسندیدہ ہیر ڈریسر یہ ہدایت کرتے ہیں کہ آئندہ ملاقات کے لیے تاریخ لے لیں۔ مرد گاہک اگر اتفاق سے اسی ہیر ڈریسر کے پاس جاتے ہوں جہاں ان کا ڈاکٹر یا باس بھی جاتا ہے اور وہ اپنے بالوں کو رنگ کرواتے پکڑے جائیں تو سوچنا پڑتا ہے کہ آیا مجرمانہ نظروں اور کنکھیوں سے دیکھنے والے کو سلام کیا جائے یا ایسے انجان ہوں جیسا کچھ بھی دیکھا ہی نہیں۔ مرد گاہک عام طور پر عورت ہیر ڈریسر سے بال کٹانا پسند نہیں کرتے اور نہ ایسی جگہ جانا پسند کرتے ہیں جہاں عورتوں کی اکثریت موجود رہتی ہے۔ پھر کیسے پتہ چلے کہ کس جگہ صرف مرد ہی زیادہ جاتے ہیں؟۔ پہلے تو یہ دیکھ لیا جاتا ہے کہ وہاں عورتیں بھی ہیں یا نہیں۔ پھر آس پاس میز پر رکھے ہوئے رسالوں کا جائزہ لیں کہ آیا وہاں پلے بوائے PLAYBOY یا پینٹ ہاوز PENTHOUSE رسالوں کا ذخیرہ تو نہیں رکھا ہے۔ جہاں ان کا ذخیرہ ہوگا وہاں ووگ VOGUE، کاسمو COSMO اور ہاوز اینڈ گارڈن پڑھنے کو نہیں ملیں گے۔ ایک آدھ سنسنی خیز خبروں والا اخبار ہوگا! اور سنجیدہ سرخیوں والے کوئی بھی اخبار

کے لیے جگہ نہیں ہوگی۔

بالوں کو رنگ کروانا یا پھر خاص طور پر سفید بالوں کی لکیر کھنچوانا کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے مگر ناک اور کان میں بالیاں نیز پہننے کا فیشن لمبے بالوں کے ساتھ عام سا ہوگیا ہے اور عورتوں نے مردوں کی طرح بال بنوانے، سوٹ پہننا اور ٹائی لگانا شروع کردیا ہے۔

زلفیں سمٹ کے کانوں کی لو تک پہنچ گئیں — مونچھیں سکڑ کے گھس گئیں یاروں کی ناک میں
برتا گیا فراک میں لیکن وہ اختصار — دم اختصار کا بھی ہوا جس سے ناک میں
داڑھی تو منڈھاتے تھے مونچھیں بھی صفا کردیں — اب تیرا خدا حافظ اے صورتِ دوانہ
تہذیب نو کے سائے میں کیسی ڈھلی یہ پود — ہیں لڑکیاں تو کوٹ میں لڑکے فراک میں

عورت تو عورت مرد بھی ہزاروں نئے انداز کے ہیرکٹ کروانے میں ایک دوسرے سے آگے ہیں۔ رومن سپاہیوں کی طرح ہیلمٹ HELMET بنانا۔ اس میں SPIKE لگوانا۔ لال پیلے اودے قرمزی اور ہر طرح کے رنگوں سے بالوں کو سجانا فیشن کی نشانی ہے۔

کٹ جانے سے زلفوں کے یہ کیا نظر آتا ہے — جس لڑکی کو تم دیکھو لڑکا نظر آتا ہے

ہیرڈریسر اب اولڈ لیڈی کی طرح بال بنانے کے لیے نہ تو قدیم رولر ہی رکھتے ہیں اور نہ وہ رول کرنا چاہتے ہیں، ان کے پاس اب ہیرڈریسر میں سر رکھنے والی گنبد کی طرح مشین بھی نظر نہیں آتی۔ اگر کوئی گاہک ان کے پلے پڑجائے تو نہایت بے دلی کے ساتھ کئی منٹ تو صرف معائنے میں گزر جاتے ہیں پھر جیسی بھی درگت بن جائے ایک ٹیلے کی طرح بالوں کو اونچا کیا اور ہیر اسپرے HAIRSPRAY کی مدد سے اس کو منجمد FREEZE کردیا۔ لیجئے آپ کا پچاسویں دہائی کا ہیر اسٹائل مکمل ہوگیا۔ عورتیں عام طور پر ایک ہی ہیرڈریسر کی غلام ہوتی ہیں اور ہیرڈریسر کی غیر معمولی توجہ کا مرکز رہتی ہیں یا پھر ہیرڈریسر انہیں ایسا منہ چڑھا کر جلد سے جلد اپنی جان چھڑا لیتا ہے جیسے وہ گراں خاطر ہوں۔ اس کی ان کو کیا پرواہ کہ انھیں بھاری بخشش بھی ملتی ہے۔ ہیرڈریسر بھی زندگی کے ان تسمہ پاؤں میں سے ہے جو نہ نگلتے بنتے ہیں اور اگلتے۔ یہ وہ پائے جاناں ہے جس پر سب ہی سجدہ کرتے ہیں اور ستم بھی اٹھاتے ہیں۔ جئے بھی جاتے ہیں اور دنیا یہ سوچتی رہ جاتی ہے کہ آیا یہ سجدۂ کفر تھا کہ ایماں۔

دنیا میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس نے ہیرڈریسر کے بارے میں اپنے ذاتی تجربات، مشاہدات، دوسروں کی شکایات، ناراضگی کی کہانیاں ایک دوسرے کو نہ سنائی ہوں لیکن اس کے باوجود اس کا ساحرانہ جادو ایسا بھرپور اثر کرتا ہے کہ وہ اس کی قینچی اور آئینے کو صرف اپنی ذاتی ملکیت کے طور پر ہمیشہ کے لیے گھر داماد بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔ مقامی اور پابندی سے آنے والے گاہکوں کے بارے میں گپ شپ، کانا پھوسی سے لیکر سنسنی خیز اخبارات کی خبروں پر تبصرے اور تبادلۂ خیال کا بھی موقع مل جاتا ہے اب ان گاہکوں کا کیا ذکر جو سر رنگوانا یا لکیر بنوانا نہیں چاہتے مگر یہ مطالبہ ضرور کرتے ہیں کہ اصلاح سے پہلے سر کے سفید بالوں کو چن چن کر اکھاڑ دیے جائیں۔

موسم کی طرح اب تو مردوں اور عورتوں دونوں کے بالوں کے فیشن بدلنے لگے ہیں۔ باغ و بہار شوخ اور چمکدار مختلف رنگوں سے بالوں کی قوسِ قزح تیار کی جاسکتی ہے اور مرد اپنی زلفوں میں رنگ برنگی چھوٹے بڑے دانے پرونے لگے ہیں ایک روز وہ بھی آئے گا جب بالوں کو گنبد کی طرح بنا کر گھونسلے کا نمونہ بنایا جائے گا اور زلفوں کے کسی گوشے سے نقلی چیریز CHERRIES جھانکتی نظر آئیں گی۔ اگر ذوقِ نمائش نے کچھ اور اجازت دی تو کیلے لگالئے تب ہیر ڈریسرز اپنی دوکانوں میں چھوٹی موٹی سُپر مارکٹ یا نرسری سی لگالیں گے جہاں حسنِ انتخاب کی آزادی بھی ہو اور خواہ مخواہ بھاگ دوڑ بھی نہ کرنا پڑے۔ شائد بالوں کے اس باغ و بہار گھونسلے سے چڑیا بھی چہکتی سنائی دے۔ □□

نمائش سوسائٹی کا کل ہند صنعتی نمائش

مکرم جاہی روڈ، نمائش میدان حیدرآباد ۱

یکم جنوری تا ۱۵ فروری

ہندوستان کی ہمہ مقصدی عظیم نمائش، جنوبی ہند کی سب سے بڑی فروخت کنندہ دکانیں جہاں ۴۶ دن میں ۲۵ لاکھ افراد آتے اور ۱۵ کروڑ کی خرید فروخت ہوتی ہے۔

غیر منافع بخش ادارہ: جو اپنی آمدنی تعلیم اور خاص طور سے خواتین پر خرچ کرتا ہے اور حسبِ ذیل اداروں کو مالی امداد فراہم کرتا ہے۔

۱. عثمانیہ گراجویٹس اسوسی ایشن، حیدرآباد۔
۲. اکنامک کمیٹی، حیدرآباد۔
۳. کملا نہرو پالی ٹکنک فار ویمن، حیدرآباد
۴. سروجنی نائیڈو ونیتا مہا ودیا لیہ، حیدرآباد
۵. سردار پٹیل کالج، سکندرآباد۔
۶. لال بہادر کالج، ورنگل
۷. سری لکشمی نرسمہا سوامی کالج، بھونگیر ضلع نلگنڈہ
۸. سری وینکٹیشورا کالج، سوریا پیٹ ضلع نلگنڈہ
۹. کستوربا گاندھی کالج فار ویمن، سکندرآباد
۱۰. سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف کامرس، سکندرآباد۔
۱۱. دسویشوریا انڈسٹریل ٹریننگ سنٹر، سکندرآباد۔
۱۲. راجیو گاندھی انڈسٹریل ٹریننگ سنٹر، نرمل، عادل آباد
۱۳. شنکرجی میموریل گرلز ہائی اسکول، حیدرآباد
۱۴. سری راما لنگیشورا ڈگری کالج، کلکچرلہ آر آر ڈسٹرکٹ
۱۵. یل ین گپتا میموریل ڈسپنسری، حیدرآباد
۱۶. روی نارائن ریڈی انڈسٹریل ٹریننگ سنٹر الوملا، نلگنڈہ

صنعتوں، بزنس، مارکٹنگ، ٹریڈ اور پبلسٹی کے لیے بہترین مواقع فراہم کرتی ہے۔ کل ہند صنعتی نمائش حیدرآباد ریاست کے عوام کے لیے نیا سال کا تحفہ اور سالانہ فیچر ہے۔

ایم نہال سنگھ
اعزازی سکریٹری

صاف صاف

منہ پھٹ ناگپوری

شادی میں، امتحاں ہے مرے اعتبار کا
اللہ! چیک بھیج دے ۶۵ ہزار کا

آیا خیال جیتے جی جب یادگار کا
مکرانہ سے بلا لیا پتھر مزار کا

اب لڑکیاں نصاب کے اسباق چھوڑ کر
افسانہ لکھ رہی ہیں دلِ بے قرار کا

ہم سے بچا نہ شہر کا کوئی دکان دار
ہم نے ریکارڈ توڑ دیا ہے ادھار کا

ہر ایک نوجواں کو گلیمر کے خبط نے
محتاج کر دیا ہے بناؤ سنگھار کا

اب لوگ اس کو چوم رہے ہیں تو کیا کروں
سمپل عرب سے لایا ہوں گرد و غبار کا

مہنگائی اپنا رنگ جماتی ضرور ہے
ڈولی اٹھائیں لوگ کہ ڈولہ کہار کا

اس نے کیا ہے خوب ضیافت کا اہتمام
بریانی میں ملا کے مصالحہ اچار کا

منہ پھٹ ہم ایک ہی سے پریشان ہو گئے
ارماں جنابِ شیخ کو ہے چار چار کا

○

قاعدے، قانون سب بکواس ہیں
کچھ بھی کر لیں مال جن کے پاس ہیں

ہم سے ٹکرانے سے پہلے سوچ لو
اک گرو گھنٹال اپنے پاس ہیں

ہے غلامی سے غلامی دیس میں
بیوی داسی ہیں تو شوہر داس ہیں

ڈائری میں ہے مری، تصویر یار
دور رہ کر بھی وہ میرے پاس ہیں

موم کے موتی، نگینے کانچ کے
اس صدی کے گوہر و الماس ہیں

گندگی آتی ہے اوپر لوٹ کر
یہ کمیشن میں بنے سنڈاس ہیں

مندروں میں اہتمامِ جشنِ یگ
اہلِ مسجد غرقِ حزن و یاس ہیں

کیوں نہ منہ پھٹ لوگ جھک جھک کر ملیں
منترائن جب ہماری ساس ہیں

○

ٹیکس والوں سے بچا کر رکھیو
گھر کو ویرانہ بنا کر رکھیو

پیسے بچ جائیں جو گھر خرچ کے بعد
اپنے شوہر سے بچا کر رکھیو

منتری بن کے کروڑوں نہ سہی
پانچ دس لاکھ کما کر رکھیو

مرد دل پھینک ہوا کرتے ہیں
خود کو دن رات سجا کر رکھیو

گیسوؤں میں نہ سفیدی جھلکے
انہیں پابندِ حنا کر رکھیو

بات بے رحم ہے تنہائی کی
خواب پلکوں پہ سجا کر رکھیو

مرثیہ، گیت، لطیفے گالی
کوئی کہرام مچا کر رکھیو

اب ہنر ہو گیا سرقہ منہ پھٹ
اپنی غزلوں کو چھپا کر رکھیو

شیخ سلیم
(لکچرر انوار العلوم کالج۔ حیدرآباد)

ناز اٹھانے کو ہم رہ گئے فقیروں کے

ابتدائے آفرینش سے انسان ناز اٹھاتا آیا ہے، کبھی فطرت کے معاندانہ رویہ سے خوف کھا کر اور کبھی فطری تقاضوں سے مجبور ہو کر اور یہ خوبیاں و خامیاں انسان کے رگ و پے میں خون کے ساتھ سرایت کر گئیں، کیوں کہ خالقِ کائنات نے انسان کی سرشت میں یا قسمت میں یہ لکھ دیا ہے کہ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی کے ناز اٹھاتا رہے۔ ناز اٹھانے کے مرحلے اور مواقع الگ الگ ہی سہی مگر ناز اٹھانے کا یہ رجحان عالم گیر تحریک کی شکل اختیار کر چکا ہے، اس کے باوجود یہ سچ ہے کہ محبوب کے (کبھی اپنا اور کبھی دوسروں کا) اور داماد کے ناز اٹھانا تو ضرب المثل بن گیا ہے، اس کے بہترین (آپ چاہیں تو بدترین بھی کہہ سکتے ہیں) مرقعے ہماری سیاست میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اب تو یہ نازوں کے پالے انسان نہ جانے کون کون سے ناز اٹھانے پر مجبور ہیں۔ اس کا اندازہ تو سماج و معاشرے میں مختلف جگہوں کا مشاہدہ کرنے ہی سے ہو سکتا ہے۔ ہمیں کبھی ڈاکٹروں اور لیڈروں کے ناز اٹھانے پڑتے ہیں تو کبھی اربابِ بلدیہ و بلدہ کے اور کبھی خادماؤں کی ناز برداری کرنی پڑتی ہے۔ (بیویوں سے زیادہ) تو کبھی سسرال والوں کی لیکن آج کل موجودہ سائنسی ترقی یافتہ عہد میں جہاں اذہان نظریات اور اقدار بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں، مذکورہ بالا نظریات اور روایات بھی بدلتی جا رہی ہیں، اس لیے اب تو سب سے زیادہ ناز فقیروں کے اٹھانے پڑ رہے ہیں۔ عہدِ عتیق و عظیم میں فقرا اپنی شانِ بے نیازی اور قناعت، سلوک، ریاضت، یادِ الٰہی کے ذریعہ بڑے بڑے غیور بادشاہوں کو اپنا ناز اٹھانے پر مجبور کر دیتے تھے مگر دنیا والوں کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کرتے تھے، جبکہ آج کل ہر چیز دراز ہوتی جا رہی ہے جیسے دست درازی اور زبان درازی وغیرہ وغیرہ۔ فقیروں کی انہی صفات کی وجہ سے بڑے بڑے بادشاہ فقیرانہ درویشانہ طرزِ زندگی اختیار کرتے تھے اور میر کے اس شعر کی عملی تنقید کا عملی نمونہ ہوتے:

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

ادھر اقبال نے بھی اپنے بیٹے کو یہ تلقین کی تھی:

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

مگر آج کل تو سماج میں، جہاں دیکھو غالب کے اس شعر کی دھوم نظر آنے لگی ہے:

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

چنانچہ مختلف حلیوں اور حالتوں کے فقیر ہمیں جا بہ جا نظر آجائیں گے، معلوم نہیں فقیروں کی اس روز افزوں بڑھتی تعداد سے ملک و قوم کی ترقی کا اندازہ کیا جائے یا فقیروں کی تیز رفتار ترقی کی تعریف کی جائے۔ سڑک کے کنارے سے لے کر بازاروں تک، مسجدوں کے دروازوں سے لے کر مے کدوں تک، گھروں اور گھرانوں سے لے کر ہوٹلوں و پارکوں تک، الیکشن کے پلیٹ فارم سے لے کر ریلوے پلیٹ فارم تک ہر طرف ان فقیروں کی قطاریں نظر آتی ہیں اور کبھی کبھی یہ قطار اتنی طویل ہو جاتی ہے کہ بین الاقوامی سطحوں تک پہنچ جاتی ہے، اس لیے فقیروں کے ناز اٹھانے سے کوئی بچ نہیں سکتا، فقیروں کے ناز اٹھاتے اٹھاتے ہمیں بھی اتنا تلخ و شیریں تجربہ (تلخ زیادہ) ہو گیا ہے کہ اب ہمیں حقیر و فقیروں اور امیروں میں کوئی فرق ہی نظر نہیں آتا۔

ایک دفعہ ایک ایسے ہی ماہر نفسیات فقیر سے سابقہ پڑا، ہم تو خیرات دے کر دل ہی دل میں بڑے نازاں تھے اور اس کا رنگ ہمارے چہرے سے چھلکنے لگا تھا جسے دیکھ کر فقیر نہایت تدبر اور دانش مندانہ لہجہ میں ہم سے کہنے لگا کہ آپ مجھے خیرات دے کر اتنا خوش نہ ہوں اور یہ نہ سمجھیں کہ آپ نے مجھ پر کوئی احسان کیا ہے بلکہ میں نے ہی آپ پر احسانِ عظیم کیا ہے، ہم نے نہایت تعجب سے اس سے پوچھا کیسے؟ فقیر نے ناصحانہ انداز میں کہا کہ اگر ہم لوگ خیرات لینے سے انکار کر دیں تو پھر تمہارے پاس ثواب حاصل کرنے کے کون سے وسیلے رہ جائیں گے! ہم تو یہ جواب سن کر نہایت خجل ہوئے اور اپنی کم علمی و کم مائیگی پر شرمندہ بھی، کیوں کہ ہم نے تو بہت سارے وسیلوں کے متعلق معلوم کر رکھا تھا مگر فقیر کے بتائے ہوئے وسیلے کی طرف کبھی ذہن گیا ہی نہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہم اپنے گھر میں بیٹھے ریزگاری کی قلت پر غور و فکر کر رہے تھے کیوں کہ اس کے سوا ہمارے پاس کوئی اور مسئلہ بھی تو نہیں تھا جس پر غور و فکر کرتے، اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی کسی نے صدا لگائی۔ ہم نے نادانستہ طور پر بے اختیار کہہ دیا کہ بابا پیسے نہیں ہیں، تو فقیر نے بھی اپنی برجستگی کا بروقت مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "پیسے نہیں ہیں تو گھر پر بیٹھے کیا کر رہے ہیں، ساتھ چلیے۔ فقیر کی جرأت آموز بے باکی پر ہم بہت جز بز ہوئے مگر کیا کرتے اپنا دل مسوس کر رہ گئے، ناز اٹھانے کی عادت جو تھی۔

جمعہ کی نماز پڑھ کر ہم خوشی خوشی مسجد سے باہر نکلے تو دیکھا کہ فقیروں کی قطار در قطار ثواب بانٹنے میں مصروف ہے، ہم نے بھی نیکی کے جذبے سے مغلوب ہو کر ثواب حاصل کرنے کا ارادہ کیا اور فقیروں میں پیسے تقسیم کرنے لگے، آخر جیب کو کبھی تو خالی ہونا تھا، ہم نے کچھ فقیروں سے معذرت چاہتے ہوئے کہا کہ بھائی معاف کرو پیسے ختم ہو گئے ہیں (ہمیں اکثر اس صاف گوئی اور بے باکی پر اسی طرح رسوا ہونا پڑا) فقیروں نے اجتماعی طور پر بیک آواز کہا کہ پیسے کم تھے تو خیرات بانٹنے کی حماقت کیوں کی؟ تم نے جتنے پیسے تقسیم کیے ہیں اس سے زیادہ تو ہمارے پاس ہر وقت

[illegible]

ایک روز ہم بڑی جلدی میں تھے۔ آفس جانے کے لیے دیر ہو رہی تھی، اچانک گلی کے نکڑ پر ہماری ملاقات ہمارے قدیم دوست سے اس حالت میں ہوئی کہ ہمارا دل بھر آیا، باوجودیکہ ہمیں دیر ہو رہی تھی ہم نے اپنے قدیم ترین دوست سے پوچھا "یہ کیا حالت بنا رکھی ہے" تو اس نے بڑے عبرت آمیز لہجے میں کہا کہ خیرات دیتے دیتے میری یہ حالت ہو گئی ہے، جو لوگ ہم سے خیرات لیتے تھے وہ سب امیر ہو گئے اور ہم فقیر!

ایک روز کا بڑا سنگین اور غمگین واقعہ ہے کہ ہم اپنی بلڈنگ کی بالائی منزل سے شہر کے خوب صورت (جواب کم ہی رہ گئے ہیں) مناظر کا مشاہدہ کر کے لطف اندوز ہونے کی کوشش کر رہے تھے کہ اچانک نیچے نظر پڑتے ہی ایک صاحب ہاتھ ہلاتے ہوئے ہمیں بلاتے نظر آئے، ہم نے سوچا کہ یقیناً کوئی ضروری کام ہوگا! ہم دوڑے دوڑے ہانپتے کانپتے نیچے آئے تو اس شخص نے نہایت متانت اور سنجیدگی سے خیرات مانگی، ہمیں غصہ بہت آیا، مگر انتقام لینے کے لیے ہم نے اس شخص کو اوپر آنے کے لیے کہا تو اس فقیر نے شاطرانہ انداز میں کہا کہ نہیں اوپر نہیں آؤں گا کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے اوپر لے جا کر کہیں گے کہ معاف کرو، ہم اب اتنے بھی بے وقوف نہیں رہے جتنا کہ۔۔۔۔" ہم اپنی شکست پر ہاتھ ملتے رہ گئے۔

اسی طرح ایک دن ہم اپنے گھر کے کتب خانے میں بیٹھے مولوی نذیر احمد کی کتاب "چند پند سودمند" پڑھ رہے تھے، ہمارے کانوں میں رس بھری آواز پڑی جو صحت مندی کی چغلی کھا رہی تھی، ہم نے دروازے پر آ کر دیکھا تو واقعی ایک صحت مند اور تنومند فقیر کھڑا بھیک مانگ رہا تھا، ہم نے اس سے کہا کہ صحت مند اچھے خاصے ہٹے کٹے ہو تو پھر بھیک کیوں مانگتے ہو، کوئی کام کیوں نہیں کر لیتے۔ جس پر فقیر نے نہایت خفگی سے کہا کہ صاحب میں نے بھیک مانگی تھی آپ سے مشورہ نہیں مانگا، اس دن سے ہم نے کسی کو مفت مشورہ دینا ہی چھوڑ دیا۔

قدم بہ قدم، شانہ بشانہ، ترقی کی ایک ہی منزل کی طرف

یوم جمہوریہ 26 جنوری 1996ء

ایم اے حنّان
(حیدرآباد)

مکان ہی ملا نہ قطعۂ زمین

یوں تو ہمارا اور گھر کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ ایک گھر ہی میں ہم نے اپنی دونوں آنکھیں کھولیں۔ ابتدائی پرورش اور پرداخت بھی گھر ہی پر ہوئی۔ بالغ ہوئے اور یہیں سے ہماری عملی زندگی کا آغاز ہوا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب تک اس گھر میں لینے دینے کی ذمہ داری ہمارے بزرگوں کے سر تھی۔ جو ہماری شادی خانہ آبادی کے بعد ہمارے سر پر سوار ہو گئی۔

ایک دن ہماری نصف بہتر نے یہ مژدۂ جانکاہ سنایا کہ ہمارا اکلوتا کمرہ جو عرصۂ دراز سے کئی عدد نفوس کی رہائش کا بوجھ سہار رہا ہے۔ اُس میں مزید کسی خوش خبری کے سمانے کی قطعی گنجائش نہیں اور کسی بھی ننھے مہمان کی متوقع آمد کسی شدید رہائشی بحران کا سبب بن سکتی ہے اور جلد از جلد ایک عدد مکان ڈھونڈھ لینے کا مشورہ دیا۔

پہلے پہل ہم نے اپنے دوستوں، رشتہ داروں اور شناساؤں سے اپنی اس تیسری ضرورت کا ذکر کیا جواب میں انھوں نے ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے سارے اعداد و شمار من و عن ہمارے آگے پیش کر دیئے۔ رہائشی، مشکلات اور مسائل پر تفصیلی لیکچر دے ڈالا۔ مستقبل میں درپیش خطرات سے کما حقہٗ آگاہ کرتے ہوئے فرمایا اگر آبادی بڑھنے کی یہی طوفانی رفتار رہی تو عنقریب ملک کی آبادی اتنی بڑھ جائے گی کہ سڑکوں پر چلنا پھرنا دشوار ہو جائے گا۔ پیدل چلنے کے لیے بھی لائسنس درکار ہوگا۔ جس پر آپ کے گھر نکلنے لوٹنے کے اوقات اور سمتیں درج ہوں گی لیکن موصوف ایک عدد خالی مکان کی تلاش میں قطعی ناکام رہے۔

چنانچہ حسب معمول دوستوں اور رشتہ داروں کے غیر ہمدردانہ رویّے سے مایوس ہو کر ہم مکان دلانے والے ایک ایجنٹ سے رجوع ہوئے اور ڈیڑھ سو روپیے رجسٹریشن فیس دے کر ایک ایسا مکان کہ جس پر بقول غالب،

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب

بلکہ سبزہ، چچا غالب کے تجربے سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ ایک عدد نیم تاریک ہال سے متصل دو مکمل تاریک کمرے اس کی کل کائنات تھی۔ جس میں انجینئرانہ مہارت سے ایک عدد نام نہاد ٹائلٹ اور باتھ روم کی سہولت فراہم کی گئی تھی۔ گہرے اندھیرے کے پیش نظر ایجنٹ نے دن رات بتی جلانے اور پانچ سو بتی کا بلب استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن ہماری دانست میں تو ایک خوف ناک آتشیں دھماکہ ہی اس گھور اندھیرے کو پاٹ سکتا ہے۔ ٹائلٹ میں کچھ اس قسم کا سامان رکھا تھا جو عموماً ڈرینیج عملہ کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ یعنی سڈول لکڑیاں، موٹا رسا، ٹاٹ اور چھوٹی سی بکٹ وغیرہ۔ استفسار پر بتایا کہ ڈرینیج والوں کے امکانی تساہل اور لاپرواہی کے پیش نظر یہ سہولت فراہم کی گئی ہے۔ بعد ازاں خارجاً مسموع ہوا کہ ہر دوسرے تیسرے دن اس کی ضرورت پیش آجایا کرتی ہے۔ بصورتِ دیگر گھر میں نہ صرف ہمارا بلکہ پڑوسیوں کا رہنا بھی دشوار ہوجاتا ہے۔

دوسرا گھر جس کا ہم نے دیدار کیا اور جو آگے چل کر اس گھر کا آخری دیدار ثابت ہوا۔ 5-32 مربع گز پر مشتمل تھا۔ جس پر مالک مکان ایک عظیم الشان رہائشی اپارٹمنٹ کی تعمیر کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے میونسپلٹی میں عرضی بھی دے دی تھی اور منظوری کا بڑی بے چینی اور اختلاج کے ساتھ انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے تو ہمارا اچھا خاصہ انٹرویو لے ڈالا۔ ہمارا حسب نسب، نام معہ ولدیت پوچھا دیگر افراد خاندان کی تعداد، جنس، عمر اور پیشے دریافت کیے۔ جائیداد، بینک بیلنس، فکس ڈپازٹس، شیئرز اور انشورنس پالیسی اور دیگر خفیہ ذرائع آمدنی کے بارے میں پوچھا، موجودہ گھر ترک کرنے کی وجوہات دریافت کیں پچھلے چھ مہینوں کے دوران کسی موذی اور متعدی مرض میں مبتلا نہ رہنے اور کسی فوجداری مقدمہ میں ماخوذ نہ رہنے کا تیقن حاصل کیا۔ شاید یا تناسب جاننے کے بعد بھی ان کی تسلی نہیں ہوئی۔ کہا کہ ہمارے کردار کی مزید تصدیق کے لیے اگر وہ پولس انکوائری یا تفتیش کروانا چاہیں تو ہمیں کسی قسم کا اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔!

پھر گھر کیا تھا سفیدی سے مبرا نصف کمرہ اور اس سے ملحق نصف ٹائلٹ اور باتھ روم۔ کمرہ کے ایک کونے میں قدیم وشکستہ میز پڑا تھا جسے وہ حیرت انگیز طور پر باورچی خانہ کہہ رہے تھے یعنی میز کے نیچے گیس اور اوپر چولھا اور دیگر برتن کی اشیا رکھ کر اس سے کچن کا کام لیا جاسکتا تھا۔ گھر میں لکڑی جلانا منع تھا۔ کیروسین کا استعمال بھی ممنوع تھا۔ کوئی نصف درجن ہدایات اور احتیاطی تدابیر کے ساتھ صرف گیس کے استعمال کی اجازت تھی۔ ریڈیو، ٹی وی، ٹیپ ریکارڈر کی سماعت کے اوقات مقرر تھے۔ ان کی انتہائی آواز کا بھی تعین کر دیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے اور بیوی سے جھگڑنے کی آواز کی بلندی بھی طے کر دی گئی تھی۔ دیوار و در اور رنگ و روغن کو کسی قسم کا گزند پہنچنے پر نقصان کی پابجائی رقم کی شکل میں کرنی ہوگی۔ جس کے نرخ مقرر تھے۔ روپے پر سو درّے کے مصداق مکان کی سفیدی اور رنگ پاشی وغیرہ کے لیے ایک مہینہ کا کرایہ پیشگی نقد ادا کرنے کے علاوہ، دس ہزار روپے بطور ڈپازٹ دینے تھے!!

غرض کہ مالک مکان کی کڑی شرائط اور جارحانہ انٹرویو ہی کسی شریف آدمی کو یہاں سے بھگانے کے لیے کافی تھا۔

تیسرا امکان مشترکہ تھا۔ اگرچہ کہ بظاہر کوئی اس کا شریک نظر نہ آتا۔ لیکن ان پر حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ دن میں تو کوئی اس کا شراکت دار نہیں۔ البتہ انہیں بلکہ رات دیر گئے کوئی اس پر اپنا حق جتاتا ہے۔ چناں چہ کبھی کبھار نصف شب کے بعد سلام کرنے کی گرج دار آواز سنائی دیتی ہے۔ کوئی دکھائی نہیں دیتا! جواب دینے پر یعنی بآواز بلند "وعلیکم السلام" کہہ دیں تو معاملہ ختم۔ وہ اپنی جگہ، آپ اپنی جگہ۔ اس گھر کا کوئی کرایہ مقرر نہیں تھا۔ صرف سالانہ ٹیکس ادا کر دینا کافی تھا۔ نل اور لائٹ والے تو اِدھر کا رخ بھی نہیں کرتے تھے تو پھر آخر ہم پیسے اس گھر میں سکونت اختیار کرتے ؟!!

مکانات کی عجیب و غریب ہیئت کذائی، کڑی شرائط اور منہ مانگے کرایوں سے عاجز آکر ہم نے کرایہ کے مکان کے بجائے ایک عدد پلاٹ خرید لینا مناسب سمجھا تاکہ حسب مرضی مکان تعمیر کیا جاسکے۔ اس سلسلے میں جب ہم نے اپنے سابق ایجنٹ سے ربط پیدا کیا تو اس نے اس نیک خیال کی پرزور تائید کی اور مزید سو روپے بابت رجسٹریشن برائے خریدی پلاٹ وصول کر لیے اور پلاٹ کے خریداروں کے لیے ایجنٹ اور دیگر شائقین کی ایک پوری ٹیم کے ہمراہ ٹیکسی کی گاڑی میں سوئے منزل روانہ ہوئے۔ گاڑی میں جو سوار ہوئے تو کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے یوں ہی سوار رہے۔ یہ ایکسپریس سروس سے بھی کوئی ماورائے لگتی تھی۔ جو کہیں رکنے کا نام نہ لیتی۔ خدا خدا کر کے ایک مقام پر گاڑی رکی۔ نیچے اترے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے حقیقی خسر سامنے کھڑے ہیں۔ وہ ہمیں یہاں دیکھ کر فرط مسرت سے بغل گیر ہو گئے۔ بیوی بچوں کو ہمراہ نہ لانے کی شکایت کی۔ جب ہم نے اپنا مدعا بیان کیا تو دوبارہ خوش ہوئے اور سسرالی گاؤں میں زمین لینے کے اس جذبہ کی پرزور ستائش کی۔ بڑی شفقت سے ہمیں اپنے گھر لے گئے۔ دعوت کا اہتمام کیا۔ دو چار گھنٹے قیام کے بعد وہاں سے بذریعہ ٹرین گھر لوٹ سکے! دراصل اس ایجنٹ نے زمین دکھانے کے بہانے ہمیں اپنے سسرالی گاؤں پہنچا دیا تھا!!

دوسرے دن ایجنٹ کی مزاج پرسی کے لیے پہنچے تو اس نے کمال ہشیاری سے ہمیں شہر کے قریب واقع ایک پلاٹ سے رجوع کر دیا۔ زمین قدرے سنگلاخ تھی جس کے بارے میں ایجنٹ کی رائے تھی کہ گھر کی تعمیر کے وقت یہ پتھر بے حد کارآمد ثابت ہوں گے۔ باہر سے منگوانے کی قطعی ضرورت نہ ہوگی۔ اس طرح کافی رقم کی بچت ہو جائے گی وغیرہ۔ زمین کے معائنہ کے دوران اتفاقاً ہمارا پیر ایک چھوٹے سے پتھر سے ٹکرا گیا۔ پاس میں ایک چھوٹا سا گڑھا بھی نظر آیا۔ اندر جھانک کر دیکھا تو غیر ارادی طور پر منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ انسانی ہڈیوں کا مکمل ڈھانچہ دراز تھا۔

قبرستان کی زمین دکھانے پر ہم سخت برہم ہوئے اور ایجنٹ کی سرزنش کی۔ اس نے بتایا کہ رہائشی مسائل کے تناظر میں مالک قبرستان ہی نے اسے یہ زمین فروخت کی ہے!!

ہمارے شدید ردعمل کو دیکھ کر اس نے فوراً ایک تیسرے پلاٹ کا ذکر کر دیا۔ یہ زمین ریگزار کی تھی۔ جس میں قدرے نمی تھی۔ اطراف و اکناف جدید طرز و وضع کے چھوٹے بڑے مکانات تیزی سے تعمیر کیے جا رہے تھے۔ یہ علاقہ قلب شہر میں واقع تھا۔ صرف حیرت اس بات کی تھی کہ شہر بسنے کے پورے پچاس سال بعد یہاں رہائش کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہم نے دل ہی دل میں اسے خریدنے کا فیصلہ کر لیا۔

اور پلاٹ کا تفصیلی جائزہ لینے کے لیے دو چار قدم آگے بڑھے تھے کہ "پیروں تلے زمین کھسکا جانے کا محاورہ صادق آ گیا۔ اگرچہ کہ پیروں تلے زمین مکمل طور پر غائب تو نہیں ہوتی تھی بلکہ قدرے اندر دھنس گئی۔ جو بتدریج اندر ہی دھنستی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ہم کمر تک غرقاب ہو گئے۔ باہر نکلنے کی لاکھ کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ مدد کی آواز دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ہماری چیخ و پکار سن کر پاس ہی موجود چند شریف آدمی دوڑے دوڑے آئے اور انھوں نے بڑی مشکل سے ہمیں اس دلدل سے باہر نکالا۔!

اس طرح کیچڑ میں لت پت دیکھ کر پہلے تو لوگوں نے یہ سمجھا کہ ہم "نیچرو تھراپی" کروا رہے ہیں۔ لیکن جب انھیں اس بات کا علم ہوا کہ ایک عدد پلاٹ کی تلاش نے ہمارا یہ حشر کیا ہے تو انھیں بے حد قلق ہوا اور لوگوں نے ہمیں اس ایجنٹ وغیرہ کے چکر سے نکلنے کی تلقین کی۔ ایک کرم فرما نے رخصت ہوتے ہوئے از راہ عنایت شہر کی ایک معزز شخصیت کا پتہ بتلایا اور کہا کہ ان کے یہاں متعدد "پلاٹس" فروختگی کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ کسی کو مایوسی نہیں ہوتی۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق نہا دھو کر سیدھے ان کے پاس پہنچے۔ آدمی نہایت معقول نظر آئے۔ ساری فیملی اسٹیٹس (Estates) میں تھی۔ شاید صرف وہ قوم کی خدمت کے پیش نظر یہاں رک گئے تھے۔ لب و لہجہ اس قدر شیریں اور نرم تھا کہ اس انداز سے متاثر ہو کر ہم نے ۱۵۰ مربع گز زمین "لاٹری" کے ذریعہ حاصل کر لی۔

پلاٹ کی خریدی کے بعد اس کی نگرانی کے لیے ہم ہر ماہ پابندی کے ساتھ مقام مذکور کے دو ایک چکر لگاتے۔ ایک دن معمول کی گشت کے دوران کیا دیکھتے ہیں کہ ایک اجنبی شخص ہمارے پلاٹ کی نوک پلک سنوارنے میں مصروف ہے۔ استفسار پر اس نے بتایا کہ اس نے یہ زمین خرید لی ہے۔ اس زمین پر ایک "آئیڈیل فلیٹ" تعمیر کرنے کا ارادہ ہے۔!!

یہ سن کر ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ لیکن ہم ان حواس کو مجتمع کرتے ہوئے زمین کی خریدی کے کاغذات و نقشہ جات اس اجنبی کے آگے پیش کر دیئے۔ ادھر جواب میں اس نے بھی ہو بہو ویسے ہی کاغذات ہمارے روبرو رکھ دیئے۔!

اس غیر متوقع صورت حال کے پیش نظر ابھی ہم کسی نتیجہ پر پہنچ نہیں پائے تھے کہ ایک اور بزرگ ایک نوجوان کے ہمراہ ہمارے قطعہ زمین پر نمودار ہوئے جو ہماری زمین کے نامعلوم مالکین میں سے ایک مالک نکلے۔ انھوں نے بڑی مسرت سے بتایا کہ حال ہی میں انھوں نے یہ پلاٹ اپنے داماد کے لیے خریدا ہے اور بہت جلد اپنے نئے نویلے داماد کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کرنے والے ہیں۔!

قبل اس کے کہ ہم اُن سے کچھ کہتے ایک نوخیز ولو بیاہتا جوڑا آ کر ہمارے پلاٹ کے آگے رکا اور اسے دیکھ کر فرط مسرت سے سرشار ہو گیا اور اتنی دیر تک سرشار رہا کہ ہمیں کچھ کہنے کا موقع نہ مل سکا۔

سخت برہمی اور غصہ کے عالم میں ہم سیدھے مالک زمین کے گھر پہنچے۔ وہ گھر پر دستیاب نہیں تھے۔ محلے میں بھی نہیں پائے گئے بلکہ شہر سے بھی غائب تھے۔ کافی تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ وہ اپنے کسی عزیز

ملاقات کے لیے "اسٹیٹس" روانہ ہو گئے ہیں۔ وہاں دو چار ماہ قیام کے بعد وطن واپس ہوں گے۔

چناں چہ چھ ماہ کے صبر آزما انتظار کے بعد وہ لوٹے۔ جب ان کی فروخت کی ہوئی اکلوتی زمین کے چاروں مالکین نے ان کا گھیراؤ کر دیا تو ان پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ کچھ کہنے کے موقف میں تھے اور نہ کچھ کرنے کے بعد ازاں یہ انکشاف ہوا کہ بڑے بڑے آدمی تھے۔ بڑے آدمیوں کی کچھ ہابیز ہوا کرتی ہیں۔ اس طرح ایک قطعہ زمین دو چار اشخاص کو فروخت کر دینا ان کی ہابی تھی۔ چناں چہ وہ چار ایکڑ زمین کے پلاٹس گزشتہ ربع صدی سے کامیابی کے ساتھ مسلسل فروخت کر رہے تھے۔

بہر حال کافی تگ و دو اور پولیس کے ایک اعلیٰ عہدہ دار کی مداخلت کے بعد ہم اس زمین کی بازیابی میں صرف اس لیے کامیاب رہے کہ ہم اس کے پہلے خریدار تھے۔ جس کے فوری بعد کسی انجانے خدشے کے پیش نظر ہم نے اس پلاٹ کو ایک "نیم معزز شہری" کے ہاتھوں فروخت کر دیا اور سکون کی سانس لی لیکن اب ہماری یہ حالت تھی کہ:

مکاں ہی ملا نہ قطعہ زمیں
ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

شکیل اعجاز ۔ اکولہ

تو کہاں ہے یہ بتا' اِس نشیلی رات میں

رپورتاژ

پچھمڑی (PACHHMADI) جیسا بلند پہاڑی مقام اور دسمبر کی سردی۔ ہم لوگ اس سے قبل مسوری اور مہابلیشور میں قیام کر چکے تھے۔ پچھمڑی بالکل ویسا ہی نکلا۔ کیا سارے ہل اسٹیشن ایک جیسے ہوتے ہیں؟ وہی آثار چڑھاؤ والی سڑکیں، جگمگاتی دوکانیں۔ دوکانوں میں انواع و اقسام کے گرم کپڑے۔ امپورٹیڈ دوربین اور کیمرے بڑی بڑی ہوٹلیں اور سبزیوں کی دوکانیں۔ جن میں گاجر، مولی، گوبھی، جام اور دوسری چیزیں ایک ہی انداز میں سجا کر رکھی ہوئیں۔ اور ان سب کے علاوہ ہر طرف، ہر جگہ، بے شمار، خوبصورت، جوان لڑکیاں اور لڑکے۔ ہنسی، قہقہے، محبتیں۔ جگہ جگہ الاؤ جل رہے جن میں جنگل سے لائی ہوئی ٹہنیوں کو آگ میں جھونک دیا گیا ہے۔ جیسے ہمارے دیش کی سیاست نے جوانوں کو فرقہ پرستی کی آگ میں جھونک دیا ہے۔ اندھیری رات میں فرقہ پرستی کی یہ آگ بڑی سہانی لگ رہی ہے۔ لیکن کل؟ جب نیا سورج نکلے گا؟

دوکانوں پر بلند آواز ٹیپ ریکارڈ، گاہکوں کو متوجہ کر رہے ہیں۔ ہم نے چائے پی اور ہوٹل پہنچ کر اشارٹی وی آن کر دیا۔ یہاں ہوٹل میں دو کمسن لڑکے ہیں۔ رام سنگھ اور سنیل۔ ساتویں جماعت کی عمر کے۔ لیکن پڑھائی چھوڑ چکے ہیں۔ اور مسافروں کی خدمت میں لگے رہتے۔ رات گیارہ بجے بھی چائے کے لیے آواز دو تو بیٹھی بیٹھی نیند سے خود کو کھینچ کر چائے بنانے بیٹھ جاتے۔ کیا یہ بچے زندگی بھر اسی طرح بس خدمت کرتے رہیں گے؟ اور جب جسم مضمحل ہو جائے گا تب موت کا انتظار کریں گے؟ مجھے لگا یہ بھی الاؤ میں جل رہے ہیں اور ان بچوں کی قسمتوں کے ذمہ دار، دیش کو چلانے والے بڑے لوگ؟ الاؤ کے سامنے اپنی ہتھیلیاں گھستے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ اس غضب کی سردی میں یہ آگ کتنی اچھی لگ رہی ہے۔

کل شام SUNSET POINT سے اترتے وقت بھابی جان نے انکشاف کیا تھا کہ وہ اس پہاڑ کی چڑھائی سے بہت خوفزدہ تھیں۔ بھائی نے خوش ہو کر کہا "تب تو یہاں آنا بڑا مفید ہوا۔ مجھے تو پتہ چلا کہ آپ' جن سے میں ڈرتا ہوں' آخر کس چیز سے ڈرتی ہیں۔ آپ جب بھی مجھے ستائیں گی پچھمڑی لے آیا کروں گا۔ اس کے بعد لفظ 'پچھمڑی' مذاق کے لیے تلمیح کا کام کرنے لگا۔ جہاں کسی بات پر بھابی جان نے بھائی سے بحث شروع کی اِدھر بچوں اور ہم نے ایک ساتھ چلانا شروع کر دیا کہ اگلے ماہ پھر پچھمڑی آئیں گے۔ یہ سنتے ہی بھابی جان مسکرا کر خاموش ہو جاتیں۔ دو تین دفعہ کے بعد بھائی نے چپکے سے ہم کو چائے پلوائی اور شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہماری اس حرکت کے سبب وہ اب تک ماہانہ سو روپے کے خسارے یعنی

غیر ضروری خریداری سے بچ گئے ہیں۔ یہ سُننا تھا کہ مسرور کی رگِ شرارت پھڑک اُٹھی! انھیں بہانہ چاہیئے بس چائے پینے کے بعد بھائی کو بلیک میل کرنے لگے کہ کافی پلوایئے ورنہ بھابی جان سے کہہ دیں گے کہ پندرہ سو روپے والی ساڑی پسند کریں ہم "چھپڑی چھپڑی" نہیں کریں گے۔ دونوں پارٹیوں سے چائے اور ناشتے اُڑاتے وقت ان کے بچّے اور ہم بڑے خوش رہے۔

آج صبح کیلاش نامی گائیڈ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ پہلا پوائنٹ ہے مہادیو۔ پہاڑ کے اندر ہی اندر۔ اتنی اندر کہ روشنی اور ہوا کا بھی گزر نہ ہو، ایک مورتی ہے جس کے نیچے پہاڑوں کا پانی بہہ رہا ہے۔ وہاں اُلٹے سیدھے سوالوں سے گائیڈ اُلجھنے لگا ہے میں نے کہا بھائی، ہم کو یہاں مہینہ بھر ساتھ رہنا ہے۔ نرم زبان کا ٹھیک استعمال کرو۔ اس کے بعد بائیس سالہ کیلاش نارمل ہوگیا۔ پھر دوسری طرف گئے جہاں دو پہاڑوں کے درمیان ایک خفیہ راستہ ہے جو بقول گائیڈ کئی میل تک اندر جاتا ہے اور آخر کار ایک بہت خوبصورت جنگل میں نکلتا ہے۔ یہاں سے روانہ ہوئے تو SUICIDE POINT یا خودکشی پوائنٹ پہ رُکے۔ مسرور کا کہنا ہے کہ بیویوں کی موجودگی میں شوہروں کی پسندیدہ جگہ ہے یہ۔ ہر طرف اونچے، خوبصورت، دُھند میں ڈوبے ہوئے ہرے ہرے پہاڑ۔ نیچے نظر کریں تو ایسی ہی خوبصورت لیکن خوب گہری کھائی۔ گرے تو لاش بھی دکھائی نہ دے۔ گائیڈ کہہ رہا ہے ـــــ وہ نیچے جو کھائی دکھائی دیتی ہے وہاں تک پیدل پہونچنے کے لیے ساڑھے تین گھنٹے لگتے ہیں۔ لیکن یہیں اُوپر سے چھلانگ لگادیں تو صرف سترہ سکنڈ میں وہاں پہنچ جائیں گے! اس پر مسرور نے کہا کہ چھلانگ نیچے لگائیں گے لیکن سترہ سکنڈ بعد "اوپر" پہنچ جائیں گے۔

بی فال: اور اب ہم لوگ جارہے ہیں۔ اس سفر کی سب سے خوبصورت جگہ بی فال (BEE FALL) کی طرف۔ ایک جگہ گاڑی روک دی گئی۔ یہاں سے نارنگی دھول میں اَٹا ایک راستہ درپیش ہے۔ دو کلومیٹر یہاں جیپ کی آمد و رفت تو ہوسکتی ہے لیکن مارُوتی نہیں اس لیے پیدل سفر شروع ہوا۔ راستہ طے کرنے کے لیے گانے گائے جارہے ہیں۔ کیلاش کے سبب کہیں کہیں راستہ چھوڑ کر شارٹ کٹ کا سہارا بھی لے لیتے! آج کل لوگوں نے مذہب میں بھی شارٹ کٹ اپنا لیا ہے۔ فرض نمازیں پڑھ کر فوراً مسجد سے باہر نکل آنا۔ تراویح میں بیس کی بجائے آٹھ ہی رکعتیں پڑھنا۔ مذہبی شارٹ کٹ کا کیا انجام ہوتا ہے پتہ نہیں لیکن اس راستہ کے شارٹ کٹ کا انجام بخیر ہوا۔ کم وقت اور کم تھکاوٹ میں وہاں تک پہنچ گئے جہاں سے بی فال کا پہاڑی، کچّا ڈھلوانی راستہ شروع ہوتا ہے۔ اب آبشار تک پہنچنے کے لیے دو کلومیٹر نیچے اترنا ہے۔ ایک ایسے راستہ پر جہاں پتھروں اور جھاڑیوں کے سوا کوئی سیڑھیاں نہیں ہیں۔ لوگ پھسل رہے ہیں۔ ڈر رہے ہیں۔ گھنے جنگلوں کا سرسبز و شاداب، چٹانوں سے گھرا یہ راستہ اپنے اُونچ نیچ کے سبب اچھا لگا۔ سورج اپنا نصف سفر کر کے روانگی کے راستہ پر ہے۔ اُترنے کی پریشانیوں کے باوجود، نیچے نظر کرنے پر یہ جنگل اتنا خوبصورت لگتا کہ آدمی واپسی کا ارادہ ترک کردیتا ہے تھوڑی دیر بعد آبشار گرنے کی آواز دُور سے آنے لگی۔ دل خوشی سے پانی کی طرح اُچھلنے لگا۔ اب آواز اور قریب ہوگئی۔ اور آخر کار ایک موڑ پر وہ چاندی کے تاروں کی طرح چمکتا ہوا اور سفید ریشمی کپڑے کی طرح لہرا کر گرتا ہوا دکھائی دیا۔ ساری تھکاوٹ دور ہوگئی۔ جیسے اولاد کو چھوٹے سے بڑا کرنے کی ساری صعوبتیں خوشی میں بدل جائیں اگر اولاد لائق اور سعادت مند نکل آئے۔ تینوں بچے آبشار کے قدموں میں سب سے پہلے پہنچ گئے۔ آبشار کیا ہے اب تک کی زندگی کا اک خوشگوار خواب ہے۔ یہاں کئی پتھر اتنے

بڑے ہیں جیسے کسی عمارت کا ایک منزلہ ہوتا ہے۔ مختلف پتھروں پر بیٹھے ہوئے لوگ اپنے اپنے زاویئے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ آبشار کے قریب جہاں اس کی پھوار، دھواں سا معلوم ہوتی ہے تصویریں نکالی جارہی ہیں۔ بعض نو بیاہتا جوڑے کچھ ایسی حرکتیں بھی کر رہے ہیں جیسے آس پاس کوئی نہ ہو۔ کسر ور نے ایک موٹے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ دیکھو یہ آبشار سے زیادہ ان حرکتوں سے لذّت اٹھا رہا ہے۔ بڑے سے پتھر پر ایک لڑکا، اسٹو سے چائے بنا کر فروخت کر رہا ہے۔ لڑکے اور آدمی کپڑے اتار کر صرف نیکر میں آبشار میں اُتر گئے ہیں۔ عورتیں کپڑوں سمیت بھیگ گئی ہیں۔ یہاں دو گھنٹے کیسے گزر گئے پتہ ہی نہ چلا۔ ہم لوگ جیسے برسوں کے تھکے ہوئے یہاں تازہ دم ہو گئے۔ ایسا لگا کہ یہ تازہ دم برسوں کام آئے گا۔ سورج اب کافی نیچے اُتر چکا ہے۔ بلکہ جس گہری کھائی میں ہم آبشار کا لطف اٹھا رہے ہیں وہاں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ دھیرے دھیرے لوگ واپس ہونے لگے ہیں۔ ہم بھی واپس اوپر چڑھنے لگے تب فہیم بھائی نے کہا کہ مدھیہ پردیش کا یہ علاقہ undeveloped رہ گیا ہے۔ ایسا ہی آبشار ستودری میں بھی تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے سمنٹ کی خوبصورت سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ سفر محض اسی لیے زیادہ پُر لطف رہا کہ سیڑھیاں نہیں ہیں اور جنگل کا حسن اپنی اصل حالت میں ہمارے سامنے ہے۔ گر پڑنے کا خدشہ ہی ہے جس نے اس راستہ کو، اور آبشار کو زیادہ حسین بنا دیا۔ زندگی بھی جب آسان ہو جائے تو بے کیف ہو جاتی ہے۔ اور کسی کروڑپتی ہندوستانی کا جوان بیٹا مارلیشس میں خود سوزی کرنے میں راحت محسوس کرتا ہے۔

ریچھ گڑھ : یہ قدرتی غاریں ہیں۔ جن کے بارے میں گائیڈ نے بتایا کہ یہاں کبھی ریچھ اور شیر رہا کرتے تھے اور اب بھی آتے ہیں۔ جگہ واقعی قابلِ دید ہے۔ انگلش فلم کے کسی بھیانک غار کی طرح۔ سسپنس یا مرڈر فلمیں بنانے کے لیے ایک معقول سائٹ۔ دوپہر کی دھوپ میں وہاں بالکل اندھیرا ہے۔ آواز خوب گونجتی ہے گنگنانے گائے گئے ؎ تو کہاں یہ بتا اس نشیلی رات میں ؛ مانے نہ میرا دل دیوانہ !

یہاں سے نیچے چلے تو سات منزلہ بلڈنگ، اتنا اونچا ایک بڑا پتھر ہے جو کٹورے کی دیوار کی طرح خمدار ہے اسی طرح کے تین پتھروں نے اس جگہ کو ایک قید خانہ بنا دیا ہے۔ اوپر نظر اٹھایئے تو آسمان کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔ مجھے لگا یہاں کسی کو چھوڑ دیا جائے اور باہر جانے کا واحد راستہ بند کر دیا جائے تو ہزار کوشش سے باہر نہ نکل سکے۔ اقبال بھائی نے خیال ظاہر کیا کہ گھر سے بھاگ کر ہنی مون منانے کے لیے بہترین جگہ ہے۔ سیاح نہ ہو تو دنیا کو پتہ بھی نہ چلے کہ یہاں کوئی ہے۔ اطمینان سے، جیسا بھی چاہے، جتنا بھی چاہے، رہیئے۔

یہاں سے [illegible] کے لیے نکلے۔ راستہ میں شہناز نے پوچھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ میں نے کہا دل کو لبھانے والا۔ دلِ کش اور دلپذیر تالاب۔ اس سے ان لوگوں نے خوبصورت سپنے سجا لیے۔ یہ پیدل سفر کچھ زیادہ طویل اور تھکا دینے والا نکلا۔ بلکہ ڈیڑھ کلومیٹر کی دشوار گزار پہاڑی بھی اُترنی پڑی۔ منزل پہ پہنچے تو چھوٹے سے تالاب کے سوا کچھ نہ نکلا۔ سب مجھ پر ناراض ہوئے۔ میں گائیڈ پر۔ گائیڈ نے اس کی تعریف میں کہا کہ ہم لوگ جب بھی پکنک منانے جاتے ہیں تو ایسے پتھروں میں بس نہیں آتے ہیں۔ مسرور نے کہا آپ خوبصورت چہروں کے ساتھ پکنک منانے آتے ہوں گے۔ اتنے تنگ اور خفیہ راستے ہیں۔ اور اس تالاب کے آس پاس

ایسے ایسے محفوظ مقامات ہیں کہ ہر شخص اپنی ایک الگ پکنک منا سکتا ہے۔ اور دُور سے باتیں بھی کر سکتا ہے۔ اقبال بھائی اس ٹھنڈے اور شفاف پانی کے تالاب میں فوٹو کھنچواتے ہوئے بولے کہ یار تم نے ترجمہ تو بڑا اچھا کیا تھا لیکن جگہ اتنی اچھی نہیں نکلی۔ میں نے اپنی صفائی میں صرف اتنا کہا کہ آئندہ کسی کا ترجمہ نہیں کروں گا۔ تھوڑی دیر بعد جب حواس بجا ہوئے اور غصّہ ٹھنڈا ہوا تو یہ مقام سب کو اچھا لگنے لگا۔ (جیسے والدین کی مرضی کے خلاف کوئی لَو میرج کرلے۔ والدین ابتداء میں کہیں کہ خبردار ہمارے گھر میں قدم نہ رکھنا۔ لیکن دھیرے دھیرے بہو بیٹا گھر میں اس طرح گھل مل جائیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا) اب میں اس تالاب کی تصویریں لے رہا ہوں اور سب ایک دوسرے سے کہہ رہے ہیں دیکھو دیکھو کتنا شفاف پانی ہے۔ جیسے کانچ۔ تہہ میں پڑے ریت کے ذرّات تک صاف دکھائی دے رہے ہیں۔ مختلف رنگوں کے پتھر کیسے چمک رہے ہیں۔ ادھر دیکھو۔ یہ کالی کالی اور یہ سونے چاندی جیسی مچھلیاں۔ گہرائی بہت ہے لیکن مچھلیاں اتنی صاف نظر آرہی ہیں جیسے سامنے تیر رہی ہیں۔

تالاب پر آتے وقت، اس خطرناک حد تک گھنے جنگل میں ہم لوگ، ایک دوسرے سے آدھے گھنٹے کے لیے کھو گئے تھے۔ طرح طرح کے بُرے خیالات اور وسوسے دلوں میں آنے لگے تھے۔ ہنسی مذاق پُراسرار خاموشی میں بدل گئی تھی۔ اس لیے کہ سورج غروب ہونے کو تھا اور اندھیرا بڑھنے لگا تھا۔ بعد میں دیگر لوگوں کی آوازیں آئیں تب اطمینان ہوا لیکن آدھ گھنٹہ کا وہ پریشان کن وقفہ بعد میں دل چسپ لگا۔ میں سوچنے لگا کہ زندگی کا لُطف اسی میں ہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے، ہم کو معلوم نہیں رہتا۔ ہم اسی اُدھیڑ بن میں رہتے ہیں کہ اچھا ہوگا یا بُرا۔ ؎

آگے بھی جانے نہ تُو ۔ پیچھے بھی جانے نہ تُو ۔ جو بھی ہے بس یہی اک پَل ہے۔ (اسی لیے)

؎ یہ مت سوچ کل کیا ہوگا ۔ جو بھی ہوگا اچھا ہوگا ۔

دو سردارجی: شام کے لذیذ کھانے کے بعد خریداری کے لیے نکلے۔ یہاں دو سرداروں کی دوکانیں ہیں ایک گرم کپڑوں کی۔ دوسری الیکٹرانکس کی۔ دونوں سردارجی آپس میں سگے بھائی۔ نہایت مہمان نواز اور پُرلُطف۔ ان کی ایک دوکان پر بچوں نے مجھے ٹوکری کھولنے کے لیے دی۔ جیسے ہی ڈھکن اٹھایا۔ کالا ناگ کھڑا ہوا اور زور زور سے ہلنے لگا۔ میں نے گھبرا کر ٹوکری پھینک دی۔ اور شاید ایک بے سُری چیخ بھی ماری۔ لیکن سب ہنس رہے ہیں کل یہی دُرگت ان کی ہوئی تھی۔ وہ سانپ کا غذ کا ہے۔ لیکن فنکاری پر داد کا مستحق ہے۔ اس کو خریدنے کا ارادہ ہوا لیکن فہیم بھائی نے منع کر دیا کہ مذاق بھی ایسا نہ ہو جس سے کوئی ڈر جائے۔ اس میں لوگ پاگل ہو جاتے ہیں۔ مر بھی جاتے ہیں۔

دوسرے سردارجی، ایک موٹے تازے نوجوان ہیں۔ ہیرو ہونڈا پر شہر کے گشت پر رہتے ہیں۔ جو بھی شناسا سیاح، ہاتھ میں تھیلی یا کچھ سامان لیے نظر آتا ہے۔ اُسے سڑک کے کنارے لے جا کر آہستہ سے پوچھتے ہیں کیا خریدا؟ کہاں سے؟ کتنے میں دیا؟ ہمارے ہاں اس سے کم میں مل جاتا۔ چلئے ابھی دیکھ لیتے ہیں۔ آپ خریدیں نا۔ صرف دیکھ لیں۔

لیکن دکھانے کے بعد اس خوبصورتی سے اصرار کرتے کہ آدمی کچھ نہ کچھ خریدے بغیر واپس نہیں ہو سکتا۔

تینوں شام وہ بہاری ٹولی سے مل کر سیر کرتے رہے۔ آخری شام میں اپنے پھٹے جوتے سلوا کر اور ایک خوبصورت پیکٹ میں پیک کروا کر ہوٹل کی طرف آرہا ہوں کہ ان کی گاڑی آتی دکھائی دی۔ جوتوں کا پیکٹ اپنی بغل میں دبا کر میں نے گلیوں میں بھاگنا شروع کر دیا ہے۔ ہوٹل پہنچ کر یہ واقعہ سنا رہا ہوں کہ سردار جی مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ یہ سن کر سب لوگ ہنس رہے ہیں۔ مسترد کہتے ہیں یار تم خواہ مخواہ بھاگے۔ بغل کا سامان، سردار جی کو تھما دیتے۔ وہ خود ہی خاموش ہو جاتے۔ میں کہتا ہوں کاہے کا بابا۔ وہ سردار جی خاموش ہونے والے آدمی نہیں ہیں۔ وہ پھر بھی یہی کہتے کہ کیا خریدا؟ پھٹے ہوئے جوتے؟ کتنے میں؟ اپنے یہاں اس سے کم میں مل جاتے۔ آپ نے خریدے کیا نا۔ صرف دیکھ لیں؟

لیکن آج دونوں سردار جی بڑے مخلص اور HELP FULL ہیں۔

ست پڑا پہاڑی سلسلہ کی سب سے اونچی پہاڑیاں یعنی پچمڑھی میں ۱۴ر دسمبر کی رات بہت سرد ہے۔ بس اڈہ پر ایک بڑے میدان میں مجید شعلہ قوال اپنا کامیاب پروگرام دے رہے ہیں لیکن میدان کا نقشہ یہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے جگہ جگہ، چھوٹے چھوٹے الاؤ جل رہے ہیں۔ ان کو گھیر کر لوگ قوالیاں سن رہے ہیں۔ ان میں بعض لوگوں کی پشت، ڈائس کی طرف ہے۔ قوالی کے دوران کسی دلچسپ مرحلہ پر ان لوگوں کے ہاتھ اور جسم الاؤ کی طرف اور چہرہ ڈائس کی طرف ہو جاتا ہے۔ اگلی صبح اکولہ کے لیے روانہ ہونا ہے اس لیے ہم لوگ سونے کی کوشش کر رہے ہیں۔

نیند آئے تو تو : بستر پر دن بھر کے سیر کئے مقامات یاد آنے لگے ہیں۔ میں یہ سوچ کر محظوظ ہو رہا ہوں کہ اس خوشگوار سردی اور پورے چاندنی رات میں BEE FALL کتنا اچھا لگ رہا ہوگا آبشار رات کے سناٹے میں شور کرتا گرتا ہوگا۔ اسے دیکھنے والے ہوں گے تو صرف درخت، چٹانیں اور چھوٹے بڑے چرند پرند۔ جو دن میں کہیں چھپ جاتے ہوں گے۔ کیا قدرت کے یہ سارے کرشمے اب آپس میں باتیں کر رہے ہوں گے؟ دن میں آئے سیاحوں کے نقشے ایک دوسرے کو سنا کر ہنس بول رہے ہوں گے؟ (جیسے مسترد رات کے بستروں پر دن بھر کی باتوں پر خوب ہنساتے ہیں)۔

DUTCHES FALL کا ٹھنڈا پانی اب اور ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔ جن راستوں سے ہو کر ہم وہاں پہنچے تھے وہاں اب چاندنی چھٹکی ہوئی ہوگی۔ رہبہ گنڈ، جو دیسے ہی رومانٹک ہے۔ اب قیامت خیز ہو گیا ہوگا۔ اور ہاں، ریچھ گڑھی کی اس غار میں اور اس کے قریب کٹورے نما چٹانوں میں اب کیسا محسوس ہوتا ہوگا؟ میں بغل کے پلنگ پر لیٹے اقبال بھائی سے جب یہ کہتا ہوں کہ یار ریچھوں اور شیروں والے غار میں ایسی سخت سردی اور چاندنی میں، اور ہرے بھرے جنگل میں کوئی طاقتور شیر کسی نازک ہرنی کا شکار کر کے کھا رہا ہو تو اس کو کتنا لطف آرہا ہوگا۔ اس پر اقبال بھائی آدھے منٹ تک اپنے سوتے بیٹے اور پلنگ کو ہلا کر ہنستے ہیں اور کہتے ہیں کہ پیسے وصول کرتے ہیں تم بڑے ساتا ہو۔ اس سفر میں جتنا خرچ ہو رہا ہے اسے گھوم پھر کر وصول کر رہے ہو۔ اس طرح کی باتیں سوچ کر بھی کہ شیر کو کتنا لطف آرہا ہوگا۔ اُدھر اپنے پلنگ سے مسترد نے گرہ لگائی کہ اس غار میں اس وقت بھی کوئی کالر والا شیر کسی دو پٹے والی ہرنی سے اپنی بھوک مٹا رہا ہے یقین نہ آئے تو ابھی چل کر دیکھ لو۔

اِسں جملے پر ہم تینوں، دو منٹ تک بالکل خاموش اور اکیلے ہوگئے ہیں۔ پھر یہ حساب کرنے لگے ہیں کہ کل صبح پھپھرڈی سے نکل کر اکولا اپنے اپنے گھر کتنے بجے تک پہنچ سکیں گے۔

تقریباً بارہ گھنٹے ماروتی وین میں سفر کرنے کے بعد شام ۷ بجے ہم اکولا کے حدود میں داخل ہوگئے ہیں۔ اس کا پتہ اس دھول اور دھوئیں سے بھی چل گیا ہے جو اکولہ کی خاص پہچان ہے۔ گھر میں داخل ہوا تو مجھے دیکھتے ہی چار برس کا بھتیجہ عدیل اور چار برس کی بھانجی مہ وش، میرے ایک ایک پیر سے چمٹ گئے ہیں۔ گود میں آنے کے بعد میرے کان، ناک، اور بالوں کو کھینچ کر کہہ رہے ہیں کہ ہم کو چھوڑ کر آپ کہاں چلے گئے تھے۔ ہم کو کیوں نہیں لے گئے۔ میری دو بیٹیاں، صدف (عمر دس سال)، بلی (عمر آٹھ سال) اور بیٹا نبیل اشعر (عمر چھ سال)، میرے پاس آنے کی بجائے اپنے دادا، دادی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ تب ابّا جان کہہ رہے ہیں ——

"لاؤ۔ ذرا لکڑی لاؤ۔ اِس نالائق کی آج پٹائی ہوگی بچوں کو بتائے بغیر کدھر بھی چلا جاتا ہے۔"

اس جملے پر مطمئن ہوکر بچّے مسکرا رہے ہیں لیکن میری امّی نے اٹھ کر واقعی میرا کان کھینچ لیا ہے کہ خبردار۔ اب کہیں گیا۔ تو چلا جاتا تو بچّے کتنے اُداس ہوجاتے ہیں۔

میں تینوں بچوں کے رخساروں کو تھپتھپا کر پانی پینے کے لیے کمرے سے نکل رہا ہوں۔ ! ◻◻

غالب ثانی
(حیدرآباد)

السّلام والسّلام

اے ہلالِ شہرِ رمضاں السّلام
اے خوشا ماہِ مبارک دھوم دھام

گیارہ مہ سے تھا شکم میرا غبار
یک بیک بدلا مرا ہضمی نظام

تیری آمد مژدہ ہے اک دھوم کا
ہر بشر اپنی گلی میں خوش خرام

گیا یہ مہ کا ہے مسلمانوں کا سال
اک مہینہ بھر نہیں کچھ اس کو کام

شملہ، عمامہ، ترکی ٹوپی ہر طرف
جالی والی ٹوپیوں کا اژدہام

لاؤڈ اسپیکر کا ہے بھونچال سا
یا ہے محشر کا ریہرسل لاکلام

چھیڑ کر مزمار آتے ہیں گدا
راگ سے قوّال گاتے ہیں کلام

لوڈ اسپیکر کی صدا چاروں طرف
سب کی کر دیتی ہے یہ نیندیں حرام

ٹیڑھی، ترچھی کمپیوٹر تحریریں
بٹتے ہیں روزے کے اوقاتِ نظام

اُڑتے پھرتے ہیں گلی کوچوں میں سب
خوب ہے اللہ، نبیؐ کا احترام

من چلوں کو مل گیا ہے روزگار
مل گیا ہے درزیوں کو کام دھام

چند خوروں کی بہت ہے ریل پیل
چو طرف گدھ مار کر دیں آں کا کام

ہر طرف ہے روزہ خوروں ہی کا زور
چار سُو بھگدڑ انہی کی دھوم دھام

بنئے، بقّال اور تاجر بے قرار
تا کہ اصلی میں ملائیں مالِ خام

مصنوعی قلّت سے یہ سودا گراں
کھینچتے ہیں اپنی تیغِ بے نیام

ہر بشر کھاتا ہے دل خوش کُن غذا
سحری اور افطار میں عمدہ طعام

نت نئے پکوان سے مہکے فضا
اور خوشبو سے معطّر ہے مشام

دو روپے میں یک پھوارہ دستیاب
کیوں کہ اس کا وزن ٹھہرا دس گرام

بیلن بڑا بھی دو روپے میں ایک ہے
اس کی بھی قیمت ہوئی ہے بے لگام

اُونٹ کا گوشت اور خرمہ اور ہریس — ہر برس ان کا ہے بے حد التزام
اُونٹ کھانا ایک کارِ محترم — اور وہ اس ماہ کا ہے نیک کام
اُونٹ لاتے ہیں پکڑ کر دُور سے — چھان کر مصر و عرب بغداد و شام
نام پر تو اُونٹ کے اک لُوٹ ہے — بکتا ہے لحمِ شتر سونے کے دام
روزہ بہلانا بھی ہے اک مشغلہ — دیکھنے میں ہم کو آیا گام گام
مائیں بچے بیٹھتی ہیں رات دن — اور گھرڑوں[1] کو باوا پھوڑیں صبح و شام
ہر طرف پھیلی ہے خوشبوئے حلیم — بھجیاں سڑکوں پہ لگتی ہیں مُدام
شوق سے کھاتے اہلِ اعتبار — شیخ، قاری، مُحتسب، مُفتی، امام
دعوتِ افطار کا بھی ہے چلن — اتّحاد و ایکتا کا ہے پیام
اب تو سرکاری سطح پر بھی بہت — پارٹی افطار کی عمدہ طعام
اس میں مدعو سب رئیس ابنِ رئیس — خاص کر چوٹی کے علمائے کرام
ہندو بھائی بھی نہایت شوق سے — ہر برس کرتے ہیں اِس کا اہتمام
ہنستے ہنستے کرتے ہیں افطار سب — ختم کر کے آلو بھجیے، آم، جام
با مسلماں اللہ اللہ! واہ واہ — کہہ رہے ہیں با برہمن رام رام

ٹوپی اُتری دیکھ کر چاند عید کا
ہو گیا رمضان کا یوں اختتام

[1] دہی بڑا، دکنی تلفظ

غزل — سراج نرملی

وہ گئی ہے کبھی نہ آنے کو — جا رہا ہوں میں پھر منانے کو
آگیا پھر وہ ورغلانے کو — سیندھی خانے کو لے کے جانے کو
"کھانے پینے کو خاک لاے گا — جا رہا ہے وہ "پینے کھانے" کو
گلتی ہی ہمیشہ کھاتا ہوں — دانت منہ میں نہیں چبانے کو
پوپلا منہ ہے کیا کروں مالک — کہہ رہی ہیں وہ مسکرانے کو
تو سراج اسم با مسمّٰی ہے — روشنی بخش دی زمانے کو

از: "قلم دردست"

عید کرسمس

کے موقع پر چٹ پٹی باتیں

روزنامہ "دکن کرانیکل" مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۹۵ء کے مزاحیہ کالم (SUNDAY SPICE) — چٹ پٹا اتوار کا ترجمہ

عید کرسمس مبارک ۔ زمانہ حال کی سیاسی و معاشی و معاشرتی دشواریوں کے باعث انبساط و لطف اندوزی کے وہ سارے وسائل مہیا نہ ہو سکیں گے ۔ پھر بھی یہ مسرت و چاشنی سے بھرپور عید میل ملاپ خورد و نوش کی مصروفیات کے زیر اثر دل و دماغ کی پریشانیوں کو غرق دریا کرنے کی خوش گوار سہولت بہم پہنچائے گی ۔ بائبل (بیان ۔ ۱۷ ۔ ۲۲) میں کہا گیا ہے کہ "خوش رہنا تمھیں صحت مند رکھتا ہے اور ہر وقت کی افسردگی دھیرے دھیرے موت کا پیش خیمہ" (Judson K Cornelius) جڈسن کرنیلیس نے اپنی پرلطف کتاب "کرسمس کے موقعہ پر کلیسائی لطائف" کے ذریعہ حزن و ملال کی فضا کو مسرت و شادمانی میں بدلنے کے لیے پر اثر اور نایاب چٹکلے فراہم کیے ہیں ۔ دراصل ان لطائف و ظرائف کی ابتدا قدیم ترین انسانوں آدم و حوا ہی سے ہوئی تھی ۔ کیوں کہ انسانی تاریخ میں آدم ہی وہ واحد مرد تھے جنھوں نے کسی خاتون دیگر پہ نظر نہیں ڈالی تھی اور واقعی زندگی بڑی بے مزہ رہی ہو گی !۔

آدم اور حوا دنیا کا سب سے خوش و خرم جوڑا تھا کیوں کہ ان کی کوئی ساس نہیں تھی لیکن حوا دوسری کسی عورت کی طرح حاسد اور متشکی تھی ۔ طویل مدت تک باغ عدن سے باہر رہنے کے بعد جب آدم واپس لوٹے تو انھوں نے حوا کو اپنے غیاب اور اس دوران اپنی مصروفیات کے تعلق سے غم زدہ اور متشکی پایا تو کہنے لگے "میری جان تم مجھ پر شک ہی کیسے کر سکتی ہو ۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ میں اس دنیا میں پہلا اور اکیلا مرد اور تم اکیلی عورت ہو اور دوسرا کوئی نہیں" "ہاں میں جانتی ہوں" حوا نے کہا "لیکن پھر بھی ۔"

آدم بالآخر حوا کو رضا مند کر سکے اور دونوں محو خواب ہو گئے لیکن سویرا ہونے سے قبل حوا اٹھ بیٹھیں اور آدم نے جو بنیچے کی کھال اوڑھ رکھی تھی نکال پھینکا اور لگی ان کی پسلیاں شمار کرنے۔

کیا آپ جانتے ہیں آدم اور حوا کا کس قوم سے تعلق تھا؟ ایک انگریز ایک فرانسیسی اور ایک روسی بحث کر رہے تھے۔ "وہ انگریز ہوں گے"۔ انگریز نے کہا "کیوں کہ ایک انگریز ہی اپنا آخری سیب ایک عورت کے ساتھ بانٹے گا۔"

"نہیں۔ وہ بلاشبہ فرنچ تھے۔ فرانسیسی نے کہا۔ "کیا اور کوئی اتنی آسانی سے کسی عورت کو پھسلا سکتا ہے؟"

"میرے خیال میں تو وہ روسی تھے" روسی نے کہا۔ "بھلا اور کون ننگا پھر سکتا ہے اور دونوں میں صرف ایک ہی سیب پر گزارا کرتے ہوئے بھی اپنے کو جنت نشین سمجھ سکتا ہے۔"

چرچ میں ایک ضعیف حبشی واعظ اعلان کر رہا تھا کہ دو بالغوں (Adults) اور چھ فاحشاؤں Adultresses کا Baptism بپتسما کیا جانے والا ہے!

دو امریکی پادری جرمنی میں سفر کے دوران چرچ کو جانے پر مائل ہوئے۔ جرمن زبان سے ناواقفیت کی بنا پر انھوں نے بہتری اسی میں سمجھی کہ وہ بھی کچھ کریں جو اگلی نشست پر بیٹھی ہوئی معتبر شخصیت کر رہی تھی۔ عبادت کے دوران پادری نے کوئی خاص اعلان کیا اور اگلی نشست پر بیٹھا ہوا شخص کھڑا ہوا اور یہ دونوں امریکی بھی کھڑے ہوئے ہی تھے کہ چرچ میں ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔
پادری نے بپتسما کے لیے لڑکے کے والد کو کھڑے ہونے کے لیے کہا تھا۔

غائب دماغی صرف پروفیسروں ہی کی اجارہ داری نہیں، اس زمرہ میں پادری بھی شامل ہیں۔ ایک خاتون ایک کیفے (ہوٹل) میں بیٹھی ہوئی تھی کہ ایک پادری اپنی بیوی کے ساتھ آیا اور قریب کے میز پر دونوں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد پادری جا کر ایک اخبار خرید لایا ...... اور اخبار اس قدر انہماک سے پڑھ رہا تھا کہ غلطی سے ایک خاتون کے میز پر نشست سنبھالی اور اخبار پڑھتے ہوئے ہی پوچھنے لگا۔ "ہاں تو میری جان ہم کیا کھائیں گے؟" اجنبی خاتون ظاہر ہے بوکھلا کر کچھ جواب نہ دے پائی تو پادری نے اخبار ہٹا کر دیکھا اور اپنی غلطی محسوس کر کے بولا "اوہ غلط بیوی۔ مجھے افسوس ہے۔"

مشرقی بلفاسٹ میں ایک کمسن پروٹسٹنٹ لڑکا ایک گلی میں کھڑا زار و قطار رو رہا تھا۔ ایک خاتون رک کر اسے دلاسا دیتے ہوئے پوچھنے لگی "بابا کیا بات ہے کیوں رو رہے ہو"۔ ہچکیاں لیتے ہوئے لڑکے نے جواب دیا "میرے والد مجھے نہیں چاہتے۔" خاتون نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "نہیں نہیں جی تم ایسا کیوں

سمجھ رہے ہو۔ تو لڑکے نے کہا:
اپنی موت کے بعد وہ ووٹ ڈالنے کے لیے تین دفعہ واپس آئے مگر مجھ سے ایک دفعہ بھی نہیں ملے۔"

چرچ میں فلاحی کاموں کے لیے چندہ جمع کرنے کے وقت لوگ برائے نام دل چسپی لیتے ہیں۔ پادری نے اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اس مجلس میں ایک ایسے صاحب بھی موجود ہیں جو دوسرے شخص کی بیوی سے معاشقہ لڑا رہے ہیں اگر وہ ۵ ڈالر ڈبے میں نہیں ڈالیں گے تو ممبر سے ان کا نام پکارا جائے گا۔ جب چندے کا ڈبہ کھولا گیا تو اس میں پانچ پانچ ڈالر کے ۱۹ نوٹ تھے اور ایک دو ڈالر کا نوٹ جس پر چسپاں چٹھی پر لکھا تھا باقی تین تنخواہ ملنے پر۔"

کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کی طرح باپٹسٹ اور میتھوڈسٹ بھی آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں۔ ایک باپٹسٹ گھرانے میں ایک شخص کی موت واقع ہوئی جب کہ ان کا پادری گاؤں سے باہر گیا ہوا تھا۔ اہلِ خاندان نے مقامی میتھوڈسٹ پادری سے درخواست کی کہ وہ مراسمِ جنازہ انجام دیں۔ پادری نے اپنے بشپ سے دریافت کیا کہ "کیا میں کسی باپٹسٹ کو دفن کر سکتا ہوں؟ کیوں نہیں ضرور جتنے باپٹسٹ چاہو تنے۔"

چرچ میں سو جانا ایسے کہ کھلے منہ میں مکھی گھس جائے بہت ہی معیوب بات ہے۔ ایک واعظ جس نے اپنی جادو بیانی سے ایک بوڑھے شخص کو نیند کی آغوش میں پہنچا دیا۔ طیش میں آ کر منبر پر مکہ مارا اور چلا اٹھا کہ جو جہنم میں جانا چاہتے ہیں اٹھ کھڑے ہوں میں نے کہا کھڑے ہو جائیں!
بوڑھا آدمی کھڑے ہو جاؤ کی گرجدار آواز سن کر کھڑا ہو گیا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی اور بولا کہ جناب واعظ میں نہیں جانتا کہ ہم کس مسئلے پر ووٹ دے رہے ہیں۔ لیکن لگتا ہے کہ صرف میں اور آپ ہی تائید میں ہیں۔

گو خواتین سے چھیڑ چھاڑ ایک جرم ہے۔ یہ وہ اتنا ہی قدیم ہے جتنے کہ آدم و حوا۔ خدا نے دنیا بنائی اور آرام کیا، خدا نے مرد کو جنم دیا اور آرام کیا لیکن عورت کو جنم دینے کے بعد نہ خدا کو اور نہ ہی مرد کو آرام نصیب ہوا۔

بعد از مرگ بھی حیرت و استعجاب کے لمحات آتے ہیں۔ ایک پوپ اور ایک وکیل بہشت کے دروازے پر پہنچے اور سینٹ پیٹر نے انھیں ان کے کمرے دکھلا دیئے۔ پہلے پوپ ان کے اپنے کمرے کو لے جائے گئے جس میں ایک ٹوٹی پھوٹی کرسی، ایک پرانا میز اور مقدس بائبل تھی۔ پھر وکیل ان کے اپنے کمرے کو لے جائے گئے۔ جو ہر طرح سے آراستہ پیراستہ تھا۔ "معاف کیجیے" وکیل نے سینٹ پیٹر سے کہا "کیا مقدس فادر کو میرے جیسا کمرہ نہیں ملنا چاہیے۔" "نہیں" جنت میں بیسیوں پوپ ہیں لیکن وکیل تم اکیلے ہی ہو۔

ننھی میری نے سنڈے اسکول میں جنت کے تعلق سے استاد کی تقریر بڑے غور سے سنی۔ "جو جنت میں جانا چاہتے ہوں" ٹیچر نے کہا۔ "اپنے ہاتھ اٹھائیں"۔ ہر ایک نے ہاتھ اٹھا دیئے سوائے ایک کے۔ "کیوں کیا بات ہے" ٹیچر نے پوچھا۔ "جی" میری نے بتایا۔ "جب میں اسکول جانے کے لیے نکلی اس وقت ماں جی سیب کا کیک دم دے رہی تھیں۔"

چرچ کے ایک کارکن (Pastor) نے بلدیہ کے دفتر کو فون کیا اور چاہا کہ چرچ کے سامنے سے مرے ہوئے خچر کی لاش ہٹا دی جائے۔

نوجوان کلرک جس نے فون اٹھایا شوخی و شرارت سے جواب دیا کہ "ہم تو سمجھتے تھے کہ آپ چرچ والے مردوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔" "جی ہاں" جواب ملا "مگر پہلے ہم مرنے والوں کے رشتہ داروں سے ربط پیدا کرتے ہیں۔"

واعظ مسلسل دخل اندازی کی وجہ ناراض ہو گیا اور کہنے لگا کہ "آج صبح اس محفل میں بہت سارے بیوقوف گھس آئے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ بوقت واحد میں ایک ہی شخص بولا کرے"۔ "جی ہاں" ایک پچھلی نشست والے شخص نے آواز لگائی۔ "واعظ محترم آپ اپنا بیان جاری رکھیے۔"

انگلینڈ کے ایک فٹ بال پول (لاٹری) میں دل کے مریض ایک بہت بوڑھے شخص کو ۵۰ ہزار پونڈ کا انعام ملا۔ اس کے عزیز رشتہ داروں نے اس خوف سے کہ کہیں اچانک یہ عظیم خوش خبری اس کے لیے جان لیوا ثابت نہ ہو، چاہا کہ یہ خبر دھیرے دھیرے چرچ کا واعظ احتیاط سے اس کے گوش گزار کرے۔

"سنو جان" واعظ نے کامل احتیاط سے کہنا شروع کیا۔ "فرض کرو کہ تمھیں ایک بہت بڑی رقم، ۵۰ ہزار کے لگ بھگ انعام میں مل جائے تو تم اس کا کیا کرو گے"۔ بوڑھے نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا کہ "جناب عالی سب سے پہلے اس میں کی آدھی رقم چرچ کے لیے آپ کو دے دوں گا"۔ واعظ گرا اور مر گیا۔

اور آخر میں چرچ کی خاتون خدمت گزار (Nun) کی دعا۔

"جنتی باپ ہمیں دعا سے سرفراز کرو"

"ہم سب کو زندہ سلامت رکھو۔"

"ڈنر کے لیے ہم سب ملا کر دس ہیں"

"کھانا پر صرف پانچ کے لیے ہی ہے"

"آمین!"

ڈاکٹر اسحاق حسین طبیب بدایونی

"فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں"
اب گرم سوٹ کا سوال کہاں
بیس بچوں سے ناک میں دَم ہے
"میں کہاں اور یہ وبال کہاں"

"مضمحل ہو گئے قویٰ غالب"
چڑچڑا ہی ہے وہ خوش خصال کہاں
مہ جبیں کاٹنے کو دوڑے ہے
"اب عناصر میں اعتدال کہاں"

"بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی"
ڈرتے ہو کیوں یہاں تو کوئی درمیاں نہیں
کھاتے نہیں نہ کھاؤ مگر چکھ تو لو ذرا
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں"

"قاصد کے آتے آتے خط اِک اور لکھ رکھوں"
پھینکے کہیں نہ پھاڑ کے وہ پیچ و تاب میں
قسمت سے گر جواب ملا بھی تو اے طبیب
"میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں"

"کوئی اُمید بر نہیں آتی"
مہ جبیں بھی اِدھر نہیں آتی!
اے طبیب آج ان کے درشن کی
"کوئی صورت نظر نہیں آتی"

محبوب مانجھری، بلاسپور (ایم پی)

غزل

پھاڑ لنگی رومال پیدا کر　؛　کچھ تو خود میں کمال پیدا کر
دمڑی ہر حال میں نہ جانے پائے　؛　جسم پر موٹی کھال پیدا کر
گو بُرا نا شکاری ہے بھائی　؛　پتّے سے لے نیا جال پیدا کر
کہتے ہیں شیخ کھا کے مالِ حرام　؛　صرف رزقِ حلال پیدا کر
تجھ کو جانا ہے بڑ دکھڑے میں　؛　رعب و جاہ و جلال پیدا کر
حضرت شیخ کہدیں جس کو حلال　؛　ایسی مئے اے کلال پیدا کر
جوتیوں میں جو بٹ سکے ہمہ وقت　؛　صرف ایسی ہی دال پیدا کر
مات جس سے حریف کھا جائے　؛　ایسی محبوب چال پیدا کر

ایس اے۔ رضوی
حیدرآباد

یہ مجبوریاں

ہمارے ایک کرم فرمانے شہر سے دور پُر فضا مقام پہ ایک بنگلہ بنوایا اور اسی مسرت میں ایک دن ہمیں عشائیہ پہ مدعو کیا۔ چوں کہ دعوں سے انکار ہمارے زریں اصولوں کے خلاف ہے اس لیے بلا تامل ہم نے دعوت قبول کرلی۔ گو ہم نے پہلے کبھی وہ مقام دیکھا ہی نہیں تھا لیکن سوچا کہ جب کولمبس نے بلا قصد و منشا امریکہ جیسا عظیم ملک دریافت کرلیا تو ہم اپنے عزم صمیم کے ساتھ ایک انجانا مقام کیوں نہیں دریافت کرسکتے۔ چنانچہ ہم نے جب ہمت مرداں مددِ خدا کے نعرے کے ساتھ کوشش کی تو کامیابی سے ہم کنار ہوئے اور بروقت وہاں پہنچ گئے۔ لذیذ و مرغن غذاؤں کی ضیافت سے شکم سیر ہوئے اور گیارہ بجے کے قریب صاحب خانہ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے گھر کے لیے روانہ ہوگئے۔ خیال تھا کہ بس یوں شکریہ ادا کرتے ہوئے گھر کے لیے روانہ ہوئے۔ خیال تھا کہ بس یوں نکلے اور یوں آٹو ملا۔ لیکن گھر سے قدم نکالا تو وحشت ناک اندھیرے نے آگھیرا۔ اسٹریٹ لائٹ کا پتہ نہیں تھا، آٹو رکشا بھی دور دور تک لاپتہ تھے۔ چاروناچار پیدل ہی چل پڑے سڑک سنسان تھی۔ مقام انجانا اور فاصلے کے پیش نظر آٹو رکشا لازم تھا۔ بہت دور چلنے کے بعد ایک آٹو نظر آیا۔ پاس گئے تو دیکھا کہ آٹو ڈرائیور صاحب پچھلی سیٹ پر پلکیں جھپکاتے نیم دراز تھے۔ جب ہم نے مدعا بیان کیا تو انھوں نے بڑے معقول عذر پیش کرکے معذرت چاہ لی کہ واپسی میں سواری کا یقین نہیں۔ اور ہم بھی بھلا کہاں اس موقف میں تھے کہ دو طرفہ سواری کا انتظام کرتے اس لیے خاموشی سے آگے بڑھ گئے۔ تاریکی و تنہائی سے وحشت سی ہونے لگی۔ تاروں بھرے آسمان کو دیکھا تو ماضی کی یادوں میں کھو گئے۔ وہ ہم ہی تو تھے جو ٹوئنکل، ٹوئنکل لٹل اسٹار کے سبق پر بے حد محظوظ ہوا کرتے تھے۔ انھیں خیالات میں کھوئے آگے بڑھتے رہے کہ ایک آٹو مخالف سمت سے آتا نظر آیا۔ دل باغ باغ ہوگیا۔ جب وہ نزدیک پہنچا تو ڈرائیور صاحب نے گردن باہر نکالی۔ ہمیں بھی اسی سمت چلنے کی دعوت دی۔ جدھر سے ہم آرہے تھے۔ ہم نے کہا کہ بھائی ہمیں تو مخالف سمت میں جانا ہے۔ کہنے لگے

نہیں صاحب آٹو بند کرتی ہے چلنا ہو تو ادھر چلیں جدھر ہم جا رہے ہیں۔ ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ اپنی آخر
ہم وہاں کس منہ سے جائیں جہاں سے ابھی ابھی دعوت اڑا کر آ رہے ہیں کہ ڈرائیور صاحب نے گیر بدلا اور
دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اتنے میں ہمیں بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا کہ جب اس غریب
کو مخالف سمت ہی میں جانا تھا تو کیوں کر وہ بھلا ہمیں غیر سمت میں لے چلتا۔ اتنے میں گھڑی نے بارہ بجائے
اور تھکن سے ہمارے بھی بارہ بج گئے لیکن بہر حال گھر تو جانا ہی تھا۔ لہذا چلتے رہے۔ دور سڑک کے کنارے
ایک آٹو کھڑا نظر آیا۔ پاس پہنچے تو دیکھا کہ ڈرائیور صاحب سگریٹ نوشی فرما رہے ہیں۔ ہم نے اخلاقاً و نیز
مصلحتاً پہلے تو انھیں سلام کیا پھر کلام کیا اور غرض و غایت بیان کی۔ انھوں نے بڑی ہی بے رخی سے فرمایا
کہ ستر روپے ہوں گے۔ ہم نے جیب کا خیال کرتے ہوئے منت کی "بھیا کچھ تو کم کرو" کہنے لگے بالکل نہیں۔
کیا آپ جانتے نہیں کہ پٹرول یقیناً مہنگا ہو گیا ہے۔ اچانک ہمیں یاد آیا کہ واقعی کچھ دن پہلے پٹرول کے دام میں
قابلِ لحاظ اضافہ ہوا تھا۔ ہمیں ان پر ترس آ گیا کہ جب پٹرول مہنگا ہو گیا ہے تو وہ معصوم ہم سے پیسے نہیں
لے گا تو لائے گا کہاں سے ؟ لیکن ہماری مجبوری یہ تھی کہ ہم ان کے اس قدر جائز مطالبات بھی پورا کرنے
کے موقف میں نہیں تھے۔ لہذا منہ لٹکائے آگے بڑھ گئے۔ اب چلنے کی طاقت بالکل نہیں رہی تھی۔
پھر بھی کولمبس کو دل ہی دل میں برا بھلا کہتے چلتے رہے کہ نہ کم بخت امریکہ دریافت کرتا نہ ہم اس کی تقلید
میں اتنے دور دراز مقام کی کھوج کرتے اتنے میں پیچھے سے آتا ہوا ایک تیز رفتار آٹو دکھائی دیا۔ ہم نے اپنی
پوری طاقت سے پکارا۔ آٹو ـــــ آٹو! لیکن وہ اسی رفتار سے گزر گیا۔ یقیناً اس غریب کے ساتھ
کوئی نہ کوئی مجبوری رہی ہوگی ورنہ آٹو والے بیچارے کیسے کیسے ناساعد حالات [illegible] میں مسافرین کا
پاس و لحاظ کرتے ہیں۔ پھر ہمارے کان کھڑے ہوئے کیوں کہ دور سے اس سناٹے میں آٹو کی گھن گرج سنائی
دے رہی تھی۔ اب کہ ہم نے پکا ارادہ کر لیا کہ بہر قیمت ہم اسے ہماری منزل کو چلنے پر مجبور کر ہی لیں گے۔ بھلے
ہی وہ کوئی بیجا مطالبہ کرے۔ یہ سوچ کر ہم کسی پولس والے کی طرح بیچوں بیچ سڑک پہ ہاتھ پھیلائے کھڑے
ہو گئے۔ آٹو کی رفتار اتنی تیز تھی کہ اگر ہم سنبھل کر دو قدم پیچھے نہ ہٹ گئے ہوتے تو یقیناً ٹکرا ہی جاتے۔ اب
ہمارے لہجے میں سختی تھی۔ "کرایہ کرو گے"

بہت ہی مخلصانہ جواب ملا۔ "تشریف رکھیے" ہمارا سر گھومتا محسوس ہوا۔ خدایا! یہ کیسا آٹو والا ہے؟
نہ پہلے سے کوئی جان پہچان اور نہ ہی کوئی بحث و تکرار، بس ایک دم تیار ہو گیا۔ ہمیں شک ہوا کہ ہو نہ ہو اس
شخص نے ضرور بھنگ پی رکھی ہے۔ چناں چہ ہم نے اپنے شک کو یقین میں تبدیل کرنے خود کو اس کے
اتنا قریب کر دیا کہ اس کی سانس سے بو باس محسوس ہونے لگی۔ ایسی سنسان جگہ پر ہماری اس
نامعقول حرکت پر وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا اور ہمیں سہمی سہمی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اپنی شرمندگی کو چھپاتے
ہوئے ہم نے بلند حوصلگی کا مظاہرہ کیا اور بات میں نرمی پیدا کرتے ہوئے پوچھا کہ بھائی آپ نے کرایہ کی تو بات
ہی نہیں کی۔ کہنے لگا۔ صاحب رات زیادہ ہو گئی ہے۔ کرایہ ڈیوڑھا ہوگا۔ کیوں کہ اس وقت ہماری حالت بیمار

کچھ ایسی مطلبہانہ تھی کہ وہ جو بھی مانگتا، ہم دینے تیار ہو جاتے۔ کس قدر حیرت کا مقام تھا کہ وہ صرف میٹر کے کرایہ پر اکتفا کر رہا تھا لیکن اب موقع نہیں تھا کہ ہم سوچ وبچار میں وقت ضائع کرتے، اس سے قبل کہ وہ ہمیں لے چلنے کا ارادہ بدل دے، ہم چھلانگ کر آٹو میں بیٹھ گئے۔ جب آٹو چلنے لگا تو ہماری جان میں جان آئی دونوں طرف سے گہری خاموشی چھائی رہی۔ رات کے سناٹے میں صرف آٹو کے انجن کی آواز تھی جو گرج رہی تھی۔

تاہم ہمارے ذہن میں یہ سوالیہ نشان بار بار ابھر رہا تھا کہ یہ مہربان اتنی آسانی سے ہمیں سڑک سے اٹھانے پر آمادہ کیسے ہو گئے۔ آخر جب رہا نہ گیا تو پوچھ ہی بیٹھے کہ آیا وہ ہمارے گھر کے قریب ہی رہتے ہیں۔ انھوں نے ہمارے سوال کو تاڑ لیا۔ اور نہایت شستہ انگریزی میں جواب دیتے ہوئے ہمیں مبہوت کر گئے "نہیں سر" ہمارا تو کام ہی مسافرین کو منزل تک پہنچانا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں ایم۔ اے کر رہا ہوں۔ ماں ضعیف ہیں۔ گھر میں جوان بہن شادی کے لائق بیٹھی ہے۔ دن میں آٹو چلاؤں تو کالج کے ساتھی دیکھتے ہیں۔ اس لیے گذارے کے لیے رات میں آٹو چلاتا ہوں" وہ تو اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے لیکن ہم پر جیسے ایٹم بم برس گیا۔ اور ہم کچھ اس طرح کھو گئے کہ جیسے عقل ہی مفلوج ہو گئی ہو۔ بس اتنا یاد ہے کہ ہم شدت جذبات سے مغلوب ہو گئے تھے۔ اتنے میں ہمارا گھر آ گیا۔ ہم نے اپنے ہوش وحواس یک جا کیے اور سخی حاتم بن کر کرایے کے علاوہ پچاس کی ایک نوٹ ان کے ہاتھ میں تھما دیا، جو ہمارے لیے دوسرا تازیانہ ثابت ہوئی۔ انھوں نے شکریے کے ساتھ یہ کہتے ہوئے وہ نوٹ لوٹا دی کہ ہم نے حالات کا بیان کوئی رحم کی درخواست نہیں تھی۔ یہ سن کر ہماری حالت غیر ہو گئی اور آٹو کی پچھلی لال بتی کو دیکھتے ہوئے بے اختیار ہماری زبان سے نکلا کہ شریف انسان کی مجبوریوں کا بھی جواب نہیں۔

پنجاب اسوسی ایشن مدراس کا ۴۶واں کل ہند مشاعرہ

پنجاب اسوسی ایشن مدراس اور تامل ناڈو نیشنل لنگویجس اکیڈمی کے زیر اہتمام ۷ر جنوری کو الحاج ڈاکٹر کمال مدراسی صاحب کی یاد میں کل ہند مشاعرہ زیر صدارت جناب عمر انصاری صاحب منعقد ہوا۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ ڈاکٹر منشاء الرحمٰن منشا، صدر شعبہ اردو و فارسی ناگپور یونیورسٹی نے بہ حیثیت مہمان خصوصی تقریر کی جناب بی ایس گریوال، جناب پی یو دھون اور پالدیوجی نے ڈاکٹر مدراسی صاحب کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا۔

مشاعرہ میں ملک کے ممتاز شعرا مسرس خمار بارہ بنکوی، ندا فاضلی (بمبئی) محمود سعیدی (دلی) منشاء الرحمٰن خاں منشا، ساغر خیامی (دہلی) ہمسر قادری (لکھنو) مصطفیٰ علی بیگ، رؤف رحیم (حیدرآباد) وید دیوانہ (پنجاب) خالق کانپوری، زینت سلطانہ (کانپور) اور مقامی شعرا مسرس حیات مدراسی، ڈاکٹر اعجاز اصغر ویلوری، شوق دہلوی، شاہد مدراسی، بصر دعا ع، سرجیت سنگھ موہنی، بی ایس سمن اور محترمہ صبا مصطفیٰ نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ ۸ر جنوری کو پنجاب اسوسی ایشن ہال میں مختصر شعری نشست میں بھی شعرا نے اپنا کلام سنایا اور بعد ضیافت مشاعرہ اختتام کو پہنچا۔ جناب شوق دہلوی اور ڈاکٹر اعجاز نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ مشاعرہ کے انعقاد میں ہندو مسلم، سکھ عیسائی اتحاد کی جھلک سے فضا معطر تھی۔

شمع زیدی (بمبئی)

شگوفے

بھوپال میں ایک ہوٹل کھل رہا تھا۔ اس کے مالک نے جناب علی عباس اُمید سے گزارش کی کہ اشتہار کے لیے کوئی پھڑکتا ہوا "سلوگن" لکھ دیجیے۔

اُمید صاحب نے قلم برداشتہ لکھ دیا "ہمارے ہوٹل میں تشریف لاکر بہترین کھانا کھائیں تاکہ ہمارے کھانے کا مسئلہ بھی حل ہو جائے"۔

★ اُمید صاحب آدرش ڈگری کالج کے پرنسپل تھے۔ ایک لکچرر کسی شریر طالب علم کی شکایت لے کر اُن کے پاس آئے اور غصّہ میں بھر کر بولے "سر! انسان تو گدھا بن سکتا ہے مگر گدھا انسان نہیں بن پاتا"۔
"بندہ پرور، یہ کہہ کر آپ گدھے کی توہین کر رہے ہیں۔ ایسے وقت پڑنے پر تو وہ انسان کا باپ بن جاتا ہے"۔ اُمید صاحب کے اتنا کہتے ہی ماحول زعفران زار ہو گیا۔

★ کسی بات پر ناراض ہو کر بیگم تمنا اُمید نے کہا "آپ کا دل تو پتھر ہے اس سے خراب اور کیا بات ہو سکتی ہے"!
"تمہاری طرح دماغ کا پلپلا پن، بیگم!" اُمید صاحب نے گمبھیرتا سے جواب دیا۔

★ ذکر تھا عورتوں کی فضول خرچی کا۔ داس صاحب نے پوچھا "راٹھور، تمہاری بیوی تو تمہاری آمدنی میں اچھی طرح خرچ چلا لیتی ہے؟"
راٹھور کے پہلے ہی اُمید صاحب بول پڑے "جی ہاں، اُن کا خرچ تو بخوبی چل جاتا ہے۔ صرف راٹھور کو اپنے بچوں کے لیے علیحدہ انتظام کرنا ہوتا ہے"۔

★ روٹری کلب کا دعوت نامہ آیا ہے۔ پروگرام میں کوئی محبوبہ لے کر شرکت کی درخواست ہے"۔ ممتاز بھابی نے خبر دی۔ "ٹھیک ہے تم میرے ہمراہ چلی چلنا" اُمید صاحب نے لاپروائی سے کہا۔

★ جہیز مخالف جلسہ تھا۔ اُمید صاحب اس سماجی لعنت کے خلاف تقریر کر رہے تھے کہ مجمع میں سے کسی نے پوچھا "صاحب آپ یہ بتائیے کہ کامیاب شادی شدہ زندگی کے لیے کیسی لڑکی سے شادی کرنی چاہیے"؟
"گونگی، بہری، اور اندھی" اُمید صاحب نے مشورہ دیا۔

★ سوشلسٹ لیڈر رجّن شرلواستو کی بیوی صبح ہی صبح اُن پر برس پڑیں۔ موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے انھوں نے اُمید صاحب کے وہاں پناہ لی اور پورا قصّہ سنایا۔ اُمید صاحب نے کہا "بھائی عورت کو سنبھالنے کا ایک اور صرف ایک طریقہ ہے"!
"مجھے بھی تو بتائیے وہ طریقہ" شرلواستو صاحب نے پوچھا۔
"افسوس کہ آدم سے اُمید تک وہ کسی کو نہیں معلوم"۔ اُن کا جواب تھا۔

★ عنایت صاحب نے پوچھا "پاپا! آپ تو ہمیشہ سچ بولتے ہیں نا؟" "ہاں دوست"! اُمید صاحب نے جواب دیا۔
"اچھا تو پھر بتائیے کہ کیا کبھی آپ جانتے ہوئے بیوقوف بنے ہیں اور خوش بھی ہوئے ہیں؟"۔ "ہاں، صرف ایکبار۔ تمہاری ممی کی شادی کے دن"، انہوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

ڈاکٹر پرویز احمد (ریاض)

غزلیں

مجھ کو اب ایسا لگے ہے لیڈروں کے درمیاں
جیسے میں اُلٹا کھڑا ہوں احمقوں کے درمیاں

حضرتِ اقبال سے کیسے کہیں ہے دُکھ کی بات
اُن کے شاہیں پل رہے ہیں کرگسوں کے درمیاں

ہنس کے کہتے ہو کہ شکوے کی ہمیں عادت نہیں
غم ٹپکتا ہے ہمارے قہقہوں کے درمیاں

مانگ کے سیندور کے روشن ستارے چھین لو
اب یہ سمجھوتہ ہوا ہے رہبروں کے درمیاں

کیسے چل سکتے ہیں بھائی حق و باطل ساتھ ساتھ
فاصلے ہوتے نہیں کم دو رخوں کے درمیاں

سُن کے اُس کے لب سے باتیں پیار کے انجام کی
بات میری جم گئی میرے لبوں کے درمیاں

پرسوں دیکھا کل ملے، اور آج گھر آ کر کہا
فاصلے اچھے نہیں ہیں عاشقوں کے درمیاں

جیسے کوئی چھیل دے آلو کو دے کر خوب بھاپ
دل کی دُرگت ہوتی ہے یوں گُل رخوں کے درمیاں

مسجدوں کے ٹوٹتے ملبوں سے زخمی ہو کے آج
شانتی لنگڑا رہی ہے مندروں کے درمیاں

ترقی دیس کی کچھ اس قدر ہو
کہ ہر کوچے کی خاطر اک شجر ہو

وبا طاعون کی کیوں کر نہ پھیلے
کہ سارا دیس جب اوپن گٹر ہو

لگائے کیوں نہ وہ لنگور آتش
کہ جس کی دُم تلے لنکا نگر ہو

ترقی اس کو ہوا اتنی ہی حاصل
کہ جس کے ہاتھ میں جتنا بٹر ہو

چلو چل کر پڑوسن ہی کو چھیڑیں
کہ شاید اس کا شوہر جاب پر ہو

ہنسائیں کس کو، کس کو ہم بھی پرویز
کہ جب سارا نگر ہی نوحہ گر ہو

قطعہ

ارے بھائی یہ ماجرا کیا ہے
چھوٹی چوری سے دل بھرا کیا ہے
قوم کا مال ہے ٹرک میں بھرو
ٹوکری کیا ہے ٹوکرا کیا ہے

پھر ملیں گے اگر خدا لایا ___ (اداریہ)

"شگوفہ" کے رشید احمد صدیقی نمبر کے فوری بعد سالنامہ شائع ہو رہا ہے۔ رشید نمبر کی انفرادیت کی وجہ سے یہ شمارہ بے حد مقبول ہوا ادبی حلقوں میں کافی سراہا گیا۔ مسلسل خطوط وصول ہو رہے ہیں۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ رشید صدیقی نمبر کی کاپیاں ختم ہو چکی ہیں۔ اس خصوصی شمارہ کے طلب کرنے والوں سے ہم معذرت خواہ ہیں۔ سالنامہ میں اس بار ہم ۱۹۹۵ء کے نمائندہ کارٹون شامل کر رہے ہیں۔ سرورق پر اجیت نینن کے کارٹون ہیں۔ اور اندرونی صفحات پر چند منتخب کارٹونسٹوں کے تخلیقی شاہ کار ___ ڈاکٹر عابد معز کی خصوصی دلچسپی نے شگوفہ کو مالی طور پر مستحکم کیا۔ اور قارئین کا وسیع حلقہ بیرونی ممالک اور خاص طور سے سعودی عرب میں شگوفہ سے روشناس ہوا۔ اب ہمارے دیرینہ کرم فرما جناب حسن چشتی اور زندہ دلان شکاگو کی سربراہ غوثیہ سلطانہ نے امریکہ کے اردو حلقوں میں اس کے تعارف کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کی مساعی اور تعاون کے نتیجہ میں ہم شگوفہ کو خوب سے خوب تر بنا سکیں گے ___

محترم دوست پروفیسر عبد الستار دلوی مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی کے کارگزار صدر منتخب ہوئے ہیں (جب کہ سارے ملک میں یہ افواہ پھیلائی گئی ہے کہ حکومت مہاراشٹرا نے اردو اکیڈیمی کو تحلیل کر دیا ہے!) ممتاز مزاحیہ شاعر اسمٰعیل آذر اڑیسہ اردو اکیڈیمی کے معتمد کی حیثیت سے جائزہ حاصل کر چکے ہیں۔ ہم ان حضرات کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اور امید کرتے ہیں کہ یہ حضرات اردو اکیڈیمیوں کو فعال بنانے میں کامیاب ہوں گے۔

- ۱۹۹۶ء میں شگوفہ کی سالانہ خریداری ایک سو روپے ہوگی۔ اور عام شمارہ کی قیمت دس روپے۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۲۹ ـــ مارچ ۱۹۹۶ء ـــ شمارہ ۳

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

ایڈیٹر اوورسیز:
ڈاکٹر عابد معز (ریاض)

اوورسیز کمیٹی:
مصلح الدین سعدی (جدہ)
شجاع الدین غوری (جدہ)
سعید شوکت (جدہ)
ایس۔ ایم حسینی (آسٹریلیا)
غلام نجم الدین (دوبئی)

مجلس ادارت:
مضطر مجاز
طالب خوندمیری
صلاح الدین نیر
رحیم الدین توفیق

مجلس مشاورت:
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین
یوسف ناظم
دلیپ سنگھ
حمایت اللہ

کتابت: محمود سلیم، محمد غالب، محمد عبدالرؤف
طباعت: دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد۔۲

قیمت: ۱۰ روپے
سالانہ خریداری: ۱۰۰ روپے
بیرونی ممالک سے: ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ:-
۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۱۔
فون آفس: 595716 رہائش: 521064

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے

(فہرست)

زندہ دلانِ حیدر آباد کی

سالانہ تقریبات

۱۲ر اور ۱۳ر اپریل ۹۶ء کو منعقد ہوں گی۔ اس موقع پر ''شگوفہ'' کا سوونیر شائع ہوگا۔

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن

رجسٹرڈ آفس : 5-1-4 /25/8 سکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ عابد روڈ حیدرآباد

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے یہ قرض جات دو اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں (۱). غربت ہٹاؤ اسکیم (۲) خود روزگار اسکیم۔ غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار تک کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائینڈنگ، ترکاری فروش، میوہ فروش، اگربتی کا کارخانہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 25% کارپوریشن سے دیا جاتا ہے۔ اور اس کو بیس 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود 4% کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور ماباقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے۔ اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی چھ ہزار 6000 روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین، آٹو رکشا، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ وغیرہ کے لیے قرض دیئے جاتے ہیں۔
اس جملہ لاگت کا 20% کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح سود 6½% پر دیا جاتا ہے۔ کارپوریشن مندرجہ بالا دو اسکیموں کے تحت اپنے قیام سے یکم 30 نومبر 95ء تک 57,567 افراد میں 12,58,37,000 روپے بطور مارجن منی قرض جاری کرچکا ہے۔ جس کی جملہ لاگت 55,24,85,000 روپیہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جاریہ سال ۹۴-۹۵ سے مرکزی حکومت کا قائم کردہ نیشنل اقلیتی ڈیولپمنٹ اینڈ فینانس کارپوریشن کے اشتراک سے اب تک جملہ 686 افراد میں 16 منظور کردہ اسکیمات کے تحت 89,21,000 روپے مارجن منی قرض مزید جاری کرچکا ہے۔ جس کی جملہ لاگت 2,27,44,000 روپیے ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ کارپوریشن سنہ 93ء سے اقلیتی طبقہ کے نوجوانوں کو سالانہ مفت ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے چکا ہے۔ حیدرآباد میں 531 نوجوانوں، نظام آباد میں 192، گنٹور میں 245 افراد، کرنول میں 76 نوجوانوں کو تقریباً 10 لاکھ روپے کے صرفہ سے کمپیوٹر میں، موٹر ڈرائیونگ، لیاب ٹیکنیشن، ٹیلرنگ، ٹائپ رائٹنگ وغیرہ میں ٹریننگ کرایا گیا ہے۔

کارپوریشن کی شاخیں اضلاع کے ہیڈ کوارٹرس پر بھی کام کر رہی ہیں۔
خواہشمند حضرات کارپوریشن کے دفاتر سے ربط پیدا کریں۔

محمّد علی رفعت
(مینجنگ ڈائرکٹر)

دلیپ سنگھ
(دہلی)

جمال کو غصّہ کیوں آتا ہے

اس دن مجھے یقین ہو گیا کہ جمال بھائی اب میرے پکے دوست بن گئے ہیں۔ جب انھوں نے مجھ سے پانچ ہزار روپے قرض مانگے۔

میں نے بزرگوں سے سن رکھا ہے کہ اچھا مہمان وہ ہوتا ہے جو آپ کے گھر ایک آدھ دن کے لیے آئے اور پھر جانے کا نام نہ لے۔ اچھی بیوی وہ ہوتی ہے جو میکے جانے کی دھمکی تو دیتی رہے پر اس دھمکی پر عمل کبھی نہ کرے اور اچھا دوست وہ ہوتا ہے جو آپ کے پیسوں کو اپنے پیسے سمجھنے لگے۔

جمال بھائی کا قرض مانگنے کا طریقہ اتنا پیارا تھا کہ انکار کرنے کا حوصلہ تو ایک طرف انھوں نے مجھے انکار کرنے کی مہلت بھی نہ دی۔ ایک دن سویرے سویرے میرے ہاں آئے اور کہنے لگے "یار تمھارے پاس پانچ ہزار روپے ہوں گے؟" یہ نہیں کہا کہ مجھے کوئی سخت ضرورت آن پڑی ہے۔ یہ بھی نہیں کہا کہ کب واپس کروں گا۔ بس سیدھا سوال کیا اور بیٹھ گئے۔

میں اندر سے سو سو کے پچاس نوٹ لایا جو میں ایک دن پہلے گھر کے خرچ کے لیے بینک سے نکلوا کر لایا تھا۔ رقم جمال بھائی کے حوالے کرتے ہوئے میں نے کہا "جمال بھائی گن لو" فراخ دلی سے کہنے لگے کہ گننا کیا ہے۔ بھائی مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔ انداز ان کے کہنے کا کچھ اس طرح کا تھا جیسے وہ مجھ سے قرض لے نہ رہے ہوں بلکہ مجھے دیا ہوا قرض وصول کر رہے ہوں۔

جمال بھائی چلے گئے تو مجھے خیال ہوا کہ اتنا پوچھ لینے میں کیا حرج تھا کہ بھائی قرض چکاؤ گے کب؟ لیکن جب تک مجھے یہ خیال آیا جمال بھائی میری دسترس سے نکل کر اپنے مکان میں داخل ہو چکے تھے۔

اچھے قرض دار کی طرح اب انھوں نے مجھ سے ملنا بند کر دیا۔ میرا تو خیال تھا کہ اب مہینوں ان سے ملاقات نہیں ہوگی لیکن وہ پندرہ دن کے بعد اچانک ایک دن نمودار ہو گئے۔ آتے ہی کہنے لگے "قرض دیکر

بھول گئے ہو گیا؟ ایسا جملہ عام طور پر قرض لینے والا نہیں بلکہ قرض دینے والا بولتا ہے کیوں کہ قرض لینے کے بعد اکثر لوگوں کی یادداشت کمزور ہو جاتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس جملے کا جواب کیا دوں۔ اگر کہوں کہ نہیں جمال بھائی آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں تو کمینہ سا لگوں گا کہ قرض دینے کے بعد ہر وقت اس کی وصولی کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ اگر کہوں کہ معمولی سی رقم ہے۔ آپ کبھی نہ کبھی چکا ہی دیں گے۔ تو خطرہ ہے کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ مجھے اس کی وصولی کی فکر ہی نہیں ہے۔ گھبراہٹ میں مجھے کوئی جواب نہ سوجھا سچی بات یہ ہے کہ قرض دینے اور اسے وصول کرنے کے سلسلے میں مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میری گھبراہٹ کا احساس کرتے ہوئے جمال بھائی بولے "اگر تم سمجھتے ہو کہ میں تمھاری رقم خوشی خوشی لوٹا دوں گا تو تم غلط سمجھے ہو۔ میں قرض لوٹانے والا آدمی نہیں ہوں۔"

یہ سن کر میں ذرا سا چکرایا لیکن ہوش سنبھالتے ہوئے بولا: "آپ یقیناً مذاق کر رہے ہیں۔" جمال کہنے لگے میں ہرگز مذاق نہیں کر رہا۔ اچھی طرح سمجھ لو کہ میں تمھارے پیسے واپس نہیں کروں گا۔ تم اگر میرا کچھ بگاڑ سکتے ہو تو بگاڑ لو۔"

میں اس صورت حال کے لیے تیار نہیں تھا۔ دل ہی دل میں نے سوچا کہ چلو پانچ ہزار روپے برباد کرنے کے بعد ہی چند اختر مرحوم کا یہ مصرعہ تو سمجھ میں آگیا کہ:

ہمارے دوستوں کے بے وفا ہونے کا وقت آیا

لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ جمال بھائی بے وفا ہو جانے کے بعد اتنا گرم کیوں ہو رہے ہیں۔

جمال اب روز آنے لگے۔ جتنی دیر بیٹھتے بار بار یہی کہتے کہ میں تیرا قرض نہیں چکانے والا۔ یہ کہہ کر وہ میری چھاتی پر مونگ دلتے رہتے اور میں اُف تک نہ کرتا۔

ایک دن اس سلسلے میں مجھے بہت اکسایا۔ کہنے لگے "بے وقوف تم معاملے کی نوعیت کو سمجھ نہیں رہے۔ پانچ ہزار روپے بہت ہوتے ہیں۔ اس سے کئی بوری آٹا، کئی سیر دال اور کم از کم پچاس بوتلیں وسکی خریدی جاسکتی ہے۔ اسے وصول کرنے کی کوشش کرو۔" میں نے کہا: "جمال بھائی کیسے وصول کروں؟ آپ نے ہی دینے ہیں اور آپ اس کے لیے راضی نہیں ہیں۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟" یہ سنتے ہی آگ بگولہ ہو گئے اور کہنے لگے۔ "تمھیں اتنا بھی نہیں معلوم کہ قرض کیسے وصول کیا جاتا ہے۔ ارے بے وقوف مجھ پہ مقدمہ کرو۔ مجھے جیل بھجوانے کی دھمکی دو۔ یوں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہو گے تو ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔ اپنے باپ کی اولاد ہو تو کل ہی مجھ پر مقدمہ دائر کر دو۔ کوئی اچھا سا وکیل کرنا۔ اگر کسی کو نہیں جانتے تو میں تمھیں ایک اچھے وکیل کا نام اور پتہ بتانے کو تیار ہوں۔ جس نے بڑے بڑے جعادری مجرموں کو ناکوں چنے چبوا دیئے۔ وکیل میرا ایکا یار ہے۔ میرا نام لو گے تو فیس میں رعایت کر دے گا۔"

جمال بھائی تو یہ کہہ کر چلے گئے۔ میں سوچتا رہا کہ یا تو وہ ایک گھٹیا سے مذاق کو خواہ مخواہ طول دے رہے

ہیں اور یا پھر ان کا دماغ چل گیا ہے ۔ دوسری صورت کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا اپنا دماغ چکرانے لگا کہ کہیں ان کا علاج کروانے کے لیے مجھے مزید خرچ کا بوجھ نہ اٹھانا پڑے ۔

اگلی بار جب جمال میرے ہاں آئے تو بہت زیادہ گرم تھے ۔ کہنے لگے عجیب ہونق آدمی ہو کہ ابھی تک قرض کی وصولی کے لیے مقدمہ دائر نہیں کیا ۔ ادے کرو ۔ ورنہ ساری عمر پچھتاؤ گے ۔

میں نے کہا "جمال بھائی آپ کے پاس اگر اس وقت پیسے نہیں ہیں تو کوئی بات نہیں ۔ جب ہوں گے دے دیجیے گا ۔ یہ سنتے ہی بپھر گئے اور بولے میں نہیں دوں گا تیرے پیسے ۔ تو نالش کیوں نہیں کرتا ۔ میں نے کہا جمال بھائی "آپ بھی کمال کرتے ہیں ۔ کوئی دوستوں پر نالش کرتا ہے کیا ؟" کہنے لگے "کس دوستی کی بات کر رہے ہو ۔ میں نے تجھ سے کون سی دوستی نبھائی ہے ۔ تجھے لوٹنا تھا دوستی کی آڑ میں ، لوٹ لیا ۔ دوستی میں نے اگر نبھائی ہے تو صرف اس حد تک کہ تمھیں صحیح مشورہ دے رہا ہوں کہ مجھ پر مقدمہ کردو ۔"

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے ۔ اپنے آپ پر مقدمہ چلوانے کی ایسی شدید خواہش میں نے پہلے کبھی دیکھی تھی نہ سنی تھی ۔ جمال بھائی جب اگلی بار آئے تو ان کی بات سن کر میں اور بھی چکرا گیا ۔ وہ میرے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے ۔

"یار تجھے دوستی کا واسطہ مجھ پر مقدمہ دائر کر ۔ اگر مقدمہ دائر کرے گا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تیرا قرض بھی چکا دوں گا ۔"

اس رات میں سو نہ سکا ۔ مجھے یقین ہو گیا کہ جمال کا دماغ چل گیا ہے ۔ لیکن چلے ہوئے دماغ والے لوگ تو دوسروں پر پتھر پھینکتے ہیں ۔ اپنا دامن تار تار کر لیتے ہیں ۔ کئی کئی دن نہاتے نہیں ۔ لیکن لوگوں سے یہ تو نہیں کہتے پھرتے کہ بھائی مجھ پر مقدمہ چلاؤ ۔ اگلے دن سویرے ، سویرے میں جمال بھائی کے گھر گیا اور ان کے قدموں میں بیٹھ کر گزارش کی کہ وہ مجھے یہ بتانے کی زحمت کریں کہ وہ خود پر مقدمہ کیوں چلوانا چاہتے ہیں ۔

جمال نے ایک اچھے دوست کی طرح میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا ۔ "کئی دنوں سے میری سانس پھول رہی ہے ۔ میں نے ڈاکٹر سے مشورہ کیا تو وہ کہنے لگا کہ بہت سے ٹیسٹ کروانے پڑیں گے جن پر قریب پانچ ہزار روپے خرچ ہوں گے ۔" تیرا قرض تو میں کبھی نہ کبھی چکا دوں گا لیکن ٹیسٹ کرانے کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے ۔ اچانک اخباروں کے مطالعے سے مجھے پتہ چلا کہ ٹیسٹ مفت بھی کروائے جا سکتے ہیں ۔ طریقہ اس کا یہ ہے کہ تم مجھ پر مقدمہ کر دو ۔ عدالت میری گرفتاری کا حکم دے دے گی ۔

لیکن میں بھری عدالت میں اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہوں گا کہ میرے سینے میں درد ہو رہا ہے ۔ یہ سنتے ہی پولس والے مجھے ہسپتال لے جائیں گے ۔ وہاں میرے تمام ٹیسٹ ہوں گے اور مفت ہوں گے کہ بیمار مجرم کو جیل نہیں بھیجا جاتا ۔ پندرہ دن وہاں رہنے کے بعد جب میں تندرست ہو جاؤں گا تو پھر

مجھے عدالت میں لے جایا جائے گا۔ وہاں میں تمہارا قرض چکا دوں گا۔ اور رہا کر دیا جاؤں گا۔ کیا ایک دوست کی خاطر تم اتنا سا کام نہیں کر سکتے؟"

یہ سنتے ہی میں ہنس دیا۔ بڑی دور کی کوڑی لائے۔ بھوپال بھائی۔ میں تمہارا کام تو کر دوں گا لیکن شرط یہ ہے کہ پہلے تم میرا قرض چکا دو۔"

حیرانی کی بات یہ ہے کہ بھوپال بھائی نے فوراً میری رقم واپس کر دی اور کہا کہ آئے ہو تو کھانا کھا کر جانا ، یہ سچے دوست کی خدمت کرنا میرا اخلاقی فرض ہے۔ ○○

⊙

برنارڈ شا اور ایک نقاد

برنارڈ شا کو چند روز تک ایک نقاد مسلسل خط لکھتا رہا، جس میں شا کی تحریروں پر کڑی نکتہ چینی ہوتی، آخرکار ایک روز برنارڈ شا نے اس کو خط لکھا:

"میری تحریروں کے بارے میں خود میری بھی وہی رائے ہے۔ جو آپ کی ہے۔ لیکن لاکھوں پڑھنے والوں کے خلاف میں اور آپ کر بھی کیا سکتے ہیں۔

○

قحط

برنارڈ شا بہت دبلے پتلے تھے اور نقاد چیسٹرٹن بہت موٹے تھے، ایک بار چیسٹرٹن نے شا سے کہا، اگر کوئی آپ کو دیکھے تو یہ سمجھے کہ انگلستان میں قحط پڑا ہوا ہے۔

شا نے برجستہ کہا: جی ہاں، اور آپ کو دیکھنے کے بعد اس قحط کی اصل وجہ بھی سمجھ میں آ جائیگی۔

○

حاضر دماغی

مشہور ناول نگار وکٹر ہیوگو نے الیگزنڈر ڈیوما سے باتیں کرتے ہوئے کہا اگر ہم دونوں مل کر ایک ناول لکھیں تو وہ دنیا کا عظیم بہترین ناول ہوگا۔"

ڈیوما نے جواب دیا "واہ گھوڑے اور گدھے کا کیا میل؟"

وکٹر نے جواب دیا: "بھئی تم ناول مت لکھو، لیکن براہ کرم مجھے گھوڑے کا تو خطاب نہ دو۔"

○

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد
(صدر شعبۂ اردو، بی۔این کالج پٹنہ)

دعوت اور عداوت

دعوت اور عداوت دونوں ہی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ دنیا میں ہونے والی پہلی دعوت کا تو پتہ نہیں مگر پہلی عداوت کا حال معلوم ہے جو آدم کے بیٹوں ہابیل اور قابیل کے درمیان ہوئی تھی۔ ممکن ہے پہلی دعوت بھی اسی زمانے میں ہوئی ہو چونکہ ان دونوں کا رشتہ بہت گہرا ہے۔ یہ دکھ کی بات ہے کہ اب تک کوئی ریسرچ اسکالر اس موضوع پر تحقیق کر کے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل نہیں کر سکا مگر یہ خوشی کی بات ہے کہ آدم کے بیٹے تب سے اب تک ہر زمانے میں دعوت اور عداوت دونوں سے اپنا رشتہ قائم کیے ہوئے ہیں۔

دعوتیں آج بھی ہوتی ہیں مگر کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ دعوتوں کا اصل لطف کوئی سو سال پہلے کے زمانے میں آتا تھا۔ اس زمانے میں لوگ خود کو مصروف رکھنے یا کم از کم ظاہر کرنے کے لیے کسی نہ کسی حیلے یا وسیلے کی تلاش میں رہتے تھے۔ آج کی طرح نہیں کہ مصروفیتیں پنجہ جھاڑ کر پیچھے پڑی رہتی ہیں وہاں تو حال یہ تھا کہ کسی نواب صاحب کا مرغ بازی اور بٹیر بازی سے دل بھر گیا اور دوستوں سے ملنے کا ارادہ ہوا تو فوراً منصوبہ بنا اور دوسرے تیسرے دن سج گئی محفل اور ہو گئی ایک شاندار دعوت پھر اسی محفل میں پاس پڑوس سے آئے ہوئے کسی رئیس نے نواب صاحب کے سامنے مونچھوں کو ذرا بل دیا تو نواب صاحب کو بھی تاؤ آگیا اور شروع ہو گئی عداوت۔ لیکن وہ عداوت بھی ایسی کہ جس پر کئی دوستیاں قربان۔ اس سلسلے میں بزرگوں کا سنایا ہوا ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ ایک نواب صاحب اپنی حویلی سے نکل کر بازار کی سیر کو جارہے تھے۔ ان کے ایک دوست جو شاعر بھی تھے۔ سر راہ کسی دوکان میں بیٹھے غالباً فکرِ سخن فرما رہے تھے۔ نواب صاحب کو دیکھا تو سلام کرنے کھڑے ہوئے مگر اس وقت تک نواب صاحب کی سواری آگے بڑھ چکی تھی۔ اُن کی آنکھوں نے بس یہ دیکھا تھا کہ شاعر صاحب ایک ہاتھ میں اپنا جوتا لیے ہوئے تھے۔ نواب صاحب کے دماغ میں یہ بات آئی یا لائی گئی کہ وہ جوتے کا استعمال اپنے پیر کی بجائے کسی دوسری جگہ کرنا چاہتے تھے۔ پھر کیا تھا نواب صاحب نے دوسرے ہی دن ان پر آدھا درجن

مقدمے دائر کردیئے۔ انھیں خبر ہوئی تو غلط فہمی دور کرنے نواب صاحب کے پاس پہنچے۔ نواب صاحب نے انھیں فوراً معاف کردیا مگر مقدمے واپس نہیں لیے کیونکہ ایسا کرنا ان کی شان کے خلاف ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً پانچ برس تک دونوں دوست ایک ہی فٹن پر سوار ہو کر عدالت میں حاضر ہوتے رہے۔ راستے بھر گپیں لڑاتے پان کھاتے، اشعار سنتے اور سناتے اور کچہری میں پہنچ کر ایک دوسرے کے مخالف بن جاتے۔

یہاں یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ عداوت انھوں نے ایک دوسرے سے کی یا عدالت سے، مگر اس سوال کو یہیں چھوڑیئے اور دیکھیے کہ زمانہ نہ بدلا تو دعوتوں اور عداوتوں کا مزاج بھی بدل گیا۔ اب حال یہ ہے کہ ہمارے سماج میں اکثر رشتے دعوت سے شروع ہوتے ہیں اور عداوت پر ختم ہو جاتے ہیں۔ کبھی کوئی چھوٹا آدمی کسی بڑے آدمی کی دعوت کرتا ہے اور اپنے جیسے دوسرے لوگوں کی عداوت مول لیتا ہے۔ کبھی کوئی بڑا آدمی کسی معمولی آدمی کو دعوت دے کر دوسروں کو بے جا عداوت اور اس شخص کو بے جا خرچ کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اگر آپ اس بات کو عام نہ کریں تو میں بتا دوں کہ میرے کئی گرم سوٹ اس طرح کی دعوتوں کے موقع پر سلوائے گئے ہیں اور میں نے جن ٹیلرنگ شاپس میں یہ سوٹ سلوائے ہیں ان کے مالکوں سے میری اب تک عداوت چل رہی ہے ویسے یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں کیوں کہ کچھ عداوتیں آخر کار دعوتوں تک بھی پہنچ جاتی ہیں۔ آپ نے سنا ہی ہوگا کہ محبت کی پہلی منزل نفرت ہے۔

موجودہ زمانے میں دعوت سے بڑے بڑے کام لیے جاتے ہیں۔ اکسپورٹ امپورٹ کے پرمٹ حاصل ہوتے ہیں اور ان پرمٹوں کے سہارے پھر دعوت دی جاتی ہے۔ دو سیاسی حریفوں کو ایک دوسرے سے ملایا جاتا ہے۔ دو مختلف افسروں کو قریب لایا جاتا ہے۔ رشتے بنائے جاتے ہیں یا بگاڑے جاتے ہیں۔ افواہیں دبائی جاتی ہیں اور پھیلائی بھی جاتی ہیں۔ پرانے منصوبے ترک کیے جاتے ہیں اور نئے پلان مرتب ہوتے ہیں۔ پرانی عداوتیں ختم اور نئی شروع کی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ قوموں اور ملکوں کی قسمتوں کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ ہر دعوت ایک محشر عمل ہوتی ہے۔ کیا پتہ غالب زندہ ہوتے تو اسے محشر خیال بھی کہہ دیتے۔ دعوت کی قسمیں بے شمار ہیں اور بیماریوں کی طرح اس کی قسموں میں بھی دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ سب سے پرانی شادی کی دعوت ہے جس کے بارے میں بزرگوں سے سنا ہے کہ پچاس ساٹھ برس قبل تک یہ دعوت رات کے دس گیارہ بجے شروع ہو کر نماز فجر کی اذاں کے وقت ختم ہوتی تھی۔ یعنی ادھر موذن نے اذاں دی اور ادھر آخری دسترخوان اٹھا۔ ممکن ہے بعض دیہاتوں میں اب بھی ایسا ہوتا ہو مگر شہروں میں اب نہ وہ دعوتیں رہیں نہ کھانے والے۔ دعوتیں ہوتی بھی ہیں تو لوگ بے وقت اور بلا ضرورت کھانا کھا کر اپنے آپ سے عداوت نہیں کرنا چاہتے کیونکہ آدھے سے زیادہ مرد یا تو شوگر کی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں یا گیس کی۔ رہی عورتیں تو ان میں کچھ ہر فی صد ڈائٹنگ کر رہی ہوتی ہیں۔ البتہ بڑے بڑے شہروں میں اس قسم کی دعوتوں سے وہ بے روزگار ضرور فائدہ اٹھاتے ہیں جو دیہاتوں سے روزگار کی تلاش میں شہر آتے ہیں اور دن بھر چائے پر گزارا کرنے کے بعد ہر رات کہیں نہ کہیں "باراتی" بن

جاتے ہیں۔

نئے زمانے میں جو دعوتیں مقبول ہوئی ہیں ان میں سرکاری دعوت سب سے نمایاں ہے۔ یہ ایسی چیز ہے کہ کوئی اس کی آرزو میں مرتا ہے اور کوئی اس کے انتظار میں زندہ رہتا ہے۔ کچھ لوگ ان دعوتوں میں جاتے وقت اتنا ہی اہتمام کرتے ہیں جتنا نئے داماد سسرال جاتے وقت دعوت کے دوران وی۔ آئی۔ پی صاحب خانہ سے قریب رہنے کی کوشش بھی برابر جاری رہتی ہے۔ اس کے لیے وقت سے کچھ پہلے پہنچنا ضروری ہوتا ہے۔ میرے ایک دوست اس راز سے واقف ہیں، اس لیے وہ پانچ بجے کی دعوت میں شرکت کے لیے تین بجے ہی گھر سے نکلتے ہیں اور چار بجے منزلِ مقصود پہ پہنچ کر محفوظ ترین مقام پر اپنی جگہ لے لیتے ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے اس طرح کی دعوتوں میں جانے کے لیے خاص طور پر ایک سیکنڈ ہینڈ کار بھی خریدی ہے مگر انھیں افسوس اس بات کا ہے کہ ہمیشہ ان کی کار وی۔آئی پی گیٹ کے باہر ہی روک دی جاتی ہے اور وی۔آئی۔پی پر یہ ظاہر ہی نہیں ہو پاتا کہ وہ کار والے ہیں یا بے کار ہیں۔

سرکاری دعوتوں سے ملتی جلتی شکل سیاسی دعوتوں کی ہے یہ زمانہ کچھ ایسا ہے کہ اس میں دعوت کی سیاست ہوتی ہے اور دعوت میں بھی سیاست ہوتی ہے۔ کچھ دنوں سے مذہب اور سیاست نے اس طرح ہاتھ ملایا ہے کہ سیاسی افطار پارٹیوں کا سلسلہ چل پڑا ہے۔ بظاہر یہ دعوتیں روزہ داروں کو افطار کرانے کے لیے منعقد کی جاتی ہیں مگر ان میں روزہ اور افطار کے علاوہ اور تمام چیزوں پر توجہ دی جاتی ہے۔ میرے ایک دوست کی رائے ہے کہ اس طرح کی دعوتوں میں ننانوے فی صد روزہ دار نہیں شریک ہوتے۔ مگر مجھے علم ہے کہ میرے دوست کچھ مبالغہ آرائی سے بھی کام لیتے ہیں۔ اس لیے میں ان کی رائے پر یقین نہیں کرتا۔ دعوت کے سلسلے میں اور بھی بہت ساری باتیں مشہور ہیں۔ جیسے یہ کہ جو لوگ ثواب کمانے کی دعوت دیتے ہیں، وہ زیادہ گناہ کرتے ہیں اور دعوت چاہے جیسی ہو اور جس کی طرف سے دی گئی ہو اس سے فائدہ اٹھانے والے ہی فائدہ اٹھاتے ہیں۔

دعوت کی طرح عداوت کی بھی قسمیں ہیں۔ مگر زمانہ بدلا ہے تو عداوتوں کا انداز بھی بدل گیا ہے ماضی کی عداوتیں نسلوں میں چلتی تھیں، اور چند دنوں یا ہفتوں میں ختم ہو جاتی ہیں۔ پہلے کے لوگ دعوت دے کر عداوت سے دوچار ہوتے تھے۔ اب عداوت کر کے دعوت دیتے ہیں۔ پرانے زمانے میں اگر کسی بادشاہ کو جنگ کی دعوت ملتی تھی تو وہ فوجیں درست کرتا تھا۔ اب اگر کسی وزیر کو اس کا سیاسی حریف لڑائی کی دعوت دیتا ہے تو وہ اخبار والوں سے اپنے تعلقات درست کرتا ہے۔ پہلے عداوتیں زیادہ ہوتی تھیں اور دعوتیں کم۔ اب دعوتوں کی کثرت کا یہ حال ہے کہ ہوشیار لوگ ہفتے میں پانچ دن گھر کے ڈائننگ ٹیبل کا منہ بھی نہیں دیکھتے۔ بعض وزیروں کے بارے میں تو مشہور ہے کہ جس دن انہیں کوئی دعوت نہ ملے اس دن صبح اٹھ کر دانتوں میں برش بھی نہیں کرتے۔ ادبی دعوتیں اور عداوتیں اور عداوتیں پہلے بھی ہوتی تھیں مگر اب ادبی دعوتوں کا حال برا ہے ہاں ادبی عداوتیں خوب پھل پھول رہی ہیں۔ فرق یہ آیا ہے کہ پہلے اس طرح کی عداوتوں سے ادب کا بھلا ہوتا تھا، اب

عداوت کرنے والوں کو فائدہ ہوتا ہے۔ ادبی جشن چلتی ہیں تو صد جسے بے ادبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اکثر لوگ ایک دوسرے کی سات پشتیں کھنگال ڈالتے ہیں۔ پھر کھودا پہاڑ، نکلا چوہا۔ کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ دعوتوں اور عداوتوں کی یہ داستان کافی طویل ہے۔ سچ پوچھیے تو یہ زمانہ ہی دعوتوں اور عداوتوں کا ہے۔ کوئی دعوت برائے عداوت کرتا ہے اور کوئی عداوت برائے دعوت کا قائل ہے۔ ظاہر ہے کہ میں کس شمار قطار میں ہوں۔ پھر بھی زمانے کا اثر ہونا لازمی ہے اس لیے دعوت کام و دہن کے لیے یہ مضمون لے کر حاضر ہوں۔ درخواست بس یہ ہے کہ اس کی تلخی گراں گزرے تو مجھ سے عداوت نہ کیجیے گا کیوں کہ بقول ساحر:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

غزل

یا سبب جھنجھٹ میں ہیں یا بے سبب جھنجھٹ میں ہیں
اس جہاں میں آج کل ہم سب کے سب جھنجھٹ میں ہیں

کوئی پڑھتا ہی نہیں ہے سب دھرے ہیں طاق پر
غالبؔ و اقبالؔ و میرؔ و داغؔ سب جھنجھٹ میں ہیں

گر چکا ہے کس قدر معیارِ شعر و شاعری
اٹھ گیا ذوقِ ادب اہلِ ادب جھنجھٹ میں ہیں

ایرو ں غیروں کا بھلا کیا پوچھنا ہے اے ندیم
دور وہ آیا ہے سب اعلیٰ نسب جھنجھٹ میں ہیں

روس و امریکہ میں بھی ہے کون سا امن و اماں؟
اہلِ جاپاں، اہلِ چیں، اہلِ عرب جھنجھٹ میں ہیں

با طلب تو تھے ہی جھنجھٹ کے شکنجے میں اسیر
بے طلب بھی ان دنوں کچھ بے سبب جھنجھٹ میں ہیں

ہے کہاں محبوبؔ غربا کے مقدر میں سکوں
اور اہلِ زر بھی ان سے بڑھ کے اب جھنجھٹ میں ہیں!

محبوب مانبھومی (بلاسپور)

سید طالب حسین زیدی
(حیدرآباد)

بوفیٹ تیار ہے

(ولیمے کی ایک دعوت کی روداد)

عشائیہ کا وقت ۸ ساعت شب دعوت نامے میں تحریر تھا اور اب دس بجنے والے تھے، سردیوں کی رات، ایک میدان میں بغیر شامیانوں کے کھلے آسمان کے نیچے کرسیوں پہ سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے اور بھوک سے بچتے ہوئے سارے مہمان کھانے کے لیے بلائے جانے کی صدائے دل نواز سننے کے لیے گوش برآواز بے چین و منتظر بیٹھے ہوئے تھے۔ بعض گوشوں سے اس تاخیر پر شکایت آمیز کھسر پھسر بھی سنائی دے رہی تھی۔ اللہ اللہ کر کے میزبان اعلیٰ یعنی نوشاہ کے والد محترم کی صورت نظر آئی۔ وہ قریب آکر ہم سے اور دوسرے مہمانوں سے کچھ اس انداز سے معذرت خواہ ہوئے گویا "ایسا تو ہوا ہی کرتا ہے" اور پھر ہر لفظ پر تشدید لگا کر نہایت فخر و مباہات سے فرمایا!

'چلیے! بوفیٹ تیار ہے'

میزبان جمّا خاں کے لڑکے شیر خاں کی شادی کا یہ ولیمہ تھا جو کسی عرب ملک میں ایک شیخ کے ساتھ کوئی کام کر رہے تھے اور دونوں ہاتھوں سے دولت بٹور کر وطن واپس آئے تھے اور چاروں ہاتھوں سے یعنی وہ خود کے اور وہ والد محترم کے اس کو لٹا بھی رہے تھے۔ برخوردار قسم کے والد صاحبان اپنے ایسے کماؤ پوت کے وارے نیارے ہوا ہی کرتے ہیں جہان کے لیے افزونیٔ عزّت کا باعث ہوتے ہیں۔ چنانچہ ادھر کچھ دنوں سے جمّا خاں صاحب کے طور طریقوں، بول چال اور نشست و برخاست کے معمولات میں چینج ہائے نمایاں (change) واضح طور پہ محسوس کیا جا رہا تھا مارے تمکنت کے اپنے جامے سے کافی باہر نکل چکے تھے، ٹوپی کی نشست کا زاویہ بھی ۹۰ کے بجائے ۴۵ درجے کا ہو گیا تھا۔ ہم سے خاں صاحب کی بس یاد اللہ تھی۔ کبھی پڑوس کے ایک چھوٹے سفالی مکان میں بودوباش تھی اور کرانے کی دکان کر رکھی تھی۔ آج کل نئے شہر کی ایک پوش لوکیلٹی میں بنگلہ بنا لیا تھا اور وہیں رہتے ہیں ـــــ خاں صاحب

ہمارا ہاتھ پکڑ کر کشاں کشاں وہاں لے گئے جہاں میدانِ کارزار گرم تھا اور جس میز پر کھانے چنے ہوئے تھے اس کی چاروں سمتوں پر لوگ مورچہ سنبھالے ہوئے کھانوں سے نبرد آزما تھے، خان صاحب نے ازراہ مہمان نوازی ایک پلیٹ اور چمچہ معہ صافی ہمارے ہاتھوں میں تھما کر دنگل میں کود پڑنے کے لیے اشارہ کیا اور چلتے چلتے آہستہ سے کان میں یہ بھی فرماتے گئے کہ میں آپ کے لیے "ڈسٹل" واٹر لے کر آؤں گا۔ ہم نے مجسم حیران ہو کر پوچھا! ڈسٹلڈ واٹر"۔ ؟ میرے لیے ؟ اس کی کیا ضرورت ہے۔ ؟ ابھی دو چار روز ہی ہوئے کہ ہم نے ڈسٹلڈ واٹر بدلوا کر بیٹری چارج کروالی ہے۔ آپ خواہ مخواہ زحمت نہ فرمائیں۔ ہماری اس بات پر خان صاحب ہمیں بیک ورڈ سمجھ کر قہقہہ مار کر بولے۔ آپ سمجھے نہیں۔ ڈسٹل واٹر بیٹری کے واسطے نہیں بلکہ آپ کے پینے کے لیے لا رہا ہوں کیونکہ آج کے پانی سے "پولوشن[1]" کی ایک نئی بیماری بھوت (بہت) پھیل رہی ہے۔ ہمارے یہاں (صاحبزادے) نے اصرار کر کے اس کا انتظام خاص خاص لوگوں کے لیے کروایا ہے۔ پورے دو سو بوتل منگوا کر رکھے ہیں۔ وہ جب سے آئے ہیں، گھر کے نلوں کا پانی پیتے ہی نہیں کیونکہ کسی قسم کا .... وہ ...... کیا کہتے ہیں۔ ...... ؟ رسک۔ ہاں رسک لینا نہیں چاہتے، ہم نے بات کی تہہ کو پہنچ کر کہا اس ہیچ مداں کو خاص خاص لوگوں میں شمار کرنے کا شکریہ۔ ویسے تو ہم "پولوشن" پروف ہیں یہ نئی بیماری ہماری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کی جرأت نہیں کرتی، آپ زیادہ فکر نہ کریں۔ یہ کہہ کر ہم میز کی طرف بڑھ گئے اور اچھی خاصی کشتم کشتی کر کے صف میں داخل ہو کر رواج کے مطابق تھوڑی سی ہریس لے کر ایک گوشۂ عافیت میں چلے آئے اور کھڑے ہو کر کھانے کی کوشش کرنے لگے۔ چمچے سے کھود کھود کر جونہی ہریس اٹھائی تو بائیں ہاتھ سے پلیٹ بھی چمچے سے لگی اٹھنے لگی مضبوطی سے اس کو پکڑا اور چمچے کو کافی توانائی صرف کر کے ہریس میں گھسا کر بعد از اسٹرگل بسیار (struggle) جب اٹھایا تو بایاں ہاتھ پھر کپکپانے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے چمچہ ایسی مقناطیس کا بنا ہوا ہے جو صرف لوہے ہی کو نہیں بلکہ پلاسٹک اور چینی کی پلیٹوں کو تک کھینچ لیتا ہے۔

شادی کی دعوتوں میں ہریس کی یہ نافرجام علت حال حال ہی سے شروع ہوئی ہے ورنہ پہلے خستہ لقمی اور لگن میں دم دیئے ہوئے سوندھے کبابوں سے کھانے کی بسم اللہ ہوا کرتی تھی۔ وہ سوندھے اور سلونے دن اب خواب و خیال ہو گئے۔

ہریس سے بھگت کر ہم پھر میز پر پہنچے اور بچے کچھے میں سے جو کچھ اپنے حصے کا تھا لے کر نسبتاً ایک محفوظ جگہ چلے آئے تاکہ دھکم پیل سے بچ رہیں۔ فرش پر ہر طرف ہڈیاں، مرغ کی چچوڑی ہوئی ٹانگیں اور خدا جانے کیا کیا الم غلم بکھرا ہوا تھا جس کو مہمانوں نے کچھ کھا کر اور کچھ کو صرف چکھ کر ہی نیچے پھینک دیا تھا۔ کچھ دن پہلے ہمارے ایک پیر میں موچ آگئی تھی اور ابھی سوجن کے ساتھ ساتھ تکلیف بھی باقی تھی۔ اس لیے ڈر رہے تھے کہ اس نفسا نفسی ہائے خورد و نوش کی تو تو، میں میں میں کوئی نادانستہ اس پر حملہ نہ کر بیٹھے

---

[1] pollution

ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ایک صاحب نے جو دیوانہ وار منہ اٹھائے کھانے کی میز پر جارہے تھے اپنا فولادی قسم کا جوتا ہمارے موچ والے پاؤں پر رکھ دیا، بس جان ہی تو نکل گئی۔ کراہ کر ابھی سنبھل ہی رہے تھے ایک پانچ چھ سال کی عمر کا لڑکا سر جھکائے ہوئے بھیڑ کی ٹانگوں میں سے ہوتا ہوا تیزی سے سیدھا ہماری شیروانی کے اندر آگھسا اور گھبرا کر باہر نکلنے کے لیے کھانوں میں سنے ہوئے ہاتھ اور لتھڑا ہوا منہ جو چلایا تو ہماری شیروانی کے دامن کا ناس مار گیا اور انواع و اقسام کے کھانوں کے رنگوں سے شیروانی گویا تجریدی آرٹ کا کینوس بن گئی۔ کراہت سے ایک جھر جھری لے کر ہم اپنی پلیٹ کو معہ بچے ہوئے کھانوں کے ایک کونے میں پٹخ کر واش بیسن پر پہنچے اور دستی کو پانی سے بھگو کر جس قدر ہوسکا کپڑوں کو صاف کیا اور اپنی نشست پر جا بیٹھے۔ اتنے میں جمّا خاں صاحب حسب وعدہ اپنے ڈسٹل واٹر کا گلاس لیے ہوئے تشریف لے آئے اور ہمیں پیش کر کے بازو کی کرسی پر بیٹھ گئے اور ایک نوعمر لڑکے کو جو سامنے سے گزر رہا تھا آواز دی، فہد! ذرا ادھر تو آنا۔ وہ جب آیا تو اس کو حکم دیا صاحب کو سلام کرو اور سعود۔ خالد اور فیصل کو بھی بھیجو دیکھنا وہ کہاں ہیں؟ پھر ہم سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے "یہ سب میرے پوتے ہیں، ہمارے بڑے میاں کے بچے، سب "سعودی عرب" ہی میں پیدا ہوئے (گویا یہ بھی ایک کارنامہ ہوا) ان کو "عربی" بھی فر فر بولنا آتا ہے۔ ہم نے نہایت سنجیدگی سے مشورہ دیا کہ خاں صاحب! اب کے جو صاحب تشریف لائیں تو ان کا نام "بندر" رکھیے کہ یہ بھی ایک سعودی شہزادے ہیں۔ اس طرح کورم پورا ہو جائے گا، لیکن! آپ سے ایک چوک ہو گئی کہ اصل کو نظر انداز کر کے فروعات پر ہی زور دیتے رہے حالانکہ "عبدالعزیز" سے اس فہرست کو شروع ہونا چاہیے تھا۔ ہنس کر بولے آپ صحیح فرماتے ہیں سوچا تو میں نے بھی یہی تھا کہ کسی بچے کا نام عبدالعزیز رکھوں مگر بڑے نے کہا باوا جان! یہ بھی کوئی نام ہے؟ ایسا نام تو دکان کے منشیوں کا ہوتا ہے اور حیدرآباد کی ہر گلی میں چار چھ عبدالعزیز پہلے ہی سے موجود ہیں۔ اس واسطے ایسے کامن (Common) نام کو چھوڑ کر یہ "ماڈرن" نام ماں رکھ لیے ہیں مگر "بندر" نام کے معنی یہاں دوسرے ہوتے ہیں۔ اس واسطے یہ نام رکھنے کا خیال نہیں ہے۔ سب لوگاں چڑائیں گے اور یہ کہہ کر خود ہی ہنسنے لگے۔

ہمارے حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں ان "پیٹرو ڈالر" (Petro Dollar) ناموں کا رواج سن ساٹھ اور ستر کے بعد ہی وبائی صورت اختیار کر گیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ سارا سعودی کنبہ یہاں کے گھروں میں آبراجمان ہو گیا ہے۔ ورنہ پہلے "جمّا خانوں" کے گھروں میں بچوں کے نام چاند پاشاہ، غوثو پاشاہ گودے جانی۔ چھوٹے جانی قسم کے ہوا کرتے تھے......

خان صاحب نے اپنی شیروانی کی جیب سے ڈن ہل سگریٹ کا چمکتا ہوا سرخ پیکٹ ایک تجاہلِ عارفانہ سے نکال کر شانِ استغنا سے ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا آج کل دیسی سگریٹوں سے کھانسی بھوت ہوتی ہے اس لیے میں اب یہ سگریٹ پی رہا ہوں۔ "انگریزوں" کے ہاتھ سے بنی ہوئی چیزوں کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے صاحب۔

رات اور سردی بڑھ رہی تھی اگر چیا خاں صاحب سگریٹ کے دو چار کش لے کر موج میں آجاتے تو پھر نہ جانے باتوں اور ڈینگ بازیوں کا سلسلہ کہاں تک پہنچتا اس لیے ہم اجازت لے کر چلے آئے۔

ان چالیس پچاس برسوں میں دعوتوں اور تقریبات کے طور طریقوں میں انقلابی تبدیلیاں آگئی ہیں اپنے بچپن کی دعوتیں ہم کو آج بھی یاد ہیں۔ اس زمانے میں شادی خانوں کے ناموں سے بھی کوئی واقف نہ تھا۔ "جیسا ہے اور جہاں ہے" پر یقین رکھتے ہوئے لوگ اپنے ہی گھروں میں تقریبات منعقد کرلیا کرتے تھے اور کھانے کا اہتمام بھی سفید چاندنی کے فرش پر مدرسے کا لال دسترخوان بچھا کر کیا جاتا تھا جس پر یہ شعر لکھا جاتا تھا:

شکر بجا آر کے میہمان تو
روزی خود می خورد از خوان تو

اس شعر کے ساتھ ساتھ چمچے اور پلیٹوں کے نقش بھی چھپے ہوتے تھے۔ جن کو دیکھ کر ہم اس وقت یہ خیال کرتے تھے کہ چمچے کی جگہ چمچہ اور پلیٹ کی جگہ پلیٹ کو رکھنا چاہیے۔ ورنہ بے تمیزی سمجھی جائے گی۔ اس دور کے کھانوں میں لقمی، کباب، قیمہ بھرا ورقی سموسہ، متنجن، بریانی دہی کی چٹنی (بورانی) بگھارے بیگن تھے اور لگن میں دم دیا ہوا مرغ اور شیر مال ہوا کرتے تھے میٹھا عموماً دو قسم کا ہوتا تھا۔ زیادہ تر زردہ (چاول کا) یا ڈبل کا میٹھا یا فیرنی جس کو چھوٹی چھوٹی طشتریوں میں نکال کر پہلے ہی سے دسترخوان پر رکھ دیا جاتا تھا۔

یہ سارے کھانے اصلی بیدری گھی میں زعفران اور مغزیات (بادام، پستہ، چرونجی وغیرہ) ڈال کر تیار کیے جاتے تھے اب تو گھی کا نام بھی زبان پر لانا سنگین جرم ہے۔ گویا ساری بیماری کی جڑ یہی ایک نامراد رہ گیا ہے۔

ان کھانوں کی خوشبو ہوا کے دوش پر اس محلے سے اس محلے تک پہنچا کرتی تھی۔ کھانوں کے ذائقے اور خوشبو ابھی تک کام و دہن میں بسے ہوئے مشام جان کو معطر کیے ہوئے ہیں۔ آج کل تو گونڈ کا تودہ ہریسہ اور "چکن 1965" کا بول بالا ہے۔ معلوم ہوتا ہے بنانا کچھ اور چاہ رہے تھے مگر ہانڈی بگڑ گئی کھسیانی بلی بن کر اس کو "چکن 1965ء" اور "سعودی ہریس" کا نام دے دیا۔

برعکس نہند نام زنگی کافور

اور یار لوگ اسی کو آسمانی نعمت سمجھ کر خوب اڑا رہے ہیں اور اپنی انگلیاں چاٹ رہے ہیں۔ ورنہ لگن میں دم پخت مرغ سے اس بے بضاعت "1965" کا کیا مقابلہ؟ متنجن کا تو اب نام بھی سننے میں نہیں آتا۔ "نو دھوتے" جانتے ہی نہیں کہ یہ کس چڑیا کا نام ہے۔ اب تو سننے میں آرہا ہے کہ امریکہ کے استاد گیاٹ معاہدہ کے تحت بھنے ہوئے مرغ ہندوستان میں برآمد کرکے اپنی استادی کا سکہ اس میدان میں بھی جمانے والے ہیں۔

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی!

اس وقت کی دعوتیں از صبح تا نصف النہار ہوا کرتی تھیں۔ نوشاہ گھوڑے پر سوار برات لے کر صبح صبح عروس کے گھر پہنچ جایا کرتے تھے۔ ۷۔۸ بجے تک نکاح پڑھا دیا جاتا تھا، چھواروں کی برسات ہوتی

احباب میں سے کوئی شاعر ہوتے تو چکنے کاغذ کی رنگین دستی پر چھپا ہوا مبارک باد کا سہرا پڑھ کر سنا دیتے اور براتیوں میں دستیاں تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ اس کے بعد دسترخوان بچھ جایا کرتا ......

ان دلہنوں اور بارات کی شان بھی عجب نرالی ہوا کرتی تھی۔ گھوڑے پر سوار دلہا مشجر، کمخواب یا کمیوے کی شیروانی زیب تن کیے سہرے کے پھولوں سے سارا چہرہ ڈھکا ہوا۔ ایک ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو ہے جس کے پھل کی نوک میں ایک لیمو پرو دیا ہوا ہوتا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے کوئی دیکھے یا نہ دیکھے سارا راستہ دیوار بند کالونی اور میونسپلٹی کے کھمبوں کو سلام کرتے ہوئے گزرتے تھے۔ (لیمو اور چاقو والی بات ہماری سمجھ میں اب تک نہیں آئی کہ یہ کیا راز تھا؟) آگے آگے بینڈ باجا پیچھے باراتی۔ گھوڑے کے اطراف عموماً دلہا کے بے تکلف دوست اور چچیرے، ممیرے ہوا کرتے تھے۔ ان میں سے جن کی شادیاں ابھی نہیں ہوتی تھیں وہ حسرت سے اس کو تکتے اور فقرے کستے ہوئے ساتھ ساتھ چلا کرتے تھے۔ باراتوں میں دلہا کے ہونے والے اکثر پہلوان نما جاؤش ناچتے ہوئے تلوار کے کرتب بھی بتلایا کرتے تھے۔ نکاح اور کھانے کے بعد نہایت ہلکا پھلکا منکسر المزاج قسم کا مجرا بھی ہوا کرتا تھا۔ جس کا سلسلہ بارات کی واپسی تک چلتا تھا۔ مقطع و متشرع نہایت نورانی چہرے والے بزرگ بھی اس مجرے سے کمال خشوع و خضوع کے ساتھ کیف و سرور حاصل کیا کرتے تھے۔ بعض بزرگوں کے ہاتھوں میں تسبیح بھی ہوا کرتی تھی اور جب کسی پھڑکتے ہوئے شعر اور ادائے دل ربایانہ سے ان کے نازک اعصاب پر دباؤ پڑنے لگتا تو تسبیح کے دانوں پر انگلیاں تیزی سے پھسلنے لگ جاتی تھیں۔ صدر دالان کے اطراف کے کمروں میں پس چلمن شریف زادیاں بھی اس مجرے کی دید سے سعادت دارین حاصل کرتی تھیں۔

جب دسترخوان بڑھا تو چوکیوں کا رواج عام ہوا۔ یہ سلیقہ اور نفاست کی گویا معراج تھی۔ شادی خانوں کی فہرست بھی طول طویل نہیں تھی۔ بس گنتی کے دو چار نام ہی سننے میں آتے تھے۔ سلطان بازار میں راجہ پرتاب گیرجی کی عالی شان کوٹھی جس کو آنجہانی راجہ صاحب اپنی فراخ دلی سے کوئی معاوضہ لیے بغیر ضرورت مندوں کو بے پروانگی پر دیا کرتے تھے، دوسرا حیدر گوڑے میں کمال منزل اور بشیر باغ میں لیڈی حیدری کلب مناسب معاوضوں پر مل جایا کرتے تھے۔ گلی گلی جا، خانوں کی طرح جیسی بہتات ان کی اب ہے ویسی اس وقت نہیں تھی۔ بڑی دعوتیں عموماً لیڈی حیدری کلب میں ہوا کرتی تھیں۔

حیدرآباد میں بوفے کی بدعت نافرجام زیادہ متعارف نہیں تھی۔ کبھی کبھی ہی اس کا نام سنائی دیتا تھا، حیدرآبادی شرفا کھڑے ہو کر کھانے کو خلاف تہذیب اور آداب و شائستگی کے منافی تصور کیا کرتے تھے۔ اس وبا کی ریل پیل بھی ہماری دانست میں پٹرو ڈالر کے طفیل ہی پروان چڑھی ہے۔

کہیو عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے
اتنا بھی حد سے اپنی نہ باہر نکل چلے!

تیس پینتیس سال ادھر کا واقعہ ہے لیڈی حیدری کلب کے ایک عشائیہ میں جو بوفے سسٹم تھا ہم

بھی مدعو تھے ذرا تاخیر سے پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ جماعت شروع ہو چکی ہے۔ صف میں شامل ہونے کے لیے پلیٹ اور چمچہ لے کر وہاں پہنچے تو ڈاکٹر میر محمد علی صاحب پر نظر پڑی جو کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی ہوئی صف میں شامل ہونے کے لیے پلیٹ پر چمچہ بجاتے ہوئے اِدھر سے اُدھر اور پھر اُدھر سے ادھر صف کے پیچھے مسلسل بازگشت میں مصروف ہیں، ہم نے قریب پہنچ کر ڈاکٹر صاحب سے بعد از سلام اپنی بے بسی کا اظہار کرتے کہا۔ ڈاکٹر صاحب ابھی کوئی ترکیب نکالنی چاہیے تاکہ سلام پھیرنے سے پہلے ہم کو بھی جماعت میں شامل ہونے کا موقع مل سکے۔ اللہ بخشے ڈاکٹر صاحب مرحوم تھوڑی دیر کچھ سوچ کر فرمانے لگے۔ آئیے میرے ساتھ اور یہ کہہ کر اپنے پیچھے کو کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوئے مصلیوں کے بازوؤں میں گھسا کر ہلایا۔ مصلی اس ناگہانی آفت پر پہلے تو ذرا چونکے کہ یہ کیا ہے ---؟ پھر پیچھے پر جو نظر پڑی تو غالباً یہ سمجھ کر کہ یہ چھوٹا ہے اکدم اچھلے اور صف توڑ کر اس طرح باہر نکل آئے جیسے ان کی طہارت قطع ہو گئی ہو۔ ڈاکٹر صاحب ہم کو آگے بڑھاتے ہوئے خود بھی شریک ہو گئے اور پلیٹ میں کھانا لے کر ہم وہاں سے نکل آئے۔

ہم نے ڈاکٹر صاحب سے کہا! نسخہ تو بڑا لاجواب آزمایا آپ نے، ہنستے ہوئے فرمانے لگے ایسے امراض میں کبھی کبھی نشتر لگا دینے سے بھی افاقہ ہو جاتا ہے، ہم نے صف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جی ہاں! اور ایسے امراض میں چمچہ ہلا دینے سے بھی نجات مل جاتی ہے ......

(ہماری اس نگارش کو پڑھنے کے بعد اگر کسی جمّا خاں کے نازک اعصاب پر دباؤ پڑنے لگے تو ہم ان سے معذرت خواہ ہیں، اگر وہ فراخ دلی سے کام لے کر ہمیں معاف کر دیں تو یہ ان کی معرفت شناسی ہوگی۔ اگر نہ معاف کرنا چاہیں بھی تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ کہ یہی ہمارا اپنا اصل نقطۂ نظر ہے) □

میں جیجوں گا

پلنے تین سالہ بچے کی کہانی، خود اس کی زبانی

سوانح

جسے عاتق شاہ نے روشنائی سے نہیں بلکہ اپنے خونِ جگر سے لکھا ہے۔

قیمت 40 روپے

(بتوسط شگوفہ)

گھوٹالہ سے حوالہ تک

ڈاکٹر محبوب راہی

دیتے ہیں جو لوگ حوالہ کس کا ہے
کیا ہے یہ گڑبڑ گھوٹالہ کس کا ہے

پیٹھ میں جانے کس کس کی کب چبھ جائے
سازش کا یہ خنجر بھالا کس کا ہے

بدعنوانی کی تہمت ہے جس کے سر
بہنوئی کس کا ہے سالا کس کا ہے

پھوٹا ہے بھانڈا یہ کس کی سازش کا
رستا ہے ہر دم جو چھالا کس کا ہے

دہک رہی ہیں جو یہ چتائیں کیسی ہیں
یہ جو ہے ہر طرف اُجالا کس کا ہے

پڑا ہوا ہے لاوارث چورا ہے پر
کس کا یہ صندوق ہے تالا کس کا ہے

اک اک کرکے سارے پھنستے جاتے ہیں
کس نے پھیلایا یہ جالا کس کا ہے

سبھی سیاسی کاروبار کے اڈّے ہیں
کلہے کی مسجد ہے شوالا کس کا ہے

کون یہ دیکھے اتنی فرصت کس کو ہے
غلطی کس کی اور ازالہ کس کا ہے

اُجڑ رہا ہے بسا بسایا گھر کس کا
نکل رہا ہے یہ جو دیوالہ کس کا ہے

پڑا ہوا ہے اب جس تِس کی ٹھوکر میں
گود میں نازوں کی یہ پالا کس کا ہے

کان پڑی آواز سنائی دیتی نہیں
ہاتھ یہ ڈھول بجانے والا کس کا ہے

نخرے سبھی سیاست کے ہیں یہ لیکن
ان نخروں میں گرم مسالا کس کا ہے

چھلک رہا ہے جو جس تِس کے ہاتھوں میں
سچائی کے زہر کا پیالا کس کا ہے

ندی ملی ہے جاکر کسی کے سمندر میں
اور ندی کے بیچ یہ نالا کس کا ہے

اس گڑ بڑ میں پتہ لگانا مشکل ہے
پیٹ ہے کس کا اور نوالہ کس کا ہے

کون کون ہے کالکھ کے اس دھندے میں
کس کا چہرہ اُجلا کالا کس کا ہے

ٹوٹ گئی ہے پاؤں کی یہ پائل کس کی
پڑا ہوا یہ کان کا بالا کس کا ہے

اس حمام میں جتنے ہیں سب ننگے ہیں
سارے ہیں تاریک اُجالا کس کا ہے

دودھ کی گنگا میں سب ہیں جب دُھلے ہوئے
پھر یہ سب ہنگامہ سالا کس کا ہے

لوٹ رہا ہے اپنے دیش کو جو راہی
یہ رہبر آخر رکھوالا کس کا ہے

قطعات

اسمٰعیل ظریف
(حیدرآباد)

مبارک سالِ نو سب کو سلامت اپنی آزادی
سبھی خوش ہیں کہ جیسے آج سب کی ہوگئی شادی
تقاضا وقت کا ہے تین یا دو ہیں بہت کافی
کرو کوشش کہ اب بڑھنے نہ پائے گھر کی آبادی

دواخانوں میں دفتر میں کلب میں روڈ پر چمچے
ڈنر پر اور جلسوں میں بھی آتے ہیں نظر چمچے
تعجب ہے کہ ان میں چمچیاں بھی ہوگئیں شامل
زمانہ ہے یہ چمچوں کا جدھر دیکھو اُدھر چمچے

کہیں باوا پریشاں ہیں کہ بیٹا پرنکالا ہے
کہیں بیوی کی چلتی ہے کہیں مختار سالا ہے
ظریف اس پنچ رنگی دور کا کچھ حال مت پوچھو
ہماری زندگی گویا پنا کا گیت مالا ہے

غزلیں

بلبل کاشمیری (لندن)

قد فرنگن کا ہے مینار قد آور کی طرح
دیکھنے کی چیز ہے لندن کے ٹاور کی طرح
دخترِ لندن کے لب پر پیار، غصہ ناک پر
اس کا دل ہے خشک دریا۔ سر سٹیمر کی طرح
حسن کی تاجر ہے وہ رکھتی ہے بوسوں کا حساب
پونڈ بھی گردش میں رکھتی ہے وہ ڈالر کی طرح
میم کی دو خوبیاں سب خوبیوں سے خوب ہیں
سخت پتھر کی طرح ہے، نرم پوڈر کی طرح
کون کہتا ہے کہ ہے نازنیں "میڈم تساد"
فیکٹری میں کام کرتی ہے وہ شوہر کی طرح
کاش کھائے وہ دلِ بلبل کا اک چپل کباب
پیش کر دوں گا یہ سوغاتِ پشاور کی طرح

○

دفتری کا بن گیا ہے گھر بھی دفتر کی طرح
ڈانٹتی رہتی ہے بیوی اس کو افسر کی طرح
ایشیائی پیار کی، گفتار کی رفتار دیکھ
سست ٹم ٹم کی طرح ہے تیز موٹر کی طرح
مشرقی مس جب پہن لیتی ہے مردانہ لباس
سر سے پاؤں تک نظر آتی ہے مسٹر کی طرح
"لوڈ شیڈنگ" ہجر کی شب اور مایوسی کی دھند
تم چلی آؤ ذرا بجلی کے پاور کی طرح
سبزیوں کی ایک منڈی ہے مرا رخسارِ دوست
کان گوبھی، آنکھ آلو۔ ناک گاجر کی طرح
اس کے پتھر دل میں بلبل آشیاں کیسے بنے
میرا دلبر سنگدل ہے، سنگِ مرمر کی طرح

پرویز یداللہ مہدی

(پہلی قسط)

فکر ہوتی ہے فکر ہوتا ہے

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں بمبئی میں نیا نیا وارد ہوا تھا عمر ابھی کچی تھی لیکن ادب و شاعری کا خاصا چسکہ لگ چکا تھا اس لیے جیسے ہی یہ معلوم ہوا کہ پڑوس میں جو جوڑا رہتا ہے بڑا اچھا ادبی ذوق رکھتا ہے تو فوراً دوستی گانٹھ لی حالانکہ میاں بیوی دونوں مجھ سے عمر میں خاصے بڑے تھے لیکن مشترکہ ادبی ذوق نے عمر کے فرق کو مٹا دیا۔

ایک دن کا ذکر ہے جب میں حسب معمول ان کے ہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں سامنے ہی باورچی خانے میں گھر کی مالکن کھڑی رو بھی رہی ہیں اور کام کاج بھی کیے جا رہی ہیں۔ اس صورت حال کو دیکھ کر میرا گھبرانا لازمی تھا لہٰذا ہڑبڑا کر پوچھا — ؟ کیا بات ہے بھابی؟ آپ رو کیوں رہی ہیں۔ کیا بھائی صاحب سے جھگڑا ہو گیا — ؟۔
میرے اس استفسار پر بھابی روتے میں بھی بے ساختہ ہنس پڑیں۔ آنسوؤں کی روانی کے ساتھ ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی ہنسی نے میری حیرت میں اور اضافہ کر دیا۔ وہ اسی طرح ڈبل ایکٹنگ کرتے ہوئے یعنی ہنستے روتے ہوئے بولیں — کوئی جھگڑا وگڑا نہیں ہوا بھیا! دیکھ نہیں رہے ہو میں پیاز چھیل رہی ہوں، آج کی پیاز کچھ زیادہ ہی تیز و ترش معلوم ہوتی ہے۔ اس انکشاف پر میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ خدا کا شکر اس جھگڑے کے پہاڑ کے نیچے سے میاں بیوی کی آپسی رنجش کی جگہ پیاز نکلی۔ اپنے اس غلط اندازے پر ظاہر ہے، بڑی خفت ہوئی۔ چنانچہ اپنی خفت کو چھپانے کے لیے میں باورچی خانے سے سیدھا ڈرائنگ روم میں چلا آیا لیکن وہاں آ کر ایک بار پھر حیرت کا شکار ہو گیا۔ ڈرائنگ روم کا منظر باورچی خانے کے منظر سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ وہاں گھر کی مالکن پیاز چھیلتے ہوئے رو رہی تھیں۔ یہاں صاحب خانہ آنکھوں کے آگے اخبار پھیلائے اس طرح چپ چاپ بے آواز آنسو بہائے چلے جا رہے تھے جیسے ان کے حلق میں سائیلنسر (SILENCER) لگا ہوا ہو، آنسوؤں کی روانی کا یہ عالم تھا جیسے آنکھوں کی جگہ کوئی پرنالہ لگ گیا۔ میں نے گڑبڑا کر پوچھا۔ بھائی صاحب کیا بات ہے! یہ آنسو کس لیے! خدانخواستہ اخبار میں کوئی بری خبر — !"
بولے کوئی بری خبر نہیں، میں جب بھی دلی کے روزنامہ ملاپ میں فکر تونسوی کا مستقل کالم پیاز کے چھلکے پڑھتا

پھل، میرے آنسو آپ ہی آپ بہنے لگتے ہیں !!

میں نے بے ساختگی کے ساتھ کہا۔ عورت ہو یا پیاز، دونوں کا کام رونا رلانا ہوتا ہے! اور جہاں دونوں یک جا ہو جائیں تو پھر مرد کا خدا ہی حافظ —— !!

وہ حیرت سے بولے — میں تمہارا مطلب سمجھا نہیں برخوردار!

میں نے وضاحت کی — اس وقت، آپ جو کالم پڑھ رہے ہیں اس کا عنوان ہے پیاز کے چھلکے، اور یہ پیاز کے چھلکے اتار رہے ہیں کسی فکر تونسوی صاحبہ تو گویا عنوان بھی زنانہ اور لکھنے والی بھی زنانہ —— "زنانہ —— !" انھوں نے حیرت سے دہرایا۔ پھر ایک قہقہہ لگا کر بولے۔ تم فکر تونسوی کو عورت سمجھ رہے ہو برخوردار۔ کیوں نہیں —— ! میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ لفظ فکر کو، تانیث میں بولا جاتا ہے، فکر ہوتی ہے کہتے ہیں۔ فکر ہوتا ہے نہیں کہتے —— !!"

"بھئی خوب، جس فکر تونسوی کو تم زنانے کی چیز سمجھ رہے ہو وہ اصل میں مردانے، کی چیز ہے ——" انھوں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ پھر میری غلط فہمی کو مزید دور کرنے کے لیے مفکرانہ انداز میں آگے فرمایا —— لفظ فکر صرف تانیث ہی میں نہیں تذکیر میں بھی استعمال ہوتا ہے مثال کے طور پر اگلے وقتوں کے ایک استاد شاعر کا یہ شعر سنو:

فکر ہوتی ہے، فکر ہوتا ہے
اُونہہ دونوں طرح سے جائز ہے!

فکر کو دونوں طرح سے جائز ثابت کرنے والے اس خطرناک شعر کے حوالے سے فکر تونسوی سے میرا پہلا پہلا غائبانہ تعارف ہوا —— !!

اس روز میں نے سوچا کہ فکر تونسوی کا قلم اور دماغ دونوں ہی کس قدر "زوردار" ہیں کہ دہلی میں بیٹھ کر وہ اپنے پھل دار قلم سے پیازی سماج، کے چھلکے اتارتے ہیں اور ایک ہزار میل دور بمبئی میں بیٹھے اپنے ایک قاری کو رلانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ مجھے فکر تونسوی ادیب کم اور جادوگر زیادہ معلوم ہونے۔ جو مسمریزم ہپناٹزم کمیونزم اور پتہ نہیں کون کون سے ازم کے سہارے دور بیٹھے بیٹھے غریب عوام کو رلاتے رہتے ہیں۔ میں نے یہ سوچ کر اطمینان کا سانس لیا کہ اچھا ہوا میں نے آج تک جادوگری کے زور سے اپنے قارئین کو رلانے والے اس ادیب کو نہیں پڑھا، اور پھر حفظ ما تقدم کے طور پر پورے خشوع و خضوع کے ساتھ قسم کھائی کہ آئندہ بھی کبھی بھول کر فکر تونسوی کو نہیں پڑھوں گا —— !

فکر تونسوی کو کبھی نہ پڑھنے کی قسم میں نے محض اس لیے کھائی تھی کہ جو ادیب جادو ٹونے کی مدد سے ادب کو اپنے قاری پر مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی تحریروں کی زد سے دور رہنے ہی میں ایک قاری کی عافیت ہوتی ہے۔ لیکن افسوس میں اپنی عافیت کی خیر زیادہ دنوں تک نہیں منا سکا۔ کیوں کہ بہت جلد مجھے اس بات کا علم ہو گیا کہ فکر تونسوی ایک ایسا گھاگ گرگ باراں دیدہ قسم کا ادیب ہے جو نام بدل کر اپنی ادبی حیثیت کو پیر تسمہ پا کی طرح پڑھنے والوں کے ذہنوں پر مسلط کر دیتا ہے، مختلف فرضی ناموں کی آڑ لے کر وہ اپنے دشمنوں تک سے جا دوصول کر لیتا ہے، فکر تونسوی کو بھول کر بھی نہ پڑھنے کی میری قسم ایک ایسی جھوٹی

قسم ثابت ہوئی جہاں دفعل ہماری سرکاری عدالتوں میں اکثر کھائی جاتی ہے۔ اس جھوٹی قسم سے فکر تونسوی کا تو کچھ نہیں بگڑا' میرا ہی ایمان متزلزل ہوگیا (ظاہر ہے ادبی ایمان) بہت جلد مجھ پر یہ بھید کھل گیا کہ میں فکر تونسوی کو برسوں سے پڑھ رہا ہوں۔ بیسویں صدی کی پانچویں چھٹی اور ساتویں دہائی کے مشہور ادبی ماہنامے' بیسویں صدی کے تقریباً ہر شمارے میں جہاں گرد کے قلمی نام سے جو ادیب اپنی گل افشانی گفتار کے جوہر دکھاتا ہے وہ کوئی اور نہیں فکر تونسوی ہی ہے اس انکشاف نے میرے تجسس کو اس قدر ہوا دی کہ مجھ پر فکر تونسوی کے بارے میں نت نئی معلومات حاصل کرنے کا خبط سوار ہوگیا، گویا فکر تونسوی میرے لیے پبلک سروس کمیشن کے امتحان کا جنرل نالج والا پرچہ ہوگئے اور جب یہ پرچہ آؤٹ ہوا تو پتہ چلا کہ فرضی ناموں سے لکھنے والے اس آل راونڈ' ادیب کا اصل نام بھی فکر تونسوی نہیں بلکہ یہ بھی ان کا اپنا رکھا ہوا فرضی اور قلمی نام ہے، مفروضات کی بھول بھلیوں میں اپنے آپ کو الجھا کر فکر تونسوی اس حد تک ترقی کر گئے تھے کہ زندگی کے ہر شعبے میں فرض کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اردو صحافت میں قلم کے سہارے دور حاضر میں شاید ہی کسی صحافی ادیب کو خوش حال زندگی نصیب ہوگی۔ لیکن فرضی نام والے فکر تونسوی اپنے آپ کو خوش حال فرض کرکے بڑی آن، بان کے ساتھ مرتے دم تک جیتے رہے، ظاہر ہے کہ آن کے ساتھ جینے کے لیے ستم کے بے شمار بان' عرف تیر کھانے پڑتے ہیں اور فکر تونسوی بڑی شان سے اس تیر انداز زمانے کے ستم پرور تیر کھاتے رہے مسکراتے رہے بلکہ تیر کھاتے کھاتے وہ واٹر پروف چیزوں کی طرح تیر پروف ہوگئے تھے۔

جب ایک طنز نگار تیر پروف ہو جاتا ہے تو پھر وہ صرف طنز لکھنے پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس کی ہر حرکت، ہر عمل طنز آمیز ہو جاتا ہے اور فکر تونسوی طنز کی اس منزل پر پہنچ چکے تھے۔ چناں چہ وہ طنز لکھتے تھے طنز بولتے تھے۔ طنز اوڑھتے تھے۔ طنز بچھاتے تھے۔ طنز کھاتے تھے۔ طنز بانٹتے تھے۔ غرض ان کی زندگی صرف اور صرف طنز سے عبارت تھی۔ اس کے باوجود ان کی شخصیت میں طنز کی تلخی بہت کم اور خلوص کی مٹھاس بہت زیادہ تھی۔ ہر ادیب ہر فن کار کی طرح فکر صاحب کی بھی چند کمزوریاں تھیں۔ جیسے مسز فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین، سماج کی دکھتی رگیں اور لہور (لاہور کو فکر تونسوی دیگر لاہوریوں کی طرح پیار سے لہور کہتے تھے۔ اور ان ہر بات کی تان بلکہ اکثر ٹانگ بھی لہور پہ ٹوٹتی تھی) البتہ سماج کی دکھتی رگوں پہ انگلی رکھنے کی کمزوری ان کی دیگر کمزوریوں پہ حاوی تھی بلکہ اگر فکر تونسوی کی اس کمزوری کو شہہ زوری، کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔

فکر تونسوی برسوں سے سماج کی کسی نہ کسی دکھتی رگ پر انگلی رکھتے چلے آرہے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر آخر میں وہ حکیم نابینا کی طرح صرف لفافے کو چھو کر خط کا سارا مضمون بیان کر دیا کرتے تھے۔ اگر کوئی فکر تونسوی سے یہ پوچھتا کہ اوپر والے نے انسان کو انگلیوں کی نعمت سے کیوں نوازا ہے تو جواب میں فکر تونسوی یقیناً یہی کہتے کہ انسان کو انگلیاں اس لیے بخشی گئی ہیں کہ وہ انھیں سماج کی دکھتی رگوں پر رکھ کر سماج سدھار کا کار خیر انجام دے سکے۔ فکر تونسوی کی انگلیوں کا صحیح مصرف نہ تو انہیں گھی میں ڈبونا تھا اور نہ کسی سود خور سیٹھ کی طرح ان پر سود کی رقم کا حساب جوڑنا تھا — سماج کی دکھتی رگوں پہ انگلی رکھتے رکھتے فکر تونسوی سماج سدھار کے راستے پر اس قدر آگے نکل گئے تھے کہ صرف انگلی رکھ کر ہی انھیں چین نہیں پڑتا تھا بلکہ انھیں سماج کی دکھتی رگ میں کوئی

زہریلا مادّہ سرایت کرتا محسوس ہوتا یا اس میں کوئی ناسور جڑ پکڑتا دکھائی دیتا۔ وہ اپنے نوکِ قلم سے نشتر کا کام لے کر کامیاب جراحی کا نمونہ بھی دکھا جاتے تھے۔ میری نظر میں فکر تونسوی صرف ایک طنز نگار ادیب، ایک صحافی یا ایک کالم نویس نہیں بلکہ ایک کامیاب جراح بھی تھے۔ لیکن لفظ جراح کو بخدا ان محدود معنوں میں مت استعمال کیجیے جو اس نائی کے لیے بھی مستعمل ہے جو ننھے منوں کی "ختنہ" کر کے خود کو بڑا ماہر "سرجن" سمجھنے لگتا ہے۔ میں فکر تونسوی کو ان معدودے چند قلم کاروں میں شمار کرتا ہوں جن پر مرزا غالب کا یہ شعر کلیتاً صادق آتا تھا۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

(باقی آئندہ شمارے میں)

کلیم ضیا
(بمبئی)

غزل

جوتیاں کرتے ہیں سیدھی رات دن سرکار کی
تاکہ حاصل ہوں انھیں بھی کرسیاں سرکار کی

سات پھیرے کیا لگے سب ہیکڑی جاتی رہی
انگلیوں پر ناچتا پھرتا ہے اب دلدار کی

کل صحافی اور مدیر و منتظم تھا جس کا میں
ردّیاں اب بیچتا پھرتا ہوں اس اخبار کی

ہر گھڑی دھڑکا لگا رہتا ہے چپل کا انھیں
کاش کر سکتے شکایت اس اللہ ماری مار کی

کالی چوٹی، موٹی عینک، نقلی بتّیسی لیے
وہ نشانی ڈھونڈتے پھرتے ہیں اپنے پیار کی

فکر ہم پر ہے ضیاؔ لازم مرمت کی ہوئی
کافی اینٹیں گر چکی ہیں قوم کی دیوار کی

منظور الامین
(حیدرآباد)

رفیعہ

(ایک خاکہ)

رفیعہ سے میری ملاقات آج سے (X) ایکس برس پہلے ہوئی۔ آپ جاننا چاہیں گے ایکس (X) کا مطلب کیا ہوتا ہے یا کتنے برس پہلے، جواب میں کہوں گا : میں مسلمان ہوں مجھے علم حساب آتا نہیں اور حساب ہی کیا اہل وطن مسلمان کو آتا ہی کیا ہے؟

معافی کا خواستگار ہوں کہ بات ذرا تیکھی ہوگئی لیکن جس شخصیت کا ذکر آج کی اس محفل میں ہے وہ ہیں بھی تو تیکھی، میری مشکل یہ ہے کہ علم مجلسی کو پیش نظر رکھ کر اگر میں رفیعہ کی کچھ زیادہ ہی تعریف کروں تو یقین ہے کہ یہ تو خوش ہو جائیں گی کیوں کہ ہر عورت تعریف سے خوش ہوتی ہے لیکن اندیشہ ہے کہ میرے تعلق سے آپ سوچیں گے کہ ویسے تو یہ شخص خاصا مہذب لگتا ہے لیکن شاید اپنی بیوی سے ڈرتا ہے۔ اس کے برعکس اگر میں ان کے بارے میں publicity کچھ ایسے کلمات سے کردوں جو انھیں ناگوار ہوں تو یہ بات طے ہے کہ ہمارے گھر کا امن غارت ہو جائے گا اور سکون وچین درہم برہم ہو جائے گا' ان دنوں جبکہ رفیعہ کئی SITCOMS اور Tele flims لکھنے میں مصروف ہیں۔ خادم کو جو کچھ کچی پکی کھانے کو مل جاتا ہے وہ اس سے بھی گیا۔ گھر پہنچ کر یہ مجھ سے کہیں گی " اے میاں تم نے مجھ تو آج بڑی TONGUE IN CHEEK بات کی You should have kept a civil tongue in your head -

میں نے انگریزی الفاظ اس لیے استعمال کیے کہ انھیں غصہ جب بھی آتا ہے بے تحاشہ آتا ہے اور انگریزی میں آتا ہے ادھر اندر کی بات اگر آپ پوچھیں تو زبان کے اس شعر کے ذریعے بات کہنی چاہوں گا کہ اس وقت زباں ہی کی بات چل نکلی ہے :

حالِ دل کیوں کر کروں اپنا بیاں اچھی طرح
روبرو ان کے نہیں چلتی زباں اچھی طرح

اس لیے صاحبو! بہتر یہی ہے کہ میں رفیعہ کا خاکہ بھی اگر کھینچوں تو ایسا لگے کہ واقعی بہت عمدہ نقشہ ہے لیکن اس process میں ڈر یہ بھی ہے کہ کہیں اس خاکسار کا خاکہ نہ اُڑ جائے۔

چونکہ آج یہ ان کے ناول کے ریلیز کی محفل ہے اس لیے فوراً یہ کہہ دوں تو بہتر ہوگا کہ رفیعہ ایک اچھی کہانی کار اور ناول نویس ہیں۔ کہانی کا تانا بانا بننے پر انھیں واقعی دسترس حاصل ہے۔ یہ ایک تخلیقی فن کار ہیں تخلیقی صلاحیت خدا کی دین ہے خواہ یہ تصویر بنا رہی ہوں یا کہانی لکھ رہی ہوں تخلیق کے اسی کرب سے گزرتی ہیں جسے حافظ شیرازی نے یہ خوب صورت الفاظ دیے ہیں۔

زخاکِ تیرہ درون تا بہ شیشۂ حلبی

انگور کا بیج خاکِ تیرہ میں پلتا ہے بڑھتا ہے پودا بنتا ہے اور انگور کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس سے شراب کشید کی جاتی ہے اور یہ شراب پھر شہر حلب میں بنے ہوئے ساغر میں ڈھلتی ہے یہ سارا process تخلیق ہی کا Process ہے۔

رفیعہ ایک اچھی مصور، نقاش اور سنگ تراش بھی ہیں۔ اسٹاپ پریس یہ ہے کہ شوہر کے ساتھ ان کی معاش بھی خوب سے خوب تر ہوتی جا رہی ہے۔ تو آج سے قبل کبھی کبھار ان کا برتاؤ وجہِ خراش بھی ہوا ہے۔

میں انھیں کبھی تو Spark plug کہتا ہوں جو کار کو Ignition اور پھر movement دیتا ہے اور کبھی Catalyst، یہ وہ ایجنٹ ہے جس کی وجہ سے کیمیائی تغیر واقع ہوتا ہے۔

رفیعہ کی کہانیوں میں عورت کا دکھ درد ہے، ساتھ ہی یہ عورتوں کو زبردست حوصلہ دیتی ہیں، یہ ان کے سارے ہی ناولوں کی ہیروئنز بڑی باہمت اور حوصلہ مند ہیں، وہ مردوں کی اس دنیا میں مرد سے جس طرح نبرد آزما ہوتی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہی ہیں۔ یہ لڑکیاں شکست نہیں کھاتیں، راہ فرار اختیار نہیں کرتیں۔ اس جنگ میں ان کے پاؤں بقول غالب قلم نہیں ہو جاتے بلکہ وہ آنچل سے پرچم بنا لیتی ہیں۔ رفیعہ کی تحریروں کو پڑھ کر ملک کے کئی علاقوں سے خطوط آتے ہیں جن میں لڑکیاں لکھتی ہیں ہم بہت پژمردہ اداس اور پستی کی حالت میں تھے، آپ کی تحریر نے ہمیں حوصلہ دیا ہے۔ خواہ وہ عالم پناہ کی ہیروئن ایمن ہو کہ "سارے جہاں کا درد" کی ہیروئن دلبر یا زیر نظر ناول "یہ راستے" کی ہیروئن کا کل ان سب لڑکیوں میں اعلیٰ حوصلگی اور خود اعتمادی ہمیں ملتی ہے۔

ہرزہ سرا، خرافاتی لوگوں سے رفیعہ کی کبھی نہیں بنتی، بھاڑے کو گلاب کہنے کی توقع آپ ان سے نہ رکھیں کیونکہ یہ راست گو ہیں انسانی سطح پر یہ ایک اچھی بیوی اور ایک اچھی ماں ہیں۔

صاحبو! میں کوئی نقاد نہیں پھر بھی کوشش کرتا ہوں کہ رفیعہ جب کبھی اپنی نئی تخلیق مجھے سنائیں اس پر اپنی رائے معروضی طور پر دے سکوں، کبھی کبھار سخن گسترانہ بات بھی آ جاتی ہے لیکن مقصود قطعِ محبت نہیں ہوتا اور بات کو صحیح perspective میں سے کر گفتگو جاری رہتی ہے۔

انگریزی زبان میں شاعری کی ایک صنف ہے جسے doggerel کہتے ہیں جسے ہم اپنی زبان میں تک بندی یا معمولی سطح کی شاعری یا Versification of facts کہہ سکتے ہیں جیسے کوئی کہے:

ریل پنجاب کو جاتی ہے بھٹنڈہ ہو کر

وغیرہ۔

رفیعہ کے اس ناول میں چائے باغات کا پس منظر ہے، اس پر یاد آیا ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں doggerel شاعری کی جاتی تھی مثلاً:

تھوڑا روٹی تھوڑا چپا
کوئن وکٹوریہ بہت اچھا (اچھا)
تھوڑا مکھی، تھوڑا جسیم
Queen Victoria is a very fine man

میں اپنی بیوی کا حسب نسب کوئن وکٹوریہ سے نہیں ملا سکتا نہ ملانا چاہوں گا۔ البتہ اس تک بندی کی آخری لائین میں نام کی ترمیم کے ساتھ آخر میں یہی کہنا چاہوں گا کہ ان میں کچھ کمزوریاں کیوں نہ ہوں لیکن

Rafia is a very fine man

صاحبو! اس سے کہیں آپ میرے بارے میں الٹا نتیجہ نہ اخذ کرلیں ویسی بات نہیں،

Rafia is certainly a fine woman

مگر اس کا کیا کیا جائے کہ روزمرہ کی گفتگو میں رفیعہ کا انداز تذکیری ہے جیسے میں جا رہا ہوں، میں کھا رہا ہوں وغیرہ، یاد آیا۔ ہماری جب شادی ہوئی تو انھوں نے فرمایا تھا "آج میں بہت تھک گیا ہوں" یہ سن کر میں نے اپنے آپ پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور خود خریدگی سے عرض کیا تھا:

"بہت بہتر تو میں سوتی ہوں"

(رفیعہ منظور الامین کے نئے ناول "یہ راستے" کی رسم اجرا پر پڑھا گیا)

غزلیں

ظفر کمالی (سیوان)

اپنی ہستی کا نگہبان سمجھ بیٹھے ہیں
مال و دولت کو ہی بھگوان سمجھ بیٹھے ہیں

چال میں ایسی رعونت کہ الٰہی توبہ
آدمی ہونا بھی آسان سمجھ بیٹھے ہیں

چار پیسے جو ہوئے اپنی حقیقت بھولے
خود کو بستی کا وہ سلطان سمجھ بیٹھے ہیں

لگ گیا ہاتھ کہیں سے انھیں بوسیدہ کلام
اس کو اپنا ہی وہ دیوان سمجھ بیٹھے ہیں

ناز ہے جن کو یہاں اپنی خرد مندی پر
خار زاروں کو گلستان سمجھ بیٹھے ہیں

زندگی لاکھ گراں مایہ سہی پر اس کو
لوگ عاشق کا گریبان سمجھ بیٹھے ہیں

ہے اٹھا جہلِ مرکب سے خمیر ان کا مگر
قوم کا خود کو حُدی خوان سمجھ بیٹھے ہیں

جس کو احباب ظفر بوفے ڈنر کہتے ہیں
ہم اسے لُوٹ کا سامان سمجھ بیٹھے ہیں

○

سراج نزہلی

رنجیت یا سجیت ؟ بتا ! کون لے گیا؟
معصوم مادھوری کو بھگا کون لے گیا ؟

اب تک تو وہ یہیں تھا پڑا ، کون لے گیا؟
سیڑھی تھی جس میں بھر کے گھڑا کون لے گیا ؟

تھی منہ کے سامنے جو غذا ، کون لے گیا؟
جو جیب میں رکھا تھا.. وڑا کون لے گیا؟

یوں مت ستا بتا دے ، پتہ کون لے گیا؟
تھی میان میں جو مانوتا ، کون لے گیا ؟

بس میں ادھر جھکا تو ادھر غیب ہو گئے
رکھے یہیں تھے اِڈلی وڈا کون لے گیا؟

کپڑوں کی پوٹلی کو وہ خود ڈھو رہا ہے کیوں!
دھوبی کے پاس تھا جو گدھا کون لے گیا؟

پہلے تو موٹا تازہ تھا اب ڈھار ہے سراج
ہے بیچ کے حرف 'ج' سرا کون لے گیا؟

○

حفیظ انجم کریم نگری

میری شہرت ہے دیوی جی اتنی!
بھیڑ اکٹھا جو ہو گئی اتنی

سیٹھ کیوں پیٹ بھر نہیں کھاتا
ہے تجوری بھری پڑی اتنی

سارے انگور چٹ گئے اس نے
تھی وہ چالاک لومڑی اتنی

ہر جگہ اس کی ہار ہوتی ہے
اب شرافت ہے منہ مری اتنی

صرف میک اپ میں دن گزرتا ہے
میری بیوی ہے کام کی اتنی

بیچ بازار تجھ کو بیچے گی
چیز ہے وہ میاں چھٹی اتنی

اس کی "اماں" بھی کم نہ تھی انجم
اس لیے ہے وہ سرپھری اتنی

سلیم مقصود
(جدہ)

آ بیل مجھے مار

ایک مضمون نگار کے مضامین کا مجموعہ ہم نے حال ہی میں پڑھا۔ اس مجموعے کا نام تھا "آ بیل مجھے مار" مضمون نگار نے اس مجموعے کے پیش لفظ میں لکھا تھا کہ "میں نے زندگی کا مطالعہ ایسے کیا ہے جیسے ایک بیل اپنے چارے کا کرتا ہے۔ پھر انھوں نے کتاب بظاہر مضمون بیل کے نام معنون کردیا تھا۔ ان کے ایک مضمون کا عنوان تھا۔ "دو بیلوں کی جوڑی خوب سجے گی (یہ مضمون انھوں نے اپنے اور اپنے ایک عزیز ترین دوست کے بارے میں لکھا تھا) حالانکہ یہ محاورہ ہمارے ملک کی ایک سیاسی جماعت کا انتخابی نشان تھا۔ پھر اس جماعت سے دو بیلوں کی یہ جوڑی چھن گئی اور صرف ان کو ہانکنے والے رہ گئے جس سے اب تک وہ عوام کو جس سمت میں چاہتی ہے ہانک دیتی ہے۔ دوسرے مضمون کا عنوان تھا۔ "بیل کا دماغ رکھنے والے" یہ عنوان ہمیں کچھ بین السطور قسم کا لگا۔ ایک مضمون میں انھوں نے اپنا اور بیلوں کا تقابل کرتے ہوئے لکھا "بیل اور انسان میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ افسوس یہ فرق رفتہ رفتہ کم ہوتا جارہا ہے۔" بس اسی جملے نے ہمارے دل میں گھر کرلیا اور ہم نے ارادہ کرلیا کہ صاحبِ مضمون سے ضرور ملاقات کریں گے اور اپنی آنکھوں سے ہم خود دیکھیں گے کہ یہ فرق دو مخلوقات میں کس قدر پایا جاتا ہے۔ ایک جگہ زورِ بیان میں تلفظ کی رسی توڑ کر موصوف نے "بیل" (پودوں کی ایک قسم) کو "بَیل" (جانوروں کی قسم) موںڈھے چڑھا لکھ دیا۔" سنا گیا ہے کہ ایک بہت ہی ثقہ قسم کے پیشہ ور نقاد نے ان کی کتاب کی رسم اجرا کے دن ان کے مضامین کی اس قدر تعریف کی کہ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے مٹی سے بھرے بورے پر کسی نے کمخواب کا غلاف چڑھا دیا ہو۔ بعد میں پتہ چلا کہ رسم اجرا سے قبل مضمون نگار نے جس دعوت کا اہتمام کیا تھا اس میں اتنے ہی اقسام کی ڈشس تھیں۔ جتنے اقسام کی خوبیاں فاضل نقاد نے مضامین کے مجموعے میں بتلائی تھیں۔ اسی طرح نقاد نے حقِ مہمانی و حقِ دسترخوانی ادا کیا تھا۔ ایک اخبار کے مدیر کو اس کتاب کے مضامین اور ان کے اخبار کے قارئین کے درمیان بہت سی باتیں مشترک نظر آئیں۔ چنانچہ رسم اجرا کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے موصوف نے فرمایا "ہمارا اخبار بیلوں کا اخبار ہے۔ ہم ایسی خوشبودار سیاہی استعمال کرتے ہیں

کہ بیل بھی ہمارے اخبار کو پسند کرتے ہیں .... بلکہ یہ دنیا کا واحد اخبار ہے جس پر بیل ٹوٹے پڑتے ہیں اور کبھی کبھی تو سینگ مار کر ہاکر ہی سے چھین لیتے ہیں۔" اگر بیلوں کی کہیں آزاد و خود مختار ریاست ہوتی تو یہ کتاب وہاں کے نصاب میں شامل کر دی جاتی اور اس صاحب طرز ادیب کو اس ریاست کے سب سے "اعلیٰ خطاب" سے نوازا جاتا۔ ایک مضمون میں انھوں نے انسانوں میں اتحاد کی اہمیت کو ہیرا اور موتی کی مثال سے اجاگر کیا۔ اور بتلایا کہ کس طرح محض اتحاد کے سبب دو بیل ہر پندھی سے آزاد ہو جاتے ہیں (بلکہ خطرناک ہو جاتے ہیں) پھر انھوں نے لکھا کہ اگر ہم انسان متحد ہو جائیں ہیرا اور موتی کی طرح تو میرے سوا کسی کا بال بھی کوئی بانکا نہیں کر سکتا۔ قوسین میں موصوف نے لکھا کہ میں اس محاورے کی گرفت سے آزاد ہوں کیونکہ میرے بال ہی نہیں ہیں۔ آخری مضمون میں انھوں نے کھلے دل سے بیلوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا۔ "اے بیلو! ہم انسان آپ کے مشکور ہیں کہ آپ کے سبب ہماری زبان میں بہت سے محاورے بن سکے۔ اردو زبان خصوصاً آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولے گی۔ ہم نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ آپ کا ہمارا ساتھ بہت قدیم ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہزاروں سال تک آپ ہم ایک ہی تھان پر بندھے رہے ہوں اور ایک ہی ناند میں کھاتے رہے ہوں۔ کیوں کہ ہماری اور آپ کی بہت سی نشست و برخواست کی عادتیں ملتی جلتی ہیں۔ اس لیے انسان اور بیل کی دوستی امر ہے" پھر انھوں نے آخر میں ایک "ہندی چینی بھائی بھائی" قسم کا نعرہ بھی لگایا جسے ہم نے یہاں نہیں لکھا کیونکہ بیلوں سے زیادہ گہری دوستی کا ایکبار ہندوستان کی ساری قوم کو تجربہ ہو چکا ہے۔ انھیں جیسے ایک صاحب طرز شاعر نے ان کے مضامین میں زبان و بیان کی غلطیوں کو خوبی ثابت کرنے کے لیے دلی اور لکھنؤ سے اسناد پیش کیں اور بعض محاوروں کے غلط استعمال کو بیلوں کی غلطی سمجھ کر سندِ قبولیت عطا کرنے کی ادبی نقادوں سے اپیل کی تاکہ دوسرے جانوروں کے متعلق مضامین لکھنے والے ادیبوں کی حوصلہ افزائی ہو۔ پھر انھوں نے اعلان کیا کہ مضمون نگار ممدوح کے مضامین سے حوصلہ پا کر انھوں نے اپنے آئندہ مجموعۂ کلام کا نام "خرِ معصوم" رکھنے کا ارادہ کیا ہے۔ انھوں نے بتلایا کہ اس شعری مجموعے کے سارے مضامین اور محاورے انسان کے قدیم خدمت گار گدھے" سے متعلق ہوں گے۔ جانوروں کو جب زمین پر تحفظ دیا جا رہا ہے تو پھر ادب میں بھی ان کا تحفظ کیا جانا چاہیے بلکہ ادب میں گدھوں کے مقام کو متعین کر دینا چاہیے۔ یہ عرصے سے معرضِ التوا میں پڑا ہوا مسئلہ اب حل ہو جانا چاہیے۔ انھوں نے پطرس اور کرشن چندر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا "ان دونوں ادیبوں نے معزز جانوروں کے مقام کو ادب میں پہچانا اور اس کا تعین کیا۔ خصوصاً کرشن چندر سے قبل شرفا ایک دوسرے کو گدھا کہنے سے کتراتے تھے۔ کرشن چندر نے انھیں گدھے کی سوجھ بوجھ اور اس کی دانشوری سے واقف کروایا۔ اس کے بعد معزز لوگ پارلیمان میں تک ایک دوسرے کو فخر سے گدھا کہنے لگے۔"

غرض ہم ذوقِ ملاقات میں مضمون نگار کے فلیٹ روانہ ہوئے۔ پتہ کتاب میں لکھا تھا۔ اس لیے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ فلیٹ پہنچے تو دروازے پر کال بیل کے بجائے قفل کی وضع کی زنجیر لگی تھی۔ ہم نے دو تین بار زنجیر بجائی۔ اندر سے ایسی خوف ناک آواز آئی کہ جس کی دہشت سے دروازہ کانپنے لگا۔ ہم نے اپنا تعارف کرایا۔ تھوڑا سا دروازہ کھلا۔ پھر اس میں سے ایک گنجا سر برآمد ہوا۔ ہم سے مدعا پوچھا گیا۔ ہم نے کہا۔ "ملاح ہیں آپ کے۔ شرفِ ملاقات کے لیے آئے ہیں۔" ہماری جسامت کے برابر دروازہ کھلا اور گریبان پکڑ کر ہمیں اندر گھسیٹ لیا۔

اندر کا منظر اور ہیبت ناک تھا۔ ساری چیزیں الٹ پلٹ پڑی تھیں۔ برآمدے میں ایک جانب ایک ٹیبل پہ بڑا سا ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ جس پہ دو لڑاکا بیلوں کا کانچ کا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ موصوف نے ہماری طرف دیکھ کر اپنے مضامین کے آئیڈیل کی طرح موٹی گردن ہلائی اور ہنس کر کہا۔ جب سے بیگم میکے گئی ہیں میں گھر میں ایسے رہتا ہوں جیسے آئینہ خانے میں بیل گھس آیا ہو۔" پھر خود ہی قہقہہ مار کر ہنس پڑے اور فرمانے لگے۔ آپ کے آنے سے قبل علم الہندسہ پر غور کر رہا تھا۔ کیا آپ اس علم سے واقف ہیں ؟"

ہم نے کہا "کیوں نہیں" کہنے لگے "بتلائیے! ہمارا لکی نمبر کیا ہے۔" ہم 420 کہنے ہی والے تھے کہ بند دروازے اور ان کی شخصیت کا خیال آگیا اور ہم نے فوراً بات بدل کر جواب دیا "آپ کا لکی نمبر ہے دو ۲"

کہنے لگے "تمہیں کیسے معلوم ؟" ہم نے بتلایا "آسان سی بات ہے۔ دو آنکھیں، دو کان، دو ہاتھ اور ہر بات دو بار کہنے کے بعد آپ کی سمجھ میں آتی ہے"۔ غصے سے ہماری طرف دیکھ کر کہنے لگے۔ میرا مذاق اڑا رہے ہو؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ باہر جانے کا راستہ بند ہے" ہمارے بدن میں جھرجھری آگئی ڈر کر بولے "آپ غلط سمجھ ہم ثبوت دیتے جا رہے تھے" خود ہی بات کاٹ کر بولے "ہمیں پتہ ہے ہمارا لکی نمبر دو ہے کیونکہ ہم نے میٹرک دوسری بار پاس کیا تھا۔ گریجویشن ہر مضمون میں دو بار.... کامیاب ہوئے۔ ملازمت سے دو بار نکالے گئے۔ شادی دو بار ہو چکی ہے" ہم نے درمیان میں ٹوکا "آپ کی دوسری بیوی کا لکی نمبر دو تو نہیں" وہ ہمارا مطلب بھانپ گئے۔ اور سر جھکا کر ہماری طرف ایسے لپکے گویا اسپرنگ مارنا چاہتے ہوں۔ ہم نے چھلانگ لگائی اور دروازہ کھول کر نکل پڑے۔ ان کا سر اس زور سے دروازے سے ٹکرایا کہ اس کے ارتعاش سے خود بخود لفٹ تیسری منزل پر آگئی۔ ۵۵

بابو آر کے

میرے پڑوس کا سرکاری نل

چوں کہ ہماری ذات میں سیاسی اور سماجی جراثیم کچھ زیادہ ہی کلبلاتے ہیں اس لیے اکثر ہم سیاست سے کام لیتے ہوئے سماجی خدمات میں خود کو مصروف کرلیا کرتے ہیں۔ ویسے سماجی خدمات کے معاملے میں ہم اپنے ساتھ ساتھ سرکاری نلوں کی افادیت کے بھی قایل ہیں اسی لیے ہم عرصۂ دراز سے اپنے گھر کے پڑوس میں ایک سرکاری نل لگوانے کا ارمان رکھتے تھے...... اور خیر سے پچھلے دنوں خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ہمارے سیاسی اثر و رسوخ کام آ ہی گئے اور ہم نے اپنے پڑوس میں سرکاری نل لگوا ہی لیا۔ ہماری اس دیرینہ تمنا کے پورا ہوتے ہی ہم اور جملہ اہل خانہ خوشی و مسرت سے سرشار ہوگئے۔ نل کے لگنے پر جہاں ہم اپنی سیاسی کامیابی پر مسرور تھے وہیں بیگم یہ سوچ سوچ کر خوش ہوئی جا رہی تھیں کہ اب وہ گھر میں موجود اپنے نجی نل سے پانی کم کم لے گی اور اس سرکاری نل سے زیادہ مستفیض ہوں گی۔ اسی طرح گھر کے دیگر افراد، اس سرکاری نل پر سو جان سے فدا اس لیے ہو رہے تھے کہ، ان کی دانست میں اس کے دم قدم سے اپنے گھر کے آس پاس رونق ہی رونق ہوگی اور خوب چہل پہل رہے گی۔

خیر صاحب، حسب روایت الٹی بالٹی یعنی میونسپلٹی وارڈ کے کونسلر صاحب نے تالیوں کی گڑگڑاہٹ اور برتنوں کی جھنجھناہٹ کے بیچ ہمارے اس نومولود سرکاری نل کا اودگھاٹن، اس کی ٹونٹی گھما کر کیا۔ ابھی کونسلر صاحب افتتاحی رسم پوری کرکے نل کے پاس سے ہٹنے بھی نہ پائے تھے کہ پانی بھرنے والی بھیڑ نے انھیں دھکے فراہم کرکے پرے ڈھکیلا اور انتہائی بھونڈے طریقے سے برتن بھانڈے لے کر نل پر چڑھ دوڑے۔ قصہ مختصر یہ کہ اس نئے نویلے نل سے پانی لینے کے لیے ہر کوئی ماہیٔ بے آب تھا۔ جسے دیکھو وہ مارنے مرنے پہ تیار تھا وہ دھکم پیل اور کالی گلوج شروع ہوئی کہ اللہ کی پناہ، ہمارے سرکاری نل کی یہ شانِ نزول ہے کہ اس نے اپنے نازل ہوتے ہی مارا ماری اور تو تو میں میں سے محلہ کو لرزا کے رکھ دیا۔ اودگھاٹن کے فوراً بعد اس نے اچھے اچھوں کو پانی بھرانا ہی نہیں بلکہ پانی بھی پلا دیا۔......... اور اپنی آمد در

افتتاحی تقریب کے ساتھ ہی اس نے بیس چوڑیاں، پانچ برتن، دو افراد کے سر پھوڑ ڈالے اور ایک طلب گار
آب کی ٹانگ توڑ دی۔ اس دن تو اس سانحہ کا نوٹس ہم نے اس لیے بھی نہیں لیا کہ اس نل کا پہلا دن تھا اور
یہ ممکن ہے اہلِ محلہ نے کچھ زیادہ ہی جوش و خروش دکھایا ہوگا جن کی بنا پر برتنوں، چوڑیوں، سروں
اور ٹانگوں کی توڑ پھوڑ ہوئی ہوگی اس طرح بڑی آسانی سے ہم نے اپنے سرکاری نل کے اس پہلے قصور
کو لوگوں کی غلطی پر محمول کیا اور اسے معصوم و بے قصور جانا۔ دوسرے دن علی الصبح چیخوں، نعروں اور
برتنوں کی آوازوں نے ہمیں جگایا ہی نہیں بلکہ بستر چھوڑ کر بھگا دیا۔ ہم بھاگے بھاگے دروازے پہ آئے
اور باہر جھانک کر دیکھا۔ نل کے اردگرد لوگوں کا ہجوم آپے سے باہر تھا۔ برتن سے برتن ہی نہیں ٹکرا رہے
تھے بلکہ آدمی سے آدمی بھی ٹکرا رہا تھا اور مرد سے عورت بھی ٹکرا رہی تھی۔ کسی کی کالر کوئی پکڑے ہوئے
تھا تو کوئی کسی کا ہاتھ کسی کے گریبان پر ڈالے۔ پہلے تو عادت و گریباں کا یہ میل ملاپ دیکھ کر ہم نے اپنا سر پیٹ لیا اور اپنے پڑوس میں
سرکاری نل لگوانے کے اپنے فیصلہ پر ہم خود ہی لعنت ملامت بھیجنے لگے۔ آپ یقین جانیئے کہ جس دن سے ہم نے
پڑوس میں سرکاری نل لگوایا ہے اس دن سے آج تک صبح سویرے ہم نہ ملّا کی اذاں سے بیدار ہوئے نہ
مرغ کی بانگ سے اور نہ بیگم کی ہانک سے، یہ واقعہ ہے کہ ہر صبح اصحابِ نل کی چیخ و پکار ہمیں جگا دیا
کرتی ہے۔ گویا ہمارے پڑوس کا سرکاری نل اوروں کے لیے بھلے ہی نل رہا ہو لیکن یہ دشمن جاں نصیب
طوفان ہمارے لیے الارم بھی ثابت ہوا ہے۔ اس نل کے تعلق سے ایک اور بات جو ہم نے محسوس کی.....
وہ یہ کہ وارڈ میں اس کے قدم رنجہ فرمانے سے قبل اہلِ محلہ شرفا کی زبان اپنی بول چال میں استعمال کرتے تھے
لیکن یہ ہمارے سرکاری نل کا اعجاز ہے اس کی صحبت خبیثہ نے اہلِ محلہ کو شہدوں اور اٹھائی گیروں کی
زبان سے آشنا کر دیا۔ اسی نل کی نوازش سے تمام محلہ میں سے بڑوں کا ادب، چھوٹوں کا ڈر خوف ہی نہیں
گیا بلکہ پانی بھرتے رہنے کے باعث جوانوں کی آنکھوں کا پانی بھی مرا اور باحیا خواتین کے سروں سے آنچل
بھی گرا۔

العرض وارڈ میں سرکاری نل کی کرم فرمائیاں پوری شد و مد کے ساتھ جاری رہیں جس کے نتیجہ
میں اکثر تنازعات اٹھتے رہے۔ سر اور برتن پھوٹتے رہے، ہاتھ اور پیر ٹوٹتے رہے جس کے باعث نل کے
آس پاس پانی کم اور خون زیادہ بہنے لگا۔ نل کے اس آفاقی فنکشن کو دیکھتے ہوئے پھر ایسا بھی ہوا کہ محلہ
کے شرفا اپنے بچوں کے اخلاق و کردار کی بحالی کے پیشِ نظر انھیں نل سے دور بہت دور رہنے کی
تاکید کرنے لگے۔ ایک دن فکر مند ہو کر ہم نے بھی اپنے گھر میں بیگم سے کہا، دیکھو بھئی، ذرا دھیان رکھنا
کہیں ہمارا منا بھی نل پہ آنے جانے نہ لگ جائے؟ یہ سن کر بیگم بولیں، ہائے اللہ آپ بھی کیا بدکلامی کرتے
ہیں۔ خدا نہ کرے ہمارا منا اس مردار نل پہ جائے، ارے لے دے کر ایک ہی تو اولاد ہے۔ ہماری...
اولاد اگر وہ بھی اس موئے نل پہ جانے لگ جائے تو پھر اس دنیا میں ہمارا نام لیوا کیا جائے گا۔ وہ آنکھوں
میں آنسو لا کر بولیں، ہم تو کہیں کے نہ رہیں گے۔ اس طرح بیگم ہر وقت منے میاں کو ٹوکتی رہتیں کہ دیکھو بیٹا
پانی کے لیے تم کو بحر الکاہل یا بحر اوقیانوس جانا پڑے تو جاؤ لیکن تمہیں میرے دودھ کا واسطہ بھول کر بھی
تم اپنے پڑوس کے سرکاری نل پر مت جانا..... ہاں بیگم کی ہوں یہ نہ جانے کی صبح شام کی اس تنبیہہ کا

اکثر ہمارے منے پر یہ ہوا کہ ..... جب کبھی وہ کسی غیر معمولی چیز کی فرمائش کرتا اور اس کی فرمائش پوری کرتے تو وہ باغیانہ تیوروں کے ساتھ کہتا "دیکھو ابو، آپ میری فرمائش پوری کرتے ہیں یا میں نل پہ جاؤں۔ یہ سنتے ہی بیگم جھپٹ کر اسے دبوچ لیتیں اور ہم سے کہتیں جائیے اور جلدی سے اس کی فرمائش پوری کر دیجیے۔ نہیں تو یہ نل پہ چلا ہی جائے گا۔ اور اس طرح ہم اپنے بیٹے کی ہر جائز و ناجائز فرمائش محض اس لیے پوری کر دیا کرتے کہ کہیں واقعی یہ سرکاری نل پہ نہ چلا جائے۔ چونکہ یہ نل اپنے پڑوس میں ہم نے لگوایا تھا اس لیے اس خطا کی سزا بھی ہمیں بھگت رہے تھے۔ یعنی ہمارا زیادہ تر وقت نل کے خرافات کی نذر ہونے لگا۔ لوگوں کے قضیے نمٹانے انہیں اسپتال پہنچانے عدالتوں میں چشم دید گواہ بن کر لوگوں کو پولیس تھانے سے چھڑانے ہم دن سے رات مصروف ہو گئے۔ الغرض سرکاری نل کی پے در پے شدید کارگزاریوں کے باعث اس پہ ایک برا وقت ایسا بھی آیا کہ عوام الناس میں اس کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی، نل کے تئیں عوام میں بیزارگی دیکھ کر ہم نے بھی مصمم ارادہ کر لیا کہ اب تو ہمارے پڑوس میں یا تو یہ بے ہودہ نل نہیں رہے گا یا اس نل کے پڑوس میں ہم نہیں رہیں گے۔ یہ طے کر لینے کے بعد رائے عامہ کو مزید ہموار کرنے کے لیے ہم نے اپنے وارڈ میں "نل ہٹاؤ" اندولن آرمبھ کر دیا۔ ہم نے "نل ہٹاؤ اخلاق بچاؤ" نعرے سے مزین بینرس چھپوا لیے، جلسے جلوس کا اہتمام کیا۔ ایک شام سرکاری نل کے قریب ہی ہم نے ایک عظیم الشان جلسے کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا "حاضرین سرکاری نل" اس تخاطب پر مجمع میں تالیاں بج اٹھیں، ہم نے تالیاں بجانے والے اپنے گرگوں کو گھورا۔ تالیاں تھم گئیں ..... لیکن ایک سرگوشی ضرور ابھری، "عجیب آدمی ہے ہم سے تالیاں بجانے کا معاہدہ بھی کرتا ہے اور تالیوں پہ ناراض بھی ہوتا ہے" ہم نے سرگوشی کو فوراً کچل دیا اور بولے لیجیے تو سنیے۔

ہمارے سماج میں سرکاری نل ایک مہان درجہ رکھتے ہیں اور یہی سرکاری نل ہمارے بھارتیہ سماج کا اٹوٹ انگ ہیں لیکن آپ لوگ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ اسی اٹوٹ انگ سے ہمارے انگ انگ لوٹ بھی رہے ہیں۔ انہی سرکاری نلوں پر پانی کے لیے بیروں پر بالٹیاں اور سروں پر پیٹیاں جا بجا باندھی جا رہی ہیں۔ بھائیو اور بہنو! ہمارے انہی سرکاری نلوں کے آغوش میں ہنسا، عدم تعاون، داداگری اور مارا ماری نے جنم لیا ہے۔ ان نلوں کا خونی اتہاس گواہ ہے کہ ان سے پانی کے دھارے کبھی کبھار ہی پھوٹتے ہیں جبکہ پانی کے لیے مارا ماری کے روپ میں خون کے دھارے ہمیشہ چھوٹتے ہیں۔ ہمارے انہی نلوں پر ہماری گرہست عورتیں لائن لگایا کرتی ہیں جس کے باعث ان نلوں پر سر، برتن اور گھر تینوں پھوٹتے ہیں۔ انہی نلوں پہ ہمارے مرد داداگری اور نوجوان عاشقی کرتے ہیں۔ اس جملے پر جلسہ میں بجائے تالیوں کے نعروں کے سیٹیاں بج اٹھیں۔ اب ہم اپنی جامع اور مدلل تقریر کے آخری موڑ پہ تھے۔

حاضرین! آج ہم سرکاری نلوں کے اس خونی اتہاس کے خونخوار پنوں کو پھاڑ ڈالیں گے، سرکاری نلوں کا خونی اتہاس لکھنے والے مورخ سے اس کا قلم چھین لیں گے، اس کے ہاتھ قلم کر دیں گے۔ جوش و غضب میں یہ جملے کہنے کے بعد ہم ڈائس سے نیچے اتر ہی رہے تھے کہ مجمع نے فلک شگاف نعرے لگانے شروع کیے ..... نہیں چلے گی۔ نہیں چلے گی۔ نلوں کی ہنسا نہیں چلے گی۔

"لڑائی بھڑائی بند کرو، نلوں سے پانی بند کرو ..... نل ہٹاؤ۔ گھر بچاؤ .... نلوں کو

توڑو، دلوں کو جوڑو ...... ہندو مسلم سکھ عیسائی، آؤ توڑیں نل کو بھائی۔ الغرض ایسے ہی نعروں کی جاپ پہ ہم سرکاری نل کی جانب بڑھنے لگے۔ نل کے قریب آکر ہم نے ایک بڑے سے ہتھوڑے سے نل کی ٹونٹی پہ وار کیا اور ایک ہی وار میں اس کے سر کو دھڑ سے جدا کر دیا...... پھر دیکھتے ہی دیکھتے گھمسان کی جنگِ نل چھڑ گئی جنگ کے پہلے ہی ریلے پر عوام کی بے قابو بھیڑ نے تشدد کے علمبردار اس سرکاری نل کی تکا بوٹی کر دی۔ انجام کار یہ سرکاری نل اس حالت کو پہنچا...... کہ:

اک نل کے ٹکڑے ہزار ہوئے
کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا

غوثیہ سلطانہ (شکاگو)

روسٹنگ

زندہ دلانِ شکاگو کے زیرِ اہتمام ایک محفل

روسٹنگ کے لفظی معنے بھوننے کے ہیں لیکن بھوننے سے مراد داغدار کرنا نہیں بلکہ ذائقہ دار بنانا ہے۔
روسٹنگ انگریزی کی خاص صنفِ ادب ہے روسٹنگ کو اردو سے متعارف کرانے کا خیال کئی برسوں سے اکسا رہا تھا۔ ہالی ووڈ کے ٹی وی شوز میں اس کا ایک خاص مقام DEAN MARTIN نے پیدا کیا اور یہ ٹی وی کا ایک دلچسپ شو ہوا کرتا تھا۔ دیگر کئی اصناف کی طرح روسٹنگ بھی انگریزی ادب کی دین ہے۔ فرق یہ ہے کہ اردو میں ایسے مذاق کو وہ درجہ نہیں ملا جو انگریزی کے بلند و بالا معیار کو چھو سکے! اس کی کئی وجوہات ہیں۔ جن میں اولیت تہذیب و تمدن کا فرق اور ماحول کی مشرقیت ہے. ظرافت کا فن آزاد ہے اس بات کی تصدیق انگریزی ادب سے ہوتی ہے ہمارا مقصد انگریزی اور اردو میں ظرافت کا موازنہ کئے بغیر روسٹنگ کرنا ہے جس کے لیے ایک وسیع القلب شخصیت پر بطور تجربہ روسٹنگ کی یہ محفل سجائی گئی ہے. تن تنہا تو کوئی محفل سجائی نہیں جا سکتی اور سچ تو یہ ہے کہ NO BODY CAN WALK ALONE. محفل کے شرکا سے "روسٹنگ" کی محفل میں رونق نظر آرہی ہے جس کسی سے میں نے روسٹنگ کی محفل والی بات کی اس نے سوال کیا کہ یہ کیا بلا ہے جب کہ اس پر بے شمار کتابیں موجود ہیں۔ یہ انگریزی ادب کا ایک حصہ ہے اور اس کی بنیاد WIT اور WISDOM پر رکھی گئی ہے۔ روسٹنگ اور ہجو میں فرق ہے۔ ہنسی ہنسی میں کام کی بات کہہ جانا یعنی کر جائے کام اپنا اور نظر نہ آئے — روسٹنگ کہلاتی ہے۔

یہ کام اردو میں بھی غیر محسوس طریقہ پر ہوا ہے۔ لیکن اب انگریزی زمین پر اردو کی پھلواری کیاریاں بنانے کے لیے روسٹنگ کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ روسٹنگ کی تعریف پہلی بار شاید پانچسو قبل مسیح میں کی گئی تھی جب کہ سسلی میں اس قسم کی محفلوں کا انعقاد ہوا تھا۔ فوج کے تھکے ہارے مسافر اور سپاہی ہتھیار سے لیس دن بھر کی تھکن کے واقعات ایک دوسرے کو بڑھا چڑھا کر سنایا کرتے تھے۔ شکار سے واپسی پر اس قسم کی محفلیں سجائی جاتی تھیں۔ ادھر شکار روسٹ ہوتا رہتا۔ ادھر محفل جمی رہتی اور شکار کے معرکوں کا ذکر چلتا رہتا تاکہ روسٹ کا لذت دوبالا ہو جائے۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا آہستہ آہستہ اس کی شکل REFINED ہوتی گئی۔ عام لوگوں کو بھی اپنے خیالات کے اظہار کا موقع ملنے لگا پھر یہ محفلیں تھیٹرز میں ہونے لگیں روسٹ ہونے والے کے خاص پہلو، عادات اور صفات کو بڑھا چڑھا کر مزاحیہ انداز میں کہنا روسٹنگ کہلایا۔ برنارڈ شاہ نے مزاح کی تعریف یوں کی

ہے ITS A SENSE IN NON SENSE اوسکر وائلڈ کہتا ہے "اگر کسی سے سچی بات کہلوانا ہو تو اس
کے ہاتھ میں ایک نقاب دیدو۔ بس اسی کا نام روسٹنگ ہے۔ یہی کیفیت روسٹنگ میں پیدا کی جاتی ہے۔ مگر جس
شخص پر چوٹ کی جا رہی ہو اس کی دل شکنی یا دل آزاری ہرگز نہ ہو گویا SUGAR COATED انداز ضروری
ہے۔ بلکہ روسٹ ہونے والے کی عزت اور وقعت میں اضافہ ہونا چاہیئے آج کی اس محفل روسٹنگ کا مقصد
بھی ایک ادبی تفریح ہے۔

بات دلکش ہو دلچسپ ہو دل آزار نہ ہو ؛ بات ایسی ہو کہ اُس بات میں کچھ جان رہے
آپ سب لوگ ہیں محفل کی جاری رونق ؛ بے ارادہ بھی نہ ہو دل شکنی یاد رہے

بفضل ربی دیار غیر کے ہر خطے میں اردو کے کام ہو رہے ہیں تخلیقی کام کے ساتھ محفلوں کا بھی اہتمام ہو رہا ہے طنز و مزاح
پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے ہندوستان اور پاکستان میں اس پر کافی کام ہوا ہے۔ خاص طور پر حیدرآباد دکن میں طنز و
مزاح کے لیے فضا سازگار ہے بلکہ یوں کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ حیدرآباد دکن میں ظرافت کے بادشاہ موجود ہیں۔ اُدھر
پیروڈیاں بھی خاص لکھی گئیں۔ مثلاً گوپی ناتھ امن نے اقبال کے شعر سے استفادہ کرتے ہوئے یوں کہا تھا ؎

بارش سے دب گیا ہے ٹوٹا مکاں ہمارا ؛ آندھی کا منتظر ہے یہ سائباں ہمارا

دلاور فگار نے اقبال کے کلام سے کیسے فائدہ اٹھایا ہے دیکھیئے: ؎

کیا ہوا لوگ اگر مجھ کو گدھا کہتے ہیں ؛ ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

خواتین بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہیں لکھنؤ کی ریحانہ رضوی کہتی ہیں۔

؎ گوبردھن کا مرغ ہے لنگڑا ؛ مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

اردو بولنے والے سرزمین یو۔ ایس۔ اے میں رہتے ہوئے بھی اردو سے رشتہ قائم رکھے ہوئے ہیں کچھ لوگ اپنے
خیالات کو شاعری میں کاغذ پر منتقل کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ اس کوشش میں ہیں کہ مزاحیہ مضامین اور لطیفوں کا سلسلہ چلتا رہے گی
آج کی کوشش بھی اسی قسم کا ایک تجربہ ہے۔

روزمرہ کی مشینی زندگی میں اگر ہنسنے ہنسانے کا موقع مل جائے تو وہ غنیمت ہے۔ ویسے بھی ہنسنا اور ہنسانا تازگی
کے لیے ایک ٹانک ہی تو ہے۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ کئی باتیں ذہن میں ضرور آتی ہیں لیکن ہم کہہ نہیں پاتے لیکن مزاحیہ
انداز میں کہہ جانے میں حجاب نہیں ہوتا اور مقصد کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

محفل روسٹنگ بھی ایک اسی قسم کی ٹانک کا نام ہے جو مصروف زندگی کی MONOTONY کو توڑے
اور اسے دور کر سکے! اس کا ایک مقصد اردو ادب میں روسٹنگ کی نئی راہ بنانا ہے۔

امریکہ میں روسٹنگ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہاں بڑی سے بڑی سیاسی شخصیت بھی .A R ہنری
COATED باتیں کرنے سے دریغ نہیں کرتی کیوں کہ صحیح بات کہنے میں ہچکچاہٹ ہوتی ہے اور روسٹنگ
غیبت سے بہتر طریقہ ہے۔ روسٹنگ میں شخصی حملے نہیں ہوتے اُن نکات کو ضرور ملحوظ رکھا جاتا ہے جو ممدوح
کی نمایاں خصوصیتیں ہوتی ہیں۔ کسی کو HUMILIATE ہرگز نہیں کیا جاتا اور نہ ہی پرسنل وجوہات پر بحث کی جاتی
ہے۔

آج کے روسٹ جناب سعیدی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخصیت ہیں یہ اپنے فن کے کامیاب شخص ہیں۔ ان کے بلند اخلاق کی مثال اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ یہ بس میں سفر کر رہے تھے تہذیب و تمدن کے شیدائی نے دیکھا کہ کچھ خواتین کھڑی ہوئی ہیں لہٰذا انہوں نے اپنی سیٹ انھیں پیش کردی اور خود کھڑے ہوگئے۔ اور ان کی ایک سیٹ خالی ہوجانے سے ایک نہیں تین عورتوں کو بیٹھنے کی جگہ فراہم ہوگئی۔!

یہ حیدرآباد دکن کی پیداوار ہیں بچپن میں گلی ڈنڈا کھیلتے تھے کسی نے انہیں ڈھکیل کر پاکستان بھجوادیا وہاں گنتہ داری میں پیسہ اکٹھا ہوتے ہی نعرہ بلند کردیا کہ پاکستان خریدلوں گا اور آج شہر شکاگو میں روسٹ ہورہے ہیں۔ یہ ایک خوددار باذوق شخص ہیں جنھوں نے منی سوٹا سے سول انجینیرنگ اور نیویارک سے مینجمنٹ اور کمپیوٹر سائنس کیا ہے۔ صحافت میں بھی عمل دخل ہے۔ دین و دنیا ایک ساتھ لئے چلتے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سٹاک اور بانڈز میں دلچسپی بڑھتی ہوئی دیکھ کر امریکن عورتیں پریشان کرنے لگی ہیں۔ کوئی کہتی ہیں لنچ پر لے چلو۔ کوئی کہتی ہے ڈنر پر چلو اور یہ ہیں کہ انھیں اردو شاعری سمجھائے جاتے ہیں نتیجتہً کوئی ہاتھ نہیں لگتی۔

ان کا کہنا ہے کہ سٹاک ایکسچینج میں سالانہ کئی ہزار ڈالر بناتے ہیں لیکن کہاں رکھتے ہیں یہ کسی کو نہیں بتایا ہاں ان کی انکم کا حال معلوم ہوتے ہی ان کے گھر مسجدوں سے مُلّا تشریف لانے لگے عطیہ طلب کرنے پر یہ دریافت فرماتے ہیں کہ "ایک سو ہزار ڈالر مسجد کے لیے بطور عطیہ دینے سے مجھے جنت برحق ہوگی" تو مُلّا نے جواب دیا میں یقین سے نہیں کہہ سکتا آزما کے دیکھ لو۔ پھر محلے کے چرچ کو خبر ملی کہ ان کی دن دونی ترقی ہورہی تو ان لوگوں نے چرچ کے لیے DONATION مانگا اور کہا چرچ کی مدد کرو تمہیں جنت ملیگی یہ حیرانی سے کہنے لگے۔

ارے تو کیا جنت پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہوگیا؟

ان کے ہوائی سفر کا قصہ بھی مشہور ہے۔ ایکبار ہوائی سفر کی خاطر انھوں انشورنس کروالی۔ ایرپورٹ پر پہنچے وہاں سامنے رکھے ہوئے فری آف چارج وزن کے مشین پر خود کو تولا تو اس میں سے ایک کارڈ بڑی خوفناک آواز کے ساتھ برآمد ہوا جس پر جلی حرفوں میں لکھا تھا کہ

"آپ کے پاس جو کچھ سرمایہ جمع ہوا ہے اس سے آپ کی فیملی کو یقینی طور پر فائدہ ہونے والا ہے بس یہ سُننا تھا کہ انھوں نے ہوائی سفر ملتوی کردیا اور گھر واپس چلے گئے"۔

آج کی محفل میں شہر شکاگو کے باذوق اہلِ قلم حضرات موجود ہیں۔ آپ سب کے تعاون سے اس قسم کی محفل روسٹنگ اور طنز و مزاح کی محفلوں کو جاری رکھنے اور زندہ دلانِ شکاگو کی طرف سے اہلِ قلم حضرات کو اپنے دیس سے دعوت دے کر بُلانے کا خیال ہے۔ الحمد باضابطہ روسٹنگ کی کاروائی جناب خلیل الزماں نقشبندی کے سہرے سے شروع ہوئی۔

ہر راہ گزر پہ شمع جلانا ہے میرا کام
تیور ہیں کیا ہوا کے یہ میں جانتی نہیں

ڈاکٹر خورشید خضر
(شکاگو)

روسٹنگ عبدالملک سعیدی

خدمت بہ حسن و حصّہ
حصّہ بقدرِ جُثّہ
قصّہ تمام کر دی
شامی کباب خوردی
مال و متاع رسیدی
عبدالملک سعیدی

○

نادر نوا نویدی
از سر تا پا نمودی
گل فام گل گزیدی
قلب و نظر کشودی
سر پر ہما ہویدی
بیضہ بزار بودی
زردی ہے نہ سفیدی
عبدالملک سعیدی

○

مسلک کمال کا ہے
زہرہ جمال کا ہے
شہنا جو ہنری ہیں
سرشار شوہری ہیں
جوہر خصال کا ہے
روشن مثال کا ہے
یارِ وفا نہادی
عبدالملک سعیدی

"صحرائے شاعری میں
خود اپنی ڈائری میں
سند باد ہیں جہازی
رونق ہے مجازی
نسخہ ہے آزمودی
عبدالملک سعیدی

○

شعر و سخن کا دریا
جس سمت جا کے ٹھہرا
جھنڈی وہیں ہلا دی
کشتی وہیں جلا دی
مرد جہاں نوردی
عبدالملک سعیدی
○
علم و ادب ہی ان کا
اک راستہ ہے سیدھا
سُر سے ہیں نے حبدیدی
عبدالملک سعیدی

○

دیوان ایوشیو پر
اک دن کوئی حسینہ
پاس ادب سے جھک کر
نزدیک آ کے بولی!
بھائی مرے سعیدی؟

سن کر غضب سے بولے
کیا بھائی ہوں میں تیرا!
چل ہٹ نکل ندیدی!
مٹی نہ کر پلیدی
قربت ہوئی بعیدی
اب کچھ نہ کہہ مزیدی
منہ پھٹ دہن دریدی
کم بخت کاک لودی
غصّہ بڑھا رہے تھے
کہتے ہی جا رہے تھے
شبو میاں شدیدی
عبدالملک سعیدی

○

ہر انجمن کے شیدا
ہر رنگ و بو کے رسیا
پیری ہے اور مریدی
غازی ہے نہ شہیدی
نکتہ ہے یہ کلیدی
دم دم دما دمیدی
عبدالملک سعیدی

○

خواجہ ریاض الدین عطش
(شکاگو)

محترم ملک سعیدی کا روسٹ نامہ

چھری کانٹا لیے کرسی بہ کرسی یار بیٹھے ہیں
ملک کو "روسٹ" کرنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں
چڑھا دیں گے ابھی سب روسٹنگ کی ان کو سولی پر
یہ جس کے منتظر مقتل میں زیرِ دار بیٹھے ہیں
ہجو گوئی کا مقصد آج پیکا یہ تمسخر ہے
سب ہی نظموں کی صورت میں لیے تلوار بیٹھے ہیں
ملک صاحب کی پگڑی سب یہاں مل کر اچھالیں گے
صدائے غوثیہ پر سب یہی للکار بیٹھے ہیں
اِدھر ہیں ڈاکٹر فخری، اُدھر ہیں غوثیہ بی بی
بہت سے دوسرے بھی ان سے کھائے خار بیٹھے ہیں
بخارِ دل کا سب لاوا اگلنے کے ہیں چکر میں
ہجو گوئی کے جو آکر یہاں فنکار بیٹھے ہیں
یہ اتنا ہی نہیں کہ کاٹ کھائیں گے انہیں دشمن
یہاں تو دوست بھی کھولے ہوئے منقار بیٹھے ہیں
یہ شاعر بھی، لطیفہ باز بھی اور خوش بیاں بھی ہیں
نظامت کے بھی تختِ بخت پر سو بار بیٹھے ہیں
لطیفہ گوئی میں ثانی کوئی اِن کا نہیں ملتا
یہ گویا اس مہارت میں سرِ دیوار بیٹھے ہیں
شکم میں ان کے باتوں کی ہوا کا اک ذخیرہ ہے
جہاں دیکھو وہاں باندھے ہوئے طومار بیٹھے ہیں

وہ بزمِ شاعری ہو یا کہ ہو محفل لطیفوں کی
جہاں بیٹھے وہاں بن کر یہ منصب دار بیٹھے ہیں
ہیں ان کے حافظے میں سیکڑوں دیوان کے نسخے
نہ جانے کتنی غزلوں پر یہ شب خوں مار بیٹھے ہیں
یہ اردو کی ندی کے اک کنارے پر نہیں ٹکتے
کبھی اِس پار بیٹھے ہیں کبھی اُس پار بیٹھے ہیں
یہ جو بیٹھے ہیں مثل اژدھا مارے ہوئے کنڈلی
ظرافت میں چھپائے اک بڑی پھنکار بیٹھے ہیں
شبابِ عہدِ ماضی کی جواں اَب بھی ہے جولانی
رٹائر ہو کے بھی اندر سے یہ بیدار بیٹھے ہیں
ہجو سننا کوئی آساں نہیں لیکن انھیں دیکھو
یہ اِن کانٹوں پہ بھی کتنے گل و گلزار بیٹھے ہیں
اُٹھائے پھر رہے ہیں بوجھ یہ اردو کا برسوں سے
بہت سے اس سفر میں ان سے بازی ہار بیٹھے ہیں
سعیدی کے ہی گلشن کے جو خوشہ چیں رہے کل تک
وہی اردو کے اب بن کر اجارہ دار بیٹھے ہیں
ملک صاحب نے اک اک شعر کی دے دی ہے منظوری
اجازت ان سے ہم لے کر پئے اظہار بیٹھے ہیں

ملک جی کا یہ کہنا ہے کہ چیلے بندگی سیکھیں
جو اپنے آپ کو سمجھے ہوئے اوتار بیٹھے ہیں
چھپا کر رنج و غم اپنا یہ لوگوں کو ہنساتے ہیں
ہزاروں داغ دل پر رکھ کے بھی سرشار بیٹھے ہیں

عطش لیکن سعیدی خدمتِ اردو کی قطاروں میں
کئی مختار کی باندھے ہوئے دستار بیٹھے ہیں

ڈاکٹر محمد یونس بٹ
(جدہ)

تبدیلئ نام

جب سے امریکی حکومت نے کہا ہے کہ قذافی اسٹیڈیم کا نام تبدیل کر دیا جائے۔ ہم روز اخبار پڑھتے ہیں کہ یہ نہ ہو امریکہ کہے کہ یونس بٹ کا نام بھی تبدیل کر دیا جائے۔ حفظ ماتقدم کے طور پر ہمارے دوست کے ہاں بیٹا ہوا تو ہم نے اسے کہا جو نام تم رکھنا چاہتے ہو امریکی ایمبیسی سے جا کر اس کی منظوری لے لو۔ اس کے باوجود ہمیں یہ سمجھ نہیں آئی کہ امریکی حکمرانوں کو کرنل قذافی کا نام کیوں پسند نہیں؟ کرنل صاحب خود کو معمر قذافی لکھتے ہیں سو ہو سکتا ہے لفظ معمر کی وجہ سے ہلری کو یہ نام پسند نہ ہو لیکن بل کلنٹن کی سمجھ نہیں آئی کہ انھیں اس نام سے چڑ کیوں ہے؟ امریکی ہمیں کبھی سمجھ نہیں آئے۔ سی۔ آئی۔ اے والوں نے ایک مشکوک بندہ پکڑا انھیں شک تھا کہ یہ غیر ملکی ہے۔ پوچھا "کون ہو؟" وہ بولا "امریکی" سی آئی اے والوں نے کہا "امریکہ کا قومی ترانہ سناؤ" وہ بولا "مجھے نہیں آتا" تو سی آئی اے نے اسے یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ تم واقعی امریکی ہو۔ امریکیوں اور وکیلوں کے بارے میں بڑے لطیفے ہیں مگر ان کا مسئلہ یہ ہے وہ خود یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہنسنے والے نہیں اور دوسرے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ صرف لطیفے نہیں ہیں۔ امریکہ ہمارا بڑا قریبی ہے ہمارے بڑے بڑے سرکاری افسروں کو جتنی دیر اپنے گھر سے امریکہ جانے میں لگتی ہے اس سے زیادہ دیر تو گھر سے اپنے دفتر جانے میں لگتی ہے۔ ایک شاعر سے کسی نے پوچھا "کسی عورت کو دیکھ کر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ تمہاری شادی نہ ہوئی ہوتی؟" کہا "ہاں" پوچھا "کسے دیکھ کر"؟ کہا "اپنی بیوی کو دیکھ کر" ایسے ہی امریکہ کو دیکھ کر ہمارے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش یہ پاکستان میں ہوتا۔ امریکہ سے ہمارا کیا رشتہ ہے اس کی ہمیں سمجھ نہیں آئی کیوں کہ ہم شادی شدہ نہیں ہیں۔

ہم نے جس سے محبت کا اظہار کرنا ہو اس کے نام پر اپنے بچوں کے نام رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں بچوں کی تعداد سے آپ اندازہ لگالیں کہ ہم کتنی محبت کرنے والے لوگ ہیں۔ قذافی اسٹیڈیم بھی اسی محبت کی یادگار ہے۔ سنا ہے اب امریکہ کہہ رہا ہے ورلڈ کپ اس میں اسی صورت ہو سکتا ہے جب اس کا نام بدلا جائے۔ ہمیں کھیلوں سے دلچسپی نہیں۔ ریسلنگ کا شوق ہے اسی لیے کبھی کبھی اسمبلی کی کارروائی دیکھ لیتے ہیں۔ کھلاڑیوں میں جان شیر خان پسند ہے وہ اس لیے جیت جاتا ہے کہ مخالف جان شیر خان سے کھیل رہے ہوتے ہیں جبکہ شیر خان گیند سے کھیل رہا ہوتا ہے۔

اس سے تو لگتا ہے اب کھلاڑیوں کے نام بھی امریکہ کی پسند سے رکھے جائیں گے۔

ویسے ہم سمجھتے تھے امریکہ کے لیے سب نام ایک جیسے ہیں اس کے لیے بے نظیر اور نواز شریف ایک ہی نام ہے اگرچہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے بھی فرمایا تھا کہ بے نظیر اور نواز شریف میں کوئی فرق نہیں جس پر مولانا معین الدین لکھنوی نے کہا بڑا فرق ہے۔ نواز شریف داڑھی منڈواتا ہے البتہ مولانا فضل الرحمٰن اور بے نظیر بھٹو میں کوئی فرق نہیں کیوں کہ مولانا فضل الرحمٰن بھی داڑھی نہیں منڈواتے۔ خیر یہ بات تو کوئی مولوی ہی کہہ سکتا ہے البتہ دونوں میں بقول شخصے یہ فرق ہے کہ ایک شریف خاندان سے ہے دوسرا بھٹو خاندان سے۔ پتہ نہیں موجودہ حکومت نام تبدیل کرتی ہے یا نہیں پہلی حکومتوں کے قول و فعل میں بڑا تضاد تھا وہ جو کہتی تھیں کرتی نہیں تھیں لیکن موجودہ حکومت کے قول و فعل میں تضاد نہیں یہ کہتی ہے نہ کرتی ہے۔ پچھلے دنوں ایک مقامی اسکول میں ذہنی آزمائش کے مقابلے میں اشاروں سے پوچھے گئے ہیرو کا نام بتانا تھا صحیح جواب تھا "سلطان ٹیپو" بچے نے کہا "سلطان راہی" کمپیئر نے فرمایا چونکہ اس نے پہلا نام صحیح بتایا ہے اس لیے اسے انعام کی آدھی رقم ملے گی۔

شیکسپیئر نے کہا تھا نام میں کیا رکھا ہے گلاب کو جس نام سے بھی پکارو وہ خوشبو دے گا لیکن شیکسپیئر کو شاید یہ پتہ نہ تھا کہ گلاب کو کسی اور نام سے پکارو تو وہ رقم نہ دے گا نام بدلنے سے بڑا فرق پڑتا ہے امریکی یونیورسٹی کے فزیالوجی کے پروفیسر کو واش روم کے لیے شیشہ چاہیے تھا۔ اس نے ریکوزیشن بنا کر بھیجی تو اس کی ڈیمانڈ یہ اعتراض لگا کر واپس کردی گئی کہ یہ "نان سائنٹیفک" سامان ہے۔ پروفیسر صاحب کو ہر حال میں شیشہ چاہیے تھا انہوں نے اسے حاصل کیا پتہ کیسے؟ جی ہاں نام بدل کر انھوں نے اگلی مرتبہ ریکوزیشن میں سائنسی ٹرمینالوجی استعمال کی ذرا نام بدل کر لکھا مجھے ایک HUMAN REFLECTOR - ہیومن ریفلیکٹر چاہیے۔

دو غلا لباس:

صاحب پولیس میں اور کوئی برائی نہ ہو پھر بھی یہ کیا کم ہے کہ وہ پولیس ہے۔ جیسے ایک وکیل وکالت چھوڑ دے اور سچ بولنے لگے لوگ پھر بھی اسے وکیل ہی کہتے ہیں ایسے ہی ہمارے محلے کا سابقہ پولیس ملازم روز کہتا ہے کہ پہلے میں تھانیدار تھا اب میں ٹھیک ہوگیا ہوں لیکن لوگ اب بھی اس کے پاس سے جیب پر ہاتھ رکھ کر گزرتے ہیں پولیس اس لیے نہیں کہ وہ قانون کو لاگو کرسکے بلکہ قانون اس لیے ہے کہ وہ پولیس کو لاگو کر سکے۔ ہمارا ایک جاننے والا کہتا ہے کہ میں تو پولیس میں فقط اس لیے بھرتی ہوا ہوں کہ کھلی ہواؤں میں گھومنا چاہتا ہوں لیکن پنجاب کے نئے وزیر اعلیٰ عارف نکئی صاحب کو پولیس اس قدر پسند ہے کہ ان کا ہر بیان پولیس کے بارے میں ہوتا ہے گزشتہ دنوں انھوں نے کہا کہ میں پولیس کی پتلونیں اتار دوں گا تب سے پولیس والے چلتے وقت بھی اپنی پتلونوں کو پکڑے رکھتے ہیں۔

خوشونت سنگھ سے کسی نے پوچھا یہ کیسری رنگ، بھارتی جھنڈے میں ہندوؤں کا ہوا، سبز رنگ مسلمانوں کا اور سفید دوسری اقلیتوں کے لیے ہے مگر سکھوں کے لیے جھنڈے میں کچھ بھی نہیں؟ تو خوشونت سنگھ بولے تو یہ جھنڈے میں ڈنڈا کس لیے ہے ہمارے سردار جی وزیر اعلیٰ عارف نکئی صاحب کی جھنڈے والی گاڑی کا ڈنڈا پولیس کے لیے ہے وہ تو ایسی کو بھی پولیس کہتے ہیں۔

عارف نکئی موضع "آدھن" جوان کے لیے آ۔ دھن ہے وہاں کے کھاتے پیتے زمیندار ہیں ان کے ڈیرے پر ہزاروں کو کسی بھی وقت لسی، جوتے اور روٹی کھانے کو مل سکتی ہے شہر میں جو جوتا کسی کو سو میں پڑتا ہے وہاں مفت پڑتا ہے نکئی صاحب دو پہا ہوئی بھینس کا دودھ بھی لیور دھوتے ہیں کہ لگتا ہے ان کا تعلق محکمہ انکم ٹیکس سے ہے ان کے ساتھ رہیں تو گانا نہیں

سکتا پتہ نہیں وہاں کے لوگ نہاتے کیسے ہوں گے؟ انھیں متلون مزاج پتلون مزاج لوگ! مجھے نہیں لگتے دور اندیش ہیں۔ یعنی آپ انھیں کوئی لطیفہ سنائیں تو دور جاکر ان کی سمجھ میں آئے گا ہمارا بھی یہی حال ہے جس کی وجہ مخالفین یہ بتلاتے ہیں کہ ہمارے آباء و اجداد پہلے امرتسر میں رہتے تھے۔ جب نکی صاحب کو وزیر اعلیٰ چنا گیا تو پنجاب کے بارہ میں دائیں والے کہتے اس قدر بے تکلف ہیں کہ جس دوست کے ساتھ عزت سے پیش آئیں وہ سمجھتا ہے کہ سردارجی ناراض ہیں وائیں کا تعلق مڈل کلاس سے تھا اگرچہ انھیں میٹرک کلاس سے تعلق تھا لیکن نکی کا ممتاز سا ایچی سن کالج سے تعلق ہے اپنے بھتیجوں بھانجوں کو ملنے تھانے آتے رہتے ہیں۔ وہ خود لپنے گاؤں آدھن کے تھانیدار ہیں ان کے پاس اتنا اعلیٰ چھترہے کہ آپ اسے "چھتر اعلیٰ" کہہ سکتے ہیں جسے وہ خود مجرموں کو اس زور سے مارتے ہیں کہ دیکھنے والوں کی چیخیں دور تک سنائی دیتی ہیں۔ جیسے ہم سوچتے رہیں کہ مرغ بھی بانگ دیتا ہے پھر اسے سب سے زیادہ مولوی ہی کیوں ذبح کرتے ہیں تو مشتاق یوسفی صاحب نے اس کی وجہ بتائی پیشہ وارانہ رقابت۔ ہو سکتا ہے کہ نکی صاحب پولیس کو اسی وجہ سے ناپسند کرتے ہوں ویسے بھی پولیس بند کرنے کے لیے نہیں ہوتی جرائم ختم کرنے کے لیے ہوتی ہے اور اگر پولیس تعاون نہ کرے تو جرائم ختم ہو بھی سکتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ نکی صاحب کا یہ کہنا کہ وہ پولیس والوں کی پتلونیں اس وار دیں گے پولیس کے خلاف نہ ہو، مغربی لباس کے خلاف ہو۔ پتلون بھی عجیب و غلا لباس ہے اوپر سے واحد نیچے سے جمع اس سے پہلے کسی نے پولیس کے لباس کی طرف توجہ نہ دی تھی۔ ان کی پتلونیں شروع سے ہی ایسی ہیں کہ اگر تنگ ہوں اور نہیں دھوؤ تو اور تنگ ہو جاتی ہیں کھلی ہوں تو انھیں دھوؤ تو اور کھل جاتی ہیں جس تھانیدار، مولوی اور پنڈت کا پیٹ نہیں سمجھیں وہ اپنے پیشے سے مخلص نہیں سو وہ اتنی جلدی مجرموں سے تنگ نہیں ہوتے جتنی جلدی پتلونیں تنگ ہوتی ہیں چور ڈاکو تو وہ گھیر لیتے ہیں مگر پتلون ان کے گھیرے میں نہیں آتی۔ ممکن ہے کہ نکی صاحب ان کی پتلونیں اتروا کر اپنا پسندیدہ لباس لاچا پہنوانا چاہتے ہوں کہ نکی صاحب سے بہتر کون اس ایئر کنڈیشن لباس کی افادیت جانتا ہے یا پھر ممکن ہے وہ تقریروں میں جو کچھ کہہ رہے ہوں وہ کہنا ہی نہیں چاہتے ہوں کیونکہ دماغ ایسی چیز ہے جو اس وقت چلنا شروع کرتا ہے جب بندہ پیدا ہوتا ہے اور اسی وقت تک چلتا رہتا ہے جب تک وہ اللہ کو پیارا نہیں ہو جاتا۔ □□

شیخ امیر سرور

اکولہ

علامہ اقبال کی روح سے معذرت کے ساتھ

بھلا کیسے سناؤں میں کسی کو داستاں میری
جہاں میں کون ہے ایسا سُنے آہ و فغاں میری
فقط بیگم ہے لیکن وہ بھی سُنتی ہے کہاں میری
"نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری"

تڑپتی ہیں ہزاروں خواہشیں اس قلبِ بسمل میں
کوئی بے چین لیلیٰ تڑپے جیسے اپنے محمل میں
بھلا کیوں کر سناؤں میں تجھے کیا ہے مرے دل میں
"یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری"

میرے دل کے کئے ٹکڑے میرے دل کے مکینوں نے
جہاں بھر میں کیا رسوا عزیزوں نے رفیقوں نے
دی شعلوں کو ہوا مل کر مرے سارے رقیبوں نے
"اڑائی طوطیوں نے قمریوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری"

نہیں اب حوصلہ باقی پھٹے دامن کو سینے کا
نہ بستر ہے نہ کھٹیا ہے نہ لوٹا پانی پینے کا
نہ روٹی ہے نہ کپڑا ہے نہ کمرہ ہے قرینے کا
"الٰہی پھر مزہ کیا ہے یہاں دُنیا میں جینے کا
حیاتِ جاوداں میری نہ مرگِ ناگہاں میری"

مجھے قلاش کر ڈالا تمہارے اک تغافل نے
ہنسی غنچوں نے چھینی گیت میرے لوٹے بلبل نے
گُلوں نے رنگ اڑایا اور مہک اپنائی سنبل نے
"اُٹھائے کچھ ورق لالہ نے کچھ نرگس نے کچھ گُل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری"

ممتاز مہدی
(حیدرآباد)

مرنا

دہلی دوردرشن کے "دسی ڈی ون چینل" پر ہر روز صبح ایک گھڑی دکھلائی جاتی ہے۔ جسے "پاپولیشن کلاک" کا نام دیا گیا ہے۔ جس میں ملک میں ہر سکنڈ میں کتنے بچوں کا اضافہ ہوا دکھلایا جاتا ہے۔ چینلوں کی تعداد میں بھی آبادی کی طرح اضافہ ہو رہا ہے اور یہ چینل باہم مقابلہ بازی میں مرے جا رہے ہیں۔ ہمارا لطیف سا مشورہ ہے کہ DD1 کے جواب میں "ZEE TV" والے مرنے والوں کی گھڑی "کلاک آف ڈیتھ" کسی مقررہ وقت پر بتلائیں اور سامعین کو مشورہ دیں کہ وہ اس کی رفتار میں تیزی لائیں اور ناظرین سے عاجزانہ اپیل کریں کہ وہ جلدی جلدی مریں۔ جوں کہ جوں جوں اس دم توڑتی دنیا کی حقیقت اور مغرور انسان کی کمزوریاں آشکار ہوتی جا رہی ہیں، انسان کے مرنے کا غم بہت ہی ہلکا پھلکا ہوتا جا رہا ہے بلکہ پسماندگان اپنی مسرت چھپانے میں ناکام ثابت ہو رہے ہیں۔

تدفین کے وقت شرکا قبرستان میں مختلف ٹکڑیوں میں بٹے لطیفہ گوئی اور خوش گپیوں میں مصروف نظر آنے لگے ہیں۔ ماضی قریب تریں میں یہ تھا کہ کسی کی موت کا ذکر، کسی انجانے کے جلوس جنازہ پر دل دھک سے ہو جاتے تھے، دھیرے دھیرے ساس سسر کے مرنے پر بہو یا داماد اطمینان کا سانس لینے لگے، زمانہ ترقی پر ہے لہذا اب تو بیٹے بیٹیاں مشترکہ جشن منانے لگے ہیں۔ کچھ پہلے تک بھی مرنے والے کے گھر میں چالیس دن کا سوگ ہوتا تھا ـــــــ نہ ریڈیو نہ تفریح نہ نیا کپڑا، نہ کسی کی تقریب میں شریک ہوتے تھے، اب "لونگی مرچ مسالے" کے ساتھ گھر میں آگئی ہے۔ جہاں سامان تعیش ضرورت نمبر ایک دو بن گئے ہیں۔ وہیں تفریحات جیسے "ٹی وی" کے بغیر جینا تو لوگ جانتے ہی نہیں۔ اس طرح تفریحات لمحے لمحے میں یوں رچ بس گئے ہیں کہ رسم دنیا نبھانا ناممکن سا ہو گیا ہے۔ ایک بوڑھی ماں کہا کرتی تھیں "قسم ٹوٹ سکتی ہے لیکن رسم نہیں"! اب یہ ہو رہا ہے کہ قسم تو کوئی کھا نہیں رہا ہے کہ ٹوٹ کر اول پلٹ سے رسمیں مرنے لگی ہیں یا اتنی بھونڈی ہو گئی ہیں کہ "زندہ بھیا نک خواب" ہو گئی ہیں۔

ادھر کچھ دن پہلے ہمارے ایک دوست کے والد کا انتقال ہو گیا۔ گھر پہنچے تو بولے: "میاں! والد صاحب کا آپ کو مرثیہ لکھنا ہوگا۔" ہمارے دوست کی عادت ہے کہ ہمیں دیکھتے ہی ادب سے متعلق ہی بات کرتے ہیں، لاکھ سمجھایا کہ "میاں! ہم شاعر نہیں ہیں۔" لیکن وہ "شاعر صاحب" ہی سے مخاطب کرتے ہیں۔ والد کی موت پر فرمائش بھی کی تو گویا گڑھے مردے اکھاڑنے والی ــ مونچھیں اور ریالیعل کی آہ و بکا میں نحیف و ناتواں زبان کے اصنافِ ادب تو گویا کب کے مر چکے۔ کیا قصیدہ، کیا مرثیہ، کیا مثنوی، کیا داستان سبھی اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ کہتے ہیں اب "غزل گو" اور "غزل گا" رہ گئے ہیں۔ جو غزل گو ہیں ان سے اندیشہ لگا رہتا ہے کہ جانے کب غزل کی گردن مار دیں۔ شاعری میں نثر کی شال لپیٹ لیں۔

جہاں تک "غزل گا" کا تعلق ہے وہ تو زبردستی گلا پھاڑ رہے ہیں۔ اساتذۂ سخن بھی ایسے گلا پھاڑ کے گلے پر حرف رکھ سکتے ہیں ورنہ "زمانے کی نبض پر نشتر" ـــ

نبض کی بات آئی ہے تو عرض ہے پہلے کے حکیم ایسے تھے کہ نبض پر ہاتھ رکھا اور سارے جسم کی "اسکیننگ" کر دی، ایمانداری سے مرنے والے کو بچا بھی لیتے۔ بلکہ بسترِ مرگ سے اٹھ کر مرنے والے ہنستے توانا ہو جاتے کہ کئی کئی حسینوں پر جان چھڑکنے لگتے۔ اور اب یہ حال ہے کہ مریض بلا تشخیص شہر کے بڑے سے بڑے ہسپتال میں مر گیا، چار لاکھ کی بل ادا کی گئی تب ــــ نعش ــــ گھر آئی ـــــ گھر میں بیٹھنے والے کے لواحقین کی لوٹ مار گویا کچھوے کی کنڈی میں ہڈی پر کتوں کا جھپٹنا ـــــ پھر قبرستان کے مجاوروں کی بے رحمی، تجہیز و تدفین کے سامان اور پھول کی پتیوں کی خریداری، نیاز و نذر کی برکتیں، زندہ لوگوں کی کمر جھکا رہی ہے گویا مرنا بھی ایک مرحلہ سخت ہے۔ ہمیشہ زندہ رہنے والے ایک شاعر کا قول نہیں بلکہ شعر ہے:

ہوئے ہم جو مر کے رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

گویا شعر کیا ہے کہ ہے ایک صدی پہلے آج کے حالات کی ویڈیوگرافی ـــــ ہنستے ہنستے چلتے پھرتے مرنے کی کوشش بھی کہا گیا لیکن:

گھستے گھستے پاؤں کی زنجیر آدھی رہ گئی

چناں چہ آدھی ہڈیاں گھس جاتی ہیں لیکن مرنے کا نام نہیں، مرے تو دیکھا "پوٹلی بابا" کی جو الگ سے باندھ رکھی تھی (جسے کسی کو چھونے نہیں دیتے تھے۔ کوئی شرارتی لڑکا گھور بھی لے تو ڈنڈا دکھاتے تھے) اس میں سے چند تصاویرِ بتاں اور ان کے خطوط نکلے ـــــ

یہ تھی بوڑھی شرارت اور جوان شرارت کچھ یوں ہوئی کہ ہمارے شرارتی جواں سال ساتھی جو ایک کل ایک پل چین سے نہیں بیٹھتے تھے حرکتِ قلب بند ہونے پر یکایک انتقال فرما گئے، جلوسِ جنازہ میں ہم ساتھی شریک تھے۔ مخالف سمت سے بارات آ رہی تھی۔ ہم سب مسکرا پڑے کہ مرنے والے کی یہ آخری شرارت ہے!

ابھی حال ہی میں یہ خبر آئی تھی کہ زو کے جانور مر رہے ہیں یا منصوبہ بند طریقے سے مارے جا رہے ہیں۔ اتنی بھولی ناک خبر پر کتنے دل طول ہوئے نہیں معلوم لیکن ہمارا یہ اٹل خیال ہے کہ کسی بھی انسان کا دل تھوڑی دیر کے لیے بھی متاثر نہیں ہوا ہوگا۔ چونکہ اخباروں میں بوسینا کے لاکھوں انسانوں کے قتلِ عام کی خبر اہتمام سے شائع ہونے کے باوجود بہت کم لوگوں نے تفصیل جاننے کی کوشش کی ہوگی۔

یہ باتیں تو مرنے والوں کی تھیں۔ ان کی الگ داستان ہے جو جیتے جی مر گئے ہیں۔

رزاق اثر شاہ آبادی

ذکر اک چندہ فروش کا

دنیا اس وقت اکیسویں صدی میں داخل ہونے کے لیے ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہی ہے اور اگر یہ اس کے بس میں ہوتا تو آج ہی کسی نہ کسی طرح اکیسویں صدی میں داخل ہو چکی ہوتی لیکن جب تک کیلنڈر کے مطابق پورے سو سال مکمل نہیں ہوں گے کس کی کیا مجال ہے کہ وہ اکیسویں صدی میں داخل ہو سکے۔ جس طرح گھڑی کی سوئی کو پیچھے کی طرف گھمانے سے ہم پیچھے کی طرف نہیں جا سکتے بالکل اسی طرح کیلنڈر کے اوراق پھاڑنے سے ہم اکیسویں صدی میں داخل نہیں ہو سکتے۔

اس الکٹرانک دورِ بے حیا میں جہاں ہر کوئی اپنا چولا بدل رہا ہے وہاں چندہ وصول کرنے والے بھی الکٹرانک دور کے تقاضوں کو پوری شدت سے محسوس کرتے ہوئے اپنی چندہ وصولی کی ٹیکنیک کو دنیا کا نیا ڈھنگ دے رہے ہیں۔ گل فروش، مچھلی فروش، پارچہ فروش، ترکاری فروش، میوہ فروش، ایمان فروش اور نہ جانے کیا کیا فروش کے اسمائے گرامی سے تو آپ اچھی طرح واقف ہیں ہی!

صبح سویرے جس کی صدائے دل خراش سے آپ بسترِ خواب سے نہیں چاہتے ہوئے بھی اٹھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ وہ دودھ فروش کی ہی ہوتی ہے۔ صبح سویرے اس کے چہرۂ جمیل کو دیکھنے ہی کا نتیجہ ہے کہ آپ کی بیگم آپ کو چائے کی گرم گرم پیالی پیش کرتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ جب تک آپ اپنی چسکیوں سے چائے پینے کا سگنل دیتے رہتے ہیں آپ کی نصف بہتر "گھر کے اندر کیا کیا نہیں ہے" کی فہرستِ طویل پیش کرتی رہتی ہیں۔ اور آپ سنی ان سنی کرتے ہوئے با دلِ ناخواستہ میٹھی میٹھی چائے کے گھونٹ کڑوے محسوس کرتے ہوئے بھی حلق سے اتار کر گھر سے فرار ہو جانے کی ترکیب سوچتے رہتے ہیں۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ شام تک کسی نہ کسی جنس فروش سے آپ کا سابقہ پڑتا ہی رہے گا۔ اگر آپ گھر میں ہی ہوں تو کوئی نہ کوئی جنس فروش زنجیرِ در کھٹکھٹاتا ہی رہے گا۔ کیوں کہ یہ تمام اجناس فروش ایک جائز کام کر کے اکلِ حلال کی روزی کماتے ہیں۔ اس لیے داد کے ساتھ دعا کے بھی مستحق ہوتے ہیں۔ داد کے اس لیے کہ

گھر گھر پہنچ کر ضرورت کا سامان نچلی منزل سے لے کر گھر کی پانچویں بلکہ دسویں منزل تک پہنچاتے ہیں اور دعا کے مستحق اس لیے کہ آپ کو اپنی مرضی کا مال ادھار دے کر ہر ماہ تنخواہ ملنے کے بعد قسطوں میں حساب چکتا کرنے کے باوجود زبان سے اف تک نہیں کہتے۔ اگر آپ کو میری اس بات سے اتفاق نہ ہو تو کسی مفتی کا فتوٰی منگوا لیجیے اور اپنی تسلی کر لیجیے ــــ

ہاں تو میں اپنے عنوان کی طرف آپ کی اجازت سے آنا چاہوں گا۔ جس طرح چندہ مانگ کر شرمندہ نہیں ہونا ایک مشکل کام ہے اسی طرح چندہ نہیں دے کر "سرخرو" ہونا بھی ایک مشکل کام ہے۔ بعض چندہ مانگنے والے صورتاً ہی اتنے یتیم و یسیر ہوتے ہیں کہ لوگ کچھ پوچھے بغیر ہی کچھ دے دلا کر انھیں رخصت کر دیتے ہیں۔ بعض اتنے چرب زبان ہوتے ہیں کہ ثواب دارین کے ساتھ ساتھ عذاب قبر سے لے کر عذاب محشر کا ایسا خوف ناک منظر پیش کرتے ہیں کہ انکار کی کوئی گنجائش نکالنے کا موقع نہیں دیتے اور آپ اپنی جیب تنگ میں اپنا دست کوتاہ ڈال کر اپنے نام کی رسید کٹوا لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں ــــ لیکن سب لوگ آپ جیسے نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی سیر کو سوا سیر مل جاتا ہے۔ (بلکہ آج کل تو سوا سیر والے ہی زیادہ ملتے ہیں) اچھے سے اچھا چندہ مانگنے والا بھی ان چکنے گھڑوں سے کچھ برآمد نہیں کر سکتا بلکہ منہ چھپا کر لاحول پڑھتا ہوا وہاں سے کھسک جاتا ہے اور آئندہ کے لیے اس گھر کا کیا اس گلی کا بھی رخ نہیں کرتا۔ بلکہ قسم کھا لیتا ہے۔

ابھی حال ہی میں ہماری ملاقات ایک ایسے نثر فروش سے ہوئی جو حالاتِ زندگی سے گھبرا کر کم اور اپنی دو عدد بیویوں اور نو عدد بچوں کی ذمہ داریوں سے تنگ آ کر گھر سے بھاگ نکلا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق ریل گاڑی میں اس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو مختلف خیراتی اداروں کے لیے کمیشن پر چندہ وصول کرنے کا کام کیا کرتا تھا اور خیراتی ادارے اپنی ضرورت اور مجبوری حالات کے مطابق ہر ایک پھر اس کے پاس سے چندہ حاصل کر لیا کرتے تھے۔ بقول حضرت سلیمان خطیبؔ مرحوم اس کام کے لیے گھر سے کچھ روپیہ لگانا نہیں پڑتا ہے۔ اس لیے اس کے کاروبار میں اتنی برکت ہوئی کہ چند ہی برسوں میں اس نے چندہ وصول کرنے کے لیے ملازم رکھ لیے ــــ

چنانچہ حالات زندگی سے گھبرا کر فرار ہونے والے نے ان کی رہبری تسلیم کرتے ہوئے ان کے ٹولے میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ خدا کے فضل و کرم سے اور اس کی ذاتی محنت شاقہ کی وجہ کی وجہ سے اسے اس کام میں اتنا تجربہ حاصل ہوا کہ اس نے جلد ہی اپنا ایک الگ ٹولہ تیار کر لیا اور ملک بھر میں چندہ فروشوں کا ایک ایسا جال بچھا دیا کہ کوئی شہر اور گاؤں اس کی زد سے نہیں بچ سکا۔

اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اکیسویں صدی میں داخل ہوتے ہوتے وہ اپنی شاخیں خلیجی ممالک اور امریکہ و یورپ میں بھی کھولنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ کیوں کہ ان ملکوں کی مٹی (بشمول ریت) بھی چندہ وصول کرنے والوں کے لیے بڑی زرخیز ثابت ہو رہی ہے۔

تو صاحبو! اگر یہ چندہ فروش آپ کو کہیں نظر آئے تو بجائے پولس میں دینے کے اس موقع کو نادر سمجھ کر فن چندہ فروشی کے "گر" اس سے سیکھ لیں۔ تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آوے

ایس۔ ایس علی (اکولہ)

رپورتاژ

یہ چپ ہوں تو میں کچھ بولوں

شکیل اعجاز نے ہمیں وارننگ دے رکھی تھی کہ پروگرام ٹھیک ½9 بجے شروع ہوگا۔ ہم نے حیرت سے کہا تھا کہ بھائی یہ کیسے ممکن ہے، دعوت نامے پر بھی وقت ½9 کا درج ہے۔ انھوں نے وضاحت کی تھی کہ سیاسی شخصیتیں مدعو ضرور ہیں لیکن جلسہ سیاسی نوعیت کا نہیں ہے خالص ادبی نوعیت کا ہے۔ اس لیے ساڑھے نو، یعنی ساڑھے نو!

جلسہ واقعی خالص ادبی تھا بلکہ دوچند ادبی تھا۔ یعنی ٹو ان ون۔ یعنی آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ یعنی ایک تو دربھہ کے مایہ ناز شاعر جناب غنی اعجاز کے دوسرے مجموعۂ کلام "گردِ سفر" کا اجرا اور دوسرے اس کے فوراً بعد مشاعرہ (گویا غیر ادبی مزاج والوں کے لحاظ سے یہ جلسہ کرٹھا کریلا تھا)، وہ بھی نیم چڑھا۔ ہم نے بھی دل میں ٹھان لی کہ چاہے کچھ ہو جائے جلسہ میں وقت پر پہنچیں گے۔ لہٰذا ٹھیک ½9 بجے گھر سے نکل پڑے۔ اجائے وقوع پر پہنچے تو کوئی دس کا عمل ہوگا۔ باہر خان محمد اظہر حسین (سابق وزیر مملکت) کی کار کھڑی تھی۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ پروگرام شروع ہو چکا ہے، اب خیر نہیں!

ہال میں داخل ہوئے تو جان میں جان آئی کیوں کہ ہال اپنی گنجائش کا ایک چوتھائی بھی پُر نہیں ہوا تھا۔ البتہ ڈائس شہر کی معزز ہستیوں سے پر تھا۔ ہم فوراً شکیل اعجاز کے پاس چلے گئے اور ان سے اس انداز میں گفتگو کرنے لگے گویا پروگرام سے متعلق کوئی اہم بات کر رہے ہوں۔ حالاں کہ مقصد صرف یہ تھا کہ خصوصاً اللہ نقیب ضمیر ساجد اور دیگر منتظمینِ جلسہ دیکھ لیں کہ ہم بمع اپنے فرزند تشریف لا چکے ہیں۔

ہم نے پلٹ کر دیکھا تو سامعین ہال کی دیواروں سے ٹیک لگائے محوِ گفتگو نظر آئے۔ صرف داخلہ کے دروازے کے قریب دیوار سے ذرا سی جگہ باقی تھی۔ ہم وہیں پر اجماں ہوگئے۔ ایک جگہ ہمارے لیے بہت مبارک ثابت ہوئی کیوں کہ ہال میں داخل ہونے والا ہر شخص ہمارے آگے جھکتا، سلام کرتا اور اپنے جوتے اٹھا کر آگے بڑھ جاتا! ہال دھیرے دھیرے پُر ہونے لگا۔ ادھر ناظمِ جلسہ فصیح اللہ نقیب

نے مسکراتے ہوئے مائیک سنبھالا اور یہ کہہ کر حاضرین کی گفتگو میں خلل ڈالا کہ نہ صرف تمام معزز مہمان تشریف لا چکے ہیں بلکہ جناب صدر، مسندِ صدارت پر جلوہ افروز بھی ہو چکے ہیں۔ اسی کے ساتھ گل پوشی کا سلسلہ شروع ہوا۔ گل پوشی کے عمل میں چوں کہ ہار پہنانے والا فاعل ہوتا ہے اور پہننے والا مفعول، اس لیے اہمیت پہنانے والے کی ہوتی ہے لہٰذا ہار پہنانے والوں نے امکان بھر کوشش کی کہ وہ مع ہار نمایاں طور پہ تصویر میں نظر آئیں اور صاحبِ ہار پس منظر میں رہے۔

گل پوشی ختم ہوئی اور نقیب نے مہمانِ خصوصی جناب خان محمد اظہر حسین سے درخواست کی کہ وہ "گردِ سفر" کا اجرا فرمائیں۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ ہم سوچ رہے تھے کہ اب مقالہ خوانی کا سلسلہ شروع ہوگا اور ہمیں ہال میں بکھرے دوستوں کی خیریت پوچھنے اور بات چیت کرنے کا موقع مل جائے گا۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ عام طور پہ ہوتا یہ ہے کہ جلسہ و مشاعرہ کے اختتام پر صدرِ جلسہ کی تقریر ہوتی ہے لیکن نقیب نے صدرِ مجلس، مردان علی خاں نشاط سے درخواست کی کہ وہ جلسہ کا افتتاح فرمائیں اور اپنی صدارتی تقریر سے بھی لوگوں کو نوازیں۔ انھوں نے جلسہ و مشاعرہ کے افتتاح سے متعلق کچھ کلمات کہے پھر صدارتی تقریر شروع کر دی۔ اتنے میں ہمارے ایک دوست تشریف لے آئے۔ عمر میں ہم سے بڑے ہیں لیکن وہی ہمارے آگے جھکے، سلام کیا اور ہمارے قریب ہی بیٹھ گئے۔ رسمی گفتگو کے بعد جب ان کی توجہ خطبۂ صدارت کی جانب مبذول ہوئی تو بہت پریشان ہوئے اور کمالِ افسوس کے ساتھ کہنے لگے "آئی ایم ساری یار، مجھے آنے میں دیر ہو گئی" لیکن پھر حیرت سے کہنے لگے "لیکن کمال ہے یار مشاعرہ اتنی جلدی ختم کیسے ہو گیا؟"۔ ہم نے انھیں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ بڑی مشکل سے مطمئن ہوئے۔ صدرِ جلسہ نے دورانِ تقریر کہا۔ "میں آپ لوگوں سے گزارش کروں گا کہ آپ "گردِ سفر" خرید کر پڑھیں اور زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کر کے خریدیں اور اسے مالِ مفت نہ سمجھیں"۔ یہ سن کر سامعین سناٹے میں آ گئے۔ ہم سوچ ہی رہے تھے کہ صدر صاحب کس زمانے کی بات کر رہے ہیں کہ دو چار اصحاب دھیرے دھیرے سرکتے ہوئے دروازے تک آ گئے اور ہمارے آگے جھک کر جوتے اٹھانے ہی والے تھے کہ ہم نے کہا "کتاب ابھی اور اسی وقت نہیں خریدنی ہے۔ پہلے مشاعرہ سن لیں۔ پھر دو چار دن یا دو چار ماہ بعد یا پھر دو چار سال بعد کتاب خرید لینا"۔ یہ سن کر ان کے حواس درست ہوئے اور وہ دوبارہ اپنی جگہ پر جانے کے بجائے ہمارے قریب ہی جم گئے۔

صدارتی تقریر ختم ہوئی تو نقیب نے باقاعدہ مشاعرہ شروع ہونے کا اعلان کیا (گویا اب تک بے قاعدہ یا غیر قانونی مشاعرہ چل رہا تھا) مشاعرہ کا آغاز حمد و نعت سے ہوا۔ سردی اپنے شباب پر تھی۔ لوگ اپنے کانوں پہ مفلر لپیٹے ہوئے تھے یا پھر اونی ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے۔ مترنم شعرا نے اس بات کا خیال رکھتے ہوئے اپنے حلق کی پوری قوت کے ساتھ گانا شروع کر دیا۔ ایک شاعر نے تو اتنی دھما کے دار تان لگائی کہ ہال میں بیٹھے ہوئے بچے مارے ڈر کے رونے لگے۔ بچوں کے رونے اور بڑوں کی چیخ و پکار کو انھوں نے ہوٹنگ سمجھا اور غصہ میں مائیک چھوڑ کر بیٹھ گئے۔ سامعین نے اطمینان کی سانس لی لیکن وہ لعن طعن کرتے رہے۔ اسٹیج پر بیٹھے ہوئے شعرا نے انھیں بہلانے کی خاطر دوبارہ غزل سرائی کا مشورہ دیا لیکن یہ مشورہ زخم پر نمک ثابت ہوا۔

نقیب نے مقالہ خوانی کی کسر اس طرح پوری کی کہ ہر شاعر کو بلانے سے پہلے غنی اعجاز صاحب کے فکر چند مطلع اور ان کے چند اشعار کہے لیکن کبھی کبھی جوشِ عقیدت میں غنی اعجاز صاحب کی پوری کی پوری غزلیں پڑھ ڈالیں (بعد میں انکشاف ہوا کہ جنھیں ہم مکمل غزلیں سمجھ رہے تھے وہ گیارہ گیارہ اشعار کی غزلوں کے صرف چار چار اشعار تھے) نقیب کے حافظہ کی ہمیں داد دینی پڑی۔ ہمارے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک نے کہا اب دیکھو صدر صاحب نے حکم صادر فرمایا کہ کتاب خرید کر پڑھو لیکن یہ صاحب ہیں کہ پوری کی پوری کتاب سنا رہے ہیں۔ اب کتاب خریدنے اور پڑھنے کا کیا لطف ؟ اب ہم چار سال بعد تو کیا ' چار صدیوں بعد بھی کتاب نہ خریدیں گے۔"

ان دنوں عوام پر مذہب کا رنگ اتنا گہرا ہے کہ تقریباً ہر مشاعرہ حمد و نعت سے شروع ہوتا ہے۔ حمد و نعت گو شعرا خوب خوب داد بٹورتے ہیں۔ آخر عقیدت بھی کوئی چیز ہے۔ اس مشاعرہ کا آغاز بھی اس طرح کامیاب طریقے سے ہوا تھا۔ پھر جب جب تحت گو شعرا نے سامعین کو خاموشی اور سکون کی چند ساعتیں بخشیں، تب تب ترنم گو شعرا نے آکر محفل کو گرمایا۔ یہ نقاد لوگ فضول ہی ان شعرا کو "گلے باز" اور نہ جانے کون کن خطابات سے نوازتے رہتے ہیں اور بھائی مشاعرہ لوٹنے کا فن تو صرف ہزل گو شعرا کو آتا ہے۔ ایک بڑا شاعر جب مائک پر آئے تو عوام کے مزاج کی چیزیں سنا کر محفل کو لوٹ پوٹ کر گئے پھر شیخ ایم وسیم نے ایک انتہائی پر لطف تضمین پیش کی جس سے سامعین لطف اندوز نہ ہو سکے۔ لہٰذا انھوں نے بھی غصہ میں آکر ایک عوامی چیز سنا ڈالی۔

ودربھ میں طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے بے تاج بادشاہ فیاض افسوس نے نہایت شائستگی سے نقیب کی طرف اشارہ کر کے کہا :

دل کی گرہیں کیسی کھولوں   یہ چپ ہوں تو میں کچھ بولوں

اس پر نقیب نے اعتراف کیا کہ وہ آج کچھ زیادہ ہی بول رہے ہیں ساتھ ہی زیادہ بولتے رہنے پر اصرار بھی کیا۔ جواز اس کا انھوں نے یہ پیش کیا کہ مشاعرہ کا دوسرا دور نہیں ہوگا۔ اس اعلان سے جہاں شعرا میں مایوسی پھیلی وہیں سامعین نے زیادہ شوق سے مشاعرہ سنا۔

بجلی کو ڈرانے کا ایک اور موقع اس وقت نصیب ہوا۔ جب ایک شاعر انتہائی پر اسرار انداز میں مائک پر آئے۔ انھوں نے سیاہ رنگ کا اوورکوٹ پہن رکھا تھا۔ اونچی دیوار کی اونی ٹوپی اور اس سے میل کھاتی ہوئی سیاہ گھنی داڑھی اور موٹے شیشوں کی عینک۔ شکل و صورت اور ہیئت کذائی سے وہ کسی ڈراؤنی فلم کے پُر اسرار سائیں یا چوکیدار لگ رہے تھے۔ صرف ہاتھ میں لالٹین کی کمی تھی۔ غزل گوئی کا انداز ایسا تھا جیسے خود سے محوِ گفتگو ہوں۔ اس موقع کو غنیمت جان کر سامعین نے انٹرول کر لیا۔ شاعر صاحب چوں کہ خود سے باتیں کر رہے تھے۔ اس لیے پہلے دو چار اشعار، پھر چند متفرق اشعار پھر ایک مطلع اور پھر ایک غزل سناتے رہے، جب سامعین واپس ہال میں آئے تو انھوں نے سب کا شکریہ ادا کیا اور رخصت لی۔

ڈھائی بجے شب یہ یادگار مشاعرہ بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ برسوں بعد ایسی کامیاب نشست آکولہ میں منعقد ہوئی، کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ ہمیں چائے کی سخت ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن ہوٹلیں بند ہو چکی تھیں۔ واپسی میں راستہ بھر ہم اپنے اندر کے شوہر کو جگانے کی کوشش کرتے رہے کہ گھر پہنچ کر بیگم سے چائے بنوا کر پئیں گے۔ لیکن مارے سردی کے بیچارے اندر کا وہ شوہر، نہ جانے کہاں دبکا پڑا تھا۔

فارم ۷ حسب قاعدہ

بابت "شگوفہ" حیدرآباد 500001

مقام اشاعت : ۳۱ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۱

وقفۂ اشاعت : ماہانہ

پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر : ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال ۸۔۷۔۶۔۱۷ دبیر پورہ حیدرآباد ۲۳

مالک کا نام اور پتہ : قیصر کمال " " " "

میں سید مصطفیٰ کمال تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط

سید مصطفیٰ کمال

اودھ پنچ اور پنچ نگار

تعارف وتبصرہ : از قلم دردمند

مصنف : پروفیسر شفقت رضوی

اس پرلطف کتاب کے مصنف پروفیسر رضوی نے کیا خوب فرمایا ہے کہ جب ادب صحافت سیاست اور مزاح یہ چار عناصر یک جا جمع ہو جاتے ہیں تو اخبار کی وہ شکل سامنے آتی ہے جس کا ابتدائی نمونہ "اودھ پنچ تھا جو ہماری صحافت، سیاست اور مزاحیہ ادب کا سرخیل تھا۔ منشی سجاد حسین اس کے مدیر تھے اور انھوں نے یہ آٹھ صفحات والا ہفتہ وار اخبار ۱۸۷۷ء میں نکالا۔ موصوف کانگریس اور تحریک آزادی کے پرجوش حامی اور انگریز اور انگریزیت کے کٹر مخالف تھے اور بایں وجہ سرسید احمد خاں مرحوم اور ان کے نقطۂ خیال کے کہ انگریز دوستی اور سرپرستی سے ملک اور قوم اور بالخصوص مسلم فرقہ معاشی و معاشرتی ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے گا، کے حامی نہ تھے اور زور زبان اور مہارت قلم سے حد درجہ مخالفت کی اور قابل لحاظ مقبولیت حاصل کی۔

اخبار اودھ پنچ طنز و مزاح، سیاست و معاشرت کا بے باک نقیب اور نمائندہ تھا اور حکومت اور اس کی تائید کرنے والے اداروں اور حلقوں کے عدم تعاون بلکہ مخالفت کے باوجود کوئی ۳۵ سال (۱۸۷۷ء تا ۱۹۱۲ء) تک میدان صحافت میں سرخروئی اور امتیازی کامیابی حاصل کی اور مالی اعتبار سے بھی ایک مستحکم ادارہ بنا رہا۔ زمانۂ آخر میں منشی سجاد حسین کی خرابیِ صحت کی بنا پر اشاعت بند کرنی پڑی۔

کتابچہ "اودھ پنچ اور پنچ نگار" اردو اکیڈمی کراچی نے ۱۹۵۵ء میں شائع کیا ہے۔ کتاب کے حصہ دوم "پنچ نگار" میں منشی سجاد حسین - نواب سید محمد آزاد - ستم ظریف اکبر الہ آبادی - احمد علی شوق، تربھون ناتھ سپرو ہجر - جوالا پرشاد برق اور رتن ناتھ سرشار جیسے مشہور و معروف مزاح و طنز نگار ادیبوں اور شاعروں کی سوانح حیات اور ان کی تخلیقات کے چند اقتباسات دیئے گئے ہیں۔

چند دلچسپ حوالے جات جو اس کتاب کی زینت ہیں ملاحظہ ہوں :

مرزا محمد مرتضیٰ المعروف بہ مرزا مچھو بیگ نام اور قلمی نام ستم ظریف تھا۔ نثر اور نظم دونوں میں رواں دواں تھے۔ سال نو ۱۸۷۸ء کی مبارک باد نمونتاً درج ذیل ہے۔ دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں سنہ (۷۷) ختم کی

بجائے چھیانوے پڑھا جائے تو زمانہ حال کے سالِ نو کی بھی بھرپور عکاسی ہوتی ہے:

دھوم سے آیا نیا سال مبارک باشد — خوش ہیں سب ہند کے کنگال مبارک باشد

"سن سترکی بدولت ہوئی چندیا گنجی — پھر نئے سر سے جھے بال مبارک باشد

پانی سب مانگی تھی خلق بٹیری کی طرح — مینہ برستے ہی اُڑا کال مبارک باشد

کچھ تعجب نہیں سر پیٹیں دھڑادھڑ بنیے — اپنا منہ نوچیں گے بقال مبارک باشد

آنے والا کوئی ہیٹسا ہے تو پیسا جائے — خوب جوتوں میں بٹے دال مبارک باشد

سال بھر رنج اٹھاتے ہیں الٰہی توبہ — اب تو غارت ہوا چنڈال مبارک باشد

اردو ادب کا ہر طالب علم اکبر الہ آبادی (۱۸۴۶-۱۹۲۱ء) کے نام ، ان کے اسلوبِ بیان، ظریفانہ انداز اور طنز کے نشتروں سے خوب واقف ہے وہ ایک طرزِ خاص کے موجد ہی نہیں خاتم بھی تھے اعلیٰ تعلیم پائی اور اعلیٰ عہدوں (عدالتِ خفیفہ کے جج ۱۸۹۴ء) پر فائز رہے۔ اُن کا کلام واقعہ نگاری اور مزاح کے لیے مشہور و مقبول ہے۔ "اردو پنچ" کی تعریف میں فرماتے ہیں:

دریا قطرے میں موج زن ہے — غنچے میں بہار صد چمن ہے

مزاح نگاری کی صنف میں اکبر کا لکھا ہوا ایک لطیفہ ملاحظہ ہو:

ایک صاحب نے اپنے شائستہ اور تعلیم یافتہ لڑکے کی تعریف میں فرمایا کہ "حضرت ماشاء اللہ کرنسی نوٹ ہیں"۔

ایک خوشامدی بیٹھے تھے بول اٹھے۔ بجا ہے پیرو مرشد اگر کوئی دخترِ نیک اختر ہوتی تو چشم بددور وہ بھی بل آف اکسچینج ہوتی۔

دے کے خط

(مراسلے)

محترمی تسلیمات

"رشید احمد صدیقی نمبر" دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ اس خصوصی نمبر کا معیار رسالے کی ضخامت سے نہیں اس میں شامل شدہ مضامین کی کیفیت سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ آپ کی اور پروفیسر سلیمان اطہر جاوید صاحب کی محنت، محبت اور عقیدت کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر حلیمہ فردوس (بنگلور)

○

مکرمی و محترمی ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب تسلیمات۔

ڈاکٹر عابد معز کی فانی محبتوں کا شریک ہونے پہ ہی یہ نا چیز اتراتے پھر رہے تھا۔ آپ نے برصغیر کے باوقار ادبی جریدے "شگوفہ" سے سرفراز فرما کر ایک اور اعزاز سے نواز ڈالا "شگوفہ" مزاحیہ اردو ادب کا نہایت ہی معتبر نمائندہ اور جدید و قدیم رجحانات کا خوب صورت وارث ہے۔ اس کی جتنی بھی تعریف و توصیف کی جائے کم ہے۔

گلزار جاوید

مدیر چہار سو۔ راولپنڈی

○

ماہنامہ شگوفہ کے دو شمارے اکتوبر اور نومبر ۹۵ء نظر نواز ہوئے بہت پسند آئے اور جتنی تعریف سنی تھی اس کے مطابق فراق گورکھپوری کے تعلق سے خامہ بگوش کا مضمون بہت ہی عمدہ تھا۔ کردار نگاری کا مقصد صرف تعریف کے پل باندھنا ہی نہیں بلکہ حقیقت حال کو واضح کرنا بھی ہے سیپے تلے انداز میں تاکہ نہ صرف شخص مذکور اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھے اور مائل بہ اصلاح ہو۔ اور ساتھ ساتھ قارئین بھی صحیح اور غلط طرز زندگی کے فرق کو محسوس کریں اور راہ راست پر گامزن ہوں۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ ان ہی خطوط پر چند احباب کے خاکے تحریر کروں تاکہ خود ان کو بلکہ تمام پڑھنے والوں کو نصیحت و عبرت ہو۔

خامہ بگوش کی طرح میرا بھی قلمی نام "قلم در دست" ہوا کرے گا۔

ماہنامہ شگوفہ میں مشتاق یوسفی صاحب کے مضامین بہت اعلیٰ معیار کے ہوتے ہیں۔ یوسف ناظم اور خاص طور پر مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری لاجواب ہوتی ہے۔

کے ایس شفیق، حیدرآباد

شگوفہ کا رشید احمد صدیقی نمبر بہت ہوا بہت خوب ہے۔ مبارکباد قبول کیجیے۔ رشید صاحب کے مضامین لطف دے گئے۔

ضیا احمد بمبئی

○

ماہنامہ شگوفہ کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ باچھیں کھل گئیں۔ بوسہ دیا۔ آنکھوں سے لگایا۔ دعائیں دیں اور انہماک کے ساتھ الف سے ی تک ذہن نشین کر لیا۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ کی محنت شاقہ اور دلی لگن کا ہی یہ ثمرہ ہے۔ یعنی شگوفہ سابقہ آب و تاب کے ساتھ آج بھی شائع ہو رہا ہے۔ ورنہ کتنے رسائل منظر عام پر آئے اور گئے۔

صابر رحمانی (دہلی)

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

حیدرآباد

سووینر

جلد : ۲۸
شمارہ : ۴

اشاعت کا اٹھائیسواں سال

اپریل ۱۹۹۶ء

ایڈیٹر
ڈاکٹر سید مصطفٰے کمال

سرورق : سعادت علی خاں
کتابت : محمود سلیم۔ محمد غالب۔ محمد عبدالرؤف۔
طباعت : دائرہ پریس، چھتہ بازار حیدرآباد

فی پرچہ : ۱۰ روپے
زرسالانہ : ۱۰۰ روپے
بیرونی ممالک سے : ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :
۳۱۔ بیچلرز کوارٹر معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد۔۱
فون آفس : 565716 فون مکان : 521064

زندہ دلان حیدرآباد کے لئے
نیک خواہشات
کے ساتھ

MAPCO

STRUCTURAL FOAM (P) Ltd.

میاپکو اسٹرکچرل فوم (پرائیوٹ) لمیٹڈ

آفس:
36-B پہلی منزل
روبرو میڈون بلاک
راگھوا رتنا ٹاور، چراغ علی لین
حیدرآباد-500 001

office :
36-B,Ist Floor
(Opp. Medwin Block)
Raghava Ratna Towers
Chiragali Lane
Hyderabad-500 001.

سالانہ تقاریب جمعہ ۱۲/ اور شنبہ ۱۳/ اپریل ۱۹۹۶ء

ندہ دلان حیدرآباد

رر: نریندر لوتھر (آئی۔اے۔ایس، ریٹائرڈ)
ب صدر: سوداگر انور (آئی۔اے۔ایس)
۔وی۔رمناچاری (آئی۔اے۔ایس)
تمد عمومی: طالب خوندمیری
ب معتمد: رشید الدین
روٴف رحیم
زن: محمد علی رفعت

رکان:

ر حمایت اللہ
کٹر سید مصطفیٰ کمال
زا مصطفیٰ علی بیگ
ح انجم
کٹر حبیب ضیا
اب قیصر
لاح الدین نیر
لم فرشوری
یب احمد خاں

یلی کمیٹیاں:

نوینر سووینیر محمد علی رفعت
نوینر ابطہ منور علی مختصر
نوینر نشر و اشاعت روٴف رحیم
نوینر طباعت ممتاز مہدی
نوینر ڈائس سعادت علی خاں
نوینر بکنگ مرتضیٰ
نوینر بک اسٹال مرزا نقی علی بیگ
نوینر خواتین مقبول فاطمہ
نوینر انتظامی وہاب قیصر
علاوہ شفیع ماسٹر، طارق زبیری
سین محی الدین سلیم، طلعت مہدی
سید علی

ادبی اجلاس

جمعہ ۱۲/ اپریل بمقام رویندرا بھارتی تھیٹر
صدارت: جناب نریندر لوتھر
مہمان خصوصی: جناب مجتبیٰ حسین
مزاح نگار: دلیپ سنگھ
فیاض فیضی
مسیح انجم
پرویز یداللہ
ڈاکٹر حبیب ضیا
ڈاکٹر عباس متقی
کنوینر: فیروز حیدر

محفل لطیفہ

۱۳/ اپریل صبح ۱۰ بجے نمائش میدان
صدارت: جناب دلیپ سنگھ
شرکا: نریندر لوتھر

* مجتبیٰ حسین
* فیاض احمد فیضی
* سنیل کمار تنگ
* ڈاکٹر رام پرشاد
* حمایت اللہ
* غوث خواہ مخواہ
* غلام یزدانی
* طالب خوندمیری
* موہن پرشاد
* ڈاکٹر احمد اللہ
* سہا سلیمہ
* اسلم فرشوری
* افشاں جبیں
* حامد کمال
* منور علی مختصر
* صبغت اللہ بمباٹ

کنوینر: مصطفیٰ علی بیگ

مشاعرہ

۱۳/ اپریل ۱۹۹۶ء۔نمائش میدان
صدر: نواب شاہ عالم خاں صاحب
مہمان خصوصی: جناب زاہد علی خاں "مدیر سیاست"

شعرا:

ہاپوڑ میرٹھی (یوپی)
ساغر خیامی
خواہ مخواہ (بمبئی)
لتا حیا (بمبئی)
سنیل کمار تنگ (بہار)
مختار یوسفی (مالیگاؤں)
عیسیٰ قمر نگری
حمایت اللہ
طالب خوندمیری
مصطفیٰ علی بیگ
اسمعیل ظریف
شمشیر کوڑنگلی
وینو گوپال بھٹ
صبغت اللہ بمباٹ
روٴف رحیم
اقبال ہاشمی
ان پڑھ بھونگری
محمد علی رفعت
محمود نغز
معین امر بمبو
منور علی مختصر
نریندر رائے
نظامت: ثقلین حیدر
کنوینر: طالب خوندمیری

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

مال مفت (انشائیے)

فکریات

***

چورن (منظومات)

انتخاب کلام ساتواں کل ہند مزاحیہ مشاعرہ ۱۹۷۴ء

نواب شاہ عالم خاں صاحب
صدر مشاعرہ

جناب نریندر لوتھر
صدر زندہ دلانِ حیدرآباد

جناب زاہد علی خاں
مہمان خصوصی مشاعرہ

دلیپ سنگھ

جناب مجتبیٰ حسین

جناب فیاض احمد فیضی

طالب خوندمیری

مصطفیٰ علی بیگ

جناب فیروز حیدر
کنوینر ادبی اجلاس
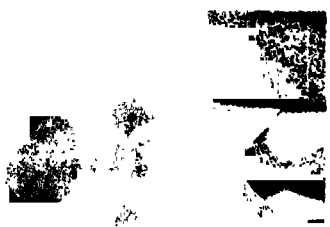
۱۹۸۳ء میں منعقدہ کل ہند مزاحیہ مشاعرہ کے ڈائس پر دائیں سے بائیں
جناب بھارت چند کھنہ، ڈاکٹر رام پرشاد، جناب نریندر لوتھر، نواب شاہ عالم خاں صاحب
افسانہ نگار انتظار حسین اور ہلال سیوہاروی

مزاحیہ مشاعرہ کی ایک یادگار تصویر ـ سلیمان خطیب، آئی۔ایس۔جوہر اور آغا حیدر حسن
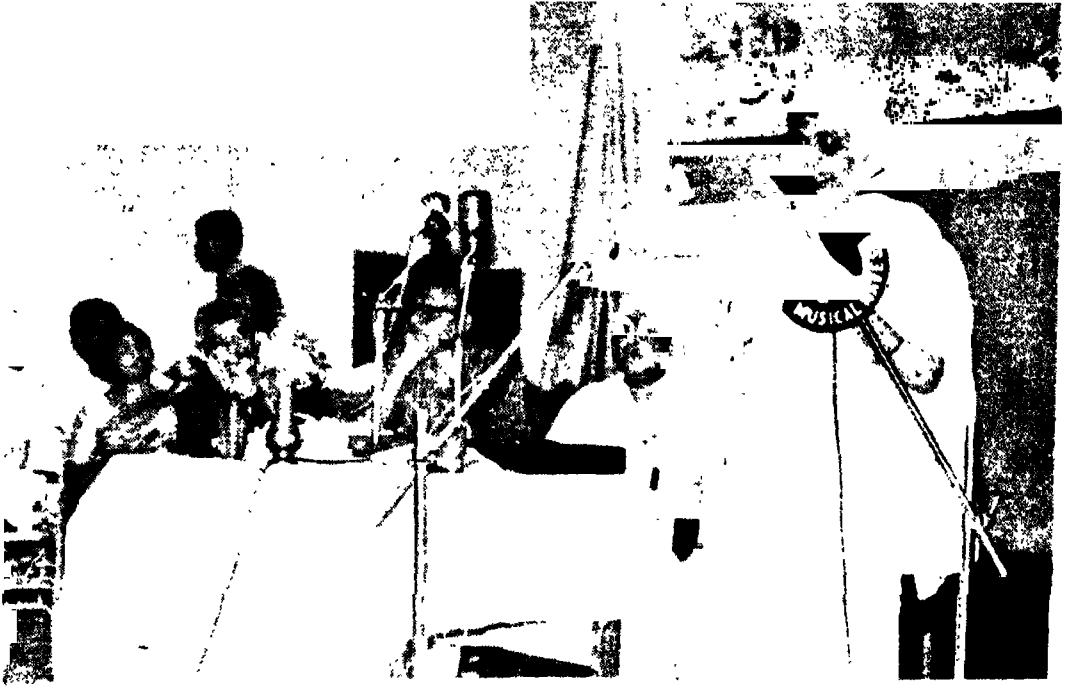
۱۹۶۶ء میں منعقدہ کل ہند مزاح نگاروں کی کانفرنس میں محترمہ سلمیٰ صدیقی مضمون سُنا رہی ہیں۔
ڈائس پر کرشن چندر، مخدوم محی الدین، بھارت چند کھنہ اور محترمہ سرور جمال۔

اینگلو اردو غزل

مرزا مصطفی علی بیگ

گھر کے کاموں کا عذاب ازماٹ گڈ
بعد پنشن کے یہ جاب ازماٹ گڈ

بال کالے کرلئے از آل رائیٹ
ماکنوں کا یہ شباب از ماٹ گڈ

کل کا دادا لیڈری کے زور پر
بن گیا عزت مآب از ماٹ گڈ

مائین ہنڈریڈس ریالس کما جانے کے بعد
پارسائی کا نقاب از ماٹ گڈ

جس کے جیبوں میں چھپا ہو ٹائم بم
اس کے ہاتھوں میں گلاب ازماٹ گڈ

عاشقی اچھی نہیں شادی کے بعد
پروہیبیشن کی شراب ازماٹ گڈ

میرے گھر میں چاہیئے اک ماہتاب
یہ دہکتا آفتاب از ماٹ گڈ

میرے ذاتی شعر بھی سننے کے بعد
آپ کا غصہ جناب از ماٹ گڈ

قطعات

درد دل درد جگر یوڈونٹ نو
عاشقی میں باؤنسر یوڈونٹ نو
بن گئے تم رومیو جس کے لئے
ایڈس ہے اس کو مگر یوڈونٹ نو

....

اک حسینہ کو لونلی پاکر
منچلے کچھ جکڑ لیے اس کو
پھر سڈنلی وہ چھوڑ کر بھاگے
جب کہا اس نے ایڈس ہے مجھکو

غزل

اعجاز الدین پاپولر

تری نگاہ عنایت بہت ضروری ہے — لگی ہو پیاس تو شربت بہت ضروری ہے
اگر بعوض خرچ زیادہ قلیل ہو تنخواہ — تو یہ سمجھ لو کہ رشوت بہت ضروری ہے
جوان شخص اگر ہو تو کوئی بات نہیں — مگر بڑھاپے میں عورت بہت ضروری ہے
انھیں کوئی بھی نہیں پوچھتا جو بزدل ہیں — یقین جانئے ہمت بہت ضروری ہے
پولیس والوں کو میرا یہ مشورہ دیدو — ستم گروں کی مرمت بہت ضروری ہے
کہیں نہ شان ترنم پہ حرف آجائے — میاں گلے کی حفاظت بہت ضروری ہے
تم اپنا عیب چھپانا ہی چاہتے ہو تو پھر — جناب شیخ کی دعوت بہت ضروری ہے
سنا یہ ہے کہ زمانے کا غم بھلانے کو — شراب پینے کی عادت بہت ضروری ہے
اے پاپولر کرو ہموار ٹی وی والوں کو — ہمارے دور میں شہرت بہت۔ ضروری ہے

غزل

اقبال ہاشمی، حیدرآباد

ادھر چھلکی تری آنکھوں سے وہسکی — ادھر دھرتی مرے پیروں سے کھسکی
نشہ بندی ہے نافذ جان جاناں — ذراسی بات بن جائے گی رسکی
میں اس کی بات کرنا چاہتا ہوں — زبان کرتی ہے لیکن بات اس کی
وہی بدنام مجھ کو کر رہا ہے — بڑی تعریف کرتا ہوں میں جس کی
کبھی بدلے فضا تو ہنس بھی لینا — ابھی لیتے رہو سسکی پہ سسکی
مدد کتوں سے لیتی ہے ہمیشہ — یہی اک بات اچھی ہے پولیس کی
زمیں لے تو رہے ہو ہاشمی تم — ذرا معلوم کرنا ہے یہ کس کی

غزل

فرید انجم، عادل آباد

سسرال میں رہنے کا اک یہ بھی نتیجہ ہے — داماد ہے آنگن میں، بیڈروم میں کتا ہے
کیا بات ہوئی آخر کس بات پہ جھگڑا ہے — لنگڑا کے بھی چلتے ہو ٹوٹا ہوا جبڑا ہے
اب تم کو بتاؤں کیا درگت یہ بنی کیسے — بیوی کا میاں ہم پہ یہ تیسرا حملہ ہے
جاتا ہوں میں تھانے کو لکھوانے رپٹ اپنی — سسرال میں رہنے سے اب جان کو خطرہ ہے
جب فوت ہوا بیتا سب لوگ یہ کہہ اٹھے — جلدی سے جلا ڈالو سب سے بڑا فتنہ ہے
دیکھا جو مرغ تگڑا ہے چین ہوئے مرشد — اب اسکی گرفتاری چیلوں کا فریضہ ہے
وہ دیکھ کے انجم کو کہنے لگے سی سے — شاعر بہت اچھا ہے لیکن بڑا دبلا ہے

الکشن کی وباء

پروفیسر حفیظ بنارسی، آرہ (بہار)

پھر الکشن کی وبا آنے کو ہے
گھر میں پھر سیل بلا آنے کو ہے
لیکے اپنی جھولیاں نکلیں گی پھر
لیڈروں کی ٹولیاں نکلیں گی پھر
اسپ و خر دوڑینگے سبقت کے لئے
ہر بھلے انساں کی درگت کے لئے
مینڈکوں کی ہوگی ٹرٹر ہر طرف
ہوگا برپا شور محشر ہر طرف
لاوڈاسپیکر لگائے جائیں گے
قوم کو لکچر پلائے جائیں گے
جنت لفظی سجائی جائیں گی
فصل وعدوں کی اگائی جائیں گی
اپنی کرسی کو بچانے کے لئے
اور جنتا کو پھنسانے کے لئے
دام نو ہر سو بچھائے جائیں گے
خواب کچھ تازہ دکھائے جائیں گے
چیخ کو نغمہ بنایا جائے گا
فلمی دھن پر گیت گایا جائے گا
چند ہیرو لوگ بھی آجائیں گے
اور ہر اک اسٹیج پر چھا جائیں گے
دیں گے بھاشن کوچہ و بازار میں
بدھو، بھی بیٹھیں گے موٹر کار میں
جھنڈے ہوں گے دفتر و دوکان پر
ڈاکے ڈالے جائیں گے لمان پر
اردو سے الفت جتائی جائے گی
مانگ اس کی پھر سجائی جائے گی
دیویاں بھی آئیں گی میدان میں
کم نہیں ہیں وہ بھی ہندوستان میں
زور بازو آزمایا جائے گا
اور پیسہ بھی لٹایا جائے گا
ذات کی ڈفلی بجائی جائے گی
دھرم کی آواز اٹھائی جائے گی
گرچہ میلا ہوگا دل کا ہر ورق
ایکتا کا پھر بھی سب دیں گے سبق
سب کہیں گے ہم سے بہتر کون ہے
قوم پرور ہم سے بڑھکر کون ہے
ہاتھ پھیلائے ہوئے آئیں گے سب
دست بستہ عرض فرمائیں گے سب
سب کہیں گے ہم ہیں خادم آپ کے
آپ آقا ہم ملازم آپ کے
قوم سے الفت کا موقع دیجئے
پھر ہمیں خدمت کا موقع دیجئے

ووٹ لیکر سب رواں ہوجائیں گے
ہم غبار کارواں ہوجائیں گے

چناؤ کے دن

ڈاکٹر محبوب راہی، بارسی ٹاکلی۔

تمام فاصلے مٹ جائیں گے چناؤ کے دن
بڑے غضب کے مزے آئیں گے چناؤ کے دن
گئے چناؤ کے دن آئے تھے جو اپنے گاؤں
جو ہم سے بات نہ کرتے تھے سیدھے منہ اب تک
تمام عمر جنھیں ووٹ دیکے کچھ نہ ملا
فضا جو گرم ہے پہلے ہی بھاشنوں سے بہت
کبھی نصیب نہ ہو پائی سائیکل بھی جنھیں
جسے بھی دیکھو الاپے گا اپنا اپنا راگ
خطا ہیں جو انھیں جیسے بھی ہو سنائیں گے
گرہ میں باندھ کے رکھتے ہیں کوڑی کوڑی جو
جنھوں نے مدتوں ترسایا ہے ہمیں راہی

جو دور تھے وہ قریب آئیں گے چناؤ کے دن
چپاتی کھیر گدھے کھائیں گے چناؤ کے دن
خوشی مناؤ کہ پھر آئیں گے چناؤ کے دن
ہم ان سے ناک رگڑوائیں گے چناؤ کے دن
وہ ووٹ دینے کو پھر جائیں گے چناؤ کے دن
اسے کچھ اور بھی گرمائیں گے چناؤ کے دن
وہ جیپ کاروں کو دوڑائیں گے چناؤ کے دن
کہ کان شور سے پھٹ جائیں گے چناؤ کے دن
جو روٹھے ہیں انھیں پھسلائیں گے چناؤ کے دن
پھوار نوٹوں کی برسائیں گے چناؤ کے دن
ہم ان کو دیکھنا ترسائیں گے چناؤ کے دن

جین حوالہ

روف رحیم، حیدرآباد

ہائے نیتاؤں نے کب ہوش سنبھالا یارو
ہوش نیتا کے اڑاتا ہے حوالہ یارو
سب کو دعویٰ تھا یہاں روشنی لانے کا مگر
ہاتھ میں آئے اگر ان کے نظام شمسی
رکھالیا تھا جو بڑے شوق سے لی بھی نہ ڈکار
سب مزے لے کے اڑاتے ہیں حکومت کا مذاق
جن سے بدنام مرا دیس ہوا جاتا ہے
دے کے استعفیٰ سمجھتے ہیں بڑا کام کیا
پارسائی کی جو تقریریں کیا کرتے تھے
شرم آتی ہے ہمیں دیکھ کے کرتوت ان کے
بن کے سادھو جو پھرا کرتا تھا اعزاز کے ساتھ
جیبیں بھرتے رہے لیکن یہ کہاں سوچا تھا
ڈائری جین کی ہے کتنی اہم مت پوچھو

پھٹ پڑا جب کہ نوالے کا جوالا یارو
سامنے آیا ہے ہر ایک گھٹالہ یارو
دل نظر آتا ہے ہر ایک کا کالا یارو
بیچ کھائیں گے یہ سورج کا اجالا یارو
منہ سے اب ان کے نکل آیا نوالہ یارو
مل گیا سب کے لئے مرچ مسالہ یارو
ایسے لوگوں کا کرو دیش نکالا یارو
حسن کردار کا منہ کردیا کالا یارو
پڑگیا ان کے بھی اب ہونٹوں پہ تالا یارو
کیسے لوگوں سے پڑا تھا ہمیں پالا یارو
وہ حقیقت میں تھا شیطان کا سالا یارو
جین لوٹے گا کبھی " جین حوالہ " یارو
اے رحیم اس پہ لکھو تم بھی مقالہ یارو

قطعات خواہ مخواہ

دل کے زخموں کو یوں چھپاتا ہوں
رنج و غم میں بھی مسکراتا ہوں
لوگ تو خواہ مخواہ ہنستے ہیں
میں تو بس آئینہ دکھاتا ہوں

مزاح و طنز کے جب تیر بیٹھیں گے نشانے پر
جو دیوانے ہیں ان کی عقل آئے گی ٹھکانے پر
ہمارے بیچ قدر مشترک ہے خواہ مخواہ ہنسنا
زمانہ مجھ پہ ہنستا ہے میں ہنستا ہوں زمانے پر

دل آزردہ ہو تو چہرے سے ویرانی نہیں جاتی
بہت کوشش تو کی لیکن پریشانی نہیں جاتی
یہ سچ ہے کہ گرانی خواہ مخواہ بڑھتی جاتی ہے
بس اک میرے ہی منہ زرانے کی ارزانی نہیں جاتی

وہ دل پتھر ہے جس میں عشق کا جذبہ نہیں ہوتا
وہ صحرا ہی تو ہے جس میں کہیں سبزہ نہیں ہوتا
حسینوں میں شرارت ہی حرارت کی نشانی ہے
وہ ٹھنڈا حسن ہے جس حسن میں غمزہ نہیں ہوتا

(جگر مرادآبادی سے معذرت کے ساتھ)

محمد علی رفعت

وہ کب کے کھائے بھی اور گئے بھی نظر ابھی تک چرا رہے ہیں
مگر وہ کھانا ، بھی کیا تھا کھانا کہ پیٹ اپنا دبا رہے ہیں
بہت ہی مہنگا پڑا ہے ان کو وہ مرغ سالم ، ڈبل کا میٹھا
" یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آرہے ہیں وہ جارہے ہیں "
رہیں سلامت میاں ہمارے کہ ہڈیاں بھی چبا کے چھوڑیں
بجا کے اٹھنے کا ذکر ہی کیا گرا ہوا بھی اٹھا رہے ہیں
وہ " کھینچنے " کی ادا تو دیکھو کہ چار مشتاب ہوچکے ہیں
نظر ہے اب پانچویں پہ ان کی وہ اپنا چمچہ بڑھا رہے ہیں
نکل گیا صبح تک نتیجہ کہ ان کو جلاب لگ گیا ہے
ہے لوٹا ٹونٹی کا ہاتھ میں اب وہ وقفہ وقفہ سے جارہے ہیں

متفرق اشعار

سامان میں جہیز کے اک چوکڑا بھی آیا
ماما کا عقد ثانی کس دھوم سے ہوا ہے

پیچھے برقعہ کے بجاتا جارہا ہے سیٹیاں
کیا پتہ برقعہ میں تیرے گھر کا ہی سامان ہو

ملا کی یہ پہچان کہ مشتاب میں گم ہے
مرشد کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے مشتاب

Dr. B.R.AMBEDKAR OPEN UNIVERSITY
RAOD No.46, JUBILEE HILLS, HYDERABAD-500 033.

THE UNIVERSITY OFFERS THE FOLLOWING PROGRAMMES

UNDER GRADUATE PROGRAMMES:

* B.A./B.Com./B.Sc., (Eligibility Test Stream)	- (3 Years)	English, Telugu & Urdu Mediums
* B.Sc./B.Com./B.A., (Direct Admission Stream)	- (3 Years)	- do -
* Bachelor Degree in Public Relations	- (1 Year)	English Medium
* Bachelor Degree in Library & Indormation Science	- (1 Year)	- do -
* Certificate Course in Food & Nutrition	- (6 Months)	Telugu and Urdu Medium
* Certificate Programme in Mushroom Cultivation	- (6 Months)	English Medium
* M.Phil in Development Studies		In Collaboration with Centre for Economic and Social Studies, Hyderabad.
* Ph.D. Programme in Development Studies		

POST GRADUATION PROGRAMMES:

* M.A. (Political Science)	- (2 Years)	Telugu Medium
* M.A. (Public Administration)	- (2 Years)	- do -
* M.A. (Economics)	- (2 Years)	- do -
* M.A. (History)	- (2 Years)	- do -
* M.Sc. (Mathematics)	- (2 Years)	English Medium
* M.B.A.	- (3 Years)	- do -

P.G. DIPLOMA PROGRAMMES:

* Business Finance	- (1 Years)	English Medium
* Marketing Management	- -do-	- do -
* Environmental Studies	- -do-	- do -
* Writing for Mass Media	- -do-	Telugu Medium

FOR DETAILS CONTACT
THE PUBLIC RELATIONS OFFICER
Dr.B.R.AMBEDKAR OPEN UNIVERSITY, ROAD No.46, JUBILEE HILLS, HYDERABAD
UNIVERSITY P & T LINES OF EPABX:
244743, 244772, 244986, 216272, 247016.

مجتبیٰ حسین

کچھ حیدرآبادیوں کے بارے میں

ہمارے ایک غیر حیدرآبادی دوست کا کہنا ہے کہ حیدرآباد ہندوستان کا سب سے بڑا شہر ہے۔ ہم نے اعداد و شمار کی بنیاد پر ان سے اختلاف کیا تو بولے "آپ شہر حیدرآباد کی آبادی میں صرف ان لوگوں کو شامل کرتے ہیں جو حیدرآباد میں رہتے ہیں۔ آپ ان حیدرآبادیوں کو شامل نہیں کرتے جو دنیا کے ہر کونے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دیگر شہروں کے لوگ کہیں بھی جاتے ہیں تو اپنے شہر کی شناخت کو بھول کر مقامی ماحول کا حصہ بن جاتے ہیں۔ لیکن حیدرآبادی دنیا کے کسی بھی کونے میں رہے وہ حیدرآبادی ہی بن کر رہتا ہے چنانچہ حیدرآباد اب حیدرآباد سے کہیں زیادہ بیرونی ممالک میں آباد نظر آتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ شہر ہندوستان کا سب سے بڑا شہر قرار پاتا ہے۔

کچھ برس پہلے ہم امریکہ گئے تھے تو ہمارے ایک پاکستانی دوست نے کہا تھا کہ حیدرآبادی امریکہ کے ہر گوشے میں آباد ہیں۔ کوئی پتھر اٹھایئے تو اس کے نیچے سے ایک حیدرآبادی فرشی سلام کرتا ہوا برآمد ہوتا ہے۔ حیدرآبادی سارا دن وقت بے وقت سلام کرنے میں گزار دیتے ہیں۔ پتہ نہیں کام کب کرتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو ہم بھی ایک عرصہ تک بلاوجہ سلام کرنے کی عادت میں مبتلا رہے۔ کسی نے پانی پیش کیا اور ہم نے سلام کیا۔ کسی نے ہمارے لیے جگہ دی اور ہم نے سلام کیا۔ کسی نے ہمارا مزاج پوچھا اور ہم نے سلام کیا۔ ہمارے دوست اوتار سنگھ جج جو انگریزی کے صحافی ہیں، ایک عرصہ تک ہماری اس عادت سے پریشان رہے۔ وہ اکثر کہتے تھے کہ تم نے آتے ہی مجھے سلام کر دیا تھا۔ پھر یہ بار بار سلام کر کے مجھے کیوں پریشان کرتے ہو۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ محفلوں میں ہمارے ان بیجا سلاموں پر روک لگانے کے لیے وہ ہمارے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھے رہتے تھے کہ کہیں ہمارے ہاتھ سے سلام نہ سرزد ہو جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ حیدرآبادیوں کا سلام سلام برائے سلامتی نہیں ہوتا بلکہ صرف سلام برائے سلام ہوتا ہے جیسے ان دنوں ادب برائے ادب ہوتا ہے۔

ہمیں یاد ہے کہ ۱۹۵۶ء کے بعد ہمارے اکثر دوست جب حیدرآباد کو چھوڑ کر بیرونی ملکوں میں آباد ہونے لگے تو دس بارہ برسوں تک ان کا باضابطہ حساب کتاب رکھتے رہے کہ کونسا دوست کس ملک میں آباد ہے۔ لیکن پچیس تیس برس پہلے جب اچانک خلیجی ممالک کے دروازے کھلے اور حیدرآبادی جوق در جوق ان ملکوں میں جانے لگے تو ہمارے لیے ان کا حساب کتاب رکھنا ناممکن نظر آنے لگا۔ حساب میں ہم یوں بھی کمزور ہیں۔ پھر ہم نے اپنے حیدرآبادی احباب کو ان کے حال پر چھوڑ دیا کہ وہ جہاں بھی رہیں خوش رہیں۔ اب ہمیں خود نہیں معلوم کہ ہمارا کونسا دوست کہاں آباد ہے۔ سعودی عرب

ہیں ہے یا کویت میں، قطر میں ہے یا دبئی میں۔ مسقط میں ہے یا دمام میں۔ حساب کے اس گھپلے کی وجہ سے اس بار مسقط میں ہمارے ساتھ ایک دلچسپ صورتحال پیش آئی۔ مسقط جانے سے پہلے ہم نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ یہاں کون کون حیدرآبادی دوست آباد ہے۔ ہمیں کچھ یاد نہ آیا۔ تاہم اتنا ضرور یاد تھا کہ ہمارے ایک حیدرآبادی دوست مہدی علیخان جو میکانیکل انجینئر ہیں اور جو برسوں دوبئی میں مقیم رہے، اب حال ہی میں مسقط میں آباد ہوئے ہیں۔ ہم جس دوست کی دعوت پر مسقط گئے تھے ان کا تعلق اتر پردیش سے ہے۔ لہٰذا ہم نے ان سے کہہ دیا تھا کہ یوں تو مسقط میں ہمارے کئی حیدرآبادی احباب ہوں گے لیکن ایک دوست مہدی علیخان حال ہی میں مسقط میں آباد ہوئے ہیں۔ اگر ہو سکے تو انھیں ہماری آمد کے بارے میں بتا دیں۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ ہماری یہ چھوٹی سی خواہش مسقط میں ہمارے پانچ روزہ قیام کو درہم برہم کر کے رکھ دے گی۔ ہمارے میزبان ہمایوں ظفر زیدی نے پہلے تو مسقط کے حیدرآبادیوں کو تلاش کیا۔ پھر ان حیدرآبادیوں میں سے "مہدی علیخانوں" کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ ہم مسقط پہونچے تو ہمایوں نے کہا "آپ نے فون پر مہدی علیخان کے بارے میں کہا تھا۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ آپ کے حیدرآبادی دوست مہدی علیخان کیا کام کرتے ہیں۔ لہٰذا مجھے جتنے بھی حیدرآبادی مہدی علیخاں ملے میں نے انھیں آپ کی آمد کے بارے میں بتا دیا ہے۔ اب تک جملہ پانچ مہدی علیخان ملے ہیں۔ ان میں سے جو بھی آپ کے کام کا مہدی علیخان ملے اس سے مل لیجئے"۔

دوسرے دن ہم صبح صبح گہری نیند سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ایک عدد مہدی علی خاں کا فون آ گیا ہم نے خوشی خوشی کہا "مہدی علی خاں صاحب دیکھئے آپ کو ڈھونڈ ھ ہی نکالا کیسے ہیں آپ"؟ بولے "اچھا ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟ ہم نے کہا "ہم تو اچھے ہیں" مگر آپ کی آواز سے تو لگ رہا ہے کہ آپ اچھے نہیں ہیں۔ خاصی بھاری آواز ہے۔ کیا نزلہ اور زکام میں مبتلا ہیں"؟

بولے "جی نہیں! ادھر ایک برس سے تو کبھی نزلہ اور زکام میں مبتلا نہیں ہوا۔ خیر چھوڑیئے۔ مسقط میں آپ کا آنا مبارک ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھے یاد کیا"۔

ہم نے تھوڑی دیر میں اندازہ لگا لیا کہ ہم جن صاحب سے بات کر رہے ہیں وہ مہدی خاں تو ہیں لیکن ان کی آواز ان مہدی علی خاں کی نہیں ہے جن سے ہماری دوستی ہے۔ ہم نے کہا "مہدی علیخاں صاحب! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ زکام کے بارے میں بعد میں بات ہو گی۔ پہلے یہ بتائیے کہ آپ ہمارے دوست محمد میاں کے سمدھی ہیں نا"؟

دوسری طرف سے مہدی علی خاں نے کہا۔ "حضور! آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ابھی تو خود میری شادی نہیں ہوئی ہے میں کسی کا کیسے سمدھی بن سکتا ہوں۔ بہرحال چلئے اس بہانے آپ سے بات ہو گئی۔ میں آپ کے جلسے میں ضرور آؤں گا
خدا حافظ"۔

ہماری بات چیت کو سن کر ہمایوں نے کہا "چلئے ایک مہدی علی خاں کا فون تو آ گیا۔ اب چار مہدی علی خانوں کے فون آنے باقی ہیں"۔ ہم دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگے تو پھر فون کی گھنٹی بجی پتہ چلا کہ ایک اور مہدی علیخان کا فون آیا ہے۔ ہم نے ہمایوں سے کہا۔ "بھیا! اب تم ہی ان مہدی علی خاں سے نپٹو۔ ان سے پوچھو کہ کیا وہ میکانیکل انجینئر ہیں۔ اگر ہیں تو پوچھو کہ کیا وہ ہمارے دوست کے سمدھی ہیں"۔ ہمایوں نے بات کی تو پتہ چلا میکانیکل انجینئر نہیں بلکہ الیکٹریکل انجینئر ہیں۔ ایک کوالیفکیشن یہ بھی بتائی کہ ہمارے مداح ہیں اور ہمارے مضامین پڑھتے رہتے ہیں۔

چنچل گوڑہ کے رہنے والے ہیں۔ ہم سے ملنے کے متمنی نظر آئے تو ہم نے انھیں جلسہ میں آنے کی دعوت دیدی۔ غرض دوپہر ہونے تک ہم نے پانچوں مہدی علیخانوں کے فون ریسیو کیے لیکن ان میں سے کوئی بھی مطلوبہ مہدی علیخان نہ نکلا۔ ایک مہدی علی خاں تو ایسے بھی نکلے جو مسقط کے ایک ہوٹل میں خانساماں ہیں بہت اصرار کرتے رہے کہ ہم مسقط میں قیام کے دوران میں ان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھائیں۔ چونکہ ہماری مزاح نگاری سے وہ بالکل ناواقف تھے۔ اس لیے ہمیں ان کے لہجہ میں بے پناہ پیار اور خلوص نظر آیا۔ وہ اس بات سے بہت خوش تھے کہ حیدرآباد نے نہ صرف اچھے خانساماں پیدا کیے ہیں بلکہ اچھے مزاح نگار بھی پیدا کیے ہیں۔ خیر وہ جلسہ میں تو نہ آسکے البتہ باقی چاروں غیر مطلوبہ مہدی علیخان جلسے میں موجود تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ہمارے دوست مہدی علیخان کو عین جلسہ کے دن ہماری آمد کا پتہ چل گیا اور وہ بھی باقی مہدی علی خانوں کے ہمراہ جلسہ میں موجود تھے۔ بہت شرمندہ تھے کہ ان کی تلاش میں کئی غیر ضروری مہدی علی خانوں سے ہماری ملاقات ہوگئی۔ ہمایوں کہنے لگے "مجھے یہ تو پتہ تھا کہ مسقط میں کئی حیدرآبادی آباد ہیں لیکن یہ پتہ نہیں تھا کہ ان میں سے اتنے سارے مہدی علی خاں بھی یہاں آباد ہیں"۔

اصلی مہدی علی خاں اگرچہ ہمیں دیر سے ملے لیکن یہ اچھا ہوا کیوں کہ ان کی ساری توجہ اس بات پر تھی کہ ہمیں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کھانا کھلایا جائے۔ ایک دن وہ ہمیں ایک نخلستان میں بھی لے گئے جو مسقط سے سوا سو کیلو میٹر دور واقع ہے۔ اس کا نام "غل" ہے۔ دو تین پہاڑیوں کے بیچ میں سے پانچ چھ چھوٹے چھوٹے چشمے نکلتے ہیں۔ کھجور کے چند درخت ہیں۔ یہاں وہاں کچھ پانی بھی دکھائی دیتا ہے۔ بس اس کو عمان والوں نے تفریح گاہ بنا دیا ہے۔ جتنے پانی کو دیکھ کر لوگ یہاں خوش ہوتے ہیں اتنا پانی تو نل کے پائپ لائن خراب ہونے کی صورت میں ہماری اکثر سڑکوں پہ بہتا رہتا ہے۔ بہرحال ہر ایک کے خوش ہونے کے الگ الگ طریقے ہیں۔ مسقط میں ہمیں اور بھی کئی حیدرآبادی ملے۔ مسقط ایرپورٹ پر ہمیں لینے کے لیے دو حیدرآبادی احباب ڈاکٹر عبدالحی اور ادریس مشہدی بھی آئے تھے۔ ڈاکٹر عبدالحی (جن کے یہاں یوسف ناظم مقیم تھے) کا شمار مسقط کے مشہور ڈاکٹروں میں ہوتا ہے ہر دم مریضوں کی خدمت میں لگے رہتے ہیں اور دوسری طرف (بعض بھی ان کی کچھ کم خدمت نہیں کرتے) ادریس مشہدی اصلاً حیدرآبادی ہیں مگر براہ بمبئی مسقط میں مقیم ہیں۔ حیدرآباد کے سارے فنکاروں، ادیبوں اور شاعروں کو جانتے ہیں ہمیں بتایا گیا ہے کہ مزاح نگاروں کی محفل میں شرکا کی ایک تہائی تعداد حیدرآبادیوں پر مشتمل تھی۔ ہماری دعا ہے کہ حیدرآبادی جہاں بھی رہیں خوش رہیں اور حیدرآباد کی یاد کو اپنے سینوں میں بسائے رکھیں۔ ■■

دلاور فگار

بجٹ اور جوتا

(ایک خبر کی سرخی ہے کہ بجٹ میں صرف جوتا سستا ہے اور ہر شے نسبتاً گراں ہے)

ایک جوتی خورخوش ہوکر یہ بولا لو میاں　　جوتا سستا ہے بجٹ میں اور ہر شے ہے گراں

ان بجٹ سازوں کو بھی اس بات کی تو ہے تمیز　　جس سے میں پٹتا ہوں سستے دام مل جائے وہ چیز

جوتا سستا ہے بجٹ میں یہ تو اچھائی ہوئی　　آں بجٹ سے ختم اپنی برہنہ پائی ہوئی

سستا جوتا لینا ہوگا اس کے جو امکان میں　　رات دن جوتا چلے گا قوم کے ایوان میں

سستے جوتے لے کے　　ہے بجٹ یہ جو نیا　　جوتیوں میں دال بٹنے کا زمانہ آگیا

کفش سازوں کو بہت اچھا لگے گا یہ بجٹ　　ان کی جوتی سے جو ہو جائے مری طلبی الٹ

جو ملا ہے یہ جو بیاں اک رہنما کا سارا ہے　　اس بجٹ کے پردہ میں پبلک کے جوتا مارا ہے

سستے جوتے کی خبر بھی جس کو گزری ناگوار　　ایسے جوتے والے کو تو نوک پہ جوتی کی لا مار

وجہ راحت ہم کو یہ جوتے کی ارزانی ہوئی　　جوتیاں چٹخاتے پھرنے کی تو آسانی ہوئی

جوتا سستا ہے تو سستی سے ڈرے گی پوری قوم　　جوتیاں توڑے گی اب محنت کرے گی پوری قوم

سستے جوتے سے نہیں ہوگا صنعت کا زیاں　　اے بجٹ ساز و مرے سر پہ تمھاری جوتیاں

سستا جوتا کام اس شوہر کے آئے گا مزید　　بیویوں سے جوتیاں کھا کر ہوا جو زن مرید

نکتہ چینی اس بجٹ پر مت کرو بے کار کی　　جوتیاں سمیت آنکھوں میں گھس جاؤ اس سرکار کی

بات یہ سچ کہہ گیا اک رائٹر اخبار کا　　یہ بجٹ ہے جوتیوں کا صدقہ اس سرکار کا

جوتیوں میں بیٹھنے والے بجٹ سے خوش نہیں　　اپنی بیٹھک کے لیے اب وہ جگہ ڈھونڈیں کہیں

سستے جوتے کے بجٹ سے جان آئی جان ہیں　　جوتا بیزار اب تو ہوگی قوم کے ایوان میں

ہاں جو مسجد میں نئے جوتے پہنے جاتے ہیں
سستے جوتے کی خبر کو سن کے وہ پچھتاتے ہیں

ڈاکٹر علیمہ فردوس
(بنگلور)

لو ہم بھی ڈاکٹر بن گئے

حضرات! دانش وروں نے کہا ہے کہ نام میں کیا رکھا ہے۔ اجی حضور آج کل نام میں ہی سب کچھ رکھا ہے۔ لوگ کام سے نہیں نام سے مشہور ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے والدین ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے بے معنی نام رکھتے ہیں جو کانوں کو بھلے لگیں اور بولنے میں آسان ہوں جیسے میناز، شبرین، زارا وغیرہ۔ یہی نہیں بلکہ بچوں کے اسکول کے معیار کے مطابق نام بھی بدل دیئے جاتے ہیں۔ اگر شہر کے معیاری اور Posh اسکول میں بچی داخل ہو جائے تو می ساراکو زارا بنا دیتی ہیں اور ہم جیسے اردو کی روٹی کھانے والے غریب استاد اردو کی حالت پر زار زار رونے لگتے ہیں۔

آج کل ناموں کے ساتھ ساتھ عرفیت میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ پہلے والدین بڑے چاؤ سے اپنے بچوں کو ننھے منّے لڈّو، پاشا، منّی، رانی کہا کرتے تھے اور اب والدین اپنی اکلوتی اولاد کو ایسی ایسی عرفیت دیتے ہیں جنہیں عرف عام کہا جاتا ہے عرفِ عام سے مراد یہ ہے کہ اولاد اور جانوروں کی عرفیت میں کوئی فرق نہ ہو) روزی، منی، ہیرا، جیکی، پنکی جیسی عرفیت اکثر غلط فہمی پیدا کرتی ہے۔ ہمارے بس اسٹاپ کی ساتھی روزانہ صاحبہ اپنے جیکی کی ناسازیٔ طبیعت کا ذکر کرتی تھیں۔ آخر کار ایک دن ہم نے یہ طے کیا کہ از راہِ ہمدردی گھر جاکر ان کے جیکی کی طبیعت کا حال دریافت کریں۔ گھر پہنچ کر عیادت کے لیے الفاظ سوچ ہی رہے تھے کہ سامنے ان کے بیٹے کے بجائے ایک خونخوار کتا دم ہلاتا ہوا آیا۔ ہم حیران! یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے اور وہ صاحبہ ہیں کہ اس کو چمکار رہی ہیں۔ بڑے پیار سے سہلا رہی ہیں۔ فون پر ڈاکٹر سے Appointment لے رہی ہیں۔ ہم کچھ کہے سنے بغیر بغل میں پرس دبائے اکھڑی اکھڑی سانسوں کے ساتھ گھر پہنچے۔

بعض عرفیتیں اچھی بھی لگتی ہیں۔ ہماری ایک سہیلی ہیں۔ ان کی بھانجی اپنی بیٹی کو پنکی بلاتی ہیں اس عرفیت کو سن کر مسرت کا احساس ہوا کہ یہ گلابی کا نعم البدل ہے۔ اس عرفیت کو سننے کے بعد کم از کم گلابوں بھری کیاری کا تصور تو آسکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے .... کوئی اپنے روئی کے سے گالوں والے بیٹے کو ملکی سمجھے۔ یہ ملکیت سے ملکی نہیں بلکہ یہ دودھیا کا مترادف ہے۔ بھلا ہو ہماری پڑوسن وداں بلی کا جس نے ان کے گھر دو ننھے ننھے بلّوں کو لاکر چھوڑا۔ اس میں ایک سفید اور ایک بھورا تھا۔ ہماری پڑوسن کو کچھ اور نہ سمجھائی

نہیں دیا تو انھوں نے ان پلّوں کو پنکی اور پکی بلانا شروع کردیا۔

حاجی اور ڈاکٹر جیسی عرفیت اب قدیم ہوچکی ہے۔ عہدِ ماضی میں لوگ اپنے گھر پیدا ہونے والے بچے کا عرف حاجی رکھتے تھے یا پھر بیٹا نکما ہوتا تو والدین دل کی تسلی کے لیے اسے ڈاکٹر کہتے اور وہ خوش نصیب تعلیم اور ڈگری کے بنا خاندان بھر میں ڈاکٹر مشہور ہوجاتا۔ صرف بیٹوں ہی کو اس عرفیت کا اعزاز حاصل تھا۔ ہم نے کسی نالائق بیٹی کو یوں ڈاکٹرنی بنتے ہوئے دیکھا نہ سُنا۔ بیٹیوں کے ساتھ یہ ناانصافی ہمیں بہت کھلتی تھی۔

اس لیے ہم نے یہ طے کرلیا تھا کہ ہر حال میں ڈاکٹر بنیں گے ہم ہنستے کھیلتے ہائی اسکول تک پہنچ گئے اور یہ تمیز بھی نہیں تھی کہ ڈاکٹر بننے کے لیے کون سے اختیاری مضامین ضروری ہیں۔ ہماری سہیلیوں نے امورِ خانہ داری سیکھنے کے لیے ہوم سائنس بطور اختیاری مضمون چنا (گو کہ پڑھنے سے ان امور پر عبور حاصل نہیں ہوتا) اور ہم نے بھی یہی مضمون اختیار کرلیا۔ جب کالج پہنچے تو مجبوراً سماجیات، سیاسیات اور ادب کو اپنانا پڑا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ جھینگروں اور چوہوں کی چیر پھاڑ سے اپنے دستِ نازک کو آلودہ کرنا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ ڈاکٹر بننے کا ارمان دل کا دل میں رہ گیا۔ کیا پتہ تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا۔ جب ہم دواؤں کے نہیں کتابوں کے ڈاکٹر بن جائیں گے اور ہمارے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا دم چھلا ہوگا۔

آج سماج میں ڈاکٹر بننا خود ایک وبا کی حیثیت اختیار کرگیا ہے۔ پہلے طالب علم اپنے رجحان اور شوق کے تحت ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اب سماج میں ناموری کے لیے اور والدین کی خواہش پر کئی نوجوان، ڈاکٹر بننے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ حقیقتاً اولاد کی نیندیں حرام کرنے کا حق والدین کو نہیں پہنچتا۔ ستم بالائے ستم اس قبیل کی اولاد ڈاکٹر بننے کے بعد اپنی اولاد کو بھی ڈاکٹر بنانا چاہتی ہے۔ اکثر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا۔ محققین نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ ڈاکٹر کا بیٹا ڈاکٹر نہیں بن سکتا۔ تحقیق کرنے کا چلن بہت پرانا ہے۔ البتہ اسے فن کی حیثیت چند صدیوں پہلے ملی ہے۔ بعض مسئلے آج بھی تحقیق طلب ہیں۔ آج تک کوئی محقق یہ ثابت نہ کرسکا کہ انڈا پہلے آیا یا مرغی پہلے آئی۔ ہم نہیں جانتے زندگی کے دوسرے شعبوں میں تحقیق مشکل ہے یا نہیں لیکن اس کا پتہ ضرور ہے کہ جامعات میں تحقیقی مقالے لکھنا بڑا آسان ہے۔ تحقیق کے اسی شوق کی وجہ سے ہمیں چند جامعات کا جغرافیہ اور اردو شعبوں کی تاریخ اور ادبی ماحول کو دیکھنے کی توفیق ہوئی کسی جگہ گائیڈ ہے تو شعبہ کارفرما نہیں اور کہیں "شعبہ" ہے تو گائیڈس میں چشمکیں ہیں۔ ہم بھلا دو مُلاؤں کے بیچ پھنس کر اپنی جان حلال کیوں کرواتے۔ اس شوق کو دل میں لیے جیتے رہے۔ آخرکار ایک ہندی کے پروفیسر نے ہمیں دعوت دی کہ ان کی نگرانی میں تحقیقی مقالہ لکھیں۔ انھوں نے ہماری مشکل آسان کرنے کے لیے کہا کہ پریم چند سے اچھا موضوع اور کیا ہوسکتا ہے۔ صرف نام رجسٹر کروا لیجیے باقی کام میں سنبھال لوں گا۔ گائیڈ کرنے میں مجھے مشکل ہوگی اور نہ لکھنے میں، آپ کو پریشانی۔ ہندی اور اردو میں لکھے گئے مواد کو اکٹھا کرکے مواد تیار کرنے والی بات ہمیں کچھ ہضم نہیں ہوئی۔ ہماری خاموشی دیکھ کر انھوں نے ایک پیار بھرا خط لکھا:

عزیزی شاگردہ

بعد التماس عارض ہے کہ اگر آپ مجھے گائیڈ بننے کا موقع عطا فرمایئے اور مجھے اس
قابل سمجھے تو آپ کا بڑا احسان ہوگا۔ اس سے نہ صرف میرا مالی فائدہ ہوگا بلکہ
سماج میں میری ساکھ بھی بڑھے گی۔ میں آپ سے عاجزانہ التماس کرتا ہوں کہ دل
وجان سے آپ میرا ساتھ دیں۔

آپ کا خادم

....

اس تحریر کے ہر ہر حرف پر خلوص کی مہر ثبت تھی لیکن املے اور قواعد کی غلطیوں کو دیکھ کر "ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے" والے معاملے کی بو آئی۔ بہتر یہ معلوم ہوا کہ طویل رخصت پر چلے جائیں کیوں کہ وقت کا حافظہ بڑا کمزور ہوتا ہے۔ ہم پورے طور پر مطمئن تھے کہ پروفیسر صاحب کے ذہن سے یہ بات جلد ہی اتر جائے گی اور ایسا ہی ہوا۔ جب ہم رخصت ختم کر کے لوٹے تو دیکھا کہ ہمارے پروفیسر صاحب نے اپنے جال میں ایک اور شکار کو پھانس لیا ہے۔

پروفیسر صاحب کو دنیا داری آتی تھی۔ انھوں نے ہمارے شعبے کی ایک جونیر لکچرر کو اپنی مٹھی میں لے کر ہم سے اچھا بدلہ لیا۔ نام رجسٹر ہوتے ہی وہ پڑھانے کی ذمہ داری سے آنکھیں چرانے لگیں اور اپنے گائیڈ کی خدمت میں جٹ گئیں۔ گائیڈ صاحب جب بھی ہمارے کالج آتے تو ان کی تعریفوں کے "ڈیم" اور برج (Dam Bridge) باندھے جاتے جو ہاوڑہ برج سے بھی بڑے ہوتے اور ان کی تعریفوں کو سن کر ہمارے دل پر سانپ لوٹ لوٹ جاتے۔ جیسے ہی ہمارے ساتھی کا رجسٹریشن ہوگیا۔ پروفیسر صاحب نے انھیں ڈاکٹر کہنا شروع کر دیا۔ ایک بار ہم نے دیکھا کہ وہ ٹیبل پر سر رکھے آرام سے سو رہی ہیں اور پروفیسر صاحب ہندی کی کتابوں سے کچھ مواد نقل کر رہے ہیں۔ ہم نے اپنے ساتھی کو جگانا چاہا تو پروفیسر صاحب نے بڑی محبت سے کہا:

سرہانے ڈاکٹر کے آہستہ بولو

ابھی ٹک پڑھتے پڑھتے سو گئی ہیں

ہم نے کہا آپ ان کی نازبرداریاں اٹھائیں ہم سے تو یہ نہیں ہوگا ...... یہ کہاں کا انصاف ہے وہ کمائی سرکار کی کھاتے ہیں اور گن آپ کے گاتی ہیں۔ آخر ہم اس بانسری کو توڑ کر رہیں گے جو آپ ایک دوسرے کے لیے بجا رہے ہیں۔ ویسے بانس بڑا مضبوط ہوتا ہے اور خاص کر تعریف اور خوشامد کی بانسری توڑنا ایک محتاط انسان کے لیے بہت مشکل کام ہے۔ تب ہم نے یہ سوچا کہ اب ان کا سر نیچا کرنے کے لیے ہمیں مقالہ لکھنا اور ڈاکٹر بننا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ ان تلخ تجربوں کے بعد ہمارا تحقیقی رجحان اور بڑھ گیا۔ ہم گئے اپنے استاذ محترم کے پاس لگے گڑگڑانے۔ حضرت اگر آپ ہمیں ڈاکٹر بننے کا موقع نہیں دیں گے تو ہم شعبے کے آگے دھرنا دے کر بیٹھ جائیں گے۔ اگر آپ اس پر بھی نہ مانیں تو ہم چلو بھر پانی میں ڈوب مر جائیں گے کیونکہ چلو بھر پانی میں مرنا اب "out of Date" ہو چکا ہے۔ پھر کیا تھا ہماری آنکھوں سے کاویری بہنا شروع ہو گئی (جس پر بہاؤ پر کسی ریاست کا دباؤ نہیں) ادھر ہمارا تکیہ بھیگتا گیا۔ آدھر ہماری حالت دیکھ کر استاذ محترم کا دل بھی پسیج گیا اور انھوں نے جھٹ سے فارم منگوایا اور ساری کارروائی گھنٹہ بھر میں مکمل کر دی۔ ہم خوشی خوشی گھر چلے آئے جیسے ہمیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل گئی ہو۔ دوسرے دن مسکراتے ہوئے کالج پہنچے تاکہ ہمارے ساتھی کو یہ مژدہ

سنائیں اور ان پر دھونس جمائیں اتنے میں وہ جونیئر لکچرر زار و قطار روتی ہوئی ہمارے سامنے آئیں اور بد دعا دینے لگیں کہ پروفیسر صاحب وظیفہ پر سبکدوش ہوتے ہی بوریا بستر باندھ کر رفو چکر ہو گئے۔ ہم نے انھیں تسلی دیتے ہوئے دبے دبے الفاظ میں کہا کہ غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے۔ ان کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر ہمارا دل کہہ رہا تھا:

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
آپ کو ڈاکٹر بننے پہ کتنا غرور تھا

خیر وہ آگے بڑھ کر ہم نے انھیں سمجھایا کہ صبر کرو۔ جلد ہی ہمارا مقالہ مکمل ہو جائے گا اور ہم ڈاکٹر بن جائیں گے۔ اس کے بعد سب سے پہلے تمھیں ڈگری دلوائیں گے (سنا ہے کہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری محنت سے نہیں ملتی۔ سفارش پہ دلوائی جاتی ہے اور محنتانہ دے کر لکھوائی بھی جاتی ہے) رات کی نیندیں حرام کر کے دن کا چین غارت کر کے ہم نے مقالہ مکمل کر لیا۔ خدا خدا کر کے ڈگری بھی مل گئی۔ پر ساتھیوں نے ہمارا خوب مذاق اڑایا اور کہا کہ مقالہ لکھنے کے لیے اس قدر محنت کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تو بچوں کا کھیل ہے۔ یہ تو بس چیونٹی نے تھوڑا دیا۔ منو نے تھوڑا دیا ہمارا پیٹ بھر گیا والا معاملہ ہے۔ واقعی یہ ترکیب سن کر ہم حیران رہ گئے۔ کاش کہ یہ نسخہ ہمیں پہلے معلوم ہوا ہوتا۔

ہماری محنت رائیگاں نہ گئی۔ اب ہم اپنے نام کے ساتھ "Dr" لکھ سکتے ہیں۔ ہمیں یہ حروف بہت عزیز ہیں مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ .... یہ حروف کس موقع پر استعمال کریں، کیوں کہ ہر وقت ہمیں اپنے ڈاکٹر ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ البتہ ہماری ماہانہ تنخواہ کی بل میں بڑے احتیاط سے نام کے ساتھ اس سابقے کو جوڑ دیتے ہیں اور سرکاری خزانہ سے جب ہمارے نام کا چیک آتا ہے تو ہمارے نام کے ساتھ ان دو ننھے منے حروف کو دیکھ کر اس قدر خوشی ہوتی ہے جو شاید مقالے کی اشاعت پر بھی نہ ہوگی۔

ماشاءاللہ آج ہم بھی دوسروں کو گائیڈ کرنے لگے ہیں۔ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتے (جو گائیڈس کی فطرت ثانیہ ہوتی ہے) حسب وعدہ ہم نے پہلا حق اپنے ساتھی کو دیا ہے۔

مقالہ لکھنے کی قابلیت ہو کہ نہ ہو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی pay - scale کے لیے ہر لکچرر کو یہ ہفت خواں طے کرنا پڑتا ہے۔ ہم نے مقالہ نگاروں کی سہولت کے لیے ایسے ایسے عنوان منتخب کیے ہیں جس میں ہینگ اور پھٹکری لگے بغیر رنگ چوکھا آتا ہے۔ ان عنوانات کو دیکھ کر آپ کا دل بھی للچائے گا۔ بر بنائے رفاہِ عام دو عنوان درج ذیل ہیں:

لکھنؤ کی شاعری کا سماجی پس منظر

پہلا باب: شاعری اور سماج کا رشتہ (مختلف تنقیدی مضامین سے اقتباسات کی نقل)
دوسرا باب: لکھنؤ کا سماجی پس منظر (نوابین کا شوق، مشاعروں، مسخروں اور بھانڈوں کے مظاہرے)
تیسرا باب: لکھنؤ کی شاعری میں چولی کا تصور (فلمستانی چولی سے مقابلہ)
چوتھا باب: لکھنؤ کی شاعری میں سولہ سنگھار کی اہمیت (سولہ سنگھار اور بیوٹی پارلر کا مقابلہ)
پانچواں باب: جاروں ابواب کی روشنی میں لکھنؤ شاعری کی اہمیت)

ساحر اور سمیر کی شاعری کا تقابلی مطالعہ

پہلا باب : ساحر اور سمیر کے حالاتِ زندگی۔

دوسرا باب : شاعری کی ابتدا اور بمبئی کا ماحول

تیسرا باب : فلمی شاعری پر ساحر اور سمیر کے احسانات

چوتھا باب : ساحر کے نغموں اور سمیر کے بے تکے بولوں کا اسلوبیاتی مطالعہ۔

پانچواں باب : موجودہ سماج پر ساحر اور سمیر کی شاعری کے اثرات۔

ایسے اور بھی عنوانات ہمارے ذہن میں ہیں مگر یونیورسٹی سے صرف دو حضرات کی نگرانی کی اجازت ملی ہے۔ آپ چاہیں تو ہم آپ کی بھی سفارش کرسکتے ہیں کیوں کہ

صلائے عام ہے۔ ....

وجاہت علی سندیلوی

بات سماجی سطح کی

اتوار کا دن تھا، آتما رام ... سویرے ہی سویرے میرے فلیٹ پر آپہنچا اور اپنی عادت کے بموجب کال بیل کو نظر انداز کرتے ہوئے دروازے پر "شبن میاں" "شبن میاں" کے نعرے لگانے لگا۔

شبن میاں میرے بہت بچپن کی عرفیت تھی اور اب اتنی غیر معروف ہو چکی تھی کہ مجھے بھی مشکل سے یاد آتی لیکن نہیں معلوم کیوں آتما رام نے اسے کسی کیل کی طرح اپنے حافظے میں ٹھونک رکھا تھا اور مجھے ہمیشہ صرف اسی نام سے پکارتا۔

درمیان کے کئی دروازے بند ہونے کی وجہ سے اس کے نعرے مجھ تک تو نہیں پہنچے البتہ ان سے پاس پڑوس کے فلیٹ والے جاگ اٹھے اور ناک بھویں چڑھانے کے علاوہ میرے خاندان والوں اور میرے دوست احباب کے متعلق کافی ناخوش گوار خیالات کا اظہار کیا۔

ہماری داہنی جانب کی پڑوسن مسز شرما، ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج مسٹر شرما کی نصف بہتر نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"ان کے یہاں اسی قسم کے اجڈ اور گنوار لوگ آیا کرتے ہیں۔ آفیسر ہونے سے کیریکٹر تو جاتا نہیں۔ انھیں کیا پتا کلچر اور ایٹی کیٹ کس چڑیا کا نام ہوتا ہے"

ہمارے بائیں جانب کے پڑوسی منشی عبدالغفور پوسٹ ماسٹر جو اپنے فلیٹ کے سامنے چہل قدمی کرنے کے ساتھ ہی کوئی وظیفہ بھی پڑھ رہے تھے انھوں نے آتما رام کو ہاتھ کے اشارے سے کال بیل کا بٹن دبانے کا مشورہ دیا۔ آتما رام کے پلے اس کا صحیح مفہوم تو آیا نہیں لیکن یہ سمجھ کر کہ کسی چیز کو دبانے کے لیے کہہ رہے ہیں، اس نے میرے فلیٹ کے دروازے پر اپنی بیڑی رگڑ کر بجھا دی۔ اور پھر اس کے بعد بھی جب منشی عبدالغفور کو بدستور وہی اشارے کرتے دیکھا تو یہ سوچتے ہوئے کہ شاید سینما ہال کی طرح یہاں آفیسرز کالونی میں بھی بیڑی پینا جرم ہے۔ اس نے تلافی کے طور پر اپنی بیڑی کی لاش اٹھا کر میرے ساڑھے سات

قدم کے طلان کو ملے کر کے باہر سڑک پر ایسے جھٹکے سے کہ منشی جی گواہ رہیں، پھینک دی۔ منشی جی غالباً لاحول ولا قوت بڑبڑاتے ہوئے اپنے فلیٹ میں چلے گئے۔ اور آتما رام ان کی پسپائی کے بعد پھر شبن میاں "شبن میاں" کی بانگیں لگانے لگا۔

میرے سامنے والے فلیٹ میں گرجا شنکر اکسائز کمشنر رہتے اور غالباً اپنے محکمے کے تعلق سے شاعری میں بھی کچھ دخل درمعقولات رکھتے۔ ان کی سمع خراشی کام آگئی اور انھوں نے مجھے فون کیا۔" بھائی ایک صاحب غالب کے اس مصرع کی تفسیر بنے ہوئے :

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے۔

ساری کالونی کو شبن میاں، شبن میاں کی بے ہنگم صداؤں سے بہرا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ آخر شبن میاں ہیں کون ذات شریف ؟ آپ کا خانساماں بھی کیف جلدی سے دروازہ کھلوا کر ان صاحب کو جن کے حلق میں کسی کتے کا گلا اترا ہوا ہے۔ اگر بندِ غم سے نہ سہی تو پھر قیدِ حیات ہی سے نجات دلوائیے۔"

ہم ٹیلی فون کا ریسیور رکھ کر کئی دروازے کھولتے ہوئے باہر پہنچے تو، ملیشیا کے تازہ استری کیے ہوئے سفاری سوٹ میں ملبوس آتما رام کو مسکراتے ہوئے پایا۔ اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ایک چھوٹا ڈبہ تھا اور اس نے مجھے دیکھتے ہی شکایت کی "خوب گھوڑے بیچ کر سوتے ہیں آپ ؟ یہاں چیختے چیختے گلا بیٹھ گیا ہے۔"

" اور یہ کال بیل کیوں نہیں بجائی تم نے ؟" میں نے پوچھا۔

میں نے سوچا کر آپ کو اتنے سویرے ڈسٹرب کون کرے ؟ اور لیجیے اس ڈبے میں گرم گرم جلیبیاں ابھی تلوا کر لایا ہوں بچوں کو جا کر فوراً دے دیجیے، ورنہ یہ بھی ماسٹر پیارے لال کا کدو ہو جائیں گی۔"

اور پھر آدھ گھنٹے تک میرے ڈرائنگ روم میں میرا بچپن لوٹ آیا۔ ناشتے اور چائے کے درمیان آتما رام اور میں اپنی پچھلی شرارتوں اور حماقتوں پر دل کھول کر ہنستے رہے اور جب اس نے ماسٹر پیارے لال کا ایک واقعہ اپنے مخصوص انداز میں بیان کرنا شروع کیا تو میرے ہاتھ سے چائے کی پیالی کئی مرتبہ چھوٹتے چھوٹتے بچی۔

" آئیں وہ گھانسی رام نہیں تھا، حقے کی طرح ٹیڑھا، جس کا کھیت تالاب کے کنارے اسکول کے راستے میں پڑتا۔ وہ کچھ سٹھیا گیا تھا اور اکثر جھوٹ موٹ واویلا مچایا کرتا کہ اسکول کے لڑکے میرا نقصان کرتے ہیں۔ ایک روز اسے سبق پڑھانے کی نیت سے منھ اندھیرے میں شاکر اور بسنت اس کے کھیت پر پہنچے، اور تین کدو توڑ کر جھولوں میں رکھ لیے، خیال تھا کہ ان کو لے جا کر اسکول کی فیلڈ میں پھینک دیں گے اور پھر انجان بن کر ان کے متعلق ماسٹروں اور لڑکوں کی چہ میگوئیاں سنیں گے۔

تالے والی گلی تک پہنچے تھے کہ دیکھا ماسٹر پیارے لال اپنے گھر سے نکل رہے تھے، جان ہی تو نکل گئی کہ اگر انھوں نے ہم لوگوں کو مال مسروقہ کے ساتھ پکڑ لیا تو مارے جانے کے علاوہ سارے اسکول کے سامنے مرغا بھی بنائے جائیں گے۔ ہم لوگ پلیا کے پیچھے دبک گئے لیکن پیارے لال جی اپنی چھڑی کو چرخے کی طرح گھماتے ٹیوشن پڑھانے دوسری طرف مڑ گئے۔

جان میں جان آئی تو ہمیں ایک دوسری شرارت سوجھی۔ جا کر تینوں کدو پیارے لال جی کے بوٹے میں رکھ دیئے اور بسنت نے پکار کر کہا "ماسٹر صاحب کے لیے ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنے کھیت کے کدو بھیجے ہیں" اور پھر ہم لوگ سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

آتما رام نے چائے کا ایک بڑا سا گھونٹ پی کر پُرلطف ڈرامائی انداز میں اپنی داستان جاری رکھی اس روز پیارے لال جی مارے خوشی کے پھولے نہ سماتے۔ گھر سے اسکول جاتے ہوئے انھوں نے بچاس راہ چلتوں اور خصوصاً جلانے کے لیے اپنے ساتھی ٹیچروں کو بڑے فخر کے ساتھ یہ خبر سنا ڈالی کہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے آج ان کو تحفے میں تین کدو بھیجے اور ساتھ ہی ساتھ یہ تبصرہ بھی لگاتے جاتے۔ "انگلش کا ٹیچر بھلی نا؟ اور آپ جانتے کہ انگلش از دی موسٹ ڈفیکلٹ سبجکٹ!" جھومتے جھامتے وہ اسکول پہنچے تو دندناتے سیدھے ہیڈ ماسٹر کے دفتر میں "مے آئی کم اِن سر۔ یس سر گڈ مارننگ سر" کہتے ہوئے گھس گئے۔ انھیں کیا خبر تھی کہ گھاسی رام اپنے کدوؤں کا دکھڑا ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھر جا کر سویرے ہی رو آیا تھا اور وہ غصے میں بھرے بیٹھے تھے۔ پیارے لال نے جاتے ہی اپنی گوراشاہی انگریزی فل اسپیڈ سے چھوڑ دی۔

"سر آپ کا بہت بہت تھینک یو! آپ کے پریزنٹ کیے ہوئے کدو ایکسٹرا آرڈنری مزیدار، میرا مطلب ٹیسٹ فل یعنی ڈیلی شش تھے۔ میں آدھے کدو کی بھجیا تو ابھی لنچ یعنی آئی ایم سوری، بریک فاسٹ میں کھا کر ہی ہاں آ رہا ہوں آئی تھنک اِٹ جسٹ ناؤ۔"

جوگندر پال سنگھ ہیڈ ماسٹر کا شیر جیسا چہرہ مارے غصے کے تمتما اٹھا اور وہ دھاڑتے ہوئے چیخے۔

"نان سنس! میں نے آپ کو کدو پریزنٹ کیے؟ آپ مجھے بدنام کرنا چاہتے ہیں! میں ابھی آپ کے خلاف منیجر کو رپورٹ بھیج رہا ہوں۔"

"نو سر، یس سر، نو نو سر سر" پیارے لال ہکلانے لگے۔ وہ ہیڈ ماسٹر سے بہت ڈرتے اور آج محض کدوؤں کے بل بوتے پر وہ ان سے اس طرح براہ راست گفتگو کرنے آئے تھے۔ ڈرتے کانپتے انھوں نے بات کا رخ پلٹنا چاہا۔ "سر میں نے ہاف کی بھجیا کھائی ہے اور شام کو میری مسز ریمیننگ ہاف کو چنے کی دال میں گھونٹ کر پکائیں گی۔" ہیڈ ماسٹر کے چہرے پر انھوں نے غیظ و غضب کی بجلیاں لہراتی دیکھیں تو ان کے اور بھی ہوش اڑ گئے اور منہ سے بے ساختہ نکل گیا "سر وڈیو کائنڈلی لائیک ٹو ٹیسٹ اِٹ!"

"شٹ اپ" ہیڈ ماسٹر صاحب تلملاتے ہوئے چیخے "آپ کیا بکواس کرتے ہیں۔ میں چوری کا کدو کھاؤں، شیم فل، جائیے گھاسی رام کو اس کے کدو فوراً واپس کیجیے۔"

پیارے لال فوراً اسٹ پٹا کر جانے کے لیے مڑے، لیکن دروازے کے پاس پہنچ کر ان کے پیٹ کے کدو نے انھیں پھر ورغلایا اور انھوں نے پلٹ کر پوچھا۔ "اینڈ سر واٹ اباؤٹ ہاف جو میں کھا چکا ہوں۔"

"اس کے آپ گھاسی رام کو دام دیجیے۔ فوراً، ابھی، اسی وقت۔" ہیڈ ماسٹر گرجے۔

آتما رام تھوڑی دیر اور ایسی ہی باتیں کر کے چلا گیا تو مجھے محسوس ہوا کہ جیسے اپنے ساتھ میرا بچپن بھی سمیٹ لے گیا وہ میرا بچپن کا دوست، ساتھی اور پڑوسی تھا۔ مولوی صاحب کے مکتب سے لے کر ہائی اسکول تک وہ میرے ساتھ پڑھا تھا۔ میں نے قصبے کی گلیوں میں اس کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلا تھا۔ پتنگ لڑائے تھے۔ ڈنمو

ی طرح ایک دوسرے سے مارپیٹ کی تھی اور بھائیوں کی طرح ٹوٹ کر محبت بھی۔

مجھے عرصے سے اس کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ میرا بہ حیثیت اڈیشنل جج مین پوری تبادلہ ہوا تو پتا چلا کہ وہ بھی وطن کو خیر باد کہہ کر یہیں ایک کباڑی کی دکان کھولے ہوئے ہے۔ وہ مجھے پہلی بار جب ملنے آیا تو مجھے ایسا لگا جیسے میرا وطن میرا بچپن لے کر میرے پاس آ گیا ہو۔ اور پھر وہ میرے ہی کہنے پر اکثر میرے یہاں آنے لگا۔

آتما رام کے جانے کے بعد میں گھر میں داخل ہوا تو میں نے سنسان صحن ہی سے بارود کی بو سونگھ لی بیگم مسز بھاشکر کے یہاں مسز شرما کے ساتھ کسی تقریب میں جانے کی تیاریاں کرنے کے ساتھ ساتھ میرے خلاف بری طرح بھری بیٹھی تھیں۔ یہ آپ بھی اپنا خوب تماشا بنواتے ہیں اور آپ کی وجہ سے ناحق مجھے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ آتما رام کے ساتھ آپ ڈرائنگ روم میں کیسے بھیانک قہقہے لگا رہے تھے اور میں اس بدتمیز کو کیا کہوں، وہ تو ہے ہی موا کباڑیا۔ ساری کالونی میں اپنی چیخ پکار سے آج سات ہی بجے سویرا کر دیا۔ پاس پڑوس کے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم کسی غریب گھر کے یا نیچی ذات کے لوگ ہیں۔ تبھی تو ایسے لوگ ہم سے ملنے آتے ہیں۔ لوگ اپنے ملنے والوں ہی سے تو پہچانے جاتے ہیں۔

آپ کو اپنے سوشیل سٹیٹس کی کوئی فکر نہیں تو کم سے کم کچھ میرا تو خیال کیجیے دیکھیے آج مسز بھاشکر کے یہاں بند بند کیا کچھ سننے کو ملے گا؟"

اب میں آتما رام سے چھپ کر ملتا۔ رات کو جب کلب سے لوٹتا تو اس کی دکان کے سامنے سنسان سڑک پر تھوڑی دیر کے لیے اپنی موٹر سائیکل روک کر اس سے ادھر اُدھر کی باتیں کر لیتا۔

ایک روز وہ مجھ سے کہنے لگا۔ "شبن میاں! آپ ایک موٹر کیوں نہیں رکھتے؟ دیکھیے میں آپ کے لیے موٹر بنانے کے لیے کئی مہینوں سے پارٹس جمع کر رہا ہوں۔ باڈی بھی مل گئی ہے اور انجن بھی۔ تھوڑی ہی سی کسر باقی ہے۔ پھر دیکھیے گا تماشا۔"

"میرے پاس موٹر نہ ہونے سے تیرے پیٹ میں کیوں درد ہوتا ہے؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"بتا دوں؟" کہہ کر کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر سنجیدگی سے بولا۔ "آپ کی موٹر سائیکل کی آواز سن کر جب میری دکان میں بیٹھے لوگ کہتے ہیں، جا تماشا دیکھ، چھٹ بھیا مجسٹریٹ آ گیا۔ دوستی بھی کی تو کس سے۔ ارے تیری دکان کے سامنے ایک چمچاتی کار تو آ کر رکتی! لیکن مجھے تو اپنے سوشیل اسٹیٹس کی کوئی فکر ہی نہیں تو مجھے بہت برا لگتا ہے۔

فیروز حیدر
(حیدرآباد)

ردّی نامہ

یقین کیجیے کہ نہ تو ہم ردّی فروش ہیں اور نہ ہی پیشہ ور شاعر۔ ردّی سے ہمارا تعلق اتنا ہی ہے جتنا کہ اکثر شعرا کا ہے۔ ہم بھی ردی کو وقت ضرورت بھوک پیاس کا لڈو سمجھ کر اس پر نظر رکھتے ہیں۔

کاغذ کا المیہ ردّی ہے گو کہ کاغذ پیدائشی مذکر ہے لیکن ردّی کا خطاب پاتے ہی اس کی جنس بدل جاتی ہے۔ بغیر کسی آپریشن کے تبدیلیٔ جنس کے معمہ کو حل کرنے کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ قواعد کی رو سے تذکیر و تانیث کے قاعدے، لوازمات سے کما حقہٗ واقفیت حاصل کرلی جائے۔

ہمارے دوست مرزا کے خیال میں اگر کاغذ نہ ہوتا تو مرزا پکے جاہل ہی رہ جاتے۔ کیونکہ انہیں چڑوں اور پتوں پر لکھنا بالکل نہیں آتا۔ مرزا کاغذ کی افادیت کے قائل ضرور ہیں۔ لیکن کبھی یہ بھی کہتے ہیں کہ کاش کاغذ کی ایجاد ہی نہ ہوتی کیونکہ جب کاغذ نہ ہوتا تو سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی حکایتوں کا سلسلہ آج بھی جاری رہتا اور اس صورت میں انسانی ذہنوں میں نفرت اور تعصب کا وہ زہر تو نہ پھیلتا جو آج کاغذ کے ذریعہ پھیل رہا ہے بلکہ چند خاندانی اور سیاسی سینوں میں ہی دفن رہتا۔

مرزا کاغذ کو اس وقت ایک بے ضرر اشیا میں ہی شمار کرتے رہے۔ جب تک انھیں "لفافہ بم" کی ہلاکت انگیزی کا یقین نہ ہوگیا۔ اس کے بعد مرزا نے لفافوں کا استعمال ہی احتجاجاً بلکہ احتیاطاً ترک کردیا۔ اور پوسٹ کارڈ کا بے جا استعمال کرنے لگے۔ سننے میں یہ بھی آیا کہ اپنا اکلوتا معاشقہ بھی پوسٹ کارڈ کے ذریعہ جاری رکھا اور آخر میں ڈاکیہ کو رقیب بنا کر پوسٹ کارڈ کا استعمال بھی ترک کردیا۔

مرزا کا خیال ہے کہ انسان اور کاغذ میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ ایک عقل سے کورا ہوتا ہے اور دوسرا ذات سے کورا کاغذ کارہ۔ دونوں کی قدر اس وقت تک ہے جب تک کوراپن اور کرارہ پن برقرار ہے ورنہ دونوں ہی زندگی کے آخری حصّہ میں ردّی میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔

ردّی کی تعریف کے لیے ضروری ہے کہ کاغذ کی برائیاں کی جائیں۔ ویسے بھی یہ انسانی فطرت ہے کہ ایک کی تعریف کرتے، وقت دوسرے کی برائی کی جائے۔

ردّی ایک صفت ہے یا ایسا وصف ہے جس کی وجہ سے موصوف کو نکما ناکارہ اور بے مصرف سمجھا

جاتا ہے۔ تحقیر اور بے وقعتی اس کا نصیب۔ اور گھر کا کوئی غیر اہم گوشہ اس کا مقدر بن جاتے ہیں۔ بقول مرزا، انسانوں میں جو حالت بے کار گھر داماد کی یا کبھی نااہل ریٹائرڈ شخص کی ہوتی ہے۔ وہ ردّی حالت کہلاتی ہے۔

ایک روز مرزا کسی دوست کے گھر بیٹھے ہوئے تھے جو ملازمت سے ریٹائر ہو کر گھر کی ردی میں اضافہ کر چکے تھے۔ اچانک ایک چھوٹا لڑکا گھبرایا ہوا آیا اور کہنے لگا "دادا جان۔ آپ کہیں چھپ جائیے۔ ردّی والا آیا ہے۔ کل ممی کہہ رہی تھیں کہ آپ کی حالت بالکل ردی ہو گئی ہے۔

ویسے یہ بات ابھی تصفیہ طلب ہے کہ انسان ردّی ہونے پر ریٹائر کیا جاتا ہے یا ریٹائر ہونے پر ردی میں شمار کیا جاتا ہے۔ خیر بات ہو رہی تھی کاغذی ردّی کی۔ اس بات کا ہمیں مرزا ہی سے پتہ چلا کہ ردی کچرے سے نہ صرف مختلف بلکہ ممتاز ہوتی ہے کیونکہ ردی سے کبھی تعفن نہیں اٹھتا۔ چاہے اس میں کتنا ہی گندہ ادبی و غیر ادبی مواد کیوں نہ ہو۔

ردّی کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ جیسے گھریلو ردّی، دفتری ردی، سرکاری، غیر سرکاری ردی وغیرہ۔

گھریلو ردی عموماً معیاری سمجھی جاتی ہے۔ معیاری سے مراد کاغذ کی عمدگی نہیں بلکہ معیاری ردّی ان مجموعۂ اوراق کو کہتے ہیں جس کو دیکھنے سے صاحبِ ردّی کی معاشی حالت اور ان کے بچوں کا تعلیمی معیار ظاہر ہوتا ہے۔ مرزا کی نصیحت کے مطابق گھریلو ردی کبھی محلّے کے ردّی فروش کو نہیں بیچنی چاہیے۔ اس کے خریدار خود گھر تک پہنچ جاتے ہیں جو اکثر اپنے بیٹھے ہوئے گلے سے ترنم میں یہ کہتے ہوئے پھرتے ہیں۔

خالی ڈبے۔ . . . خالی بوتل . . . . . . اور پے پار۔

جن کی آواز ٹھیک ہوتی ہے وہ تحت اللفظ میں paper کے حروف میں 'ع' کی ملاوٹ کر کے پے پعار۔ پے پعار کی گردان کرتے ہیں

اس ردّی نواز طبقہ کی دو خاصیتیں ہیں۔ اول یہ کہ ان کا ترازو کسی طرح ترازو کہلانے کے لائق نہیں ہوتا۔ دوم یہ کہ ان کے ذہنوں میں لسانی تعصب کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔

کم بخت اردو اخبارات کی ردّی کو ہمیشہ حقارت سے دیکھتے ہیں اور بہت ہی کم قیمت پر خریدتے ہیں۔ مرزا کے خیال میں اردو کی بڑھتی ہوئی ناخواندگی کے پس پردہ اردو کی ردّی قسمت کے ساتھ اردو کی ردی قیمت کا بھی دخل ضرور ہے۔

ہمارے ملک میں اخبار پڑھنے کے علاوہ اس سے دوسرے بہت سے کام لیے جاتے ہیں، جیسے گرمیوں میں پنکھا جھلنا، برسات میں مکھیاں اڑانا بلکہ بعض لوگ اخبار سے تولیہ کا کام لینے کی کوشش میں اپنا منہ کالا کر بیٹھے ہیں۔ بنگلور کی ہوٹلوں میں تو اسے بطور نیپکن گاہکوں کو فراہم کیا جاتا ہے۔ ادب کو اوڑھنا بچھونا بنانے کے بارے میں ہمیں صرف اتنا علم ہے کہ بعض نامور ادیب پتہ نہیں کن مجبوریوں کے تحت ایسا کرنے پر مجبور تھے۔ لیکن اخبار کو بچھونا بنانے کا علم ہمیں منور رانا کی زبانی ہوا۔ کہتے ہیں:

فٹ پاتھ پہ سو جاتے ہیں اخبار بچھا کر
مزدور کبھی نیند کی گولی نہیں کھاتے

مرزا کے خیال میں یہ شعر ضرر رساں حد تک مبہم ہیں کیوں کہ شاعر محترم نے اس بات کی وضاحت نہیں

کی کہ فٹ پاتھ سے مراد کس شہر کے فٹ پاتھ ہیں کیوں کہ ہمارے شہر کے فٹ پاتھ پر تو چلنا بھی ممکن نہیں سونا تو در کنار۔

دوسری بات شاعر نے یہ بھی واضح نہ کی کہ سونے کے لیے کون سے اخبار مفید ہیں اور اخبار کو لڈے کے نیچے بچھانا چاہیے یا گدے کے اوپر مرزا کو اس بات کا خدشہ ہے کہ کوئی "انقلاب" کی چادر پر ٹائمس آف انڈیا کا تکیہ لیے "ہندو" کو اوڑھے اور بیدار ہوتے ہی "سیاست" میں داخل ہو کر رہنمائے دکن بننے کی کوشش نہ کرے۔

بقول مرزا آجکے اردو اخباروں کی ردی چند بوسیدہ صفحات پر چھپے ہوئے انگریزی فلموں کے نیم عریاں تصاویر کے علاوہ یونانی ادویات کے ایسے پختہ اشتہارات پر مشتمل ہوتی ہے۔ جن کو ہتحل سے پڑھنے والا کمزور قاری ان اشتہاری دواؤں کا ہی مریض بن جائے اور کہتا پھرے کہ

اشتہاروں نے نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

ایک روز اخباروں کی کیفیت پر تبصرہ کرتے ہوئے مرزا نے فرمایا کہ روز روز یکساں خبریں اور یکساں عریانیت والے اشتہارات سے پتہ نہیں چلتا کہ یہ آج کا اخبار نہیں ہے۔ ہم نے کہا مرزا اخبار کے تازہ اور باسی ہونے کی پہچان انتقال پر ملال کی تصویروں سے بآسانی ہو سکتی ہے۔

مرزا نے کہا ان تصویروں میں بھی کچھ یکسانیت ہوتی ہے کیونکہ اکثر مرحومین کی تصویریں بھی کتابوں کے سرورق پر چھپی ہوئی ادیبوں اور شاعروں کی تصویروں کی طرح جوانی کی ہوتی ہیں۔

ہم نے کہا ادیبوں کا ذکر چھوڑیے تصویر کا انتخاب تو مرحوم کے بس میں نہیں ہوتا۔۔۔ مرزا جھک کر ہمارے کان میں بولے عقل مندوں کو اشارہ کافی۔ بعض تجربہ کار مرد مرحوم کی تصویر سے بیوہ کی عمر کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔

راستے پر بکھری ہوئی کاغذی اور انسانی ردی سے بہتر اور خوش نصیب ہوتی ہے؟ دفتری ردی۔ سر پر میز کا سایہ رہنے کو ردی دان۔ ایک روز مرزا کی زبانی ہی پتہ چلا کہ کسی سرکاری دفتر میں ایک رشوت خور کلرک صرف اس بات پر پکڑا گیا کہ اس کے ردی دان سے ڈھیر ساری امپورٹیڈ سگریٹ کی خالی ڈبیوں کے علاوہ کسی ڈائری کے چند پھٹے ہوئے صفحے بھی برآمد ہوئے۔ جس پر درج ناموں کے مقابل حاصل شدہ رقم بھی لکھی ہوئی تھی۔

اور ایک روز ہم نے اپنے ماتحتین کے ردی دانوں کا مطالعہ کرنے کی ٹھانی۔ تب ہمیں پتہ چلا کہ ٹائپسٹ جمیلہ کے ڈھکن والے ردی دان میں وہی اچار و چٹنی کی بو بس گئی تھی جو وہ سب کی نظریں بچا کر اکیلے میں تیزی سے کھا لیتی ہے مگر مسکراہٹ تازہ کیک پیسٹری کی بکھیرتی ہے۔

یہ بھی پتہ چلا کہ شرما جی اپنی بیٹی کے جہیز کی فکر میں روز بغیر فلٹر والی سگریٹ کی چار چار ڈبیاں پھونک جاتے ہیں اور ان کی الارم جیسی کھانسی کا راز سگریٹ میں نہیں بلکہ دواؤں کی ان چٹھیوں میں بھی چھپا تھا جو وہ ردی دان میں پھینک ڈالتے تھے۔

یہ دیکھنے کے بعد ہمیں کچھ اور دیکھنے کی طاقت نہ رہی اور ہم نے ردی دان کو ہاتھ لگانا ہی چھوڑ دیا●

محمد فاروق نشتر (میسور)

جوتے کے فراق میں

نمازِ عصر سے فارغ ہوکر ہم مسجد کے اُس گوشہ میں گئے جہاں ہمارے جوتوں کو ہماری واپسی کا شدت سے انتظار تھا۔ مگر افسوس اس انتظار کے بطن سے دائمی جدائی کا صدمہ پیدا ہوگیا۔ چار برس کی مسلسل رفاقت کے بعد جوتا ہمارے ہاتھوں بلکہ پیروں سے نکل گیا تھا۔ جس محفوظ گوشۂ عافیت میں ہم نے اُسے جوتا چور بے نمازیوں کی نظروں سے بچا رکھا تھا، وہاں ہاتھ ڈالا تو ہاتھ پُرامید داخل ہوا اور بے نیلِ مرام لوٹ آیا۔ جوتے کے بجائے مسجد کی ایک بوسیدہ جھاڑو ہاتھ لگی، جو کسی قیمت پر بھی جوتے کے فرائض پورا نہیں کرسکتی تھی۔ جھاڑو کو اس گوشہ میں رکھ کر میت کو غسل دینے والے تختہ سے ڈھانپا گیا تھا۔ جو دیوار اور فرش کے درمیان اتنا خلا پیدا کردیتا تھا کہ ہم جیسے لالچی نمازی اپنی نمازوں میں خشوع وخضوع "ڈالنے" کے لیے اس تختے کی آڑ میں جوتے محفوظ کرلیا کرتے تھے تاکہ جوتوں کے تحفظ کا خیال نماز کو نہ لے ڈوبے۔

جوتے کی جدائی نے ہمارا سارا قرار چھین لیا۔ عقل و خرد نے رشوت خور سرکاری ملازمین کی خصلت اپنالی یعنی کام کرنا چھوڑدیا۔

خود بہ خود برہم نظامِ دانش و دل ہوگیا

تصورات کی پرچھائیاں گمان کے کانٹوں میں اُلجھ بغیر یقین سے دامن گیر ہوگئیں۔ عموماً ہندوستانیوں کو حقوق کی ادائیگی کا خیال اُس وقت آتا ہے جب حقدار داغِ مفارقت دے جاتا ہے۔ آخر ہم بھی ایک سچے دیش بھگت تھے۔ آج صبح ہی دل ہی دل میں اپنے مفرور جوتوں سے وعدہ کررکھا تھا کہ نمازِ عصر کے فوری بعد ان کے وہ ٹانکے لگوالیں گے جو کارپوریشن کا ستم اور ہمارے نصیب کی ٹھوکریں سہہ کر نامُراد عاشق کے دل کی طرح ٹوٹ گئے تھے۔ مہینوں سے جوتوں نے پالش کا منہ نہیں دیکھا تھا، کبھی کبھی پندرہ برس پرانے "تقریباً" گنجے برش کو دھول صاف کرنے کی زحمت دیتے تو روندے ہوئے جوتے رگڑ سے پیدا ہونے والے جرکوں کو بڑے صبر سے سہہ لیتے۔ وہ تو اچھا ہوا جوتے تھے جو ہماری بے اعتنائی کو درگزر کرتے رہے۔ بیوی ہوتے تو اُسی کی زبان بن کر مل جاتے اتنے بدرنگ ہوگئے تھے کہ کسی میک اپ زدہ میم کا میک اپ سے عاری چہرہ کیا ہوگا۔ ایک وقت وہ آیا کہ اِن کی بدرنگی ہمارے لیے عار ہوگئی۔ یہ کہنا دشوار تھا کہ وہ کبھی سیاہ بھی تھے۔ سُنا ہے سیاہ رنگ کسی اور رنگ کا محتاج نہیں ہوتا مگر یہ ہوگئے تھے امریکن سیاہ فاموں کے قبیل کے معلوم ہوتے گرگٹ کی طرح رنگ یا فلمی اداکاروں کی طرح چولا بدلنے میں یکتا ہوگئے تھے۔ بالفرضِ محال ناگہانی

برسات سے ۔۔ الجھ پڑجاتا اور "جوتے بچاؤ" ہم کودتے پھاندتے ناکام ہوجاتی تو برسات کے چھینٹوں سے چیچک نکل آتی ۔ اس صورت میں بھی خوب صورت نظر آتے۔

عموماً موسم بہار میں ہم انہیں آفتِ چیچک سے بچانے کی خاطر کسی سایہ میں آسرا لے کر برسات کے کم ہونے کا انتظار کرتے اور امید پر یقین کا گمان لگتے ہی راستوں پر دانستہ بنائے ہوئے مین ہولوں اور نادانستہ نکل آئے گڑھوں سے بچتے بچاتے پھونک پھونک کر قدم یعنی جوتے رکھتے ہوئے منزلِ مقصود تک پہنچتے۔ اس کوشش میں کہیں بُرا مُید بصارت غوطہ کھا جاتی تو ایک جوتا غلاظت سے اَٹے ہوئے پانی میں مرغِ زندگی پاکر لوٹتا تو اپنا حلیہ ہوتا کہ سرکاری بدوا خانوں میں مُفت فراہم ہوتی ہوئی چپاتیاں یاد آتیں اور جب چپاتیاں نظر نواز ہوتیں تو جوتا یاد آتا۔ مذکورہ بالا حادثے کے بعد صرف ایک پیر کا جوتا لجلجہ ہوجاتا اور دوسرے پیر میں کسی خشک موضوع کی طرح جوتا ہوتا تو ایسا محسوس ہوتا جیسے بے جوڑ میاں بیوی ایک دوسرے کے ہجلے بچوں کی خاطر جی رہے ہوں۔ ایسے نازک موقع پر ہم دانستہ کسی ٹرک یا سواری سے نکلنے والے فوارے کی زد پر دوسرا جوتا دے دیتے تاکہ ہمیں کوفت اور جوتوں کو ایک دوسرے سے حسد نہ ہو۔ اگر جوتوں میں یہ جذبہ اُجاگر ہوجائے تو پیروں کی وہی حالت ہوتی ہے جو حاسد رہنماؤں کی وجہ سے قوم کی ہورہی ہے۔

مٹوں گا لیکن اُسے بھی تباہ کردوں گا!

کہتے ہیں انسان کی زندگی میں کئی یادگار دن آتے ہیں۔ جیسے پیدائش کا دن، شادی کا دن اور موت کا دن مگر ہماری زندگی کا یادگار دن وہی ہے جس دن ہم نے وہ جوتا خریدا تھا۔ آپ یقین کریں ہم۔ اے کی ڈگری کے حصول کے دن ہم خوش نہیں تھے اور نہ شادی کے دن کو وہ خوشی میسر ہوئی تھی جو خوشی ہم نے جوتا خریدتے ہوئے محسوس کی۔ اپنا اپنا ظرف اور اپنی اپنی قسمت بہت کم ایسے ہونگے جنھیں ایسے جوتے نصیب ہوئے ہوں۔

جس روز ہم نے سُنا کہ ہمارے ملک کے صاحبِ جوتا دانشور جوتوں کو دیکھ کر جوتوں میں داخل پاؤں والے کی حیثیت کا اندازہ لگالیتے ہیں، فوراً ایک منفرد جوتے کو اپنانے کے لیے چل پڑے تاکہ جوتے کے زور پر اپنی حیثیت منوا سکیں۔

جوتوں کے شوروم میں جوتے ہی جوتے تھے! انہیں شیشے کی الماریوں میں اس سلیقہ سے سجا کر رکھا گیا تھا کہ یہ جوتے، جوتے کم اور زیورات زیادہ معلوم ہوتے تھے۔ سُنار کا سارا ہنر چمار نے جوتے کی سجاوٹ و بناوٹ میں اپنالیا تھا۔ چاروں طرف جوتوں اور چپلوں کی بہار تھی۔ پتہ نہیں کون سے جوتے ہمارے مقدر میں لکھے تھے۔ قدم بے اختیار ہر جوتے کی طرف یوں اُٹھ جاتے کہ اشتیاق کے جذبہ کو اختیار میں لانا محال ہوجاتا۔ مردانہ و زنانہ جوتیوں کی الماریوں کے درمیان کافی فاصلہ رکھا گیا تھا (اگر مشرقی جوتیوں کا فاصلہ اہل مغرب عورت و مرد کے درمیان ملحوظ رکھتے تو کئی شاہی خاندانوں کو باعزت زندگی گزارنا آجاتا ؟) طرّہ یہ کہ بچوں کے جوتوں کا شعبہ بھی بالکل الگ تھلگ تھا۔ جوتوں کا شوروم گویا ایک دنیا تھی، جہاں ہر جوتا اپنی دنیا آپ بسانے یا بنانے کے چکر میں چمک رہا تھا۔

ایک ننھے مُنے جوتے پر نظر پڑی جو ہمک ہمک کر ہماری جیب کو گیلا کرنے کے لیے مچل رہا تھا۔ ننھّا

صاحبزادی کے لیے یہ جوتا خریدنا گویا اپنے جوتے کی رقم سے ڈنڈی مارنا تھا۔ جب تک بیٹے اور خواہشات کی ڈنڈی نہ ماری جائے اولاد بڑی کہاں ہوتی ہے۔ اس جوتے پر قیمت کی پرچی نہیں لگی تھی۔ ہم نے سوچا زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس روپے کے ہوں گے کیوں کہ اس جوتے کو کونسا جوتیاں چٹخانا تھا۔ دو تین ماہ کی بچی کا پیر کیا اور اس کا چلنا پھرنا کیا۔ بس دنیا والوں کو یہ احساس دلانا تھا کہ ہم بھی جوتا رکھتے ہیں کسی ملک کے اس عہدے کی طرح جو اختیارات کے بجائے اپنی گرہ میں عہدہ اور دستخط رکھتا ہو۔

قیمت سن کر پیروں تلے قالین نکل گیا جو اتنا نرم اور ملائم تھا جیسے بے دانت کی ضعیفہ کے لیے بنایا جاتا ہو۔ قالین کا نکلنا تھا کہ ہاتھوں سے توتے اور دل سے صاحبزادی کو جوتا پہنانے کی آرزو بھی تو زدگیارہ ہوگئی۔ دکاندار کہتا تھا "یہ بھی کوئی قیمت ہے سو روپے میں شیرخواروں کے لیو زاینڈ بھتے ور نیکین آجاتے ہیں اور یہ تو جوتا ہے جوتا۔"

ہم نے خفت مٹانے کے لیے کہا "پھر بھی وہ نیکین کام میں تو آتے ہیں۔"

کہنے لگا۔ "یہ جوتا بھی ایک عظیم کام انجام دیتا ہے۔"

عرض کیا۔ "یہ کیا کام انجام دے گا۔"

دکاندار نے تاک کر ہماری خواہش کو نشانہ لگاتے ہوئے کہا۔ "آپ کی خواہش کی تکمیل کوئی معمولی کام ہے۔"

ہم ایک خواہش کی تکمیل سو روپے کے خون ناحق سے نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اب جبکہ زنانہ جوتیوں کی طرف آنکھ اٹھاتے کا یارا نہ تھا۔ وہاں کوئی خواہش ٹھاٹیں مارتی اور اسی انجام کو پہنچتی جہاں مذکورہ بالا خواہش پہنچ چکی تھی تو اس کا اثر خواہ مخواہ ازدواجی تعلقات پر پڑتا!

یہ تمنا بھی بن کھلے مرجھا گئی تو مردانہ جوتوں کے شعبہ میں نکل آئے۔ ہر شو کیس میں کئی کئی جوتے ہمارے دل کو لبھانے کے لیے وہ وہ کر رہے تھے جو انہیں زیب نہیں دیتا تھا۔ اس انداز پر تو صرف فاحشہ عورتوں اور سیاسی بازیگروں کا حق ہوتا ہے۔ ہم جوتوں کی ان پیشہ وارانہ حرکتوں سے جب بر داشتہ دکان سے نکل رہے تھے کہ اس جوتے پر نظر پڑی جو دنیا کی گھما گھمی سے بالکل بے خبر ایک گوشہ میں سنیاس لیے بیٹھا تھا۔ ہماری طبیعت کے میلان نے اُسے منتخب کیا۔ ہم نے جوتا پہن کر اس آئینہ میں اپنی شخصیت کو بغور دیکھا جو اس طرح زمین کو بس تھا جیسے زمین سے اُگا ہو۔ اس آئینہ میں ہماری قدوقامت بھاری بھاری جوتوں سے شروع ہو کر ایک نقطہ جیسے سر پر ختم ہو رہی تھی۔ یقیناً ان جوتوں نے ہماری شخصیت کو نکھار دیا تھا۔ جوتوں کے آگے ہمارا سر ایسے لگ رہا تھا جیسے حوادث کے آئینہ میں قوم کا مستقبل۔ جوتے پہن کر ٹہلنے لگے تو اپنے چال چلن پر پہلی بار اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن اطمینان کا یہ سانس اسی قالین کا بھی نتیجہ تھا جو اتنا دبیز تھا کہ پاؤں فرش کی قدم بوسی کو طوالت بخشنے پہ مجبور تھے

لیکن اس شوروم کے باہر تو وہ راستے ہی اس جوتے کا نصیب تھے جن میں جوتوں کو سنبھالے رکھنے کی تاب نہ تھی۔ وہ تو مظلوم عوام کی قوت ارادی میں پوشیدہ صبر و تحمل کا جذبہ ہے جو انہیں ان راستوں پر ڈگمگانے نہیں دیتا ورنہ جہاں سر پڑ جائے وہاں ایک کھڈ اپنے نصیب اور ملک کے مقدر کو روتا ہوا ملتا ہے اور اس جوتے کے چلنے

کا مزہ صرف پہن کر چلنے میں نہاں تھا۔ چلنے کے منصوبوں پر غور کرتے ہوئے کھڑے کھڑے تصور کو شہر کے تمام راستوں پر دوڑایا تو ساٹھ لاکھ کی آبادی والے باغوں کے شہر میں ایک سڑک ایسی نظر آئی جو جوتوں کے لیے باعثِ تسکین تھی جس کا طول بلد صرف چار فرلانگ تھا۔ اگر یہ چار فرلانگ بھی شہر میں نہ ہوتے تو کارپوریشن والے کسی کو راستہ اور منہ دکھانے کے لائق نہیں رہتے۔ وہ بھی غنیمت تھا ورنہ ہمیں اپنی خواہش کی تکمیل کیلئے دبئی جانا پڑتا۔ جہاں ہماری چپل قدمی سے ارمان، جوتوں کے ارمان سمیت نکلتے۔

آخر کار ہم نے دل تھام کر وہ جوتا خرید لیا۔ وہ جوتا واقعی جوتا تھا۔ خدا گواہ ہے کیسے کیسے پُر خطر راستوں پر اس نے ہمارا ساتھ دیا تھا۔ آپریشن زدہ، اُدھڑی ہوئی گلیوں کے پرخطرناک کھڈ سے بچ کر چلتا تھا۔ ایک تاریک رات میں (جس کی تاریکی سے گھبرا کر الیکٹرک بورڈ والوں نے بھی برقی قوت ضبط کرلی تھی) یکایک، دو چار گدھے، منہ پھاڑے پے درپے ہمارے سامنے آگئے تو ہر گدھے سے یہ کہتا ہوا گزر گیا "پرے ہٹیں دو ہزار کا ہوں، میرے آقا کی ماہانہ تنخواہ بھی اتنی ہی ہے۔ ہم دونوں کا سوشیل اسٹیٹس ایک ہے۔ میں اپنے آقا کو منہ کے بل گرنے نہیں دوں گا۔"

تھا اتنا با اخلاق کہ زندگی کے کئی مراحل میں حریفوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے اس کا استعمال ناگزیر ہوگیا لیکن کبھی پیر سے نہیں نکلا۔ اور وفاداری کی مثال ایسی کہ انسان تو انسان کتا بھی شرما جائے۔ اب تو راہ چلتے ہوئے ایسے واقعات عام ہوگئے ہیں کہ راہ گیر جوتیاں چھوڑ کر بھاگنے لگیں لیکن سخت سے سخت ہنگاموں اور افراتفری پر بھی اس نے پیروں کو تھامے رکھا۔

حیا و غیرت کا یہ حال کہ چار برسوں میں کبھی کسی غیر چمار کے آگے عریاں نہیں ہوئے۔ جو ٹانکے وقتِ ولادت لگائے گئے تھے اُسی پر جیتے رہے۔ بے حیا لوگوں کے لیے سامانِ عبرت تھے۔ گرہستن و وفا شعار بیوی کی طرح آرائش و زیبائش کے بغیر ہی رہ لیتے اسی لیے ہماری لاپرواہی نے انہیں اتنا بدرنگ بنا دیا تھا جتنا ایک غریب کی خوبصورت بیوی کو افلاس بدرنگ کر جاتا ہے۔

ہمیں یقین ہے جس وقت جوتا چور کے ہاتھ لگا ہوگا اُس وقت وہ بدنصیب اقلیتوں کی طرح محوِ خواب ہوگا ورنہ اُسے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا ــــ مرتے کیا نہ کرتے جوتا چور کے کرتوت پر رو پیٹ کر رہ گئے۔ اتفاقاً ایک ہفتہ بعد اُسی مسجد میں عشاء کی نماز کے لیے جانا پڑا۔ اس گوشہ اور تختہ کو دیکھ کر ایک ہوک سی اٹھی۔ مظلوم جوتا بے اختیار یاد آگیا۔ جو یاد کے ساتھ ہی حقیقت میں تختہ کی آڑ ہی سے ہمارے پیروں کو اپنی باہوں میں لینے اتاولا ہو رہا تھا۔ اسے غیر متوقع طور پر دیکھ کر ہماری بھی کم و بیش وہی حالت ہوئی۔ دوڑ کر جوتوں کو جا لیا۔ اُلٹ پلٹ کر دیکھا... وہی تھے... سو فیصد... وہی بدرنگی، وہی حیا، وہی سگھڑ پن... اور کچھ ندامت بھی! یکایک اس کے اندر سے ایک کاغذ کا پرزہ نکل آیا۔ جس پر یہ مضمون تھا کہ ــــ "جناب یہ جوتا اتنا پرانا ہونے کے باوجود نئے جوتوں کی طرح کاٹتا کیوں ہے۔ اسی لیے لوٹا رہا ہوں... آپ کو آپ کے جوتے مبارک۔"

ہم جوتوں کی وفاداری پر عش عش کر اٹھے... اب ارادہ ہے کہ اس کا جو شاہدہ بنا کر قوم و ملت کے اُن گمراہ رہنماؤں کو پلائیں۔ جن میں وفاداری و غمخواری کا اتنا بھی جذبہ نہیں جتنا جذبہ ہمارے جوتوں میں ہے! ◻◻

محمد طارق
(امراوتی)

قصہ ووٹر کا

ووٹ دینا ہمارا جمہوری حق ہے نہ صرف ہمارے ابا جان اس جمہوری حق کا استعمال کرتے تھے بلکہ دادا جان بھی اس کوچہ میں قدم رکھ چکے تھے۔

پہلے زمانے میں عمر کے اکیس سال پورے ہونے پر ووٹ دینے کا حق حاصل ہوتا تھا۔ اب عمر کے اٹھارہ سال مکمل ہونے پر ہی یہ حق مل جاتا ہے۔ اس کی وجہ کوئی سیاسی داؤ پیچ قطعاً نہیں ہے بلکہ ووٹ دینے کے معاملے میں ہمارے ملک کے مرد اور عورت کے "آئی۔کیو" میں ترقی ہوئی ہے۔ (چلو اس اعتبار سے تو ہم نے ترقی کر لی۔)

ہمارے ملک کا ہر بچہ اپنی پیدائش کے دن سے اٹھارہ سال مکمل ہونے تک چاہے کچھ نہ بنے ووٹر ضرور بن جاتا ہے کیوں کہ ووٹر بننے کے لیے صرف ہوا پانی اور غذا کی ضرورت ہوتی ہے اور کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑتی (بہ شمول حسن انتخاب) ہوا۔ پانی اور غذا کا خالص ہونا بھی قطعاً ضروری نہیں۔ شاید اسی لالچ نے ہمارے ملک میں بچوں کی پیداوار بڑھا دی ہے۔

ہمیں ووٹر بنے آج پورے بیس سال ہو چکے۔ (ان بیس) سالوں میں ہمیں ووٹ دینے کا کافی تجربہ ہو چکا ہے چار انچ کے بیلٹ پیپر سے لے کر فل سائز اخبار جیسے بیلٹ پیپر بھی ہم نے دیکھے ہیں۔ پچاس سے زائد انتخابی نشانات والے بیلٹ پیپر پر بغیر کنفیوز ہوئے ووٹ دیتے رہے ہیں۔ اس سے آپ ہماری قوت ارادی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہاں! ہماری یہ بدنصیبی رہی کہ ہم نے جس امیدوار کا انتخاب کیا ــــــ ا سے ووٹ دیا۔ اس کے درشن ہی سے محروم رہے۔

اپنی اس محرومی کا اظہار ہم نے اپنے ابا جان اور دادا جان سے اس وقت کیا تھا جب کہ ہم ووٹر کی حیثیت سے تابیس شخصی میں مبتلا تھے۔

ابا جان اور دادا جان ایک آواز میں ٹھنڈی سانس بھر کر فرمانے لگے تھے۔ بیٹا ہمارا ملک بڑا ملک ہے ہمارے ملک کے نیتاؤں کے کاروبار بھی بڑے ہیں۔ اگر وہ ہر ایرے غیرے کو اپنے درشن دینے لگے تو حکومت کا کام

"کون کرے گا"

ہم نے ان کی بات کو مختصراً "ہوں" کہہ کر ٹال دیا تھا۔ کیوں کہ ہم ان دنوں "یونگس ووٹر" تھے اور ناتجربہ کار بھی لیکن آج ـــــ ! آج تو ہم سینیر ووٹر ہیں اور خاصے تجربہ کار بھی

آج ہمیں ان کی بات کے ساتھ ان کی ٹھنڈی سانسیں بھی یاد آتی ہیں تو ہم ان کے لہجہ کے طنز کی چبھن محسوس کرتے ہیں۔!

کچھ سال ہوئے ہم نے عہد کر لیا تھا۔ اسی کو ووٹ دیں گے جس کے درشن ہوں گے ـــــ '

شاید نیتا لوگ بھی عوام کا موڈ بھانپ گئے تھے۔ پھر کیا تھا الیکشن کا موسم جب بھی آتا۔ درشن دینے کے لیے نیتاؤں کی باڑھ آجاتی۔

کس کس کو دیکھیں ـــــ کس کس کی سنیں .... ہر پارٹی کا نیتا دیش کا اور دیش کی جنتا کا سب سے بڑا ہمدرد ظاہر کرتا۔ سب نیتا کمر کس کر "جنتا کی خدمت کرنے کے موڈ میں تیار نظر آتے۔ ایک علامت سب نیتاؤں میں مشترک تھی۔ دھرم اور ذات کے بخار کی علامت کسی کو 98 سے کچھ زیادہ دھرم اور ذات کا بخار کسی کو 100 سے اوپر چڑھا محسوس ہوتا تو کوئی 105 کے بخار میں ہذیانہ نظر آتا ہے۔ بہرحال ووٹ دینا تو ہمارا جمہوری حق ہے اس لیے ہم ووٹ اس نیتا کو دیتے جس میں دھرم اور ذات کے بخار کی کیفیت نارمل ہوتی۔ یہ ہماری بدقسمتی کہ جسے بھی ہم نے ووٹ دیا وہ منتخب نہیں ہوا۔ رہی درشن کی بات تو جنتا کی یہ عام شکایت ہے کہ نیتا لوگ پانچ سال میں ایک بار ووٹ لینے کے لیے درشن دیتے ہیں۔ کھلے میدانوں میں اسٹیج پر جنتا سے کیے گئے وعدے پورے نہیں کرتے۔

ہم جنتا کی شکایت پر اپنے دادا جان کی طرح ٹھنڈی سانس بھر کر ان کی ہی بات ترمیم کے ساتھ دہراتے ہیں۔ ہمارا ملک بڑا ہے۔ ہمارے ملک کے نیتاؤں کے کاروبار بھی بڑے بڑے ہیں۔ اگر وہ ہر ایرے غیرے کو اپنے درشن دینے لگیں تو حکومت کے کام کون کرے گا۔ رہی وعدوں کی بات، اگر نیتا وعدوں کو پورا کرنے لگے تو پھر اگلے چناؤ کے لیے ان کے پاس کیا رہ جائے گا۔

نیتاؤں کی وعدہ خلافی۔ ووٹرس سے چشم پوشی اور دیش میں بڑھتا ہوا کرپشن دیکھ کر کچھ سماج سیوک الیکشن کے موسم میں اخبارات میں یوں اشتہارات دیتے ہیں۔

ووٹرس اپنے ووٹ کا صحیح استعمال کریں۔ سمجھ سے کام لیں۔ دیش کو بچاؤ ـــــ دیش بھگت امیدوار کو جن کر لاؤ ـــــ امیدواروں کو جانو ـــــ پہچانو ـــــ سمجھو، پھر ووٹ دو ـــــ پارٹی کو مت دیکھو، امیدوار کو پرکھو، کیوں کہ پارٹی کچھ نہیں کرتی۔ امیدوار سب کچھ کر سکتا ہے۔"

اتنا وقت ہے کس کے پاس؟ وقت ہے تو کردار کی شناخت کی کسوٹی کہاں سے لائیں؟ دیش بھگت کیسے ہوتے ہیں ـــــ ؟ اب کہاں ہیں دیش بھگت ؟! ـــــ اشتہارات اور پمفلٹ پڑھ کر سوالات ہمارے سر پر ہتھوڑے کی طرح برسنے لگتے ہیں ـــــ اپنے سوالات کی اذیت سے ہم نے اس طرح نجات حاصل کی کہ جب بھی الیکشن آتا ہے ہم اللہ کا نام لے کر اپنے حلقے کے امیدوار کو قرعہ اندازی سے منتخب کر لیتے ہیں اور اسے ووٹ دے دیتے ہیں تاہم آج تک ہم صحیح امیدوار کو ووٹ نہیں دے سکے۔

پرویز یداللہ مہدی

قسط (۲)

فکر ہوتی ہے فکر ہوتا ہے

ہمارے حلقۂ احباب میں ایک تنہا سا ایسے بھی تھے جن کا ادبی ذوق مرغ مسلّم کی طرح مسلّمہ تھا۔ موصوف فکر تونسوی کی طنزیہ تحریروں کے گھائل اور مزاحیہ فقروں کے قائل تھے۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے پوچھا اتنے سارے طنز و مزاح نگاروں کی بھیڑ میں صرف فکر ہی کے عشق میں آپ کے مبتلا ہونے کی کوئی خاص وجہ؟

بولے۔ ظالم کسی ہرجائی معشوق کی طرح لگتا ہے، تصویر میں جلاد، تحریر میں [illegible] میں نے شرارتی لہجے میں کہا شیریں والا فرہاد؟" جھنجھلا کر بولے۔ اجی نہیں، شیریں والا فرہاد تو ہولا (بے وقوف) تھا۔ جوئے شیر اور شیریں کی شیرینی میں الجھ کر بے وقوف نے خود کو اپنے ہی تیشے سے ہلاک کر ڈالا۔ اردو طنز و مزاح کا یہ فرہاد تو بڑا "کائیاں" ہے۔ اس نے تیشے کی جگہ قلم سنبھال لیا ہے۔ چنانچہ جوئے شیر کی فرمائش پر شیریں ہی کی چٹکی کاٹ لیتا ہے اور جب وہ تلملا اٹھتی ہے تو اسے مزاح کی تھپکیاں دینے لگتا ہے نتیجہ میں شیریں کے شیریں لبوں آہ اور واہ کی ملی جلی مسکاریاں پھوٹ پڑتی ہیں اور یہی مسکاریاں لفظوں میں ڈھل کر فکر کی تحریر دل میں ہمیشہ کے لیے زندۂ جاوید ہو جاتی ہیں۔ میں نے موصوف کی ٹانگ کھینچی ـــــ فکر تونسوی کی آڑ لے کر آپ نے تو شہرۂ آفاق رومانی جوڑی شیریں فرہاد کے تعلق سے اپنی ذاتی خصوصیت خوب نکالی ہے۔"

یہ میری نہیں فکر تونسوی کے قلم کی خوبی ہے۔ موصوف نے بڑے ہی مدلل لہجے میں بندر کی بلا طویلے کے سر ڈال دی اور آگے فرمایا ـــــ میں جب بھی اس کی کوئی تخلیق پڑھتا ہوں تو لگتا ہے جیسے اس کے قلم نے میرے دل کا کوئی تار کوئی غبار ہلکا کر دیا۔ یعنی بالکل وہی بات:

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کسی بھی موضوع پر قلم [illegible] شان سے قلم اٹھاتا ہے کہ پھر موضوع چاہے بیٹھ جائے یا لیٹ جائے فکر کا اٹھا ہوا قلم ہرگز نہیں بیٹھتا بلکہ ہر بار ایک نئے ذہنی فلک کو چھو آتا ہے۔

یوں سمجھیے کسی بھی موضوع کو یہ جنبش قلم اس طرح گرفت میں لے لیتا ہے کہ گرفتار شدہ موضوع مرغ بسمل کی طرح پھڑپھڑانے لگتا ہے۔

میں نے انھیں مزید چھیڑنے کے لیے مین میخ نکالی۔ یہ تو کوئی خاص بات نہیں ہوئی، بعض ادیب

شاعر تو بغیر کسی جنبش بلکہ بغیر قلم کے کسی بھی موضوع کو گرفت میں لے لیتے ہیں بلکہ اس کے بال و پرتک نوچ ڈالتے ہیں —— ! اس نرالی منطق پر موصوف کو کچھ دیر کے لیے چپ سی لگ گئی اور جب چپ کا یہ بند ٹوٹا تو پھٹ پڑے۔ فلسفیانہ انداز میں بولے ۔ ابھی ابھی غور و فکر کرنے پر محسوس ہوا کہ مجھے دراصل فکر تونسوی کی تحریر سے کہیں زیادہ اس کا تخلص پسند ہے اور اس سے کہیں زیادہ پسند ہے اس کی شخصیت کی ہم آہنگی ۔ موصوف منطق کو منطق کے زیر کرنے لگے ۔ آگے فرمایا:

" بدقسمتی سے میں فکر تونسوی سے کبھی ملا نہیں شخصی طور پر، لیکن تصویروں میں اسے بارہا دیکھا ہے۔ بیٹھے ہوئے، لیٹے ہوئے، چھینکتے ہوئے پڑھتے ہوئے تقریر جھاڑتے ہوئے، چپ سادھے ہوئے اور ہر تصویر، ہر پوز میں میں نے اس کے کسی نہ کسی عضو کو فکر مند پایا۔ کسی میں اس کی آنکھیں فکر میں ڈوبی ہوئی ہیں تو کسی میں اس کی عینک، کسی میں اس کی پیشانی پر فکر کی سلوٹیں نمایاں ہیں تو کسی میں وہ اپنی ناک پر بیٹھی فکر کو کھجانے کے بہانے دبوچتا دکھائی دیتا ہے، کسی تصویر میں وہ گھر یا بال بچوں کی فکر میں غلطاں دکھائی دیتا ہے تو کسی میں پڑوس محلے کی فکر میں پیچاں، کسی میں پورے شہر کے اندیشے میں دبلا دکھائی دیتا ہے تو کسی میں دیش کی بلکہ سارے سنسار کی فکر میں ڈوبا۔ اچھے اچھے مفکروں کے ناک کان کاٹتا لگتا ہے۔ !!"

فکر تونسوی کی تصویروں کی اس منہ زبانی، تصویر کشی سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ موصوف نے فکر کی تحریروں سے زیادہ تصویروں کا مطالعہ کیا ہے اور اسی مطالعہ کی بنا پر موصوف نے آگے ارشاد فرمایا۔

فکر تونسوی کو اس کے چاہنے والے اس کی تحریروں میں نمایاں طنز کی کاٹ کی وجہ اسے پسند کرتے ہوں گے، کچھ اس کی تحریروں میں چھپی دردمندی کے کارن اس کی قدر کرتے ہوں گے، کچھ کو اس کے مزاحیہ برجستہ فقرے بھاتے ہوں گے، غرض لوگ ایک مختلف وجوہات کی بنا پر فکر کو اپنا آئینہ تصور کرتے ہوں گے لیکن مجھے فکر کی جو بات خاص طور پر پسند ہے وہ جانتے آپ کون سی خاص بات ہے — ؟"

ہم نے برجستگی کے ساتھ کہا —— فکر تونسوی کے چہرے سے جھلکتا گنوارپن ——"

بولے —" ٹھیک ہے مجھے اس کے چہرے کا یہ گنوارپن پسند ہے لیکن وہ بات جو فکر تونسوی کو دوسرے ادیبوں، شاعروں سے الگ کرتی ہے اسے اوروں سے مختلف ثابت کرتی ہے وہ کچھ اور بات ہے ۔ خیر آپ سے کیا چھپانا، فکر تونسوی کی جو خصوصیت مجھے بے حد پسند ہے وہ تخلص باقی رکھ کر شاعری چھوڑ دینے کی ہمت ہی تو ہے —— !! موصوف کے اس انکشاف پر احساس ہوا کہ واقعی فکر تونسوی کی اس ادا کی طرف کبھی ہمارا خیال گیا ہی نہیں ۔ واقعی فکر کی یہ ادا قابل ستائش ہے — !!!

دینے والوں نے شاعری کو اس خطرناک کمبل سے تشبیہ دی ہے جو کمبل کے کیڑے، عرف شاعر کے اس دار فانی سے کوچ کر جانے کے بعد بھی سامعین و قارئین کا پیچھا نہیں چھوڑتا لیکن اردو طنز و مزاح کے جیالے کے قلم کار فکر تونسوی نے جیتے جی شاعری کو ترک کر کے یہ ثابت کر دیا کہ شاعر اور چور میں ذرا سا فرق ہوتا ہے چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا مگر جب شاعر شاعری سے جاتا ہے تو سچ مچ چلا جاتا ہے۔ فکر تونسوی نے شاعری کو ترک کر کے نثر کو اپنا کر شعرا حضرات کی خوش فہمی کا بھی پول کھول دیا کہ صرف شاعری ہی وہ صنف ادب نہیں ہے جس میں غم جاناں، غم دوراں اور انسان کی اعلیٰ اقدار کی تفسیر بیان کی جاسکتی ہے بلکہ نثر کے

میدان میں بھی غموں کی یہ کھچڑی بلکہ کھچڑا بہ آسانی پکایا جا سکتا ہے چنانچہ ثبوت کے طور پر فکر نے غم ذات کو غم کائنات اور غم جاناں کو غم دوراں میں خلط ملط کر کے ان کے آپسی اختلاط سے ایک نیا ہی غم پیدا کیا جسے اگر "غم فکری" کے نام سے منسوب کیا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ یہی غم فکری فکر تونسوی کو آفاقی ادیب کے درجہ پر پہنچا دیتا ہے مجھے کامل یقین ہے کہ فکر تونسوی کے آفاقی ادیب ہونے میں کسی بھی صاحب ذوق قاری کو رتی بھر شبہ نہیں ہوگا، البتہ فکر نے اردو میں لکھ کر جہاں اپنی عافیت سنواری وہیں اپنی عافیت، معیشت اور صحت کو خواہ مخواہ خطرے میں ڈالا، نتیجتاً اچھا خاصا آفاقی ادیب جب تک باحیات رہا۔ آفاقی چیز معلوم ہوتا رہا، بوسیدہ بیمار، پریشان، لٹا لٹا بکھرا بکھرا ٹوٹا ٹوٹا۔

پیارے قارئین، میں ذاتی طور پر شاعروں اور ادیبوں سے غائبانہ یعنی کہ قلمی دوستی کا قائل ہوں بالمشافہ ملاقاتوں سے زیادہ تر گریز کرتا ہوں کیوں کہ اکثر ادیبوں و شاعروں سے مل کر یہی احساس ہوا کہ اگر ان سے روبرو، دید و ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو یہ ہر دو کے حق میں بہتر ہوتا یہی وجہ ہے کہ ایک عرصہ تک میں اوقاتی شخصیت والے آفاقی ادیب فکر تونسوی سے بچتا رہا لیکن خدا بھلا کرے "زندہ دلان حیدرآباد" کا جنھوں نے اپنی زندہ دلی کے طفیل ایک مرتبہ اپنی سالانہ ادبی تقاریب کے ہنگاموں میں میرا اور فکر تونسوی کا آمنا سامنا کروا ہی دیا۔ حیدرآباد کی مشہور و قدیم عمارت مجرد گاہ عرف بیچلرز کوارٹرس (BACHELORS QUARTERS) جس میں آباد کوئی بھی شخص اتفاق سے بیچلر عرف مجرد نہیں ہے اور جس میں زندہ دلان حیدرآباد اور ماہنامہ شگوفہ کے دفاتر واقع ہیں اسی تاریخی عمارت کی سیڑھیوں پر فکر تونسوی سے میرا تعارف مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے کروایا، تعارف کے فوراً بعد فکر تونسوی مجتبیٰ حسین سے بولے؛

یار مجتبیٰ! کون کہتا ہے ہندوستان میں اردو کا مستقبل تاریک ہے۔ اس کا موقف کمزور ہے۔۔۔! پھر میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولے۔ یہ دیکھو اردو کا مستقبل کس قدر تابناک ہے اس کا موقف کس قدر مضبوط اور ہٹا کٹا ہے۔۔! یہ جملہ چست کرنے کے بعد اسی چستی سے راست مجھ سے پوچھا۔ "یار تو حیدرآباد میں کیسے پیدا ہو گیا۔۔۔!"

جس طرح آپ پنجاب میں پیدا ہو گئے ۔۔۔! میں نے بھی اسی برجستگی سے جواب دیا۔ فکر صاحب نے ہنستے ہوئے بات آگے بڑھائی۔ یار قدرت بھی کسی شریر مزاح نگار سے کم نہیں، غلط آدمی کو صحیح جگہ اور صحیح آدمی کو غلط جگہ پیدا کر دیتی ہے" فکر صاحب کے اس فقرے پر قہقہہ لازمی تھا اور ہم سے بلند ہوا اور زندہ دل قہقہہ فکر صاحب ہی کا تھا جو اس بات کا کھلا ثبوت تھا کہ اوسط قد اوسط جسامت والے فکر تونسوی جن کی صحت بھی اقتصادیات اوسط ہی رہتی۔ اگر فالج کے حملے نے اس اوسط شخص کو بے دم بے ہم نہ کیا ہوتا لیکن اس کے باوجود زندگی کے تئیں ان کا رویہ مجھے مثبت نظر آیا، بھرپور محسوس ہوا۔ آفاقی ادیب شخصی طور پر بھی آفاقی ثابت ہوا۔۔۔!!

جس شام ادبی اجلاس منعقد ہوا اسی رات ڈنر کے دوران فکر تونسوی شہر کی ادبی شخصیتوں، دانشوروں اور مقامی اخباروں کے ایڈیٹروں کے بیچ کافی دیر تک گھرے رہے لیکن قرار کا پہلا موقع ملتے ہی وہ اپنی ادبی برادری میں کسی کارے بچھڑے ہرن کی طرح چلے آئے اور یوں مطمئن ہو گئے جیسے بھولا بھٹکا مسافر اپنے ٹھکانے پر لوٹ آیا ہو، یہی نہیں بلکہ جتنے دن وہ حیدرآباد میں رہے ان کی کوشش یہی

رہی کہ ان کا زیادہ سے زیادہ وقت ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کے بیچ گزرے، اس سارے ہنگامے میں میں نے فکر کو ایک مقامی نام نہاد نقاد سے کئی بار بچتے ہوئے دیکھا۔ میں نے آخر ان سے اس کا سبب دریافت کیا تو وہ اپنے مخصوص پنجابی لہجے میں بولے۔ یار پرویز نقادوں سے جیسے بھی میری روح فنا ہوتی ہے کہ یہ لکھنے پڑھنے کا محض ڈھونگ کرتے ہیں"۔ اور یہ نیا نقاد کل سے میرے کان کھائے جا رہا ہے اور ایک ایسے مزاحیہ مضمون .. کی تعریفوں کے پل باندھ کر میرے کھاتے میں ڈال رہا ہے جو میرا نہیں کپور کا ہے ۔۔۔ ! میں نے فوراً کہا۔ تو کیا ہوا، کپور صاحب کون سے غیر برادری کے ہیں۔ طنز و مزاح کے حوالے سے اپنے ہی ہیں۔ خوشی خوشی قبول کریجیے ان کی تعریف !

بولے ۔۔ بالکل کرلوں کا بشرطیکہ وہ نقاد میرا کوئی مضمون کپور کے کھاتے میں ڈال کر اس کی تعریف کپور کے سامنے کرنے کا وعدہ کرے ۔ !"

فکر تونسوی سے اگلی ملاقات بمبئی میں ہوئی۔ ملاقات کی دوسری ہی کڑی میں اپنے مخصوص پنجابی لہجے میں جس میں تکلف کی آمیزش ہی نہیں ہو سکتی، پوچھا ۔۔۔ 'یار پرویز تو حیدرآبادی ہو کر بمبئی میں کیا کرتا ہے؟' میں نے ترکی بہ ترکی لہجے میں جواب دیا۔ وہی جو آپ پنجابی ہو کر دہلی میں کرتے ہیں"۔ فری لانسنگ" ویری گڈ بہت اچھا جواب ہے۔ !" فکر صاحب نے مسکرا کر کہا پھر آگے فرمایا ۔۔۔ مگر اے نعیم شمیم نوجوان میں فری لانسنگ اس لیے کرتا ہوں کہ یہ میرا مقدر ہے، میرا تن و توش قلم کے علاوہ کوئی دوسرا بوجھ اٹھانے کی اجازت نہیں دیتا۔ مگر تجھ پر ایسی کون سی افتاد آ پڑی جو تو اچھی خاصی جوانی میں قلم اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔ فکر صاحب کے اس ہمدردانہ سوال پر میں انھیں بے بسی سے دیکھتا رہ گیا۔ میری بے بسی ان سے دیکھی نہ گئی، شاید وہ کسی کو بھی بے بس نہیں دیکھ سکتے تھے۔ فوراً لفظوں کی کمک پہنچا دیا کرتے تھے لہذا اپنی اس عادت سے مجبور ہو کر آگے بولے۔ خیر تو نے چونکہ قلم اٹھا ہی لیا ہے تو اب اسے یوں ہی اٹھائے رکھو۔ اگرچہ یہ بڑا کٹھن کام ہے مجھے دیکھ برسوں پہلے قدم اٹھایا تھا لیکن سزا آج تک بھگت رہا ہوں۔ جانے کیوں اردو کی نئی نسل کا کوئی بھی بھولا بھٹکا مسافر شعر و ادب کے راستے فری لانسنگ کی سنگلاخ وادی میں قدم رکھتا ہے تو اسے یہی ایک ادنیٰ مشورہ دینے کو جی کرتا ہے کہ او مورکھ نادان، ملک ہندوستان میں اردو ادیب بن کر فری لانسنگ کی صلیب پر خود کو مت چڑھا، کوئی اور دھندا کر، لانڈری کھول لے، فٹ پاتھ پر انڈر گارمنٹ (Undergarment) بیچ، کچھ بھی کر، مگر اردو کا ادیب یا شاعر مت بن .... " یہ کہتے کہتے فکر صاحب کا لہجہ ان کی آنکھیں بلکہ ان کا سراپا فکر میں ڈوب گیا ۔ !!

ملاقاتوں کی اگلی کسی کڑی میں فکر صاحب نے مجھ سے پوچھا ۔۔۔ 'یار تو بمبئی میں رہتا ہے یہ ضرور جانتا ہوگا، ملک کے بڑے بڑے دھنوان چوٹی کے سیاست دان اور پائے کے دانش وران بمبئی کے جسلوک ہسپتال، ہی میں اڈمٹ ہونا کیوں پسند کرتے ہیں ۔ ؟

عرض کیا ۔۔۔ " اس لیے کہ جسلوک سے پرلوک " کا فاصلہ زیادہ نہیں ہے ۔۔ میرے اس جواب پر فکر صاحب خوش ہو کر بولے ۔ یعنی کہ بالا ہی بالا عالم بالا کا یکطرفہ ٹکٹ بآسانی کٹ جاتا ہے ۔'

'جی ہاں ۔۔۔' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ فکر صاحب اپنی فکر آلود آنکھیں مجھ پر مرکوز کرتے

ہوئے بولے۔ یار زندہ دلی اور طنز و مزاح تم حیدرآبادیوں ہی کا حصہ ہے۔ تم لوگ مزاح لکھتے ہی نہیں بولتے بھی ہو۔

طنز و مزاح لکھنے اور لطیفے گھڑنے والا یہ جیالا کھلاڑی اپنی ذات کے حوالے سے آخر آخر میں عملی مذاق بھی کرنے لگا تھا۔ ایسا عملی مذاق جس کے ذریعہ اپنے مداحوں کو بجائے ہنسانے کے خوف زدہ کرنے کی کوششیں زیادہ ہوا کرتیں۔ مثلاً خود پر پچھلے بعد دیگرے فالج کے دو دو حملے کروالئے تو کبھی مختلف رسائل میں ایسے کھلے خطوط شائع کروائے جن میں اکثر اس مصرعہ پہ تان بوجھ کر تان توڑی جاتی تھی :

اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

اس سلسلے میں فکر صاحب سے میں نے کئی بار دست بستہ عرض کی یہ پراکٹیکل مزاح نگاری اور ایسے دل دہلانے والے شوشے چھوڑنا بند کیجیے اگر آپ کو اپنے مداحوں اور شیدائیوں کا خیال نہیں تو کم از کم سماج کی دکھتی رگوں کا خیال کیجیے جو آپ کی نباض انگلیوں اور نوک قلم کے لمس کی عادی ہو چکی ہیں اور پھر آپ کو ابھی اہل جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں لکھنا ہے۔ سامان کے چلے جانے کا غم مت کیجیے کہ ہم اردو والے ویسے بھی بے سرو سامانی کے عادی ہو چکے ہیں بلکہ اب تو بے سرو سامانی اردو والوں کا مقدر ہو چکی ہے۔ بس آپ اپنے جنوں کی جوت جلائے رکھیے کہ یہی ہمارے درد کا مداوا ہے لیکن فکر صاحب نے کسی کی ایک نہ سننے کا تہیہ کر لیا تھا انہیں یقیناً اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ آدمی اپنے جانے سے پہلے جس قسم کا سامان نامعلوم منزل کی طرف روانہ کرکے چند دنوں کے لیے اپنی روانگی ہائی کمان سے ملتوی کرواتا ہے، اب اس لائق سامان اس کے پاس باقی نہیں رہا تھا۔ سوائے ان کی اپنی ذات کے لہٰذا ایک دن یہ آفاقی ادیب اپنا ادبی سرمایہ آئندہ نسلوں کے سپرد کرکے چپ چاپ آفاق میں کہیں گم ہو گیا!

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن

رجسٹرڈ آفس :- 4-1-825/B سکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ عابد روڈ حیدرآباد

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے۔ یہ قرضہ جات 2 اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں -(۱) غربت ہٹاؤ اسکیم (2) خود روزگار اسکیم۔ غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار تک کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائینڈنگ، ترکاری فروش، میوہ فروش، اگربتی کا کارخانہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جیں۔ اس جملہ لاگت کا 25٪ کارپوریشن سے دیا جاتا ہے۔ اور اس کو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود 4٪ کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور باقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی چھ ہزار 6000 روپے سے کم ہونی چاہیے۔

خود روزگار اسکیم کے تحت 50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں، پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین، آٹو رکشا، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ، وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں - اس جملہ لاگت کا 20٪ کارپوریشن کی جانب سے لبطور مارجن منی شرح سود 6½٪ پر دیا جاتا ہے۔ کارپوریشن مندرجہ بالا دو اسکیموں کے تحت اپنے قیام سے لے کر ۷ مارچ ۹۶ء تک 57837 افراد میں 12,66,60,000 روپے لسور مارجن منی قرض جاری کر چکا ہے۔ جس کی جملہ لاگت 55,98,15,000 روپے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جاریہ سال ۹۶-۹۵ سے مرکزی حکومت کا قائم کردہ نیشنل اقلیتی ڈیولپمنٹ اینڈ فینانس کارپوریشن کے اشتراک سے اب تک جملہ 868 افراد میں (۱۶) منظور کردہ اسکیمات کے تحت 1,06,30,000 روپے مارجن منی قرض مزید جاری کر چکا ہے۔ جس کی جملہ لاگت 2,70,03,000 روپے ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ کارپوریشن ۱۹۹۳ء سے اقلیتی طبقہ کے نوجوانوں کو سالانہ مفت ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے چکا ہے۔ حیدرآباد میں 531 نوجوانوں کو نظام آباد میں 192 کنکور میں 243 افراد کرنول میں 74 نوجوانوں کو تقریباً ۱۰ لاکھ روپے کے صرفہ سے کمپیوٹرس، موٹر ڈرائیونگ، لیاب ٹیکنیشین، ٹیلرنگ، ٹائپ رائیٹنگ وغیرہ میں ٹریننگ کرایا گیا ہے۔

کارپوریشن کی شاخیں اضلاع کے ہیڈکوارٹر پر بھی کام کر رہی ہیں۔

خواہش مند حضرات کارپوریشن کے دفاتر سے ربط پیدا کریں۔

محمد علی رفعت ایم کام۔ ایل۔ ایل۔ ایم

نائب صدر نشین و منیجنگ ڈائرکٹر

اِنتخابِ کلام

ساتواں کُل ہند مزاحیہ مُشاعرہ

منعقدہ ۱۳ر مئی ۷۴ء بمقام نمائش میدان

بیس پچیس سال قبل منعقدہ زندہ دلانِ حیدرآباد کے مشاعروں کے آڈیو یا ویڈیو کیسٹ دستیاب نہیں ہیں۔ اکثر شائقین نے ان مشاعروں میں سُنائے گئے کلام کی اشاعت کی فرمائش کی ہے۔ چنانچہ اس بار ہم ۱۹۷۴ء میں منعقدہ مشاعرے کا منتخب کلام شائع کر رہے ہیں ------ (ادارہ)

ناظر خیامی

یہ میرا قول ہے، خیال رہے
وقت بڑبول ہے، خیال رہے
شادی کرنے کو کیجیے لیکن
برتھ کنٹرول ہے، خیال رہے

افلاس و غم و یاس کو کھو دیتا ہوں
تقدیر کا لکھا ہوا دھو دیتا ہوں
وہ اور ہے دُنیا نے ڈبویا ہے جسے
میں جام میں دُنیا کو ڈبو دیتا ہوں

موجۂ آبِ رواں ہیں اور نہ اب طوفان ہیں
آرزوئیں دل میں باقی ہیں نہ اب ارمان ہیں
اِک ہوا لکھتا ہوا نکلا یہ نس بندی کے بعد
ہم سے ملیے آپ، ہم بے ضرر انسان ہیں

کیا میں دل و نگاہ کا سینا بھی چھوڑ دوں!
نظارہ ہائے کوئے حسینہ بھی چھوڑ دوں
جھوٹی تسلیاں بھی نہ دوں اپنے دل کو میں؟
یاروں کی آرزو ہے کہ پینا بھی چھوڑ دوں!

ایمان کو ایماں سے ملاؤ پہلے
دامن کو گریباں سے ملاؤ پہلے
مہتاب سے دھرتی کو ملانے والو
انسان کو انساں سے ملاؤ پہلے

سب مانی و بہزاد کے فن ٹوٹ گئے
آئینۂ رنگیں کے بدن ٹوٹ گئے
وہ زور جوانی تھا کہ اللہ غنی
انگڑائی جو آئی تو بدن ٹوٹ گئے

مجھ کو افسوس نہیں تم جو بُرا کہتے ہو
میں نے مانا، میں شرابی ہوں بجا کہتے ہو
لیکن اِک بات ہے، اس کو بھی بتاتے جاؤ
خونِ انساں جو پیئے تم اسے کیا کہتے ہو

جس پہ صدقے ہوئیں وہ باپ ہوں میں
کتنی رنگین در کتاب ہوں میں
غالب و میر جس کے لونڈے تھے
اس محبت کا مائی باپ ہوں میں

اسٹیل ہو گئے کبھی فولاد ہو گئے
واللہ حسن و عشق کی بنیاد ہو گئے
کل رات اُن کو دیکھ کے شیطان نے کہا
لو آج ہم بھی صاحبِ اولاد ہو گئے

ہر آہ مری تا بہ گلو آتی ہے
آنکھوں میں مری موجِ لہو آتی ہے
ہر پھول سے ہے چہرۂ دشمن ظاہر
ہر خار سے احباب کی بُو آتی ہے

مانگ لے کچھ کہیں نہ رستے میں
بات کرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں
ہائے افلاس و مفلسی میری
دوست منہ پھیر کر گزرتے ہیں

غالب خدا کے حضور

ہم سو رہے تھے خواب میں دیکھا یہ ماجرا
یعنی قیامت آئی تھی میدانِ حشر تھا
اللہ ایک پردے کے پیچھے تھا جلوہ گر
وہ نور کا وفور کہ ٹکتی نہ تھی نظر!
پیڑوں پہ شاعروں کے تھے دیوان پڑے ہوئے
پہلو میں تھے ادب سے فرشتے کھڑے ہوئے
آواز آئی پہلے کہ غالب کو کھینچ لاؤ
ہتھکڑیاں اور بیڑیاں فوراً اُسے پہناؤ
یہ حکم سُن کے دوڑے فرشتے اِدھر اُدھر
غالب میاں پہ ایک جگہ پڑ گئی نظر
لمبی عبا اور سر پہ وہ ٹوپی کی آب و تاب
شیشہ بغل میں ہاتھ میں تھا ساغرِ شراب
محشر میں بھی شراب پی اور بے حساب پی
داڑھی سے ٹپکی پڑتی تھیں بوندیں شراب کی
بوئے شراب پھیلی ہوئی تھی اِدھر اُدھر
رومال رکھ لیے تھے فرشتوں نے ناک پر
غالب کا ٹھاٹ دیکھ کے بیٹھے تھے دامن ہزار ہا
گھیرے ہوئے تھے اُن کو نہایت ہزار ہا
اپنے سیہ ترین نوشتوں کو دیکھ کر
جب سب چلے گئے، کہ ملک نے یہ عرضِ حال
تم کو بلا رہا ہے۔ خداوندِ ذوالجلال
غالب نشے میں بولے کہ بزمِ سخن ہے کیا
ہے غیر طرحی یا کوئی طرحی مشاعرہ؟
اردو نواز ہے کیا خداوندِ عز و جل
یا فارسی میں پڑھنا پڑے گی مجھے غزل
شامل ہے واجبات میں غالب کا احترام
ہوٹنگ تو نہ کرے گا فرشتوں کا اژدحام
کچھ اہتمام ساغر و مینا بھی ہے وہاں
یا خالی بس نشست ہے اللہ کے یہاں
تم خالی ہاتھ کیوں مجھے لینے کو آئے ہو
یہ کاہے پر چلوں گا سواری بھی لائے ہو
یہ ہوں مصاحبین ظفر میں تبھی ہے
عزت یہ میری تنگ نظر! کچھ نظر بھی ہے
غالب یہ کہہ رہے تھے ملک نے کیا کلام
اللہ کے حضور میں اس درجہ تیم ٹام
چل تو، ترے درست ابھی ہوں گے سب مزاج
غالب یہ بولے ٹھہر کے مستی اڑائیں گے
یوم جزا اگر ہے تو پھر ہم نہ جائیں گے
بولے ملک: چلے چلو ہے فائدے کی بات
ورنہ لتہ کریں گے ہزار ماردیں گے ہات

غالب نے مار پیٹ کو سُن کر کہا کہ ہاں
تم تو پولس کی طرح سے دیتے ہو دھمکیاں
انسان سے اکڑتے ہو کتنے ہو بدخصال
تم کو نہیں ہے اشرف المخلوق کا خیال
وہ آج کر رہے ہیں دل آزاری بشر
کل سجدہ کر چکا ہے جو آدم کی خاک پر
بولا ملک شور مت کرو دت جلال سے
اہلِ فلک پہ رعب جمانا محال ہے
جانا ہے بغیر پیشِ خدا اب نہیں نجات
غالب نے تھوڑی دیر ٹھہر کر کہی یہ بات
اچھا میں خود چلوں گا اب اللہ کے حضور
دو گھونٹ پی لوں تاکہ دوبالا رہے سرور
بگڑے ہوئے ... کی حالت سنبھالی
یہ کہہ کے اپنی جیب سے بوتل نکال لی
دیکھی ملائکہ نے جو بوتل کی آب و تاب
پھیری زبان ہونٹوں پہ نیت ہوئی خراب
غالب ملک کی بات سے تنگ آ کے پی گئے
دانتوں سے کاگ کھول کے جھلا کے پی گئے

جب پی چکے شراب دوبالا ہوا سرور
کہنے لگے کہ لے چلو اللہ کے حضور
گرز گراں لیے ہوئے ہر سو ملک چلے
غالب کو گھیر گھار کے اہلِ فلک چلے
پردے کے پاس آ کے ملک نے یہ دی صدا
غالب کو لے کے آئے ہیں خدام باوفا
تب آیت نے بڑھ کے یہ پہلے کیا سوال
پیشِ خدا شراب پی یہ تاب یہ مجال
فردوس سے جو باغِ جناں سے تجھے ملی
محشر میں یہ شراب کہاں سے تجھے ملی
غالب نے اس سوال کا ہنس کر دیا جواب
مجھ خانماں خراب پہ کیوں اس قدر عتاب

شاگرد تھے جو غالبِ خانہ خراب کے
دو آدھے رکھ گئے تھے کفن میں شراب کے
اک آدھا تو چھڑا لیا منکر نکیر نے
باقی جو بچ گئی تھی وہ پالی حقیر نے
جو ذہن پہ کھنچی تھی وہ تصویر ڈھل گئی
بیوی کے ڈانٹنے سے مری آنکھ کھل گئی

زندگی کا اصول ہو جیسے
کافروں میں رسول ہو جیسے
شبِ تاریک میں ہے یوں مہتاب
تیرے جوڑے میں پھول ہو جیسے

شاداب ادائیں بھی سمٹ سکتی ہیں
مخمور فضائیں بھی سمٹ سکتی ہیں
جوڑے کو ترے دیکھ کے آیا یہ خیال
ساون کی گھٹائیں بھی سمٹ سکتی ہیں

کل اک جوان جوڑا سینما کے روبرو
ہنس ہنس کے کر رہا تھا کچھ اس طرح گفتگو
جیسے زمیں کے بوسے کو جھکتا ہے آسمان
جیسے غریب فکر میں روزی کے ہو رواں
جیسے بہار گا نکلے سواری بہار پر
جیسے دھنک کا رنگ رخِ آبشار پر

جیسے کسی کتاب کا رنگین تر ورق
جیسے لباسِ قوس میں دوشیزۂ شفق
قاتل کے روبرو کوئی قاتل ہو جس طرح
آئینہ آئینے کے مقابل ہو جس طرح
یوں بے خیالیوں میں چلاتے تھے ہاتھ پاؤں
جیسے خرامِ ناز میں مصروف دھوپ چھاؤں
اک دوسرے کے کاندھے پہ رکھ رکھ کے اپنا ہاتھ
ہونٹوں کا رس بھی پیتے تھے سگرٹ کے کش کے ساتھ
میں آب و تابِ زیست سے گھبرا کے رہ گیا
ہر راہ گیر راہ میں للچا کے رہ گیا

وہ ناظر ریل ہو یا ہو پسنجر لیٹ جاتی ہے
مسلسل لیٹ جاتی ہے برابر لیٹ جاتی ہے
کوئی پیچھے سے جاکر یہ مری سرکار سے کہہ دے
میں جس گاڑی پہ چڑھتا ہوں وہ اکثر لیٹ جاتی ہے

اوروں کے لیے کچھ اور جی لوں تو چلوں
میں دامنِ صد چاک کو سی لوں تو چلوں
بس بس ملک الموت فقط اتنی دیر
جو جام میں باقی ہے وہ پی لوں تو چلوں

گھٹا نے پھر اٹھائے چمپئی آنچل تو کیا ہوگا
صراحی در بغل آنے لگے بادل تو کیا ہوگا
میں توبہ تو ابھی کر لوں مگر اے حضرتِ واعظ
کسی کے دستِ نازک میں ہوئی بوتل تو کیا ہوگا

کہیئے ذرا کچھ سوچ کے ایسی ہونگی
ایسی نہیں منظور تو ویسی ہونگی

یہ بات بتانا ہی پڑے گی اے شیخ
جنت میں جو حوریں ہیں وہ کیسی ہونگی

کر کے میں ہاؤ ہو نہیں پیتا
جا کے میں کو بکو نہیں پیتا
میں تو پیتا ہوں مے مگر ناظر
مفلسوں کا لہو نہیں پیتا

مہذب جتنا ہوتا جا رہا ہے
وقارِ انساں کا کھوتا جا رہا ہے
اسے بھی آدمی کہتے ہیں شاید
جسے رکشہ میں جوتا جا رہا ہے

زینتِ انجمن مبارکباد
فخرِ گنگ و جمن مبارکباد
تجھ سے باقی ہے نام اردو کا
سرزمینِ دکن مبارکباد

وہ بلندی تھی یا یہ پستی ہے
بات یہ زاہدوں کو ڈستی ہے
انقلابِ زمانہ کیا کہیے
گیہوں مہنگا شراب سستی ہے

خود اپنے آپ کہنا پڑ رہا ہے
پِتا کو باپ کہنا پڑ رہا ہے
خدا رکھے الیکشن کو سلامت
گدھوں کو باپ کہنا پڑ رہا ہے

پھر دامنِ صد چاک سِلے یا نہ سِلے
پھر غنچۂ صد رنگ کھِلے یا نہ کھِلے
دُنیا ہی میں کر لیجئے ہر فعلِ حرام
جنت کا ہے کیا ٹھیک مِلے یا نہ مِلے

ایک نظم

یہ اُونچی ہیل کی چپل، یہ تنگ تر شلوار
کھنچا کھنچا سا یہ جمپر، یہ چمپئی رُخسار
یہ اُلجھے اُلجھے سے گیسو کہ جیسے ابرِ بہار
تنے تنے سے یہ ابرو کہ جس طرح تلوار
جھُکی جھُکی سی یہ پلکیں کہ جیسے شامِ نگار
یہ لانبے لانبے سے بازو، سڈول اور گردار
ہر ایک جسم کا حصہ نگاہِ بد کا شکار
ہمارے عہدِ ترقی کی یہ امانت ہے
قسم خدا کی یہ دنیا نہیں ہے جنت ہے

ایک بند

وہ تیری آنکھیں کہ تاروں پہ جس طرح سفر آب
وہ تیری چال کہ پانی میں جس طرح مہتاب
وہ تیرے عارضِ رنگیں کہ سُرخ سُرخ گلاب
وہ تیرا جسم کہ شیشے کے پیرہن میں شراب
یہ دن دکھائے محبت کی حکمرانی نے
تباہ کر دیا مجھ کو تری جوانی نے

مینا کی موت میرے لیے تجربہ بنی
ناظرہ شراب و شعر نے مجھ کو بچا لیا
مینا شراب پیتی تھی رہتی تھی سب کے ساتھ
پاکیزہ بن گئی تو خدا نے بُلا لیا

حمایتُ اللہ

مرے دل کی مڑی دھن مڑی تو کون رے مجھے بولنے والا
کبھی بھاو ال گریں گے کبھی بھاواں چڑیں گے
کبھی اُپلیاں ڈبیں گے، کبھی پھترے تریں گے
کریں گے آڑی پو آڑی، تو کون رے مجھے بولنے والا
کبھی لاٹھی چلائیں گے، کبھی بلاں گرائیں گے
کوئی زدیلا منگا تو اُسے گولی کھلائیں گے
یہ جنتا سڑی تو سڑی، تو کون رے مجھے بولنے والا
کبھی ڈینجر پکڑ کے، کبھی قندیل پکڑ کے
کوئی غافل تھٹا تو اُس سے پیسے اکڑ کے
دے دیں گے تڑی پو تڑی، تو کون رے مجھے بولنے والا

○

الٰہی! یہ لیڈر سمجھ پا گئے کیا
شرافت کے رستے انھیں بھا گئے کیا
جدھر دیکھئے حق میں اردو کے لیکچر
الکشن کے دن پھر قریب آ گئے کیا

○

رہتے رہتے چپ جھگڑنا، آئی رے
دل مرا اک دم اُکھڑنا، آئی رے
کھیل چھپنے کا کبھی کھیلے تو ہم
چُپ کا چُپ آ کو سپڑنا، آئی رے
میں تڑپ کو بھاگ کو آتوں ککو!
ڈھونگ کا گرنا لنگڑنا، آئی رے
رُس کو گئے تو میں بُلاتوں سوچ کر
جاتے جاتے اُن کا مُڑنا، آئی رے
منتاں کر کو بُلایا آ گئے
اِس پہ اِترا کو اکڑنا، آئی رے
غصہ کرتے کرتے جب آئی ہنسی
ہونٹ دانتوں میں مروڑنا آئی رے

سہیلیوں کے بیچ میں چھیڑا تو میں
مُنہ میں مُنہ میں اُن کا گڑنا، آئی رے
میں تو تھا، اب تو ہوا بھی چھیڑ رئی
جھک کو ساڑی کو پکڑنا، آئی رے
قسمتوں سے میں اُنوں اِک دِن مِلے
اُن کی امّاں کا اُجڑنا، آئی رے
کیا مزا رہیں گا' دکھادے رے خُدا
اُن کی امّاں جی کا گڑنا، آئی رے

چھت پو اب آتیں کی جب آتیں سکو
ناچتے گلی میں کھڑنا، آئی رے
نائٹ شٹ پو پھر کو انگڑائی لیئے
گنڈیوں کا ٹُٹ کو جھڑنا، آئی رے
بات شادی کی کبھی چھیڑا تو میں
اُن کا شرمانا سُکڑنا، آئی رے
اُن کی ہاں سُننے کو زندہ ہوں مگر
اُن کا نیں نیں نیں پو اڑنا، آئی رے

رُس کو میں جانے اُٹھا تو روکنے
بیچ دروازے میں اڑنا، آئی رے

گلّی نلگنڈوی

لیڈر کی موت پر چمچوں کا مرثیہ

یا وارے دا تا رے' کاں کی جاتا رے، جاتا رے
تیرے دَم سے زندہ تھے سارے کے سارے گئے مر ہائے رے
امّاں باوا، جورو بچے زِندہ مر گئے، ہائے رے
اب کس کی ڈش میں کھانا رے

با وا رے . . . . .

تیری جھوٹی فارن کی وہسکی پیتے تھے' اب کیا پینا رے
جھوٹا گڑ مبہ بھی نئیں پلا تو بول رے کیا جینا رے
ساقی تھا سے خانہ تھا جمشید کا تھا پیمانہ رے

باوارے . . .

تیرا ایک اِچ ایک بٹیا، اللہ میاں کی گائے اُن
ہمارا کیا کلیان کرے گا پورا ہے برہمچاری اُن
شیطان کے پیٹ میں ولی کے جیسا ان کو ہوا اُتے پیدا رے

باوارے . . .

کون سا الکشن لڑنے کو جارائے خواب میں آ کو بتلادے
سب کو دھوکا دیئے سریکا ہمنا نکو دھوکا دے
جِینا تیرا دھوکا تھا، یہ مَرنا بھی ہے کیا دھوکا رے

باوارے . . .

بغیر سیکوینس رمیوں پو رمیاں' کھیلوں پو کھیلے کرتے تھے
جوکر کاں کی رہتا تھا، پیارے اپنا دھندا کرتے تھے
تاش کے باون پتوں میں تو یکوں میں تھا یکہ رے

باوارے . . .

اسمگلنگ اور بلیک مارکٹ ایک دم سے بند ہو جائینگے
تیرے چمچے کے یہ چمچے بول بتا پھر کیا کھائیں گے
سونے کا انڈا دیتا تھا سو تھا تو اصلی مُرغا رے

باوارے . . .

تیرے الکشن کی گڑبڑ میں کتے قتل ہم کر ڈالے !
تیرے دَم سے چُپ تھی سی آئی ڈی اب کیا کرتی کی نارے
گلے میں جلدی پڑنے کو دِکھ رائے پھانسی کا شند پھندا رے

باوارے . . .

تیرے بجائے چمچوں میں سے چمچوں کے بچے مرنا تھا
چمچوں کے بچے بھی نئیں مرے تو چمچوں کے سگے مرنا تھا
تیرا بلا سے کیوں نئیں مارتے چمچوں میں سے کوئی چمچہ رے
باوا رے . . .

تیرے آدمی ہم کو سمجھ کو سارے لوگاں ڈرتے تھے
شہر میں جتنے بھی تھے طوائف جھک کو سلاماں کرتے تھے
ہارمونیم بند ہوگئی ہے جتنا ہے غم کا دھیڑا رے
باوا رے . . .

کار میں تیری تن کو پھرتے تھے دنیا کو منہ کیا دکھائیں گے
قبر میں تیری جگہ ملی تو بازو تیرے سو جائیں گے
دسواں، بیسواں نئیں تو نئیں کون دیں گا قل کا دھیلا رے
باوا رے . . .

کل تک راجا ٹھاٹ تھا اپنا، آج فقیر بن گئے ہم
ماں بھی نو تھا، باوا بھی نکو تھا، یتیم یسیر بن گئے ہم
بنسری بجا کو گلی گلی میں جینگے منگ کو چندہ رے
باوا رے . . .

باوا رے . . .
کیا کرنا دل گھٹا کریں گے تجھ کو ہم دفنا دیں گے
تیری قبر کے اوپر گنبد بھی ایک بنا دیں گے
تربت کے اوپر چمچہ، بیٹھینگا کوئی اک سجادہ رے
باوا رے . . .

کون ہے ہاتوں سے اب تجھ کو بول ہمیں دفنانا رے
پنڈت نیم تھا، بابر تھا، تو مٹی میں کیسے ملانا رے
میوزیم میں اب رکھ کو جنازہ سب کو ٹکٹ سے دکھانا رے
باوا رے . . .

تازہ قتل اور اغوا کے کچھ تیرے بن گئے کیساں تھے
دلی میں اک بنک لٹا سو ہم لوگ پی الزام یاں تھے
گلی کے سرکیا اڑتے تھے کیا، ڈنڈوں کا تھا تو ڈنڈا رے

میرے ہی رنگ میں اُنوں بھی جی کو ہیں
زخمِ دل پورے کے پورے سی کو ہیں
وہ جو سر ماریں کر پیتا ہے غلط
کیا بتاؤں وہ بھی صاحب پی کو ہیں

ہر موڑ پو حسینوں کا چکر ہے آج کل
معشوق کتو کیا ہی کبوتر ہے آج کل
عالم تمام پھرتا ہے ٹورسٹ کار میں
دل ان کا ٹرانسپورٹ منسٹر ہے آج کل

غزل

اُنوں سننگ کرائے سرکیا ہے
شرارت کا سگنل گرائے سرکیا ہے
مجھے کیا تمیں اب سنبھالے سرکیا ہے
تم بھی زری ماموں چڑھائے سرکیا ہے
مروت میں کمیا ڈبائے سرکیا ہے
ملاحظہ میں مرغا کھلائے سرکیا ہے
ندی کے کنارے پو خوشبو مہک رہی
گلابوں کی مہک بہائے سرکیا ہے
اُنوں میری لنگی پہن کو نکل رئیں
منجے اپنی ساڑی پہنائے سرکیا ہے
مرے دیش کا ہے غریبی مقدر
اُنوں کیا غریبی ہٹائے سرکیا ہے
منجے فون کر کو جو ہو ڈیئر کہہ رئیں
اُنوں رانگ نمبر بلائے سرکیا ہے
بہت لیڈراں جھک کو کررئیں سلاماں
الکشن کے دن پھر کو آئے سرکیا ہے
اُنوں چائے پو چائے منجے پلا رئیں
اُنوں پھر بھلا یاں لگائے سرکیا ہے

جدھر دیکھو گلی کے مُنڈوں لیو داغاں
اُنوں دھر کو ڈنڈا بجائے سرکیا ہے

ایک نظم

مَیں نہیں کہتا ہوں استاریبی کہتا ہے
آپ کل سُرخ ترو تازہ ٹماٹر ہوں گے
یوں سمجھ لیجیئے پولس میں آفیسر ہوں گے
آپ کے گھر پہ کئی بکروں کے چکر ہوں گے
آپ کے ہاتھ کی ریکھاؤں میں امریکہ ہے
مَیں نہیں کہتا ہوں . . .
آپ گودام میں اسٹور کیئے ہیں غلّہ
دام بڑھ جائیں گے اس سال جو اللہ اللہ
مارکٹ میں نہیں پھر آپ کا ہم پلّہ
چور بازاری کے دھندے میں خسارہ کیا ہے
مَیں نہیں کہتا ہوں . . .
آپ مُردوں کے جو اشعار چُرا لیتے ہیں
واہ کیا کہیئے، سلیقے سے سُنا لیتے ہیں
داد ہو یا نہ ہو، اِک رنگ جما لیتے ہیں
آپ کی جراتِ شعری کا بڑا چرچا ہے
مَیں نہیں کہتا . . .
معمولی آدمی فولاد نظر آتے ہیں
آپ شہزادۂ شدّاد نظر آتے ہیں
کسی مے خوار کی اولاد نظر آتے ہیں
مَیں نہیں کہتا . . .
لڑکیاں آپ کے اطراف رہا کرتی ہیں
آپ کے نام کی مالا بھی جپا کرتی ہیں
جان و دل آپ پہ قربان کیا کرتی ہیں
پھر کہیں آپ کو رشتہ کی ضرورت کیا ہے
مَیں نہیں کہتا . . .

آپ کے عشق میں مولانا بہت گھپلا ہے
سب رقیبوں میں رقیب آپ کا اِک غنڈہ ہے
تخت اِک روز اُلٹ دیگا بڑا لچّا ہے
کیسے کہدوں کہ رقیب آپ کا ہی لڑکا ہے
مَیں نہیں کہتا . . .
آپ بنتے ہی منسٹر جو بدل جائیں گے
دیکھتے ہی دیکھتے انڈیا کو نگل جائیں گے
آپ کے صدقے میں چمچے کئی پل جائیں گے
آپ کا ظرف معاذ اللہ بہت اُونچا ہے
مَیں نہیں کہتا . . .
آپ تو مرشدِ کامل بھی کبھی ہوں گے ضرور
یوں سمجھ لیجیئے عامل بھی کبھی ہوں گے ضرور
چار سو بیسوں میں شامل بھی کبھی ہو گے ضرور
آپ کے ہاتھ میں گلّی سے بڑا ڈنڈا ہے
مَیں نہیں کہتا ہوں، اِسٹاریبی کہتا ہے

طالب خوندمیری

ایک نظم

باغ میں کچھ سہیلیاں جب اتفاقاً مِل گئیں
دیکھ کر اِک دوسرے کو سب کی باچھیں کھل گئیں
سب کی سب کہنے لگیں آ پس میں مِل مِل کے گلے
آؤ اللہ بیٹھکر ہم عشق پیچاں کے تلے
اپنے اپنے آیڈیل سرتاج کی باتیں کریں!
ہونے والے گھر میں اپنے راج کی باتیں کریں!!

اور پھر منڈوے تلے یہ کارواں جب تھم گیا
ایک نے پھر دوسری کے گال سہلا کر کہا
تو بتا فرخندہ! تجھ کو کیسا شوہر چاہیئے
سیٹھ، ساہوکار یا سرکاری نوکر چاہیئے

ڈاکٹر ہو یا کوئی کمپاؤنڈر چل جائے گا
یا ترے گھر کی گلی کا مین گر چل جائے گا
سُن کے فرخندہ نے پہلے ناز سے انگڑائی لی
پھر شرارت سے دبا کر آنکھ یہ کہنے لگی
کوئی بھی ہو تندرستی میں مگر ہو لاجواب
دیو آنند کا بڑھاپا ہو جیتندر کا شباب
زندگی کی وہ اُچھلتی، کُودتی تصویر ہو
یعنی وہ بھی ڈارون کے خواب کی تعبیر ہو
اُس کے ذہن و دل میں بس رنگینیاں آباد ہوں
کم سے کم سو نام فلموں کے زبانی یاد ہوں

کر چکی جب ختم بی فرخندہ اپنی داستاں!
راشدہ کہنے لگی مٹکا کے اپنی انکھیاں
شیخ چلی ہو، یا رمضانی ہو، یا عبدالرشید
اِک لنڈورا ڈھونڈ کر اس کو بنا لوں گی مرید
ابنِ لیلیٰ کا پسر یا قیس کی اولاد ہو! !
سب سے پہلی شرط بس یہ ہے کہ گھر داماد ہو
چاہے کوئی پوسٹ ہو لیکن ذرا زرخیز ہو
تاکہ پیداوار بھی نوٹوں کی تھوڑی تیز ہو
کم سے کم تنخواہ سے دونی تو بالائی رہے
ایک پربت بھی ضروری ہے جہاں لیلائی رہے
روز آفس سے زیادہ کام وہ گھر پر کرے
اپنے افسر سے زیادہ میری امّی سے ڈرے

کانتا بولی! پتی اپنا تو چکنا چاہیئے
لکھ پتی ماں باپ کا اکلوتا لڑکا چاہیئے
ہر بھی سامان گھر میں عیش و عشرت کے لیے
نوکروں کی فوج بھی ہو میری خدمت کے لیے

ہر اشارے پر مرے اِک ناچنے والا رہے
میرے ڈسپوزل میں ہر دم ایک امپالا رہے
نام پر لکھ دے مرے وہ باپ کی جاگیر بھی
کوٹھیاں دو چار کروا دے نئی تعمیر بھی
دل لگا کر خوب میری رات دن سیوا کرے
سامنے اپنے بٹھا کر وہ مری پوجا کرے
ساس سے جھگڑا کروں تو وہ مری پالنگ کرے
یا نہیں تو کم سے کم وہ دُور سے واچنگ کرے

اور اپنے بعد یہ روزی سے پوچھی کانتا
تیرا کالج میں کسی سے ہو رہا تھا، کیا ہوا
جب سُنی یہ بات تو اِٹھلا کے روزی نے کہا
یور لوکا بات ڈُو شو ڈُو ناٹ ٹِل می کانتا
اپنا سالا لائف ہے اِنجوائے کرنے کیلئے
سوئمنگ چھوکرا ہے ہم ہے ڈیٹ کرنے کے لیے
اپنا ممی اور ڈیڈی بھی بہت ایڈوانس ہے
اِس لیے اپنے 'بلڈ' میں بھی بہت رومانس ہے
پہلے اپنا لو تھا ولیم جارج سے بٹ ناؤ ڈیز
اِک نیا ہیرو ہمارا روڈ پہ کرتا ہے چیز
اب انگلینڈ بھی ہم کو ڈیٹ کرتا ہے مگر
فرینکلی بل یو ڈیر آئی ڈونٹ میاری ہِم مگر
لائف کے انجوائمنٹ سے بور جب ہو جائیگا
ہم بھی پرمننٹ ہسبنڈ ڈھونڈ کر لے آئے گا

اور اس کے بعد بس جگجیت لہرا کر اُٹھی!
اپنی پنجابی اَدا سے تن کے یہ کہنے لگی
ساڈا ارا بنجارا وچ ساڈے نال جھگڑا کر سکے
دیس دے لئی او گردوارا نا آلے کر سکے

DATE [1] FRANKLY [2] CHASE [3] BUT NOW A DAYS [4] YOU SHOULD NOT TELL ME [5]
PERMANENT [6]

کوئی بس مہتا سے یہ پوچھی تمارو کیم چھے
ہنس کے وہ بولی نروڑی بھائی ایونیم چھے
اور اُس کے بعد لیوں گویا ہوئی ہس کھا تنڈے
ہم کو بانڈے وار دھڑ دھاکٹ پر تیم پا ہیجے

غور سے سب سہیلیوں کی گفتگو جب سُن چکی
اپنی عینک ٹھیک کر کے عالیہ کہنے لگی
دل مچلتا ہے کہ اپنا لے کسی زردار کو
پر نگاہیں ڈھونڈھتی ہیں منفرد فنکار کو
وہ شرابِ فکر و فن کا رندِ مستانہ رہے
سارترے کا فین بیتھوون کا دیوانہ رہے
سن کے اس کی بات فرخندہ نے جھنجھلا کر کہا
کیا کہا تو نے یہ پگلی تجھ کو آخر کیا ہوا
تیرا مطلب ہے کہ تجھ کو فلسفی مرغا ملے
یعنی افلاطون کے پوتے کا پڑپوتا ملے
فلسفی پلّے پڑا تو تیرا بیڑا غرق ہے
کیوں کہ اُن میں اور انسانوں میں کافی فرق ہے
وہ تو دیمک کی طرح موٹی کتابیں کھائے گا
تیرے ارمانوں کو فاقوں میں سکھایا جائے گا
تیری اک اک رات نذرِ فلسفہ ہو جائے گی
وہ فقط سوچا کرے گا اور تو سو جائے گی

چھیڑ کر جب سروری سے بھی یہی پوچھا گیا
سوچ کر کچھ دیر اس نے بھی متانت سے کہا
کیا بتاؤں شوق کا میرے الگ انداز ہے
طائرِ فکر و نظر کی مختلف پرواز ہے
کوئی پنجابی، یا گجراتی یا مدراسی رہے
افسرِ اعلیٰ رہے یا صرف چپراسی رہے
وہ رہے کوشاں فروغِ آدمیت کے لیے
زندگی بھی وقف کر دے ملک و ملت کے لیے

وہ جنون و جذبہ و ادراک میں اقبال ہو
اور میدانِ عمل میں وہ جواہر لال ہو

سُن کے اس کی بات کوئی منہ بنا کر رہ گئی
اور کوئی مسکرا کر طنز سے کہنے لگی
ایسا شوہر تو تجھے بس تیرے خوابوں میں ملے
یا نہیں تو پھر وہ تاریخی کتابوں میں ملے
تو ابھی بچھڑے ہوئے اقدار کی چکر میں ہے
ٹاپ لس کے دور میں تو گھونگھٹ میں جا رہی ہے
گو تو تُلی ہے کوئی مولوی ہی ڈھونڈ لے
یا سہولت کے لیے فرزندِ قاضی ڈھونڈ لے
ورنہ تیرا میاں ملنا تو بہت دشوار ہے
آج کل ہر شخص کی بدلی ہوئی رفتار ہے

▲

اشرف خوندمیری

"چان کی بُڈی" (میرے سوالاں اُس کے جواباں)

چان کی بُڈی سان پکڑ کو سچی سچی بول
میرے مُلک کی قسمت کیکو ہوگئی غلِّی غول
چیل کی نیت مرداروں پو کیکو ہے کنڈول
ہم لوگوں کی حالت کیکو ہوگئی جیج ڈھول
تیرے رُکھے بٹھوں میں کیں داوں تو من تیل
بول بُڈی اگے بی کبھی دیکھی ایسا کھیل
بھگتاں کو بھلتی جا رئیے بھاتی کی تون
ہم کو دلیا یا کھنڈی کو بریانی کی خون
جھوٹ تو اپنی جل اُگل گئی سچ کی سڑ گئی لون
لالچ انسانوں کے نچے چپکی ہیں کو گون
بھلے بُرے ہور چھوٹے بڑے سب اب ہے اس کا میل
بول بُڈی اَئے ۔ ۔ ۔

ہم نے تو روزاں کھاریں دیدو اوں اس الجھن
بھوک ہور پیاس کی گلی میں اٹھ گئی تا فون
دھن والوں کی مٹھی بن گئی بدروں کا قانون
کھٹل بن کو پی جارئیں مجھتے لوگوں کا خون
کیتے اُنچے جھاڑ پو چڑھ گئی من مانی کی بیل
بول بڈّی اگے ....

سیٹھاں ساہوکار لٹیرے بدلیں جیسے گیر
نشّہ آم کے جھاڑاں پرا ئے لگ رئیں کھٹّے بیر
ان کا کونیہ ڈوبنے میں اب ہور ہے کتّی دیر
دو دو من کے لوٹاں لیکو سودا دے ریاں سیر
کُھڑا دیو کچہری میں بھاریں پلّہ پلّہ تیل!
بول بڈّی اگے ....

نام جنگ کے ہیلوں کو اب رہ گیا اتّا کام
ذٹ پاتوں کے کھمبے بن کو روشن کر رئیں نام
دن نکلے تک ٹانگاں پھیلا کو کر تیں آرام
لانڈے مونڈے کھا کھا کو کھو دیتیں نی شام
سڑکوں کو تو گھر سمجھتیں ہور گھر کو سمجھتیں جیل
ان کو لکھنے پڑھنے سے ہے عمر بھر کیا بیر
برس برس کو کر لیتیں پکّسی فلموں کی سیر
اسکولوں کے رستوں پو جب آ گرئیں ان کے پیر
بھٹ بول کو پیچر ہو تیں ہونڈی عقل کے ٹیر
پڑتا لاں میں پاس ہو جاتیں امتحاناں میں فیل
بول بڈّی آگے بی ...

جب سے ان میں بی آ گئی ہیں پیٹوں کی شان
مشکل سے ہور یکجے اب نر ہور مادی میں پہچان
میں بی سوچتا رہتوں ہو کو حیرت میں غلطان
کس کو اپنا بھی سمجوں ہور کس کو سمجوں بھان
دو لوں کو نچیّے بلے بائم اُپر لوئی ٹھیل!
بول بڈّی آگے بی ...

اللہ میاں بی کیکو کی بدلیں اپنی چال
رس گئے ہیں نگے دیک کو اپنے بندوں کا حال
جنگلے جنگل سکائی سکا گوں گوں میں کال
ہلو ہلو لوّن پھیلا رائے بربادی کا جال
کیسے کھڈّے کے موں پو آ گئی دنیا کی ریل!
بول بڈّی آگے بی کیں دیکھی ایسا کھیل!

اُس کے جاباں

تیرے ملک کی حالت اب ہو گئی بہتّی ویران
میری بڈّی عقل بی ہو گئی اتّی حیران
تیرے غم کا آتا ئی میرا غم بی ہے ڈو تمان
تیرے باتاں سن سن کو بیٹھے ہورائے لوران
پھر بھی سوب کا سول کو تو رب کی مرضی لو ٹھیل
میرے باوا میرے بچّے تو غم نکّو جھیل

کیکو چھپارائے لصوں میں سوسینوں میں تو شمشیر
کلف پڑیا سو گھر کی کیکو کھٹکا رائے زنجیر
کیکو ہلارائے باوا خالی دیغوں میں کبگیر
اتّے ڈوغن خابوں کی بوٹی میں نکّو تیر
اتّا نکّو اکڑائیں تو جائیں گا تو بی جیل
میرے باوا میرے بچّے ...

مابی جائینگی سوب کے گنوں کی اک دن اک اک انیغ
بن بن کو ترسیں گے کوئی بی نیں دالیگا پیچ
ڈھیلوں پو ڈھیلا دے دے کو ہونگی کھینچم کھینچ
رنگ لا کو رہیا گی ماصوموں کے زخموں کی مینچ
کیں نہ کیں جا کو رک جائینگی من مانی کی ریل
میرے باوا میرے بچّے ...

اللہ میاں سوچ سمجھ کو دے دیں سوب کو ڈھیل
رس گئے تو پھر کھینچ کو رک دیں گے رحمت کی ریل
تو کیکو پی جارائے غم کی اتری سوا میل
کیکو بجھا کو بیٹھ گیا رے ہمت کی قندیل

اِک نہ اِک دن ظُلم کی ہنڈی کا سَر جائیں گا تیل
میرے باوا میرے جنّے
مستی کا چسکا ڈھیئی بی بن جائینگا تِپلی چھاچ
پھر چالاں بھول کر سوب ناچیں گے ننگی کا ناچ
رُس رُس کو جب بھڑک اٹھیں گی اُسکے غضب کی آنچ
تڑاخ تڑاخ کو گر جائینگی ہر شیش محل کی کانچ
سوب کو ڈھنکنا میرے رَب کی قدرت کا کھیل
میرے باوا میرے جنّے تو غم نکو جھیل!

■

اسمٰعیل ظریفؔ

بدلنے ذائقہ انگور کھٹّے پیش خدمت ہیں
ظرافت کا یہ تحفہ آج اس محفل میں آیا ہے
گذارش ہے مری اس کا مزا اب آپ بھی چکھیں
بہت سے اچھے اچھوں کو مزئیں نے چکھایا ہے

کوچے سے محبت کے گذرنا سیکھو
اُن پر نئے انداز سے مرنا سیکھو
غیروں کو ہری گھاس کو تکنے والو
رہ کر حدِ مخصوص میں چرنا سیکھو

سکار اب عورتیں چلاتی ہیں
بس چلاؤ تو کوئی بات بنے
مُسکرانے سے کچھ نہیں ہوگا
ہنہناؤ تو کوئی بات بنے

دوا خانوں میں دفتر میں کلب میں روڈ پر جھے
کبھی تو میز پر کھانے کی آتے ہیں نظر جھے
گلی کوچوں میں اکثر موڑ پر پاؤگے تم اُنکو

زمانہ ہے یہ جھوں کا جدھر دیکھو اُدھر جھے

ٹھیک ہے فیشن بدلتا ہے مگر
کچھ حقیقت کا تو اندازہ لگے
چل گئی اُلٹی ہوا ایسی ظریفؔ
دیکھنے میں نر بھی اب مادہ لگے

سَرپٹ حیدرآبادی

بے تحاشہ عشق کر سکتا ہوں میں
جس حسین پر چاہوں مر سکتا ہوں میں
چال سرپٹ چلتا ہے گھوڑا میرا
کیا کسی ٹٹّو سے ڈر سکتا ہوں میں

مَیں خود استاد ہوں میرا کوئی استاد نہیں
ایسی تعمیر ہوں جس کی کوئی بنیاد نہیں
فسٹ اِن فسٹ ہمیشہ ہی رہا عشق میرا
عہدِ حاضر کا ٹرک چھاپ ہوں فرہاد نہیں

جو نمایاں تھے وہ مستور ہوئے جاتے ہیں
تھے جو کیری وہی انگور ہوئے جاتے ہیں
اس گرانی میں کچھ ایسے بھی ہیں کھانے والے
کھاتے کھاتے جو ٹھمپور ہوئے جاتے ہیں

گئی بہار، فریبِ بہار باقی ہے
بڑھاپے میں بھی کسی کا نکھار باقی ہے
نہ پیٹ میں ہے کوئی آنت اور نہ منہ میں دانت
مگر حسینوں میں اُن کا شمار باقی ہے

وہ آگئے تو موت کا بھی وقت ٹل گیا
یعنی کفن کو پھاڑ کے مُردہ نکل گیا

آوارہ ہے نہیں ہے کوئی دل کا اعتبار
چکنی جہاں دکھائی دے صورت پھسل گیا

اس حادثہ کا نام محبت ہے غالبؔ
ٹکرائی آنکھ دل کا کچومر نکل گیا

پیٹو سمجھ رہا ہے زمانہ مجھے تو کیوں
سوچوں گا غالباً میرا معدہ بدل گیا

سمجھا مجھے فقیر کہا معاف کیجئے
جب اس کے آگے گاتے ہوئے میں غزل گیا

پرواز روح کرگئی سُنتے ہی اسکا نام
پاتے ہی موقعہ جانب سے مُرغا نکل گیا

میدانِ عاشقی میں ہوئی جب کبھی گھڑدوڑ
سرپٹ ہر اک دوڑ میں آگے نکل گیا

فیضُ الرحمٰن فیضؔ

اپنی اپنی عزت ہے اپنے اپنے ہاتھ
گھونسے کو ہے گھونسہ تو لات کو ہے لات
صحبت اگر اچھی ملے، اچھے بنیں گے
ہونہار بِروا کے ہیں چکنے چکنے پات

بیچلری کا یقیں دلائے
ان کو جب رستے پر لائے
ایسے وقت میں ہائے ہائے
گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے

گھر کے ہنڈیاں لوٹ اور لوٹا
چمچہ بھی کرتا ہے سلیوٹ
دے دے کر وہ جعلی نوٹ

مانگ رہے ہیں گھر گھر ووٹ
بھائی ہمارے جیون لال
یہ مُنہ اور مسور کی دال

شیخ جی پہنے بُشرٹ پائنٹ
ہاتھ میں تسبیح ڈے اینڈ نائٹ
ہیرو بن کر مارے لائیٹ
مے خانے میں گزرے نائٹ
بس اِتنا ہے عرضِ حال!
یہ مُنہ اور مسور کی دال!

اماں ٹرنہ ہا وا ٹر
لاکھ فائن گھر کا گھر
لیکن بیٹھے ہیں لیڈرا
سونے نہیں، ہے اک بستر!
خواب میں ہے کشمیری شال
یہ مُنہ اور مسور کی دال

پیسے والے دیوتا ناگ
گاتے ہیں اُلفت کے راگ
سب کے کہاں ہیں ایسے بھاگ
کیا سینکیں گے ٹھنڈی آگ
چوپال ہوتا نینی تال!
یہ مُنہ اور مسور کی دال!

ڈھکن رائچوری

آج تو آکو لے جارے بھیک شام کی
میں نے روٹی نکال ہے تیرے نام کی
ترے نام کی، رے سائیں، تیرے نام کی
میں نے روٹی نکالی ہے تیرے نام کی

ہندیرا ہُوا پن کی ٹُوٹی نہ آیا !
مجھے تیری قسمت نے دَر دَر پھرایا
کبھی بھُوکا سویا، کبھی سُوکا کھایا
مگر درد دل میں نہ لوگاں کے آیا
بیگی آجا پکائی ہوں مچھی بام کی
مَیں نے روٹی نکالی ہے تیرے نام کی
بڑے تیلاں سے میں روٹی پکائی
ترے واسطے اُس کو گھی بی لگائی
پکانے کو روٹی میں پوٹی رُو لائی
مَرد کے میں اپنے گالیاں بی کھائی
ماراں کھا کو بنائی ہوں چٹنی آم کی
مَیں نے روٹی . . .
اِدھر گالیاں کھا کو، اُدھر باناں مُن کو
بلی تجھ کو روٹی نہ کپڑائی تن کو
لگاؤ جی انگار لوگاں کے دَھن کو
صرف مَیں ہی سمجھی ہوں دل کی چبھن کو
لوگاں برٹی اُٹھائے ہیں میرے نام کی
کیکو روٹی نکالی میں تیرے نام کی
ترے نام کی رہے سا بھی تیرے نام کی

جھرّیاں جا بجا ہیں گالوں پر
حسن آیا ہے اُجلے بالوں پر
رنگ بھی کیا خضاب لایا ہے
جیسے سچ مچ شباب آیا ہے
مُنڈی ہلتی ہے ہاتھ میں رعشہ
خوں بدن میں نہیں ہے اک ماشہ
اس پہ طرّہ اکڑ کے چلتے ہیں
یعنی لکڑی پکڑ کے چلتے ہیں

بگڑّ رائچوری

پانچ من کی کڑھائی تو ہو تیچ
جاں بھی دیکھو بڑھائی تو ہو تیچ
کتّا پڑھ لکھ کو ڈگریاں لے کو
ساس بہو میں لڑائی تو ہو تیچ

پھٹے کپڑوں کو اپنے سی لیتوں
رکھی سو کھیچ کھا کو جی لیتوں
بڑا شاعر بنوں گا پیوں گا شراب
چھوٹا شاعر ہوں سیندھی پی لیتوں

▲

گلیم میدکی

کس کی شادی ہے بزم ہستی میں
دھوم ہے کل سے سارکی بستی میں
ہر طرف جشنِ شادمانی ہے
آج موئس کا عقدِ ثانی ہے
بیل بھی چڑھ رہی ہے منڈوے پر
آگیا ہے سہاگ رنڈوے پر
ساٹھ سالہ ہے نوجواں نوشہ
نستھار سنیم زماں نوشہ

جل تو جلال تو — صاحب کمال تو
گرتوں کو سنبھال تو — آئی بلا کو ٹال تو

غلّہ ہے نہ پانی ہے — سب کو پریشانی ہے
سر چڑھ کو گرانی ہے — جاں دیکھو من مانی ہے
عزت اب سنبھال تو — جل تو جلال تو

جاں دیکھو گھیراؤ ہے — فائرنگ ہے پتھراؤ ہے
غصّہ ہے اور تاؤ ہے — کرتب ہے اور داؤ ہے

اور نکّو اچھال تو — جبل تو جلال تو

ہماں بن کو ساس آئی — گلے شکوے ساتھ لائی
کرنے لگیں کائیں کائیں — رونے لگیں دھائیں دھائیں
اندھی کر لے چال تو — جبل تو جلال تو

نوکری چاکری نئیں — شادی میری ہوتیچ نئیں
ہاتھ کو دولت ملتے نئیں — لاٹری بیٹھے اٹھتے نئیں
اتا کھول دے فال تو — جبل تو جلال تو!

قبرستان تو تیرا زور — مشہور ہے تو کفن چور
نکّو دیکھ مردے کا گھور — نکّو چھوڑ یوں ڈھیلی ڈور
پکّا ہے غسّال تو! — جبل تو جلال تو

دل اپنا اناڑی ہے — سندھی ہے اور تاڑی ہے
ساقی تو کھلاڑی ہے — اُلال اپنی گاڑی ہے
ذات کا کلال تو — جبل تو جلال تو

بنیا ہے اور دانا ہے — مالک زمانہ ہے
بگڑے سے یارانہ ہے — کیا تجھ سے فرمانا ہے
سن لے عرضِ حال تو — جبل تو جلال تو

بوگس حیدرآبادی

وہ دُلہن ہماری بنتی جو اُسے بھی پیار ہوتا
یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
نہ ہوا تقرر اپنا اسی غم میں مر گئے ہم
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
کوئی چاند کا مسافر دنیا سے جا کے مر ہی جاتا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

کئی بار ہیروئن کر کیں فلم میں مر چکا ہوں
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

صبغت اللہ بمباٹ

گھر میں داخل ہوا تو بیگم نے
یہ کہا اضطراب سے مجھ کو
آپ کے دوست جو ریاض ہیں نا
ان سے فوری یہ بات جا کے کہو
وہ نہ سلطانہ سے کریں شادی
مل سکے گا کبھی نہ سکھ اُن کو
اِک تو جاہل ہے اور پھوہڑ ہے
دوسرے بد دماغ بھی ہے وہ
ایک پل سوچ کر کہا میں نے
روکوں اس کو نہ ہو گا یہ مجھ سے
اس نے روکا تھا کب مجھے بیگم
کر رہا تھا بیاہ جب تم سے

ایک دن غصّہ میں میں نے ان کو چانٹا جڑ دیا
اور جواباً اُس نے میرا گال نیلا کر دیا

دل میں سوچا دیکھئے کیا ہوتا ہے اس کا جواب
اور ڈرتے ڈرتے اس کے گال کا بوسہ لیا
میری حیرت کی کوئی حد ہی نہ تھی اس وقت جب
دوسرا بھی گال اس نے میرے آگے کر دیا

دوستی بھی ڈالڈا دلدار بھی جعلی ملا!
گھی چربی سے گیا گزرا ملا جب گھی ملا!
کچھ نہیں خالص جہاں میں بے ایمانی کے سوا
سب تو سب مرنے گئے تو زہر بھی نقلی ملا

غزلیں

محمود نشتر

بدن جب سے ٹوٹا کھنڈر ہوگیا ہے
مجھے آئینے سے بھی ڈر ہوگیا ہے

وہ اپنی سہیلی کے ساتھ آرہے تھے
مرا دل اِدھر سے اُدھر ہوگیا ہے

نہ تھی جس کو پینے پلانے سے رغبت
وہ زاہد مرا ہم سفر ہوگیا ہے

خضاب اور لپ اسٹک بھی کیا رنگ لائے
مرا شوق ٹیکنی کلر ہوگیا ہے

ہوئی لِسٹ فرمائشوں کی جو لمبی
سفر پیار کا مختصر ہوگیا ہے

نوازا ہے پولیس کے ڈنڈوں نے جس کو
وہی عشق میں معتبر ہوگیا ہے

بڑھاپا جوانی ہوے ایک نشتر
نہ ہونا تھا ایسا مگر ہوگیا ہے

سراج زملی

یہ سوچے من ہی من، مٹان خاں ہے
فدا سو جاں سے مجھ پر ریشماں ہے

تمہارا دوست گر چنگیز خاں ہے
ہمارا بھی نصیر اللہ میاں ہے

مجھے پیٹو تو ہوگا درد اُس کو
ہمارے جسم دو ہیں ایک جاں ہے

یہی امریکہ کہتا ہے سبھی سے
ہمارے آگے خم سارا جہاں ہے

جو کل سائیس تھا اک اصطبل میں
بتاتا خود کو اب سائنس داں ہے

بھرے بازار میں پیٹا تھا جس نے
فلاں۔ اِبن چُناں اِبنِ فلاں ہے

اُجاڑے ہے چمن کو، جو، وہ ظالم
کوئی دوجا نہیں ہے باغباں ہے

سراج اب شیش آسن کر رہا ہے
زمیں اوپر ہے نیچے آسماں ہے

۱۔ शीष
۲۔ आसन

تمیز پرواز

صاف اور شفاف پانی ڈھونڈتے رہ جاؤ گے
لوگ اچھے خاندانی ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

کرتے ہیں خود ساختہ بحروں میں وہ مشق سخن
اُن کے شعروں میں روانی ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

شرٹ اور پتلون چھاپے دار آئیں گے نظر
عید کے دن شیروانی ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

آج پچپن سال بھی ہوتے ہیں بچپن میں شمار
پختہ پن کی ہر نشانی ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

کوئی بھی لڑکی پسند آتی نہیں کچھ تو ہے راز
چار دن کی ہے جوانی ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

آج موقع مل گیا پرواز کو سن لیجئے
رات بھی اتنی سہانی ڈھونڈتے رہ جاؤ گے

کے ایس شفیق
(حیدرآباد)

شعرا کی بذلہ سنجی

اردو کے کسی ایسے شاعر کا ہم تصور ہی نہیں کرسکتے جس میں حسِ مزاح نہ ہو۔ میر۔ سودا۔ غالب۔ ذوق مومن۔ داغ، اکبر۔ جگر اور فیض سب ہی اپنا مخصوص اندازِ طنز و مزاح رکھتے تھے۔ مسرت و خوش گوئی ان کی فطرت کا خاصہ رہی ہے۔ ذہانت اور نگاہِ عمیق کی بدولت فطرتِ انسانی کی گہرائیوں تک انہیں رسائی میسر آئی۔ ان شعرا کی دسترس میں بذلہ سنجی اور طنز و مزاح کے وہ پُراثر ہتھیار تھے جن کے موزوں و بروقت استعمال سے وہ اپنے موضوع و مقابل کو مقتول و مجروح تو نہیں البتہ بے بس و مجبور ضرور کردیتے تھے۔

مرزا اسداللہ خاں غالب کا کلام زبان زدِ خاص و عام ہے جس میں بے پناہ سرمایہ ظرافت بھی ہے۔ غدر کے فوری بعد چند برطانوی فوجی غالب کو ان کی رہائش گاہ سے بالجبر پکڑ کر کرنل براؤن کے پاس لے گئے۔ کرنل نے ان کی وضع قطع دیکھ کر پوچھا "تم مسلمان ہو؟" غالب نے بغیر پلک جھپکائے فی الفور جواب دیا "آدھا" براؤن نے تعجب سے پوچھا اس کا مطلب؟ غالب نے جواب دیا "شراب پیتا ہوں۔ سور نہیں کھاتا" براؤن ہنس پڑا۔ اور ملازمت سے ما ضی خوشی گھ ہنے کو کہا۔

محمد علی مشہور سنہ مانہ علی بہادر ان میں بڑے بھائی تھے اور اپنی بذلہ سنجی کے لیے مشہور تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی شوکت علی بھی اتنے ہی شگفتہ مزاج تھے اور اپنے تن و توش کی فراوانی کے باعث "برادرِ بزرگ" کہلاتے تھے ان کے ایک تیسرے بھائی ذوالفقار بھی تھے۔ محمد علی اور ذوالفقار علی اوسط درجے کے شاعر تھے۔ ذوق شاعری شوکت علی کو چھو تک نہیں گیا تھا۔ ایک دوست نے شوکت علی سے بطور تمسخر پوچھا کہ ذوالفقار علی تو گوہر تخلص کرتے ہیں اور دوسرے بھائی محمد علی جوہر اور آخر آپ کا تخلص کیا ہے شوکت علی جو شعر نہیں کہتے تھے پٹ سے بولے 'جی شوہر'۔

اکبر الہ آبادی تجرد کے خلاف تھے بالخصوص خواتین کے۔ کلکتہ کی گوہر جان، مشہور موسیقار اور رقاصہ تھی۔ گوہر بہت متمول اور بن بیاہی تھی۔ جب اکبر سے ان کے دوستوں نے گوہر کے حسن و تمول کی داستان بیان کی تو شاعرِ ظریف نے یہ شعر پڑھا:

خوش نصیب آج یہاں کون ہے گوہر کے سوا ؎ سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

پڑھے لکھے ان پڑھ ہندو، شیعہ سنی سب ہی اکبر کے طنز و مزاح کا نشانہ بنتے رہے زائد از نصف صدی کی مدت تک یہ لوگ اور ان کی دھوکہ دہی و چال بازی اکبر کے تند و تیز مزاحیہ ہتھیاروں کا نشانہ بنی رہی:

پوچھا کہ شغل کیا ہے کہنے لگے گروجی ؛ بس رام رام جپنا، چیلوں کا مال اپنا

بیشتر مسلم مرد و خواتین اکبر کے مخالف اور خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ خاص طور پر بھوپال کی مسلم خواتین ان پر تنقید و مخالفت میں پیش پیش تھیں، ایک محترم خاتون آصف جہاں بیگم نے چیلنج کیا کہ دنیا کی کوئی طاقت مغربیت کے ورود اور فتح یابی کو روک نہیں سکتی۔ اکبر بھی اپنے مسلک کی حمایت میں اتنے ہی قوی اور ثابت قدم تھے:

اکبر دبے نہیں کسی سلطاں کی فوج سے
لیکن شہید ہو گئے بیگم کی فوج سے

ایک دفعہ جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، اسرار الحق مجاز اور چند دوسرے شعرائے اردو ایک بار میں مصروف شراب نوشی تھے۔ پنڈت ہری چند اختر جو مے نوش نہیں تھے شراب کی فہرست کے معائنہ میں مصروف تھے۔ جوش نے ان سے پوچھا کہ وہ کیا پڑھ رہے ہیں۔ ہری چند اختر نے جواب دیا کہ یہ اسپرٹ، شراب، بیر وغیرہ کی فہرست اور انکی قیمتیں دیکھ رہا ہوں۔ جوش جھٹ سے بولے۔

"پنڈت جی مینو (Menu) پڑھتے ہوئے ایسے لگتے ہو جیسے کہ ایک ہجڑا کوک شاستر پڑھ رہا ہے۔"

حیدرآباد کی دل فریب شام مطلع ابر آلود تھا اور بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ادب نواز سپیو ملین ایل این گپتا کی صدارت میں بوٹ کلب میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ جناب ہادی القادری غزل پڑھ رہے تھے "ہوتی جاتی ہے" ردیف قافیہ تھا۔ جوش صاحب جھومتے جھامتے بوتل ہاتھ میں لیے آئے۔ دو ایک شعر سنے اور شاعر کو روک کر فی البدیہہ اسی وزن کا شعر پڑھا:

گھٹا چھائی ہے کالی اور کالی ہوتی جاتی ہے
یہاں بوتل پہ بوتل جوش خالی ہوتی جاتی ہے

اور محفل داد تحسین سے گونج اٹھی۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب نے علی گڑھ میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں ہوسٹل کے طعام خانہ کے گھٹیا درجہ کے کھانے کے بارے میں طنز کیا ہے "طالب علم نہ تو فرائض مذہبی کی ادائی کے قابل ہوتا ہے اور نہ ہی شادی بیاہ کے قابل، کیونکہ گھٹیا غذا اسے نہ عاقل بناتی ہے اور نہ ہی بالغ"!

بہت سے شعرا نے تاج محل کی خوب صورتی اور اس کے بنانے والے شہنشاہ کی مدح و ستائش کی ہے لیکن ساحر نے یہ طنزیہ شعر لکھا تھا:

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

کئی شعرا بشمول ... بسمل حیدر صیانوی کے اس مشہور شعر پر تحریف نگاری کی ہے۔ لیکن ایک غیر معروف اردو شاعر نے کہا ہے۔

" آپ کے باپ نے کتوں کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق "

فیض احمد فیض چند سال پہلے جب کہ ان کی شہرت بام عروج پر تھی حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ ادارہ اردو ہال میں ایک شاندار استقبالیہ ترتیب دیا گیا تھا۔ محترمہ زینت ساجدہ صاحبہ نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں تعارف میں یوں فرمایا کہ ..... فیض صاحب شاعری تو اردو میں کرتے ہیں لیکن عاشقی انگریزی میں" اور سارا ہال تالیوں اور قہقہوں سے گونج اٹھا۔ اشارہ فیض صاحب کی انگریز بیوی کی طرف تھا۔ حضرت امجد بہت بلند پایہ شاعر تھے۔ قطعات و رباعیات بہت مشہور ہیں:

بانیِ ادارۂ ادبیات اردو ڈاکٹر زور کے بارے میں فرماتے ہیں:

دکھلائیے گا حمد الٰہی کے مناظر
تا مدح کریں آپ کی ہم اور زیادہ
ہے زور کی تحریر میں کیا زورِ خدا داد
اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

ماہنامہ سب رس کی رسم اجرا کے متعلق کہا:

یہ تحفہ لاجواب از بس لے لو مرغوبِ دل ہر کس و ناکس لے لو
"سب کا لینا تو امر ناممکن ہے سب میں بہتر ہے کہ سب رس لے لو

نواب بہادر یار جنگ کا انتقالِ پر ملال حیدرآبادیوں کے لیے ایک سانحہ عظیم تھا۔ امجد نے کیا خوب فرمایا:

"نواب بہادر خاں جب چھوٹ گئے ہم سے
غم بیٹھ گیا دل میں دل بیٹھ گیا غم سے"

اسی زمانے میں نواب یوسف یار جنگ نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ امجد صاحب نے یوں فرمایا:

زندگی سے تنگ آ کر صلح کر لی موت سے
نفسِ امارہ سے جو کرتا رہے ہر بار جنگ
محفلِ علم و عمل کے بجھ گئے دو شب چراغ
اک بہادر یار جنگ اور ایک یوسف یار جنگ "

ان شگفتہ بیان اور خوش خیال شعرائے طنز و مزاح میں اب ذکرِ خیر جامیِ دکن حضرت مرزا شکور بیگ مرزا کا ملاحظہ ہو۔ اب جب کہ دو ایک ماہ کے اندر ملک میں الیکشن کی ہنگامہ آرائی شروع ہونے والی ہے ان کی ایک طویل نظم "ان سے ووٹ لینا ہے" میں فرماتے ہیں:

" نہیں وقتِ تن آسانی کہ ان سے ووٹ لینا ہے
پسینے کو کرو پانی کہ ان سے ووٹ لینا ہے

اگر پانی کی قلت ہے ، اگر کچھ دودھ بھی کم ہے
ملا دو دودھ میں پانی، کہ ان سے ووٹ لینا ہے
مذمت میں تو ان کی کچھ کسر چھوڑی نہیں تم نے
کرو تعریف امکانی کہ ان سے ووٹ لینا ہے
"بڑی بی" پہلے کہتے تھے کہو اب ہر ضعیفہ کو
کبھی دادی کبھی نانی کہ ان سے ووٹ لینا ہے
اگر باطن ہیں حیوانی، نہیں پرواہ کچھ مرزا
ہوں بس اشکال انسانی کہ ان سے ووٹ لینا ہے

شادی بیاہ ، سال گرہ یا کوئی اور تقریب ہو، مرزا صاحب فی البدیہہ قطعات اور رباعیات سنا کر محفل کو لوٹ لیتے ہیں ۔ حال ہی میں ایک اعلیٰ عہدہ دار نے اپنی شادی کی گولڈن جوبلی منائی ۔ مرزا شکور بیگ صاحب نے اس محفل میں مندرجہ ذیل فی البدیہہ شعر سنا کر فی الواقعی دھوم مچا دی :

دُلہا دلہن پرانے جراب ہیں حجاب میں
دونوں کو پہلی رات نظر آئے خواب میں

"زندہ بھوت"

مختار یوسفی
مالیگاؤں

کل رات سونا پور سے میرا گزر ہوا
اتنے میں ایک چیخ نے مجھ کو جکڑ لیا
پیدل ہی چل کے آیا مگر کانپتا رہا
سہما ہوا کھڑا تھا میں قبروں کے درمیاں
شاید کہ دن تھے پلٹے ہوئے اُس مزار کے
بولا مجھے گھسیٹ کے آجا کھلا ہے گیٹ
کی عرض میں نے بھائی مرے کچھ تو بولیے
بولا کہ کس کی چیخ تھی میں کیا کہوں بھلا
تم نے نگاہ ڈالی ہے کیوں ایک ہی طرف
مجھ جیسے پانچ اور نظر آرہے ہیں وہ
لوٹا ہوا یہ مال ہے لائے ہیں قبر میں
گر تم نے کی کسی کو خبر جان لیجیو
چپ چاپ اپنی راہ لو ہم پر نظر نہ ہو

حدِ نگاہ تک تھا مزاروں کا سلسلہ
بارہ بجے تھے شب کے کسی نے پکڑ لیا
دہشت کے مارے دیر تلک کانپتا رہا
اک منظر عجیب نظر آیا ناگہاں
اک نوجوان سویا تھا ٹانگیں پسار کے
اب آگیا یہاں تو مرے پاس آ کے لیٹ
کیسا یہ شور تھا یہی بس راز کھولیے
مجھ کو مرے ہوئے تو زمانہ گزر گیا
تم کو دکھائی دیتا نہیں دوسری طرف
رمی سے اپنے شوق کو بہلا رہے ہیں وہ
لاکھوں روپے بھی ہم نے چھپائے ہیں قبر میں
جاؤ گے اپنی جان سے یہ مان لیجیو
ہم سب ابھی ہیں زندہ کسی کو خبر نہ ہو

روداد سُن کے چور کی چکرا کے رہ گیا
آنکھیں کھلیں تو آپ ہی تھرا کے رہ گیا

غزل

ظفر کمالی
(سیوان)

کرشمے ہیں یہ بیوٹی پارلر کے، سن ہے اسّی کا
شمار اُن کا مگر ہوتا ہے کم سِن نازنینوں میں
کریں اسکول کے لڑکے یہاں آپس میں وہ باتیں
جنھیں اشراف سن کر ڈوب جاتے ہیں پسینوں میں
لگا کر گوند بیٹھے ہیں نہ چھوڑی ہے نہ چھوڑیں گے
وزیر محترم میرے ہیں ان کرسی نشینوں میں
رشیدؔ احمد، ضمیر جعفریؔ، مشتاق احمد پاشاؔ
ظفرؔ اقرار کرلے تو ہے ان کے خوشہ چینوں میں

۱ پروفیسر رشید احمد صدیقی ۲ سید ضمیر جعفری ۳ مشتاق احمد یوسفی ۴ احمد جمال پاشا۔

غزلیں

معین امر بمبو

اب یقیں چوروں کو بھی ہے، پانچ گھنٹے لائٹ بند
شہر کتنا دلنشیں ہے، پانچ گھنٹے لائٹ بند

کیا کروں مجبور ہوں، دیدار کر سکتا نہیں
آپ کا چہرہ حسیں ہے، پانچ گھنٹے لائٹ بند

عمر اتنی ہو گئی آنکھوں میں پردہ آ گیا
میں کہیں ہوں وہ کہیں ہے، پانچ گھنٹے لائٹ بند

کھانا کھانے بیٹھتے ہی اڑ گیا سارا کرنٹ
دال چہرے میں آستیں ہے، پانچ گھنٹے لائٹ بند

کون کونہ ملک کا بمبو مشاعرے پڑھا
سارے بھارت میں یہیں ہے پانچ گھنٹے لائٹ بند

○

جو کہا مانے، وہ بیوی نہیں اچھی لگتی
ڈاگ کی دُم کبھی سیدھی نہیں اچھی لگتی

جب سے وہ بیٹی دیئے شیخ کو پیتے ہیں شراب
اب چچا جان کو سیندھی نہیں اچھی لگتی

جیسے پانی کے ڈرم پہ کوئی کپڑا ڈالے
آپ کے جسم پہ میکسی نہیں اچھی لگتی

اپنی اماں کو تم اب بھیج دو واپس بیگم
خواہ مخواہ دودھ میں مکھی نہیں اچھی لگتی

میری شادی کا وہ انجام ہوا ہے بمبو
اب کسی دوست کی شادی نہیں اچھی لگتی

○

قطعے

○

یہ شرم دان شہر میں جس دن سے آ گیا
ہم سب کی زندگی میں بڑا حادثہ ہوا
اب شوہروں کو بیویاں کہتی ہیں ڈانٹ کر
سی۔ ایم ہمارا جب دے دیا، تم کو کیا ہوا

○

اب سدھر سکتی نہیں اس دیش میں جمہوریت
لیڈروں کے اس قدر کرتوت کالے ہو گئے
جنتا جن نیتاؤں کو سمجھی تھی بمبو پارسا
وہ 'حوالے' میں سلاخوں کے حوالے ہو گئے

○

پھر ملیں گے اگر خدا لایا...

(اداریہ)

طنز و مزاح کی کل ہند تحریک کا نقطۂ آغاز ۱۹۶۶ء میں منعقدہ مزاح نگاروں کی کل ہند کانفرنس ہے۔
جس کے بعد سے زندہ دلان حیدرآباد کی سالانہ تقریبات بڑے اہتمام کے ساتھ اور شاندار پیمانے پر منعقد ہوتی رہی ہیں۔
اس ادارے نے پچھلے تیس سال میں مسلسل اور منفرد سرگرمیوں کے ذریعہ طنز و مزاح کے فروغ کا بے مثال کارنامہ
انجام دیا۔ حیدرآباد ہی نہیں برصغیر بلکہ دنیائے ادب کے تمام نامور ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور اردو کے
چاہنے والوں نے طنز و مزاح کی اس تحریک کی سرپرستی کی۔ آج اس تحریک نے اپنی عمر کی تیس منزلیں طے
کرنے کے بعد ہند و پاک ہی نہیں، عالمی سطح پر بھی گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ ادب، صحافت، ریڈیو اور ٹی وی
کے سب سے مقبول طرز اظہار کی حیثیت سے طنز و مزاح نے سماج کی بے اعتدالیوں، ناہمواریوں اور منافقت
کا پردہ چاک کرنے کا رول بخوبی نبھایا ہے۔ زندہ دلان کی سالانہ تقریبات کے اہتمام کا ایک اہم مقصد
تخلیق کار اور قاری کے رشتہ کو مضبوط و مستحکم کرنا ہے جس کے بغیر زبان و ادب کی بقا اور ترقی ممکن نہیں۔

طنز و مزاح کی اس تحریک کو آگے بڑھانے میں سنجیدہ تخلیق کاروں اور خاص طور سے افسانہ نگاروں
نے بھی قلمی اعانت کی ہے۔ ان میں ممتاز افسانہ نگار نعیم زبیری کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ نعیم زبیری کا
۸۔ مارچ کو دماغ کی شریانیں پھٹ جانے سے انتقال ہوگیا۔ ادیب، صحافی، کالم نگار و طنز و مزاح نگار
نعیم زبیری خلوص و محبت کا پیکر تھے۔ فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کے ملازمین کی انجمن کے وہ سربراہ تھے۔
حسنِ خدمت پر وظیفہ حاصل کرنے کے بعد آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کے ترجمان ماہنامہ "قومی زبان" کے لیے
اُن کی خدمات حاصل کی گئی تھیں لیکن افسوس ہے کہ اکیڈمی نے ان کی صلاحیتوں سے کماحقہٗ استفادہ نہیں کیا
شگوفہ سے نعیم زبیری کو خاص محبت اور اُنسیت تھی۔ ابتداء ہی سے ان کے مزاحیہ مضامین، خاکے اور افسانے
شگوفہ میں وقتاً فوقتاً چھپتے رہے۔ ان کا انتقال میرے لیے ایک ذاتی صدمہ بھی ہے، ہم خیال و ہمراز
ہمدم و ہمدرد نعیم زبیری کے بغیر ایک بے لوث ٹوٹ کر چاہنے والے یار اور بے تکلف ادیب دوست کی کمی
کا احساس ہمیشہ ستاتا رہے گا۔ "شگوفہ" میں بہت جلد نعیم زبیری کے لیے خصوصی گوشہ کی اشاعت
عمل میں آئے گی جس کے ذریعہ مرحوم کی شخصیت و فن کے تمام پہلو اُجاگر ہوسکیں گے۔

خدا سے دعا ہے کہ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے نوازے۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد : ۲۸	ایڈیٹر	مئی
شمارہ : ۵	ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال	۱۹۹۶ء

کتابت : محمد غالب۔ محمد عبدالرؤف
طباعت : دائرہ پریس، چھتہ بازار حیدرآباد

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ
۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد۔ 500001
فون آفس : 595716 ● رہائش : 521064

اس تھیلے کے چٹے بٹے

(فہرست)

مالِ مُفت (انشائیے)

—○— —○—

—○—

پیغام زبانی اور ہے (خط)

اُڑیں گے پُرزے (خاکہ)

ادب کا جغرافیہ

چورن

(منظومات)

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن !

(رجسٹرڈ آفس 4-1-625/5 سکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ عابد روڈ حیدرآباد اے پی)

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے۔ یہ قرضہ جات 2 اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں (۱) غربت ہٹاؤ اسکیم (۲) خود روزگار اسکیم۔ غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائنڈنگ، ترکاری فروش، میوہ فروش، اگربتی کا کارخانہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 25% کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود 4% کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور مابقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی چھ ہزار 6000 روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین، آٹو رکشا، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 20% کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح سود 6½% پر دیا جاتا ہے۔ کارپوریشن مندرجہ بالا دو اسکیموں کے تحت اپنے قیام سے لے کر 7 مارچ 96ء تک 57837 افراد میں 12,66,60,000 روپے بطور مارجن منی قرض جاری کرچکا ہے جس کی جملہ لاگت 5598,15,000 روپے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جاریہ سال ۹۶ــ۹۵ سے مرکزی حکومت کا قائم کردہ نیشنل اقلیتی ڈیولپمنٹ اینڈ فینانس کارپوریشن کے اشتراک سے اب تک جملہ 868 افراد میں (۱۶) منظور کردہ اسکیمات کے تحت 106,30,000 روپے مارجن منی قرض مزید جاری کرچکا ہے۔ جس کی جملہ لاگت 270,03000 روپے ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ کارپوریشن ۹۳ء سے اقلیتی طبقہ کے نوجوانوں کو سالانہ مفت ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے رہا ہے۔ حیدرآباد میں 531 نوجوانوں کو نظام آباد میں 192 گنٹور میں 243 افراد، کرنول میں 76 نوجوانوں کو تقریباً ۱۵ لاکھ روپے کے صرفہ سے کمپیوٹر، موٹر ڈرائیونگ، لیاب ٹیکنیشین، ٹیلرنگ، ٹائپ رائٹنگ وغیرہ میں ٹریننگ کرایا گیا ہے۔

کارپوریشن کی شاخیں اضلاع کے ہیڈ کوارٹر پر بھی کام کررہی ہیں۔
خواہشمند حضرات کارپوریشن کے دفاتر سے ربط پیدا کریں۔

محمد علی رفعت ایم کام، ایل ایل ایم
نائب صدر نشین و مینیجنگ ڈائرکٹر!

مجتبیٰ حسین

صاحب باتھ روم میں ہیں

ایک دن میں نے اپنے علاقہ کے نیتا بدری نارائن جی سے بات کرنے کے لیے فون کیا تو ان کے پرائیویٹ سکریٹری نے کہا "صاحب باتھ روم میں ہیں۔ تھوڑی دیر بعد فون کریں۔"

میں نے سوچا جب بدری نارائن جی باتھ روم میں ہیں تو کیوں نہ میں بھی باتھ روم ہو آؤں، جیسا راجہ ویسا پرجا۔ کچھ دیر بعد اپنے باتھ روم سے نکل کر جب میں نے فون ملایا تو پھر جواب آیا۔

"صاحب باتھ روم میں ہیں۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "باتھ روم سے کب تک باہر آئیں گے؟"

سکریٹری بولا "عجیب آدمی ہو۔ موت اور آدمی کے باتھ روم سے نکلنے کا بھی بھلا کوئی سمئے مقرر ہوتا ہے۔ وہ باتھ روم گئے ہیں تو کبھی نہ کبھی آ ہی جائیں گے ایسی بھی کیا جلدی ہے؟"

اور میں ان اچھے دنوں کو یاد کرنے لگا جب نہ تو بدری نارائن جی کے گھر میں باتھ روم تھا اور نہ ہی میرے گھر میں۔ کتنے اچھے دن تھے وہ جب کسی پرائیویٹ سکریٹری اور ٹیلی فون کی مدد کے بغیر کھلے میدان میں ان سے صبح شام ملاقات ہو جاتی تھی بلکہ ہم لوگ تو ایک دوسرے سے کچھ دور بیٹھ کر کام کی باتیں بھی کر لیا کرتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی بیچ میں ہیلو ہیلو بھی کہنا پڑتا تھا۔

میں نے سوچا اتنی دیر میں کیوں نہ اس افسر سے بات کر لی جائے جس کے پاس بدری نارائن جی سے سفارش کرانی تھی مجھے ڈر تو تھا کہ اس افسر کا بھی ایک پرائیویٹ سکریٹری ہے اور کمبخت کے گھر میں وہ محفوظ جگہ بھی ہے جسے باتھ روم کہتے ہیں۔ چنانچہ سیدھے جواب آیا "صاحب باتھ روم میں ہیں۔"

میں نے سوچا کیوں نہ میں بھی پھر باتھ روم ہو آؤں۔ مگر اپنے خیال پر ہنسی بھی آئی کہ عام اور ہم جیسے آدمی کی قسمت میں اتنی دیر تک باتھ روم میں رہنا کہاں لکھا ہوتا ہے۔ وہ بیچارا تو بڑی مشکل سے دن بھر میں صرف ایک مرتبہ ہی باتھ روم میں جانے کی ہمت کر سکتا ہے۔ اپنی پھوٹی قسمت کی وجہ سے اسے تو ڈرائنگ روم یا بیڈ روم میں ہی رہنا پڑتا ہے۔ اور گھر میں رہنے کی بھلا یہی کوئی جگہیں ہیں؟ خیر... یہ اچھا بھی ہے کیوں کہ عام آدمی بھی اگر باتھ روم میں رہنے لگ جائے تو پھر دیش کیسے ترقی کرے گا؟

ایک گھنٹہ بعد میں نے بدری نارائن جی کو پھر فون ملایا۔ اس سے پہلے کہ ان کا پرائیویٹ سکریٹری انھیں پھر باتھ روم میں بھیج دیتا میں نے خود ہی پوچھ لیا "ہیلو! کہیں بدری نارائن جی باتھ روم میں تو نہیں ہیں؟"
سکریٹری حیرت سے بولا "تمہیں کیسے معلوم۔ خوشبو آرہی ہے کیا؟"
میں نے کہا "بھیا! یہ تو تمہیں کو مبارک ہو۔ میں تو صرف اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ ایک گھنٹہ پہلے جب میں نے فون کیا تھا تو پتہ چلا تھا کہ وہ باتھ روم میں ہیں۔ میں نے سوچا کہ اب واپس آگئے ہوں تو بات کرلوں"۔
سکریٹری بولا "ایک گھنٹہ پہلے دوسرے پرائیویٹ سکریٹری نے انہیں وہاں بھیجا تھا۔ اب میری ڈیوٹی ہے" میں نے کہا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب انہیں باتھ روم میں بھیجنے کی ذمہ داری تمہاری ہے؟
سکریٹری بولا "میری ڈیوٹی تو اس وقت شروع ہوگی جب وہ باتھ روم سے باہر آئیں گے۔ ابھی تو وہ وہیں ہیں" یہ سنتے ہی میرے ہاتھ سے ٹیلی فون کا ریسیور چھوٹ گیا۔ جب یہ نیچے گر گیا تو اس میں سے قہقہہ بھری آوازیں آنے لگیں "رانگ نمبر رانگ نمبر"۔ میں سوچنے لگا ہمارا ٹیلی فون سسٹم بھی عجیب ہے ساری بات کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ آپ نے رانگ نمبر ملایا تھا۔ اس دن بھی بدری نارائن جی کا فون نمبر تو صحیح مل گیا تھا لیکن غلط جگہ مل گیا تھا کیوں کہ ہم نے تو انہیں عالیشان کوٹھی میں بھیجا تھا اور وہ باتھ روم میں جاکر بیٹھ گئے۔ اس میں ہمارا یا ٹیلی فون کا کیا قصور؟
شاید ہی کوئی دن ایسا جاتا ہو جب میں کسی بڑے آدمی کو فون کروں اور مجھے یہ اطلاع نہ ملے کہ وہ باتھ روم میں ہے۔ ادھر جب سے بڑے آدمیوں نے زیادہ سے زیادہ باتھ روم میں رہنے کی عادت ڈال لی ہے تب سے آدمی اور گھر دونوں کا تصور ہی بدل گیا ہے پرسوں کی بات ہے میں ڈرائینگ روم میں بیٹھا تھا۔ فون کی گھنٹی بجی تو میری بیوی نے یہ کہہ کر فون کا ریسیور رکھ دیا کہ "وہ تو باتھ روم میں ہیں"
میں نے غصہ سے کہا "مگر میں تو تمہارے سامنے بیٹھا ہوں"۔
وہ بولی "میں جانتی ہوں کہ تم یہاں بیٹھے ہو لیکن میری یہ خواہش ہے کہ تم بھی کبھی بڑا آدمی بنو تمہیں بھی بڑا آدمی بننے کا حق حاصل ہے۔ تم جب بھی کسی بڑے آدمی کو فون ملاتے ہو تو وہ ہمیشہ باتھ روم میں ہوتا ہے اور تم ہو کہ سارا دن ڈرائینگ روم میں بیٹھے مکھیاں مارتے رہتے ہو۔ آج سے میں بھی بڑے آدمی کی بیوی بننا چاہتی ہوں آج سے تم باتھ روم میں رہنے کی کوشش کرو۔ اگر نہیں رہتے تو پھر میں وہاں رہنے لگتی ہوں۔ میں تو صرف "پہلے آپ، پہلے آپ" کے چکر میں ماری جارہی ہوں"۔
ایک زمانہ تھا جب گھر کے نقشے میں باتھ روم ایسا ہی ہوتا تھا جیسا دنیا کے نقشے میں آسٹریلیا بالکل الگ تھلگ۔ مگر اب باتھ روم ہی اصل گھر نظر آنے لگا ہے۔ پچھلے دنوں میں نے ایک اخبار میں ایک اشتہار پڑھا تھا جس میں لکھا تھا "ضرورت ہے ایک خوش نما بڑے باتھ روم کی۔ اس کے ساتھ اگر ایک اٹیچڈ بیڈ روم بھی ہو تو ٹھیک رہے گا۔ نہ ہو تو بھی چلے گا"۔ میں نے سوچا تھا کہ اشتہار دینے والا ضرور پیچش کا مریض ہوگا۔ مگر اب پتہ چلا کہ بڑا آدمی تھا ان دنوں پیچش کے مریض اور بڑے آدمی کی حرکتوں میں بہت کم فرق باقی رہ گیا ہے۔
ایک بار ہمیں ایک بڑے آدمی کے باتھ روم میں جانے کا موقع ملا تھا۔ ہم تو اسے دیکھ کر دنگ رہ گئے اتنا بڑا باتھ روم تھا کہ اس میں ہمارا سارا گھر صحن سمیت سما سکتا تھا۔ کیا خوش نما ٹائلس تھیں۔ کیا بھڑکیلے آئینے تھے۔ ہم تو اس کی خوبصورتی سے اتنے ڈر گئے کہ اسے استعمال کئے بنا ہی واپس آگئے اور بڑے آدمی سے ڈرتے ڈرتے کہا

"ہم آپ کی ہمت کو مان گئے کہ اتنی پیاری جگہ کو باتھ روم کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ہم میں یہ حوصلہ نہیں ہے۔ اگر اجازت ہو تو آپ کے بیڈ روم کو باتھ روم کے طور پر استعمال کرلیں" اور اس کے بعد اس بڑے آدمی نے ہمیں کبھی اپنے گھر میں آنے نہ دیا۔ دوستو! ہماری باتوں کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ ہم سرے سے باتھ روم کے ہی مخالف ہیں۔ ہم تو صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر آج کے بڑے آدمی کے رہن سہن کے طریقے بدل گئے ہیں اور وہ باتھ روم میں زیادہ رہنے لگا ہے تو پھر ٹیلی فون کا آلہ اپنے ڈرائنگ روم میں کیوں لگواتا ہے باتھ روم میں ہی لگوالے۔ وہیں ڈائننگ ٹیبل وغیرہ بھی لگوالے تو کیا حرج ہے۔ بعض دفعہ تو جتنا پانچ پانچ برس تک بڑے آدمی کو ڈائننگ روم اور دفتر میں ڈھونڈتی ہے اور وہ باتھ روم میں بیٹھا رہتا ہے!

حوالہ

ڈاکٹر راہی قریشی
(گلبرگہ)

نادر ہے، انوکھا ہے، نرالا ہے حوالہ
کس ہاتھ نے پیچھے سے نکالا ہے حوالہ

تاخیر سہی، وقت مگر تھا یہی موزوں
کچھ سوچ سمجھ کر ہی اُچھالا ہے حوالہ

آسان نگلنا ہے نہ ممکن ہے اُگلنا
اٹکا ہے جو منہ میں وہ نوالا ہے حوالہ

ہے تین طلاقوں کی طرح اس میں بھی عبرت
غیرت کے لیے جیسے "حلالہ" ہے حوالہ

دروازۂ زنداں کھُلے کس طرح بتاؤ
چابی نہیں جس کی وہی "تالا" ہے حوالہ

وہ محفلِ رنگیں ہے نہ وہ خلوتِ عشرت
یعنی کہ گناہوں کا ازالہ ہے حوالہ

آ آ کے پھنستی جاتی ہے ہر قسم کی "مکھی"
مکڑی نے جو تانا ہے وہ جالا ہے حوالہ

ہر شخص کا حصہ ہے یہاں حسبِ مراتب
اعلیٰ ہے اگر عہدہ تو اعلیٰ ہے حوالہ

شمشان ہو یا قبر ہو، نزدیک ہیں دونوں
سچ یہ ہے کہ اک زہر کا پیالا ہے حوالہ

جس پاؤں میں پہلے ہی کئی زخم تھے موجود
اب خیر سے اُس پاؤں کا چھالا ہے حوالہ

نیتا کے لیے یہ شبِ تاریک ہے لیکن
جنتا کے لیے ایک اُجالا ہے حوالہ

گر جائیں گے ایوانِ سیاست سبھی راہی
اک ایسے دھماکے کا مسالا ہے حوالہ

○

اقبال شاہد (مقیم سعودی عرب)

مائیکل جیکسن کی شادی

رقص میں سارا جہاں ہے، وجد میں کوہ و دمن
ناچتی ہیں بلبلیں اور ڈانس کرتا ہے چمن

"شیک" کرتے ہیں براتی "بریک" کرتی ہے دلہن
بن گئے دولہا جو برخوردار مائیکل جیکسن

ساری دنیا کو نچاتے تھے مگر اب دیکھنا
اہلیہ کی اُنگلیوں پر ناچ اُٹھے گا بدن

دیکھ کر تصویر دولہا اور دلہن کی دوستو
فیصلہ کرنا ہے مشکل کون ہے یارو دلہن

پھول سے نازک بدن والوں کی جوڑی ہے عجب
جیسے ہے پہلو میں اک شعلہ بدن کے گلبدن

شکل سے موصوف لگتے ہی نہیں "صنفِ کثیف"
اور لگتا ہے بہت مشکوک ہیں چال و چلن

زندگانی رقص میں گزری ہے جس کی دوستو
کیسے اک مرکز پہ ٹھہرے گا بھلا اُس کا بدن

ناچنے کا بھوت ہے موصوف کے سر پر سوار
نیند میں بھی شیک کرتا ہے میاں اُن کا بدن

خوب ہے یارو شریکِ زندگی کا انتخاب
دخترِ رقاص گویا محترم کی ہے دلہن

رقص میں مصروف شاہد رات دن دولہا دلہن
دیکھنا جھولے میں ناچے گا یقیناً اُن کا "سَن" [illegible]

SON

مسیح انجم

100V (ہنڈرڈ وِی)

جس گاڑی سے ہم سفر کرتے ہیں، وہ کوئی لَو لاکھ کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ گاڑی میں سوار ہو کر سیٹ تک پہنچنے تک لَو لات، لَو ضرب شدید اور کوئی لَو "ضرب خفیف کو برداشت کرنے کی نوبت آتی ہے۔ اِس صبر آزما منزل سے گزر کر ابھی اطمینان کا سانس لینے بھی نہیں پاتے کہ کنڈکٹر سے مڈبھیڑ ہو جاتی ہے، اور وہ بازپرس کرنے لگ جاتا ہے "ارے ٹکٹ! کہاں جاتا ہے؟" جس کے نتیجے میں ہماری شان اور اکڑ دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ اس وقت خیریت اِسی میں ہوتی ہے کہ نماٹے پن کا مظاہرہ نہ کریں، اور ٹھیک ٹھیک جواب دیں۔ ورنہ کنڈکٹر ہماری شان میں گستاخی کر بیٹھے گا۔

"کیا گاڑی کو اپنی سُسرال کی سمجھ بیٹھا ہے؟"

ہم نے دو ایک بار کنڈکٹر سے درخواست بھی کی، بلکہ ایک بار تو چائے اور بسکٹ کی پیش کش کا ارادہ بھی ظاہر کیا کہ وہ اپنی غلط اردو دانی اور کھردرے لہجے کے ذریعہ ایرے غیرے مسافروں کے روبرو ہمیں "لوں" "ارے تم" سے مخاطب کر کے بے تکلفی کا مظاہرہ نہ کرے۔ تو اُس نے ہمارے جملے کا مطلب ہی اُلٹا لیا اور اپنی اردو دانی میں قواعد کی غلطی کو جاننے کے لیے درناکیولر لہجے میں پوچھا "کیا اس میں گرامٹکل مِسٹیک ہے؟" ہم نے اس کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے کہا "مِسٹیک گرامر کی نہیں" بلکہ مِسٹیک تو ہماری ہے کہ تم جیسے ہمہ دان قسم کے کنڈکٹر سے سابقہ پڑا ہے۔" بات کی گہرائی میں گئے بغیر بولا "ارے میّں رے! تجھے دکھنی (دیکھتے ہی) اردو بولنے کو جی کرتا ہے!"

ہم نے کہا "اردو ہی میں کیوں جی کرتا ہے؟ جی کرنا ہی ہے تو اور بھی کئی زبانیں ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی کو لو...

ابھی ہم اپنا جملہ مکمل ہی نہیں کر پائے تھے کہ اُس نے جملے کو درمیان سے لپک لیا، اور اپنی قابلیت جتلانے کے لیے زبانیں گنانی شروع کر دیں "ہاں، ہاں، انگریزی کو لیو، فرنچ کو لیو، جرمن کو لیو، پرشین کو لیو، تلگو کو لیو......"

اُس کی "لیو، لیو" سے گھبرا کر ہم نے فوراً اسے ٹوک دیا "یہ کیا "لیو، لیو" لگا رکھی ہے۔ لینا ہی ہے تو سب کو لیو مگر فی الحال اردو کو معاف کر دو!"

پتہ نہیں بحث کب تک چلتی، ڈرائیور نے بس آگے بڑھادی۔

ہماری گاڑی کی پیشانی پر "100V" (ہنڈریڈ وی) لکھا ہوتا ہے۔ یہ "V" (وی) FOR (فار) VICTORY (وکٹری) نہیں، بلکہ "V" (وی) FOR (فار) وسٹبل لورم ہے، جہاں سے "ہنڈریڈ وی" سے ہمارا سابقہ پڑتا ہے۔ اب رہ جاتا ہے "100!" (ہنڈریڈ) کا ہندسہ تو اس پر ہم کیا، ہمارے فرشتے بھی روشنی نہیں ڈال سکتے، تا وقتیکہ اس کیس کو محکمۂ روڈ ٹرانسپورٹ سے رجوع نہ کریں۔ ویسے، ہم اپنے طور پر "100V" (ہنڈریڈ وی) کو ایک ایسا اسکور بورڈ سمجھتے ہیں جو دوڑ کر بس کو پکڑنے کی جلت میں سو بار گرنے، گر کر سجدۂ سہو ادا کرنے، پھر اٹھ کر کپڑے جھاڑنے، اور پھر "ہنڈریڈ وی" کا تعاقب کرکے "فاتح زمانہ" کہلانے کی نشان دہی کرتا ہے۔ اگر ہم اس قسم کی قلابازیاں کسی بیرونی ملک کی بس میں کر دکھاتے تو وہاں کا محکمۂ روڈ ٹرانسپورٹ، سو بائبل کورٹ کے ذریعہ تحقیقات کروا کے یہ اعزاز ضرور عطا کرتا:

"YOU ARE THE SUPER STAR AMONG THE TRAVELLERS."

پتہ نہیں، ہمارے محکمۂ روڈ ٹرانسپورٹ کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اس قسم کی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے کوئی انعامی اسکیم کیوں نہیں شروع کرتا؟

ہماری بس کا کنڈکٹر بڑا اچھا ہوا ہے۔ وہ ہم جیسے کئی مسافروں کو اپنی جیب میں رکھتا ہے۔ وہ باتیں کم کرتا ہے اور چٹکیاں زیادہ بجاتا ہے۔ بھلا اُس کے چٹکیاں بجانے پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن اس کی چٹکیوں سے ہمیں کچھ الرجی سی ہو گئی ہے۔ وہ جب کبھی ہمارے سامنے اپنی مخصوص ورنا کیولر زبان میں "کہاں کا ٹکٹ" پوچھنے کی بجائے صرف چٹکی بجاتا ہے تو ہمیں یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے وہ ہمیں چیلنج کر رہا ہو کہ "مجھے تو صرف چٹکی میں مسل دوں گا"۔ پہلی بار جب اُس سے مڈبھیڑ ہوئی تھی تو اس نے ہمارے منہ کے سامنے سوالیہ انداز میں دو چٹکیاں بجائی تھیں، جیسے پوچھ رہا ہو "کہاں جانا ہے؟ ٹکٹ کہاں ہے؟" ہم نے جواب میں شرارتاً چار چٹکیاں بجائی تھیں اس نے غصہ سے پوچھا تھا "یہ کیا؟" ہم نے عرض کیا تھا "ہمیں بھی بجانا آتا ہے۔ تم دو مرتبہ بجا سکتے ہو تو ہم چار مرتبہ بجا سکتے ہیں۔ ہو جائے مقابلہ!"

یونیفارم کے معاملہ میں اس کی بڑی عجیب و غریب منطق ہے۔ عجیب اس لیے کہ اس غریب کے پاس صرف منطق ہے، پیسہ نہیں ہے۔ اور منطق کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ غریب کے پاس اس دنیا میں زندہ رہنے کا کوئی نہ کوئی جواز رہتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ غریب صرف منطق کے سہارے ہی پہاڑ جیسی زندگی سہار سکتا ہے۔ یہی حال "ہنڈریڈ وی" کے کنڈکٹر کا ہے۔ ہم نے اسے مکمل یونیفارم میں کبھی نہیں دیکھا۔ وہ، برائے نام یونیفارم کے طور پر صرف خاکی شرٹ پہنتا ہے اور پینٹ کوئی دوسرے رنگ کا پہنتا ہے۔ ایک بار ہم نے باتوں باتوں میں یوں ہی پوچھ لیا کہ "تم فل سرکاری یونیفارم کیوں نہیں پہنتے؟"

بولا "ہماری سرکار جو تنخواہ دیتی ہے، اس میں صرف شرٹ بن سکتا ہے، پینٹ نہیں بن سکتا۔ یہ جو پینٹ ہے اسے بیوی نے بنوایا ہے، جس کی وجہ سے میں دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہوں۔ اوپر سے آدھا گورنمنٹ کا ہوں، اور نیچے سے آدھا بیوی کا ہوں!" اس جواب پر ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، جو، تا دمِ تحریر کھلی ہوئی ہیں۔

یوں تو "ہنڈریڈ وی" میں ہنڈریڈ خامیاں ہیں۔ لیکن اس میں صرف ایک خوبی یہ ہے کہ وہ کبھی بیٹھتی نہیں،

ہمیشہ کھڑی رہتی ہے۔ وہ جب اسٹارٹ ہو جاتی ہے تو اس کی ہر چیز بجنے لگتی ہے۔ اس کے ڈنڈے بجتے ہیں۔ اس کی چھت بجنے لگتی ہے۔ اس کی کھڑکیاں بجنے لگتی ہیں۔ اور نہیں بجتی تو صرف کنڈکٹر کی سیٹی ہے۔ وہ جب بس کو رکوانا چاہتا ہے تو لوہے کے بنے ہوئے ٹکٹ بڑے سے اس کی چھت کو اس زور کے اسٹروک لگاتا ہے کہ خواتین تو خواتین، بعض کمزور دل کے مرد تک اپنی سیٹوں پر یوں اچھل پڑتے ہیں جیسے کوئی "بم یا پٹاخہ" پھٹ پڑا ہو۔ کنڈکٹر کے ان طاقتور اسٹروکس کی وجہ سے "ہنڈرڈ ڈوی" کی چھت پر اتنے سارے گومڑے اُبھر آئے ہیں کہ پوری چھت چیچک زدہ سی لگتی ہے۔ میں نے ایک بار کنڈکٹر سے پوچھا بھی کہ تم اپنے پاس وِزِل رکھنے کے باوجود کیوں نہیں بجاتے؟ بولا "وزِل مُنہ میں رکھتے ہی مجھے یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے مُنہ میں بیڑی لے لیا ہو!"

"ہنڈرڈ ڈوی" میں سیٹ حاصل کرنا، پارلیمنٹ کی سیٹ حاصل کرنے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ وہ اس لیے کہ پارلیمنٹ کی سیٹ حاصل کرنے کے کچھ قاعدے اور قوانین ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر ایک لاغر اور مریل قسم کا انسان ۔۔۔ حتیٰ کہ قربانی کے لیے ناقابل قبول قرار دیا گیا "دو پایہ" بھی پارلیمنٹ کی سیٹ کا اہل قرار پاتا ہے۔ لیکن "ہنڈرڈ ڈوی" میں سیٹ حاصل کرنے کا کوئی قاعدہ ہے نہ قانون۔ ویسے کہنے کو تو "ہنڈرڈ ڈوی" میں دو سیٹیں معذوروں کے لیے مختص ہیں، جن پر کسی زمانے میں سرکاری زبان میں "[illegible]" یعنی "معذوروں کے لیے" لکھا ہوا تھا۔ لیکن اب آپ کو وہاں "[illegible]" کے بجائے "[illegible]" یعنی "لفنگوں کے لیے" پڑھنے کو ملے گا۔ یہی حال خواتین کے باب الداخلہ کا ہے، جہاں کسی زمانے میں نٹ بورڈ پر "ENTRY FOR LADIES" لکھا ہوا تھا۔ لیکن اب آپ وہاں "ENTRY FOR LADIES" کے بجائے "TRY FOR LADIES" بنا ہوا پائیں گے۔ ظاہر ہے یہ سب ہمارے نوجوانوں کی کارستانی اور تحریف نگاری یا WORDS TAMPERING کا نتیجہ ہے۔ حال ہی میں جب کرکٹ کی دنیا میں گیند کو کھرچنے پر اخباروں میں "Ball Tampering" کے موضوع پر زبردست واویلا مچایا گیا تھا۔ لیکن جب ہدایتی تحریروں کی تحریف کے ذریعہ سماجی اقدار کو کھرچ کھرچ کر لہو لہان کر دیا جاتا ہے تو SOCIAL VALUES کی TAMPERING پر صحافت تو صحافت حکومت تک کوئی نوٹس نہیں لیتی۔

"ہنڈرڈ ڈوی" میں جس مسافر کو کھڑکی کی قریب والی سیٹ مل جاتی ہے تو وہ ایسی خوشی محسوس کرتا ہے جیسے اسے ایک دن کی سلطانی مل گئی ہو۔ مگر ساری پریشانی اور کوفت تو اس کی بازو والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسافر کے حصے میں آتی ہے کیوں کہ گاڑی کے درمیانی حصے میں سزا کے طور پر کھڑے اور پھنسے ہوئے مسافر کے لگیج کا بوجھ کنارے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسافر کے کندھے پر آ پڑتا ہے تو اس کو بہ آسانی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کھڑے ہوئے مسافر کا لگیج کس نوعیت کا ہے اور اسے ٹٹولنے کی زحمت نہیں کرنی پڑتی۔

ہاں تو ہم یہ عرض کر رہے تھے کہ "ہنڈرڈ ڈوی" میں وہی شخص سیٹ حاصل کر سکتا ہے، جس کے جسم میں لچکنے اور بچکنے کی زبردست صلاحیت ہو، اور وہ ایک طرف سے گھس کر دوسری طرف سے نکل جانے کا گر جانتا ہو۔ اس کو بس میں اُلٹا چڑھنے اور اُلٹا اُترنے کی پریکٹس بھی ہو۔ مختصر یہ کہ وہ اُلٹی کھوپڑی کا ہو!

پہلی بار جب ہمیں "ہنڈرڈ ڈوی" میں سفر کرنے کی سعادت نصیب ہوئی تو پتہ چلا کہ سفر میں ایک انسان

کیسی بے حسی، بے مروتی، شقی القلبی اور خود غرضی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ہم "ہنڈرڈ وی" میں سفر کرنے کے لیے اس کے اسٹارٹنگ پوائنٹ "نامپلی اسٹیج" کے پاس کھڑے اس کی آمد کے انتظار میں اذیت ناک حد تک بور ہو رہے تھے۔ ہمارے دوست صمدانی بھی، جنھیں "ہنڈرڈ وی" میں سفر کرنے کا زبردست پریکٹس تھی، ہمارے ساتھ کھڑے، انتظار کو سگریٹوں سے بہلا رہے تھے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے مستقل لوم روٹ سے آنے والی بسوں کے لیے ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے پھرانے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ کھڑے کھڑے جب ہمارے پاؤں جواب دے چکے اور سگریٹ ڈھیلی پڑ چکی تو تب کہیں "ہنڈرڈ وی" آئی۔ صمدانی نے فوراً خبردار کیا "ارے یہ گھس!" ہم نے کہا "یار ایسی بھی کیا جلدی؟ بس کو خالی تو ہونے دو۔" پھر اطمینان سے گھسیں گے۔" بولے "ارے یار! یہ بس خالی ہونے والی نہیں ہے۔ اس میں جو لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، وہ سب کے سب "پاس ہولڈرس" ہیں، اور الٹا سفر کرتے آ رہے ہیں۔ انھوں نے محض سیٹوں پر قبضہ جمانے کے لیے پچھلے اسٹیجوں اور چوراہوں کے سگنلوں کے پاس چھاپہ مارا ہے۔ اب وہ منزل مقصود پر ہی اتریں گے۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ چالیس، پچاس مسافروں کا ایک ریلا سا "ہنڈرڈ وی" کی طرف لپکا۔ جن کی گھس پیٹھ اور دھکوں کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ہم اپنا ایک قدم غیر ارادی طور پر فٹ بورڈ پر جما سکے۔ اتنے میں گاڑی حرکت میں آگئی۔ پھر کیا تھا، ہماری دوسری ٹانگ اچانک ہوا میں معلق ہو کر کچھ اس قسم کا زاویہ حادہ بنا گئی جیسے لنگڑی کھیل رہے ہوں۔ اب ہم پر دوہری ذمہ داری آ پڑی تھی کہ ایک طرف تو خود کو سنبھالیں اور دوسری طرف، اپنی دوسری ٹانگ کو ٹکانے کے لیے ــــ "ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب!" کی جستجو بھی کرتے رہیں۔ اسی جستجو میں جب ہم اپنی ٹانگ کو اِدھر اُدھر حرکت دینے لگے تو ہماری متنازعہ ٹانگ ایک دھوتی والے مسافر کے ٹانگوں کے درمیان آگئی۔ پتہ نہیں کب سے وہ موقع کا منتظر تھا کہ تھوڑا سا سہارا بھی ملے تو RELAX کی گنجائش نکل آئے۔ چنانچہ اس نے جھٹ ہماری ٹانگ کو اپنی دونوں ٹانگوں کے درمیان پھنسا کر ریلیکس (RELAX) ہونے کے لیے کچھ اس طرح دباؤ ڈالنا شروع کیا جیسے ایک شریر بچہ اپنے دادا کے ڈنڈے کو اپنے دونوں پاؤں میں دبائے "لکڑی کا گھوڑا" کھیلتا ہو۔ اِدھر ہم اس کوشش میں تھے کہ اپنی متنازعہ ٹانگ کو آزاد کرالیں۔ اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی دھوتی کی پچھلی گرہ کھل گئی اور پھر وہ آہستہ آہستہ دھوتی سے لنگی کی شکل اختیار کر گئی۔ اگر ہماری ٹانگ ڈنڈے کا کام نہ کرتی تو ظاہر ہے کہ ہوا اپنا کام کر دکھاتی۔ ہم اس ACTIVITY میں اس قدر محو تھے کہ دوسرے مسافروں کی ACTIVITIES کی جانب توجہ نہ دے سکے۔

جب اس ACTIVITY سے فرصت ملی تو کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے ایک مسافر مجمع میں پھنسا ہمری طرح بے چین نظر آرہا تھا۔ وہ اپنی بغل میں ہری ہری لوٹ کو دبائے کچھ اس پوزیشن میں کھڑا تھا کہ جڑ مل والا حصہ اس کی طرف اور لوٹ والا حصہ اس کے پیچھے کھڑے ہوئے دو مسافروں کے ہونٹوں کے عین روبرو آگیا تھا۔ اب سچویشن یہ تھی کہ وہ دو مسافر اس ہری لوٹ سے مستفید ہونے کے صحیح صحیح موقف میں تھے۔ لیکن ان میں سے ایک مسافر جو صورت سے ذرا ایماندار معلوم ہوتا تھا، لوٹ کی طرف صرف کنکھیوں سے گھورے جا رہا تھا۔ مگر دوسرے مسافر نے اس موقع کو غنیمت جانا اور "ھٰذا من فضلِ ربّی" کے طور پر اس لوٹ سے دھیرے دھیرے شغل فرمانا شروع کر دیا۔ چونکہ ہری لوٹ والے مسافر کی گردن دوسرے مسافروں کی باہنوں میں پھنسی ہوئی تھی، اس لیے وہ پیٹھ پیچھے کی کارروائی کا جائزہ لینے کے موقف

میں نہیں تھا۔ ہم نے اس کے حق میں تھوڑی سی ہمدردی جتانے کی خاطر اس مُفت خور کو متنبہ کرنا چاہا تو ہمارے ہم دوست صمدانی نے ہماری متوقع ٹانگ کو دبا کر خبردار کر دیا کہ "تم اپنی نشریات کو بند رکھو۔ ورنہ فٹ بورڈ سے فٹ پاتھ پر بے دست و پا پڑے ہوئے پاؤ گے"! اتنے میں وہ مسافر موقع پا کر ایک طرف کھسک گیا اور پھر دو ایک اسٹیج کے بعد کہیں اتر گیا۔

یہ تھا "ہنڈریڈ ڈوی" سے ڈیڑھ گھنٹے سفر کا ٹریلر۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے شہر کی ہر بس "ہنڈریڈ ڈوی" ہے

DD

بالِ جبریل کا پہلا منظوم انگریزی ترجمہ

عالمی شہرت یافتہ شاعر علامہ اقبال کے اردو اور فارسی کلام کے سب مجموعوں کے ترجمے بالِ جبریل کے سوا، انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں اور برصغیر ہند و پاک کی کئی زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ بالِ جبریل کی مشہور نظم "مسجد قرطبہ" کے انگریزی ترجمہ کے علاوہ اس مشہور مجموعہ کلام کا کوئی انگریزی ترجمہ اب تک شائع نہیں ہو سکا تھا۔

ماہر اقبالیات پروفیسر نعیم صدیقی نے اس اہم کام کو انجام دیا ہے۔ ان کا منظوم انگریزی ترجمہ جو اب زیرِ طبع ہے، ایک اہم خلا کو پُر کرے گا اور اقبال کے کلام کے ان بے شمار قدر دانوں کے لئے جو اردو سے ناواقف یا کم واقف ہیں، اقبال فہمی کے راستے میں ایک اہم رکاوٹ کو دور کرنے کا باعث ہوگا۔

پروفیسر نعیم صدیقی نے جامعہ عثمانیہ اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے امتیازی کامیابی حاصل کرنے کے بعد جامعہ عثمانیہ اور دوسری کئی جامعات میں پروفیسر انگریزی کی خدمات انجام دیں۔ وہ کئی سال سے کیلی فورنیا (امریکہ) میں مقیم ہیں۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے ممتاز مصنف ہیں۔ ان کی اردو تصانیف میں کئی تنقیدی مضامین، نظمیں اور ایک شعری مجموعہ "چاند امروز" ۱۹۸۷ء شامل ہیں۔ انگریزی میں ان کی کئی نظمیں، تنقیدی مضامین اور افسانے ہندوستان اور امریکہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۹۲ء اور ۱۹۹۳ء میں ان کو امریکہ میں "ممتاز شاعر" کا ایوارڈ ملا جس کی اطلاع کئی اخبارات میں شائع ہو چکی ہے۔

مجھے امید ہے کہ اس صدی کے سب سے عظیم شاعر کے ایک اہم ترین مجموعہ کلام کے انگریزی ترجمہ کا جو پہلی دفعہ شائع ہو رہا ہے، قدر دانی کی نظر سے استقبال کیا جائے گا۔

حسن چشتی

جناب حسن چشتی، (شکاگو)

پاپولر میرٹھی

فرضی مشاعرہ

برسوں کے بعد کل جو ہوا تھا مشاعرہ ہوٹنگ کی نذر ہو گیا سارا مشاعرہ
دیکھا نہ تھا کبھی کہیں ایسا مشاعرہ تھا اپنی نوعیت کا انوکھا مشاعرہ
شاعر تمام نشۂ غفلت میں چور تھے یہ حال تھا تو کون جگاتا مشاعرہ
منظر ہر اک نگاہ میں تھا رقصِ جام کا آئینہ مے کدے کا تھا گویا مشاعرہ
آمادہ تھا نہ کوئی نظامت کے واسطے خود صدرِ محترم نے چلایا مشاعرہ
وہ پڑھ گیا تھا حضرتِ غالب کی اک غزل آغاز جس نے آکے کیا تھا مشاعرہ
ہر شخص بزمِ شعر میں تھا قہقہوں میں گم جیسے کہ بن گیا تھا تماشہ مشاعرہ
جب پاپولر نے شعر سنائے مزاح کے تب جاکے تھوڑا رنگ پہ آیا مشاعرہ
اہلِ غزل تو کر گئے ماحول کو خراب میں نے ہی بار بار سنبھالا مشاعرہ
تھا پوسٹر میں کیفی و مجروح کا بھی نام محروم دونوں سے تھا بچارا مشاعرہ
اعلان تو جناب خمار و فنا کا تھا لیکن بغیر ان کے ہوا تھا مشاعرہ
شاعر تمام کرتے تھے اک دوسرے پہ طنز تھا جیسے شاعروں کا اکھاڑا مشاعرہ
بزمِ سخن میں حضرتِ بیدار تھے مگر کچھ کر نہ پائے وہ بھی جو سویا مشاعرہ
مہمان شاعروں کا عجب حالِ زار تھا پایا نہ اس کو جس نے کیا تھا مشاعرہ

سب اپنے شہر لوٹ گئے اس دعا کے بعد
اللہ اب نہ دیجیو ایسا مشاعرہ

○

زندگی کے لیے اور کیا چاہیے روز چندے کا اک سلسلہ چاہیے
باوفا چاہیے بے وفا چاہیے کوئی ساتھی ہو اچھا برا چاہیے
عشق کے واسطے عمر کی قید کیا عشق کے واسطے حوصلہ چاہیے

بزم میں آپ موجود ہیں سامنے
پاپولر کے لیے اور کیا چاہیے

دلیپ سنگھ
(نئی دہلی)

مَیں بانس سے اُترنا چاہتا ہُوں

آج کے اخبار میں ایک خبر، میری خصوصی توجہ کا مرکز بنی۔ کیوں بنی؟ یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا — پہلے خبر پڑھ لیجئے۔ ۔۔۔ ایک ملک کے مفتیٔ اعظم ۔۔۔ نے عورتوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اونچی ایڑی کے جوتے پہننا ترک کردیں۔ اِس کیلئے انھوں نے دو وجہیں بتائی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایسے جوتے عورتوں کی صحت پر بُرا اثر ڈالتے ہیں اور دوسری یہ کہ ایسے جوتے پہننے سے عورتیں پھسل کر گر سکتی ہیں اور اپنی ٹانگیں توڑ سکتی ہیں۔

یہ خبر میری خصوصی توجہ کا مرکز اس لیے بنی کہ مذاہب کے سربراہ عام طور پر 'مشورہ' نہیں دیتے۔ فتویٰ دیتے ہیں یا حکم نامہ جاری کرتے ہیں۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ مفتیٔ اعظم نے مشورہ ہی دیا ہے فتویٰ جاری نہیں کیا۔ مجھے امید ہے کہ دوسرے مذاہب کے سربراہ اس مشورہ سے سبق حاصل کریں گے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میری شادی ہوئی تو رسم کے خاتمہ پر وہ گرنتھی جو میرے "پھیرے" کروارہا تھا مجھ سے کہنے لگا کہ میں پھیروں کے دوران بہت تیز چل رہا تھا۔ کہنے لگا "آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا' آپ کو اس طرح چلنا چاہیئے تھا کہ جب تک میں ایک "شبد" پورا کرتا آپ ایک "پھیرا" پورا کرتے۔ شبد ابھی آدھا بھی نہیں ہوتا تھا کہ آپ پھیرا کر لیتے تھے۔ گرو مہاراج کا حکم ہے کہ دولہا کی رفتار اور شبد کی رفتار برابر ہونی چاہیئے۔

میں نے کہا، کیا یہ حکم ہماری مذہبی کتاب گرو گرنتھ صاحب میں درج ہے؟ کہنے لگا "کتاب میں تو نہیں ہے لیکن میں جو کہہ رہا ہوں" گویا جو وہ کہہ رہا تھا وہی خدائی حکم تھا۔ بعد میں جب میں نے اُسے مناسب بلکہ مناسب سے کچھ زیادہ فیس دے دی اور ہمارے تعلقات معتدل ہوگئے تو وہ پیار سے پوچھنے لگا کہ آپ کو اتنی جلدی کیوں تھی اب میں اُسے کیا سمجھاتا کہ خودکشی کرنے والے جب کسی اونچی عمارت سے کودتے ہیں تو وہ سلو موشن .... (SLOW MOTION) میں نہیں کودتے' بلکہ اس طرح کودتے ہیں کہ جلد از جلد زمین پر گریں اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملیں۔

مفتی صاحب نے عورتوں کو دیا تو مشورہ ہی ہے لیکن چونکہ مذہبی رہنما ہیں اس لیے اس مشورے میں مذہب کو بھی شامل کرلیا ہے۔ انھوں نے اپنے بیان میں فرمایا ہے کہ اسلام اونچی ایڑی والے جوتوں کی اجازت اس لیے نہیں دیتا کہ اس طرح عورتیں اپنا قد اُس قد سے بڑھا لیتی ہیں جو خدا نے اُن کے لیے مقرر کیا ہے۔ اس طرح وہ اصلیت کو چھپاتی

ہیں۔ اور مذہب اصلیت کو چھپانے، بڑھانے یا گھٹانے کی اجازت نہیں دیتا۔
بنیادی طور پر مفتی اعظم کی بات بالکل درست ہے کہ آدمی اور عورت کو ایسا ہی لگنا چاہیئے جیسا خدا نے اُسے بنایا ہے لیکن مشکل اس میں یہ ہے کہ ایسا بنے رہنے سے زندگی میں کوئی کام نہیں ہوتا۔ مجھے اپنی بات کے ثبوت میں مجبوراً آپ کو اصلیت بتانی ہوگی کہ میرا قد [مطلب ہے میرا اصلی قد] پانچ فٹ تین انچ ہے۔ اتنا ہی قد میری بیوی کا ہے۔ میری شادی اُس کے ساتھ اِس لیے ہوگئی کہ جب میں اُسے پہلی بار ملا تو میں نے ایسا جوتا پہن رکھا تھا جس کی عنایت سے میرا قد پانچ فٹ چھ انچ ہوگیا تھا۔ ایسا نہ کرتا تو میں یا تو مجرد رہ جاتا یا پھر کسی پانچ فٹ یا اس سے بھی کم قد کی لڑکی سے شادی کر کے بونے پیدا کر رہا ہوتا۔
صرف قد کی بات نہیں زندگی میں بہت کچھ چھپانا بڑھانا یا گھٹانا پڑتا ہے۔ میں نے شادی کے وقت اپنی تنخواہ بڑھا کر بتائی تھی کہ اپنے ہونے والے سسر پر رعب جمانا ضروری تھا لیکن شادی کے فوراً بعد بیوی کو گھٹا کر بتانی پڑی کہ بیوی ہمیں امیر آدمی سمجھ کر اس طرح کے کپڑے اور زیورات خریدنے اور پہننے لگ گئی تھی جو کسی بھی عورت کو شوبھا تو دیتے ہیں لیکن آخر میں خاوند کا وہ حال ہوتا ہے جو مرزا غالب کا قرض کی شراب پینے سے ہوا تھا۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں ؎ رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

ہم نے بھی غالب کی طرح ایک شعر کا سہارا لے کر بیوی کو سمجھا دیا ہے کہ

"نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی"

حالانکہ ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ خدا نے کچھ ایسی عورتوں کو بے شمار زیور بھی دے رکھے ہیں جن کو اُس نے خوبی بھی دے رکھی ہے۔
مفتی اعظم کا مشورہ اپنی جگہ درست سہی لیکن اس زمانے میں یہ معلوم کرنا کہ حقیقت کیا ہے اور کیا نہیں ہے' بہت مشکل ہو رہا ہے۔ میں جب بمبئی میں ایک ٹیلی ویژن سیریل لکھ رہا تھا تو وہاں میری ملاقات ایک ایسی ایکٹرس سے ہوئی جس کی زلفیں دیکھ کر میری اوپر کی سانس اوپر' اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔ بیچ والی کا مجھے پتہ نہیں کہ وہ اُس وقت کہاں گم ہوگئی تھی۔ حالانکہ مجھے شاعری کرنا نہیں آتا لیکن میں نے پوری رات جاگ کر ایک نظم اُس کی زلفوں کی تعریف میں لکھ دی۔ ویسے یہ کوئی بہت مشکل کام نہیں ہے کہ اردو کے بیسیوں شاعر زلفوں کی مدح میں ہزاروں شعر کہہ گئے ہیں۔ اُن میں معمولی رد و بدل کر کے آپ بھی اپنے معشوق کی زلفوں کی مدح میں ایک نظم جوڑ سکتے ہیں۔ نظم جب تیار ہوگئی تو میں نے سوچا کہ آج کی ملاقات پر اُسے یہ نظم سناؤں گا کہ حالِ دل کہنے کا یہ سب سے آسان نسخہ ہے۔ میں سیٹ پر بیٹھا تھا کہ وہ تشریف لائیں۔ انھیں دیکھ کر میری سانسوں کی وہی حالت ہوئی جو اُن کے ساتھ پہلی ملاقات میں ہو چکی تھی لیکن آج وجہ کچھ اور تھی۔ اُن کے سر سے زلفیں ہی غائب تھیں۔ میں نے تقریباً ہکلاتے ہوئے کہا کہ محترمہ میں نے آپ کی زلفوں کی مدح میں ایک نظم لکھی ہے جو

آپ کو سنانا چاہتا تھا لیکن آپ کی زُلفیں کیا ہوئیں ؟" کہنے لگی " آج کا سین کچھ اس طرح کا تھا کہ زُلفوں کی ضرورت نہیں تھی اس لیئے میں انھیں گھر پہ چھوڑ آئی ۔ آپ شام کو میرے ساتھ گھر چلیں تو میں آپکے سامنے زلفیں رکھ دوں گی ۔ آپ انھیں دیکھ کر نظم سنا دیجئے گا ۔

میں نے اپنی ملازمت جس عہدے سے شروع کی تھی وہ کوئی بہت اونچا نہیں تھا ۔ لیکن جلد ہی میں نے ترقی کی منزلیں طے کر لیں ۔ جب میرا عہدہ بڑا ہوگیا تو مجھے اپنا نام چھوٹا لگنے لگا کہ بڑے آدمی بڑے نام سے ہی پہچانے جاتے ہیں ۔ میں نے بہت سوچا کہ اپنا وقار کیسے بڑھاؤں لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا ۔ ایک روز میرے پی اے نے مشورہ دیا کہ اپنے نام سے پہلے انگریزی کا لفظ K لگالوں ۔ میں نے پوچھا ۔ " اس سے کیا ہوگا ؟ " کہنے لگا ۔ لوگ آپ کو کنور صاحب کہنے لگیں گے ۔ میں حیران ہوا جب یہ نسخہ چل نکلا اور اتنا چلا کہ میرے ساتھیوں نے وہ ریاست بھی تلاش کر لی جہاں میرے والد صاحب آزادی سے پہلے حکومت کیا کرتے تھے اور وہ عورتیں بھی تلاش کر لیں جو میرے والد کے حرم میں ہوا کرتی تھیں ۔ کچھ عرصہ بعد ہمارے ہاں جب ڈیموکریسی بڑھی اور راجاؤں سے زیادہ "عوام کے نمائندوں" کا وقار بڑھنے لگا تو میں نے اپنے " خاندانی مرتبے " سے چھٹکارا پانے کی بہت کوشش کی لیکن یہ ممکن نہ ہوا ۔

کیا ہمارے ہاں کا کوئی مذہبی رہنما میرے لیئے اتنا کر سکتا ہے کہ پبلک کو بتا دے کہ میرا صحیح قد کیا ہے کہ میں اب بانس سے اُترنا چاہتا ہوں ۔

سنگار لکھنوی (بمبئی)

غزل

شکریہ آپ خواب میں آئے — کیوں نہ عہدِ شباب میں آئے
مسکراتے ہوئے وہ وصل کی شب — میرے خط کے جواب میں آئے
کہتے للّو ہیں حضرتِ ناصح — بن کے ہڈّی کباب میں آئے
کوئی لیڈی مجھے یہ سمجھا دے — چین کیسے شباب میں آئے
دے رہے ہیں ہمیں اپنے کیوں — کیوں شبِ ماہتاب میں آئے
عقل و دانش بھی کچھ خدائے کریم — بخت حضرت مآب میں آئے
سانپ ڈستے ہیں پھر سیاست کے — کوئی موسیٰ جواب میں آئے
زندہ باد انقلاب زندہ باد — زور پھر انقلاب میں آئے
کر گئے ناخدا کا بیڑا غرق — ایسے طوفاں حباب میں آئے
قتلے تربوز کے وہ بت سمجھا — دل کے ٹکڑے جو قاب میں آئے
جیسے آتی ہے پیار میں خوشبو — کاش عطرِ گلاب میں آئے

○

جو حسینی شان دار ہوتا ہے — دل کے وہ آر پار ہوتا ہے
پھر یہ روکے سے رک نہیں سکتا — عشق جب دھوں دھکار ہوتا ہے
پیار کتوں سے کرنے والے حسن — آدمی سے بھی پیار ہوتا ہے
وصل کی شب وہ جب بھی آئے ہیں — ایک سو دو [۱۰۲] بخار ہوتا ہے
پکڑے رہتا ہے ہاتھ میں ڈنڈا — جب کوئی تھانیدار ہوتا ہے
تم تو سولہ سنگار کرتے ہو — دل ہمارا فگار ہوتا ہے
ایک آنسو کو کیا سمجھتے ہو — یہ سمندر پہ بار ہوتا ہے
ہم نے دیکھا ہے راہ چلتے بھی — عشق کا کاروبار ہوتا ہے
جیب کتروں میں لیڈروں کا شمار — اب بصد افتخار ہوتا ہے
ایک دن ان سے پوچھ لیں گے سنگار — دل میں کچھ یار بار ہوتا ہے

سنگار لکھنوی

پرویز یداللہ مہدی

شوہری جزویست از چپچہ گری

آج کل شوہر بننا بہت آسان ہے کیوں کہ فی زمانہ شوہر بننے اور الو بننے میں کچھ زیادہ فرق نہیں رہا ہے۔ بہر حال شوہر بننے کے لیے اب نہ تو اگلے وقتوں کی طرح سوئمبر میں حصہ لینا پڑتا ہے نہ دھنش توڑنے کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ ڈوئیل (DUEL) لڑنے کی حاجت ہوتی ہے (توڑ پھوڑ اور لڑائی جھگڑا تو شادی کے بعد شروع ہوتا ہے) اب تو براہ راست سر پر سہرا باندھ کر قاضی صاحب قبلہ کے روبرو "قبول کیا میں نے" کا بانگِ دہل اعلان کر کے یا پنڈت جی کی چھتر چھایا میں اگنی کو ساکشی مان کر باہوش و حواس سات پھیرے لگا کر یا کسی محترم المعلم پادری بہاشے کے سامنے بلا جبر و اکراہ "یس آئی ڈو" (YES I DO) کا اعتراف کر کے دنیا کا ہر عاقل و بالغ مرد پلک جھپکتے میں خود کو الو کا پٹھا ثابت کر سکتا ہے یعنی کہ شوہر بن سکتا ہے۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ بیوی کی نظر میں اپنے آپ کو شوہر ثابت کرنے کے لیے کبھی کبھی ایک عمر بھی کم پڑتی ہے۔

شوہروں کا ایک بڑا طبقہ صدیوں تک اس مغالطے میں مبتلا رہا کہ مقدس صحیفوں اور آسمانی کتابوں میں شوہر کو مجازی خدا، پتی پرمیشور اور پتہ نہیں کیسے کیسے القابات اور درجات کا اہل قرار دیا گیا ہے لیکن یہ درجہ بندی بیویوں کی نظر میں ہمیشہ کھٹکتی رہی کہ مٹی کے حقیر پتلے کو تو مجازی خدا کا رتبہ بخش دیا اور جس نازک ہستی کو اس مٹی کے مادھو کی پسلی سے پیدا کیا وہ سنر مجازی خدا کے ٹائیٹل کی بھی حقدار نہیں، چنانچہ بیویوں کی قوم نے اس نا انصافی کا بدلہ اس طرح لیا کہ پہلے تو ایک ایک کر کے مردوں کی تمام دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا، پھر بڑی چالاکی سے مجازی خدا کی "خودی" بن بیٹھیں، وہی خودی جو مجازی خدا کو خدا سے جوڑتی ہے اگر خودی بیچ میں نہ ہو تو آدمی کاتب تقدیر سے اپنی مرضی کے مطابق تقدیر نہیں لکھوا سکتا۔ نتیجہ اس درجاتی الٹ پھیر کا یہ ہوا کہ جو شوہر کبھی مجازی خدا کی حیثیت سے اپنی نصف بہتر کی چشم سیاہ فام کی تہوں میں، دل کی وسعتوں میں اور روح کی گہرائیوں میں براجمان ہوا کرتا تھا اس کی عملداری مانگ کے سیندور، گلے کے منگل سوتر اور ہاتھوں کی چوڑیوں تک محدود ہو گئی بلکہ بعض بیویاں تو جیتے جاگتے سہاگ سے زیادہ اہمیت سہاگ کی نشانیوں کو دیتی ہیں اور ان پر جتنا وقت جتنی توجہ صرف کرتی ہیں اس کا عشر عشیر بھی بیچارے میاں کے حصے میں نہیں آتا۔ سہاگ کا لفافہ تو سسکتا تڑپتا رہتا ہے اور سہاگ کی نقلی نشانیاں اس کی نظروں کے سامنے چمکتی دمکتی کھنکتی رہتی ہیں۔ چنانچہ قدوی قسم کے شوہر، بیگم صاحبہ کی ہر جا و بے جا بات پر یہ کہہ کر سر جھکا دیتے ہیں کہ "سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے"

میں آئے، گویا شوہری اب پہلے کی طرح ذریعہ عزت نہیں رہی بلکہ تجھہ گری کے زمرے میں داخل ہوگئی ہے۔

شوہری جزویت از تجھہ گری۔

"تاریخ گواہ ہے کہ اگلے زمانے میں شوہر کہلانے کے لیے آدمی کا صرف مرد ہونا کافی ہوا کرتا تھا جب کہ آج منصب شوہری پر فائز ہونے کے لیے آدمی میں مردانگی کے علاوہ کچھ اور صلاحیتوں کا پایا جانا لازمی ہے۔ بالخصوص بار برداری و ناز برداری کی شرط اسی لیے کہ آج کی کنواریوں کی اکثریت کو خاتون خانہ سے زیادہ سبھا کی پری بننے کا شوق ہے لہٰذا سبھا کی یہ پریاں "انڈور" (INDOOR) یعنی کہ درون خانہ ذمہ داریوں کو فضولیات میں شمار کرتی ہیں۔ چنانچہ شادی کے فوراً بعد امور خانہ داری کا پورٹ فولیو (PORTFOLIO) کمال ہوشیاری سے شوہر نامدار کے حوالے کرکے خود کو آوٹ ڈور (OUT-DOOR) یعنی کہ بیرون خانہ مصروفیات کے لیے پوری طرح وقف کر دیتی ہیں گویا میاں جی کو مٹھو میاں کی طرح باورچی خانے کی کنگنائی میں محصور کر کے خود پارٹیوں کلبوں اور ہمجولیوں کے جھرمٹ میں مسرور رہتی ہیں۔ کہیں کہیں کچھ بدنصیب خواتین البتہ غلطی سے خاتون خانہ کے ناپسندیدہ روپ میں نظر آجاتی ہیں لیکن اس میں بخدا ان کی مرضی سے زیادہ خانگی مجبوری کو دخل ہوتا ہے! اسی لیے یہ بے چاریاں اپنے شوہروں سے کم از کم اس بات کی توقع کرتی ہیں کہ ان کی جا ہے کھانا بنانے کی جھنجھٹ میں نہ پڑیں صرف برتن دھونے ہی میں ہاتھ بٹا دیا کریں۔ بے شک سارے گھر کو جھاڑو نہ لگائیں کم از کم فرنیچر کی دھول ہی صاف کر دیا کریں، علی الصبح اہلیہ محترمہ کی خدمت میں "بیڈ ٹی" (BED-TEA) پیش کر کے اپنے "پتنی ورتا" ہونے کا ثبوت یقیناً نہ دیں مگر اپنے جگر کے ٹکڑوں آنکھ کے تاروں، راج دلاروں کو ادھر ادھر سے سمیٹ کر یکے بعد دیگرے انہیں "شو شو" کرا کے نہلا دھلا کے ناشتہ کرا کے اسکول کے لیے تیار کر دیا کریں۔ غرض یہ کہ چھوٹا موٹا دست تعاون دراز کر کے شوہر نامدار اگر چاہے تو اپنے باربردار ہونے کا ثبوت پیش کر سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی ہنستے ہنستے ان ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہوتا ہے تو کوئی روتے بسورتے لیکن باربرداری سے مفر بہرحال نہیں ہے کہ باربرداری آج متوسط طبقے کے ہر شوہر کا مقدر ہے!

دورِ حاضر کے شوہر کے لیے باربرداری کے فن میں طاق ہونا جس قدر ضروری ہے، ناز برداری کے باب میں ماہر ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے کیوں کہ فی زمانہ شادی کے بعد ہر شوہر کو بیوی کے ناز نخروں، فرمائشوں اور نت نئی مانگوں کے جھٹکوں جھٹکوں اور صدموں کو مسکراتے ہوئے سہنا پڑتا ہے بلکہ سہتے ہوئے یہ کہنا بھی پڑتا ہے کہ

اُٹھائے جا ان کے ستم اور جیئے جا — یونہی مسکرائے جا آنسو پیئے جا

لیکن بدقسمتی سے موجودہ نسل کا ہر کنوارا نوجوان مذکورہ شرائط پر پورا نہیں اترتا اور نہ ہی جمعہ جمعہ آٹھ دن میں ٹریننگ مکمل کر کے ان امور میں ید طولیٰ حاصل کر سکتا ہے اس کے لیے برسوں کی کڑی ریاضت اور سخت مشقت چاہیئے ویسے بھی امور خانہ داری کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے کہ چٹکی بجاتے میں آجائے جس طرح اردو کے تعلق سے حضرت داغ دہلوی نے فرمایا ہے کہ

آتی ہے اردو زباں آتے آتے

اسی طرح امور خانہ داری میں مہارت بھی آدمی کو آتے آتے ہی آتی ہے لہٰذا اس ضمن میں ہم محکمہ تعلیمات کے ارباب مجاز سے گذارش کرتے ہیں کہ امور خانہ داری کو لڑکوں کے نصاب میں لازمی مضمون کے طور پر شامل کیا جائے بلکہ اس کی عملی تربیت کا بھی خاطر خواہ بندوبست کیا جائے۔ اس سلسلے میں کل ہند پیمانہ پر ماہر فن باورچیوں دھوبیوں اور جاروب کشوں

کا انتخاب کرکے بحیثیت پروفیسر و لیکچرر ان کی خدمات حاصل کی جائیں بلکہ آگے چل کر کالج و یونیورسٹی کی سطح پر مذکورہ بالا فنون میں مکمل دستگاہ حاصل کرنے کے مواقع بھی طالب علموں کو مہیا کئے جائیں اور پھر کامیاب طلبہ کو ڈاکٹریٹ کی باوقار سند سے نوازا جائے جیسے ڈاکٹر آف ککنگ، ڈاکٹر آف چلڈرن ویلفیر، ڈاکٹر آف فرائی کلیننگ، واشنگ اینڈ رفوگری وغیرہ وغیرہ۔

اب رہا ناز برداری کے ہنر سے بہرہ ور ہونے کا معاملہ تو شہروں کی حد تک آج کی نئی نسل نے گرل فرینڈز کے روپ میں خود ہی اس کا حل ڈھونڈ نکالا ہے۔ گرل فرینڈ چونکہ نازنخروں کی مکمل و مفصل شرح ہوتی ہے اس لیے اس کے توسط سے ایک کنوارا نوجوان غالب کی زبان میں اس سے واقف ہوتا ہے کہ

عشوہ و غمزہ و ادا کیا ہے؟

بلکہ بعض دُور اندیش نوجوان تو بہ یک وقت کئی گرل فرینڈز پال کر عشووں، غمزوں اور اداؤں کے پس پردہ کارفرما علامتی اشاروں اور ابہام کے گورکھ دھندوں سے اچھی طرح واقف ہو جاتے ہیں۔ بعد میں یہی تجربہ بیوی کی ناز برداری کے باب میں قدم قدم پر ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ البتہ دیہات اور قصبات کے بیشتر کنوارے نوجوان چونکہ گرل فرینڈز کی نعمت سے آج بھی محروم ہیں لہٰذا اس ضمن میں بیس نکاتی کا ریہ کرموں کے جنم داتاؤں سے ہماری درخواست ہے کہ جس طرح انہوں نے یہ نعرہ دیا ہے، بیس نکات کی یہ کہانی، گاؤں گاؤں میں بجلی پانی، اسی طرح گاؤں گاؤں قریہ قریہ گرل فرینڈز کی وبا کو عام کرنے کے لیے یہ نعرہ وضع کریں گاؤں گاؤں میں ہو یہ کھیل، لڑکا لڑکی میں ہو میل۔

سچ کہتے ہیں اگر بیس نکات کے کرتا دھرتا ہمارے اس مشورے پر عمل کریں تو دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کے کنوار نوجوانوں کی بڑی تعداد شہری نوجوانوں کے شانہ بہ شانہ چل کر ناز برداری کے فن میں طاق و مشاق ہو جائے گی۔ خیر یہ تو مستقبل کی طرف ایک احمقانہ جست تھی، ایک بار پھر ذرا پیچھے کی طرف لوٹیں تاکہ اس بہانے مذکورہ بالا امور کے تعلق سے ہماری شخصی جہالت اور لاعلمی کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو جائے یعنی

نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

بدقسمتی سے ہم ایک ایسے معاشرے کے پروردہ ہیں جہاں گرل فرینڈ کو زمین پر شجرِ ممنوعہ کا ہم پلہ سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا اس کا تصور تک معیوب قرار دیا گیا تھا خاندان کے جہاندیدہ ممبران سنسر بورڈ ہاتھوں میں قینچیاں تھامے اس حسین تصور کے پر کاٹنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ناز برداری کے باب میں ہم آج بھی اتنے ہی نابلد ہیں جتنے کہ پیدائش کے وقت تھے بلکہ الٹا ہماری پرورش اس قدر بے جا لاڈ پیار سے کی گئی کہ ہم ناز اٹھانے کے بجائے ناز اٹھوانے کے عادی ہو گئے۔ اصل میں ہمارے خلاف یہ ایک سوچی سمجھی سازش تھی خاندان کے بزرگوں کی تاکہ ہم حسن و عشق کی آنکھ مچولی کے کھیل سے دور رہیں۔

جس معاشرے نے ہمیں معاملات دلبری و دلنوازی سے اس قدر چترائی سے دور دور رکھا وہ بھلا ہمیں امورِ خانہ داری کی تفصیل میں جھانکنے کی اجازت بھلا کیسے اور کیوں کر دیتا، وہاں تو صرف گھر کی خواتین کی مکمل علمداری ہوا کی تھی چنانچہ ہم پر کھانا مدتوں من و سلویٰ کی طرح اترتا رہا اور ہم حضرت موسیٰ کی ناشکری امت کی طرح بنا ڈکار لیے ہڑپ کرتے رہے!

□□

منہ پھٹ ناگپوری — صاف صاف

شعر اپنے شہر والوں کو سنا رہا ہوں | چند غزلیں لا کے پاکستان سے
دشمنی لکھتے پڑھنوں سے کیجیے | دوستی اچھی نہیں نادان سے
کر دیا داڑھی کو نذر استرا | ہو گیا محروم گھر والان سے
پھر رہے ہیں بن کے ہیجو باورا | ہم سگائی کر کے بھری جان سے
اپنی غربت دور کرنے کے لیے | رشتہ داری کیجیے دھنوان سے
کیسے داماد کو مٹھی میں رکھیں | یہ ہنر سیکھا ہے نانا جان سے

یہ غزل منہ پھٹ اڑا کر لائے ہیں
اپنے ابا جان کے دیوان سے

تنگ آ کے دل کی بربادی سے ہم | کان پکڑے دوسری شادی سے ہم
لوگو! یوں تو ہم کسی قابل نہیں | کھپ رہے ہیں ہر جگہ کھادی سے ہم
پانچ بہوویں ان کے کل بچے پچاس | ہیں پریشاں گھر کی آبادی سے ہم
اپنی ہڈی پسلیاں تڑوا چکے! | کر کے دو دو ہاتھ فولادی سے ہم
جب تلک شاگرد تھے، تھے نامور | ہو گئے بدنام استادی سے ہم
ٹوکری میں پھول لے کر برف کے | آ گئے کشمیر کی وادی سے ہم
منتری ہونے سے پہلے شہر میں | گھومتے پھرتے تھے آزادی سے ہم
اک روپے میں گیہوں بارہ پائیلی | داستاں یہ سن چکے دادی سے ہم
ہائے جو مچھر سے ہاتھی ہو گیا | آپ کو ملوائیں اس ہادی سے ہم

جیب میں کوڑی نہیں منہ پھٹ مگر
عشق فرماتے ہیں شہزادی سے ہم

غزل

شجاع الدین عاطف (مہاراشٹرا)

کوئی دن ہنسنا ہنسانا اور ہے ÷ کر کے میک اپ مسکرانا اور ہے
بارہا لکھتی ہیں اس نے گالیاں ÷ پر کچھ اب کے دل جلانا اور ہے
دے کے خط منہ دیکھتا ہے پوسٹ مین ÷ کچھ تو بخشش کا بہانا اور ہے
یوں کئی کی ہیں انھوں نے شادیاں ÷ ان کو پھر اک گھر بسانا اور ہے
پہلے رہتی تھی محبت راز میں ÷ صاحبو! یہ زمانہ اور ہے
یوں کئی آئے سخنور جگ میں، ہم ÷ مرزا غالب کا وہ آنا اور ہے
[illegible] ÷ اک کھڑی کو حساتا اور ہے

رؤف خوشتر
(بیدر)

دیوانے آم

جنت نشاں و راحت فزا ہندوستان میں جتنے فرقے اور عقائد ہیں اتنی ہی تعطیلات ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق یہاں ہر چوتھا دن تعطیل کا دن ہوتا ہے۔ بقیہ دن ہم اپنے طور پر تعطیلات منا رہے ہیں۔ اونگھتے ہوئے، چائے سگریٹ پیتے اور گپ بازی کرتے ہوئے عام تعطیلات سے ہمارا نہ جی بھرتا ہے نہ پیٹ مگر گرمائی طویل تعطیلات عام سی نہیں آم کی تعطیلات ہوتی ہیں۔ جبکہ جی بھی بھرتا ہے اور پیٹ بھی۔ خطا معاف ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو کرکٹ کو کھیل کا بادشاہ اور آم کو پھلوں کا بادشاہ مان کر تعظیم کے طور پر صرف دو چار رن بنانے اور دو چار آم کھانے پر ہی اکتفا کریں۔

کرکٹ میں ہم سنچری بنائیں یا نہ بنائیں ہماری مرضی بلکہ اب تو سنچری بنانا بلّے بازوں سے زیادہ ایمپائر کی انگلی اور مرضی پر منحصر ہے۔ شہادت کی انگلی سے وہ بلّے باز کو ۹۹ رن پر بھی شہید قرار دے سکتا ہے۔ لیکن آم کے موسم میں اگر ہمارے صحن میں بکھری ہوئی گٹھلیوں کو گن جائے تو یقیناً ہمارا اسکور مظہرالدین کے بلے اسکور سے زیادہ ہوگا۔ محکمۂ تعلیمات کے پیش نظر گرمائی تعطیلات کا مقصد کچھ اور رہتا ہوگا لیکن فی زمانہ ان لمبی تعطیلات کا مصرف صرف اور صرف آم کھانا اور گٹھلیوں سے کھیلنا ہو کر رہ گیا ہے۔ طلباء پڑھیں یا نہ پڑھیں۔ کامیاب ہوں یا فیل ہو جائیں۔ اساتذہ پڑھائیں یا ٹیوشن چلائیں اس موسم میں ہر ایک کو آم نصیب ہو جاتے ہیں

آدم بر سر آم۔ آموں کو اب تک لال مٹی پسند تھی اور کالے لوگ بھاتے تھے مگر اب معاملہ بدل گیا ہے۔ . . . . آموں کو اب سرد ممالک اور گورے لوگ پسند آ رہے ہیں۔

جی ہاں آموں کو شاید ہندوستان کی گرم اور فرقہ وارانہ ہوا راس نہیں آ رہی ہے۔ اس لیے اب وہ یورپ اور امریکہ کا رخ کر رہے ہیں۔ اب تو آم اور خاص لوگ ہی باہر جا رہے ہیں۔ سنتا ہے باہر کے لوگ ہندوستانی آم کو ہاتھوں ہاتھ اور ہندوستانی عوام کو آڑے ہاتھ لے رہے ہیں۔ ہمارے ایک آم فروش دوست با ذوق اور حاضر جواب واقع ہوئے ہیں۔ وہ ہمیشہ سے مہنگے اور اعلیٰ قسم کے آم فروخت کرتے ہیں [illegible] ان کی شکایت ہے کہ کوئی ان کے آم نہیں خرید رہا ہے، جہاں جیب وہ "یہ دنیا یہ محفل میرے

آم کی نہیں کہتے ہوئے اپنے آم بیرونی ملکوں کو بھیج رہے ہیں۔

مرزا غالب نے جہاں اردو دنیا کو پرانی پرتگالی شراب۔ نئی خطوط نگاری، آسان چوسر بازی اور شغل شاعری سے روشناس کیا وہاں انھوں نے آموں کی خوبیوں کو اتنے اچھوتے انداز میں پیش کیا کہ اس موضوع پر دوسروں کے لیے کہنے کو کچھ نہ رہا۔ ایک آم ہی کیا غالب نے ایسا کچھ لکھا اور کہا کہ اکثر شاعر اور ادیب حضرات نے غالب کی شاعری اور خطوط نویسی کے مطالعہ کے بعد اپنے اپنے قلم رکھ دیئے اور آموں کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کا اس شعر و سخن سے کام کی طرف منتقل کو شعر و ادب کی بڑی خدمت قرار دیا گیا۔ البتہ آموں کو خطرہ لاحق ہو گیا۔

اس دور کی ایک علت ہر چیز کی قلت ہے۔ اسی لیے آج کل ہر کوئی مرزا غالب کی طرح یہ آرزو کرتا ہے کہ آم بہت ہوں اور میٹھے ہوں۔ لیکن ہمارے بچپن اور انیس سو پچپن کے وقت قلت نام کی کوئی چیز نہیں تھی ہمیں یاد ہے کہ اس وقت بھائی جان صحن میں ہر وقت پھلوں کے بھرے بھرے ٹوکرے رکھتے اور چھت پر کھڑے ہو کر مارزن کی طرح زور زور سے پکارتے ہوئے بلاتے تھے۔

آجا آجا رے کل جامن کا ڈھیر ملا تھا اب آموں کا ڈھیر پکارے

اور ہم مارزن کے سدھائے ہوئے جانور کی طرح یہ کہتے ہوئے دوڑے پڑتے

"ہم کو آنا پڑے گا آموں کو کھانا پڑے گا۔"

کثرت میں وحدت کے مصداق آم تو ہر جگہ ملتے ہیں مگر الگ الگ ناموں سے جیسے قلمی آم (قلمی آم) لنگڑا۔ دسہری۔ چوسہ۔ نقلی ثمر بہشت، گلاب خاص، سفیدہ وغیرہ وغیرہ۔ مہاراشٹر میں ایک آم ہوتا ہے۔ جس کو آپوس کہتے ہیں اتنا میٹھا ہوتا ہے گویا کہہ رہا ہو ——— آچوس۔

پہلے آم صرف آم کی شکل میں ملتے تھے۔ اب آم جام کی شکل میں بھی مل رہے ہیں۔ آم کا جام، آم کی جیلی اور آم کا مشروب۔ جب لوگ ایک چہرے پر کئی چہروں کے نقاب لگا سکتے ہیں تو پھر موجودہ دور کے آم کیسے پیچھے رہ سکتے ہیں؟ سو وہ بھی بدلی ہوئی شکلوں کے ساتھ آ رہے ہیں۔ آم کی خوبی یہ ہے کہ یہ خربوزے کی طرح اپنا رنگ نہیں بدلتا۔ آم کے چھلکے کیلے کے چھلکوں کی طرح کسی کو گراتے نہیں ہیں۔ آم کا پودا خواص کا پودا ہے۔ عام درختوں کے ساتھ نہیں اگتا۔ ہمارے ایک دوست کے باغ میں ہر قسم کے پھل کے درخت ہیں۔ جب انھوں نے آم کے درخت لگوائے تو ہم نے کہا جناب یہاں آم کے درخت نہیں اگ سکتے تو انھوں نے جواب دیا کہ بادام ہوئے تو کیا آم نہ ہوں گے۔

موجودہ دور میں بڑے ملک ایک دوسرے کو ہتھیار اور بم دیتے رہتے ہیں۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں:

"اے میرے دل کہیں اور چل بم کی دنیا سے دل بھر گیا"

ہندوستان چونکہ صدیوں سے امن پسند ملک رہا ہے۔ اسی لیے وہ خلوص و محبت کے ساتھ ساتھ دوسرے ملکوں کو آم بانٹتا ہے بلکہ کئی ملکوں کے سربراہ تو محض آموں کی خاطر اپنے دورے آم کے موسم میں مقرر کر لیتے ہیں۔ اس طرح ان کے ہندوستان کے ساتھ میٹھے تعلقات بنے رہتے ہیں اور انھیں آم بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ ایسے دوروں کو وہ ہر لحاظ سے ثمر آور دورہ کہتے ہیں۔ اس عالمی سیاست کو آم کے

آم گٹھلیوں کے دام بکتے ہیں۔

اس طرح موجودہ دور میں جو کام ہوشیار اور قابل سفیر نہیں کر پاتے وہ کام میٹھے آم خاموشی سے کر لیتے ہیں۔ ظاہر ہے جب کوئی میٹھے آم کھائے گا تو وہ جنگ تشدد اور نفرت کی بات نہیں کر پائے گا۔ اس لیے ہمارا مشورہ ہے کہ اقوام متحدہ کے اجلاس میں مندوبین کے ہاتھوں میں آم تھما دینا چاہیے۔ ظاہر ہے وہ جارحانہ باتیں چھوڑ کر آم چوسنے میں لگ جائیں گے۔ اس طرح تیسری عالمی جنگ ٹل جائے گی۔ جوہری لڑائی، دور مار میزائل سے نزدیک مار گٹھلی جنگ بہتر ہے۔ کیچڑ اچھالنے سے آم کا رس اچھالنا اچھا ہے۔

آموں کی بات ہو رہی ہو اور بوم الدولہ کا ذکر نہ ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم آم چوس رہے تھے کہ وہ دبے پاؤں آکر پھینکی ہوئی گٹھلی کی طرح آموں کی ٹوکری پر گر پڑے اور دونوں ہاتھوں سے آموں کو چوستے ہوئے کہنے لگے۔

"اماں یار ہماری جمہوریت کا حال بھی اب آم کے درخت جیسا ہو گیا ہے۔ آم کا درخت بونے اور نگرانی کرنے والوں کو پتھر مل رہے ہیں اور پتھر مارنے والوں کو آم مل رہے ہیں۔ گویا:

جو برسے کے تھام لے آم اسی کا ہے

حسب روایت ایک سوال داغا۔ "اچھا ایسے آموں کو کیا کہیں گے جو پردہ نشین اور باحیا خواتین کی طرح خود کو چھپائے رکھتے ہیں۔ اور شریر بچوں کے ہوس زدہ پتھروں سے محفوظ رہتے ہیں؟"

ہم نے کہا:

"ایسے آموں کو سیانے آم کہیں گے۔"

بوم الدولہ نے ایک اور سوال داغ دیا۔

"اور ایسے آموں کو کیا کہیں گے جو جدید نسل کی فیشن ایبل خواتین کی طرح خود کو آشکار کرتے رہتے ہیں اور یوں وہ آوارہ اور شریر بچوں کے پتھروں کا نشانہ بن بن کر ان کی گود میں آ گرتے ہیں۔"

ہمارا جواب تھا۔

دلیانے آم

کوثر صدیقی (بھوپال)

لکھ پتی

سود کھا کھا کر بنا ہے لکھ پتی — اور اب حج کو چلا ہے لکھ پتی
چارہ چرنے میں لگا ہے لکھ پتی — یا جگالی کر رہا ہے لکھ پتی
وہ بِنا محنت مشقت آج کل — لاٹری سے بن گیا ہے لکھ پتی
سُن کے خرّاٹوں کی آوازیں مری — رشک مجھ پر کر رہا ہے لکھ پتی
ٹوٹتی سانسیں میں گنتا ہوں مگر — نوٹ گننے میں لگا ہے لکھ پتی
ہوگئی نوٹوں کی جب سے ریل پیل — جس کو دیکھو بن گیا ہے لکھ پتی
وہ بھی بھرتا ہے بھروں کی جھولیاں — لکھ پتی بن رہا ہے لکھ پتی
ان کا نمبر دو کا ہے سب کاروبار — ٹیکس چوری میں لگا ہے لکھ پتی
سنگترہ کوڑیوں کے رکھ کر جیب میں — اب کویتا کر رہا ہے لکھ پتی
ڈر رہا ہے سود کے انجام سے — اب نمازی بن رہا ہے لکھ پتی
روپیہ گننا بھی نہیں آتا جسے — وہ مقدر سے بنا ہے لکھ پتی

غزل

(آتش کے رنگ میں) — علامہ پکاؤ (بمبئی)

فلم جنگلی جو لگی تھی وہ جوانی تھی مری
صبح تک شام سے یا ہو کے سوا بات نہ تھی

اب تو جو بیس ہوں تبلیغ میں بھی جاتا ہوں
ورنہ درگاہ میں کس روز مناجات نہ تھی

ہائے کالج کے وہ دن سب کو اجازت کِس کی (KISS)
پھیرے سائل سے جو منہ کو وہ تری ذات نہ تھی

آئے بجلی دے کے وہ سب مال اڑا کر چلے گئے
دن دہاڑے یہ ہوا ہے کہ کوئی رات نہ تھی

پھونچ میں لے کے کھڑا رہتا ہے سورج مرغا
شاعری میں کبھی پہلے یہ خرافات نہ تھی

سید رحیم الدین توفیق
(حیدرآباد)

دکھتی رگیں

دکھتی رگیں پکڑنا محاورہ بھی ہے اور مشغلہ بھی، محاورہ اور مشغلہ کا اتنا مترادف ہونا اپنی مثال آپ ہے۔ گویا ایک جان دو قالب، دکھتی رگوں سے کون واقف نہیں۔ سب ہی جانتے ہیں۔ یہ کیا ہوتی ہیں۔ ہر شخص کی ایک نہ ایک دکھتی رگ ہوتی ہے کوئی اس سے بچا نہیں چھوٹا سلما کہ بے عیب صرف خدا کی ذات ہے اور بندہ خطا کا پتلا نہ ہوتا تو جنت سے ہی نہ نکالا جاتا۔ لوگ کبھو ہنسی مذاق میں اور کبھی دشمنی میں ایک دوسرے کی دکھتی رگیں پکڑتے رہتے ہیں۔ یہ کم سے کم ایک ہوتا ضرور ہے۔ اور ایک سے زیادہ کے لیے ہمت اور ہاتھ کی صفائی کی ضرورت ہے۔ دکھتی رگ کی نوعیت ہر بندہ کے لحاظ سے جدا جدا ہوتی ہے۔ بعض کی دکھتی رگ کوئی شخصیت ہوتی ہے۔ عورت مرد کی تخصیص نہیں بعض کی کوئی فطری کمزوری بعض کا کوئی جسمانی عیب یا نقص اور بعض کی کوئی ایسی دانستہ "حرکت" جس کا داغ اس کے کردار کو ہمیشہ کے لیے داغ دار کر جاتا ہے اور اسے صاف کرنے والی ایسی کوئی تلافی مافات جیسی چیز نہیں ہوتی جس کے صحیح طریقہ استعمال کے بعد لوگ اس داغ کو ڈھونڈتے رہ جائیں۔

ایک کہاوت ہے کہ "مرغی پہلے یا انڈا" مگر دکھتی رگیں پکڑنا ایسی مشکوک کہاوت نہیں ہے۔ یہ دکھتی رگوں کے عرفان کے بعد ہی کی ایجاد ہے۔ دکھتی رگیں تو انسان کے ساتھ ہی عدم سے وجود میں آگئیں۔ لیکن ان کا احساس اس وقت ہوا جب انسان کا شعور بیدار ہوا۔ اور اس نے اپنے جسم کو پتوں سے ڈھانکنا شروع کیا۔ پس دکھتی رگوں کی ٹیس محسوس کرنے کے لیے شرم و حیا۔ غیرت اور ضمیر کا زندہ ہونا ناگزیر ہے۔

دکھتی رگیں پکڑنا ایک سفاکانہ فعل ہے مگر کیا کیا جائے کہ دنیا میں سفاکوں کی کمی نہیں۔ یہ فعل بعض لوگوں کا مشغلہ ہوتا ہے بعض کی فطرت ثانی اور بعض محض انتقاماً شغل فرماتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو احساس کمتری سے چھٹکارا پانے کے لیے خود سے کسی برتر کی دکھتی رگیں پکڑ کر اپنی زخمی انا پر

پھاڑ کر لیتے ہیں ۔ جن کا مشغلہ اور فطرتِ ثانی یہ عادت ہوتی ہے ۔ لوگ عام طور پر انھیں اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے ۔ بعض وقت دکھتی رگ کا حوالہ یا اشارہ ہی کافی ہوتا ہے ۔ سمجھنے والا سمجھ جاتا ہے کہ کہیں یہ شخص اصلیت پر نہ اتر آئے ۔ اگر یہ تنبیہ ہے تو بات ٹل جاتی ہے ۔ اگر یہ اشارہ کسی ایسے آدمی کو سمجھ میں نہ آئے جسے دوسروں کے پیچھے پڑ جانے کی عادت ہو تو دکھنے والے کے پیچھے پڑ جاتا ہے ۔ بتاؤ کیا بات ہے تب اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے مجبوراً اس کی کسی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنا ہی پڑتا ہے ۔

دکھتی رگوں کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ اپنے آپ کبھی نہیں دکھتیں ۔ اسے چھیڑنے یا ... کے لیے مضراب ضروری ہے تب ہی یہ جھنجھنا اٹھتی ہیں ۔ اس پر بھی آدمی اف کہہ کے تماشہ نہیں بنتا ۔ بلکہ حتی الامکان چپ چاپ سہہ جاتا ہے ۔ بعض حضرات کی دکھتی رگیں پوشیدہ ہوتی ہیں اور بعض کی "ابھری" ہوتی تاہم بالذکر پہ باتیں سبھی جانتے ہیں ۔ جن پر خفا مبادا تبصرے کر کے محفل کو رنگین بھی بنایا جاتا ہے ۔ نیک لوگ اسے غیبت کا نام دیتے ہیں ۔ عوامی شخصیتوں کی دکھتی رگیں عوامی سطح پر پکڑی جاتی ہیں اور عام آدمی کی نجی محفلوں میں بعض دکھتی رگیں بے ضرر ہوتی ہیں جن سے پکڑنے والا اور پکڑوانے والا دونوں لطف اندوز ہوتے ہیں ۔ اس کا درد میٹھا میٹھا ہوتا ہے ۔ آج کل بہت سی مشہور ہستیاں اپنی اسی قسم کی دکھتی رگیں خود ہی پکڑ کر خوب داد بٹور رہی ہیں ۔ ہر شخص ان کی تعریف کرتا ہے ۔ بھئی کیا ظرف ہے یا اس کو خود پر ہنسنے کا سلیقہ ہے ۔ ہمت ہے ۔ خود پر ہنسنا یا طنز کرنا کوئی معمولی بات نہیں ۔ جو شخص خود پر ہنستا ہے وہ دوسروں کی ہنسی سے محفوظ رہتا ہے ۔ لوگ اس کی نیت پر شک بھی نہیں کرتے جب وہ دوسروں پر ہنستا ہے یا ان کی دکھتی رگیں پکڑتا ہے ۔ اپنے آپ پر ہنسنے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ دوسرے کی ہنسی پر اسٹاپ لگ جاتا ہے یا اس کا زہر خند ہلکا یا بالکل ختم ہو جاتا ہے ایسے لوگوں پر انگلی اٹھانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی ۔ جو خود اپنی خامیوں اور خرابیوں کی فخریہ انکساری سے تشہیر کرتے ہیں یا برملا ان پر تنقید کرتے ہیں ۔ ان کی اس اعلیٰ ظرفی اور سلیقہ کا بھرم اس وقت کھل سکتا ہے جب ان کا کوئی کٹر رقیب ان کی ایسی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دے جو خطرناک بھی ہو اور شرمناک بھی ۔

دکھتی رگیں سماج کی بھی ہوتی ہیں جنھیں افسانہ نگار ، مزاح نگار ، نقاد یا سماج کی ستائی ہوئی مظلوم شخصیتیں پکڑتی ہیں ۔ مگر سماج کی چمڑی اتنی موٹی ہے کہ اس پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا ۔ یہ رگیں چربی کی تہوں کے نیچے چھپی ہوتی ہیں جو ان کی حفاظت کرتی ہیں اور پکڑنے والا اکثر اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا ہے سماج اور سماج کے ٹھیکیدار ہمیشہ اچھے اور نیک لوگوں کو پریشان کرتے ہیں اور خصوصاً دو چاہنے والوں کے تو جانی دشمن ہو جاتے ہیں ۔ یہ محبت کے اتنے مخالف ہوتے ہیں کہ شادی سے پہلے تو دور کی بات شادی کے بعد بھی میاں بیوی محبت کرنے لگیں تو یہ برداشت نہیں کر پاتے ۔

بعض اصحاب کی دکھتی رگیں ان کی بیویاں ہوتی ہیں ۔ چنانچہ دوست احباب ہنسی مذاق میں ان کی یہ دکھتی رگیں پکڑ کر لطف اندوز ہوتے ہیں ۔ بیویاں ایسے احباب سے سخت نالاں رہتی ہیں اور انھیں لوفر ، آوارہ ، بگڑے ہوئے کے خطابات سے نوازتی ہیں ۔ یہ ان کی بلاک لسٹ میں شامل ہوتے ہیں ، اور گھروں میں ان کا داخلہ ممنوع رہتا ہے ۔ ان کا خیال ہے کہ یہ "لفنگے" ان کے شوہروں کو بگاڑ رہے ہیں ۔ یہ ذرا بھی نہیں سوچتیں کہ اگر ان میں بگڑنے کی صلاحیت ہوتی تو اتنی آسانی سے ان کے قابو میں کیسے رہتے ، اور

کب کے بگڑ چکے ہوتے۔ بیویوں کی اس قدر سختی کے باوجود ان شوہروں کو یہ دوست اتنے پیارے ہوتے ہیں کہ یہ ان سے مستقل میل ملاپ اور دوستی قائم رکھتے ہیں اور بیویوں کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ پتہ تو اس وقت چلے گا جب ان میں بگاڑ کے آثار نظر آئیں جو ممکن نہیں۔ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ محفل میں کسی مسئلہ پر گفتگو ہو رہی ہے کہ ایک دو حضرات اچانک بھڑک اٹھتے ہیں۔ اور مارنے مرنے پر تل جاتے ہیں۔ لوگ حیران کہ انھیں کیا ہوگیا۔ لاکھ کہو کہ آپ کیوں جھاگ یا ہو رہے ہیں۔ آپ کا نام تو نہیں لیا جارہا ہے تو جواب ملے گا: "آپ بات ہی ایسی کر رہے ہیں کہ لوگوں کو فوراً آجائے۔" سمجھنے والے سمجھ جاتے ہیں۔ نادانستہ کسی کا ہاتھ ان کی کسی دکھتی رگ پر پڑ گیا ہے جیسے اندھیرے میں کسی کا پیر کتے کی دم پر پڑ جاتا ہے۔ سینما ہال میں اپنی سیٹ پر جاتے ہوئے کوئی کسی کا پیر کچل دے وہ اُف اور کچلنے والا "سوری" کہہ کر رہ جائے۔ اپنے آپ پر قابو نہ ہونے کی وجہ سے لوگ خود اپنے بھید آشکار کر دیتے ہیں۔

بعض حضرات محفل میں دوسروں کی دکھتی رگ پکڑ کر خوب مزہ لیتے ہیں۔ لیکن جب ان کا استاد ان کی دکھتی رگ پکڑ لیتا ہے تو مارنے مرنے پر تل جاتے ہیں۔ ایسے وقت ان کی حالت دیکھنے کی ہوتی ہے جب وہ محفل پر چھائے رہتے ہیں اور اپنی بذلہ سنجی یا چھچھورپن کے جھولے کی اونچی پینگ بڑھا رہے ہیں۔ کہ اچانک ان کا کوئی استاد جھولے کی رسی کاٹ دیتا ہے۔ اب جو چوٹ لگتی ہے تو ایسی کراری کہ اسے سہلانے میں بھی درد ہوتا ہے۔ یہ لمحہ بڑا تکلیف دہ اور شرمناک ہوتا ہے اس کا کرب اس درد سے کئی گنا شدید ہوتا ہے جو شاید عام حالت میں اسی رگ کو پکڑے جانے پر ہوتا ہے۔ زبردست مارے اور رونے بھی نہ دے۔

ایک صاحب جنھیں اپنی بذلہ سنجی، حاضر جوابی، حاضر دماغی اور قابلیت پر بے حد گھمنڈ ہے۔ اور دوسروں کی دل آزاری کرنا جن کا پسندیدہ مشغلہ ہے باتوں باتوں میں اپنے مخاطب کا مذاق اڑا رہے تھے۔ مخاطب بھی مانے ہوئے مہمان نوازی کا لازمہ سمجھ کبھی مسکرا کر کبھی ہنس کر ان کی دل جوئی کر رہا تھا۔ باتوں باتوں میں ان کا ایک جملہ گرفت میں آگیا اور مخاطب نے چٹکی لی۔ "تو اب آپ نے یہ دھندہ بھی شروع کر دیا۔" مذاق ہوا ہوگیا۔ لفظ دھندہ تیر نیم کش بن کر ان کے دل میں اتر گیا۔ چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا۔ انھوں نے خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا کہ ایسا سخت جوابی حملہ ہوگا۔ تلخ لہجہ میں انھوں نے پوچھا" بالجو دھندہ پوچھ رہیں تم کو کیا معلوم ہم کیا ہیں۔" چونکہ وہ مہمان تھے اس لیے مخاطب نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ اس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ ان کی بذلہ سنجی اور زندہ دلی پر فل اسٹاپ لگ چکا تھا۔ اور انا ایسی مجروح ہوئی کہ اب تک انھوں نے جو لطف اٹھایا تھا۔ اس میں ذلت اور ندامت کی کڑواہٹ گھل گئی۔ ایسا لگا جیسے زندگی میں پہلی بار اس سنار کے بچے کو لوہاری چوٹ کا تجربہ ہوا ہے۔

خانہ بدوش

(حال مقیم پونہ کے قلم سے)

خانہ بدوشیاں

ایک صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ناموں میں کیا رکھا ہے۔ آدمی کی عزت تو اس کے کام سے ہوتی ہے۔ ایک دوسرے صاحب کا خیال مختلف تھا۔ فرماتے تھے۔ آج کل کام کو کون دیکھتا ہے۔ لوگ تو بے تحاشہ ناموں کے پیچھے دوڑتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو یہ ذو برق رفتاری کی حد سے آگے بڑھ کر بھی نہیں رکتی، یہی حال ہمارا بھی ہوا، ہم نے جب مزاح لکھنے کے لیے اپنے آپ تیار کیا اور کاغذ کو ہموار کر کے قلم کو برق بہ کنار کرنا چاہا تو سب سے پہلے یہی خیال ذہن میں ابھرا کہ ہمیں اس صنف میں "صبا رفتار" ہونے سے پہلے اپنے لیے کوئی عمدہ سا قلمی نام ضرور تجویز کر لینا چاہیے۔ مزاح چاہے معیاری نہ ہو مگر نام ضرور معیاری ہونا چاہیے۔ حالاں کہ پہلے صاحب کا قول ہمیں یاد بھی آیا کہ "آدمی کی عزت اس کے کام سے ہوتی ہے۔" ہم نے سوچا طنز کرنے اور مزاح لکھنے سے کس کی عزت ہوئی ہے جو ہماری ہوگی، نام تو بڑے ہوتے ہی ہیں، چاہے درشن چھوٹے ہوں اس پر پروفیسر بشیر بدر یاد آگئے۔ ویسے ہم چاہتے تو ندا فاضلی کو بھی یاد کر سکتے تھے مگر جو بات پروفیسر بشیر بدر کی ہے وہ ندا فاضلی کی نہیں، دراصل ہم ایسے لوگوں کو بے حد پسند کرتے ہیں جو اپنے منہ سے اپنی تعریف کرتے ہوئے نہیں شرماتے چاہے اپنے قلم سے اپنا قصیدہ لکھنے کی جرائت بھی رکھتے ہیں۔ جن کے آگے پیچھے کسی نہ کسی معیاری یا غیر معیاری سند کا سابقہ یا لاحقہ ضرور ہوتا ہے، ندا فاضلی نہ ڈاکٹر نہ پروفیسر، انھوں نے پچاس سال کے بعد پیدا ہونے والے قاری کے نام کوئی چٹھی بھی نہیں لکھی، بشیر بدر نے یہ چٹھی لکھ کر ہمیں اس بات کا یقین ضرور دلا دیا ہے کہ ابھی پچاس سال تک کوئی اردو کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ ندا فاضلی نے ابھی تک ایسی کوئی پیش گوئی نہیں فرمائی۔ اس لیے ہمیں پروفیسر بشیر بدر یاد آگئے اور ہم سوچنے لگے اپنے لیے ایسے نام کا انتخاب کریں جس میں بشیر بدر کے ....

ایسے نام کے چند حروف ضرور شامل ہوں، اگر ایسا کرنے سے ہمارے سرقے کا الزام بھی آیا تو ہم اسے قارئین بدل دیں گے مگر بشیر بدر کے شین، دال، اور بے کو ضرور اپنے نام یا تخلص کا حصہ بنائیں گے ڈ یوں کہ ہمیں کاموں پر کم اور ناموں پر زیادہ اعتبار آنے لگا ہے ممکن ہے یہ بھی بے اعتباری کی ایک دلیل ہو۔ ہم اس

سلسلے میں غور و خوض کر ہی رہے تھے کہ اچانک حضرت خامہ بگوش" کی روح مظروفہ نے (ظرافت سے بھری ہوئی روح، آپ اس کے معنی لغت میں تلاش نہ کریں) ہمارے ذہن و دل پر اپنا تسلط جما دیا۔ پہلے تو ہم بہت گھبرائے کیوں کہ زندگی میں پہلی بار ایسی بال کی کھال نکالنے والی روح سے سابقہ پڑا تھا، روحوں کو بھگانے کے جتنے منتر یاد تھے ہم نے جلدی جلدی سبھی پڑھ ڈالے مگر خامہ بگوش کی روح نے یہ کہہ کر ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا کہ یہ منتر تو مردہ روحوں کے لیے وجود میں آئے ہیں، میں تو ایک زندہ اور فعال روح ہوں مجھ پر تمہارے جنتر، منتروں کا کوئی اثر نہیں ہوگا" ہم نے کہا "پھر ہم آپ سے کیسے گلو خلاصی حاصل کر سکتے ہیں، جواب میں ایک زوردار قہقہہ فضاؤں میں بلند ہو کر ہماری سماعت سے ٹکرایا اور پھر فرمایا "یہ ممکن نہیں" ہم یا تو کسی کے سر پر سوار نہیں ہوتے اور اگر سوار ہو جائیں تو پھر زندگی بھر اسی کے لیے تازیانہ بنے رہتے ہیں سرِ دست اس میں دنیا کے کسی خطے کی قید نہیں، لوگ جانتے ہیں کہ لندن میں بیٹھے ہوئے ساقی فاروقی اور ہندستان میں ایم حسین (بشیر بدر) کے سر پر ہم جب سے سوار ہوئے ہیں تب سے نہ ساقی فاروقی کو لیٹنے دیا نہ بشیر بدر کو اٹھنے دیا حالانکہ ایک کے پہلو اور دوسرے کی کروٹ سے شعلے نکلنے لگے ہیں۔ مگر ہم نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا (محبتوں میں ایسی رواداری اب کم ہی دیکھنے میں آتی ہے) ہم اب اپنے حواس میں آچکے تھے اس لیے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے دست بستہ کھڑے ہو گئے اور پھر سر تسلیم خم کر لیا۔ بظاہر یہ ہماری جانب سے اعترافِ شکست تھا مگر یہ سچ ہے کہ ہم اندر سے بھی ہار چکے تھے۔ اگر مجتبیٰ حسین یا یوسف ناظم کی ارواحِ مظروفین کی بات ہوتی تو ہم تھوڑا سا احتجاج کر لیتے، واویلا مچا لیتے یا پھر خوشامد کر کے ہی چھٹکارا حاصل کر لیتے کہ یہ اپنے گھر کی بات تھی، مگر خامہ بگوش کی روح کا معاملہ ہی الگ تھا مسئلہ سرحد پار کا نہیں تھا کیوں کہ روحیں سرحدوں کے حصار کی محتاج نہیں ہوتیں۔ طول طویل فاصلے بھی ان کی نظروں میں کوئی معنی نہیں رکھتے۔ دراصل بات یہ تھی کہ ہم پہلے ہی سے خامہ بگوش کی خامہ بگوشیوں کے قائل تھے اور انھیں اپنا روحانی پیر و مرشد مان چکے تھے، ماضیِ قریب میں ہم نے جب بھی خامہ بگوش کا کوئی کالم یا خاکہ پڑھا وہ مزاح لکھنے والوں کی بھیڑ میں ہمیں بلند قامت ہی دکھائی دیئے۔

ہم نے اب تک سو سوا سو کتابوں پر تبصرے کیے، تجزیئے، تنقید لکھی، پیش لفظ اور دیباچے لکھے مگر یقین مانیے کتاب کبھی نہیں پڑھی۔ نہ ہی پیش لفظ لکھتے وقت کبھی نظر بھر کر کسی مسودے کو دیکھا۔ بس کتاب کا نام اور مصنف کا مقام دیکھ کر ہی اپنی رائے لکھ دی، مسودہ کاتب کے پاس رکھا ہے اور ہم اپنے مطالعے کی میز پر بیٹھے بیٹھے دیباچہ لکھ رہے ہیں، اکثر یوں بھی ہوا کہ اشاعت کے بعد کتاب کو کم اور دیباچے کو زیادہ پسند کیا گیا، کئی احباب اپنی کتابوں کی اشاعت سے پہلے ہم سے جتنے خوش تھے کتابوں کی اشاعت کے بعد اتنے ہی ناراض ہو گئے۔ بظاہر اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں کیوں کہ پیش لفظ لکھتے وقت ہمیں صاحبِ کتاب کا کم اور اپنی آبرو کا زیادہ خیال ہوتا ہے۔ یہ بات تو جملۂ غیر معترضہ کے طور پر بتا رہے ہیں ورنہ بتانا تو یہ کرانا تھا کہ جب خامہ بگوش کی پہلی کتاب پہلی بار چھپ کر بازار میں آئی تو ہم نے پہلی بار پوری قیمت ادا کر کے کتاب خریدی اور پھر حرف بہ حرف ہی نہیں بلکہ زیر زبر اور پیش کے ساتھ پہلی بار ایک مکمل کتاب آخری حرف تک پڑھنے کا ریکارڈ بھی قائم کیا، صحیح معنوں میں اس کتاب کی عبارت نے ہمیں ایسا متاثر

کیا کہ ہم اپنے آپ ہی خامہ بگوش کو اپنا پیر و مرشد مان کر ان کی تقلید میں "خانہ بدوش" بن بیٹھے، خود ساختگی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ بشیر بدر میر و غالب کو اپنا رقیب کہتے ہیں۔ ہم بشیر بدر کو اپنا رقیب اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ ہم دونوں کا زمانہ ایک ہے۔ رقابت اگر اپنے سے سو سال پہلے کے لوگوں سے کی جائے تو اس کا کوئی مقام بھی ہوتا ہے۔ ویسے طنز و مزاح میں ہمارا اتنا بھی مقام نہیں جتنا بشیر بدر کا مشاعرے کے اسٹیج پر ہے۔ تاہم ہم نے اپنا قلمی نام "خانہ بدوش" انتخاب کر کے یہ ثابت کر دیا کہ شین اور دال بے اور یے پر جتنا بشیر بدر کا حق ہے اتنا ہی ہمارا بھی ہے۔

۵۵

ڈاکٹر انیس سلطانہ (بھوپال)

شامتِ اعمال ما

چاروں طرف کتابوں کے ڈھیر، درمیان میں بکھرے ہوئے اوراق جن پر کہیں کہیں نشان لگے ہوئے، کہیں کچھ لکھا ہوا، لکھ کر کاٹا گیا، کاٹ کر باندازِ دگر نمبروں کی ترتیبِ نو، اپنے حسابوں، خوب سے خوب تر کی جستجو، جستجو کیا، تلاشِ حق کہیے کہ تحقیقِ جدید کو بزعمِ خود تلاشِ حق ہونے کا شرف بھی حاصل ہے ــــ اور یوں کچھ ادھر سے لیا کچھ اُدھر سے، بھان متی کا پٹارہ تیار ــــ جسے آسانی کے لیے تحقیق کہنے لگے ہیں۔

سو ہم نے تحقیق و تنقید کا نام لے کر دونوں کی خوب خوب حق تلفی کی۔ مزید براں کہ مقامی ادیبات پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز کردی کہ اہلِ وطن سارے قصور بھلا کر ہم ایسے ناچیز کو بھی "چیز" کریں۔ پانچ سال کی محنتِ شاقہ کے بعد مقالہ تیار تھا، بلکہ ہمارے ہاتھوں میں اس کا صلہ موجود تھا، جو مقامی یونیورسٹی نے ہماری کارکردگی سے مطمئن ہو کر ہمیں عطا کیا تھا۔

قلم جس دن سے پکڑا تھا، کچھ کچھ یقین تو تھا کہ کبھی ہم بھی نوازے جائیں گے۔ لیکن اب تو مکمل یقین تھا ایم اے کر لینے کے بعد ہی ہم اپنے آپ کو محققِ اعظم سمجھنے لگے تھے۔ دوست احباب بھی ورغلانے سے باز نہیں آئے، چنانچہ ڈاکٹر فلاں و فلاں کے نام کی تختی ہمیں دکھا دکھا کر جتاتے کہ ہم بھی اس بدعت میں شامل ہو جائیں۔

شہر کے ہر اخبار میں ہماری ایک معمر سی تصویر شائع ہوئی۔ لیکن ان احباب نے خبر نہ لی جو ہمیں اکساتے رہتے تھے۔ احباب کے خیال سے ہی ہم نے تصویریں کھنچوانے پر معقول رقم ضائع کی تھی۔ ورنہ بچپن سے آج تک ان تصویروں کے علاوہ کبھی تصویر کھنچوائی ہو تو کافر۔

ہماری بے چینی عروج پر تھی۔ ان احباب کے پتے بلکہ ان کا حال معلوم کرنے کے لیے ہماری کوششیں جاری تھیں اور تجسس اپنی انتہا پر کہ [illegible] نے خبر کیوں نہ لی ــــ؟

بعد از تلاشِ بسیار ان میں ایک صاحب ہمیں میسر آئے۔ پتہ چلا کہ مقامی اخبار پڑھنا ہی کسرِ شان

سمجھتے ہیں۔

ایک دوسرے حضرت سے ہم نے خفگی کا اظہار کیا۔۔۔ کہنے لگے "ارے وہ آپ کی تصویر تھی۔ کچھ کچھ شک تو ہمیں بھی ہوا تھا۔ لیکن ہمیں آپ کا نام معلوم نہ تھا۔" عرفیت نے یہ دن دکھایا۔!!!

ہم نے بھی دل میں ٹھان لی کہ جب تک عزیز پیاروں کو یہ خبر سنا نہ لیں گے چین سے نہ بیٹھیں گے۔ اور مذاق ہے کوئی۔ شیخ سعدی نے چالیس سال کی عمر کے بعد علم حاصل کیا ۔۔۔ جس کی آج تک شہرت ہے۔ ہم نے پچاس کے بعد ایک عدد اعزازی ڈگری حاصل کی اور کسی کو خبر نہ ہوئی۔

آج تک اپنے نام کی مہر بنوائی تھی نہ وزیٹنگ کارڈ چھپوائے، رائٹنگ پیڈ چھپوانے کا ان دنوں جی چاہتا تھا۔ جب خط لکھنے کی عمر تھی۔ اب کہ خط لکھیں تو کیا اور کیوں کے ساتھ کسے بھی ۔۔۔؟؟ وزیٹنگ کارڈ بھی کسے دیں؟ کہ شہر میں اونٹ بدنام ۔۔۔!!

مہر بھی بھلا کس کام کی کہ؟ ۔۔۔ لیکن عزیز پیاروں کی خواہش کے آگے سر جھکانا پڑا۔

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغ جگر ہدیہ۔ جانی درد مند کے غم خوار آئے تو بھی۔ گل بدامن، مٹھائی کے ڈبے ساتھ میں ۔۔۔ ہم شرمسار کیا' پانی پانی ہونے جا رہے تھے۔ کالج یونیورسٹی کے امتحان پاس کرنے کے بعد احساس فخر ہوتا تھا اور یہ ڈگری کرئے ملامت سے آشنا کر گئی۔

ایک عدد معصوم سی عزیزہ وارد خانہ ہوئیں اور ہماری گلپوشی کرنے کے بعد فرمانے لگیں ۔۔۔ "ارے ہاں بھائی جان آپ نے کیا کیا ہے؟ کچھ ملا ہے آپ کو ۔۔۔۔ ہے نا ۔۔۔۔ اچھا تو مبارک باد ۔۔۔"

ایک اور صاحبہ آئیں ۔۔۔۔" ارے ہاں سنا ہے ڈاکٹرنی ہو گئیں تم ۔۔۔ اللہ خیر ۔۔۔ اسپتالوں کے چکر سے تو چھٹی ملی"۔

ہم دل ہی دل میں یوں گویا تھے ۔۔۔ "علاج درد دل تم سے مسیحا ہو نہیں سکتا"۔

ہماری ڈاکٹری کا اعلان ہوتے ہی طالبات کی بھیڑ لگ گئی کہ اب ہم بھی مجاز ہیں کہ تحقیق کے اس مشکل فن میں ان کی رہبری کر سکیں ۔۔۔ لیکن رہبری تو وہ کرے جسے اس راہ جانا ہو ۔۔۔ جو تھک کر بیٹھ رہیں وہ کیا کسی کی رہبری کریں گے ۔۔۔ بہت ڈرایا، خوف زدہ کیا کہ یہ راہ کانٹوں بھری ہے۔ انگلیاں فگار ہو جائیں گی۔ پیروں میں آبلے پڑ جائیں گے، نگاہ کمزور ہو جائے گی اور گردن جھکی کی جھکی رہ جائے گی۔ لیکن نہ راہ کی مشکلیں انھیں ڈرا سکیں اور نہ منزل کی دوری انھیں روک سکی ۔۔۔ ان کی نظر تو مچھلی کی آنکھ پر تھی۔

۵۵

سید طالب حسین زیدی
(حیدرآباد)

ہم نے تو دوسری کر بھی لی

(جنگ آمد کے مصنف کرنل محمد خاں کے خط کا جواب)

محترم کرنل صاحب، السلام علیکم!

آپ کا ۱۳ / جنوری ۱۹۹۶ء کا گرامی نامہ جو میرے خط کے جواب میں ہے یہاں اس وقت پہنچا جب میں تقریباً مایوس ہو چکا تھا اور اس گمان میں مبتلا ہو گیا تھا کہ شاید میرا خط آپ تک نہیں پہنچا اور "ڈاک بند" ہو گیا۔

لیکن خط کے ابتدا ہی میں ہسپتال میں داخل ہونے والی خبر نے تھوڑی دیر کے لیے سہما دیا' دہلا دیا۔ مجھ زار و نزار کو ایسی ہولناک خبریں "کوئی" نہ سنایا کرے تو اچھا ہے۔ ہول کھا جاتا ہوں، خلجان میں مبتلا ہو جاتا ہوں، کیوں؟ کیوں کہ خود ادھر کا احوال یہ ہے کہ دوا۔ ڈاکٹر اور ہسپتال میں آرام لینے جیسی عیش کوشیوں سے بے نیاز ہوں۔ ایمان یہ ہے کہ جہاں سے درد ملتا ہے اس کے مداوے کا انتظام بھی ادھر ہی کا ہے۔ "Headache" اور بارہا کے تجربوں نے میرے اس ایقان پر مہرِ تصدیق بھی ثبت کر دی ہے' چنانچہ ایسے عمل کو پالتا ہی ہوں ورنہ کرنل صاحب اس سوختہ ساماں کی کہانی کبھی آپ جو سنیں گے تو ششدر رہ جائیں گے کہ آخر یہ آشفتہ سر تھپیڑوں سے پس پسا کر بھی کیوں کر اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹوں اور چہرے پر بشاشتوں کے شگوفے کھلا لیتا ہے؟ اس نسخۂ کیمیا کے لیے بھی اپنی نعمت ہی کا رہینِ منت ہوں سپاس گزار ہوں' کسی نے کیا فرمایا ہے؟

اسد کو بوریئے میں دھر کے پھونکا موجِ ہستی نے
فقیری میں بھی باقی ہے شرارت نوجوانی کی

ہسپتال والی خبر کے بعد آپ نے قلم کو بہت جا کر اپنے خط میں "۸۰" کا ہندسہ بھی رقم فرمایا ہے، کہا جاتا ہے اور مثل مشہور ہے کہ ننانوے کے پھیر میں بنیے ہمیشہ سرگرداں رہتے ہیں آپ کو کیا ہو گیا کہ "۸۰" کے بند کے چکر میں پڑ گئے۔ کہہ رہ ڈالیے ان ہندسوں کو دل و دماغ سے اللہ کا! انا باعث فساد ہوا کرتا ہے . . . . آپ کو فارعق کے بے عمرہ . . . .

"تذکرہ تنہائی" کا بے ریو زیادہ مصلح بے ساختہ کہا — تقدا اللہ و اماد: ستانہ باد نہیں! کہاں ان ہندسوں ---

گوشہ

الٹ پھیر میں پھنسا رکھا ہے۔ ۔۔۔ آپ کو ایک فوجی کی شانِ قلندری کی کہانی سناتا ہوں سن کر آپ عنداللہ ماجور و مستجاب ہوں گے۔

۱۹۷۵ء میں جب میرے پنڈوی والے چچی صوبے دار میجر ق" کی تیسری اہلیہ بھی ۔ اللہ کو پیاری ہو گئیں تو تقریباً ایک ہفتہ بعد ہم بہر تعزیت حیدرآباد سے پنڈوی پہنچے اُدھر چہرے پر ماتمی کیفیت کے آثار پیدا کر کے چچا کے حضور میں جو حویلی کی بیٹھک میں مونڈھے پر تشریف فرما حقہ کے کش لگانے میں مشغول تھے حاضر ہوئے اور ابھی ہم نے سلام کے بعد تعزیت ادا کرنے کیلئے منہ کھولنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ وہ ہمارے مافی الضمیر کو بھانپ گئے اور ہاتھ اٹھا کر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پ مخصوص رکروٹوں کو کاشنز دینے والی گرج دار آواز میں روک کر فرمایا اور کیا فرمایا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !؟

" بس رہنے دے ان " ڈھکوسلوں کو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " ہم نے تو دوسری کر بھی لی "۔ ۔ ۔ ۔ جا' وہ اندر بیٹھی ہے سلام کر آ، اپنی چچی کو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ! اس آن ہم پر شرح صدر ہوا تھا کہ ایک فوجی اور وہ بھی ٹھیٹ مسلمان فوجی کا اندازِ عارفانہ کیسا ہوتا ہے ؟

صوبہ دار میجر چچا " ق " مرحوم کا تکیۂ کلام " فاصلہ مردی و نامردی قدمے دارد " ہوا کرتا تھا ' جس کو وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے سارا دن گنگنایا کرتے تھے اور جب حویلی کے اندر جاتے اور اس وقت کی ہماری " دوسری چچی " پر نظر پڑتی تو ہم بچوں کو آنکھ مار کر استاد فیاض خاں کی ٹھمری " یا جو منہ کھل کھل جائے سنو نیا نے کیا جادو ڈارا ۔ لہک لہک کر الاپنے لگ جاتے تھے جس کو سن کر پتہ نہیں یا جو نہ کھلا بھی تھا یا نہیں مگر ' " ا ! ! چچی مرحومہ کا گھونگھٹ ایک دو فٹ اور لمبا ہو جایا کرتا تھا اس کے اندر سے آواز آتی تھی " بے شرم ہو گئے ہیں " ساری پنڈوی میں ان کی زندہ دلی کا شہرہ تھا ' کوئی شامت کا ۔ ۔ ۔ ۔ ہی لیا تو ہنستے سے اکھڑ جاتے اور پوچھتے کیا اچار ڈالنا ہے مجھے " ؟ ہم بچے کسی بات سے ڈر جاتے تو ان کی ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ ساتھ " فاصلہ مردی و نامردی " کی وعید سے نہیں بچ پاتے تھے ۔

ایک مرتبہ نواب زادہ جنرل شیر علی خاں بہادر بالقابہ کے طرح دار گھوڑے " شیرو " کو لے آئے اور مجھ سے فرمایا لے ! سوار ہو جا اس پر ۔ سیاہ چمک دار رنگ کا اونچا پورا کنوتیاں بھرتا ہوا وہ گھوڑا اور ہم ٹٹو کی سواری کے شوقین آٹھ نو سال کے بچے ویسے ہی گھوڑے کی پرسنالٹی " (Personality پر ہیبت و جلال سے سہمے جا رہے تھے اس پر صوبیدار میجر چچا " ق " کا اصرار کہ ہو جا سوار ' ڈرتا کیوں ہے ' مرا کیوں جا رہا ہے ؟ اور پھر " فاصلہ مردی و نامردی والا قولِ زریں سنا کر اپنے ایک ہاتھ سے ہمارا ڈنڈ پکڑا ، اٹھایا اور گھوڑے کی پیٹھ پر ایک جھٹکے میں پہنچا دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بعد میں اس خوب صورت نہایت حلیم الطبع ، شریف المزاج گھوڑے " شیرو " کو ایک اور وجہ خود نواب زادہ صاحب بالقابہ نے اپنے ہی ہاتھوں گولی کا نشانہ بنا دیا تھا ۔

اب رہا موڈ کا سوال ۔ جس کے لیے آپ یک گونہ شکوہ سنج ہیں ' ہمارے نزدیک " موڈ " ایک تابع مہمل چیز ہے ۔ ہمارے اعصاب پر کسی بھی سمت سے یہ دباؤ نہیں ڈال سکتا بلکہ جب چاہیں اس کو حکم دے کر " مرغا " بنایا جا سکتا ہے ۔ ایک سپاہی کے ہاتھ میں جب بھی تلوار آئے گی اس کے بازو کی مچھلیاں آپ ہی تن جائیں گی پھڑکنے لگیں گی دیکھئے صاحبِ قلم جب بھی اپنی انگلیوں میں قلم تھامے گا تو وہی باغی " موڈ " ہاتھ باندھ کر اس پر اسرار و رموز کی گتھیاں

کہ کہ آتا چلا جائے گا۔ پھر دیکھیے۔ تہہ بہ تہہ کیسا رنگ جمتا چلا جاتا ہے

گدائے میکدہ ام لیک! وقت مستی بیں
کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

کرنل صاحب! آپ نے میرے وسیع مطالعے کا ذکر فرمایا اور بندہ شرم کے ہاتھوں پانی پانی ہوا۔ مجھ خوشہ چیں کے مبلغ علم کی بساط ہی کیا ہے۔ "بانکے تانگے کا علم"۔ "ادھر سے تھوڑا، اُدھر سے تھوڑا۔ بھان متی نے کنبہ جوڑا" کیا اسی کو "مطالعہ" اور "علم" کہیں گے؟

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

...... "بجنگ آمد" کے آئندہ ایڈیشن میں بیگم بھٹی کے قیمتی ...... مشورہ کے ساتھ "اے تیر میرے سینے میں مار کہ ہائے ہائے" والی "ان" کی بھولی بھالی معصوم [illegible] آپ کی بغلیں جھانکنے والی پریشانی کا اضافہ لطف دے جائے گا۔ ادبی مشغولیتوں نے مجھ کو [illegible] دوا [illegible] ہسپتال سے پرے رکھا ہے۔ ہاں کبھی کبھی ذائقہ بدلنے کے لیے نزلہ، زکام اور بخار میں مبتلا ہو [illegible] اور معمولی دواؤں سے کام چل جاتا ہے۔ دو چار روز لوٹ پوٹ کر پھر سے تیار ہو جاتا ہوں۔

آپ نے خط کے آخیر میں "میرے لیے کوئی خدمت ہو تو ارشاد فرمائیے" لکھا ہے۔ آپ کی اس نوازش اور خلوص سے فقیر اسد کے ہاتھ پاؤں فرطِ انبساط اور خوشی سے پھول گئے...... "کوئی خدمت ہو تو" کا جواب یہ ہے کہ "وہ ہے" یعنی ہم جیسے نیازمندوں کی خاطر عاطر سے آپ دواخانوں کے چکر اور "۸۰" کی گردان [illegible] کو بعجلتِ ممکنہ نکال لیجیے۔

ہم نے ان حسابوں کو لکھ کر کون سے تیر مارتے ہیں۔ لکھیں وہ جن کو ہمارے دائیں بائیں "میاں" کھاتے اور کردی نویسی پر مامور و متعین کیا گیا ہے:

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

والسلام
طالب اکرام

ڈاکٹر انوار احمد انصاری
(مالیر کوٹلہ۔ پنجاب)

ادیب و غریب

عجیب و غریب کی اصطلاح تو رائج ہے لیکن اس ادیب و غریب کی اصطلاح نے میرے ذہن کے کارخانے میں اس وقت جنم لیا جب میں نے اپنی تمام تر قوتوں اور توانائیوں کو ادب پر صرف کرکے سالہا سال گزار دیے جس کے نتیجے کے طور پر میری روزمرہ ضروریات بھی پایۂ تکمیل کے منصب پر سرفراز ہونے کا شرف ... حاصل نہ کر سکیں اور میری حالتِ زار پر کفِ افسوس ملتی دکھائی دیں۔ جب ضرورتوں کی محتاجی کا برہنہ رقص روزانہ کا تماشہ ٹھہرا تو پھر عیش و عشرت کے باغ میں کیسے قدم رکھے جا سکتے ہیں۔

میں جب بھی کوئی تحریر سپردِ قلم کرتا ہوں تو بڑی خوشی کے ساتھ کسی اخبار یا رسالے کو بھیج دیتا ہوں اور نہ شدت سے اشاعت کا انتظار کرتا ہوں۔ یعنی تحریر کو دیکھنے کے لیے اس اخبار یا رسالے کا خریدار بھی بننا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ کسی دوکان پر سے گزرتے وقت یا بس میں سفر کرتے وقت حسرت بھری اور متجسس نگاہوں سے اخبار یا رسالہ پڑھتے ہوئے لوگوں کی طرف مثل ہد ہد... گردن کو گھمانا پڑتا ہے کہ اس شمارے میں میری تخلیق جلوہ افروزی سے ہمکنار ہوئی یا نہیں۔ انتظار کے روزانہ معمول میں کبھی کبھی غسل سے پہلے ٹوتھ برش کرنا بھی بھول جاتا ہوں اور یہ حقیقت مجھ پر ناشتہ کرنے کے بعد آشکار ہوتی ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں نے اپنی ایک تحریر برائے اشاعت ارسال کی۔ جب کافی دنوں تک انتظار کوئی رنگ نہ لایا تو میں نے اپنے ایک ادیب دوست سے پوچھا "یار تقریباً ڈیڑھ ماہ گزر گیا لیکن ابھی تک میرا مضمون اشاعت سے محروم ہے۔ یہاں تک کہ پچھلے ڈیڑھ ماہ سے وہ اخبار میں برابر خرید رہا ہوں۔" یہ بات سنتے ہی انہوں نے جواب دیا "تم ڈیڑھ ماہ کی بات کر رہے ہو، ہم یہاں چھ ماہ کے مسلسل انتظار سے دم پخت ہوئے بیٹھے ہیں اور اشاعت کا ابھی تک نام و نشان بھی نہیں۔

میں نے سنا ہے کہ وہاں گروپ بندی ہے یعنی سیاست چل رہی ہے۔ کون سا ادیب کن گروہوں میں شامل ہوتا ہے اور کن میں نہیں۔ کس ادبی گروہ میں اس کا جانا آنا ہے اور کس کے پاس نہیں یہ سب دیکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد ادیب کی قابلیت کا تعین کیا جاتا ہے اور میرٹ بنائی جاتی ہے۔" میں نے احساسِ

تفاخر سے کہا "میری تحریر اتنی زبردست ہوتی ہے کہ اسے تو ہاتھوں ہاتھ فوراً ہی شائع ہو جانا چاہیے تھا۔"

"تحریر کے ساتھ ساتھ تمہاری شخصیت بھی پُرکشش ہونی چاہیے۔"

"یعنی.... "

"جہاں تم نے اپنی تخلیق بھیجی ہے کیا وہاں کے اسٹاف کا کبھی 'آلو پان' بھی کرایا ہے؟"

"میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"او ہو یار ــــ میرا مطلب ہے کبھی تم نے ان لوگوں کی خاطر مدارات اور آؤ بھگت بھی کی ہے۔"

"بھئی میں ایک ادیب ہوں ــــ سڑکوں کا ٹھیکہ دار نہیں جو افسروں کی طرح مدیروں کی مٹھی گرم کرتا پھروں۔" اس پر میرے موصوف دوست نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا "جب ٹھیکیدار مٹھی گرم کرتا رہتا ہے تو آئندہ بھی اسے ٹھیکے ملتے رہتے ہیں ــــ اس لیے تمھیں بھی حصول مقصد کے لیے ٹھیکے دار کے نقش قدم پر چلنا ہوگا۔ ایسا کرنے پر ہی تمھیں کاروبار میں کامیابی ملے گی۔" اس پر بحث کرتے ہوئے میں نے کہا "بھائی صاحب! آپ ٹھیکیدار اور ادیب کو برابر سمجھ رہے ہیں یہ تو کوئی اچھی بات نہیں۔ مجھے آپ کی عقل پر ترس آرہا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ادیب باشعور ہوتا ہے جب کہ ٹھیکیدار اس وصف سے مبرا ہوتا ہے۔ ادیب سماج کی نابرابریوں کو برابر کرنے اور بے اعتدالیوں کو اعتدال میں لانے کی جسارت کرتا ہے۔" اس پر میرے دوست مسکرا کر کہنے لگے "تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ ٹھیکیدار ٹوٹی ہوئی سڑکوں کو ٹھیک کرتا ہے، اونچ نیچ کو برابر کرتا ہے۔ اس میں آئی ہوئی بے اعتدالیوں کو رفع کرتا ہے۔ جس کو سب لوگ دیکھتے ہیں اور اس پر چل کر آرام محسوس کرتے ہیں تمہاری تحریر لوگوں کے کیا کام آتی ہے اور کون سا سکھ دیتی ہے؟" میں نے بڑی شائستگی سے جواب دیا۔ "میری تحریر اچھے اور مہذب معاشرے کی تکمیل میں مدد دیتی ہے۔ ہمیں اچھے معاشرے کی ضرورت ہے نہ کہ اچھی سڑکوں کی۔"

"مطلب یہ ہے کہ اچھے معاشرے کو سڑک کی ضرورت نہیں؟"

"خیر چھوڑو۔ اگر میں آپ کے مشورے پر عمل کر کے ان لوگوں کا 'آلو پان' کرا دیتا ہوں تو کیا میری تخلیقات زیورِ طبع سے آراستہ ہو جائیں گی؟"

"یہ نسخہ آزما کر تو دیکھو۔ تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کسی سچے دوست سے پالا پڑا تھا۔"

"مگر یہ تو ایک طرح کی رشوت ہے ــــ جب کہ ایک ادیب کا سب سے اولین فرض یہ ہے کہ وہ چار حرفوں کے اس مرکب کو نیست و نابود کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے۔"

"نہیں یار یہ تو آج کے زمانے میں تعلقات کی بنیاد ہے۔ ــــ یہ تو ایک REVICOL ہے جس سے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے جڑ جاتے ہیں۔"

طوعاً وکرہاً میں نے موصوف دوست کے مشورے پر عمل کیا اور جلد ہی اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرلی اور بہت شاداں ہوا ـــــــــ اس کے بعد میں نے معاوضے کی وصولی کے لیے بے چین رہنا شروع کردیا۔

اب میں سوچ رہا تھا کہ اس معاوضے کی رقم سے میں اپنے سائیکل کی دونوں ٹیوبیں نئی ڈلوا لوں (ا ـــــــ جن کے رخ روشن متعدد پنکچر جات سے داغدار ہو چکے تھے ۔ میں کتنے ہی دنوں بلکہ کتنے ہی مہینوں انتظار کرتا رہا لیکن کبھی پوسٹ مین نے منی آرڈر کا مژدہ نہیں سنایا۔ البتہ میرے مداحوں کے بیرنگ خطوط اکثر موصول ہونے لگے۔ پوسٹ مین الٹا مجھ سے ہی پیسے وصول کرنے لگا۔ لیکن وہ ضرب المثل ہے نا کہ چور چوری سے جائے۔ ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ میرے اندر کا ادیب مجھے لکھنے پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔ ادب کے یہ جراثیم مجھے پھر لکھنے پر مائل کرتے ہیں۔ بیٹھ جاتا ہوں۔ اشاعت کے لیے بھیج دیتا ہوں اور پھر انتظار کرتا ہوں۔

۱

پھر میں انتظار کی لوٹوں گا لذتیں

پھر اک خط لکھوں گا ان کی بے رخی کے نام

فیض احمد انصاری
(اکولہ)

کان

کان تو تقریباً جان داروں کو ہوتے ہی ہیں۔ لیکن کچھ جان دار ایسے بھی ہیں جنھیں کان کی جگہ سوراخ ہوتے ہیں۔ جن سے وہ سن سکتے ہیں۔ کان والوں کے کانوں کی الگ الگ بناوٹ ہوتی ہے۔ چھوٹے کان والوں کے بارے میں ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی عمریں کم ہوتی ہے۔ اسی طرح بڑے کان کے لوگوں کے بارے میں ایسا مشہور ہے کہ ان کی عمریں زیادہ ہوتی ہیں۔ یہ بات کہاں تک صحیح ہے یہ تو بولنے والے اور سننے والے ہی جانیں۔ مگر اللہ نے تو سب کی عمر مخصوص کر دی مطلب یہ کہ اوپر والے کا ویزا آیا کہ بس چلے۔ پھر بھی میں کہوں گا کان بھی انڈیاتے بناتے ہیں۔ شاید اسی لیے بڑے کان والے زیادہ ہی عمر پاتے ہیں۔ مثلاً گاندھی جی کی ہی مثال لے لیجیے اور مرار جی دیسائی کو دیکھ لیجیے یا پھر مدر ٹریسا کو۔ اسی طرح کچھ ایسے کان والے بھی ہوتے ہیں جن کی قوت سماعت بہت تیز ہوتی ہے۔ فوراً ہی بات سن لیتے ہیں چاہے بات کرنے والا کتنی ہی کم آواز میں بات کیوں نہ کر رہا ہو۔ اسی طرح چند ہوتے ہیں کچے کان کے۔ جو بات سنی اسے سچ سمجھ لیا۔ اور اس کا افسانہ بنا دیا اور بنا تحقیق کیے فیصلہ بھی کر لیا۔ ایسے لوگ بعد میں ضرور پشیمان ہوتے ہیں اور نظروں سے گر جاتے ہیں۔ چند ہوتے ہیں پکے کان کے یہ لوگ کبھی کوئی بات بتاتے نہیں۔ ایسے لوگ اپنے پیٹ کا پانی بھی نہیں ہلنے دیتے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو سنتے کچھ ہیں اور اس پر نمک مرچ لگا کر بیان کرتے پھرتے ہیں۔ اگر آپ کو کوئی بات پھیلانی ہو تو بس ایسے کان والے لوگوں کو پکڑ لیجیے پھر دیکھیے آپ کی بات گلیوں، محلوں اور چوکوں میں کیسے گشت کرتی ہے وہ بھی بنا کسی معاوضہ کے۔ آپ نے سنا ہو گا کہ آنکھوں آنکھوں میں بات چیت ہوتی ہے۔

اسی طرح کانوں کانوں میں بھی باتیں ہوتی ہیں۔ اگر چار بچے آپس میں کھیلتے کھیلتے لڑائی کرنے لگیں تو دو بچے ایک دوسرے کے کان میں کچھ کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ دراصل وہ کچھ نہیں کہتے۔ بس ایک منہ ملاتا ہے دوسرا اپنا سر ہلاتا ہے جیسے بہت راز و نیاز کی باتیں کی جارہی ہوں اور دونوں ساتھی آپس میں

مسکراتے بھی ہیں تاکہ دوسرے ساتھیوں کو تجسس ہو۔ آپ نے ہڑتال کے بارے میں سنا ہوگا اسی طرح اب کان میں بھی ہڑتال ہو رہی ہے یعنی سنائی نہیں دیتا۔ بہت کم سنائی دیتا ہے جسے کہتے ہیں کان میں ہڑتال ہونا۔ ہمارا کان بھی ہڑتال پر آمادہ ہوگئے اپنے ایک دوست کے مشورہ پر کان کے اسپشلسٹ کے پاس پہنچے۔ اس نے جانچ کی اور کہا آپریشن کے سوا کوئی علاج نہیں۔ ہم نے ان سے کہا ٹھیک ہے۔ پہلے گھر والوں سے مشورہ کر لیتے ہیں۔ واپس گھر آئے اور بیگم صاحبہ سے پوچھا۔ بیگم صاحبہ خفا ہوگئیں اور کہا کوئی ضرورت نہیں آپریشن کروانے کی ۔۔۔ جو آپ سے بات کرنا چاہتا ہے اس سے کہیے کہ زور سے بات کرے اور پوچھا ڈاکٹر کو کتنی فیس دے آئے۔ ہم نے دبے الفاظ میں کہا۔ ساٹھ روپے۔ بیگم گرجدار آواز میں بولیں یہ مشورہ مجھ سے پہلے لیتے تو کیا ہوتا۔ ساٹھ روپے دے آئے اس موئے ڈاکٹر کو۔ لیکن بیگم کی وہ آواز ہمارے لیے گرجدار نہیں بہت دھیمی تھی۔ بہر کیف ہم نے بھی فیصلہ کر لیا کہ اس کان سے سنیں گے اور اس کان سے نکال دیں گے۔ اس طرح بیگم کے مشورہ پر بھی عمل ہو جائے گا۔ جو کچھ کہنا ہے زور زور سے کہو ورنہ کچھ نہ کہو۔

بقول غالب:

"سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر"

کان ہی وہ تھے جو اچھی بری بات سنتے ہیں۔ کان عطیۂ خداوندی ہے لیکن ہمارے لیے زحمت ثابت ہوئے۔ جب ہم چھوٹے تھے تو والدین نے ہمارے کان کھینچے۔ جب اسکول جانے لگے تو ٹیچر نے کان کھینچے اور اب جوان ہوئے تو بیوی کان کھینچ کے کام کرواتی ہے۔ اگر کان نہ ہوتے تو ذرا سوچو ہم کیسے دکھائی دیتے یا پھر ایک ہی کان ہوتا تو بھی ہم کیسے نظر آتے اور کان کی جگہ دو سوراخ ہوتے تو لوگ چشمہ کیسے لگاتے۔

○○

ظفر کمالی (سیوان)

خورشید اکبر

خورشید اکبر کو جب بھی دیکھتا ہوں تو یگانہ چنگیزی کا خیال آتا ہے۔ یگانہ اپنے چنگیزی مزاج کی وجہ سے تھے بھی یگانہ جن کی انانیت کی تیزی سے شریانیں پھٹی پڑتی تھیں، جن کی کلاہ ہمیشہ کج رہی، جنھوں نے بڑے جتن سے ایک زمانے کو اپنا دشمن بنایا جو عزم کا کوہ گراں پہلو میں لیے پھرتے اور حریفوں کو خم ٹھونک کر للکارتے تھے۔ سخن فہمی اور زبان دانی کے نشے میں چور، غالب پرستی کے صدقے میں حاصل کردہ عزت کو ٹھوکریں مارتے، حریفوں کو انگوٹھا دکھاتے۔ اپنی بنائی ہوئی راہ پر چلنے والے بالکل وہی آتش مزاجی، وہی طنطنہ، یا دِ مخالف غاسب کے سامنے تن تنہا سینہ سپر ہونے کا وہی انداز اپنے خورشید اکبر کے حصے میں بھی آیا ہے جو شخص بندگی سے بغاوت پر کمربستہ ہو، جو لہو بند لہو نہ خون کو تیشہ بنانے کی خواہش پالے، جو سر خنجر خودی کو کھنکاتا پھرے جو غضب ناک کروٹیں بدلنے اور نماز بغاوت باجماعت پڑھنے کا خواہش مند ہو، جو اپنی خود سر جبیں پر سجدے باندھ کر رکھنے کے لیے تیار نہ ہو، جو شہ کا مصاحب بننے سے انکار کردے اور جو اپنی قسمت کی تختیاں لکھنے کا اختیار طلب کرے۔ اسے دیکھ کر یگانہ چنگیزی نہ یاد آئیں تو کون آئے؟

انھیں پہلی مرتبہ ایک سمینار میں دیکھا تھا۔ آستینیں چڑھی ہوئی مٹھیاں بھینچی ہوئیں، خیالی گرز گاڈ سر فضا میں لہراتے ہوئے جھپٹ کر پلٹ اور پلٹ کر جھپٹ رہے تھے۔ اتنی روانی سے اتنی شستہ اردو میں ان کا یوں غرانا مجھے بہت اچھا لگا لیکن ملاقات نہیں ہو سکی۔ ہمت ہی نہیں پڑی۔ ایک روز بک امپوریم پر کھڑا کسی رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ میرے دوست اور کرم فرما صفدر امام قادری تشریف لائے۔ انھوں نے ہی ایک دوسرے کا تعارف کرایا۔ میں نے سلام کیا تو سر کو اک خفا جنبش نے دی، صفدر صاحب اب قسمیں کھاتے ہیں کہ مسکرائے بھی تھے لیکن مجھے ایسا کچھ یاد نہیں پھر سر راہے ملاقاتیں ہونے لگیں۔ جب انھیں میری نیازمندی پر دہ ہو گیا جسے اعتماد کہتے ہیں تو خانۂ انوری کے ساتھ خانۂ دل کے دروازے بھی کھل گئے۔

خورشید صاحب رزم کے آدمی ہیں۔ بے خطر آتشِ نمرود میں پھاند پڑنے والے۔ وہ ساحل سے خیر و شر کے تماشے نہیں دیکھ سکتے۔ تماشائی بننا انھیں گوارا نہیں، "آ بیل مجھے مار" کا مطلب ان سے ملنے کے بعد ہی سمجھ میں آیا۔ کیا مجال کوئی ان کے سامنے ناشائستہ کلمہ کہہ کر نکل جائے۔ مرضی کے خلاف کوئی بات ہو تو پلک جھپکتے آنکھوں میں خون اتر آئے۔ مرنے مارنے کو تیار، چاہے تخت چاہے تختہ۔ مخالفین کو تب تک دوڑاتے رہیں جب تک وہ گردن نہ ڈال دیں۔ کسی فرعون بے سامان کا چراغ ان کے سامنے نہیں جل سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر جگہ یکساں طور پر نامقبول ہیں۔ شہر میں ادبی حلقوں سے لے کر رکشا والے تک خوف زدہ رہتے ہیں۔ بعض جلی صورتیں پیٹھ پیچھے ان کا نام یوں جل جل کر لیتی ہیں جیسے ان کی جملہ پریشانیوں کا سبب وہی ہوں ان باتوں سے وہ بہ خوبی واقف ہیں پھر بھی ناواقفیت کا سوانگ رچائے رکھتے ہیں۔

جمی جمائی محفل کو اکھاڑنے اور اسے ناخوش گوار بنانے میں انھیں ید طولیٰ حاصل ہے۔ اگر ان کی رگِ ظرافت پھڑکنے لگے تو کوئی بھی بات خواہ وہ کتنی ہی سچی کیوں نہ ہو اس کی تردید ضروری سمجھتے اور اپنی دلیلوں سے اسے غلط ثابت کردیتے ہیں۔ جب کبھی دلائل ان کا ساتھ نہ دیں تو آواز کے حجم سے اپنی باتوں میں وزن پیدا کرنے میں ہمیشہ کامیاب رہتے ہیں ان کا اصلی رنگ اور جاہ و جلال دیکھنا ہو تو کسی ایسے سمینار میں شرکت کیجیے جس میں وہ موجود ہوں۔ وہ کسی بھی مقرر کو جب چاہیں اپنے علم سے ہوٹ کر سکتے ہیں۔ میں نے ان کے دھاردار سوالوں سے ...... لوگوں کے ناطقے بند ہوتے دیکھے ہیں۔ بحث کے دوران ان کی آنکھوں کی چمک اور بڑھ جاتی ہے۔ اس عالم جذب میں ان کو ٹوکنا عزتِ سادات کو خطرے میں ڈالنا ہے۔ مقالہ نگاروں اور سامعین کا زہرہ آب کرنے میں انھیں لطف آتا ہے۔ یہ جب تک مباحثے کو مجادلے اور مجادلے کو مقاتلے کی منزل تک نہ پہنچا دیں، محفل کو کامیاب تصور نہیں کرتے۔ کسی ادبی اجتماع میں ایک مشہور درس گاہ کے پروفیسر نے لاف و گزاف سے کام لینا شروع کیا۔ ان کے جذبۂ فرعونیت نے زور مارا تو سوال کرنے والوں کو "پیشہ ور رسوالیے" کا خطاب دے بیٹھے۔ پھر کیا تھا اللہ دے اور بندہ لے۔ خورشید اکبر اور ان کے حواریوں نے صفیں الٹ دیں۔ میمنہ اور میسرہ کو تہہ و بالا کرتے ہوئے قلب پر ہلّا بول دیا۔ منتظمین نے دہشت زدہ ہو کر پروفیسر موصوف کو پہلے تو میز کے نیچے چھپایا۔ لیکن حالات مزید بے قابو ہونے لگے تو انھیں بڑی مشکلوں سے ایک کمرے میں تقریباً ڈھکیل کر باہر سے تالا لگا دیا۔ بات یہ ہے کہ خورشید صاحب علم کی حرارت سے ہمیشہ تپتے رہتے ہیں۔ یہی حرارت بسا اوقات جلال کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ وہ افراد کی عزت پر علم کی آبرو کو فوقیت دیتے ہیں۔ اگر کسی کا دل ٹوٹے تو ان کی بلا سے۔ سچ پوچھیے تو یہ بہار کے باقر مہدی ہیں۔

یہ خوش ہیں تو آپ کو دنیا کا عظیم ترین ادیب ثابت کردیں گے اور آپ کو یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا لیکن خدانخواستہ ناراض ہو جائیں تو پھر آپ کو عرش سے فرش پر آتے دیر نہ لگے گی۔ عرش سے فرش پر آنے میں یوں تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اس نیک کام میں اگر خورشید اکبر شامل ہوں تو اس بات کا خطرہ ہمیشہ بنا رہتا ہے کہ وہ اپنے قول کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ممدوح کو فرش پر پٹک بھی سکتے ہیں۔

خورشید اکبر بظاہر جتنے سفاک اور ظالم نظر آتے ہیں لیکن اندر سے اتنے ہی مرنجاں مرنج اور رحم دل واقع ہوئے ہیں۔ دوستوں کو دوست سمجھ کر ان سے ٹوٹ کر ملتے ہیں۔ گرم جوشی کا یہ عالم ہے کہ گلے ملنے پر بعض اوقات پسلیاں فریاد کریں۔ ان کی وضعداری کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ وہ مجھ جیسے شخص کو بھی عزیز رکھتے ہیں۔ آپ نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ جس سے ٹوٹ کر ملتے ہیں۔ موقع ملنے پر اسے بھی توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ خورشید صاحب نہ جانے کس مٹی کے بنے ہیں کہ جسے ایک مرتبہ عزیز سمجھ لیا اسے عزیز سمجھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ان کا شمار ان لوگوں میں نہیں جو دوسروں کو اپنے دکھ میں شامل کرنے اور خود دوسروں کے سکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ ان کی یہ ادائیں ایسی ہیں جن کے قائل ان کے دشمن بھی ہیں۔

ایک زمانہ وہ تھا جب سر شام وہ رحمانیہ یا قبرستانیہ میں بیٹھ کر گھنٹوں گپ لڑاتے اور وقفے وقفے سے ایک دوسرے سے لڑتے تھے۔ معذرت بھی کرتے تو دھمکی کے انداز میں اب وہ محفلیں خواب و خیال ہوتی جا رہی ہیں۔

خورشید اکبر کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ایمان دار بہت ہیں۔ دوسرے رشوت نہ لیں تو سمجھتے ہیں ایمان میں خلل پڑ گیا۔ یہ ایسے عقل کے کھرے کہ مقروض ہوتے ہیں تو ہو جائیں مگر رزق حلال ہی چاہیے۔ خود کردہ را علاجے نیست۔ ایمان داری کا یہ عالم ہے کہ کسی سے کتاب مانگ کر لائیں تو اسے بھی واپس کر دیں۔ قرض لینے سے پہلے اس کی ادائیگی کے لیے پریشان ہوتے انھیں نہیں دیکھا۔ حوصلے فراخ ہیں۔ دوسروں سے قرض لے کر اپنوں کو قرض دینا بھی ان کی ایک خاص ادا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ تنگ دستی میں بھی ان کے چہرے پر تونگری کے آثار نظر آتے ہیں۔ ہیں کالک کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ دراصل اس میں قصور تنگ دستی کا ہے اور نہ تونگری کا بلکہ یہ سارا کرشمہ ان کے مزاج کی قلندری کا ہے۔ . . . . .

. . . . . اور یہی قلندری چہرے پر آسودگی اور طمانیت کی شکل میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔

یہ حضرت مطالعہ کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ کئی مرتبہ سمجھایا کہ نقادوں، پروفیسروں اور شاعروں کے لیے پڑھنا لکھنا صحت کی علامت نہیں، انھیں دن رات فقط اصولی باتیں کرنے یا مشاعرہ پڑھنے میں مصروف رہنا چاہیے۔ ثبوت کے لیے مشاہیر ادب کی مثالیں پیش کیں لیکن یہ بات ماننے کو تیار نہیں دشواری یہ ہے کہ کتابیں خرید کر پڑھتے نہیں بلکہ ان سے باضابطہ کشتی لڑتے ہیں۔ کسی کتاب کو ادھر ادھر سے صرف سونگھ لیں تو اس کے بارے میں صاحب کتاب سے زیادہ باخبر معلوم ہوتے ہیں۔ طبیعت آمادہ ہو تو مہمل اشعار کے محاسن بیان کرنے کے ساتھ فصاحت و بلاغت اور بیان و بدیع کے اتنے گوشے چمکائیں کہ سننے والوں کے دلوں میں پیچھے لگ جائیں اور وہ ان کے علم اور اپنی جہالت کا قائل ہو جائے۔

خورشید اکبر تقریر کے فن میں ماہر ہیں۔ انداز بیان رجزیانہ ہوتا ہے۔ وہ ہر موضوع پر بے تکان بول سکتے ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ جس موضوع سے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے ہوں اس کے بارے میں اور شاندار تقریر کریں گے اور دوسروں کے ساتھ خود بھی مرعوب ہوں گے۔ اپنے آپ سے مرعوب ہونے کی ایسی نادر مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ قدرت نے انھیں ذہن رسا عطا کیا ہے۔ اس لیے ان کی رسائی ایسے گوشوں تک بہ آسانی ہو جاتی ہے۔ جن کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ وسعت مطالعہ کا یہ عالم ہے کہ ساختیات اور پس ساختیات

سے لے کر مچھروں اور مکھیوں کی جنسی سرگرمیوں تک پر یکساں روشنی ڈال سکتے ہیں۔ سامنے اندھا رکھا ہو تو فلسفے سے ثابت کر دیں گے کہ وہ بھینس کا دودھ ہے۔ کسی محفل میں ایکم ان بجانے کیسے چارپہ رجنیش کا ذکر نکل آیا۔ انھوں نے رجنیش کی کتاب "سمبھوگ سے سمادھی تک" کی جو فلسفیانہ تشریح ... سے حاضرین طبق روشن ہو گئے۔ اس تقریر دل پذیر میں قابل ذکر بات یہ ہوئی کہ بے چاری سمادھی تو تھوڑی دیر بعد دم دبا کر رخصت ہو گئی اور ذکر میں صرف سمبھوگ ہی سمبھوگ رہ گیا۔ خیر گزری کہ کسی بندۂ خدا نے بڑے موقع سے جب سارے لوگ سراپا سمبھوگ بنے بیٹھے تھے "مثنوی معنوی" کی بات نکال دی اور یہ اسی معانی سے تصوف کی فضاؤں میں معرفت کے پر لگا کر اڑنے لگے۔

جھوٹی تعریفوں سے انھیں خدا واسطے کا بیر ہے۔ وہ کسی کے بھی منہ پر، خواہ اس سے دل میں آبلے کیوں نہ پڑ جائیں۔ اس کی برائیاں بیان کر سکتے ہیں۔ وہ ہمیشہ سچی بات کہتے ہیں۔ ......
یہ اور بات ہے کہ سچ سننے کی تاب ان میں کم ہے۔ ایسے موقعوں پر وہ لڑنا شروع کر دیں گے اور جب یہ لڑنے لگیں تو حریف ان کی خوشامد شروع کر دے گا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ کسی بات سے کب خوش ہو جائیں گے اور کسی بات سے رنجیدہ۔ اس معاملے میں ان کا حال ان بادشاہوں جیسا ہے جن کے بارے میں شیخ سعدی نے کہا ہے کہ کبھی سلام سے ناراض ہو جاتے ہیں اور کبھی گالیاں سن کر انعام سے نوازتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی ناک کا استعمال غصہ رکھنے کے لیے کرتے ہیں مگر ان کی ناک پر انا کا قبضہ رہتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ان کی انا کا آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھل جاتا ہے۔ خاکسار بھی ایک مرتبہ ان کے جلال کی زد میں آ چکا ہے۔

خورشید صاحب نوکری کو لباس کی طرح تبدیل کرنے کے قائل ہیں۔ یہ ان کی ہابی ہے۔ پہلے اچھی خاصی ملازمت کرتے تھے۔ اس سے جی بھر گیا تو چپکے سے ڈپٹی کلکٹر ہو گئے اور اب لکچرر بننے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنا اسی کو کہتے ہیں۔ ایک تو یوں ہی طلبہ کلاس میں آنا اپنی شان کے خلاف سمجھنے لگے ہیں۔ جب امتحان تک کی سہولیات گھر پر میسر ہیں تو بھلا کہیں آنے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس پر خورشید صاحب جیسا استاد اس پیشے سے منسلک ہو جائے تو کیا ہو گا۔ یہ میرا قیاس نہیں یقین ہے کہ وہ گھیر گھار یا ورغلا کر کچھ لڑکوں کو کلاس میں لے بھی آئیں تو انھیں مخدوم محی الدین کی طرح پڑھائیں گے کم سکھائیں گے زیادہ۔ ان کے دل میں نماز بغاوت پڑھنے کی خواہش عرصہ سے پروان چڑھ رہی ہے، لکچرر بن جائیں گے تو امامت ہاتھ آ جائے گی اور ادبی استطاعت آ جائے تو بغاوت کا راستہ خود بخود ہموار ہو جائے گا۔

ایک روز جاڑے کے زمانے میں ان کے دولت کدے پر پہنچا۔ چھوٹتے ہی پتھروں کے خواص بیان کرنے شروع کر دیئے۔ زمرد، نیلم، عقیق، یاقوت، پکھراج اور نہ جانے کن کن پتھروں پر ان کی دھواں دھار تقریر سن کر دماغ پتھرانے لگا۔ لیکن یہ اندازہ بھی ہوا کہ وہ صرف آل راؤنڈ ادیب ہیں بلکہ ان کا علم بھی جناتی ہے۔ کسی کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ جائے تو فوراً کسی نہ کسی پتھر میں اس کا سبب دریافت کر لیتے ہیں۔ کسی کو بدہضمی ہو جائے یا شعر سمجھ میں نہ آئے تو وہ کسی پتھر کا نسخۂ کیمیا تجویز کر دیں گے گویا وہ پتھروں سے صرف دوسروں کا سر ہی نہیں توڑتے بلکہ قسمت خوابیدہ کو جگانے میں بھی اس کا استعمال کرتے ہیں۔ مشکل ان کی شخصیت بھی اتنی ہی دل کش ہے جتنی ان کی شاعری۔ اسی وجہ سے بعض اوقات یہ فیصلہ

ہوجاتا ہے کہ ان کی شخصیت شاعری پر حاوی ہے یا شاعری ان کی شخصیت پر۔ خورشید اکبر جتنا ڈوب کر شعر کہتے ہیں اسی قدر بلکہ . . . . اس سے کہیں زیادہ ڈوب کر شعر سناتے ہیں جب لوگ سنانے پر آمادہ ہوں تو پھر نہ یہ گھڑی دیکھتے ہیں اور نہ کیلنڈر، بس سنائے چلے جاتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ واہ واہ کے شور میں باذوق سامعین کے فلک شگاف خراٹے شامل ہو گئے۔ ایسی حالت میں جو سماں بندھتا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

خورشید صاحب صرف تندرست شعر ہی نہیں کہتے وہ تن و توش کے اعتبار سے بھی پہلوان صفت معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں عرصے تک یوگا سے دل چسپی رہی ہے اسی وجہ سے ان کے اشعار بھی لگتا ہے آسن جمائے بیٹھے ہیں۔ ایک مرتبہ میری شامت آئی تو ان سے یوگا کے بارے میں کچھ پوچھ دیا۔ وہ بغیر ڈپلش کھائے گربھاسن، مرگاسن، وکماسن، پدماسن، لکاسن اور نہ جانے کون کون سے آسنوں کے بارے میں معلومات کا دریا بہانے لگے۔ معاملہ یہاں تک تو غنیمت تھا لیکن کسی آسن کے عملی اطلاق کے لیے از راہ محبت وہ اس پر بضد ہو گئے کہ میں سر کے بل کھڑا ہو جاؤں تو میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔ طبیعت کی خرابی کا بہانا بنایا، دہائی دی کہ اگر گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تو پھر آپ کے شعروں پر بغیر سر کے بھی مجھے کون داد دے گا۔ لیکن اس وقت وہ اتنے مہربان تھے کہ داد کی بھی پرواہ نہیں کی۔ آپ کے صفدر صاحب ہی اس وقت بھی مشکل کشا ثابت ہوئے۔ انھوں نے میرے سر سے یوگا کی لٹکی تلوار ہٹائی۔

خورشید اکبر کے شوق متنوع ہیں۔ ہپناٹزم اور پامسٹری سے ان کا لگاؤ دیدنی ہے۔ غالباً اسی وجہ سے ان کی آنکھیں سحر انگیز معلوم ہوتی ہیں۔ بزرگانِ دین اور اولیائے عظام سے ان کی عقیدت والہانہ اور تصوف سے شغف گہرا ہے اس لیے قدرت نے انھیں وسعت قلب اور وسعت نظر دونوں کی دولت سے سرفراز فرمایا ہے۔ ممتاز مفتی اگر خورشید صاحب کو دیکھتے تو کیا عجب انھیں قدرت اللہ شہاب کا پاکٹ ایڈیشن تسلیم کر لیتے۔ دوست احباب بڑی عقیدت سے ان کے پاس قسمت کا حال جاننے کے لیے آتے ہیں اور یہ بھی ہاتھ کی لکیروں کے سہارے متاعِ گم گشتہ اور نا شنیدنی واقعات کا سراغ لگانے میں محو ہو جاتے ہیں۔ اس معاملے میں ان کا علم اتنا راسخ ہے کہ اگر کسی کی مرغی گم ہو جائے تو وہ ہاتھ دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ اسے کس نے حلال کر کے اپنے ایمان کو تقویت پہنچائی ہے۔ وہ اس بات کا انکشاف بھی کر سکتے ہیں کہ کون شاعر کتنا سرقہ کرتا ہے اور کس شخص کی پشت میں کون ناموزوں شعر کہتا تھا۔ وہ ایک منجھے ہوئے سیاست داں کی طرح مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی پیش گوئی کر سکتے ہیں اور اس واقعے کے رونما نہ ہونے پر آپ کو اطمینان بھی دلا دیں گے کہ آخر ایسا کیوں نہیں ہوا۔

ان کے ساتھ کہیں تفریح کی غرض سے جائیں تو آپ سوائے تفریح کے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ لوگ اگر کھانے پر متفق ہوں تو وہ مونگ پھلی کے لیے مچلنے لگیں گے۔ آپ ٹہلنا چاہیں تو وہ بیٹھنے پر بضد ہوں گے اور جب آپ بیٹھنے کی سوچیں تو وہ چلنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ کبھی لطیفے سننے کی خواہش مند ہوں تو وہ مرثیہ پڑھیں گے یا اطمینان کے ساتھ فلسفہ مابعد الطبیعات کا قوام مزید گاڑھا کرنا چاہیں گے۔ آپ دادرا کی تان چھیڑ دیں تو وہ فوراً بھیرویں کا راگ الاپنا شروع کر دیں گے۔ ایسے موقعوں پر بھی نہ صرف

ان کی انفرادیت برقرار رہتی ہے بلکہ ان کی ہر بات ویٹو کا درجہ رکھتی ہے اور جب ویٹو کے آگے دنیا کی نہیں چلتی تو ہم آپ کس کھیت کے مولی ہیں۔

آپ شاید اس راز سے واقف نہ ہوں کہ خورشید اکبر کسی چیز سے ڈرتے بھی ہیں وہ راز میں آج فاش کیے دیتا ہوں۔ انھیں چھپکلی کے نام سے وحشت ہوتی ہے ....

...... اگر ان کے کمرے میں چھپکلی نظر آجائے تو چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوگا فرشتوں کی آمد شروع ہوگی۔ ایسے میں یہ کسی کو پکارنا چاہیں تو گلے سے عجیب و غریب انداز کی رندھی اور گھٹی گھٹی آواز نکلتی ہے۔ اس وحشت کا سبب دریافت کیا تو بولے " جب چھپکلی کو دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ میرے شعور کا حصہ بن کر میرے وجود میں رینگ رہی ہے اور پھر میرے لہو کا جزو بن کر رگوں میں گردش کرنے لگی ہے ۔" انھوں نے اپنی وحشت کی تاویلیں اس انداز سے پیش کیں جیسے چھپکلی پہ وزیر آغا کی انشائیہ سنا رہے ہوں ۔

اس بے ربط تحریر میں صفدر امام قادری کا ذکر کئی مرتبہ آیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بات خورشید اکبر کی ہو اور صفدر امام قادری کا ذکر نہ آئے یہ ممکن ہی نہیں ۔ دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں ایک دوسرے پر فدا اور جان چھڑکنے والے خورشید اکبر اگر جانسن ہیں تو صفدر ان کے باسویل۔ خورشید اکبر کی غزل اگر کسی رسالے کو بھیجی جائے گی تو وہ صفدر امام قادری بھیجیں گے۔ مشاعرے میں خورشید اکبر کون سی غزل پڑھیں گے۔ اس کا انتخاب صفدر امام قادری کریں گے ۔ خورشید اکبر کی کوئی تعریف کرے گا تو باچھیں صفدر امام قادری کی کھلیں گی ۔ زکام خورشید اکبر کو ہوگا تو چھینک صفدر کو آئے گی ۔ معاملہ گڑبڑ وہاں ہوتا ہے جب دونوں کسی مسئلے پر بحثتے ہیں۔ لگتا ہے دونوں خواہ مخواہ ایک دوسرے کا گلا پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ گھنٹوں بحث کرنے بلکہ چیخنے کے بعد اس بات پر متفق ہوں گے کہ وہ اس پر متفق نہیں ہو سکتے۔ ویسے یہ بات بھی درست ہے کہ وہ موضوع ہی کیا جس پر اتفاق ہو سکے اور وہ بحث ہی کیا جو گلے میں ٹانکے نہ لگوائے ۔ میں ذاتی طور پر ان کی بحثوں کا اتنا عادی ہو چکا ہوں کہ اب اگر کہیں فوج داری بھی ہو رہی ہو تو یہی سمجھتا ہوں کہ ان دونوں دونوں کے درمیان علم و ادب کی تلواریں چل رہی ہیں اور کسی عام فہم مسئلے کو بزور بازو الجھایا جا رہا ہے۔ دونوں درویش ادبی محفلوں میں ساتھ جاتے اور ساتھ بیٹھتے ہیں ۔ بیٹھیں گے تو کوہ وقار بن کر۔ خورشید صاحب حسب عادت جب حریف مخالف صرف مقالہ نویس پر برس بولتے ہیں تو بطور کمک صفدر امام قادری کو ہی استعمال کرتے ہیں اور یہ کمک ہمیشہ ان کے لیے وسیلۂ ظفر ثابت ہوتی ہے۔

حضرات! ہم خورشید اکبر سے چاہے جتنا اختلاف کر لیں ، ان کی غیبت میں انھیں جتنا کوس لیں لیکن ہر حالت میں ان کی علمیت کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے۔ " سمندر خلاف رہتا ہے " کی حیثیت نئی غزل کے آسمان پر آفتاب تازہ کی ہے ۔ مجھ میں اتنی اہلیت نہیں کہ ان کے فن پر اظہار خیال کروں ، براہ راست کتاب کا مطالعہ کیجیے تو آپ کی سمجھ میں یہ بات آجائے گی کہ خورشید اکبر زبان کو بغاوت کا ذائقہ دینے ، صاحبوں سے اختلاف کرنے اور شہر بھر کو بدگمان رکھنے کی باتیں ہی نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے ہی گھر میں مہاجر کی طرح جینے کا حوصلہ بھی دکھاتے ہیں۔ اپنے نصیب کی صیدواں کو محترم پوشش کہنے والا اور سکون

کے شہر میں حادثوں کی نیند سونے والا یہ البیلا طرح دار اور بانکا شاعر جب شہرت زادوں کا شہر، نامرئیاں کا موسم، بن بیاہی بغاوت، بانجھ خواہش کی داستان، احسان کی اذان، بدی کا سبز سمندر، اجالوں کا ہجرتی لشکر اور شعاعوں کے دار انگڑائی جیسی ترکیبیں تراشتا ہے تو جی چاہتا ہے اس کے روشن مستقبل کی پیش گوئی کی جائے۔ خورشید اکبر بھی فراق کی طرح اپنی آفاقہ کو مرمر کے پال رہے ہیں۔ ان کی طبیعت میں ایج کا مادہ بھی وافر ہے یہ بڑی خوش آئند اور امید افزا بات ہے:

ہماری فاقہ مستی آسماں کا پیٹ بھرتی ہے
ہم اپنے پاؤں کے نیچے خزانہ چھوڑ دیتے ہیں

میں کسی کھوئی ہوئی قبر کا کتبہ ہوں مگر
مجھ میں زندہ کئی صدیوں کا پتہ پاؤ گے

جیسے خوب صورت شعر کہنے والے شاعر کو میں "تمرد تہنیت" پیش کرتا اور "سمندر خلاف رہتا ہے" کی تقریب رونمائی پر اسے پرخلوص مبارک باد دیتا ہوں ۔

افتخار وصی (بیتیا)

مانگے کا اُجالا

شاگرد تک گئی جو خبر میری موت کی / کرنے لگا وہ بیٹھ کر آزاد شاعری
مصرعے جدید ڈھنگ کے اس کی غزل میں تھے / ترتیب کے مزاج پہ ہنستے تھے قافیے
آکر وہ میری قبر پہ روتا تھا زار زار / رو رو کے حالِ دل وہ سناتا تھا بار بار
کہتا تھا بیچ بیچ میں جاؤں کہاں گرو / بزمِ سخن میں کیسے بچاؤں میں آبرو
اب کس کے آگے تہہ میں کروں زانوئے ادب / اصلاح آپ جیسی مجھے کون دے گا اب
کیوں مجھ کو چھوڑ کر تنِ تنہا سفر کیا / سوچا نہیں کہ سر پہ ہے طرحی مشاعرہ
اب کس سے میں خریدوں گا طرحی نئی غزل / ڈھونڈے سے کوئی ملتا نہیں آپ کا بدل
اُستاد آبرو ہے مری داؤں پہ لگی / کس سے کہوں بچائے مری ناک اس گھڑی
تھی آشکار آپ پہ میری صلاحیت / مفلوج ہو کے رہ گئی نقلی صلاحیت

ایسے میں التجا ہے کہ جنت کی ڈاک سے
طرحی غزل برائے خدا بھیج دیجیے

محمود شریف محمود (حیدرآباد)

سجنی یا سجن: کیسے کرے گی کوئی نظر فرقِ مرد و زن / مردوں کا ہو لباس جو عورت کے زیبِ تن
ہر اک ادا میں اس کی ہے مردوں کا بانکپن / نسوانیت کی اب نہیں اس میں کوئی پھبن
شیشے میں خود کو دیکھ کے ہوتی ہے جو مگن / شیشہ کرے سوال تو سجنی ہے یا سجن

پرانا پیسہ: جو اٹھنی میں بھی وہ چیز نہیں آسکتی / لے کے آتا تھا جو بازار سے تنہا پیسہ
وہ پیر اب اسے دیکھ کے شرماتا ہے / جب بھی آتا ہے نظر اس کو پرانا پیسہ

سیاسی حمام

ہیرا پھیری دھوکہ بازی سے کروڑوں کا غبن / نت نئے اسکینڈلوں کا اب ہے بھارت میں چلن
ان گنت بگلا بھگت ہیں اب ہمارے دیس میں / قوم کو دیتے ہیں دھوکے رہبروں کے بھیس میں
ہیں یہ لیڈر ایک ہی حمام میں ننگے سبھی / چار دیواری بھی اس حمام کی گرنے لگی

وہاب عندلیب
(گلبرگہ)

جدید دکنی کے ہم عصر شعرا

ماہرین لسانیات و محققین کی اکثریت کا اس امر پہ اتفاق ہے کہ دکنی اردوئے قدیم کی ایک شکل ہے جس کی ابتدائی نشو و نما حضرت امیر خسرو کے دور میں ہوئی۔ امیر خسرو نے فارسی کے علاوہ جس زبان کو شعر گوئی کے لیے استعمال کیا وہ ہندوی کہلائی۔ ممتاز محقق ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے امیر خسرو کی غیر فارسی زبان کو دہلوی ہندوی کہا ہے۔ انیسویں صدی کے خاتمے تک یہ ہندی، ہندوی زبان، دہلوی، گجری، دکنی، مسلمانی، ہندوستانی، زبان ہندوستان، اردوئے معلیٰ محاورہ شاہ جہاں آباد، ریختہ وغیرہ کے مختلف ناموں سے یاد کی جاتی رہی ہے۔ غالب اور سرسید نے اس کو ہندی بھی کہا ہے۔ دکنی کا نام بہت زیادہ قدیم نہیں ہے۔ نظامی، اشرف اور فیروز کی تصانیف میں بھی لفظ دکنی کا استعمال نہیں ہوا ہے۔ قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کے قیام کے بعد ہی اس کا نام دکنی مروج ہوا۔ وجہی، ابن نشاطی، غواصی، ہاشمی اور رستمی وغیرہ نے اسے دکنی ہی کے نام سے یاد کیا ہے۔ وجہی نے سب سے پہلے قطب مشتری (۱۰۱۸ھ) میں اپنی زبان کو دکنی سے موسوم کیا۔ خاور نامہ کا مصنف رستمی کہتا ہے :-

کیا ترجمہ دکھنی ہور دل پذیر
بولیا معجزہ یو کمال فقیر

ابن نشاطی کہتا ہے :

لیسے ہر کس کیتیں سمجھا کوں قول بول
دکنی کے باتاں ساریاں کو کھول

مثنوی یوسف زلیخا کے شاعر ہاشمی کو بھی اصرار ہے کہ :

تجھے چاکری کیا تو ا بنیچ بول
ترا شعر دکنی ہے دکنیچ بول

دکنی شاعروں کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ قدیم دور جو کہ دکنی کا کلاسیکل دور ہے جو پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے اور ۱۷۰۰ء کے کچھ بعد ختم ہوجاتا ہے۔

۲۔ دوسرا دور ۱۷۰۰ء سے شروع ہوتا ہے (ولی کا سفر دہلی) اور ۱۷۹۹ء کے بعد ختم ہوجاتا ہے۔

۳۔ تیسرا دور ملک کی آزادی سے پہلے اور بعد کا ہے جسے جدید دکنی کا دور کہہ سکتے ہیں۔

سلطنت خداداد کے بعد تقریباً ڈیڑھ سو سال تک دکنی ادب طاری رہا۔ عہد آصفی تو معیاری اردو کے گیسو سنوارنے میں صرف ہوا۔ تاہم بیسویں صدی کے آغاز پر دکنی میں کلاسیکی روایات کی پاسداری کے ساتھ ساتھ نیا اسلوب وا ظہار کہیں نظر آتا ہے تو وہ دکن میں کرناٹک اور تلنگانہ کا علاقہ ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال کے وقفہ کے بعد اس علاقے میں پھر سے دکنی شاعری کا آغاز ہوا۔ اسی دور کو ہم دکنی کا جدید دور کہتے ہیں۔ تلنگانہ کی سرزمین سے ابھرنے والے جدید دکنی کے نمائندہ شاعروں میں نذیر دہقانی، علی صاحب میاں، اعجاز حسین کھٹا اور سرور ڈنڈا ہیں۔ حمایت اللہ، گلی نلگنڈوی اشرف خوندمیری، پاگل عادل آبادی، حفیظ خاں مذاق، شمشیر کوڑنگلی، گلیم میدکی، فرید انجم اور وقار خلیل نے بھی اپنے پیش روؤں کا تتبع کیا ہے۔ سلیمان خطیب، بے ڈھب، مجلی بخاری، قصیح دہقانی ڈھکن رائچوری، بگڑ رائچوری، امام رائچوری، فیض الرحمٰن فیض ...... راکٹ بھارتی اور باسط نوشہ کا شمار کرناٹک کے نام آور شعراء میں ہوتا ہے۔ ان سب میں سلیمان خطیب ہی کو یہ اعزاز حاصل رہا ہے کہ ان کی شاعری کو راس کماری سے کشمیر تک یکساں طور پر مقبولیت حاصل ہوئی۔ تاندیڑ (مرہٹواڑہ کا شہر جو کبھی سابق ریاست حیدرآباد دکن میں شامل تھا) کے شاعر عظمت بھلاواں نے بھی جدید دکنی کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا اور اپنے مشاہدات، جذبات اور تاثرات کو دکنی میں موثر انداز سے پیش کیا ہے۔ دکنی جسے شمال کے ایک شاعر قائم چاند پوری نے عرصہ قبل مجہول زبان قرار دیا تھا، جدید دکنی شاعروں نے اسے سنوار کر درجہ کمال کو پہنچایا اور ثابت کر دیا کہ اس زبان میں وقت اور ماحول کی موثر نمائندگی اور عصری تقاضوں کے کامیاب اظہار کی صلاحیت موجود ہے۔

موضوعات کی رنگارنگی جدیدیت اور اسلوبیاتی خدوخال کے لحاظ سے اگر عصری دکنی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ کلاسیکی یا جدید شاعری سے کسی طرح کمتر نہیں ہے بلکہ بعض خصوصیات کے باعث اسے افضلیت حاصل ہے۔ دہلی اور لکھنو کے دبستانوں کے برعکس دکنی شاعری میں ہندوستانیت اور مقامیت کا غلبہ ہے۔ اس میں گل و بلبل، شمع و پروانے کی واردات سے زیادہ کوئل کی کوک اور پپیہے کی ہوک سنائی دیتی ہے۔ نیز اس میں وطن سے محبت اور اہل وطن کے احساسات کا موثر اظہار بھی ہے۔ اعجاز حسین کھٹا نے اپنے وطن دکن کی اس طرح تحسین کی ہے۔

چھماچھم وہ برسات بسر میں گگن
وہ دھاناں کے کھیتاں وہ کیوڑے کے بن
مجھے پھر ترنگاں ہیں املی کا بن
وہ میرا وطن

سرور ڈنڈا نے اہل وطن کی بے بسی کا اس طرح جائزہ لیا ہے :

جاں جینے پو ٹیکساں، جاں مرنے پو ٹیکساں
جاں جنور سے بدتر ہیں بے چارے انساں
جاں ملنا بھی مشکل ہے بیر ٹکے دو دم
ادے نا ما دیشم ، ادے نا ما دیشم

نذیر دہقانی نے . . . وطن سے محبت کی ضرورت کا اس طرح احساس دلایا :

نہ اب ہمنا کو دولت کی نہ راحت کی ضرورت ہے
دلاں میں اب وطن کی اک محبت کی ضرورت ہے

سلیمان خطیب کی نظمیں ہمالہ کی چاندی اور چینی گڑیا وطن دوستی اور جذبہ سرفروشی کی بہترین مثال ہیں۔ شاعر کی یہ آرزو لاکھوں کروڑوں عوام کے دل کی دھڑکن بن جاتی ہے :

ہمالہ کی چاندی پگھلتی رہے میرے گھر میں گنگا ابلتی رہے
یہ گاندھی یہ گوتم کی پیاری زمیں ہمیشہ جواہر اگلتی رہے

چینی گڑیا میں چین کے حملہ کے خلاف شاعر کا یہ دنداں شکن اعلان ملاحظہ کیجیے۔

تیغ ٹیپو ہیں ویر ہیں ہم لوگ
رام لچھمن کے تیر ہیں ہم لوگ
ہم میں مغلوں کی شان باقی ہے
بھیم و ارجن کی آن باقی ہے
کیوں چلا ہے کسی سے ٹکرانے
چینی گڑیا ہے ٹوٹ جائے گی

جنگ و امن کے موضوع پر بھی جدید دکنی کے شعرا نے خامہ فرسائی کی ہے۔ علی صائب میاں نے جنگ کی ہولناکی کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے :

مشیں گن گنا رئی ہے برس رئیں شیشے کے ہولے
ڈگالے پو امن کے پڑ گئے ہیں خون کے جھولے
قبر میں بند ہو کر اب سفر انسان کرتا ہے
دبا بے کیا چلے ہیں ایک قبرستان بھرتا ہے

ملک کی بدامنی کے بارے میں نذیر دہقانی یوں گویا ہوتے ہیں:

امن کا نام نیں ہے جاں بھی جاو گڑبڑ گھٹالا ہے
فقط یچ تفنگوں کا یہاں پو بول بالا ہے

سرور ڈنڈا نے امن کی ضرورت کو یوں محسوس کیا:

امن کے باتاں امن سے کرتا
ہاتھ میں برچھی لٹ نکو رے

عام انسان کی ناآسودگی اور سماجی و معاشی عدم مساوات پر بھی دکنی شعرا نے قلم اٹھایا ہے:
علی صائب میاں اپنے مخصوص لہجے میں شاکی ہیں:

باغ لگا رئیوں محنت سے، پھل دوسرے کھارئیں لیو خطبہ
آنکھ میں مٹی ڈالے سوڈالے، منہ میں بھی بھارئیں لیو خطبہ

سرور ڈنڈا نے اس حقیقت کی ترجمانی اس طرح کی ہے:

اوڑھنے ہم کو ٹاٹ تک گت نیئں
ان کے کاندھے پو شال ہے سو ہے
بھاگاں میں ان کے لکھا ہے کمخواب و مشجر
بھاگاں میں اپنے لکھا ہے پھٹا، پرانا

نذیر دہقانی نے عدم مساوات پر اس طرح ضرب لگائی:

چھلکا دیتا پچھے پن کوٹاں کب تلک   سر پو پوٹلیاں کب تلک اُپرسے لاتاں کب تلک

سلیمان خطیب نے سماجی تفاوت کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

اک طرف دھن کی گیمی جا کتو جا پیچ نیں   اک طرف توبوت کو بھی آکتو آ پیچ نیئں

ہمارے شاعروں اور فن کاروں کی معاشی پستی اور ابتری کا حال خود شاعروں کی زبانی سنئے نذیر دہقانی کہتے ہیں:

وہ بابا شاتھا ادب کا سو تو کمل سر سے تانیا تھا
نہ پینے اس کو پانی تھا نہ کھانے اس کو کھانا تھا

سلیمان خطیب اسی شاعر کا حال بیوی کی زبانی اس طرح بیان کرتے ہیں:

کہاں سے بیٹھا تھا نصیباں میں یہ شاعر اجڑیو
کیا کلیجے کو مرے جی کو جلا دیتا ہے
باتاں باتاں میں اصل بات اڑا دیتا ہے   پیسے پوچھو تو فقط شعر سنا دیتا ہے

جدید دکنی شاعری عصری موضوعات سے بھی پہلو تہی نہیں کرتی۔ جدید شاعری اور تجریدی آرٹ پر سلیمان خطیب اس طرح زخم لگاتے ہیں:

بے وزن شعر صرف ترنم سے پڑھ دیے
بے معنی نظمیں لکھیں جدّت کے نام سے
ہر شکلِ بد کو کہتا ہے تجریدی آرٹ ہے
بیلن بنا کے رکھ دیا عورت کے نام سے

علی صاحب میاں جدید شاعری کا پول اس طرح کھولتے ہیں :

گھٹی تری، املی کے بوٹاں لگ گئے انجیر کو
اک گلہری بند دیئے ہیں بھینس کی زنجیر کو
شاعراں اب یوں رچیں نوے قسم کی شاعری
ایک مصرعہ تیر کو ایک مصرعہ میر کو

جدید دکنی شعرا مناظرِ قدرت کی عکاسی میں بھی کامیاب رہے ہیں۔

سلیمان خطیب کی نظمیں پگڈنڈی ، ندی اور پانی دے رے میگھ راج شاہکار حیثیت رکھتے ہیں ۔ اس خصوص میں نذیر دہقانی کی نظم "شاعر اور برسات" بھی اہمیت کی حامل ہے۔ شادی کے تجارتی اغراض اور جہیز کی لعنت کے موضوع پر بھی دکنی شعرا نے اپنے احساسات کی موثر ترجمانی کی ہے۔ ان میں سلیمان خطیب کی نظمیں چھورا چھوری، سانپ اور بیاہ، وشّہ کی نظم "تجھے تیری عقل پہ" کو امتیاز حاصل ہے جدید دکنی شاعروں نے رومانی نظمیں بھی کہی ہیں سلیمان خطیب کی یاد، دکنی عورت کا انتظار، برسوں، اور ڈھکی راہٹوں کی گاؤں کی چھوری اور ملن کے پھول یادگار نظمیں ہیں۔ جدید دکنی کا دامن غزل کے لیے بھی تنگ نہیں ہے۔ بعض شعرا نے اچھی غزلیں کہی ہیں۔ نذیر دہقانی نے اپنی غزل میں محبوبہ کے سراپا کو اس طرح سراہا ہے۔

وہ نقاب رخ پو کا ایک ادا سے سرکا یچ
روشنی چراغاں کی مان پڑ گئی نا جی

سرور ڈنڈا کی غزل کا رنگ دیکھیے :

ہوکے برباد ان کے ہاتاں سے
اب بھی ان کا خیال ہے سو ہے

وقار خلیل یوں غزل سرا ہیں۔

جلتی ہوئی حیات کی ہے روشنی بہت
اب ہم کو یہ چراغ سرِ رہ گزر نکو

حمایت اللہ کہتے ہیں :

میرے دل میں بس کو نکل کو چلے گئے
خوشی لوٹ کو غم انڈیل کو چلے گئے

باسط نوخنہ کا رنگ تغزل ملاحظہ ہو :

خوشامد کے چمچیاں کا ہے یہ زمانہ
میں بولیا تو سچ بات کیا میری غلطی

کھینچتے ہیں دلبروں کا خاکہ شاعر اس طرح
میکدہ منہ، ناک شیشہ آنکھ پیمانہ کہتے

ہم عصر دکنی شاعری کے اس تجزیے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ جدید دکنی شاعری، کلاسیکل دکنی شاعری کی روایات کو اپنے دامن میں سمیٹے، عصری موضوعات کا بھی احاطہ کر رہی ہے اور اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ دکنی میں بھی نفاست سے لطیف احساس کو شعری جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔ ○○

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

(اداریہ)

"زندہ دلانِ حیدرآباد کی تیسویں سالانہ تقاریب ۱۲ر اور ۱۳ر اپریل ۱۹۹۶ء کو بڑے اہتمام کے ساتھ منعقد ہوئیں۔ ملک کے تمام نامور طنز و مزاح نگاروں ادیبوں اور شاعروں کو ان تقاریب میں شرکت کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ اس نوعیت کا کام زندہ دلانِ حیدرآباد کے علاوہ برصغیر ہند و پاک میں کسی ادارے نے مسلسل انجام نہیں دیا۔ دلی اردو اکیڈمی نے چند سال قبل فیصلہ کیا تھا کہ ہر سال طنز و ظرافت کی محفلوں کا انعقاد عمل میں آئے گا۔ لیکن اردو اکیڈمیوں کے فیصلے برسر اقتدار اصحاب کی توثیق کے تابع ہوتے ہیں چنانچہ یہ سلسلہ دو سال کے بعد منقطع ہو گیا۔ زندہ دلانِ حیدرآباد نے نامساعد حالات میں بھی سالانہ تقاریب کے اہتمام میں کوئی کمی نہیں کی۔ ادارہ اپنے سرپرست محترم نواب شاہ عالم خاں صاحب کا خاص طور سے شکر گزار ہے کہ آپ کی دلچسپی، فراخ دلانہ تعاون اور شفقت و محبت کی وجہ سے ہم اپنی تقاریب کی انفرادیت اور اس کا بانکپن برقرار رکھ سکے۔ ہم اردو صحافت اور اہلِ اردو کے بھی ممنون ہیں، جن کے تعاون کے بغیر ایسے بڑے پیمانہ پر ادبی اجلاس، لطیفوں کی محفل اور کل ہند مزاحیہ مشاعرہ کی محفلیں کامیاب نہیں ہو سکتی تھیں۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

ایڈیٹر :
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

جلد : ۲۸
شمارہ : ۶

جون
۱۹۹۶ء

ایڈیٹر اوورسیز :
عابد معز (ریاض)

اوورسیز کمیٹی :
مصلح الدین سعدی (جدہ)
شجاع الدین غوری (جدہ)
سعید شوکت (جدہ)
ایس۔ ایم۔ حسینی (آسٹریلیا)
غلام مجسم الدین (دوبئی)

کتابت :
محمد غالب۔ محمد عبدالرؤف

طباعت :
دائرہ پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد

مجلسِ مشاورت :
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین
یوسف ناظم
دلیپ سنگھ
حمایت اللہ

مجلسِ ادارت :
مضطر مجاز
طالب خوندمیری
صلاح الدین نیر
رحیم الدین توفیق

فی پرچہ : ۱۰ روپے
زرِ سالانہ : ۱۰۰ روپے
بیرونِ ممالک : ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ :
۲۱- بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد 500001
فون/فیکس : [illegible] ، موبائل : 521 0841

اِس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

مالِ مفت (انشائیے)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

حق تو یہ ہے کہ (ترجمہ)

پچوڑن (منظومات)

مجتبیٰ حسین

آئے بھی وہ گئے بھی وہ

پچھلے ہفتے اٹل بہاری واجپائی کی قیادت میں بی جے پی بھارتیہ جنتا پارٹی کی تیرہ دن کی سرکار ٹوٹ گئی۔ یہ اس
ملک کی اب تک کی سب سے کم عمر سرکار تھی اور یہ اتنی جلدی ٹوٹ گئی کہ اتنی کم مدت میں تو ہمارے ہاں بچوں کے کھلونے بھی
نہیں ٹوٹتے۔ ہماری جمہوریت کا یہ ایک ایسا مرحلہ ہے جس میں سرکاریں کھلونوں سے بھی کہیں زیادہ ناپائیدار بننے
لگی ہیں۔ اس سرکار کے ٹوٹنے پر ہمیں رہ رہ کے یہ خیال آرہا ہے کہ یہ سرکار آخر بنی کیوں تھی اور اگر بنی تھی تو ٹوٹی کیوں۔
اس سرکار نے تیرہ دنوں میں کیا کیا اور کیا نہیں کیا اس بارے میں ہم کچھ نہیں پوچھیں گے کیوں کہ جو سرکاریں ماضی
میں پانچ پانچ برسوں تک برسرِ اقتدار رہی ہیں ہم نے ان سے بھی کبھی کچھ نہیں پوچھا۔ کیوں کہ ان دنوں سرکاریں کچھ
کرنے کے لیے تھوڑی بنتی ہیں۔ وہ تو اس لیے بنائی جاتی ہیں کہ لیڈروں کو کچھ نہ کچھ بننا ہوتا ہے۔ ہم نے بیسیوں سرکاروں
کو بنتے اور ٹوٹتے ہوئے دیکھا ہے اس لیے اب ہمیں ان کے بننے اور ٹوٹنے کی اتنی فکر نہیں ہوتی کیوں کہ ایک سرکار
کے بھروسے پر زندگی گزارنے کے عادی نہیں رہے۔ تاہم اٹل بہاری واجپائی جی کی تیرہ دن کی سرکار کے تعلق سے ہمارے
ایک بزرگ صحافی دوست کو سخت شکایت ہے۔ صحافت کے پیشے سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ہمارے بزرگ صحافی دوست
کے اٹل بہاری واجپائی جی سے خصوصی مراسم رہے ہیں۔ جس دن اٹل بہاری واجپائی کی سرکار ٹوٹی ہے اس دن یہ ہم سے
بے حد اداس نظر آئے۔ ہم نے ان سے اداسی کا سبب پوچھا تو بولے "میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ سرکار اتنی جلدی
لٹ جائے گی۔ جب اٹل بہاری واجپائی وزیرِ اعظم بنے تو میں نے سوچا تھا کہ انہیں شخصی طور پر جاکر مبارکباد دوں گا۔ دو ایک
بار فون بھی کیا تو پتہ چلا کہ وہ اپنی سرکار کو مستحکم بنانے میں مصروف ہیں۔ سوچا کہ وہ ذرا اپنی سرکار کو مستحکم بنالیں تو
اطمینان سے مبارکباد دیتے ہیں۔ ایک ہفتہ یونہی گزر گیا پھر جب اخباروں سے پتہ چلنے لگا کہ یہ سرکار ٹوٹنے والی ہے
تو میں نے سوچا کہ اب مبارکباد دینے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن افسوس کہ میں جب مبارکباد دینے کے خیال سے چلا
تو اطلاع ملی کہ یہ سرکار ٹوٹ گئی ہے۔" ان کا کہنا ہے کہ سرکاریں تو ٹوٹتی ہی رہتی ہیں لیکن کسی سرکار کو اتنی جلدی بھی نہیں
ٹوٹنا چاہیے کہ لوگوں کو اس کے بننے کی مبارکباد دینے کا موقع بھی نہ ملے۔ ہمارے ہاں کسی کو مبارکباد دینے کی روایت بہت پرانی ہے اور
کم ہے۔ آپ حیرت کریں گے کہ پچھلے دنوں کسی معاملے میں ایک لیفٹننٹ گورنر کے اندیشے ٹوٹ گئے تھے اور جب انہیں مبارکباد

عدالت سے پیشگی ضمانت حاصل کرلی تو اس پیشگی ضمانت کے ملنے پر اس کے مداحوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور اس کے گھر پر مبارکباد دینے والوں کا تانتا بندھ گیا اور لوگ اب تک اسے مبارکباد دیئے چلے جا رہے ہیں۔ یہاں تو معاملہ وزیر اعظم بننے کا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ پورے تیرہ دن مجھے ملے لیکن میں نے مبارکباد دینے کا فرض انجام نہیں دیا۔ اب مستقبل میں مجھ سے یہ غلطی نہیں ہوگی۔ ہمارے صحافی دوست کی پریشانی بالکل واجبی ہے اور ہمیں ان سے ہمدردی ہے۔ خود ہمیں بھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ سرکار اتنی جلدی ٹوٹ جائے گی۔ اس تیرہ دن کی سرکار کے بارے میں ہمارے ایک اور دوست کی رائے بالکل مختلف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سرکار کی عمر کے بارے میں حساب کتاب میں فاش غلطی ہو رہی ہے۔ ان کا استدلال ہے کہ یہ سرکار تو صرف گیارہ دنوں تک برسر اقتدار رہی کیونکہ آخر کے دو دن تو اس نے صرف جانے میں ضائع کر دیئے۔ سچ پوچھئے تو بابری مسجد کے ٹوٹنے میں اتنی دیر نہیں لگی تھی جتنی کہ اس سرکار کے ٹوٹنے میں لگ گئی۔ پارلیمنٹ میں اس کے جانے پر لگاتار دو دنوں تک بحث ہوتی رہی اور ساری قوم کا وقت الگ ضائع ہوا جو دو دنوں تک ٹیلی ویژن سیٹوں کے آگے بیٹھی رہی۔ اس پر ہمارے ایک اور دوست نے کہا دو دنوں تک قوم کا وقت ضائع ہونے کی بات تو چھوڑیئے۔ یہ بھی تو دیکھئے کہ ٹیلی ویژن پر جو بحث دکھائی گئی اور اس بحث کا جو معیار تھا اسے دیکھنے کے بعد تو میرا کم از کم ایک مہینہ تو اس کوفت میں ضائع ہو جائے گا کہ ہمارے ملک کی جمہوریت کس سطح پر پہنچ گئی ہے۔ بہر حال اس سرکار کے ٹوٹ جانے پر لوگ اپنے اپنے طور پر ردعمل کا اظہار کر رہے ہیں۔ ہمارے ایک دوست عام انتخابات کے نتائج کے اعلان کے فوراً بعد دہلی سے غائب ہو گئے تھے۔ ہم سے ملاقات ہوئی تو ہم نے دہلی سے ان کے غائب رہنے کی وجہ دریافت کی۔ بولے "بھئی! میں تو حفظ ماتقدم کے طور پر دہلی سے باہر چلا گیا تھا۔ جب انتخابات کے نتیجے آئے تو مجھے احساس ہوا کہ کوئی بھی لیڈر نئی سرکار بنانے کے قابل نہیں ہے۔ اس لیے میں نے عافیت اسی میں جانی کہ دہلی سے کہیں باہر چلا جاؤں" تاکہ کوئی مجھ سے سرکار بنانے کے لیے نہ کہے۔ جو آدمی پارلیمنٹ کا رکن نہیں ہے اس سے بھی تو سرکار بنانے کے لیے کہا جا سکتا ہے۔ میں اپنے آپ کو ایسی کسی آزمائش میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے باہر چلا گیا تھا۔ بہر حال ملک میں جمہوریت کا جو حشر ہو رہا ہے اور جس طرح کی سرکاریں بن رہی ہیں ان میں ہم جیسے عام شہریوں کا پریشان ہونا ضروری ہے۔ کیا عجب کہ کل کے دن کوئی ہم سے بھی سرکار بنانے کے لیے کہہ دے۔ اور اگر کوئی کہے گا تو ہم پیچھے ہٹنے والے تو ہیں نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس سرکار کا جو بھی حشر ہوگا اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔

اس تیرہ دن کی سرکار کے بارے میں اب ہم غور کرنے بیٹھے تو احساس ہوتا ہے کہ وزیر اعظم مسٹر واجپائی کو چھوڑ کر باقی کے سارے وزیروں نے بڑی جلد بازی دکھائی۔ وزیر قانون نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ وہ کس کس کے خلاف مقدمہ چلائیں گے اور کن کن کو جیل بھجوائیں گے۔ وزیر اطلاعات نے تو دوردرشن اور ریڈیو پر آنے والے پروگراموں کے بارے میں ایک تفصیلی ہدایت بھی جاری کر دی تھی کہ کونسا پروگرام آئے گا اور کونسا نہیں۔ ہمارے اطلاعات کے عہدیداران ہدایات پر عمل کرنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ وزیر اطلاعات استعفیٰ دے کر چلے گئے۔ ایسی صورتحال عہدیداروں کے لیے پریشان کن ہوتی ہے۔ مستقبل میں جو بھی حکومت آئے گی اور اگر وہ کوئی ہدایت جاری کرتی ہے تو عہدیدار اس حکومت کے برخواست ہونے کے انتظار میں ان ہدایات پر عمل نہیں کریں گے۔

ہمیں سب سے زیادہ ہمدردی تو جناب سکندر بخت سے ہے جو اس تیرہ دن کی سرکار میں وزیر بنا
ئے گئے تھے لیکن وہ اس عہدہ سے ناخوش تھے اس لیے انھوں نے ایک ہفتہ تک اپنے عہدہ کا جائزہ
میں لیا۔ مگر جب انھیں ہاؤسنگ کے علاوہ وزارتِ خارجہ کا بھی عہدہ دیا گیا تو تب کہیں انھوں نے جائزہ
لینے کا فیصلہ کیا لیکن کیا کریں اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ بڑی مشکل سے انھیں تیرہ دن کی اس سرکار
میں چار دن ملے اور وہ بھی اس طرح کے وہ آرزو میں کٹ گئے اور دو انتظار میں۔ سکندر بخت صاحب جانتے
ہی ہیں انھیں اس طرح کے معاملات میں دیر نہیں کرنی چاہیے تھی جب کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے دیگر وزیروں
کا یہ حال تھا کہ وزارت کا حلف لیتے ہی اپنے بال بچوں کو بھول کر دفتروں میں جا کر بیٹھ گئے اور اس وقت
تک بیٹھے رہے جب تک کہ کئی اہم سرکاری فائیلوں کی فوٹو کاپی نہیں کروالی۔ اقتدار کی کرسی اگر ملے تو
اس پر لگاتار بیٹھے رہنا چاہیے۔ حوائجِ ضروریہ کی خاطر دو چار منٹ کے لیے کرسی پر سے اٹھنا پڑے تو یہ الگ
بات ہے۔ بہت عرصہ پہلے ہم نے ایک تامل سیاسی فلم دیکھی تھی جس میں ایک حکمران کو اقتدار کی کرسی ملتی ہے تو
وہ اس پر سے اٹھنے کا نام نہیں لیتا۔ کھانا بھی تختِ شاہی پر بیٹھ کر ہی کھاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں اس
تختِ شاہی کو اس کی ارتھی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ بہرحال مستقبل میں کوئی سرکار بنے اور اس میں کسی کو
وزیر بنایا جائے تو اسے فوراً اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ جانا چاہیے دیر سویر سے اب نقصان اٹھانے کا زیادہ احتمال ہے۔

اقبال شانہ

بم

قہقہے شہروں پھٹ رہے ہیں یا دم　　جو نہیں پھٹتے ہیں وہ بے کار بم

جو بناتے ہیں یہ دہشت ناک شے　　ان کے گھر یا رب پھٹیں دو چار بم

عاشقی کا یہ صلہ اچھا ملا　　یار نے بھجوا دیا ہے "تار بم"

عہدِ اکبر کی یہ ادنیٰ توپ سے　　کر رہا ہے عشق کا اظہار بم

ردِ عمل اس ناوش کو دیکھ کر　　ہو گیا میری طرح بے کار بم

سامنے اس کے لرز جاتا ہوں میں　　آدمی ہے یا ہے میرا یار بم

امن کا جو درس دیتا ہے سدا　　جیب میں رکھتا ہے وہ دو چار بم

بہہ رہی ہے گھر میں دولت کی ندی　　آج کل ان کا ہے کاروبار بم

اُڑ گئے ہیں ہوش میرے دوستو　　بن گیا ہے یار کا دیدار بم

شاعری کی اُڑ رہی ہیں دھجیاں　　ہیں یہ شانہ آپ کے اشعار بم

پنکھا

اقبال شانہ

گرمیوں میں تو بند تھا پنکھا　　سردیاں آئیں چل گیا پنکھا

کیا پتا کیوں ہوا نہیں آتی　　دے رہا ہے مگر صدا پنکھا

کیسے بیٹھوں میں چین سے یارو　　سر کے اوپر ہے ڈولتا پنکھا

اپنے ہاتھوں سے فٹ کیا میں نے　　سر پہ اپنے ہی گر گیا پنکھا

تر بہ تر ہیں ادھر پسینے میں　　ان کی جانب ہے گھومتا پنکھا

"روڈ رولر" کی یہ نہیں آواز　　شور کرتا ہے آپ کا پنکھا

وہ الرجک ہوا سے ہیں شاید　　گھر کے باہر لگا دیا پنکھا

میں نے روزن بنا دیا چھت میں　　کیوں خریدوں میاں نیا پنکھا

جانے کیوں گھومتا نہیں یارو　　لگ رہا ہے خفا خفا پنکھا

سر پھرا ہے تری طرح شانہ　　بے سبب گھومتا ترا پنکھا

اشتہار

[illegible] دھوتی ہے کلس سے چہرہ　　دن میں دس مرتبہ مری بیوی

پھر بھی [illegible] وہ چڑیل　　[illegible] کس قدر [illegible]

[illegible] علوی (میرٹھ)

یوسف ناظم

اقلیتوں کا درد

ہم ہر روز طے کرتے ہیں کہ اب اخبار نہیں پڑھیں گے اور ہر دوسرے روز اخبار کے انتظار میں دروازے سے لگ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اخبار اگر دیر سے آئے تو اخبار لانے والے لڑکے کو ہم اسی طرح ڈانٹتے ہیں جس طرح ہمارے پڑوسی۔ بیٹا یہ عمل میاں بیوی کے درمیان صبح ہی سے شروع ہو جاتا ہے اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد میاں کو سڑک ناپتے ہم برسوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اخبار کی جسے لت پڑ جاتی ہے بس پڑ جاتی ہے ...... پڑوسی کے گھر کا اخبار مانگ کر نہ پڑھنے کو اب معیوب سمجھا جانے لگا ہے۔ پڑوسیوں سے اگر تعلقات خوش گوار رکھنا منظور ہو تو ان سے اخبار مانگنا ہی چاہیے۔ یہ ہماری اخبار پڑھنے کی عادت چھوٹتی نہیں ہے اور ہم سمجھتے ہیں ہم اسی لیے اب بڑی آسانی سے جھوٹ بول لیتے ہیں۔ اخبار اس لحاظ سے ایک نعمت بھی ہیں۔

بعض وقت اخباروں میں بڑی دل چسپ خبریں چھپ جاتی ہیں مثلاً ابھی ایک ماہ قبل دو اہم خبریں تقریباً ایک ساتھ یا ایک کے بعد ایک نمودار ہوئیں۔ ایک خبر تو یہ تھی کہ وائٹ ہاؤز میں جو شاید واشنگٹن میں واقع ہے) افطار پارٹی کا اہتمام کیا گیا۔ ظاہر ہے مغرب کی نماز بھی وہیں پڑھی گئی ہوگی۔ مشروبات میں صرف پھلوں کا عرق رکھا گیا ہوگا۔ کیونکہ وائٹ ہاؤس میں جو مشروبات بالعموم رکھی جاتی ہیں وہ تو نہیں منگوائی جا سکتی تھیں اور نہ آب زمزم کا انتظام کیا جا سکتا تھا۔ اسی خبر کے ساتھ یہ خبر بھی آئی کہ امریکہ کی جیلوں میں اس وقت الله کی مسلمات موجود ہیں۔ اگر مسلمانوں کی اتنی کثیر تعداد وہاں کی جیلوں میں اقامت پذیر ہے تو ہمارا خیال ہے وہاں بھی افطار پارٹیوں کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اقلیت کا درد ساری دنیا میں عام ہوتا جا رہا ہے اور ملک چھوٹا ہو یا بڑا وہاں کے باشندے اقلیتوں کے درد میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ لوگ تو خیر مدتیں پہلے رخصت ہو چکے ہیں جن کے دل و جگر میں سارے جہاں کا درد سمایا رہتا تھا۔ اور وہ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ جس کے درد میں وہ مبتلا ہو رہے ہیں وہ اس کا مستحق ہے بھی یا نہیں۔ لیکن اب بھی خال خال ایسے لوگ بقید حیات ہیں جنھیں درد پالنے کا شوق ہے اب وہ صرف اقلیتوں کے درد کو اپنے جگر

میں عارضی قیام کی اجازت دیتے ہیں۔ اس درد میں یوں بھی خوبی ہے کہ یہ مسلسل اور متواتر نہیں ہوتا۔ کبھی اٹھتا ہے تو صرف بیٹھ جانے کے لیے یہ نہیں کہ اب پیدا ہوا ہے تو پیدا ہی رہے۔ غالب چونکہ ہمیں ہمیشہ یاد آتے ہیں۔ اس لیے وائٹ ہاؤز کی افطار پارٹی کے موقعہ پر بھی یاد آئے۔ انھوں نے کہا تھا:

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

یہ "کوئی" اب جا کے نمودار ہوا ہے وہ بھی کہاں، واشنگٹن میں۔

اقلیت تو دنیا کے ہر گوشے میں ہے۔ کہیں کہیں یہی اقلیت اکثریت ہے۔ جہاں کہیں بھی کوئی ایک اقلیت وہاں کی دوسری اقلیتوں کے مقابلے میں سب سے بڑی اقلیت ہوتی ہے وہاں افطار پارٹیاں زیادہ تعداد میں ہوتی ہیں بلکہ بعض لوگ تو یہ تک کہنے لگے ہیں کہ افطار پارٹیاں، شوال کے ان ۶ دنوں میں بھی منعقد کی جاسکتی ہیں جن میں روزہ رکھا جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان دنوں میں روزہ دار لوگوں کی تعداد بہت کم ہے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ عام افطار پارٹیوں میں روزہ دار اقلیت ہی میں ہوتے ہیں۔ بہرحال ہم نے دیکھا ہے کہ جب بھی لوگوں کو کوئی دوسرا کام نہیں ہوتا ہے وہ اقلیتوں کے درد کو بطور عارضہ تو نہیں بطور شوق ضرور اختیار کر لیتے ہیں۔ ماہ صیام میں ان لوگوں کو تکلیف ذرا زیادہ ہوتی ہے لیکن ہماری رائے ہے کہ درد کے معاملے میں خود اپنی کم سے کم دو رائیں تو رکھنی ہی چاہئیں تاکہ وقت پڑنے پر ایک رائے واپس لی جاسکے۔ افطار پارٹیوں کا ایک مثبت پہلو بھی ہے جسے ہم اس وقت آشکارا نہیں کرنا چاہتے لیکن وہ لوگ جو منفی کو منفی سے بھی زیادہ تقسیم کے طریقہ کار کو اپنا وظیفۂ حیات بنانے کے عادی ہیں افطار پارٹی میں افطار کا خیال کم اور اس پارٹی کا خیال زیادہ رکھتے ہیں جس کے وہ ابتدائی اور آخری ممبر ہوتے ہیں (ویسے وہ آخر تک اپنی پارٹی میں رہیں گے یا نہیں اس کے بارے میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ سب کچھ اس بات پر منحصر ہے کہ انتخابات کے موقعہ پر انھیں ٹکٹ اسمبلی کا دیا جاتا ہے یا گھر کا۔ گھر کا ٹکٹ دیا گیا تو ایک طرف ہوگا لیکن اسمبلی کا ٹکٹ ریٹرن ٹکٹ بھی ہوسکتا ہے۔

اقلیت کا درد جب نقطۂ کمال پر پہنچتا ہے یا اس نقطے کو چھونے کے قریب ہوتا ہے تو مصالح انتظامی کا مجرب نسخہ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس نسخے کے مندرجات کے مطابق ہر شعبۂ حیات میں یعنی فنون لطیفہ، سائنس، تعلیمات، تعمیرات، کھیل کود، اور سماجی خدمات کے عنوانات کے تحت اعزازات کی تقسیم عمل میں آتی ہے۔ اعزاز پانے والوں کی اہلیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اقلیت سے تعلق رکھتے ہوں۔ یاد رہے کہ صرف اعزاز پیش کیا جاتا ہے۔ آنسو پونچھنے کے لیے کوئی رومال عطا نہیں کیا جاتا۔ شال ضرور اوڑھائی جاتی ہے لیکن شال سے آنسو تھوڑے ہی پونچھے جاتے ہیں۔ یہ اقلیت کے درد کو ظاہر کرنے کا مہذب طریقہ ہے۔ اس مصنوعی بارش کی وجہ سے اب اصل بارش بھی مشتبہ ہوگئی ہے ورنہ اللہ اور کسی مرغے میں یہی فرق ہے۔ کیا کبھی آپ نے کسی برائلر کو صبح سویرے الارم بجاتے دیکھا ہے؟ لوگ پوچھتے ہیں یہ اقلیت کا درد موسمی کب سے ہوگیا اور موسم بھی صرف ماہ صیام کا موسم یا پھر انتخابات کا۔ انتخابات کے موسم میں تو یہ درد بہت شدید ہوجاتا ہے اور دبائے نہیں دبتا۔

بات ہم نے وائٹ ہاؤس سے شروع کی تھی۔ اس عمارت کا نام وائٹ ہاؤز اس لیے ہے کہ

بالعموم دوسرے ملکوں کے بارے میں "وائٹ پیپر" صرف تحریری ہی آتے رہتے ہیں۔ فوجیں کہاں بھیجی جاتی ہیں۔ امداد کدھر جاتی ہے۔ اسلحہ کیسے فراہم کیے جاتے ہیں۔ اور معاہدات کے مستحق کون کون سے ملک ہیں۔ سارے مسائل اسی سفید قلعے میں طے پاتے ہیں۔ یہیں یہ بھی طے کیا جاتا ہے کہ کس ملک کو دہشت گرد قرار دیا جائے۔ ہمیں امریکہ کی سرزمین اس لیے بھی پسند ہے کہ اس سرزمین پر خود کوئی جنگ نہیں لڑی گئی۔ یہ امن پسندی کی معراج ہے اور اب تو امریکیوں نے افطار کرنا بھی سیکھ لیا ہے۔ جس افطار پارٹی کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں شرکائے افطار نے جن میں امریکی شامل ہیں۔ افطار استعمال کرتے وقت صرف ہاتھ استعمال کیے ہیں، چھری کانٹے بالکل نہیں (چمچوں کی حد تک تو مجبوری تھی) مشہور ہے کہ یہ پہلا موقع تھا جب وائٹ ہاؤز میں پکوڑے تلے گئے اور دال اُبالی گئی۔ امریکہ میں یوں تو دنیا بھر کی ساری چیزیں ملتی ہیں لیکن اس افطار کے لیے کھجوریں خاص طور سے مسقط سے منگوائی گئی تھیں اور خود امریکی ان پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ افطار کے ساتھ ظاہر ہے کھانے کا بھی بندوبست کیا گیا ہوگا۔ اس ڈنر میں شمعیں موم بتیاں نہیں جلائی گئیں کیوں کہ کینڈل ڈنر کے لیے کسی نہ کسی اسکینڈل کا ہونا لازمی ہوتا ہے اور اس دن اس کا انتظام مشکل تھا۔

یوں تو سارے مہمان (روزہ دار) باوضو تھے لیکن کہا جاتا ہے کہ وائٹ ہاؤز میں وضو کے لیے بھی کافی عمدہ انتظامات کیے گئے تھے اور منرل واٹر (Mineral Water) وافر مقدار میں تیار رکھا گیا تھا۔ اس پانی سے وضو کیے جانے سے متعلق کچھ مباحث بھی ہوئے لیکن دبی زبان سے وائٹ ہاؤز کی دیواریں چونکہ مٹی کی نہیں ہیں اس لیے تیمم کی سہولت تو وہاں تھی ہی نہیں۔ اس افطار پارٹی کو اقلیتوں کے درد کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ یہ رواداری بھی تھی اور خاطرداری بھی۔

ہم ہمیشہ اس بات کے قائل رہے ہیں کہ ساری دعوتوں میں سب سے اچھی دعوت افطاری کی ہوتی ہے۔ نہ موسیقی نہ باجا حتیٰ کہ بسم اللہ خاں کی شہنائی تک نہیں۔ فلمی گانوں کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میزبان اور مہمان صرف آنکھوں آنکھوں میں باتیں کرتے ہیں۔ گفتگو افطار سے پہلے نہ اس کے بعد۔ یہی ایک پارٹی ہے جسے کوائٹ پارٹی (Quiet party) کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ورنہ پارٹیاں تو ہم نے ایسی بھی دیکھی ہیں جس میں لوگ صرف بحث نہیں کرتے کشتیاں بھی لڑاتے ہیں۔

اقلیت کے درد کی دو اہم خوبیاں یہ ہیں کہ اس درد میں آدمی کراہتا نہیں ہے بلکہ الٹا مسکراتا ہے جسے بھی یہ درد ہوتا ہے اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہتا اور دوسری خوبی جو پہلی خوبی کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے یہ ہے کہ اس درد میں فائدہ اقلیت کا نہیں صاحبان درد کا ہوتا ہے۔

منظور الامین حیدرآباد

پت جھڑ

یہ بڑھاپا یہ خزاں کا موسم

جب ترے گھر میں در آئیگا بڑھاپا اے دوست
اپنے چہرے پہ پلستر بھی لگالے تو اگر
استری کرکے شانا بھی اگر تو چاہے
جھرّیاں اُنکی ترے دور نہ ہو پائینگی
جسم اور ہاتھ کا ڈھانچہ جو نمایاں ہوگا
دیکھ کر اس کو ترا چاک گریباں ہوگا
لہلہاتی ہے ترے رُخ پہ جو رونق جو چمک
وہ ضعیفی کے بس اک وار میں جھڑ جائے گی
دانت گر جائیں گے منہ پوپلا ہو جائے گا
گال دھنس جائیں گے اور کھال اُدھڑ جائیگی
اپنے بالوں میں لگائے تو حنا یا کہ خضاب
تیرے چہرے پہ بڑھاپے کی جو ہونگی شکنیں
اِتنا اندھیرے میں تو وہ اور نکھر آئینگی
گل بدن اور حسیں راہ میں آئینگی اگر
تجھ سے ملنے کو وہ گھبرائینگی کترائینگی
تجھ کو آتے ہوئے وہ دور سے دیکھینگی اگر
راستہ اور کوئی لینگی وہ مُڑ جائینگی
اور مجبوری میں مٹ بھیڑ اگر ہو ہی گئی!!
"ٹاٹا بابا" تجھے کہہ کر وہ چلی جائینگی
ہائے!
یہ بڑھاپا یہ خزاں کا موسم!

خالد عرفان کراچی

پیدا نہیں ہوتے

ہمارے عہد میں لائق پسر پیدا نہیں ہوتے
پدر کوشش تو کرتے ہیں مگر پیدا نہیں ہوتے

سفارش اور رشوت سے رہائی مل گئی ہوتی!
اگر اس ملک میں یہ راہبر پیدا نہیں ہوتے

کئے جاتے ہیں پیدا، دھاندلی کرکے الکشن میں
وگرنہ خود بخود یہ کونسلر پیدا نہیں ہوتے

بہت تاریک و خستہ ہے عمارت زچّہ خانے کی
مگر پھر بھی یہ بچے اپنے گھر پیدا نہیں ہوتے

تمہیں نرسوں کے ہاتھوں سے مسیحائی کی عادت ہے
تو کیا اس شہر میں اب ڈاکٹر پیدا نہیں ہوتے

اضافہ ہو رہا ہے شاعروں میں اتنی تیزی سے
کہ اس رفتار سے انجینئر پیدا نہیں ہوتے

وہ بچے جو تولّد ہو رہے ہیں آپریشن سے
وہ آجاتے ہیں دنیا میں مگر پیدا نہیں ہوتے

یہ کس نے مادہ و نر مختلف پنجروں میں رکھے ہیں
جبھی تو چڑیا گھر میں جانور پیدا نہیں ہوتے

مسائل کیوں کئے جاتے ہو پیدا مولوی صاحب
ہمارا کیا بگڑتا تم اگر پیدا نہیں ہوتے

کہیں جب مل نہ پائی افسری تو بن گئے ٹیچر
مگر اپنی خوشی سے ماسٹر پیدا نہیں ہوتے

خدا کا شکر ہے خالد! کہ ہم بیگم سے افضل ہیں
جبھی ہر سال یہ بچے اِدھر پیدا نہیں ہوتے

وجاہت علی سندیلوی

ہم کو مکان مل گیا

میرے کالج کے نئے پرنسپل آئے تو انھوں نے اپنے آنے کے دوسرے ہی دن ہم سب ٹیچروں کا ایک فوری جلسہ طلب کیا۔ پڑھائی یا لڑکوں کی ڈسپلین یا کالج کے دوسرے مسائل کے متعلق تو انھوں نے بڑے سرسری انداز میں صرف یہ کہا "اجی سب چلتا ہے" "دیکھا جائے گا یہ بھی!" "ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا" وغیرہ وغیرہ اور کالج کی ترقی اور نیک نامی کے لیے انھوں نے صرف یہ ایک نکاتی پروگرام رکھا کہ ہم سب مل کر ان کے لیے کوئی اچھا سا کرائے کا مکان ڈھونڈ نکالیں۔ مکان کے لیے انھوں نے جو شرطیں لگائی تھیں وہ یوں تو بہت سیدھی سادی تھیں لیکن مجھے تو یقین تھا کہ ایسا کوئی مکان ابھی ہمارے دیش میں بنا ہی نہ تھا۔ مکان اچھا ہو، نیا ہو، صاف ستھرا ہو، کالج کے پاس ہو، منڈی سے دور نہ ہو، نالے کے پاس نہ ہو . . . . اور اس کے آس پاس رہنے والوں کا چال چلن ٹھیک ہو، کرایہ کچھ بھی نہ ہو مطلب یہ کہ مالکِ مکان کے لڑکے کالج میں پڑھتے ہوں تو بہت ہی اچھا ورنہ کم سے کم فیس برائے نام ہو۔

پھر کیا تھا اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ۔ مہینوں کالج میں لکھائی پڑھائی بند رہی، ٹیچر گھر میں سوتے اور خوابوں میں انھوں نے پرنسپل کے لیے مکان ڈھونڈا۔ لڑکوں نے گلی گلی، گلی ڈنڈا اور کرکٹ کھیلی اور اگر کسی نے ٹوکا کہ یہ شہر تو چھانا جا چکا ہے تو انھوں نے فوراً سوال کا جواب سوال ہی سے دیا۔ "کیا آپ ہمارے پرنسپل ہوتے کو ایسا مکان کرائے پہ اٹھا سکتے ہیں؟"

پرنسپل کو مکان نہ ملنا تھا نہ ملا۔ انتظار کے اس زمانے میں وہ باری باری ہر ٹیچر کے یہاں ٹھہرتے رہے تھے۔ جب میری باری آئی تو انھیں میرا مکان کچھ ایسا پسند آیا کہ انھوں نے دوڑ دھوپ کر کے وقت سے پہلے پروموشن دلوا کر مجھے لکھنؤ بھجوا دیا۔ میں شہر پہنچ کر بے گھر ہو گیا اور پرنسپل صاحب میرے خالی کیے ہوئے مکان میں بڑے آرام سے گھر ڈالے بیٹھے ہیں۔ مالکِ مکان جو پہلے میری بیوی کو بہن جی کہتا تھا۔ اب ان کی بیوی کو بھابی جی کہہ کر اپنے کالج میں پڑھنے والے لڑکوں کا مستقبل روشن کرنے لگا۔

پروموشن سے میری تنخواہ میں جو اضافہ ہوا تھا اس سے کہیں زیادہ مکان کی تلاش میں شہر کی سڑکوں کو گھسنے کی وجہ سے میرے جوتوں کا خرچ بڑھ گیا۔ جن دوستوں، رشتے داروں اور جان پہچان والوں کے یہاں دو تین راتوں کے لیے سر چھپانے کی جگہ مل سکتی تھی۔ وہ دو تین ہی مہینے میں خود مجھ سے منہ چھپانے لگے۔ مجبور ہو کر میں پلیٹ فارم ٹکٹ لے کر اسٹیشن کے مسافر خانے میں اپنی راتیں گزارنے لگا۔ پندرہ بیس دن تو ٹھیک سے گزرے لیکن پھر ایک دن ایک چوکیدار جو مجھ سے ہر دوسرے تیسرے دن چائے کے بہانے دو تین روپیے مانگ لیا کرتا تھا مجھ سے بڑی ہمدردی کے لہجے میں کہنے لگا "بھائی اب کہیں اور ڈیرا ڈالو۔ تمہاری نگرانی کرتے کرتے میری آنکھیں پھوٹی جا رہی ہیں۔ تمہارے ہی کارن وہ دیکھو سامنے نئی تختی لگائی گئی ہے۔" میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو لکھا تھا "جیب کتروں سے ساودھان" اور اس طرح مسافر خانے سے بھی میرا ناتہ ٹوٹ گیا۔

مکان جگہ بے جگہ بلکہ ہر جگہ تھے مگر مجھے کرائے پر ملنے کے لیے کوئی مکان نہیں تھا۔ اس کے لیے میں نے اتنی دھول چھانی تھی کہ کچھ گلیوں میں جیسے ہی میں پہنچتا، لوگ میرے پوچھنے سے پہلے ہی کہنے لگتے: "اس گلی میں کوئی مکان خالی نہیں ہے۔"

کبھی رکشے والوں کے ساتھ رکشوں پر، کبھی گھوسیوں کے ساتھ ان کی بھینسوں کے بیچ، کبھی کسی کھنڈر میں چمگادڑوں کے ساتھ اور کبھی کسی پل کے نیچے کتوں کی اسمبلی کے اسپیکر بن کر میں نے بے شمار راتیں گزار دی تھیں۔ سڑکوں کے فٹ پاتھ تو میرے لیے ماں کی گود کے مانند تھے۔ جہاں پاس سے پوں پوں کرتے کھڑکھڑاتے ٹرک لوریاں سناتے معلوم پڑتے۔

بہت سی ٹھوکریں کھانے کے بعد مجھے ایک بھولے بھالے سیٹھ جی مل گئے اور انھوں نے میری بپتا سن کر مجھ سے کوئی کرایہ لیے بغیر مجھے اپنی کوٹھی سے باہر جہاں ان کی بھینس باندھی جاتی، ایک اندھی کوٹھری رہنے کے لیے دے دی۔ شرط صرف یہ تھی کہ میں ان کے تین لڑکوں کو جو تین سال سے برابر فیل ہو کر ہیٹ ٹرک کا چمتکار دکھا چکے تھے، کالج سے پلٹنے کے بعد تین گھنٹے پڑھا دیا کروں۔ ایک مدت کے بعد میں نے اطمینان کی سانس لی۔ مجھے یہ کوٹھری تاج محل معلوم ہوئی اور میں اس میں اپنی ممتاز محل یعنی بیوی کو گاؤں سے لے آیا۔ اسے کوٹھری تو نہیں البتہ پاس بندھی ہوئی بھینس بہت پسند آئی۔ کیونکہ یہ اس کے میکے کی بھینس کی طرح مرکھی تھی۔ سیٹھ جی دیالو ہونے کے ساتھ ہی بڑے دوردرشی بھی تھے۔ وہ پہلے ہی بھانپ گئے تھے کہ میں ان کے گھر میں دیا کا قرج چکا نہیں پاؤں گا۔ انھوں نے جس دن مجھے کوٹھری دی، اس کے کچھ ہی دن بعد ایک ویڈیو خرید لائے۔ پھر کیا تھا، اب میں ان کو نہیں بلکہ ان کے لڑکے مجھ کو فلم شاستر شکشا دینے لگے۔ میں ایک ہونہار طالب علم ثابت ہوا اور جلد ہی مجھے بہت سے فلمی ستاروں کے نام، ان کی پریم کہانیاں اور ان کی سلور جوبلی منانے والی ہٹ فلموں کے پلاٹ زبانی یاد ہو گئے۔

میں جانتا تھا کہ سیٹھ جی کے یہاں میری سمائی زیادہ دن نہیں ہو پائے گی۔ لہٰذا میں مکان کی کھوج لگانے سے جو ایک طرح کی میری عادت بن چکی تھی غافل نہیں رہا۔ دن کو تو چھٹی ملتی نہیں۔ لہٰذا چمگادڑوں کی طرح میں رات کو مکان ڈھونڈنے نکلتا۔

ایک دفعہ ساڑھے آٹھ بجے رات کو گھنٹی بجائی تو کواڑ کی آڑ سے اندھیرے میں جھانکتے ہوئے ایک شریمتی جی

نے ذات پیس کر ڈانٹ پلائی "کیا پاگل ہوگئے ہو؟ جانتے نہیں یہ سیٹھ میرے پتی کے کلب سے لوٹنے کا ہے!"
میں کچھ نہیں سمجھا۔ لیکن میں نے فوراً گیارہ ہونے میں دیر نہیں لگائی۔

ایک شاعر صاحب، آداب عرض، آداب عرض کہتے ہوئے مجھے اپنی ایک بڑی سی حویلی میں لے گئے۔ دو گھنٹے ان کی غزلیں سننے کے بعد واہ واہ کرتے کرتے جب میرا گلا سوکھ چکا اور آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے تو میں نے ہاتھ جوڑ کر درخواست کی "حضور! مجھے ایک مکان چاہیے" ہاتھ کے اشارے سے انھوں نے مجھے چپ رہنے کو کہا اور اپنی تازہ غزل شروع کردی:

"جل چکا اپنا مکاں، اب پوچھتے ہو کیا پتا؟"

میں ہڑبڑا کر اٹھا اور سر پہ پیر رکھ کر بھاگا۔ ان کے چلّانے کی آوازیں مجھے دور تک سنائی دیتی رہیں۔

ایک جگہ جب میں قسم کھا کر حلفیہ یہ بتا چکا کہ میں شراب نہیں پیتا، افیم نہیں کھاتا، جوا نہیں کھیلتا، اپنی بیوی کو نہیں مارتا تو مجھ سے اچانک پوچھا گیا کہ تمھارے پاس رنگین ٹی وی ہے؟ میں نے یہ سوچ کر کہ مالک مکان کو یہی جواب پسند آئے گا، کہا "ابھی میرے پاس تو ٹرانسسٹر تک نہیں"۔ مالک مکان ایسے خفا ہوگئے جیسے میں نے انھیں کوئی گالی دے دی ہو۔ "جایئے جایئے کہیں اور مکان ڈھونڈیئے۔ آپ کے پاس ٹی وی ہوتا تو ہمارے بیوی بچوں کا کچھ دل ہی بہلتا!" میں اپنا سا منہ لیے واپس چلا آیا۔

میں مکان کے متعلق جب بالکل ہی نراش ہو چکا تھا تو ایک دن مجھے ایک راجہ ہریش چندر مل گئے۔ مئی کی ایک تپتی دوپہر کو میں بازار سے ترکاری لیے آرہا تھا۔ ایک بوڑھا آدمی بھی ترکاری کا ایک پھولا پھولا جھولا لیے کافی دیر سے میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اچانک اس نے مجھ سے پوچھا "کیوں جی! کیا آپ کو بینگن پسند ہیں" میں ایسا جھٹکا جیسے بجلی کا کھمبا بولنے لگا ہو۔ میں نے بوکھلا کر کہا "جی نہیں، بالکل نہیں، کبھی نہیں"۔ بوڑھا لمبی سانس لے کر بڑے دکھی لہجے میں بولا "اور میری بہو مجھے دن رات بینگن ہی کھلاتی ہے۔ آخ تھوا" میں نے کہا "یہ تو بڑا ظلم ہے آپ پر"۔

بوڑھا مجھ سے اور قریب ہو کر چلنے لگا۔ مجھے اس پر بڑا رحم آیا اور میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے جھوٹ بولا "بدقسمتی سے میں جس سیٹھ کے مکان میں رہتا ہوں وہ بھی مجھے دونوں وقت صرف بینگن ہی کھلاتا ہے۔ آخ تھوا" کوئی مکان ہی نہیں ملتا جو بینگن سے میری جان چھوٹے۔ مرجاؤں گا میں بینگن کھاتے کھاتے"۔ بڈھے نے اپنا جھولا سڑک پر رکھ کر میرے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ "بیٹا! تو اپنا دل نہ چھوٹا کر۔ یہ دیکھ سامنے نکڑ پہ میرا مکان ہے۔ اس کا آدھا حصہ خالی ہے تو آج ہی کل سے رہنے ہی آجا۔ بینگن آخ تھو!"

"بینگن آخ تھو" میں نے جواب دیا اور اس طرح میں بھی گھر والا ہو گیا ہوں۔ اس بات پر اتنی دفعہ قسمیں اٹھا چکا ہوں کہ اب کوئی ترکاری والا بینگن لے کر میری سڑک پر سے نہیں گزرتا۔

سید عسکری حسن
(حیدرآباد)

وغیرہ وغیرہ

جو تھے ماہِ تاباں وغیرہ وغیرہ — ہیں اب چھپتے، خاباں وغیرہ وغیرہ
وہ کہہ کے گئے ہیں نہیں یار مجھ سے — ہیں سب جھوٹے باتاں وغیرہ وغیرہ
بنو ملا مرشد تو تم کو ملیں گے — دوشالے نیازاں وغیرہ وغیرہ
کرو عقد مسجد میں یہ یاد رکھو — ملے مرغ بریاں وغیرہ وغیرہ
جو نیکی کروگے تو وعدہ ہے ربا — تو پاؤگے حوراں وغیرہ وغیرہ
بجو عورت بنا تم نے یہ پانی کھائی — ہوتیں تھے، جُلایاں وغیرہ وغیرہ
کھاتے ہیں اب ہم سے دگنی کمائی — تہہ کے قصایاں وغیرہ وغیرہ

اُنھیں اب کہاں پاؤگے اے حسنؔ تم
جو تھے دل کے درماں وغیرہ وغیرہ

جہنم کی بہار

باذغ بہاری (کلکتہ)

رنج و غم اور آفت و افلاس کا مارا ہوا — ایک شاعر آخرش اللہ کو پیارا ہوا
دیکھ کر کھاتے میں دنیاوی عمل اور فعل کو — اک فرشتے نے کہا شاعر سے دوزخ میں چلو
جب ہوا داخل جہنم میں تو شاعر نے کہا — مرحبا کیا مستقر ہے یہ سکون و امن کا
یہ لپٹتی بھینی بھینی خوشبوئیں بادِ صبا — یہ تلطف یہ تلذذ یہ تعیش یہ مزا
یہ فضائیں یہ گھٹائیں اور یہ فصلِ بہار — خوب ہے تیری مشیت واہ رے پروردگار
سن رہا تھا غور سے داروغۂ دوزخ یہ بات — دفعتاً بولا وہ شاعر سے بصد التفات
زنگ آلودہ ہیں تیری عقل و دانش کے نقوش — یہ جنت ہے جہنم [illegible] وقت
آتشِ دوزخ کو بھی کہتا ہے تو فصلِ بہار — اور جہنم ہی نظر آتا ہے مجھ کو مرغزار

یہ بتا آیا ہے تو دنیا کے کس استھان سے
[illegible] نے کہا، [illegible] ہندوستان سے

پرویز یداللہ مہدی

صلائے عام ہے
مظلوم شوہروں کے لیے!!

سچ پوچھیے تو بیرونِ خانہ مشغلوں نے ہمیں کبھی اتنی فرصت ہی نہیں دی کہ جھوٹے منہ ہی اندرونِ خانہ ذمہ داریوں کی طرف توجہ کرکے باربرداری و نازبرداری کے باب میں ضروری معلومات حاصل کرکے اپنی معلوماتِ عامہ میں کچھ اضافہ کرلیتے۔ بس اپنی اس مجرمانہ غفلت کا شدید احساس اس وقت ہوا جب والدین کی من مانی اور اپنی ذراسی نادانی کے کارن دو بول پڑھوا کر اپنی تمام تر نااہلی کے باوجود ایک عدد اہلیہ کے اہل یعنی شوہر بنے۔ سچ کہتے ہیں ازدواجی محاذ پر ہماری حیثیت اس رنگروٹ کی سی ہے جسے محض قربانی کے بکرے کی طرح بغیر کسی ہتھیار کے مورچے پر بھیج دیا گیا ہو۔ یہ کہہ کر کہ

چڑھ جا بیٹے سولی پر رام تری بھلی کریں گے

بیگم صاحبہ یوں تو ہم سے ہمیشہ نالاں رہتی ہیں بلکہ "ہر آن ایک تازہ شکایت ہے آپ سے" والے موڈ میں رہتی ہیں اور شکایتوں کا یہ رجسٹر طلسم ہوشربا کے بے شمار دفتروں سے زیادہ ضخیم ہے جس کی تفصیل سن کر آپ کے صبر کا پارہ اور ہمارے ضبط کا یارا دونوں کے ٹوٹ جانے کا خطرہ ہے۔ اس لیے بطورِ نمونہ۔۔ صرف ایک ہی شکایت کی حکایت بیان کرتے ہیں۔

شادی سے پہلے ہمیں راتوں میں اٹھ اٹھ کر لکھنے کی عادت تھی جس طرح کچھ لوگوں کو نیند میں چلنے کی بیماری ہوتی ہے۔ شادی کے ابتدائی زمانے میں چونکہ ہر نوبیاہتا جوڑے کا ازدواجی ٹائم ٹیبل امنگوں کی راتوں اور مرادوں کے دنوں سے مزین ہوتا ہے لہٰذا دورِ ہنی مون کے دوران ہم اس بیماری سے پوری طرح محفوظ رہے لیکن جیسے ہی ٹائم ٹیبل بدلا یعنی رات کے آنچل سے امنگوں اور دن کے دامن سے مرادوں نے اپنا رختِ سفر باندھا ہمارے پرانے مرض نے [illegible] کی طرح پلٹ کر یلغار کردی تاہم چند راتوں تک تو ہم محض اس خیال سے لکھنے کی خواہش کو تھپکیاں دے دے کر سلاتے رہے کہ کہیں بیگم صاحبہ کی میٹھی نیند میں خلل نہ پڑے لیکن جب مرض کی شدت برداشت سے باہر ہوگئی تو ایک رات ہم نے اندھیرے ہی میں ٹٹول کر کاغذ قلم سنبھال لیا، مگر لکھنے کے لیے صرف مشتاقی کی نہیں روشنی کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ بڑی احتیاط سے لائٹ کا سوئچ آن کیا، ادھر کمرے میں چک سے روشنی ہوئی ادھر پٹ سے بیگم صاحبہ کی آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو حیرت سے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہیں، پھر جھنجھلا کر بولیں: اتنی رات گئے

یہ الوؤں کی طرح سفید قلم ہاتھ میں لیے کیا کر رہے ہیں آپ؟
ہم نے فوراً تصحیح کی" سفید قلم الوؤں کے ہاتھ میں نہیں بیگم، شاعروں اور ادیبوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے!
منہ بنا کر بولیں" ہوتا ہوگا! ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ، شاعر، ادیب اور الو تینوں رات میں جاگتے
اور دن میں سوتے ہیں، چلیے لائٹ آف کر کے سو جائیے!"
ہم نے گڑبڑا کر کہا" اس وقت الفاظ کی فوج ظفر موج بغیر پیراشوٹ کے ذہن کی بلندی سے صفحۂ قرطاس
پر لینڈ کرنے کے لیے پر تول رہی ہے بیگم!"
محترمہ نے طنزیہ لہجے میں چوٹ کی" کیا الفاظ کی یہ فوج دن کے اُجالے میں اترنے سے شرماتی ہے؟"
جھنجھلا کر جواب دیا" تم کیا جانو، رات کے سناٹے میں کیسے کیسے مضامین غیب سے خیال کی وادی میں اترتے ہیں"
بیگم نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے جملہ کسا" آدھی رات کو غیب سے مضامین نہیں، بھوت پریت اور بلائیں
اُترتی ہیں، سمان کھول کر سن لیجیے، اب آپ کی یہ شب بیداریاں، یہ بدپرہیزیاں بالکل نہیں چلیں گی۔ یوں بھی
رات آرام کے لیے ہوتی ہے اور دن کام کے لیے"
ہم نے چڑ کر پوچھا" پھر لکھنے کے لیے کون سا وقت ہوتا ہے؟"
"صبح اور شام کا وقت!" محترمہ نے برجستہ جواب دیا۔
ہم نے گھگھیا کر کہا" صبح اور شام کا وقت تو اہلیان بمبئی کی روزمرہ زندگی کا سب سے خطرناک وقت ہوتا ہے
کیوں کہ اس وقت شہر کے نوے فیصد شوہر حضرات چمگادڑوں کی طرح لوکل ٹرین کے فٹ بورڈ سے چپکے، لوہے
کے ڈنڈے یا ڈنڈے سے چپٹے کسی بندے سے لٹکے ہوئے اخوت بھائی چارے اور قومی ایکتا کا ثبوت دے
رہے ہوتے ہیں، ایسی خطرناک صورت حال میں زندگی اور موت کے بیچ لٹکا ہوا آدمی اگر ٹرین کا ڈنڈا چھوڑ کر قلم پکڑنے
کی حماقت کرے تو موت کا خونی پنجہ اسے پکڑ کر دبوچ لیتا ہے۔!!"
محترمہ نے فلسفیانہ لہجے میں کہا" آدمی ایسا شوق پالے ہی کیوں جو قدم قدم پر اس کی جان کا بیری بن جائے،
اگر کوئی اور ٹائم شوق پالنا ہی ہے تو پھر رائٹنگ کے بجائے ٹائپنگ، کیجیے، بنگ کیجیے، کوکنگ کیجیے، وقت بھی کٹے
گا اور چار پیسے کی آمدنی بھی ہوگی"
اس کے بعد محترمہ نے رائٹنگ کے نقصانات اور ٹائپنگ، نٹنگ اور کوکنگ کے روحانی، مادی اور معاشی
فوائد پر مع مثالوں اور حوالوں کے اس قدر تفصیل سے روشنی ڈالی کہ ہمارے ذہن کی بارہ دری میں مکمل بلیک آؤٹ
(BLACK-OUT) ہوگیا۔
جہاں تک ہمارا ناقص خیال ہے اگلے وقتوں میں شادیاں اکثر کامیاب اس لیے ہوا کرتی تھیں کہ آج کی طرح گرل
فرینڈ اور بوائے فرینڈز کا باہمی اختلاط اور میل ملاپ اس زمانہ میں بالکل نہیں تھا یا بہت کم تھا۔ گویا ماضی کے معاشرہ
پر یہ شعر صادق آتا تھا۔

کند ہم جنس باہم جنس پرواز ۔ کبوتر با کبوتر، باز با باز

جب کہ آج کی سوسائٹی کے رنگ وڈھنگ کچھ ایسے ہیں۔

کند جنس مخالف یا مخالف جنس پرواز ۔ کبوتر با فاختہ مینا و بلبل با باز

اس کے علاوہ قطع نظر اس معاشرتی الٹ پھیر کے اگلے وقتوں کے مردوں کی اکثریت عموماً اس مقولے پر کاربند ہوا کرتی تھی کہ کھلاؤ سونے کا نوالہ دیکھو شیر کی نگاہ سے۔ چنانچہ گھر کے نوکروں چاکروں کے ساتھ وہ بیوی بچوں تک کو شیر کی نظر سے دیکھنے کی جرأت کر جاتے تھے جب کہ دور حاضر کے شوہروں کی اکثریت کے حصے میں نگاہ نہیں محض نگہہ آئی ہے جس کے تعلق سے مرزا غالب نے فرمایا ہے کہ

وہ اک نگہہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے۔

چنانچہ آج کے مرد بے چارے بیوی بچوں کو شیر کی نگاہ سے دیکھنے کی جسارت خواب میں بھی نہیں کر سکتے کہ بیوی کو شیر کی نگاہ سے دیکھنے کے لیے اسے سونے کا نوالہ کھلانا ضروری ہے اور ان دنوں سونا تو در کنار لوہا بھی عام آدمی کی قوت خرید سے باہر ہے۔ تاہم اکا دکا شوہر فی زمانہ ایسے ضرور مل جائیں گے جو کبھی کبھار بیوی کو شیر کی نگاہ سے دیکھنے کی حماقت کر لیتے ہیں لیکن اس ہمت مردانہ کے پیچھے مردانگی کا اتنا دخل نہیں ہوتا جتنا کہ "بینک بیلنس (BANK BALANCE)" کا یا پھر جرأت رندانہ کا۔ ویسے جرأت رندانہ یا بینک بیلنس کے حوالے سے ہمارا مقصد بخدا شوہروں کی طرفداری اور بیویوں کی دلآزاری ہرگز نہیں ہے۔ ہماری نظر میں تو میاں بیوی دونوں ازدواجی گاڑی کے دو پہیے ہیں، اگر کسی پہیے کی ہوا نکل جائے یا وہ پنکچر ہو جائے تو پھر گرہستی کی گاڑی لنگڑانے لگتی ہے جب کہ آج خدا جھوٹ نہ بلوائے زندگی کے اونچے نیچے اوبڑ کھابڑ راستوں پر گرہستی کی بے شمار گاڑیاں لنگڑاتی نظر آتی ہیں، کہیں دونوں پہیے آپس میں ٹکراتے نظر آتے ہیں تو کہیں مخالف سمتوں کی طرف سفر کرنے کے لیے پر تولتے۔ میاں بیوی کے بیچ بیچ پھولتی پھلتی ہوئی اس نا اتفاقی ناچاقی اور دوری کے بڑی حد تک ذمہ دار ہیں وہ گھر پھونک تماشہ دیکھ دوستوں اور سہیلیوں کے روپ میں ہمارے گھروں میں ڈیرا ڈالے ہوئے ہیں یہ دوسروں کے ہنستے کھیلتے گھر کو برباد کرتے ہیں لیکن خود بھی آباد نہیں ہوتے۔

مغربی ممالک میں تو سنا ہے شوہر نامدار بیوی کے دوستوں کا اس قدر احترام کرتے ہیں کہ کام پر سے تھکے ہارے لوٹنے پر اگر گھر کی بیٹھک میں کوئی اجنبی ہیٹ (HAT) اوور کوٹ یا چھتری وغیرہ نظر آجائے تو الٹے پاؤں واپس لوٹ جاتے ہیں جبکہ مغربی عورتوں کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ شوہر کے اس قسم کے خفیہ معاملات کو اتنی فراخدلی سے نظر انداز نہیں کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک مغربی لطیفہ پیش ہے کسی باس کو لفٹ سے باہر نکلتے دیکھ کر اس کی منہ چڑھی پرائیویٹ سکریٹری نے حسب معمول اسے ہیلو ڈارلنگ کہہ کر مخاطب کیا، اس سے پہلے کہ جواب میں باس کچھ کہتا اس کے پیچھے سے ایک موٹی تازی خاتون نمودار ہوئی اور سکریٹری سے طنزیہ لہجے میں بولی "تم نے اپنے ڈارلنگ کو تو ہیلو کہہ لیا اب مجھ سے ملو مسز ڈارلنگ ہوں۔!!"

مذکورہ لطیفہ مغربی ضرور ہے لیکن عملی شکل میں مغرب کی یہ تہذیب اب ہمارے ہاں دکھائی دیتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آج دنیا اس قدر سمٹ گئی ہے کہ مختلف تہذیبوں کو اپنے تمام تر مثبت اور منفی اثرات سمیت ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا اور ہم افراد ایسی دوغلی اور آلودہ تہذیب کو نہ صرف لبیک کہتے ہیں بلکہ اس کی سرپرستی بھی فرماتے ہیں وہ سماج اور معاشرے کو اس مقام عبرت پر پہنچا دیتے ہیں جہاں دوستوں کے حلقے میں گھر کی بیوی اور گرل فرینڈ دوست سہیلیوں کے پیچھے دیوانے ہوئے شوہر کے خلاف گھر کی ست [illegible] قیمت بھی باقی نہیں رہتی [illegible] سکیں [illegible]
[illegible] سوا ہو نہیں سکت

رؤف رحیم (حیدرآباد)

غزل

جو گرم عشق ہے اس کو نشا دو برف کی سل پر
پہنچ جائے گا وہ آرام سے خود اپنی منزل پر

رہا کرتے تھے اگلے دور میں وہ جو بنی ہل پر
ہے ان کی جھونپڑی اب تو کسی نالے کے ساحل پر

وہ حافظ تھے سمرقند و بخارا وار دیتے تھے
میں مفلس ہوں چونی وارتا ہوں آپ کے تل پر

مریض اچھا ہوا تھا دل کی بیماری سے لیکن پھر
ہوا حملہ دواخانے کی بل کو دیکھ کر دل پر

اگر ہوا نا سمی بھرہ تو بلا لیتے ہیں ساحل کو
خدا سے بڑھ کے کرتے ہیں بھروسہ ایک عامل پر

خدا کے واسطے اپنی غزل کو مختصر کردو
رحیم احسان ہوگا آپ کا یہ ساری محفل پر۔

صاف صاف

منہ پھٹ ناگپوری

قوم کو لڑوا دیئے شہر والوں میں دنگا کیجیے
اور پھر ہمدرد ملت بن کے چندہ کیجیے

دل میں ہوتی ہے اگر انسانیت تو غم نہیں
مندروں کو مسجدوں کو اور اونچا کیجیے

بر فلاحِ قوم، تعلیمی ادارے کھول کر
اس طرف سے اس طرف سے دھن اکٹھا کیجیے

اب عمل کرنا نہ کرنا اختیارِ قوم ہے
اپنی جانب سے تو جاری روز فتویٰ کیجیے

مدفنِ علم و ہنر ہیں ناگپور کا کمپٹی
آپ اب جمہری تلیا میں بسیرا کیجیے

اب تو منہ پھٹ داد بھی ملنے لگی منہ دیکھ کر
شاعری کو چھوڑ کر کچھ اور دھندا کیجیے

فاعلاتن فاعلات

رٹتے رہتے ہیں ہمیشہ فاعلاتن فاعلات
شاعراتن۔ شاعراتن۔ شاعراتن شاعرات

مارے تیری خواہشاتن۔ خواہشاتن۔ خواہشات
مانگے مجھ سے کائناتن۔ کائناتن کائنات

پالتی ہیں آج مردوں کو کما کر شہر میں
مستوراتن۔ مستوراتن۔ مستوراتن مستورات

داد دی لیں دشمنوں نے سن کے لاثانی کلام
نعریاتن۔ نعریاتن۔ نعریاتن نعریات

ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہیں میرے پیچھے رات دن
بیگماتن۔ بیگماتن۔ بیگماتن بیگمات

روز کھا سو کھا سے بیٹا اور نیتا کھائیں صرف
مرغیاتن۔ مچھلیاتن۔ بکریاتن۔ مغزیات

ہیک بلیکس کچھ نہیں تو دوستو بے کار ہے
ڈگریاتن۔ ڈگریاتن۔ ڈگریاتن۔ ڈگریات

خاموش نیند کی واحد مٹ نہیں سکتی کبھی
کھجلیاتن۔ کھجلیاتن۔ کھجلیاتن۔ کھجلیات

واحد انصاری ([illegible])

سید طالب حسین زیدی
(حیدرآباد)

نورِ بی کا جمائیں

کوئی چالیس برس ادھر کا واقعہ ہے۔ رمضان کا مہینہ تھا مکہ مسجد میں عشا کے بعد مصری قاری عبدالباسط، عبدالصمد کی قرات کلام پاک کی محفل تھی۔ ہم اور ہمارے ایک دوست بھی قرات سننے کی سعادت حاصل کرنے کے لیے مسجد میں موجود تھے۔ ٹھیک نو بجے قاری صاحب منبر پر تشریف لے آئے۔ جلو میں حیدرآباد کے ایک مشہور صاحب سجادہ بزرگ بھی "چپکے" ہوئے تھے اور "میں کون؟ تو خواہ مخواہ" کے مصداق قاری صاحب کے بازو ہی منبر پر جلوہ گر ہو گئے، قاری صاحب کے بیٹھتے ہی لوگوں نے گل پوشی شروع کر دی اور قاری صاحب! جیسے ہی ان کے گلے میں ہار ڈالا جاتا اس کو نکال کر بازو بیٹھے ہوئے پیر و مرشد کے گلے میں معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ڈال دیتے اور وہ بلا کسی تکلف اور ہچکچاہٹ کے پھول پہن کر لوگوں کی طرف "مُرس، مُرس" کر دیکھتے جاتے موصوف کی یہ حرکت لوگوں کو کھٹک رہی تھی اور ہمارے دوست کو کچھ زیادہ ہی کھٹکی۔ جل بھن کر کہنے لگے۔

"کیا ... دیکھو نورِ بی کا جمائیں"!

... کر فارغ ہو گئے۔ مگر ہم کو اس سوچ اور فکر میں مبتلا کر گئے کہ آخر یہ "نور بی کا جمائیں" ہوتی کیا چیز؟ کئی دنوں کے غور و فکر اور بعد از ریسرچ بسیار" (Research) تحقیق یہ ہوا کہ مئی کے مہینے میں تیز دھوپ، جھلسا دینے والی گرمی اور کھڑی دوپہر کے وقت ڈھیلے ڈھالے سیاہ یا گہرے اودے اکدم اودے سوٹ میں قید بازوؤں پہ امام ضامن، تعویذ گنڈے، ہری لال اودی پیلی پیلی آٹیاں پاٹیاں اور نیلا تو ڈھ باندھے ہوئے ہتھیلیوں پر گہرا سیاہ نائل مہندی لگائے پیروں میں سرخ رنگ کی جرابیں پر سیاہ شوز پہنے سات آٹھ دوستوں کی جھرمٹ میں لنگڑاتے ہوئے بازو کے کسی ہوٹل میں گھسنے والا نوجوان ہی نورے کا جمائیں ہوا کرتا ہے۔ یہ لنگڑاتا کیوں ہے؟ اس لیے کہ عمر میں پہلی مرتبہ جوتا پہننے کی عزت جو نصیب ہوئی ہے اور جوتا ان کے کھردے پاؤں کی سختی کو برداشت نہ کرتے ہوئے کاٹنے لگتا ہے۔

گرمی سے پسینے میں شرابور اور گلے میں گہرے سرخ رنگ والی ٹائی کی ناٹ کے پھندے سے [illegible] جیب میں سرخ ریشمی دستی سے بار بار چہرے اور گردن کا پسینہ پونچھتے ہوئے "آٹھ ہوٹلے قولا دو" کا آرڈر دیتے ہیں۔

---

۱ حیدرآباد کی عام ہوٹلوں میں تھوڑے سے زیادہ دودھ والی چائے کو "پونا" کہتے ہیں۔

ایسی گرمی میں تو چائے کے نام ہی سے "انسانوں" کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ ہر نوری کے جمائیں کی تصویر کم و بیش ایسی ہی ہوا کرتی ہے۔ جیسے نکاح کے بعد دوستوں کی محفل میں ہنسی مذاق کرتے گپیں ہانکتے ہوئے جب گھڑی نے ایک بجایا تو کسی دوست نے تحریک کی "چلو خاں! چائے پی کو آئیں گے"۔

دوسروں نے بھی اس کی تائید کی "ہاؤ باپ! بہت دیر سے چائے نئیں ملی"۔ دلہا میاں گویا خود اس کے انتظار میں تھے۔ سنتے ہی کھڑے ہو گئے۔ چائے نوشی کے بعد ڈبل کے میٹھے اور زردے کا وہ پان بھی اٹھایا گیا جس میں بطور جزو اعظم "گلقند" بھی ڈالا جاتا ہے۔ دلہا میاں کا پان کو چبانا ایک قابل دید چیز ہوتا ہے۔ اس طرح منہ چلاتے ہیں جیسے بکرا پیپل کا پتہ چبا رہا ہو۔ یا "حمید رشید"[1] کا قوال، قوالی سناتے ہوئے "چبر چبر" پان چباتا ہے۔ پان کی پیک سے سرمئی ہونٹوں پر اور اطراف سرخ دھری بھی جم جاتی ہے۔

شادی کے بعد نوری کی جمائیں ہر تیسرے چوتھے روز سسرال پر نازل ہوتے رہتے ہیں جس کا سلسلہ مہینوں، برسوں بلکہ اکثر حالتوں میں نوری کے مرنے تک جاری رہتا ہے۔ "کام کے نا کاج کے دشمن اناج کے" ازل کے نکھٹو، پہلے ماں باپ کی توڑتے رہے اب سسرال کی روٹی کو مالِ غنیمت سمجھ کر ہاتھ صاف کر رہے ہیں۔ حیا اور غیرت کی تقسیم کے وقت موصوف نے نہایت کسر نفسی اور تکلف سے کام لیا تھا۔ اور ان کے حصے کی ساری حیا اور غیرت منڈیوں کو عجلت پسند اور "ذرا کام چور فرشتے نے پاس ہی کھڑی ہوئی نوری کی جھولی میں ڈال کر چین کی بنسی بجائی تھی۔ دوستوں، رشتے داروں کی چشمکوں اور طعنوں سے بھی کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ کیوں؟ چکنے گھڑے پر پانی جو نہیں ٹھیرتا۔

جیسے ہی یہ اپنی سسرال کے گھر میں داخل ہوتے ہیں نوری ان کو دیکھتے ہی پان کا بٹوہ ادھر، سروتہ ادھر پھینک، سر پر پلو ڈال جھٹ "حاختے فاختے" کھڑی ہو جاتی ہے اوسان خطا ہو جاتے ہیں کہ شراب سیخ پہ ڈال کباب شیشے میں کی مجسم تصویر بنی ایسا لگتا ہے گویا اس کے گھر کوئی سات اقلیم کا بادشاہ بدولت افروز ہو گیا ہے۔ پیٹ کا پانی ہلا دینے والے لہجے میں کہتی ہے "ادی دولے نواب چل اندر۔ دینے کے وخت (وقت) کیسی دھوپ میں آئے نا میرے باوا"؟ رنگ کو دیکھو دھوپوں میں رکتا جل کو گیا ہے" حالانکہ واقعہ یہ ہے "دولے نواب" کے رنگ سے صرف کوا ہی شرما کر پھر سے اڑ جایا کرتا ہے۔

نوری حیران پریشان بولاتی ہوئی بیٹی کو آواز دیتی ہے "آگے چھوٹی ماں! کب لگ (کب تلک) پانواں پسار کر سوتی پڑی رہیں گی ماں! یہ عیدی دو پہری ختم ہونے کو آگئی مگر تیرا سونا ختم اچ (ختم ہی) نئیں ہوتا۔ اٹھنے کا نام اچ نئیں لیتی۔ چل اٹھ گے "گھوڑلہ" (بروزنی چھوڑو۔ بچھوڑو) دیکھ دولے نواب آئیں (آئے ہیں) ہاتھ منہ دھونے کو پانی رکھ میں دستر بچھا تیوں (بچھاتی ہوں)

دولے نواب سسرال میں اپنی اس آؤ بھگت سے ویسے ہی بلخ کے شہزادے بنے اینٹھتے پھر رہے تھے۔ اس پر ستم ظریفی کی اس "صدقے جاؤں، واری جاؤں" نے صاحبقرانی کی رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ ان کے آتے ہی نوری نے چادر بچھا کر مسند لگا دی تھی۔ دولے نواب لقا کبوتر کی طرح گردن اکڑائے ہوئے پاؤں لمبے کر کے

---

[1] حیدرآباد کا مشہور مزاحیہ فن کار [illegible] قوالی اور تقوال کا [illegible] ماہر [illegible]

تکیے کے سہارے نیم دراز ہو جاتے ہیں۔ "گھوڑو" بھی اپنا سونا ختم کر کے ہر سیٹ لگا کر اٹھ جاتی ہے اور جلدی جلدی ماں کا ہاتھ بٹانے لگتی ہے اور دستر خوان بچھاتی ہے جب تک وہ لے خواب کھانے میں مصروف رہتے ہیں۔ نوری پنکھا جھلتی رہتی ہے.........

نوری کے جمائیں کی ایک تیسری صنف سے ہمارا تعارف " اورینٹ ہوٹل" مرحوم عابد روڈ میں ہوا تھا۔ ایک دن صبح ۸۔ ۹ بجے بریگیڈیر توفیق علی مرحوم اور ہم ورانڈے میں بیٹھے ہوئے چائے کی چسکیوں کے درمیان ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف تھے، بریگیڈیر صاحب کے لطیفوں، چٹکلوں اور زندہ دلی کا سارے شہر میں شہرہ تھا۔ گفتگو ایسی طرح دار کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی ـــــ ایک لطیفہ سناتے سناتے درمیان میں یکایک "فل اسٹاپ" لگا کر گیٹ کی طرف غور سے دیکھنے لگے۔ جہاں ایک نوجوان پیلے رنگ کا کرتہ پہنا ہوا باندوؤں پر ہاٹیاں، امام ضامن، ہری، لال اور پیلی ڈوریاں باندھے ہوئے ہلکی ہلکی بارش میں بھیگتا ہوا سیکل پر سوار ٹھٹکتے، جھجکتے ہوئے گیٹ میں داخل ہوا اور سیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کر کے ورانڈے میں آیا۔ بیرے سے پوچھا "چائے ملتی کیا۔؟" بیرے نے اثبات میں جواب دیا۔ "کتے" (کتنے میں) ؟ چار آنے میں ـــــ اچھا ! ایک کپ (کپ) لاؤ ـــــ آنڈر دے کر ہمارے بازو والی میز کی طرف اشارہ کر کے بیرے سے پوچھا "یاں بیٹھوں کیا۔؟" ـــــ بیرے نے اجازت دے دی اور چائے لانے کے لیے اندر چلا گیا ـــــ بریگیڈیر اس غریب کو مسلسل اپنی نظروں کے مائیکرو اسکوپ کے نیچے رکھے ہوئے اس کی ہر ہر حرکت کا بغور جائزہ لے رہے تھے اور ہم کو خطرے کا شدید احساس ہو رہا تھا کہ آپ کی رگِ شرارت زور سے پھڑک رہی ہے اور کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے ـــــ اور ہوا ـــــ توفیق صاحب نے انگلی کے اشارے سے "ادھر آ" کہہ کر اس کو اپنے پاس بلایا۔ بے چارہ ابھی کرسی پر برابر بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ گھبرا کر ڈرا سہما ہوا قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

بریگیڈیر صاحب نے پوچھا اور کیا پوچھا۔ "کب ہوئی تیری شادی !" "جی صاب کل اچ ہوئی" (جی صاحب کل ہی ہوئی) ـــــ ہونہہ ! "کل اچ ہوئی" ـــــ اور آج ہی صبح صبح یاں چائے پینے آ گیا ـــــ ؟ "جورو" پہلے ہی دن رعب جانا چاہیے ـــــ "جی صاب" ـــــ "اب کیا کہہ رہا ہے جورو ؟" ـــــ "جی سودی (سمجھی) تھی صاحب" ـــــ "تو پھر سیدھے اپنے گھر جا اور جورو کی چوٹی پکڑ کر اٹھا کے بول، چل اٹھ .... یار کو چائے بنا کے پلا" "چل اٹھ" کے بعد ـــــ خالی جگہ میں حیدرآباد کا لاجواب کام ہے۔

بے چارہ بریگیڈیر کی شخصیت وجاہت اور تحکمانہ لب و لہجے سے ایک دم مرعوب و مبہوت ہو گیا اور جیسے آیا تھا۔ اسی طرح الٹے پاؤں سیکل پر بیٹھ کر تیر کی طرح گیٹ کے پار ہو گیا۔ اتنے میں بیرا چائے لا کر گاہک کو ڈھونڈنے لگا کہ چائے منگوا کر کہاں غائب ہو گیا ؟ بریگیڈیر نے اس سے کہا وہ چائے یہاں رکھ دے ایک اور لے آ وسکی ویدر ہے (whisky weather) دوسرا پیالہ بھی چلے گا ـــــ ہمارا قہقہہ چھوٹ گیا ہم بولے، جناب ! خواہ نخواہ بیٹھے بٹھائے غریب کی جان کو آ گئے۔ بے چارہ اپنی شادی کی خوشی میں کچھ دیر یہاں بیٹھ کر تھوڑا بہت عیش ہونا چاہ رہا تھا، آپ کا کیا بگڑ جاتا۔؟

فرمانے لگے، "دیکھو ذرا" نوری کے جمائیں کو "کل ہی تو گھر میں" جورو "آئی ہے اور دوسرے ہی دن ہوٹل میں

چلئے چلتے چلا آیا۔ یعنی ایسا بھی وہی "چھاپو کا چھاپو"۔ یہی تو ہیں قیامت کے آثار!....

یوں تو قسمیں نوزبی کے جمائیوں کی دو ہی قسمیں ان کے علاوہ اقسام کے "نوزبی کے جمائی" اور بھی ہوا کرتے۔

——— اپنے افسرِ اعلیٰ کی ہلکی سی مسکراہٹ پر یا ان کے کسی بھونڈے اور بھدے لطیفے پر ایک دم کھل کھلا پڑنے والے "نوزبی کے جمائی"

——— کسی بزرگ کے عرس کے موقع پہ وزیروں سے مزار پہ چادر چڑھانے اور ان کے سر پگڑیاں باندھنے والے "نوزبی کے جمائی"،

——— دلّی میں رمضان کی فیشن ایبل افطار پارٹیاں اور ڈپلومیٹک (Diplomatic) میں وزیروں کو اپنے گھیرے میں لیے بیٹھے ان کے ایک ایک اشارۂ چشم و ابرو پر سو سو دفعہ ریشہ خطمی ہو کر قربان ہو جانے والے نوزبی کے جمائی۔

——— کسی اخبار یا رسالے کے ایڈیٹر کے سینے کے اندر گھس کر مزاج داں ہو جانے والے اور اپنا اوٹ پٹانگ مضمون چھپوانے کے لیے موقع بے موقع اس کے سر پہ مسلط ہو جانے والے "نوزبی کے جمائی"۔ الخ

یہ تھا نوزبی کے جمائیں اور نوزبی کا تعارف، اگر آپ بھی اپنے اطراف کا بریگیڈیر توفیق کی مائیکرو اسکوپ نظروں سے مشاہدہ کریں تو ایسی "نوزبیاں" اور "نوزبی کے جمائیاں بڑی تعداد میں نظر آجائیں گے۔ ●○

بابو آر کے
(اپل یورسٹی)

شادی نامہ

شادی کا خیال آتے ہی کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ ہائے! وہ بھی کیا دن تھے اپنی نیند سوتا اپنی نیند جاگتا۔ ادھر کا لیا تو ادھر کا دے دیا۔ رات میں کبھی بھی گھر لوٹو کسی کے بھونکنے کا خوف نہ کاٹنے کا ڈر۔ ہم تو اس دن کو روتے ہیں جس دن ہماری شادی کا تذکرہ گھر میں چھڑا۔ جس دن ہمارے گھر کی بڑی بوڑھیوں کو ہمارے کمرے در دھند میں گبرو جوان دکھائی دیا۔ اور ہمارے انگ انگ سے انھوں نے جوانی ٹپکتی دیکھی ...... یہاں تک کہ ہمارے دھان پان سے ہاتھ پاؤں انھیں کرکیل بھی لگے۔ الغرض ہماری ان تمام کارگزاریوں کے جواب میں ہمارے ہاتھ پیلے کرنے کی سزا تجویز ہوئی۔ ہماری سونی پسلی کو ادھر ادھر بے جا کر اس کا جوڑ ڈھونڈا گیا۔ پسلی کے جوڑ کے ساتھ ساتھ جوڑے گھوڑے اور جہیز کے ایٹم بھی دیکھے گئے۔ لینا دینا کھرا کھرا دو ٹوک طے ہو جانے کے بعد شادیانے بجے منہ میٹھے ہوئے اور اعلان ہوا کہ ہمارا رشتہ پکا ہو گیا، گویا یہ منادی تھی کہ ہم نیلام ہو گئے۔

رسم منگنی کے بعد، اب صاحب شادی کی تاریخ کا معاملہ درپیش تھا۔ تاریخ نکالنے کے لیے سب سے پہلے تو دونوں جانب کے کرتا دھرتاؤں کے بیچ ایک عدد اسلامی کیلنڈر کھول کر بچھایا گیا۔ کتنی ہی دیر مہینہ پر اتفاق نہ ہوا۔ پھر مہینہ طے ہو جانے کے بعد دن نٹ کھٹ لگے، اور اس کے بعد تاریخ طاق اور جفت کے جھمیلے میں پڑ گئی۔ کبھی رات اندھیری تھی تو کبھی قمر در عقرب۔ شادی کی تاریخ مقرر کرتے وقت میاں عقرب کے تعلق سے علم ہوا کہ ان مہاشے کو ڈنک مارنے کے ساتھ ساتھ شادیاں روکنا بھی عزیز ہے۔ خیر صاحب، ان تمام مصیبتوں کو جھیل کر عقد کے لیے ایک تاریخ مقرر ہو گئی۔ اس کے بعد پریس میں شادی کے کارڈس دیئے گئے۔ اس معاملے میں بھی الداعیان کے زمرے میں رشتہ داروں کے ناموں کا مسئلہ آیا۔ یعنی اس کا نام دو ...... تو اس کا کیوں نہیں۔ چونکہ خاندان کے کنواروں میں ہماری ہی شادی پہلی تھی۔ اس لیے بعض اہل خاندان اپنے ناموں کو ہماری شادی کے رقعہ میں جگمگاتا دیکھنا چاہتے تھے۔ اب ایسی پوزیشن

میں تمام کے تمام رقعہ میں تحریر کر دیے جاتے تو . . . . پھر آپ ہی بتائیے کہ رقعہ اور ووٹر لسٹ میں فرق ہی کیا رہ جاتا تو صاحب بول تول کر کے رقعے آئے اور تقسیم بھی ہوئے۔ اب جناب دیکھتے ہی دیکھتے ہماری شادی کے پانچ دنوں کا پہلا دن آ گیا یعنی خواتین کی اصطلاح میں منڈوے کا دن۔ اس دن گھر کے آنگن میں رنگین پردے اور جاجم وغیرہ تان کر ہری ہری ٹہنیاں اور ہرے پتے باندھے گئے۔ کھوپرے، کیلے، ہلدی خرمے اور لیموں کے تورن لٹکائے گئے۔ کھانے پکے، ڈھول بجے۔ لڑکیوں، بالیوں نے گیت گائے۔ ڈھول بجائے پھر ہمیں ہلدی کا جوڑا پہنایا گیا۔ ہاتھ میں کنگنا اور بجائے دستی بم اور ہینڈ گرینیڈ کے ہمیں کٹار سے لیس کیا گیا۔ پھر وقفہ وقفہ سے خواتین ہمیں تیل ہلدی اور پتہ نہیں کیا کیا لگانے لگیں۔ ویسے ہلدی کے طبی نکتہ سے ہم بخوبی واقف تھے کہ اس کی تاثیر گرم ہے اور یہ مار کی جگہ پر درد دور کرنے کے لیے لگائی جاتی ہے۔ لیکن شادی کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی اس لیے ہمیں مار سے پہلے ہلدی لگائی گئی۔ یعنی بیماری سے پہلے علاج ہوا۔ ہلدی کی گرمی اور خواتین کا لمس دے کر شادی کے لیے ہمارا موڈ آراستہ کیا گیا۔ جنسی بے راہ روی سے پاک گزشتہ زمانے میں یہ رسم یقیناً کارگر رہی ہوگی لیکن فی زمانہ فلموں اور ٹی وی کی عریانیت نے اس رسم کو بے اثر کر دیا۔ قصہ مختصر یہ کہ شادی کے پانچویں دن ہم مکمل طور پر کارٹون بنے خواتین کے حوالے تھے۔ پھر خدا خدا کر کے ہمارے عقد کا دن طلوع ہوا۔ طلوع آفتاب سے قبل ہم نے غسل کیا اور نماز فجر ادا کی۔ پھر اس کے بعد ہمیں سہرا باندھا گیا۔ یہ سہرا وہ سہرا تھا جس کو ہمارے سر پہ سجا دیکھنے کے لیے ہمارے بزرگوں نے برسوں دعائیں کی تھیں۔ اسی سہرے کی دعا گھر کی بڑی بوڑھیوں نے اس وقت سے دینی شروع کر دی تھی . . . . جب ہم پالنے میں لیٹے انگوٹھا چوسا کرتے تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہمارے سہرے کے پھول بڑے زبردست طریقے سے کھلے تھے یہ پھول بجائے چنبیلی گلاب، موگرے کے گیندے کے وزنی پھول تھے۔ جس سے ہوا یہ کہ سہرے کے وزن سے ہمارا سر لٹک گیا گردن کا منکا ڈھل گیا۔ عقد سے پہلے عقدہ یہ کھلا کہ سہرا سر سے باندھا ہی اس لیے جاتا ہے کہ نوشہ میاں کا سر وزن سے جھکا رہے۔ تاکہ آنے والی زندگی میں نوشہ میاں کا سر نیچا رکھنے میں دشواری نہ ہو، پھر . . . سہرے میں لپٹے ہمارے پوٹلی نما وجود کو . . . ع

پا بہ دستِ دیگرے دست بہ دستِ دیگرے

کے مصداق گھوڑی کی پیٹھ پر لاد دیا گیا۔ گھوڑی پر بیٹھتے ہی ہمیں اپنے اسلاف یاد آئے، ہم سوچنے لگے کہ وہ کیا تھے اور ہم کیا ہیں؟ وہ گھوڑے پہ بیٹھ کر سر سے کفن باندھے جہاد کرتے تھے اور ہم سہرا باندھ کر شادی کرتے ہیں۔ وہ گھوڑے پر بیٹھ کر تلوار چلاتے تھے اور ہم سہرے کی لڑیاں ہلاتے ہیں۔ وہ گھوڑے پہ بیٹھ کر خون میں نہاتے تھے۔ ہم ہلدی مہندی اور خوشبوؤں میں نہاتے ہیں . . . . انہی سوچوں کے دوران ہماری بارات دلہن کے گھر شامیانے کے قریب پہنچ گئی۔ عین شامیانے کے دروازے پر جوانوں اور بچوں نے تیل بلا یا ہوا ڈنڈا اڑا کر ہمارا راستہ روک دیا اور پیسوں کا مطالبہ کیا . . . . اس رسم کو ہمارے یہاں "دھنگانہ" کہتے ہیں یہ رسم ہماری شادیوں میں عرصۂ دراز سے جاری ہے اور شاید فریقین میں بجائے خلوص کے تشدد کا پایا جانا رسمی رسم سے ہو کر ہم تک پہنچا ہے۔ ابن بطوطہ نے آج سے کئی سو سال قبل اپنے سفرنامے میں اس کا ذکر کیا تھا۔ محمد بن [illegible] اخوند عالم کا عقد امیر سیف الدین [illegible] کے ساتھ ہوا تھا۔

رسم کے مطابق امیر عرب کی بارات گھوڑوں پر سوار ہاتھوں میں چھڑیاں لیے آئی۔ دلہن والوں نے بزورِ بازو بارات کو روکا۔ باقاعدہ طاقت آزمائی ہوئی۔ بقول ابنِ بطوطہ اس وقت نوشہ میاں کے ساتھیوں نے دلہن والوں پر حملہ کیا اور پچھاڑ پچھاڑ کر سب کو بھگا دیا۔ یہ سن کر شہنشاہ تغلق بہت خوش ہوا۔ رسم کے مطابق اگر اس وقت دلہن والے غالب آگئے ہوتے تو نوشہ میاں کو منہ مانگا انعام دلہن والوں کو دینا ہوتا...... لیکن یہاں ہماری شادی کے موقعہ پر چونکہ ہم امیر سیف الدین غدا ابن ہبۃ اللہ نہیں تھے۔ اس لیے ہم مغلوب ہوئے اور دلہن والوں کو منہ مانگی رقم دے کر شامیانے میں داخلہ پایا۔ اب جناب ایک وکیل اور دو گواہوں کے روبرو دس ہزار روپے مہر کے عوض قاضی صاحب نے ہمارا عقد پڑھایا۔ بعد از عقد ہمارے رشتہ داروں اور دوستوں کو دلہن والوں نے شال، ٹاول اور دستیوں کے نذرانے پیش کیے۔ اس رسم کی انجام دہی کے موقعہ پر بھی ہم نے اکثر شادیوں کی تقریب میں ہنگامے، تنا تنی اور تو تو میں میں ہوتے دیکھی ہے۔ طرفین سمجھ دار ہوئے تو ٹھیک ورنہ کھانے کی دیگ کا منہ کھلنے سے پہلے طرفین کے سر کھل جاتے ہیں۔ انہی نذرانوں کے بگاڑ کے باعث اکثر دولہے اٹھ جاتے ہیں اور دلہنیں بیٹھ جاتی ہیں۔ مہر کے تعلق سے ہماری قوم کا المیہ یہ ہے کہ نوشہ میاں لگن منڈپ میں شرکائے عقد کے روبرو بیوی کا مہر قبول تو بانگ دہل کرتے ہیں۔ لیکن پھر..... یہی مہر وہ وکیل کی نوٹس یا عدالت کے فیصلے کے بغیر ادا نہیں کرتے۔ ہمارے معاشرے میں مہر کی ادائیگی کا تصور یہ قرار پایا ہے کہ شوہر کی موت پر بیوی سے بخشوا لیا جائے یا شادی منقطع ہو جانے پر ہی مہر واجب الادا ہے ورنہ نہیں۔ اسی لیے اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب بھی کوئی اپنی منکوحہ کو اس کا مہر دینا چاہتا ہے تو..... بیوی رو دھو کر اپنا جینا اجیرن کر لیتی ہے اور یہ سوچ سوچ کر اپنا لہو پانی کرتی ہے کہ میاں دوسری لا رہے ہیں اس لیے مہر لوٹا رہے ہیں۔ ہماری اس بات سے اگر آپ کو اتفاق نہ ہو تو آپ بھی اپنی بیگم کا مہر ادا کرنے کا ارادہ کر کے دیکھ لیں۔ ○●

مجیب الرحمٰن بزمی (رانچی)

غزل ہوتی ہے

بھیرویں شام کو گائے تو غزل ہوتی ہے — شب میں کھماج جو سنائے تو غزل ہوتی ہے
خود تو اندر رہے دہلیز پہ اس کا کتا — ایسا منظر نظر آئے تو غزل ہوتی ہے
یوں تو ہوتی ہے شب و روز ملاقات مگر — چھپ کے ملنے وہ جب آئے تو غزل ہوتی ہے
سامنے والے دریچے سے دکھا کر جلوہ — گرمیِ عشق بڑھائے تو غزل ہوتی ہے
سرحدِ تمکیں سے کچھ اور بھی آگے بڑھ کر — نین کے تیر چلائے تو غزل ہوتی ہے
یوں تو بجلی کا بہت شور ہے سڑکوں پہ مگر — شور کمرے میں بھی آئے تو غزل ہوتی ہے
دعوتِ وصل پہ گھر اپنے بلا کر بزمی — مار ابا سے کھلائے تو غزل ہوتی ہے

غزل

مجیب الرحمٰن بزمی (رانچی)

مجھ پہ تہمت ہے بے وفائی کی — گھر بلا کر میری پٹائی کی
گالیاں کھا کے مسکراتے ہو — داد دیتا ہوں بے حیائی کی
کل کے اخبار کی یہ سرخی ہے — رہنماؤں نے ہاتھا پائی کی
دونوں ایک دوسرے سے واقف ہیں — کیا ضرورت ہے رونمائی کی
لوگ کیا کیا قیاس کرتے ہیں — دیکھ کے شکل بزمی بھائی کی

کھوئی اٹھنی

مرزا کھونچ (بیتیا)

مولوی صاحب نے کل مجھ سے کہا — لوگ کتنے ہو گئے ہیں بے حیا
کیا چلن ہے خوب ہے یہ انقلاب — ہو گئی لوگوں کی نیت اب خراب
ہم فقیروں سے بھی کر لیتے ہیں چیٹ — طے ہے دوزخ میں ملے گی ان کو سیٹ
میں نے پوچھا ماجرا کیا ہے جناب — کیوں ہوئے جاتے ہیں غصے میں کباب
بولے وہ بتلاؤں میں کیا کیا ہوا — مولوی کے ساتھ بھی دھوکا ہوا
بیٹھتی ہے مکاری اونچے بام پہ — لوگ ٹھگتے ہیں خدا کے نام پہ
شام کو نکلا گلگشت کے لیے — ہائے پر لوگوں کی نیت دیکھیے
جانے کس ملعون نے دھوکہ کیا — ڈبے میں جعلی اٹھنی رکھ گیا
میں نے پوچھا وہ اٹھنی ہے کہاں — آپ کو جس نے کیا ہے بدگماں
بولے وہ کیا اس کو رکھ کے چاٹتا — کون لیتا کس کو حصہ بانٹتا
راہ میں اندھا بھکاری مل گیا — وہ اٹھنی میں بھی اسی کو دے دیا

مراٹھی کہانی: رمیش منتری
ترجمہ: محمد اسداللہ

امیر خواتین کی آل انڈیا کانفرنس

گزشتہ برس شہر کانپور میں امیر خواتین کی ایک آل انڈیا کانفرنس ہوئی جس میں شرکت کی غرض سے پونا کی چار عورتیں اپنی کاروں میں سوار ہو کر گئیں۔ وہاں ہندوستانی عورتوں کے رنگ برنگے کپڑے، لباس، موتیں اور ان کے شوہروں کے بڑے بڑے کارخانے اور ٹھاٹھ باٹ دیکھا تو دنگ رہ گئیں۔ جی میں ٹھان لیا کہ آئندہ سال ایسی ہی زبردست کانفرنس پونا میں کروا کر ان عورتوں کو نیچا دکھانا ہے۔

چنانچہ اس کی تیاریوں کے لیے ایک میٹنگ بلوائی گئی۔ انتظامی امور پر تبصرہ کرتے ہوئے مسز ورمانے طنزیہ انداز میں کہا: "بھلا پونا والے اتنا خرچ کر پائیں گے؟" شہر پونا کی نمائندگی کرنے والی عورتوں کو یہ جملہ بری طرح چبھا۔ "ہم اس سے بھی زبردست کانفرنس کر کے دکھائیں گے۔ ہم دکھائیں گے کہ اپنے شوہروں کی جیبیں خالی کرنا ہمیں تم سے زیادہ آتا ہے۔" اور اس کے بعد پونا کی یہ بہادر عورتیں اپنے کام میں جٹ گئیں۔

سب سے بڑا مسئلہ اشتہاروں کے لیے روپیے جمع کرنا تھا۔ اس کی بھی ترکیب نکل آئی کہ جسے استقبالیہ کمیٹی کی صدارت کرنی ہے۔ وہ دس ہزار روپیے دے، انتظامیہ کمیٹی کی ممبرشپ کے دو ہزار، گورنر سے مصافحہ کرنے کے تین ہزار، گورنر کے ساتھ فوٹو کھنچوانے کے ایک ہزار، اس طرح لاکھوں روپیے جمع ہونے لگے تو کانفرنس کی کامیابی میں کوئی شبہ نہ رہا۔ طے پایا کہ گورنر صاحب سے اس کانفرنس کا افتتاح کروایا جائے گا اور پچیس ہزار روپیے عطیہ دینے والی خاتون اس کانفرنس کی صدارت کے فرائض انجام دیں گی۔

شہر کی امیر عورتوں کی فہرست تیار کی گئی، کئی کمیٹیوں کی تشکیل عمل میں آئی جن کی ممبرشپ صرف ان ہی خواتین کو دی گئی جن کے گھر کاریں تھیں۔ استقبالیہ کمیٹی کا بجٹ زبردست تھا کیوں کہ اس سیمینار کا واحد مقصد شان و شوکت کا مظاہرہ تھا۔

اسی طرح یہ بھی طے کیا گیا کہ سیمینار میں صرف وہی خواتین شریک ہوں گی جو کم از کم [illegible] پاس ہوں۔

ان خواتین سے حاصل ہونے والی رقومات کی مناسبت سے بی اے کا مطلب بی اے میں داخلہ لینا یا کالج جانا بھی لیا گیا۔ اسی لحاظ سے شہر کے ایک مشہور سرمایہ دار کی بیوی جو کبھی اپنے بیٹے کے ایڈمیشن کے سلسلہ میں کالج گئی تھی، اسے بھی کالج جانے والی قرار دے کر بی اے پاس خواتین میں شامل کر لیا گیا۔

اس دن ورکنگ کمیٹی کا وقت ۴ بجے مقرر کیا گیا لیکن پانچ بجے تک کسی کا نام ونشان نہ تھا۔ ساڑھے پانچ بجے صدر صاحبہ اور چند ممبران آئے۔ صدر صاحبہ کہنے لگیں: "آپ لوگوں کو کافی انتظار کرنا پڑا۔ کیا کرتی دراصل میری کار خراب ہو گئی تھی گیراج بھجانی پڑی تھی۔"

اس پر دسودھا بائی سے نہ رہا گیا۔ "آنے والی آئی تو میں بھی چار بجے ہی تھی مگر ہماری امبیسڈر صاحب کو لانے گئی تھی اور فیاٹ اسکول سے بچے لانے بھجائی گئی تھی۔ دونوں کاریں بالکل نئی ہیں۔ گیراج بھجوانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔"

یہ جملہ صدر صاحبہ کے زخموں پر نمک کا کام کر گیا۔ تلخ لہجہ میں بولیں۔ "سمجھ رہی ہوں میں تمہاری باتیں۔ میں نئی نئی کار سعل کے لیے سفارش کروانے اب نہ تب منسٹروں کے چکر کاٹتی نہیں۔"

کون کدھر کے چکر کاٹتا ہے۔ یہ بحث سبھی کے حق میں خطرناک ثابت ہو سکتی تھی لہذا یہ موضوع وہیں ختم کر دیا گیا۔ کالے بائی نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا— "اب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں مگر اس سے پہلے مجھے ایک بات کہنی ہے۔ ہماری امپورٹیڈ گاڑی اندور گئی ہوئی تھی۔ اسی لیے مجھے انڈین گاڑی سے آنا پڑا۔ اسی لیے مجھے دیر ہو گئی۔"

غرض جب یہ طے ہو چکا کہ کس کے گھر دو دو کاریں ہیں تو بات آگے بڑھی۔ سیمینار کے موضوع کا انتخاب کیا جانا تھا۔ اس سلسلے میں تجویز پیش کرتے ہوئے صدر صاحبہ نے کہا۔

"عورتوں کے سنگھار اور آرائش کی چیزوں پر حکومت نے زبردست ٹیکس عاید کر رکھا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"دیکھیے۔ ہر مسئلے میں دو پہلو ہوا کرتے ہیں ٹیکس ہٹائے جائیں۔ اس بارے میں دو رائیں تو ہیں نہیں لہذا کیوں نہ ہم اسے بجائے سیمینار کا موضوع بنانے کے، قرارداد بنا کر میٹنگ میں پاس کر لیں۔" سبھی نے اس کی تائید کی۔ اس کے بعد مسز بنارسے نے کہا—

"ہندوستانی عورتوں پر ہونے والے مظالم" یہ موضوع کیسا رہے گا؟"

اس پر صدر صاحبہ ناک سکوڑ کر بولیں "ارے نہ! ایسے فالتو ٹاپک کے بجائے اپنی ڈگنیٹی Dignity کو زیب دیتا ہوا کوئی موضوع چننا چاہیے۔ میرے خیال میں تو بیل باٹم یا منی اسکرٹ یہ عنوان اچھا رہے گا۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے" دسودھا بائی نے تائید کرتے ہوئے کہا۔

"منی اسکرٹ والا پہلو تو ہم سنبھال لیں گے۔ بیل باٹم پر آپ ہی حق کے ساتھ بول سکیں گی۔" اس پر زور دار قہقہہ پڑا۔

اسی طرح مختلف کمیٹیوں کا کام کاج شروع ہوا۔ عورتوں کی خاص دلچسپی کا میدان ہے کھانا۔ سندھ بائی اس سلسلہ میں خاصی مشہور تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کتاب پڑھ پڑھ کر باورچی کو ہدایات دے کر کھانا بنواتیں۔

ان کے شوہر سکریٹریٹ میں کارخانوں کی پرمیشن سے متعلق ایک اعلیٰ افسر تھے لہٰذا وہ کارخانے داروں سے زادہ وصول کیا کرتیں۔ ایک مرتبہ ان کے گھر ویج اور نان ویج دونوں قسم کے لوگ دعوت میں جمع تھے اور ہوا یہ کہ خالص ویجیٹیرین کے لیے بنوائی گئی کھیر میں گوشت کی بڑی بڑی بوٹیاں اور گرم مصالحہ پڑ گیا تھا۔ کارخانوں کی پرمیشن ملنے کی امید میں لوگوں نے گوشت بھری کھیر کی خوب تعریف کی۔ بعد میں پتہ چلا کہ سندر بائی کتاب دیکھ کر کھیر بنا رہی تھیں۔ جس صفحہ پر ترکیب لکھی تھی اس کا اگلا صفحہ چپک جانے کی وجہ سے بعد کا مضمون ان کے سامنے ان الفاظ میں موجود تھا ـــــ

"اس بڑے برتن میں زعفران، الائچی، اُبلا ہوا گوشت اور گرم مصالحہ ملایئے۔"

اس طرح کھیر میں گوشت شامل ہونے کے باوجود کٹر شاکاہاری سیٹھ کیدی لال نے اس لذیذ کھیر کی دل کھول کر تعریف کی۔ اس قدر تجربات کے باوجود سندر بائی کو اس کمیٹی کا صدر بنانا لازمی تھا۔

اس کے علاوہ ڈرامہ، سجاوٹ، ٹرانسپورٹ وغیرہ کی مختلف کمیٹیاں بنائی گئی تھیں۔ اس موقع پر ایک سوونیر بھی شائع کیا گیا اس میں شہر کی امیر خواتین کا تعارف پیش کیا گیا تھا۔ ایک نمونہ ملاحظہ فرمایئے:

"شری متی واسنتی بائی کو کون نہیں جانتا۔ کولابہ میں ان کا اتنا بڑا فلیٹ ہے کہ اس میں سنگیت محفل کا بھی اہتمام کیا جا سکتا ہے۔ ان کے آٹھ کمروں کے فلیٹ میں پانچ کمرے ایرکنڈیشنڈ ہیں۔ قلابہ مہیلا منڈل کی صدارت کا شرف بھی انھیں حاصل ہے۔ اس کے تحت تقاریر کا سلسلہ بارہ مرتبہ منعقد کروایا گیا۔ جس میں سے ایک بار بھی انھیں تقریر کا معاوضہ نہ دینا پڑا۔ اس سے ان کے سماجی وزن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جنگ کے زمانے میں واسنتی بائی نے بلیک آوٹ کمیٹی بنا کر اپنے علاقے میں لوگوں کو فٹ کر کر کے کمروں کی کھڑکیاں بند کرنے پر مجبور کیا۔ جس کا یہ اثر ہوا کہ پاکستانی جہازوں کو بمبئی کی وسعت کا اندازہ ہی نہ ہو سکا اور وہ ہاتھ ملتے ہوئے واپس چلے گئے۔ پاکستانی بموں سے بمبئی کی حفاظت کا ان کا یہ کارنامہ سنہری حروف سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ قلابہ کے علاقے کی عوام کا مطالبہ ہے کہ واسنتی بائی کو پدم شری کا خطاب دیا جائے۔"

خواتین کی کانفرنس سنیچر اور اتوار کو منعقد ہونے والی تھی۔ وقت کے بارے میں بحث ہوتی رہی۔ ۸ بجے صبح شروع ہو تو میک اپ کے لیے دو گھنٹے درکار تھے۔ لہٰذا وقت ۱۰ بجے طے ہوا۔ سجاوٹ کمیٹی نے تجویز پیش کی کہ عظیم رہنماؤں کی تصاویر محفل کے پردے پر زیب نہیں دیں گی لہٰذا فلمی ستاروں کی تصاویر لگائی جائیں۔

پنڈال کے اطراف دو لاکھ کاروں کا سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ جن لوگوں نے گورنر سے ملاقات کی مد میں ڈونیشن دیا تھا دم سادھے کھڑے تھے کہ اگر کی باری چلی گئی تو ساری رقم مٹی میں مل جائے گی۔

کانفرنس کے شروع میں استقبالیہ گیت کے بعد صدر، وزیر اعظم، وزیر اعلیٰ اور دیگر مشاہیر کی نیک خواہشات اور تہنیتی پیغامات سنائے گئے۔ کانفرنس کی منسٹر کی تقریر چھپوا کر تقسیم کر دی گئی تھی۔ اس کے بعد انھیں سننے تمام تر تفصیلات کے ساتھ تقریر کی۔ گورنر کی بیوی نے اپنی تقریر کے دوران مہاراشٹر میں کولی بستیاں گندی ہیں اس سلسلے میں اہم معلومات پیش کیں۔ اس کے بعد معزز مہمان پرملا بائی

صاحب نے اپنی تقریر شروع کی۔

"ہماری اس کانفرنس کے بارے میں ناحق یہ شور مچایا جا رہا ہے کہ یہ امیر عورتوں کی کانفرنس ہے اور اس میں غریب عورتوں کا نام تک نہیں لیا جاتا۔ یہ سراسر جھوٹ ہے۔ میں پرسوں بمبئی کی جھونپڑپٹی میں گئی تھی وہاں میں نے بچت کی اہمیت پر تقریر کی۔ میں نے ان عورتوں سے کہا کہ وہ ہر مہینے سرکاری سیونگ سرٹیفکیٹ خریدیں۔ اسی طرح بجلی کی بچت کریں۔ ضرورت نہ ہو تو پنکھا بند رکھیں۔ میں نے انھیں یہ پیغام بھی دیا کہ وہ بچا ہوا کھانا بیکار نہ جانے دیں اسے فریج میں محفوظ رکھیں اور دوسرے دن کھالیں۔ اس سے ملک کی ترقی ہوگی۔"

تمام خواتین نے تالیاں بجا کر ان کے خیالات کا استقبال کیا۔

استقبالیہ کمیٹی کی صدر نے عورتوں کے آتشیں مسائل بیان کرتے ہوئے کہا "کبھی یہ ہوتا ہے کہ ہمارے مسٹر اپنی ایک کار کارخانے لے جاتے ہیں اور دوسری کار بچوں کو لانے اسکول جاتی ہے اس وقت ہمیں کلب کی میٹنگ کو جانا ہو تو جو ذہنی کوفت ہوتی ہے اس کا اندازہ کوئی دوسرا کر ہی نہیں سکتا۔ یہ ہماری نا ری کا استحصال ہے۔ اسی طرح حکومت نے عورتوں کی آرائشی چیزوں پر جو پابندیاں لگا رکھی ہیں انھیں دور کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ جہازوں کے سفر میں عورتوں کو اولیت دی جانی چاہیے بلکہ کرائے میں بھی پچاس فی صد چھوٹ ملنی چاہیے۔"

تالیوں کی زبردست گونج کے ساتھ ان کی تقریر ختم ہوئی۔ اس دوران ہال میں بیٹھی چند خواتین کچھ اس قسم کی گفتگو میں مصروف تھیں۔

"کیا رانی صاحبہ کا ہار واقعی اصلی ہے۔ دور سے تو ہیرے کا لگ رہا ہے۔"

"ادھم امیٹیشن ہوگا۔ فلموں کی طرح۔"

"رانی ہوئی تو کیا۔ اب راج پاٹ لوک کا ختم ہو چکا۔"

"گورنر کی بیوی کے ہاتھ میں جو انگوٹھی ہے نا۔"

"ہاں وہ اصلی ہوگی"

"مگر اسے اس طرح دکھاتے پھرنے کا کیا تک ہے۔"

"ہم تو سمجھیں کہ نقلی ہے۔ اس کا شوہر لوں بھی پکا کنجوس ہے۔ اصلی ہیرا اسے تھوڑے ہی دے گا اور اصلی ہیرا ہوتا تو اس کی وہ پارسی گرل فرینڈ ہے نا اسے دے گا۔"

"کیا کہا جاپانی نائیلون! ارے وہ ساری مشکل سے ساٹھ روپیوں میں سے خریدی ہے۔ میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں۔"

"ارے پرسوں اس نے اپنے نام سے جو آرٹیکل چھپایا تھا سنا ہے اس کی سکریٹری نے لکھا تھا۔"

"سونے کی چوڑیوں کی ایسی بھی کیا نمائش ... کی جا رہی ہے۔ ہمیں تو معلوم ہے کہ اس کے شوہر نے بلیک منی چھپانے کے لیے خریدی ہیں۔"

کانفرنس کے اختتام کے بعد سیمینار اور دوپہر میں ڈرامہ کا اہتمام کیا گیا۔ اسی دوران کھانے کا انتظام بھی تھا۔ مجموعی طور پر امیر خواتین کی یہ کانفرنس کامیاب رہی۔ سنا ہے پونا کی خواتین کو نیچا دکھانے کی غرض سے اگلے سال بمبئی کی امیر عورتیں اس سے بھی زبردست قسم کی کانفرنس منعقد کریں گی۔ اس کانفرنس میں کس قسم کی ساڑیاں اور زیورات پہننا ہے اس کی تیاریاں آج ہی سے شروع ہو چکی ہیں اور ان اخراجات کا سامنا کرنے کے لیے ان امیر خواتین کے شوہر بھی مصروف ہو گئے ہیں۔

مشتاق شاد

اچار بچوں کا

حساب کرتے ہو کیوں بار بار بچوں کا
جو بڑھ چکے ہیں تو ڈالو اچار بچوں کا

سجا ہے سر پہ جو سہرا تو سوچ لے پیارے
گلے میں پڑنے ہی والا ہے ہار بچوں کا

مجھے یہ خوف کہ نزلہ زکام ہے اس کو
اسے یہ غم کہ نہ ٹوٹے بخار بچوں کا

وہ چاہتا تھا کہ بس دو ہی کام کے نکلے
لگا ہے ڈھیر مگر تابکار بچوں کا

خدا کو اپنی خدائی پہ خوف آنے لگا
جب آدمی کو دیا اختیار بچوں کا

زمین، جس پہ کہ بستی ہے سو کروڑوں کی
امنڈ کے آیا ہے سیلاب دل ہزار بچوں کا

جو ان سے پوچھا تو بولے کہ آگے گے قبال
خدا کے فضل سے ہے انتظار بچوں کا

یہ فصل بڑھی تو ماں باپ ہو گئے بوڑھے
رہا نہ گھر میں کوئی پہرہ دار بچوں کا

خدا وہ وقت نہ لائے ہمارے ملک پہ شاد
کہ ملک کرے حکومت شمار بچوں کا

عالم لکھنوی

غزل

یہ صرف سیاست میں ہوتا ہے میرے بھائی
لاکھوں بھی ہڑپ کر لو تو کچھ نہیں شنوائی

کل ایک منسٹر نے یہ بات ہے بتلائی
سو بوتے بھی کھا لیجے تو کچھ نہیں رسوائی

کیوں تیل لگاتے ہو کیوں چمپی کراتے ہو
جب جھاڑ بچھے سر پر اک بال نہیں بھائی

یا جیب کٹا دیجیے یا جان گنوا دیجیے
تب جا کے حسینوں میں ہوتی ہے پذیرائی

معلوم تھا یہ گر اس کھیل میں الفت کے
شوہر ہی ہمیشہ سے بیوی کا ہے شیدائی

پہلے تو نہ جانا تھا انجام محبت کا
اب جان پڑا اے دل جب جان پہ بن آئی

او تعل سے کیا وعدہ اور مکر کر دیا جھانسہ
جھانسی کے حسیں سارے یعنی کہ ہیں جھانسائی

اس عشق و محبت میں ہم ہو گئے یوں چکر
جس سمت نکل جائیں ہو جاتی ہے رسوائی

عالم کی وفا کا جب ان کو نہ یقیں آیا
عالم نے بصد وحشت بندوق اٹھائی

افتخار وصی

(بیتیا)

ہم ہیں جدید شاعر

اپنے ہی بینڈ باجے اپنی ہی دھن پہ گائیں
محفل میں شاعروں کی ہم جب بلائے جائیں

چمچوں کے بل پہ اپنا کچھ رعب یوں جمائیں
تب رابطہ شاعری پر بھرپور داد پائیں

ہم ہیں جدید شاعر ہم ہیں جدید شاعر

کل عیب شاعری کے حکمت سے ڈھانپتے ہیں
گرہوں پہ انگلیوں کی مصرعوں کو ناپتے ہیں

الفاظ کی رگوں کو کچھ ایسے جانچتے ہیں
سب ردیف ہمارے تھر تھر کانپتے ہیں

ہم ہیں جدید شاعر ہم ہیں جدید شاعر

چہرے پہ غزل کے مل کر رومانیت کا غازہ
یاسی کرشمی کی کوشش کو کہہ کے دو بیازہ

ہم آئے جب سے لے کر اپنا کلام تازہ
ہر کہنہ مشق شاعر کا اٹھ گیا جنازہ

ہم ہیں جدید شاعر ہم ہیں جدید شاعر

کوے کے منہ میں سورج ہم نے تھما دیا ہے
آنکھوں کی پتلیوں پر موسم سجا دیا ہے

شبنم کی چھت پہ تازہ پودا اگا دیا ہے
بلبل کو گلستاں سے ہم نے بھگا دیا ہے

ہم ہیں جدید شاعر ہم ہیں جدید شاعر

ہم سا نہیں ہے شاعر لاکھوں کی سنکھیا میں
ہم دل کو باندھتے ہیں غزلوں کے قافیہ میں

بھرتے ہیں رنگ کیسے ساحر کے فن القرس میں
گاتے ہیں بھیرویں کو انداز خادما میں

مشتاق احمد یوسفی

یہ دیباچہ نہیں ہے*

ہمارے یار طرحدار اور البیلے شاعر ساقی فاروقی اپنے آپ سے جنگ کرتے رہتے ہیں اور خود کو کئی بار دنداں شکن شکست دے چکے ہیں۔ وہ اردو کے ایک نہایت خوبصورت، حد درجہ اور بجھل اور غالباً سب سے بڑے جلالی شاعر ہیں۔ غالباً کی پخ اس لیے لگانی پڑی کہ ہم نے کسی اور جلالی شاعر سے مات اور مار نہیں کھائی؟ پچیس تیس برس سے لندن میں مقیم اور دوستوں سے برسرِ پیکار ہیں۔ جس کو دوست رکھتے ہیں اُسے پھر کہیں کا نہیں رکھتے۔ بلکہ وہ پھر اُن کے لائق بھی نہیں رہتا۔ جدید مغربی شاعری اور ادبی رجحانات سے جو براہِ راست واقفیت ساقی رکھتے ہیں وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ خالص اور تازہ ترین مغربی CONTEMPORAY DICTION کے اگر وہ تنہا شاعر نہیں تو سب سے ممتاز شاعر ضرور ہیں۔

ساقی اپنی آسٹرین بیگم کو پیار میں گنڈی اور اپنے ROTTWEUIN کتے کو کامریڈ کے نام سے پکارتے تھے۔ کتا تو اپنے نام اور ساقی کے پیار کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو گیا۔ مینڈک، کتے، بلے، خرگوش، بکرے وغیرہ پر بہت خوبصورت اور خیال انگیز نظمیں لکھی ہیں۔ چار ٹانگوں سے کم کے کسی ذی روح سے ساقی محبت نہیں کر سکتے جب سے اُنھوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ ہم سے محبت کرتے ہیں، ہم تو راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اپنی ٹانگیں ٹٹول ٹٹول کر گنتے ہیں کہ کہیں ہم اپنے بارے میں کسی مغالطے میں تو مبتلا نہیں رہے ہیں۔ جس دن سے وہ ہم پہ مہربان ہوئے ہیں، اُنھوں نے زمین پہ قدم رکھنا چھوڑ دیا ہے۔ مطلب یہ کہ ان کا ہر قدم ہماری دستارِ فضیلت پر پڑتا ہے ۔۔۔ نازک مزاج ایسے کہ بور آدمی، کلیشے، خراب شعر اور نیک چلن عورت کو ایک منٹ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ جن دوستوں کو بہت عزیز رکھتے ہیں اُن کو خطوں میں القاب کے بجائے گالیاں لکھتے ہیں۔ اُن کے مکتوب الیہم ان سڑی گالیوں کے اس درجہ عادی ہو گئے ہیں کہ ساقی اگر شریفانہ لہجے میں گفتگو کریں تو دونوں ہی اجنبیت محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ محبی و مشفقی اسد محمد خاں صاحب نے ساقی کے نام اپنے خط میں بڑے دکھ بھرے لہجے میں شکایتاً لکھا کہ "شوذر! تم نے پچھلے خط میں مجھے گالیاں

---

* ساقی فاروقی کے مجموعۂ کلام "زندہ پانی سچا" کا دیباچہ

کیوں نہیں لکھیں! اس کی وجہ ہمیں تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ اُس زمانے میں ساقیؔ سقراط پر ایک نظم لکھ رہے تھے جو شائع ہو چکی تھی۔

اب ذرا یہ اشعار دیکھیے اور شاعر کے تیور بھی۔

سفر میں رکھ، مجھے میری خدائیوں سے پرکھ ❊ فراق دے ابھی خاکِ وصال میں نہ ملا

یا

مجھ میں سات سمندر شور مچاتے ہیں ❊ ایک خیال نے دہشت پھیلا رکھی ہے

جو شخص ایسے شعر کہہ سکتا ہے، اس پر سات خون معاف ہیں۔ اس سے ہماری مُراد سات خودکشیاں ہیں کہ اس غضب کے اور غضب ناک شاعر کے ہاتھ اپنے ہی جیتے جیتے خونِ ناحق میں رنگے ہوئے ہیں۔

چھ سات برس پہلے تک گلے میں چھوٹے بڑے رنگ برنگے موتیوں اور منکوں کی مالا پہن کر ساقی گھن گرج کے ساتھ شعر پڑھتے تو لوگ شاعری سے چکاچوند ہو کر موتی گننے لگتے۔ حسنِ شعر خوانی میں جب جلالی لہجے اور اعلیٰ درجے کی اسکاچ وسکی کی ملاوٹ ہو جائے تو شعر سہ آتشہ ہو جاتا ہے۔ پڑھت اِس قیامت کی کہ ایک ایک لفظ کو زندہ کر کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں۔ خرگوش، کبڑے یا مینڈک پر نظم پڑھتے ہیں تو بالکل وہی بننے کی بڑی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ ایسی ڈرامائی طرز ایجاد کی ہے جس میں اپنے تمام اعضا استعمال کر کے سننے والے کے پانچوں حواس پر چھا جاتے ہیں۔ جیسے ڈوب کر شعر کہتے ہیں، اُسی طرح ڈوب کر پڑھتے ہیں۔ اور بعض اوقات اتنی گہرائی یعنی "شاعر ڈبا و گہرائی" میں اُتر جاتے ہیں کہ خود تو نکل آتے ہیں، مگر ہم جیسے مداحوں کو یہ کہہ کر وہیں چھوڑ آتے ہیں کہ برادرِ عزیز! جہاں بھی رہو خوش رہو! تو یہ ہیں ہمارے یارِ طرحدار ساقی فاروقی جو اپنے آپ سے جنگ کرتے رہتے ہیں اور خود کو کئی بار دنداں شکن شکست دے چکے ہیں.....

دیباچہ

سب سچے ہیں
لکھ لکھ کر سب سچے ہیں
ان سچوں میں
اب بھی ایک جگہ خالی ہے
اِک جھوٹے کی
جس کی شیطانی آنکھوں میں
صرف تمسخر ہو اور نفرت کے شعلے ہوں
جو سقراطوں اور مسیحاؤں کے مُنہ پر
تھوک سکے.....
تھوک سکے اور اِک موٹی سی گالی دے

ساقی

ڈاکٹر محمد کوثر اعظم
(پٹنہ)

وائیفوبیا

اور

لوبیریا

وائیفوبیا دراصل ایک بیماری ہے جس سے موت کا خطرہ کم اور رسوائی کا خوف زیادہ لگا رہتا ہے یہ کوئی نئی بیماری نہیں۔ اس کا سراغ سندھ ندی سے لے کر دریائے نیل تک کی تہذیبوں میں ملتا ہے۔ یہ مرض لاعلاج تو ضرور ہے لیکن پرہیز کے ذریعے اس پر کنٹرول بھی کیا جا سکتا ہے لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ اس بیماری کا مریض اس لعنت کے علاج کے بجائے اسے نعمتِ خداوندی سمجھتا ہے۔ وہ اس کی راہ میں اپنی جان تک نچھاور کرنے میں دریغ نہیں کرتا اس سلسلے میں وہ انکساری اور عاجزی کو باعثِ فخر سمجھتا ہے یہ مرض اتنا ہی پرانا ہے جتنی آریہ، منگول اور دراوڑی تہذیبیں لیکن موجودہ دور اور ہماری موڈرن تہذیب میں اس مرض کا چرچا عام ہے اور تقریباً ہر گھر میں اس کا بیمار آپ کو مل جائے گا۔ خدا بھلا کرے رشید احمد صدیقی کا جنھوں نے پہلے پہل اس مرض کے مزاج کی مناسبت سے اس کا نام وائیفوبیا رکھا تھا۔

خالصتاً یہ بیماری ان حضرات کی میراث ہے جو شادی شدہ ہیں۔ جب وہ اس مرض میں مبتلا ہوتے ہیں تو دوستوں کی محفل میں جانے سے گھبراتے ہیں کھلنے ملنے میں کتراتے ہیں۔ بھیڑ بھاڑ انہیں پسند نہیں ہوتی۔ وہ دعوتوں، جلسوں اور پارٹیوں میں شرکت کرنے سے پرہیز کرتے ہیں اور بحالت مجبوری اگر انھیں جانا ہی پڑا تو وہاں بالکل الگ تھلگ دکھائی دیتے ہیں۔ اس مرض کے مریض کی علامت یہ بھی ہے کہ وہ ہمہ وقت کسی نہ کسی خیال میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے۔ اکثر اس پر فلاسفر ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ اس کا مریض انتہائی شکی مزاج ہو جاتا ہے اور گھر چھوڑ کر باہر جانے میں اسے ختنہ کے ٹوٹنے کے اٹھ جانے کا خطرہ محسوس کرتا ہے چنانچہ بعض مصلحتوں کی وجہ سے وہ دہلیز کے باہر قدم نکالنے سے پہلے نہ جانے کیا کیا سوچتا ہے خدانخواستہ اگر اسے اپنے گھر شہر یا گاؤں سے باہر جانے کی ضرورت پیش ہی آ جائے تو اس وقت اس کی صورت قابلِ دید ہوتی ہے اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔ ہمت کر کے کسی خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیتا ہے لیکن عین اسی وقت اس کے دل کی دھڑکنیں انتہائی تیز ہو جاتی ہیں اور اس کی آنکھوں سے

آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ دائیفوبیا کا مریض بیگم کا وفادار اور خدمت گار ہوتا ہے اور وہ نہ صرف یہ کہ امورِ خانہ داری میں ماہر ہوتا ہے بلکہ برتن دھونے اور کپڑوں کی صفائی اور چولھے چکی کی لیپ پوت سے لے کر کھانا تیار کرنے کا سلیقہ اور ہنر رکھتا ہے۔ غرض وہ ایثار و قربانی کا ایسا مجسمہ ہوتا ہے کہ:

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

کی مکمل تصویر ہوتا ہے لہٰذا یہ مزاجِ یار پر ہی منحصر ہوتا ہے کہ وہ ایثار و قربانی کے پیکر کے ساتھ کیا سلوک روا رکھتا ہے؟ گویا اس بیماری میں سر اور دھڑ دونوں داؤں پر لگے رہتے ہیں اس لیے کہ:

سرد ہے ٹھنڈ کولر کی طرح   گرم ہے اہلیہ ہیٹر کی طرح

دائیفوبیا کے مریض کی خاص علامتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ اسے تنہا نیند نہیں آتی اگر آ بھی گئی تو نیند کی حالت میں بار بار چونک جاتا ہے اور بڑبڑانے لگتا ہے اکثر نیند کی حالت میں بستر پر کچھ ٹٹولتا ہے۔ بار بار تکیہ کو سینے سے لگاتا ہے۔ عجیب غریب حرکتیں کرتا ہے ویسے وہ دیکھنے میں چست درست نظر آئے لیکن اندر سے کھوکھلا ہو گیا ہے بھوک کم لگتی ہے۔ خود کم کھاتا ہے لیکن بیگم کو زیادہ کھلاتا ہے۔ ہمت اور حوصلے کے معاملے میں وہ [illegible] بیماری کی علامت ہوتا ہے۔ قوتِ فیصلہ اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اس بیماری کی وجہ سے رفتہ رفتہ کم ہوتی جاتی ہے اور وہ صد فی صد زن مرید ہو جاتا ہے۔ (آپ مریدی کی زندگی سے اچھی طرح واقف ہی ہیں)

دائیفوبیا سے ملتا جلتا ایک مرض 'لویریا' یا عاشقی بھی ہے جس نے لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا اور رومیو جولیٹ کے علاوہ نہ جانے آج تک کتنے گھروں کو اس چنگاری سے خاکستر کر دیا ہے۔ خود غالب نے اپنی زبان میں اس مرض کی سنگینی سے متعلق کہا تھا کہ: 'لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے'

مرضِ لویریا کے مریضوں کی ان دنوں ہمارے یہاں بھرمار ہے بلکہ دنیا کے ہر خطے میں اس کے مریض کثرت سے ملتے ہیں، رنگ و نسل، مذہب، ذات پات، جغرافیائی حدود اور لسانی تفرقے اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتے شاید اسی وجہ سے یہ مرض چھوا چھوت کے مرض کی طرح تیزی سے ہر سماج میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلتا جا رہا ہے۔ یہاں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس مرض کے شکار صرف غیر شادی شدہ حضرات ہی نہیں ہوتے بلکہ یہ مرض شادی شدہ حضرات کو بھی نہایت مرغوب ہے اور وہ اسے اپنے سینے سے لگانے کے لیے ہر لحظہ بے تاب رہتے ہیں۔ اس کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں۔ یہ بیماری سنِ بلوغ سے لے کر قبر میں پیر لٹکانے تک کسی بھی لمحہ لگ سکتی ہے اور یوں بھی کسی پیدا ہونے کی عمر بھلا کیسے متعین کی جا سکتی ہے۔ دراصل یہ تو خوبیٔ تقدیر ہے اور تقدیر نے جسے یہ نعمت بخشی ہو تو وہ بھلا دیر کیوں کرے؟ ورنہ کتنے اس کا ارمان لیے قبروں میں چلے جاتے ہیں۔ اس مرض کی بھی خاص علامتیں ہیں جس سے مریض کے مرض کی شناخت میں آسانی ہو جاتی ہے۔ مثلاً لویریا کا مریض بھوکا پیاسا رہنے میں بڑی عافیت محسوس کرتا ہے۔ رت جگا کرنا اس کا خاص مشغلہ بن جاتا ہے۔ وہ خصوصاً جنونی اور سنک مزاج ہو جاتا ہے بات بات پر چراغ پا ہو کر مرنے اور مارنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ سماج اور معاشرے سے بیزار رہتا ہے۔ کوچۂ محبوب میں اس پر ایک مخصوص قسم کا دورہ پڑ جاتا ہے اس کی آنکھیں ایسی حالت میں بند رہتی ہیں مگر ہوش و حواس بالکل درست رہتے ہیں۔ وہ کانوں سے سب کچھ سنتا ہے مگر آنکھوں سے مصلحتاً دیکھتا نہیں۔ اس کا مریض

گنڈے اور تعویذ کے پیچھے بھی اکثر پریشان دیکھا گیا ہے۔ اس کی شریعت میں سر کے بل چلنا اور پاسبان کے قدم چومنا روا ہے۔ عاشق جاں باز یہ جانتا ہے کہ اسے اک آگ کے دریا سے گذرنا ہے اس لیے وہ ہمہ وقت اس مصیبت کو جھیلنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اس میں اتنی ہمت ہوتی ہے کہ آتش عشق میں بے خطر کود پڑے یعنی اس کے ہر شئی پر عاشقی کے جوش کا غلبہ رہتا ہے۔ اس کا مریض عام طور پر سماج، معاشرے اور خاندان سے ٹکر لینے کا پورا حوصلہ رکھتا ہے اور وہ انجام سے بے خبر رہتا ہے اور بغیر تیشہ کے پہاڑ کاٹنے کے لیے تیار رہتا ہے۔

وائیفوبیا اور لویریا کی کچھ علامات ایسی ہیں جو دونوں میں مشترک ہیں جن سے مرض کی صحیح تشخیص میں دھوکا ہو سکتا ہے مثلاً وائیفوبیا کے مریض کی طرح لویریا کا مریض بھی شکی مزاج ہوتا ہے، محفل سے گھبراتا ہے اور اس پر فلاسفر ہونے کا شبہ آپ کو گزر سکتا ہے۔ جہاں تک مریض عشق کے علاج کا سوال ہے تو جناب صاف بات یہ ہے کہ یہ لاعلاج مرض ہے۔ اس کی کوئی دوا نہیں۔ چھیڑ چھاڑ کرنے پر یہ تیزی سے بڑھتا ہے اور شاید آپ نے سنا بھی ہو کہ:

مریض عشق پر لعنت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

غرض اس مرض کا علاج نہ تو طب یونانی میں ہے اور نہ میڈیکل سائنس میں۔ البتہ دونوں طرح کے مریضوں کے لیے کچھ مفید مشورے ضرور ہیں جس پر عمل کر کے مرض کی شدت پر کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ یعنی پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ پرہیزی نسخہ ہر ملک، ہر خطے اور ہر طبقے کے افراد کے لیے یکساں مفید ہے اور اس پر کوئی خرچ نہیں آتا لیکن یاد رہے کہ دونوں طرح کے مریضوں کی خواہشوں کا بھرپور احترام کیا جانا چاہیے۔ ان کی پسند اور ناپسند کا خیال رکھا جانا چاہیے۔ ان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائے جائیں۔ رشتہ داروں اور دوستوں کو انتہائی محبت اور نرمی کا ثبوت دینا چاہیے ورنہ مریض ضدی ہو جائے گا اور مرض خطرناک صورت اختیار کر سکتا ہے۔

ممتاز مزاح نگار سید یداللہ مہدی

غزل

روشن علی روشن (کریم نگر)

کبھی ہم سے مہری یہ اَنتی دیکھی نہیں جاتی
بڑی تو ہے بڑی چھوٹی خوشی دیکھی نہیں جاتی

کلرکی دی ہے سمدھانے ہے رفریج ہے مال و زر بھی ہے
عمر دولہے کی ہے جو بھاڈ کی دیکھی نہیں جاتی

سدا ہوتا آپریشن ہے آپریشن کے ہی تھیٹر میں
کھلے بندوں اگر ہو سرجری دیکھی نہیں جاتی

بڑا مکار ہے راشی ہے مجرم ہے فریبی ہے
ہے طرّہ اس پہ صورت چور کی دیکھی نہیں جاتی

جو مرغ و ماہی لایا تھا میں آخر کیا ہوا اس کا
رکھی ہے سامنے کھٹی کڑی دیکھی نہیں جاتی

یہ مانا حق بجا بیوی کا شوہر کی وراثت میں
جگہ ٹی اے کی ایل پی کھڑی دیکھی نہیں جاتی

مجھے سسرال سے بنگلہ ملا اور کار ماروتی
ہمیں سیکل ملی سو سال کی دیکھی نہیں جاتی

کرپشن کے سمندر میں سبھی غوطہ لگاتے ہیں
ہے رشوت سنتری تا منتری دیکھی نہیں جاتی

مجھے دعوت ہے روشن اپنے سالے کے ولیمہ کی
بجز خشکہ یہاں بوٹی کوئی دیکھی نہیں جاتی

غزلیں

کوثر صدیقی (بھوپال)

چاند خاموش چاندنی گم سم
بستی کرفیو میں ہو گئی گم سم

آپ کا دودھ گھی ہیں سب نقلی
جسم کمزور دل بھی گم سم

کس طرح کی ہے آپ کی تعلیم
عقل اوندھی ہے آگہی گم سم

مندروں مسجدوں کے جھگڑے پہ
برہمن چپ ہے مولوی گم سم

ہو گئی بند بولتی سب کی
شاعروں کی ہے شاعری گم سم

بولنے کی ملی ہے آزادی
منہ پہ تالے ہیں آدمی گم سم

جانے کیسی بہار ہے کوثر
غنچے افسردہ پھول بھی گم سم

○

لکھتے ہیں ہندی میں وہ تو خط مجھے
یہ ہے اردو پڑھنے کی عادت مجھے

ہو گئی اردو جو کٹھ ملاؤں کی
ہندی سے کرنا پڑی رغبت مجھے

بن گیا میں ڈھیرے ڈھیرے ٹیکس چور
لکھ پتی بننے کی ہے حسرت مجھے

رائفل، بندوق، گولی، کارتوس
موت کے سامان سے ہے الفت مجھے

مشورہ مجھ کو الیکشن کا نہ دو
یاد آتی ہے مری دُرگت مجھے

گڑ بھی لے کر آیا ہوں ستو کے ساتھ
اب تو پلوا دیجیے شربت مجھے

فتنے سے [illegible] یہ کوثر کم نہیں
پڑ گئی ہے لاٹری کی لت مجھے

شاکر حسین
(بڑلیل)

ٹوٹی چارپائی

وہ بہت غریب آدمی تھا۔ ایک نہایت بوسیدہ جھونپڑی میں رہتا تھا۔ یہ جھونپڑی اس کے بزرگوں نے گاؤں کے زمین دار کی اجازت سے تقریباً کئی سال پہلے بنائی تھی۔ جھونپڑی کا چھپر اب بارش اور دھوپ برداشت کرنے کے قابل نہیں رہ گیا تھا۔ برسات کے موسم میں وہ گاؤں کی چوپال پر سونے چلا جاتا تھا۔ بڑھاپے کے دن کام چوری کی عادت کی وجہ سے گاؤں والوں کی نگاہوں میں حقیر وہ اپنے دن مستی سے کاٹ رہا تھا جو بھی اثاثہ اس کے پاس تھا۔ اس میں تن کے کپڑوں کے علاوہ ایک ٹوٹی چارپائی بھی تھی۔ بچے بڑے ہو کر ادھر ادھر دانا پانی چگنے چلے گئے۔ بیوی غریبی سے لڑتے لڑتے ہار کر اس سرائے فانی سے کوچ کر چکی تھی۔ اب صرف وہی اپنے اس جھونپڑی نما محل میں تنہا رہتا تھا۔

اس کے گھر میں قدم رکھتے ہی سوائے ایک چارپائی کے کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اس کا ایک پایہ پچھلے دنوں گاؤں کے ساہوکار نے شہید کر دیا تھا اور اپنا سارا غصہ چارپائی پر اتار کر چلا گیا تھا۔ جاتے جاتے وارننگ بھی دے گیا تھا کہ ہفتہ بھر میں تین روپے واپس نہ کیے تو اس چارپائی کے باقی سبھی پائے بھی توڑ دوں گا۔ اس نے بڑی محنت سے چارپائی کو اس قابل بنایا کہ رات کو اس پر آرام کر سکے۔

یہ چارپائی اس کو اپنی ماں سے ورثے میں ملی تھی جو اس کی ماں اپنے جہیز میں لائی تھی۔ گزشتہ بیس سال سے اس کی بنائی چارپائی تھی اس جیسا کمزور، لاغر، نکما ہی اس چارپائی پر آرام کر سکتا تھا۔ دوسرا کوئی نہیں۔

جب بھی گھر میں بچے کی پیدائش کا وقت قریب آتا وہ اس چارپائی کو رسی سے باندھ کر اس کو مضبوط بنا دیتا تھا۔ بڑے فخر سے کہتا "میرے سبھی بچوں کی پیدائش اور پرورش اسی چارپائی پر ہوئی ہے۔ جاڑوں میں اس پر چادر بچھا کر بچوں کو سلا دیتا اور گرمی کے موسم میں تو یہ بے حد موزوں تھی۔

جب بھی دو۔ تین دن کے فاقے کے بعد قرض لینے کی نوبت آتی تو ساہوکار کے پاس جا کر عرض کرتا "حضور مائی باپ تین دن سے بھوکا ہوں۔ دو روپیے بھیک دے دو مع سود کے لوٹا دوں گا۔ اگر قرض نہ دے سکا تو گھر کی چارپائی آپ کی ڈیوڑھی پر پہنچا دوں گا۔" اس طرح یہ چارپائی آڑے وقت میں بہت بڑا سہارا تھی

گھر سے باہر جاتے وقت چارپائی کو جھونپڑی کے دروازہ پر کھڑی کر دیتا تھا تاکہ کتا اندر نہ آسکے۔

بڑے لڑکے کی شادی کے موقعہ پر اس نے چارپائی کو کسی نہ کسی طرح کس کر اندر بچھا دیا۔ دلہن جب پہلی رات اس پر لیٹی تو محسوس ہوا کہ گہرے گڑھے میں پڑی ہو۔ رات تو جیسے تیسے کاٹ لی مگر دوسرے دن اپنے آدمی کے ساتھ یوں میکے گئی کہ پھر کبھی سسرال واپس نہ لوٹی۔

ایک دن الکشن کے دوران ایک سابق منسٹر ووٹ کی خاطر گاؤں میں آدھمکے۔ گھومتے پھرتے اس کی جھونپڑی کے سامنے پہنچ گئے اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسی چارپائی پر بیٹھ کر گاؤں والوں کے سامنے بھاشن دینے لگے۔

"پیارے بھائیو! مجھے یہ جان کر بے حد حیرت ہو رہی ہے کہ اس گاؤں کے لوگ آج بھی چارپائی سے چپکے ہوئے ہیں۔ اپنی مثال پیش کرتے ہوئے بولے۔ ہم نے تو پچھلے الیکشن میں اپنی کامیابی کے بعد ہی اپنے گھر کی تمام چارپائیوں کو گھر سے رسٹی کیٹ کر دیا تھا۔ ہمیں یہ جان کر حیرت ہو رہی ہے کہ پورے گاؤں کے ایک گھر میں بھی ڈبل بیڈ نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ڈبل بیڈ کا استعمال کئی دہائیوں قبل شروع ہو چکا ہے اگر ہماری سرکار آئی تو ہم ڈبل بیڈ کا رخ گاؤں کی طرف ضرور موڑ دیں گے۔ چارپائی کے استعمال پر پابندی لگا دیں گے۔ اس کے بنانے والوں کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔ ہماری سرکار جلد سے جلد آپ کو ڈبل بیڈ کا سکھ پردان کرے گی۔ آپ کے آرام کے لیے گدوں کو باہر سے برآمد کیا جائے گا۔ ہم ۲۱ ویں صدی میں قدم رکھنے والے ہیں اور اس ملک کے باشندے ابھی تک چارپائی سے چپکے ہوئے ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ چند لوگوں نے چارپائی کو شاہی تخت بنا رکھا ہے۔ اس پر بیٹھ کر بھولی بھالی رعایا کے جھگڑے طے کرتے آرہے ہیں۔ خود چارپائی پر بیٹھتے ہیں اور رعایا کو زمین پر بٹھاتے ہیں اور اس طرح اپنی شان اور رتبے کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اگر چارپائی نہ ہوتی تو ایسا ہرگز نہ ہوتا۔ چارپائی نے ہم کو کاہل اور جاہل بنا رکھا ہے۔ اس پر آرام سے سو سو کر ہم نے پایا کم کھویا زیادہ ہے۔ ہم آرام میں پڑ گئے ہیں۔ گھر میں جب چارپائی نہ ہوگی ہم آرام نہیں کر پائیں گے۔ کام کریں گے ملک ترقی کرے گا۔ ہماری غلامی کا ایک سبب چارپائی بھی رہی ہے اسی کی بدولت انگریزوں نے ہم پر حکومت کی ہم کو غلام بنایا۔ انگریزی سرکار نے چند ہندوستانیوں کو چارپائی پر بیٹھ کر مقدمے سننے اور فیصلہ کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ انہی چارپائی والوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا دیش غلام بنا رہا۔ میں چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد چارپائی کو دیش نکالا دے دیا جائے۔

مجھے چارپائی سے بے حد نفرت ہے۔ آپ لوگ بھی نفرت کیجیے۔ اس کو دیکھ کر سر چکرانے لگتا ہے اس سے چپٹے لوگوں کو سمجھانا اور سمجھنا بے حد مشکل ہے جو اس پر سو گیا۔ جنم بھر کے لیے سو گیا اس پر سونے کا نشہ سب نشوں سے بڑھ کر ہے۔ آدمی بھوکا رہ سکتا ہے مگر چارپائی نہیں چھوڑ سکتا۔ لہٰذا آپ سے میری گزارش ہے کہ چارپائی سے دور رہیں۔ اور اپنا قیمتی ووٹ کرسی ہی کو دیں۔"

اس واقعے کے چند دن بعد ایک دوسرے نیتا جی ووٹ کی خاطر اسی گاؤں میں آپہنچے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ ان کا چناؤ نشان چارپائی تھا۔ نیتا جی نے گاؤں کے ایک میدان میں چارپائی بچھائی۔ اس پر بیٹھے تو نہیں مگر پائنتی کھڑے ہو کر لوگوں سے اس طرح خطاب کرنے لگے۔ بھائیو! چارپائی سب کی زندگی اور

موت کی ساتھی ہے۔ اس کے بغیر ہمارا آپ کا جیون ادھورا ہے۔ تھکا ہوا غریب رات کو اسی پر لیٹ کر دن بھر کی تھکان دور کرتا ہے۔ آرام دہ بیڈ والے رات کو گولی کھا کر سوتے ہیں مگر اس چارپائی پر بغیر گولی کھائے گہری نیند آتی ہے جب تک جہیز میں چارپائی کا چلن رہا کوئی بہو جلائی نہ گئی مگر جہیز میں ڈبل بیڈ کے داخلے نے بہوؤں کو جلوایا۔ پردیس میں آدمی کو گھر کی چارپائی کا سکھ بہت یاد آتا ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ چارپائی کا چلن کم ہو رہا ہے۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے ہمارے چناؤ نشان یعنی چارپائی پر مہر لگائیے تاکہ یہ روایت مٹنے سے بچ جائے۔ اگر یہ چارپائی ختم ہو گئی تو ہماری آپ کی زندگی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہماری آنے والی سرکار ہر طرح سے چارپائی کے استعمال کو ترقی دے گی۔ یہ ہماری تہذیب کی پہچان ہے۔ آج بھی دیش کی ستر فی صد جنتا اس کا استعمال کرتی ہے۔ جب سے ہمارے استعمال میں کرسی اور ڈبل بیڈ آیا، ہم غریب ہو گئے۔ سونے کی چڑیا کہا جانے والا دیش کیا تھا کیا ہو گیا۔ کھیت میں مچان پر بھی چارپائی کا کیا کہنا ہوا چلنے پر ایسا لگتا ہے مانو راکٹ کے ذریعہ کھیت کی رکھوالی کر رہے ہیں۔ آپ سے میری پرارتھنا ہے کہ آپ گھر کی چارپائی کو مضبوطی سے پکڑے رہیں۔ اس کی بقا کے لیے ہمارے چناؤ نشان چارپائی پر اپنی مہر لگائیے۔ بھگوان آپ کو اور چارپائی کو سلامت رکھے۔ دھنیہ واد۔

اسی دوران چند دن بعد وہ بے چارہ غریب گھر سے باہر چارپائی پر بیٹھا حقہ گڑگڑ کر رہا تھا کہ ادھر سے زمین دار صاحب کا گزر ہوا۔ غریب لفنگے کو اس طرح رعب جماتے دیکھ کر آگ بگولہ ہو گئے۔ اس وقت تو غصہ پی گئے مگر بعد میں اپنے چند نمک خواروں کو اس کی مزاج پرسی کے واسطے گھر پر بھیج دیا۔ انھوں نے اس بے چارے کو چارپائی سے نیچے پھینک دیا اور چارپائی لے بھاگے، بعد میں پڑوس میں بہتی گنگا میں اس کا جل پرواہ کر دیا۔ بے چارے کا ایک ہی تو سہارا تھا۔ وہ بھی جاتا رہا۔ ●

ہاجرہ بانو (اورنگ آباد)

سفر

اس سہ حرفی لفظ سے آپ اور ہم سبھی اچھی طرح واقف ہیں۔ بظاہر تو بہت ہی معمولی نظر آنے والا یہ لفظ اپنے اندر ایک عمیق و وسیع دنیا سمیٹے ہوئے ہے۔ اس لفظ سے تقریباً ہر انسان کا سابقہ پڑتا ہے۔ کسی کا زیادہ تو کسی کا کم۔ اکثر اسے پسند کرتے ہیں اور اکثر اس کا ذکر آنے پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ سفر کے موضوع پر کئی فلمیں بھی بنی ہیں اور بہت ساری فلموں کی کہانی کی اصل شروعات سفر سے ہی ہوتی ہے۔ ہمارے قارئین کمال امروہی کی بے مثال فلم "پاکیزہ" تو بالکل نہیں بھولے ہوں گے جس میں ہیرو راجکمار کی پہلی ملاقات ہیروئن مینا کماری سے ٹرین کے کمپارٹمنٹ میں ہوتی ہے اور پھر اس سفر سے ہیروئن مینا کماری کی زندگی کا سفر بالکل بدل جاتا ہے۔ ہماری فلم انڈسٹری کی ایک اور زبردست پیشکش تھی اس فلم کا نام ہی "سفر" تھا۔ جسیں گورکھے کی طرح نظر آنے والے ہیرو راجیش کھنہ نے اپنا سفر نبھایا تھا ہمارا مطلب کردار نبھایا تھا۔

خیر ہم بات تو کر رہے تھے سفر کی۔ سفر کرنے والے کو مُسافر کہتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اگر مسافر لفظ سے قبل بیچارہ جوڑ دیا جاتا۔ تو بہتر تھا کیوں کہ سفر کی مسافت طے کرنے کے بعد مسافر شناخت کے قابل نہیں رہتا۔ اس کا سامان تتر بتر رہتا ہے۔ چہرے پر چار سینٹی میٹر کی دبیز دھول و گرد کی تہہ جمی ہوتی ہے۔ بال کسی بے جان ہیرو کی وگ کے مانند ہو جاتے ہیں۔ کپڑوں پر دوسرے مسافروں کی غذا اور قئے کے دھبّے پڑے ہوتے ہیں جو چیخ چیخ کر خود کو کسی قیمتی اور طاقتور صابن سے صاف کرانے کا تقاضا کرتے ہیں جب تک مُسافر اپنی منزلِ مقصود پر پہونچ کر دو گھنٹے کی محنت کے بعد خود کو صحیح حالت میں واپس نہیں لاتا آپ اس کی قدرتی شکل و صورت سے واقف نہیں ہو سکتے ——— سفر میں بہت سارے تجربات پوشیدہ رہتے ہیں جو مسافر پر یکے بعد دیگرے نمایاں ہوتے رہتے ہیں۔ لوگوں کی خود غرضی، صرف اپنی سہولت، انسانیت سے بے نیازی، وقتی دوستی کے بہانے آپ کی جیب کا وزن کم کرنا، آپ کی ذاتی زندگی میں بلا خوف و خطر دخل دینا وغیرہ وغیرہ ان تمام باتوں سے مسافر کو گزرنا پڑتا ہے اور اگر اس کا سفر پانچ، چھ گھنٹے کے اوپر ہو تو اس کا اللہ ہی حافظ ہے۔ اس وقت اسے ان دقیانوسی اور روایتی جملوں کی شدت سے یاد آتی ہے جو اس نے گھر سے نکلتے وقت اور سفر شروع کرنے سے پہلے سُنے تھے کہ "سنیئے جی! ذرا اپنا خیال رکھنا۔ سفر بہت طویل ہے۔ اگر ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تو یہ مفلر لپیٹ لینا اور یہ سوئٹر پہننا مت

بھولنا. ہاں فلاں مقام سے تھوڑا درجہ حرارت بڑھ جائے گا تو کھڑکی کے قریب بیٹھ جانا اور ہاں کھانے، چائے وغیرہ کا بھی خیال رکھیے گا" مگر یہ ساری باتیں سفر کے لیے قدم باہر رکھتے ہی بھولنی پڑتی ہیں کیوں کہ یہاں تو مشکل سے آپ کو جسم کا آدھا حصہ ٹکانے کی جگہ میسر آتی ہے اور کبھی کبھار تو ٹوائیلٹ کے قریب بیٹھنا پڑتا ہے ایسی جگہ بیٹھ کر آپ چائے، کھانے وغیرہ کا کیا خاک خیال رکھیں گے.

ایسا مت سمجھیے کہ سارے سفر میں اسی طرح کے برے تجربات سے دوچار ہونا پڑتا ہے. ایسا بالکل نہیں ہے جس طرح سکے کے دو رخ ہوتے ہیں سفر کی بھی دو صورتیں ہوتی ہیں ایک بھیانک تو دوسری حسین و جمیل بھیانک سفر کی تو ایک جھلک ہم بتا ہی چکے ہیں دوسرے خوبصورت اور حسین سفر کے بارے میں کیا بتائیں اس کی جھلک ہمیں فلموں میں زیادہ نظر آتی ہے اس خوبصورت سفر میں آپ کو کوئی ایسا ہمدرد مل جاتا ہے جو زندگی کی اونچ نیچ اور ناہموار راستوں کے بارے میں آپ کو اپنے تجربات سنا کر آپ کی معلومات میں اضافہ کرتا ہے یا پھر زندگی بھر کے لیے آپ کا ہم سفر بن جاتا ہے. ایسے ہمدرد، مخلص اور کبھی نہ ساتھ چھوڑنے والوں دوستوں کے ساتھ سفر بہت خوشگوار ہوتا ہے اور زندگی بھر میٹھی کسک بن کر دل کے گوشے میں محفوظ ہو جاتا ہے.

سفر چاہے بس کا ہو، ٹرین کا ہو، ہوائی جہاز کا یا پھر زندگی کا ہو. سفر آخر سفر ہے اس ذی روح کو ایک نہ ایک دن ضرور اس کا مزہ چکھنا ہے اور اس سفر میں پیش آئی ہوئی کھٹی میٹھی یادوں کو دل میں چھپا کر زندگی کا سفر طے کرنا ہے.

دلشاد رضوی
(حیدرآباد)

کہاں گئے وہ دن

اس بار بقرعید پر ہمیں ایک قصہ بلکہ واقعہ یاد آیا۔ آپ بھی سن لیجیے۔ یہ واقعہ نہ تو راجہ پورس کے دور کا ہے نا ہی چندر گپت موریا کے زمانے کا بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ ہم خود اس واقعے کے چشم دید گواہ ہیں۔ اس وقت ہم بالکل اسی طرح بقیدِ حیات تھے جیسے فی زمانہ ہیں۔ ہوا یوں تھا کہ ایک دفعہ ہمارے والدِ مرحوم کا تبادلہ ایک نئے مقام پر ہوگیا۔ ہم جب اپنے ساز و سامان کے ساتھ وہاں پہنچے تب شام ہو چکی تھی۔ تاہم گاؤں میں دھوم مچ گئی کہ نئے مددگار صاحب آ گئے ہیں۔ اب جیسے ہی سویرا ہوا پورا تیا تلا چار سیر تازہ تازہ گوشت کوئی ہمارے گھر دے گیا۔ سب حیران تھے کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ تاہم گوشت خوری میں دن گزر گیا جب دوسرے دن کا سورج طلوع ہوا تو پھر وہی واقعہ پیش آیا۔ یونہی پورے چار دن گوشت کھاتے بلکہ کباب بناتے گزر گئے اور کسی کے کچھ پلے نہ پڑا کہ صبح صبح کون یہ عنایت کر جاتا ہے۔ لیکن والد ٹھیرے پولیس آفیسر۔ ان سے بھلا کہاں کچھ چھپا رہ سکتا تھا۔ انھوں نے فوراً گاؤں کے قصاب کو بلوا بھیجا۔ یوں بھی پولیس آفیسر کا بلاوا کسی بھی شخص کے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ پھر قصاب تو بے چارہ ویسے بھی کوئی صاحب بہادر نہیں ہوتا' وہ تھر تھراتا کانپتا والدِ مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ والد نے اسے ڈانٹ پلاتے ہوئے پوچھا کہ بتا تو نے یہ حرکت کیوں کی۔ بھلا کس کی اجازت سے اتنا گوشت مسلسل بھیجتا رہا۔ وہ گڑگڑا کر بولا "حضور میں نے کونسا گناہ کیا ہے۔ جمادار، جمعدار کو ایک سیر امین صاحب کو دو، صدر امین کو تین اور مددگار صاحب بہادر کو یومیہ چار سیر گوشت بھیجنا تو ہماری خوش قسمتی ہے۔ والد یہ جواب سن کر چراغ پا ہو گئے۔ کھڑک کر بولے بکواس بند کر۔ خبردار جو آئندہ ایسی حرکت کی۔ ہمارا ملازم روزانہ پیسے چار آنے لے کر آئے گا اسے ایک سیر تازہ تازہ گوشت دے دینا۔ یاد رہے کہ گوشت میں کوئی خرابی نہ ہو۔ قصاب یہ سن کر بلا مبالغہ ان کے قدموں پر گر گیا۔ کہنے لگا۔ حضور اتنا ظلم نہ کریں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ سرکار کو صرف ایک سیر گوشت پیش کروں۔ اور وہ بھی قیمت لے کر۔ والد نے پھر دیدے نکالے

لیکن اس سے قبل کہ وہ کچھ بول پاتے قصاب یوں گویا ہوا - سرکار ہم شام میں گوشت سستا کر دیتے ہیں صبح صرف چار گھنٹوں میں (سولہ پیسے میں) ایک سیر فروخت کر دیا کرتے ہیں - آپ کم از کم اتنا کرم کریں کہ صبح ہی اس بھاؤ سے منگوا لیں - والد اس کی عاجزی سے متاثر ہو گئے - تاہم پولیس کے ٹھکانہ پہنچ کر کہنے لگے "ٹھیک ہے" چنانچہ اب معمول بن گیا تھا کہ جان روزانہ سولہ پیسے لے جاتا اور ایک سیر عمدہ گوشت لے آتا جو ہمارا چھوٹا سا خاندان سیر ہو کر کھاتا - بقر عید آئی - والد نے جان کو بلوایا اور سویرے سویرے اسے نئے زعفرانی رنگ کے دس دس روپیوں کے چار نوٹ دیے اور یوں تاکید فرمائی کہ دیکھو! بکرا تو ویسے آٹھ روپے میں بک جاتا ہے لیکن یہ معاملہ چونکہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا ہے یہاں پیسہ بچانا مقصود نہیں - بھلے تمھیں دس روپے فی بکرا ہی کیوں نہ خرچ کرنا پڑے لیکن خیال رہے کہ بکرے اونچے پورے، بھاری بھرکم بغیر دم و کان کٹے ہوں - پورے چار بکرے لے آؤ - جان نے ادب سے سیلوٹ کیا اور پھر ساڑھے آٹھ روپے فی بکرا کے حساب سے ایسے خوش نما بکرے لے آیا کہ انھیں دیکھ کر سب ہی باغ باغ ہو گئے - والد نے خوش ہو کر اسے ایک روپیہ انعام میں دے دیا - وہ دعائیں دیتا ہوا کہنے لگا کہ سرکار آج تو جلیبی بھر ایک سیر مٹھائی اپنے بچوں کے لیے لے جاؤں گا -

اس بار بقر عید میں ہم نے جب چار ہزار روپے نقد خرچ کیے اور اوسط قسم کے دو عدد بکروں کی قربانی دی تو گزرے ہوئے دن انھیں آنکھوں میں پھر گئے جو تب بھی تھیں بس فرق صرف اتنا ہے کہ اب ان پر چشمہ لگا ہے جو پہلے نہیں تھا - ویسے تو بیتا ہوا وقت اور گزرا ہوا انسان بھلا کہاں واپس آتا ہے - لیکن بالفرض محال اگر والد مرحوم اتفاقاً کبھی لوٹ آئیں تو اور کچھ نہ سہی لیکن قیمتوں کی ان نیرنگیوں کو دیکھ کر انھیں ملک عدم سے واپسی کا غم ضرور ستائے گا - لیکن ہم بہت ہمت والے ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو اب تک بھلا جیتے کیسے رہتے - یہ اور بات ہے کہ شاعر ہونے کے ناطے اناپ شناپ مصرعے گنگناتے رہتے ہیں - جیسے: " یادِ ماضی عذاب ہے یارب " وغیرہ وغیرہ - لیکن اس کی پرواہ ہم نے کبھی نہیں کی کہ ایک سو دس روپے فی کیلو کے حساب سے گوشت کیسے کھائیں - چنانچہ پابندی سے منگواتے اور ڈٹ کر کھاتے ہیں - البتہ ٹائم ٹیبل میں معمولی سی تبدیلی کر لی ہے - وہ آپ مہربانی کر کے کسی غیر کو نہ بتائیں - ہم کرتے یہ ہیں کہ ہر آٹھویں دن آدھا کیلو گوشت منگوا کر اپنے فریج میں رکھ لیتے ہیں اور روزانہ بلا ناغہ چکھ لیا کرتے ہیں تاکہ کوئی ہم پر خالص ویجیٹیرین ہونے کا لیبل نہ چسپاں کر دے - ہاں البتہ یہ ضرور... سوچتے ہیں کہ کہاں گئے وہ دن !"

حاکم حسین
(بھوپال)

اللہ کا مکان بندہ نگہبان

کچھ روز سے حاجی لڈن بہت زیادہ پریشان نظر آ رہے تھے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ جن الجھنوں میں مبتلا ہیں وہ دراصل ان ہی کی جنم دی ہوئی ہے (یہ عجیب اتفاق ہے کہ وہ مذکر ہوتے ہوئے بھی جنم دیتے ہیں)

حاجی لڈن محلہ کے ایک بزرگ و معمر شخص ہیں۔ کئی کاروبار میں یکتا مزاج میں وسعت نظر کا دخل پسند نہیں کرتے ہیں۔ شک کرنا ایک شرعی فریضہ کی طرح ادا کرتے ہیں۔ بخالت اور کفایت شعاری کے اتنے دلدادہ ہیں کہ اگر کوئی صرف اتنا کہہ دے کہ شکر بازار سے چاول کلو پیچھے دس پیسے کم نرخ پر فروخت ہو رہی ہے تو وہ چار کلومیٹر کا سفر کرکے اسے حاصل کرنے میں بہت خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اس دس پیسے کی بچت سے مانو ان کا دو سیروں خون بڑھ گیا ہو۔ چاہے اس میں ان کی کتنی ہی توانائی خرچ کیوں نہ ہوئی ہو۔ اس کی وہ پرواہ نہیں کہ دس پیسے بچانا وہ ایک کارنامہ مانتے ہیں۔

باوجود ان تمام اوصاف کے حاجی لڈن کو محلے کے بچوں کی تعلیم کی بھی بہت فکر رہتی ہے اور اس کے لیے انھوں نے ایک ادارہ قائم کیا ہے جو غریب بچوں کی فیس اور کتابوں کے لیے امداد کرتا ہے۔ اس ادارہ کی آمدنی کا ذریعہ کچھ غیر منقولہ جائیدادیں ہیں جن کے کرائے کی آمدنی سے ادارہ ان اخراجات کو پورا کرتا ہے۔ اسکول فیس ہر مہینہ کی ۱۵ سے ۲۰ تاریخ تک تقسیم ہوتی ہے جس کے لیے ایک خاص وقت مقرر ہے۔ گھڑی کی سوئیوں پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے۔ اگر وقت پورا ہونے کے بعد کوئی آئے تو انھیں غیر مستحق قرار دے دیا جاتا ہے۔ فیس کی رقم حاصل کرنے والوں کو پورے ساز و سامان اور فرشی سلام کے ساتھ حاضر ہونا پڑتا ہے۔ دستخط کے لیے قلم کا ساتھ ہونا بہت ضروری رہتا ہے کیونکہ لڈن دادا اپنا قلم دینا خلاف قاعدہ سمجھتے ہیں۔ ایسی نازیبا حرکت کی سزا میں نام خارج کر دیا جاتا ہے۔ اسکول سے جاری کی ہوئی رسید ٹھیک اس طرح صاف اور خوش خط ہونا چاہیے جیسے چھاپہ خانہ سے چھپ کر نکلی ہو۔ اگر اسکول والے نام یا پتہ لکھنے میں کوئی غلطی کرتے ہیں تو وہ حاجی

لڈن کی کمائیوں کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ فیض حاصل کرنے والے کو یہ یقین دہانی بھی کرانی پڑتی ہے کہ جب اس پیشے سے تعلیم حاصل کرکے کسی عہدے پر پہنچے گا تو حاجی لڈن کو بہ سر و چشم اپنا محسن مانے گا اور برسر روزگار ہونے کے بعد وہ اپنی آمدنی کا کچھ حصہ اس ادارہ کو بھی بہ حیثیت امداد پیش کرے گا۔

حاجی لڈن اس نیک ادارہ کی آمدنی سے خود کی تنخواہ تو ضرور لیتے ہیں مگر محلہ کے دیگر اصحاب کو جو ان کی معاونت کرتے ہیں یہ کہہ کر خوش رکھتے ہیں کہ چوں کہ وہ اللہ کا کام کر رہے ہیں۔ اس لیے انھیں ثواب ہی پر اکتفا کرنا چاہیے اور اس کا اجر انھیں دوسری دنیا میں ملے گا۔ خود بھی یہ کام آخرت کے لیے کر رہے ہیں۔ آخرت کا نظارہ وہ اس طرح کراتے ہیں جس سے لگتا ہے کہ شاید وہ ایک آدھ چکر ادھر کا مار کر سب جائزہ لے کر آتے ہوں۔

آمدنی کا خاص اور واحد ذریعہ چند غیر منقولہ جائیدادیں ہیں جنھیں حاجی لڈن نے لوگوں سے یہ کہہ کر خریدا ہے کہ وہ ان کا مکان اللہ کو بیچ رہے ہیں اور انھیں یہ مکان یا دکان بیچ کر فخر کرنا چاہیے تا کہ اللہ نے ان کا یہ مکان قبول کر لیا اور اس طرح فروخت کنندہ نے اپنی جگہ جنت میں محفوظ کر لی ہے۔ جنت کے عجیب عجیب نظارے وہ کراتے ہیں اور جائیداد فروخت کرنے والا جنت کی لالچ میں آکر کم قیمت پر اپنی جائیداد حاجی لڈن کے ادارہ کو سپرد کر دیتا ہے۔

جن کرایہ داروں کو اللہ کے ان مکانات میں بسیرا کرنے کا موقع نصیب ہوتا ہے۔ وہ بھی اللہ ہی کے کرایہ دار ہوتے ہیں۔ حاجی لڈن یا ان کے ادارہ کے نہیں اور اگر کرایہ دار نے کبھی بھولے سے بھی کوئی خلاف ورزی کی تو اسے یہ کہہ کر ڈرایا جاتا کہ روز حشر اس کا بھی حساب کتاب ہوگا۔ جب اس کرایہ دار نے روز حشر کا نام سنا اور جہنم کی آگ کی تکالیف کو محسوس کر لیا تو حاجی لڈن کا کام ہو گیا۔ فوراً حاجی صاحب کے قدموں پر گر پڑتا ہے اور معافیاں مانگ کر اپنے گناہ بخشوانے کی استدعا کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض اوقات کچھ کرایہ دار ایسے بھی مل جاتے ہیں جو ہمارے سیاسی رہنماؤں کی طرح وعدہ کرکے مکان میں داخل تو ہو جاتے ہیں لیکن پھر جس طرح کرسی ملنے پر سیاسی قائدین طوطا چشمی کرتے ہیں اسی طرح حاجی لڈن بھی دھوکا کھا جاتے ہیں لیکن یہ ہوتا بہت کم ہے۔

حاجی لڈن جب بھی کسی ٹیکسی یا سٹی بس میں سفر کرتے ہیں تو بس کنڈکٹر کو مقررہ کرایہ سے کم پیسے دینا اس لیے جائز بتاتے ہیں کہ بس کنڈکٹر کا کم کرایہ لینا بھی داخل ثواب ہے کیوں کہ وہ کوئی تفریح کرنے یا کسی معشوق کی مزاج پرسی کو نہیں جا رہے ہیں بلکہ وہ اللہ کے مکان کی خیریت پوچھنے جا رہے ہیں۔ اس لیے انھیں رعایت حاصل کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ بے چارہ کنڈکٹر بھی بنتے ہوئے تحفہ اس لیے برداشت کر لیتا ہے کہ سٹی بس میں جہاں سینکڑوں لوگ بنا ٹکٹ سفر کر کے اپنا ایمان تباہ کر رہے ہیں وہاں یہ بے چارا کسی نیک کام کے لیے ہی تو پیسے گنوا رہا ہے۔ غرض یہ کہ حاجی لڈن بار بار اللہ کے مکان کا فقرہ دہراتے ہیں تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فقرہ ان کا تکیہ کلام ہو گیا ہے۔

آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ شاید حاجی لڈن کا دنیا میں کوئی وارث نہیں ہے اسی لیے اس غرض سے انھوں نے اپنی تفریح کا یہ سامان مہیا کر رکھا ہو لیکن حاجی لڈن کے چراغ تلے اندھیرا ہے۔

جو فیح انھوں نے کھڑا کی ہے وہ اتنی مہلت نہیں دیتا کہ وہ اللہ میاں کی تنہائیوں کو قبول کرتے۔ لیکن وہ خود اس سے مستثنیٰ کیسے ہو سکتے ہیں۔ ورنہ جو شخص دوسروں کو تعلیم دلاتے ہیں اتنا فکر مند ہو وہ خود اپنی اولاد کو تعلیم دلانے میں کتاہی کرتا ہے۔

ہندوستانی تہذیب میں خوش حالی بھی بڑی نعمت ہے۔ ہمارے حاجی لڈن حاد اس چاشنی کو آغاز ہی میں چٹ کر گئے۔ جوں جوں عمر پختگی کی منزلیں چڑھنے لگی۔ مٹھاس تلخی میں بدل گئی۔ یا یوں سمجھیے کہ جوں جوں اللہ میاں کی قربت میں پہنچنے شروع ہوئے توں توں اپنی ذرّیت کو اللہ کا حریف سمجھ کر ان سے دور ہوتے گئے۔ بیوی بچوں کے متعلق ہر وقت رونا رویا کرتے ہیں۔ فرماں بردار نہیں ہیں۔ کون سمجھائے کہ حضرت یہ خوبیاں طفلی سے ہی تربیت سے پروان چڑھتی ہیں۔ آپ نے انھیں محبت نہیں دی ہے اس لیے آپ ان سے محبت کیسے واپس مانگ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ سے دور رہنے میں وہ اپنی نجات سمجھتے ہیں۔ ویسے بھی بڑھاپے میں "ناخلف اولاد" والدین کو بوجھ سمجھتی ہے اور کسی آشرم میں داخل کروا کے بڑا ناز کرتی ہے۔ لیکن ہمارے حاجی لڈن خود دوسروں کے غم گسار بنتے ہیں۔ وہ پہلے خویش "پیر درویش" پر عمل نہیں کرتے ہیں۔

جب بھی راستہ میں کبھی ملاقات ہو جائے۔ علیک سلیک کے بعد اللہ کا مکان اور اولادوں کا غم سنا کر آپ کو بھی اپنا شریک غم بنا لیتے ہیں۔ بس چھیڑ دیجیے کہ کرایہ داروں سے کیسے نبھ رہی ہے۔ کیا فلاں کرایہ دار کی ریشہ دوانیاں۔ کہ مکان کرایہ پر حاصل کرتے وقت اس نے کیا کیا حلف لیے تھے۔ کون کون لوگ اس کے ضامن تھے۔ لیکن اب کرایہ کی ادائیگی پر آنکھ دکھاتا ہے۔ فلاں قانون کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ نئی نئی فرمائشیں کرتا ہے۔ دیکھ لوں گا حرام خور کو عدالت میں ناک چنے چبوا دوں گا۔ اللہ کے مکان میں گھسا ہوا ہے لیکن افسوس اس بات پر ہے کہ اللہ میاں نے اس نادہند کرایہ دار کو اسی طرح بے دخل نہیں کیا جس طرح وہ مخلوق کو دنیا سے کرتا ہے۔

عجیب کردار کا حامل ہے یہ اللہ میاں کا کرایہ دار جو اللہ کو خوش رکھنے میں بندوں کی درگت بناتا ہے اور جو شاید یہ نہیں مانتا کہ خود اللہ نے یہ دنیا اپنے بندوں کے ہی لیے تخلیق کی ہے۔ تمام لذتیں اور آسائشیں خدا نے بندوں کے اختیار میں دی ہیں۔

○○

ڈاکٹر امید کر یونیورسٹی، روڈ نمبر 46 جوبلی ہلز
حیدر آباد 500033

★ غذا العنتغنی سرٹی فیکیٹ کورس کا آغاز ہو چکا ہے

★ ۹۶-۱۹۹۵ء تعلیمی سال سے بی ایس سی، بی کام اور بی اے اردو میڈیم کا آغاز ہو گا۔
تفصیلات کے لیے شعبۂ اردو سے ربط پیدا کیجیے۔

محمد فاروق نشتر
(میسور)

احمد جلیس کی یاد میں.....!!!

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

جلیس بھائی ہم سے جدا ہو گئے۔ پہلے دورہ سے ایک ماہر جنگجو کی طرح لڑ لیا تھا لیکن دوسرے دورے نے کاری ضرب لگائی۔ عقل گم ہے کہ کیا — واقعی جلیس نے موت پالی ہے۔

جلیس بھائی بقول حیدرآباد' پرسوں یعنی ۲۹ رمارچ ۹۶ء کو صبح ۱۱ بجے ہمارے ساتھ "دفتر القان" گلبرگہ پر تھے۔ میں اسی دن کرناٹکا ایکسپریس سے کرناٹک اردو اکادمی کے زیر اہتمام منعقدہ "شام ظرافت" میں مضمون سنانے کے لیے پہنچا تھا۔ اور جلیس بھائی اسی غرض سے ادیان ایکسپریس سے آئے تھے۔ جوتا اتارتے ہوئے بولے "ارے نشتر! تم کب آئے؟" میں نے جواب دیا۔ "بس جلیس بھائی۔ آپ سے تین گھنٹے پہلے پہنچا ہوں' والدہ محترمہ ساتھ تھیں' ورنہ ارادہ تھا کہ آپ ہی کے ساتھ گلبرگہ کے لیے نکلوں' جلیس نگاہوں میں شکایت تھی اور خوشی بھی۔ شکایت یہ کہ — تو میرے ساتھ نہیں آیا' اور خوشی یہ کہ چلو آ تو گیا۔ کہا "چلو اچھا کیا' پروگرام تو کل ہے ہم آج ہی سے اکمل کو مہمان نوازی کی سعادت بخش دیتے ہیں۔" پھر دفتر القان پہ شمع جلیس کے پروانے منڈلانے لگے۔ حامد اکمل تو مہمان نوازی کے لیے کمر کس چکے تھے کہ وحید انجم' مختار احمد منو' امجد علی فیض اور دیگر ادبی' سیاسی و سماجی احباب نے جلیس بھائی کو گھیر لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تنہا احمد جلیس اسم بامسمیٰ ہو گیا۔

جلیس بھائی کی ہر محفل ایک خاص موضوع پر ختم ہوجاتی۔ وہ مختلف الخیال احباب کی گفتگو کا ایڈیٹ کر کے ایک مخصوص سماں باندھ لیا کرتے تھے۔ اسی ایڈیٹنگ کی بدولت ان کی ہر محفل ایک جامع مضمون معلوم ہوتی۔ اس دن کی گفتگو کا حاصل بھی ایک خاص موضوع تھا۔ ادبی' سیاسی' سماجی اور ناظر الدین کی نجی زندگی کے بجائے اُدھر چھوڑ کر جلیس بھائی اپنے ریٹائرمنٹ کے بعد کی زندگی کو موضوع بناتے رہے۔ گلبرگہ ہی کو مستقر بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ جہاں آبادی میں مکان کا خاکہ بھی بنا لیا تھا۔ حیدرآباد سے وہ اور ان سے حیدرآباد بہت دور ہو چکا تھا۔ یہ میرا ذاتی احساس ہے کہ گفتگو سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ گلبرگہ میں ایک نیا حیدرآباد' آباد کرنے کے

دم لیں گے۔ جمعہ کی نماز بھی خلاف توقع نہایت خشوع و خضوع سے عثمانیہ مسجد میں ادا کی۔ حامد اکمل نے پرتکلف ضیافت کا اہتمام کر دیا تھا۔ احمد علی فیض کی محنت شاقہ سے تیار کروایا ہوا۔ بھونا ہوا گوشت، جوار کی روٹی، دال اور چاول، دفتر الفیضان کو دستر الفیضان بنا چکے تھے۔ کھانے اور جینے کا لطف لینا جلیس بھائی خوب جانتے تھے ایک جلے ہوئے گوشت کے ٹکڑے سے کوئلے کا ریزہ جدا کرتے ہوئے بولے۔ "اس گوشت کا مزہ تو انھیں کوئلے کے ٹکڑوں اور ان کی بھینی بھینی خوشبو سے ہے۔"

کولار میں ایک اردو کانفرنس میں شرکت کے بعد فضل الدین نور [illegible] کی دعوت پر بنگارپیٹ جانا ہوا۔ وہاں شوربے میں تیرتی اور پلیٹ میں تلی ہوئی مچھلی کے رموز و نکات دسترگری اس طرح آشکار کرتے رہے کہ میں نے محسوس کیا جیسے زندگی میں پہلی بار مچھلی کھا رہا ہوں۔ اب تک جتنی مچھلی کھائی ہے وہ ایام جاہلیت کے گناہوں کے برابر تھی۔ مچھلی سامنے ہو یا گوشت یا پھر اپنے ریٹائرمنٹ کا موضوع وہ ہر خیال کو لطف کی رعنائیوں سے مزین کر دیتے

جو کھایا ہے میری نظر میں بس وہ انتخاب بہار ہے

جلیس بھائی کے قلم سے نکلا ہوا آخری شہ پارہ "بشیر میاں" کا خاکہ ہے جو ایک باورچی کی شان میں لکھا گیا۔ اسی خاکہ کو جلیس بھائی نے گلبرگہ کی "شام ظرافت" میں سنایا تھا۔ یہ خاکہ جلیس بھائی نے پروگرام کے دن یا اس سے پہلی والی رات فہیم الدین پیرزادہ کے مکان پر لکھا تھا۔ انھوں نے کوئی کام منصوبہ بند نہیں کیا۔ صرف اپنا شرٹ خریدتے وقت خیال رکھتے کہ وہ آسمانی رنگین ہو کہ کیمرہ چندھیاتا رہے۔ رہا منصوبہ بند کام ریٹائرمنٹ کے بعد کرنا چاہتے تھے۔ شاید وہ اس لیے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا کہ بعض انسانی عادتوں کی [illegible] بھی عادی ہو جاتی ہے۔

"جو اچھی طرح جیتا ہے وہ دوبارہ جیتا ہے" یہ لاطینی کہاوت ہے جو جلیس بھائی کی زندگی پر صادق آتی ہے۔ وہ آج بھی اپنے دوستوں کے دلوں میں زندہ ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کو دوستوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ دوستوں کی خوشیوں کو وہ زیادہ برتتے تھے اور دوستوں کے غموں کو ہلکا کرنے میں وہ ماہر تھے۔ یہی وہ زاد راہ تھا جو جلیس بھائی اپنے ساتھ لے گئے ورنہ اس غم، رم اور بم سے بھری دنیا میں کیا رکھا ہے۔ دوستوں کی ترقی ان کی ترقی تھی اور دوستوں کا تنزل ان کا تنزل تھا۔

حامد اکمل کو میسور یونیورسٹی نے گولڈ میڈل سے نوازا۔ حامد اکمل حسب عادت و حسب شامت گولڈ میڈل کو لے کر مجھے لیے جلیس بھائی کے یہاں پہنچے (جلیس بھائی کو ہمیشہ سے یہ گلہ تھا میرے نظر آنے کے لیے حامد اکمل کا پس منظر کیوں ضروری ہوتا ہے۔ وہ کہتے ۔۔ کبھی کبھی اکمل کو عقل کی طرح چھوڑ کر آجایا کرو) صفیہ بھابی کے گلے [illegible] گیا ہے۔ یہ فالج عجیب ہے جس نے صفیہ بھابی کی صرف آواز چھین لی۔ اس وقت جلیس بھائی کافی کمزور اور مضمحل معلوم ہو رہے تھے۔ مونچھیں بھی رکھ لی تھی۔ جس سے تازہ تازہ خضاب کے [illegible] تھے۔ حامد اکمل نے ایک پھبتی کسی "جلیس بھائی، آپ نے تو مونچھیں وہ غنڈے کی اداکاری کے لیے لگائے تھے۔ کیا اتنا بھول گئے"... یہ سن کر جلیس بھائی مسکرا کر [illegible] بن گئے۔ حالانکہ ان سے اتنی سنجیدگی کی توقع نہیں تھی۔ میں نے بھی ایک جملہ کسا "چلو... اب تو ہم [illegible] کہہ سکتے ہیں کہ ہم جلیس بھائی کو اس دن سے جانتے ہیں جبکہ جلیس بھائی کی مونچھیں بھی نہیں نکلی تھیں۔" یہ وار بھی خالی گیا۔ وہ صفیہ بھابی کے مرض کو چوبیس گھنٹے اپنے

غیر متوازن کردہ حصوں پر لادے رہنے لگے تھے۔ ورنہ حامد اکمل کے اور میرے جملے کے بعد کوئی ایسا جملہ ضرور کہتے جو یادگار رہتا۔ شاید وہ اپنے محسن قومی کو آئینہ دکھا کر بتانا چاہتے تھے کہ ابھی تو میں جوان ہوں اور ضعیفہ کی بیماری کی ایسی کی تیسی کر کے رکھ دوں گا۔

جلیس بھائی آواز اور روشنی (Light and Sound) کے آدمی تھے۔ عجیب بات ہے کہ قدرت نے پہلے تو ان سے ہم جلیس و شریکِ حیات کی آواز چھین لی اور آواز کی محرومی کے غم نے ایک ہنستے بولتے جلیس بھائی کو پہلے نڈھال کیا پھر ان سے زندگی کی روشنی چھین لی۔ اس فالج کے اطلاع کی بجلی مجھ پر ریسیور میں گری تھی۔ میں عیادت کو عبادت تصور کر کے ثواب کا لالچی بنا حامد اکمل کے ساتھ چل پڑا۔ یوں بھی حامد اکمل مجھے کب بخشنے والے تھے۔ وہ جب بھی میسور آتے تھے مجھے بھگا کر اور جلیس بھائی تک لے آتے تھے۔ پھر ان کے گھر کو لوٹنے تک جلیس بھائی کے دفتر، گھر اور پھر دفتر کے مزے لوٹنا میرے فرضِ منصبی اور غیر منصبی میں شامل رہتا۔ اس سے پہلے کہ عیادت کرتو، جلیس بھائی نے حامد اکمل کو اس طرح چپٹا لیا جیسے کوئی باپ اپنے لائق بیٹے کو اس کی کامیابی پر گلے لگا لیتا ہے گولڈ میڈل کو الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ اس زمانے میں انھیں اس قدر خوش دیکھ کر جی خوش ہوا تھا کہ چلو! آج بھی ہم ایسے لوگوں کے درمیان ہیں جن کی خوشی سے اخلاص کی خوشبو آتی ہے۔ خوش ہونے کی حد کو پا لیا تو دوپہر کے کھانے کا انتظام بہ نفسِ نفیس اپنے ماہر دستِ مبارزت سے کیا۔ ہر خیال کو رعنائی دینے کے لیے وہ جنگی پیمانہ استعمال کرتے تھے۔ خاکہ لکھنا ہو، نظامت کرنا ہو، معمر شعرا کی نقالی کرنا ہو، یا باورچی خانے میں ڈٹ جانا۔ کہیں کوئی کسر اٹھا رکھنے کے عادی نہیں تھے۔ جس وقت میں حامد اکمل اور ایک اور مہربان دوست جلیس بھائی کے یہاں پہنچے تو اسی وقت جلیس بھائی سودا سلف لے کر بیٹھے تھے اور ایک ڈیڑھ گھنٹے میں بگھارے بیگن سا مسالہ دار سالن، دو گوشتہ بریانی اور ڈبل کا میٹھا پر دس دیا تھا۔ اس دوران طفنا اطہر سے کاروباری، حامد اکمل سے صحافت پر، صفیہ بھابی سے مختلف مسائل پر باتیں بھی کیں۔ خوشی کا اظہار کر سکتے ہیں۔ فالج کا جغرافیہ اور تاریخ بھی بیان کی۔ قائم سگریٹوں سے دھواں بھی چھوڑا اور پکوان کا ذائقہ بھی نہ چھوڑا۔

ان کی دوستی میں عمر کے لحاظ اور تکلف کو دخل نہیں تھا۔ حمید الماس اور طفنا اطہر دونوں سے گاڑھی چھنتی ہے۔ ایک غیر رسمی گفتگو کے دوران میں نے جلیس بھائی کو یہ یاد دلانا چاہا کہ قبلہ ان کے والد سے بھی آپ کی آشنائی ہے مگر یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ:

چاکِ دامن گل کو رفو نہیں کرتے

جلیس بھائی کو ادب اور فنونِ لطیفہ سے شغف ورثہ میں ملا تھا۔ مگر وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا نہیں تھے۔ ریڈیو حیدرآباد سے نشر ہونے والا پروگرام "چھوٹی چھوٹی باتیں" جلیس بھائی کی ایک ایسی شناخت تھا جس کے مرکزی کردار میں جلیس بھائی کی روح بولتی تھی۔ ریکارڈنگ کے دوران ایک ایک لفظ اس قدر تول مول کر بولتے جیسے بہت پہلے ان خیالات کو ذہن کے ریڈیو گرام پر ریکارڈ کر کے بار بار ایڈٹ کرنے کے بعد نکھار لیا ہو۔

سنا ہے جلیس بھائی کے اندر وہ خوبیاں بھی تھیں جو چچا غالب کو بھی رسوا کر گئیں لیکن میں نے کبھی

جلیس بھائی کہاں خوشیوں میں ملوث نہیں دیکھا۔ وہ رندی اور درویشی دونوں کے رنگین دھوکوں تکے قائل
برائے ان کی زندگی، گو دسے گو رنگ خوشی، غم، دکھ، سکھ، رنج وراحت، آسانیاں، مشکل
انبساط وحزن و ملال جیسے مثبت اور منفی جذبات کا ملا جلا امتزاج ہوتی ہے اور یہ سارے جذبے
تک دون کی زندگیوں میں کچھ زیادہ ہی کرتب دکھاتے ہیں اس لیے ایک مزاح نگار غموں کے بھول سے خوشی
کا رس نچوڑ لیتا ہے۔ دکھوں کی کشتِ زار پر خوشی کے پھولوں کی کاشت کرتا ہے، پریشانیوں اور تنگی
سکون و مسرت دگی مول لیتا ہے۔ حزن و ملال کے ویرانوں کو انبساط کا عشرت کدہ بنا دیتا ہے۔ جلیس بھ
میں بھی یہ خوبیاں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ وہ زندگی بھر خانہ بدوشی کو اپنی اور صفیہ بھابی کی پیٹھ پہ لادے
گھر خانہ بدوشی سے حضر کا لطف لیا۔ جہاں بھی گئے اجنبیت کی لفرتوں سے انس پیدا کرلیا۔ وطن حیا
کا پس منظر ہو یا گلبرگہ، بنگلور یا کرنول کی غیر الوطنی جلیس بھائی کا کچھ نہیں لگا رسکی۔

ان کی زندگیوں سے قناعت یوں ٹپکتی تھی جیسے برسات میں غریب کی جھونپڑی کا چھپر ٹپکتا ہے۔
اپنے شرٹ کی حد تک محتاط رہتے مگر پتلون سے ان کی بے نیازیکے درویشی آشکار ہوتی، پتلون کو کون س
کا سامنا کرنا ہے۔ لہٰذا آدھے نفیس اور آدھے نفسی آدمی معلوم ہوتے۔

گویا جلیس بھائی کے تصورات کی کچھ رعنائیاں قابلِ قدر ہیں تو چند رعنائیاں قابلِ درگزر۔
انہی پہ جلیس بھائی کی زندگی کا انحصار تھا۔ وہ آج سے اپنے دوستوں کے انتظار میں ہوں گے کیونکہ احمد جلیس
ہونے کے باوجود دوستوں کا رسیا اور دیوانہ تھا۔

تین سوداگر تھے، ایک بے صبرا، ایک کافی پریشان حال اور ایک جلیس بھائی طرح مست مولا
آدمی۔ تینوں جہاز سے کہیں جا رہے تھے کہ طوفان نے جہاز کو آلیا۔ جہاز ٹوٹ پھوٹ گیا اور وہ تینوں سو
ایک تختہ کے سہارے کسی گمنام جزیرہ پہ بہتے بہتے پہنچ گئے۔ وہاں انہیں ایک بوتل ملی۔ کسی ایک نے بوتل کھ
تو اندر سے ایک جن برآمد ہوا جو علاؤ الدین کے جن سے مشابہ تھا۔ جن نے تینوں کو اپنا آقا سمجھا او
کر وہ ان کا غلام ہے وہ جو بھی حکم دیں گے اُسے پورا کرے گا۔ بے صبر سوداگر نے فوراً اپنے ملک پہنچنا چا
جن نے اس کی خواہش پوری کردی۔ پریشان حال سوداگر نے کچھ مال و متاع کی خواہش کی۔ جن نے فو
مانگ پوری کی تو وہ مال و متاع لے کر اپنے ملک جانا چاہا۔ جن نے فوراً اس کی تمنا پوری کردی اور تیسر
مست مولا قسم کے سوداگر سے کہا حکم میرے آقا۔۔۔۔ آپ کو کہاں پہنچایا جائے۔ اُس سوداگر نے جواب
تھیا، میں اُن دونوں کے بغیر اس ویران جزیرے پہ تنہا کیا کروں گا۔ اُن دونوں کو یہاں لے آؤ۔

اسی طرح جلیس بھائی بھی اپنے مالک حقیقی سے ملنے کے بعد اپنے دوستوں کا شدت سے انتظار کر
رہے ہوں گے۔ میں تو وہاں جانے کے لیے تیار ہوں کیوں کہ جلیس بھائی جیسے دوستوں کے گزر جانے کے بعد
بھی موت خطرناک لگتی ہے۔

دے کے خط (مُراسلے)

- مارچ کا پرچہ ملا۔ بھی نظر کی سب حال اچھا ہے خصوصاً گھوٹالہ سے حوالہ تک۔ شفیقہ فرحت بھوپال

- شگوفہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد معیاری پرچہ ہے خصوصاً ظرافت کے میدان میں اس کا کوئی ثانی نہیں — انگریزی سے طنزیہ مضامین کے ترجمے، آپ کے ادارے کی سرگرمیاں، سخن گسترانہ تبصرے، ادبی مسائل پر آفاذانہ اظہارِ خیال، خاکے، طنزیہ فلمی تبصرے اس طرح کے دیگر موضوعات پر طنز مزاح کے عنصر کو شامل کر کے تخلیقات کو شائع کرنا چاہیے۔ لیتھو کو خیر باد کر کے آفسیٹ پر پورا پرچہ شائع کرنا چاہیے — رشید احمد صدیقی نمبر اور سالنامہ بہت خوب ہیں یہاں یہ پرچہ یقیناً مقبول ہو سکتا ہے۔ اردو کے قدر دانوں کی یہاں بھی کمی نہیں۔ عوشیہ سُلطانہ، شکاگو

- ماہنامہ شگوفہ کا تازہ شمارہ دیکھا تو دل خوشی سے لوٹن کبوتر ہو گیا۔ وہ تو بلیوں اچھلنے والا بھی تھا لیکن جیسے تیسے اسے سمجھا بجھا کر پرسکون کرنے کی کوشش کی۔
اس محفل کے چھٹے بٹے خوب ہیں اور ان میں خوب تر ہے مجتبیٰ حسین صاحب کا مضمون "صاحب باتھ روم میں ہیں"
کچھ پرانے ساتھی بھی اس محفل میں شامل ہیں مثلاً پرویز یداللہ مہدی صاحب اور شجاع الدین عاطف صاحب۔ شجاع الدین عاطف صاحب تو سعودی عرب میں ۱۴ سال تک اسی کمپنی میں تھے جس میں مجھے بھی ملازمت کا موقعہ ملا تھا۔ اس کے بعد وہ مستقل طور سے آسٹریلیا چلے گئے۔ اشرف بدایونی، ممتاز

- نہایت خوشی کا مقام ہے شگوفہ اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ اشاعت کی منزلیں طے کر رہا ہے اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ رشید احمد صدیقی نمبر اور سالنامہ ۹۶ بھی قابلِ ستائش ہے شگوفہ میرے نزدیک ایک روحانی خوراک کے مترادف ہے اسے دیکھ کر دل کو سکون اور روح کو آرام مل جاتا ہے اور یہ سب آپ کی پیہم مساعی جمیلہ کی مرہونِ منت ہے کہ ظرافت کی چاشنی آج کے مسائل کی تلخی کو کم کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو رہی ہے — خوش رہنا اور خوش رکھنا بہت مشکل کام ہے اور یہ کام آپ کی ذاتِ گرامی بخوبی انجام دے رہی ہے۔ ڈاکٹر سید انوار احمد انصاری، مالیر کوٹلہ

- محترمی۔ تسلیمات
مارچ کا شگوفہ نظر نواز ہوا۔ اللہ نظر بد سے بچائے خوب سے خوب تر کی اچھی مثال قائم ہو رہی ہے یہ سب آپ کی محنت اور دلچسپی کا ثمرہ ہے۔ اس مرتبہ مالِ مفت میں اچھا مال ہاتھ لگا۔ پرویز یداللہ مہدی صاحب تو خود سعودی [illegible] میں کیوں فکر کرتے ہیں۔ سیدھے سیدھے فکر ہوتا ہے کہہ دیجئے۔ [illegible] آج کل کے [illegible] پر بھرپور طنز ہے [illegible] جملوں اور فقروں کی چستی پر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ [illegible] کی [illegible]۔ [illegible] کا معیار سخت ہونا چاہیے کچھ ایسی چیز آئے تو پیش کیجئے۔

[illegible] فاروقی ہوٹل۔ اسد اللہ صدیقی (ریٹائرڈ)

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

[اداریہ]

ممتاز مزاح نگار جناب احمد جلیس ڈپٹی ڈائرکٹر دوردرشن کا بنگلور میں ۹ مئی کو حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے اچانک انتقال ہوگیا ان کی عمر تقریباً ۵۷ سال تھی۔ تدفین محلہ یوسفین (میدیکان) کے قبرستان میں عمل میں آئی۔ ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی بڑی تعداد نے بادیدۂ نم احمد جلیس کو سپرد لحد کیا ——— علامہ حیرت بدایونی کے فرزند احمد جلیس کی پرورش خاص ادبی ماحول میں ہوئی۔ جامعہ عثمانیہ سے بی اے اور پھر اردو سے ایم اے کیا۔ ممتاز کالج اور انوار العلوم کالج میں اردو کے لکچرر رہے۔ آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام ایگزیکیٹیو کی حیثیت سے ان کا انتخاب عمل میں آیا۔ بڑی محنت ولگن اور خلوص کے ساتھ ریڈیو کے پروگرام نہ صرف ترتیب دیتے رہے بلکہ خود بھی حصہ لیتے رہے۔ حیدرآباد ریڈیو سے ان کا ایک مقبول عام پروگرام "چھوٹی چھوٹی باتیں" طویل عرصہ تک پیش ہوتا رہا۔ احمد جلیس بنیادی طور پر اچھے مزاح نگار تھے۔ "چھوٹی چھوٹی باتیں" موقتی مسائل پر تیکھے اور مقامی لب ولہجہ میں لکھا گیا شاہکار تھا۔ احمد جلیس کے بعض مضامین چند سال قبل شگوفہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن انھوں نے کبھی مضامین کی کتابی صورت میں اشاعت پر توجہ نہیں دی ۔ جلیس نے لاابالی طبیعت پائی تھی۔ انھوں نے اپنی صحت کی طرف کبھی توجہ نہیں دی۔ سفر، ہوٹلوں میں مقام، سگریٹ نوشی رت جگے اور دوسری بے اعتدالیوں نے دل کے عارضہ کی صورت اختیار کرلی۔ ان کا انتقال میرے لیے ایک شخصی سانحہ بھی ہے۔ ہم ایک ساتھ کالجوں سے نکلے، پیشۂ تدریس سے وابستہ ہوئے۔ گوکہ احمد جلیس نے ریڈیو کی ملازمت اختیار کرلی لیکن ادب وشعر سے ان کا رشتہ قائم تھا۔ شگوفہ کی پابندی اشاعت اور اس کی ترقی کا وہ ہر ملاقات میں ذکر کرتے اور طنز ومزاح سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا کرتے۔ وہ بے حد بذلہ سنج، ہنس مکھ اور مجلسی آدمی تھے۔ دوسروں کی مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہتے۔ ان کے انتقال سے ایک منفرد مزاح نگار، نشریات کا ماہر اور پُرخلوص اردو کا سپاہی ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا، خدا سے دعا ہے کہ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے نوازے۔

ممتاز شاعر اکمل حیدرآبادی اور صحافی شاہ نوری کے انتقال پر بھی ادارۂ شگوفہ رنج وملال کا اظہار کرتا ہے ▲

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ
شگوفہ
حیدرآباد

جلد : ۲۸ — جولائی
شمارہ : ۷ — ۱۹۹۶ء

ایڈیٹر :
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

مدیرِ "شگوفہ" کی دختر کی شادی

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال مدیر "شگوفہ" و صدر شعبۂ اردو انوار العلوم کالج کی صاحبزادی نیساں کمال سلمہا ایم اے (انگریزی) کی شادی الیاس محی الدین بی ایم ای اے ایم آئی ای پلاننگ انجینئر سیلانی واٹر کنورژن کارپوریشن (سعودی عرب) فرزند جناب غلام محی الدین صاحب کے ساتھ ۱۶۔جون ۱۹۹۶ کو شالیمار فنکشن ہال نامپلی پر انجام پائی۔ تقریبِ نکاح میں سرکردہ معزز شہریوں، مختلف کالجوں کے پرنسپل، اساتذہ، اخباروں کے مدیر صحافیوں، ادیبوں، شاعروں، فنکاروں اور رشتہ داروں و احباب کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

۱۷۔جون کی شب نفیس منزل لے سی گارڈنز پر پرتکلف عشائیہ بھی ترتیب دیا گیا۔ مدیر "شگوفہ" نے ان تمام رشتہ داروں، معززین و احباب کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے تقریب نکاح میں شرکت فرمائی، پیامات تہنیت سے نوازا اور دلہا دلہن کو اپنی دعاؤں و نیک تمناؤں سے سرفراز کیا۔

اِس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

مالِ مفت (انشائیے)

یہ ہے بابیے...

اِدھر اُدھر سے

گوشۂ سلیمان خطیب

چورن

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن

رجسٹرڈ آفس: 8/825-I-4 سکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ عابد روڈ حیدرآباد

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے۔ یہ قرضہ جات 2 اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں۔ (1)۔ غربت ہٹاؤ اسکیم (2) خود روزگار اسکیم۔ غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار تک کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائینڈنگ، ترکاری فروش، میوہ فروش، اگربتی کا کارخانہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 25% کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود 4% کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور مابقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی چھ ہزار 6000 روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں، پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین، آٹو رکشہ، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 20% کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح سود 6½% پر دیا جاتا ہے۔ کارپوریشن مندرجہ بالا دو اسکیموں کے تحت اپنے قیام سے لے کر 7 مارچ 96ء تک 57837 افراد میں 12,66,60,000 روپے بطور مارجن منی قرض جاری کرچکا ہے جس کی جملہ لاگت 5696,15,000 روپے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جاریہ سال 96۔95 سے مرکزی حکومت کا قائم کردہ نیشنل اقلیتی ڈیولپمنٹ اینڈ فینانس کارپوریشن کے اشتراک سے اب تک جملہ 868 افراد میں (16) منظور کردہ اسکیمات کے تحت 106,50,000 روپے مارجن منی قرض مزید جاری کرچکا ہے جس کی جملہ لاگت 270,03,000 روپے ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ کارپوریشن 93ء سے اقلیتی طبقہ کے نوجوانوں کو سالانہ مفت ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے چکا ہے۔ حیدرآباد میں 531 نوجوانوں کو، نظام آباد میں 192، گنٹور میں 243 افراد، کرنول میں 76 نوجوانوں کو تقریباً 10 لاکھ روپے کے صرفہ سے کمپیوٹرس، موٹر ڈرائیونگ، لیاب ٹیکنیشین، ٹیلرنگ، ٹائپ رائٹنگ وغیرہ میں ٹریننگ کرایا گیا ہے۔

- کارپوریشن کی شاخیں اضلاع کے ہیڈکوارٹر پر بھی کام کر رہی ہیں۔
- خواہشمند حضرات کارپوریشن کے دفاتر سے ربط پیدا کریں۔

محمد علی رفعت
ایم کام۔ ایل ایل ایم
نائب صدرنشین و مینیجنگ ڈائرکٹر

مجتبیٰ حسین

باہر سے سپورٹ

پچھلے کچھ دنوں سے ہم اپنے گھر میں عجیب و غریب تبدیلیاں محسوس کرنے لگے تھے۔ گھر کے رکھ رکھاؤ میں اچانک کچھ فرق سا آگیا تھا۔ ہماری بیوی جس نے فرش پر بیٹھنے اور صوفے پر بیٹھنے میں کبھی فرق محسوس نہیں کیا وہ اب نئے صوفہ سیٹ کا مطالبہ کرنے لگی تھی۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے پردے بھی کمرہ کی دیواروں کے رنگ کے مطابق خریدے گئے۔ اسی حساب سے فرش کا اہتمام بھی کیا گیا۔ ان سب کے باوجود ہماری بیوی نے ہم سے آرائش و زیبائش کی کچھ نئی چیزیں خریدنے کا مطالبہ کیا تو ہم نے کہا "محترمہ! گھر کی آرائش و زیبائش تو بہت دور کی بات ہے آپ تو کبھی خود اپنی آرائش و زیبائش کی بھی قائل نہیں رہیں آخر یہ آپ کو اچانک کیا ہوگیا ہے کہ گھر کی سجاوٹ وغیرہ کے پیچھے پڑی ہوئی ہیں؟" بولیں "وہ جو ہماری نئی پڑوسن آئی ہے نا وہ گھروں کی اندرونی سجاوٹ کی ماہر ہے۔ پرسوں مجھ سے ملی تو اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنے گھر کو اس طرح سجاؤں تاکہ گھر خوبصورت لگے۔" ہم نے کہا "مانا کہ وہ گھروں کی اندرونی سجاوٹ کی ماہر ہے مگر وہ تو صرف مشورہ دے رہی ہے اور تم اس مشورہ پر عمل کرکے میری زندگی کو ایک عذاب میں مبتلا کر رہی ہو۔"

ہماری بیوی نے کہا "وہ بیچاری کیا کرے گی۔ وہ تو اپنے تجربہ کی بناء پر ہمیں بہترین مشورے ہی دے سکتی ہے۔ یوں بھی وہ ہمیں صرف "باہر سے ہی سپورٹ" کر سکتی ہے۔"

ہم نے کہا "کاش وہ گھر کے اندر آکر بھی ہمیں سپورٹ دے سکتی۔" اس پر ہماری بیوی ہم سے خفا ہوگئیں کہ ہم ہمیشہ ہی ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہیں۔ اس واقعہ کے دو ایک دن بعد ہم نے اپنی پڑوسن کے شوہر سے ملاقات کی بیچارہ بے حد فرمانبردار اور پالتو قسم کا شوہر نظر آیا۔ اس سے مراسم بڑھے تو ہم نے اسے زیادہ سے زیادہ اپنی صحبت میں رکھنا شروع کیا اور اسے سماجی اور تہذیبی محفلوں میں بھی لے جانے لگے۔ ماشاء اللہ آخر وہ اس قابل ہوگیا ہے کہ خود اپنے طور پر راتوں کو دیر گئے گھر لوٹنے لگا ہے۔ اچھے خیر سے میاں بیوی میں جھگڑا بھی ہونے لگا۔ ایک دن ہماری بیوی نے ہم سے کہا "تم نے ہماری پڑوسن کے شوہر کو آرٹ اور کلچر کا جو چسکہ لگایا ہے وہ نہایت غلط حرکت ہے۔ وہ بھی اب تمہاری طرح دیر سے گھر واپس آنے لگا ہے۔ ہماری پڑوسن تمہاری سخت شکایت کر رہی تھی۔"

ہم نے اپنی بیوی سے کہا "محترمہ! اس میں ہمارا کیا قصور ہے ہم تو اپنی پڑوسن کو صرف "باہر سے سپورٹ" دے رہے ہیں۔"

اس کے گھر میں تو داخل ہو کر سپورٹ تھوڑا ہی دے رہے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ہمارے پڑوسی کی بیوی آرائش و زیبائش کے معاملہ میں "باہر سے سپورٹ" دے رہی ہے"۔ اور اس کے بعد ہماری بیوی غصے سے کچن میں چلی گئی۔

ادھر جب سے مرکز میں سنٹر دیوے گوڑا کی سرکار بعض پارٹیوں کی "باہر کی مدد" سے بنی ہے تب سے ہر جگہ "باہر سے مدد" کا چلن عام ہو گیا ہے اور ہر آدمی اپنی بساط کے مطابق "باہر سے مدد" کی تشریح کر رہا ہے۔ ہماری ناقص عقل کے حساب سے تو "باہر سے مدد" کا مطلب تو ہمیں صرف یہی نظر آتا ہے کہ باہر سے مدد کرنے والا آپ کی مدد باہر سے اس لیے کرتا ہے کہ آپ اندر سے اس کی مدد کریں۔ مدد چاہے باہر سے کی جائے یا اندر سے اوپر سے کی جائے یا نیچے سے دائیں سے کی جائے یا بائیں سے، اس کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ ہماری نوجوانی کے زمانہ میں حیدرآباد کی ہوٹلوں میں جو بیرے ہوا کرتے تھے ان میں سے کچھ اندر والے ہوتے تھے اور کچھ باہر والے۔ باہر والے بیرے کا کام ہوتا تھا کہ جو لوگ کسی وجہ سے ہوٹل کے اندر نہیں آسکتے تھے یا آنا نہیں چاہتے تھے انھیں وہ ہوٹل کی چیزیں باہر پہونچایا کرتا تھا اور بخدا باہر والا بیرا، اندر والے بیروں سے کہیں زیادہ مزے میں رہتا ہے۔

دیکھا جائے تو "باہر سے مدد" کا تصور ہماری صدیوں پرانی تہذیب کا ایک اٹوٹ حصہ رہا ہے۔ کئی سو برس پہلے آریہ اس ملک میں کیوں آئے تھے۔ وہ بھی تو ہمیں "باہر سے سپورٹ" دینے کے لیے آئے تھے۔ پھر بہت بعد میں بابر یہاں کیوں آیا تھا اسے بھی تو "باہر سے سپورٹ" دینے کے لیے ہندوستان آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ خیر مثالیں تو بہت سی ہیں۔ ایک مثال ہو تو بتائیں۔ بیچارے انگریزوں پر بھی ہمیں ترس آتا ہے کہ انھیں "باہر سے سپورٹ" دینے کے لیے کئی ہزار میل کی دوری سے یہاں آنا پڑا تھا۔ بیچارے ڈھائی تین سو برس تک ہمیں کچھ اس طرح سپورٹ دیتے رہے کہ اندر والے باہر اور باہر والے اندر نظر آنے لگے۔ "باہر سے سپورٹ" کے معاملہ میں عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ آپ نے "اونٹ اور عرب" والا وہ قصہ تو ضرور پڑھا ہوگا کہ ریگستان کی ایک سرد رات کو ایک اونٹ ایک عرب کے خیمہ کے پاس یہ التجا کرتا ہوا پہونچا کہ بھیا! باہر بہت سردی ہے۔ اگر اجازت ہو تو اپنی تھوڑی سی گردن تمہارے خیمہ میں داخل کر دوں۔ عرب نے اجازت دی تو کچھ دیر بعد معاملہ یہ نظر آیا کہ عرب تو خیمہ کے باہر تھا اور اونٹ خیمہ میں داخل ہو چکا تھا۔ بہر حال باہر سے سپورٹ ہماری جمہوریت میں نئی چیز ہو تو ہو لیکن ہماری تہذیب اور ثقافت میں اس کا چلن صدیوں پرانا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ہمارے ملک میں باہر سے سپورٹ کے معاملہ میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا اسے ہم نے "امریکی امداد" کے ذریعہ پر کرنے کی کوشش کی

ان مثالوں کو پیش کرنے کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ دیوے گوڑا سرکار کو اگر "باہر سے سپورٹ" مل رہی ہے تو اس پر اتنا اعتراض کرنے اور واویلا مچانے کی کیا ضرورت ہے۔ اب آپ سے کیا چھپانا کہ ہم نے اپنی زندگی کے جو ساٹھ برس گزارے ہیں ان میں "باہر سے سپورٹ" کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اگر ہمارے کچھ مخلص دوست اور کرم فرما نہ ہوتے اور وہ ہمیں "باہر سے سپورٹ" نہ کرتے تو بخدا ہماری زندگی تیس چالیس برس پہلے ہی ختم ہو چکی ہوتی۔ ہمیں جو اپنی زندگی کے فاضل بیس پچیس برس ملے ہیں تو وہ صرف "باہر سے سپورٹ" کی وجہ سے ہی ملے ہیں۔ بہر حال ہمیں تو "باہر سے سپورٹ" کے سلسلہ میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔ باہر والا بھی تو آخر کسی وجہ سے ہی آپ کو "سپورٹ" کرتا ہے۔ اور اس لیے بھی کرتا ہے کہ وہ "اندر والے" سے کہیں زیادہ مزے میں رہتا ہے۔

دیوے گوڑا جی کی لی جلی سرکار کی بات چل نکلی ہے تو چلتے چلتے ہم اس واقعہ کا ذکر بھی کرنا چاہتے ہیں جو پچھلے

دِلوں دہلی کے پریس کلب میں ہمارے ساتھ پیش آیا۔ ہم اپنے کچھ صحافی احباب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک صحافی نے ہمیں کرناٹک کا باشندہ سمجھا (ویسے ہماری پیدائش کرناٹک کی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جب تک مسٹر پی وی نرسمہا راؤ برسرِ اقتدار رہے لوگ ہمیں آندھرا پردیش کا باشندہ سمجھتے رہے۔ ہم ایسی غلط فہمیوں کو دور بھی نہیں کرنا چاہتے کیوں کہ ہمارے پاس ایسے اعزازات کے سوائے ہے بھی کیا)۔ اور کہا۔ "آپ کے دیوے گوڑا جی کو یہ کیا ہوگیا ہے کہ ہر بار اپنے کسان کا بیٹا ہونے کا اعلان کرتے رہتے ہیں اور ان کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے رہتے ہیں جو انھوں نے کرناٹک میں بحیثیت چیف منسٹر انجام دیئے تھے۔ اب تو وہ وزیراعظم ہندوستان بن گئے ہیں۔ انھیں اب کرناٹک کی چیف منسٹری کے زمانہ کو بھول جانا چاہیئے"۔ اس پر ہم نے کہا "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ آدمی اپنی جڑوں کو کیسے بھول سکتا ہے۔ یوں بھی اگر آپ دیوے گوڑا کو اپنے ذہن میں وزیراعظم کرناٹک اور چیف منسٹر ہندوستان سمجھنے لگیں تو اس سے آپ کی پریشانی دور ہو جائے گی۔ آپ آم کھانا چاہتے ہیں یا پیڑ گننا چاہتے ہیں"۔ ■□

۸

مصطفیٰ علی بیگ (حیدرآباد)

یو ڈونٹ نو

کیا ہے دل، کیا ہے جگر یو ڈونٹ نو
درد ہوتا ہے کدھر یو ڈونٹ نو

خود گریں گے ووٹ اس کے نام سے
اس کے وعدوں کا گٹر یو ڈونٹ نو

عشق بھی اب بن گیا کرکٹ کا کھیل
بے وفا کا ہاؤ فر یو ڈونٹ نو

خاک میں مل جائے گی بیوٹی تری
میری آہوں کا اثر یو ڈونٹ نو

کتنے گھائل ہو گئے کتنے مرے
چھوڑ کر تیر نظر یو ڈونٹ نو

پھینک کر پتھر اشارہ جو کیا
پھٹ گیا تھا میرا سر یو ڈونٹ نو

ونس اپان اے ٹائم میں بھی تھا جواں
وہ زمانہ مائی ڈیر یو ڈونٹ نو

غیر کے گھر روز کیا جانے لگے
کس طرف ہے میرا گھر یو ڈونٹ نو

عاشقوں کے درد کو پہچاننا
ہے بہت ایزی مگر یو ڈونٹ نو

وصل کے وعدہ پہ کر کے بلائنڈ فیتھ
کون جاگا رات بھر یو ڈونٹ نو

غزل

صحن گلشن پہ سیہ شب کا ہالا دیکھو
ہر طرف چھایا ہوا کالا اجالا دیکھو

گھر جلاتے ہیں ہمارا جو ہیں گھر کے میرے
پاسبانی کو کوئی اور ہمالہ دیکھو

کتنے شیطان چھپے ہیں صف جمہوری میں
دیکھنا چاہو تو فہرست حوالہ دیکھو

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
نسخۂ غالب ہندی میں ازالہ دیکھو

غربت فکر کے مارے ہوئے کم ظرفوں نے
طرز چنگیزی پہ جمہور کو ڈالا دیکھو

کتنا مجروح ہے یہ گوتم و چشتی کا دیار
کیسے کیسے مرد دیتے ہوا اس کو تہ و بالا دیکھو

سرفروشوں نے چمکتے ہوئے کرداروں سے
خون سے سینچ کے اس باغ کو پالا دیکھو

فکر فردا کی کرو، کام کوئی ڈھنگ کا کرو
ورنہ ہو جائے گا سب کچھ تہ و بالا دیکھو

قوم سوتی ہے تو پڑتے عقلوں پہ تالے دیکھو
نہ کوئی مندر و مسجد نہ شوالہ دیکھو

اک دہکتے ہوئے سورج کو اگانے کے لیے
صاف کرنا ہے ہمیں ذہن کا جالا دیکھو

ہے جو تشنہ ہی کا تجسس شوق تو تشنہ کرنے کو
اپنے دروازے پہ بہتا ہوا نالا دیکھو

جس طرح خود کو سنبھالا ہے تبھی دنیا نے
عصر حاضر میں سنورنے کا وہ آلہ دیکھو

بھوک و افلاس کی ماری ہوئی انسانیت
جپ رہے ہیں سبھی تقدیر کی مالا دیکھو۔

ڈاکٹر پرویز احمد (...)

عابد معز (ریاض)

عرض کیا ہے

دیارِ غیر میں بسنے والے اُردو داں خواتین و حضرات لائقِ تحسین ہیں۔ یہ لوگ دل و جان سے اپنی زبان کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ "ویک اینڈ" پر اردو کے حوالے سے ملتے ہیں، اردو زبان کے گن گاتے ہیں، اردو میں گپ ہانکتے ہیں، مشاعرہ منعقد کرتے ہیں، محفلِ غزل کا اہتمام کرتے ہیں، محفلوں کی "صدا بندی" اور "عکس بندی" کرتے ہیں اور آخر میں پُر تکلف عشائیہ اُڑاتے ہیں۔ یوں، اردو کی ترقی کو ایک ویک اینڈ سے دوسرے ویک اینڈ تک پہنچاتے ہیں۔ اُردو کی ان محفلوں میں ہم پابندی سے شریک ہوتے ہیں۔ اردو زبان کی ترقی کے لیے ان محفلوں کا برپا کرنا اور ان میں شریک ہونا ہمارے نزدیک کارِ خیر کا درجہ رکھتا ہے!

جب سے ہم نے ان محفلوں میں شرکت شروع کی، اسی وقت سے خود کو "باذوق سامع" ثابت کرنے کے لیے، ہم ڈائس کے پاس بیٹھنے لگے تھے۔ قریب ہونے کی وجہ سے کیمرے کے فوکس اور سب کی نگاہوں میں رہتے تھے۔ شاعر ہمیں دیکھتے ہوئے اپنا کلام پیش کرتے اور داد کی امید بھی زیادہ تر ہمیں سے رکھتے۔ ہم انھیں مایوس نہیں کرتے تھے، شاعر کی زبان سے شعر مکمل ہونے سے پہلے ہی ہم شعر اچک لیتے اور شعر کے مجروح ہوجانے کی پروا کیے بغیر اسے احباب میں اچھال کر سر دھننا شروع کر دیتے تھے، واہ واہ اور سبحان اللہ کی ہانک لگاتے اور ہاتھ لہراتے ہوئے داد دیتے۔ شاعر ہمیں مسلسل آداب عرض کیے جاتے۔ بہت زیادہ آداب عرض کا جواب ہم "مکرر۔ مکرر" کا نعرہ بلند کرکے دیتے کبھی کوئی فقرہ بھی جڑ دیتے "ایسا شعر کسی نے کہا ہی نہیں!" "جواب نہیں، کیا ترکیب بنائی ہے۔ واہ واہ، سبحان اللہ، سبحان اللہ اور مکرر۔ مکرر" الاپ کر ہم اردو کی خدمت کیے جا رہے تھے۔

اردو کی خدمت کا صلہ ہمیں جلد ہی مل گیا۔ ہمارے ذوقِ شعری کی دھاک جم گئی، ہمیں صاحبِ علم و فن گردانا گیا۔ شعرا حضرات بھری محفل میں اپنا کوئی شعر یا پوری غزل ہماری نذر کرنے لگے۔ ہماری توجہ مبذول کرواتے ہوئے کہتے۔ "آپ ہی اس شعر کو پرکھ سکتے ہیں" شعرا نے ہم سے دوستی بڑھائی۔ تازہ کلام موزوں ہونے پر ہمیں سناتے اور ہماری رائے پوچھنے لگے۔

اردو زبان کی ترقی کی خاطر ہم خوش کلامی سے کام لیتے۔ یوں بھی بقول شخصے، دیارِ غیر میں مشاعرہ تو بس دل بہلانے کا بہانہ ہے۔ کوئی ادبی اکھاڑہ نہیں کہ ہم سچ بات کہیں اور پھر ہم بھی کون؟ نقاد اور ادب کے طالب علم

تو ہیں نہیں کہ تنقید کریں۔ میٹرک تک اردو زبان ذریعہ تعلیم رہی ہے اور بس؛ اردو کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنا تو دور، آج
کی نسل کو اردو بحیثیت ایک مضمون بھی نصیب نہیں ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ لوگ اردو بول اور سن لیتے ہیں۔ انھیں کیا
پتہ کہ شاعری کیا ہے، بحر کس چڑیا کا نام ہے، وزن کیا چیز ہے اور قافیہ اور ردیف کسے کہتے ہیں۔ ان حالات میں
اگر کوئی شعر کہتا اور سناتا ہے اور احباب واہ واہ کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں تو ہمیں تعریف ہی کرنی چاہیے۔

شعراء اور سامعین کی مدح سرائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیں مشاعروں کی صدارت کے لیے مدعو کیا جانے لگا۔
تھوڑے سے رسمی انکار کے بعد ہم مشاعروں کی صدارت کرنے لگے۔ ہماری آمد پر مشاعرہ کا آغاز ہوتا۔ شعراء ہماری اجازت
سے اپنا تازہ کلام پیش کرتے۔ ہمہ تن گوش ہو کر شعراء کو سننا پڑتا۔ مسندِ صدارت سے اٹھ کر جانے یا احباب سے
بات کرنے کا موقع نہ ملتا۔ اِدھر اُدھر دیکھنا یا پہلو بدلنا بھی مشکل ہوتا۔ شعراء ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کروائے
رکھتے۔ ہر دم ہمیں واہ وا کہتے رہنا پڑتا۔ واہ واہ کہنے کی اتنی عادت پڑ چکی تھی کہ عام حالات میں بھی "ہم" "ہوں" "ہاں
ہاں" یا "اچھا" کے بجائے واہ واہ کہنے لگے۔ گھنٹوں کی شب بیداری اور ریاضت کا صلہ آخر میں شکریہ سے پہلے چند
منٹ تقریر کی شکل میں ملتا۔ وہ بھی اس وقت جب حاضرین کی اکثریت جمائیاں لیتے ہوئے پہلو بدل رہی ہوتی۔

ہم نے بعض گھاگ اور تجربہ کار "مشاعرہ باز" دوستوں سے رازدارانہ خط و کتابت کی تو انھوں نے مشاعرے
کی صدارت جیسے اکتا دینے والے کٹھن کام کو آسان بنانے کے چند گُر لکھ بھیجے۔ ان نسخہ ہائے دوستاں پر عمل کرنے سے
ہماری تکلیف میں اضافہ ہوا۔ اب ہم گردن اکڑا کر ہر شاعر کے کلام پر کان لگائے بیٹھے رہنے کی بجائے گاؤ تکیے کے سہارے
نیم دراز ہونے لگے۔ شاعر کے ہاتھ میں طویل آزاد نظم کا پلندہ دیکھتے ہی ہم اطمینان کا سانس لے کر اونگھنا شروع کر دیتے۔ خدا
سی مشق سے ہم نے یہ عادت ڈال لی تھی کہ آنکھیں نیم وا رکھتے تھے، لوگ سمجھتے کہ وجد کے عالم میں ہیں۔ اکثر تو مشاعرے
کے بعد بعض "محرم راز" احباب نے بتایا کہ تمہارے خراٹوں کو بھی مشاعرے کے شور میں واہ وا سمجھ لیا جاتا ہے اور شاعر
صدر مشاعرہ کی طرف سے اس "حوصلہ افزائی" پر خوش ہو کر پورا کلام از سرِ نو سنانے لگتا ہے!

مشاعروں کی صدارت کرتے ہوئے اب ہمیں جو واحد مشکل درپیش تھی وہ یہ کہ آخر میں خطبۂ صدارت
کے لیے ہم جب مائک پر پہنچتے تو بعض دل جلے اور منچلے حضرات ہم سے کلام کی فرمائش کر بیٹھتے۔ ہم ہمیشہ انھیں یہ کہہ کر
ٹال جاتے کہ حضرات دیکھیے اب تو پو پھٹ رہی ہے، کوئی دم میں اذانِ فجر ہونے والی ہے، یہ کلام اللہ پڑھنے کا
وقت ہے، ہمارے کلام کا نہیں ہے! لیکن یہ بہانہ کب تک چلتا۔ آخر ہم نے خود بھی سنجیدگی سے غور شروع کر دیا کہ ہمیں
بھی شاعری کرنی چاہیے۔ اس طرح اردو کی مزید ترقی بھی ہوگی۔ ہم نے شعر کہنے اور شاعر بننے کا قصد کیا۔ امید تھی
کہ غیب سے مضامین آئیں گے اور اشعار ڈھلتے جائیں گے۔ ہم چچا غالب کی پیروی کرتے ہوئے ہاتھ میں ریشمی ازار
بند تھامے، شعر کو گرہ میں باندھنے کے لیے تیار بیٹھے رہے۔ چند دن انتظار میں بیت گئے۔ نہ کوئی مضمون وارد ہوا اور نہ
ہی کسی شعر کی ولادت ہوئی۔ اپنے اندر پیدائشی شاعر کو جگانے میں ناکام ہوئے تو ہم نے ریشمی ازار بند کو واپس داخل
نیفہ کیا اور شعر کہنے کے لیے ادبی ریاضت کا ارادہ کیا۔

حسن، عشق، پروانہ، گل، بلبل، قمر، سورج، ہجر، وصال، رقیب، نامہ بر، قاصد، صنم، بت کدہ، شراب،
مے خانہ، ساقی، واعظ، زاہد، دل، دماغ، عقل، دیوانگی، جگر، خونِ جگر، آنسو، قیدی، داد، آزادی، رہائی، قفس،

غربت، افلاس، بھوک، قلم، صبر وغیرہ جیسے موضوعات پر عجیب و غریب خیالات کو اکھٹا کیا۔ خیالات اور احساسات کو ایک استاد شاعر کی آسان زمین میں بویا تاکہ غزل کی فصل تیار ہو سکے۔ ہم قافیہ الفاظ سے آبیاری کی اور غزل تیار ہو گئی۔
غزل کو غور سے دیکھا تو محسوس ہوا کہ اشعار بے بحر ہیں۔ مصرعوں کو ناپ تول کر وزن برابر کرنے کے لیے بندر بانٹ کوشش کی تو اشعار نہ صرف مزید بے وزن ہو گئے بلکہ بے وقعت بھی دکھائی دینے لگے۔ ہم سوچنے لگے کہ اشعار کی مرمت کے لیے کیا کریں۔ ایک شاعر کی بات یاد آئی کہ وزن میں شاعری کرنے کے لیے گنگنانا ضروری ہے۔ بحر کا دوسرا نام ترنم ہے۔ ہم نے گنگنانا شروع کیا اور ہر دم مترنم رہنے لگے۔
ہمیں کاغذ قلم اور لغت کے ساتھ گم صم رہتے اور پھر گاتے ہوئے دیکھا تو بیگم کو تشویش لاحق ہوئی۔ ہماری ٹوہ میں رہنے لگیں۔ وجہ دریافت نہ کر سکیں تو پوچھا: "کیا بات ہے۔ آپ کبھی کھوئے کھوئے سے اُداس رہتے ہیں اور کبھی خوش، گاتے اور بجاتے نظر آتے ہیں؟"
ہم نے لہراتے ہوئے جواب دیا: "ہم شاعری کرنے لگے ہیں"
بیگم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولیں: "کسے دیکھ کر؟"
کچھ سمجھ نہ آیا تو ہم نے پوچھا: "کیا مطلب؟"
جواب میں بیگم ایک گیت کا مکھڑا گنگنانے لگیں۔
میں شاعر تو نہیں مگر اے حسیں ۔ جب سے دیکھا تجھ کو مجھ کو شاعری آگئی۔
پھر پوچھا: کون ہے وہ حسین جس نے آپ کو دیوانہ بنایا ہے اور جس کے فراق میں شاعری ہو رہی ہے؟"
ہم نے سوچا کاش یہ سچ ہوتا۔ ہم کسی سے ناکام محبت کرتے اور بلند پایہ شاعر بن جاتے۔ ہم نے بیگم کو خوش کرنے کے لیے کہا: وہ کوئی اور نہیں آپ ہیں"۔
بیگم خوش ہونے کے بجائے ناراض ہو گئیں۔ "پندرہ سال سے سیدھے منہ بات نہیں کی ہے۔ اب مجھے دیکھ کر شاعری کرنے چلے ہیں۔ بغیر شاعری اچھی بھلی زندگی گزر رہی ہے۔ یکا یک آپ کو یہ کیا ہوا؟"
ہم نے بیگم کو سمجھایا: "آپ یہ خیال دل سے نکال دیں کہ ہم کسی سے عشق کرنے لگے ہیں! اتنی ہمت ہم میں کہاں۔ آج بھی ہم پہلے کی طرح آپ کے وفادار ہیں۔ ہمارا منشا شاعری کے ذریعہ اردو کی خدمت کرنا ہے"۔
جواب ملا: "اردو کی خدمت کرنے کا ارادہ ہے تو اپنی اولاد کو اردو سکھائیے۔ آپ کے بچے اردو یوں بولتے ہیں جیسے انگریزوں کی نقل اتار رہے ہوں۔ بچوں کو اپنی طرح اردو بولنا سکھائیے، مجھے اردو پڑھائیے، لیکن خدارا شاعری نہ کیجیے۔"
"شاعری میں کیا بُرائی ہے؟" ہم نے سوال کیا۔
"شاعری میں کوئی بُرائی نہیں ہے۔ اردو شاعری مجھے پسند ہے۔ جگجیت سنگھ اور چترا سنگھ کی غزلیں شوق سے سُنتی بھی ہوں۔ لیکن معلوم نہیں کیوں، شاعر اچھے نہیں لگتے۔ میں آپ کو شاعر کے روپ میں دیکھ نہیں سکتی۔"
بیگم کا جواب سُن کر ہم نے سوال کیا: "کیا شاعر جن یا بھوت ہوتا ہے؟"
بیگم بولیں: "اگر شاعر جن ہوتا۔ جن دکھائی نہیں دیتا جب کہ شاعر کو دیکھنا، سننا اور بھگتنا پڑتا ہے۔"

ہم اپنے تجسس کو چھپا نہ سکے اور بیگم سے پوچھا: "آخر شاعر ہوتا کیسا ہے؟"

"عجیب و غریب! چہرے اور سر کے بال بڑھے ہوئے گال پچکے ہوئے، خستہ حال، نحیف و نزار، ہر دم نشہ میں چور، ایک ہاتھ میں بوتل تو دوسرے میں بیاض، منہ میں پان اور ہونٹوں میں سگریٹ، ماحول سے بے خبر، اپنی دھن میں مگن، موقع اور بے محل بے وقت "عرض کیا ہے" کی رٹ لگائے ہوئے کچھ ڈراؤنی سی شکل و صورت ہوتی ہے۔!" بیگم نے شاعر کی تفصیلی منظر کشی کی۔

ہم نے بیگم کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی: "آپ نے جو نقشہ کھینچا ہے وہ شاعر کا نہیں، بگڑے ہوئے شاعر کی تصویر ہے وہ بھی آج سے کوئی سو سال پہلے والے شاعر کی۔ ہمارے دور کے شعراء ماشاءاللہ بے حد اسمارٹ ہوتے ہیں، آپ کے شوہر کی طرح سوٹ بوٹ پہنتے ہیں، گلے میں ٹائی باندھتے ہیں، پان کے بجائے چیونگم سے شغل فرماتے ہیں، پائپ پیتے ہیں، اپنے آپ کو شاعر کہنے سے ہچکچاتے ہیں اور اپنی تخلیقات ایسے پیش کرتے ہیں، جیسے اردو زبان پر احسان فرما رہے ہوں۔ یوں بھی آج کل کوئی ہمہ وقتی شاعر ہو نہیں سکتا۔ وہ دن لد گئے، جب شاعری ذریعہ معاش ہوا کرتی تھی۔ آج کا اردو شاعر صرف شاعر نہیں ہوتا، وہ ڈاکٹر انجینئر، تاجر، بیکار، کلرک، اکاؤنٹینٹ یا پروفیسر بھی ہوتا ہے بلکہ اکثر اوقات وہ شاعر کے علاوہ سب کچھ ہوتا ہے۔ آپ خاطر جمع رکھیے ہم برباد نہیں ہوں گے۔"

"کچھ بھی ہو۔ آپ شاعری نہیں کریں گے۔" بیگم نے فیصلہ سنایا۔

ہمارے درمیان دھواں دھار بحث چھڑ گئی۔ ہم نے بیگم کو شخصی آزادی میں مخل ہونے کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ بیگم نے ہم پر دوسروں کے احساسات اور جذبات کی پرواہ نہ کرنے کا الزام لگایا۔ دو گھنٹوں کی مغز ماری کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ بیگم نے مشروط آمادگی کا اظہار کیا۔

"ان شرائط کے ساتھ شاعری کی اجازت عطا کی گئی کہ ہم شاعری کر سکتے ہیں لیکن اپنا حلیہ نہیں بدلیں گے اور نہ ہی شاعر کے عادات و اطوار اپنائیں گے، شراب پینا شروع نہیں کریں گے۔ خواتین کی جانب نظریں نہیں اٹھیں گی۔ شب بیداری نہیں ہوگی۔ اپنے آپ کو مافوق البشر نہیں سمجھا جائے گا۔ شاعروں سے دوستی نہیں ہوگی۔ گھر میں مشاعرہ اور کام پر شاعری نہیں ہوگی۔ کم از کم چار احباب کے اصرار پر ہم "عرض کیا ہے" کہیں گے! کسی صورت گا کر کلام نہیں سنائیں گے اور داد کی وصولی کے لیے دونوں ہاتھوں سے یا جھک جھک کر فرشی سلام نہیں کریں گے۔

ہم نے "پابند" شاعری پر سخت احتجاج کیا لیکن بیگم کسی صورت آزاد شاعری کے حق میں نہ تھیں۔ بیویاں کب شوہروں کو آزاد رکھنا چاہتی ہیں۔ تھک ہار کر ہم نے پابندیوں میں نرمی کے لیے گزارش کی۔ ترنم کے لیے اصرار کیا کہ عروض کی غلطیوں کو شعر میں ڈھال لینے کی سہولت حاصل ہو جائے اور سر کو خفیف سا جھکا کر آداب کرنے کی اجازت چاہی کہ واہ وا، واہ وا، اور آداب کے بغیر شاعری نہیں ہو سکتی۔

مشروط اجازت ملنے کے بعد ہم نے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ایک غزل مکمل کی۔ ویک اینڈ مشاعرے میں سنانے سے پہلے ہم نے مناسب سمجھا کہ کسی کہنہ مشق شاعر کو دکھا یا جائے، سو ہم نے ایک خاندانی

شاعر کا انتخاب کیا جن کے نانا اُردو زبان کے نامور شاعر گزرے ہیں۔ اپنے بارے میں مشہور کر رکھا تھا کہ انھوں نے پہلا شعر چھ سال کی عمر میں نانا ابا کی گود میں بیٹھ کر کہا تھا۔
خاندانی شاعر سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے موصوف کی تحسین کی اور ان کے ادبی قد کو تعریفی اینٹیں رکھ کر اُونچا کیا۔ وہ خوش ہوئے اور اپنی ڈھیر ساری غزلیں سنائیں۔ ہم نے خوب داد دی۔ نظرِ عنایت کی گزارش کرتے ہوئے ہم نے انھیں اپنی غزل دکھائی۔ چہرے پر ناگواری کے اثرات نمایاں ہوئے ایک عینک اتاری اور دوسری چڑھائی ہماری غزل واپس کرتے ہوئے فرمایا: "شاعری ہر ایک کے بس کا روگ نہیں ہے۔ یہ فن خدا کی طرف سے مخصوص بندوں کو ودیعت کیا جاتا ہے! اسی لیے کہتے ہیں کہ شاعر پیدا ہوتے ہیں بنائے نہیں جاتے"۔

ہمیں یقین ہو گیا کہ خاندانی شاعر کو ہماری شاعری سے خطرہ ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ کوئی ان کے مدِ مقابل آئے۔ ہم آسانی سے ہار ماننے والے نہیں تھے، اپنی غزل لیے ایک شاعر دوست کے پاس پہنچے۔ موصوف غیر پیدائشی شاعر اور مشہور معالج ہیں۔ صرف دو سال پہلے دیارِ غیر میں شاعری شروع کی۔ ایک عدد مجموعۂ کلام بھی چھاپ چکے ہیں۔ دوسرا تیار ہے۔ انھوں نے ہماری خواہش کا احترام کیا اور بولے: "میں تو وطن میں اپنے استاد سے رجوع کرتا ہوں، قادر الکلام شاعر ہیں۔ میں اپنا تازہ کلام اور نذرانہ انھیں بھیجتا ہوں اور وہ اصلاح کر کے واپس کر دیتے ہیں بعض مرتبہ ہوا یوں کہ مصروفیت کے سبب کلام موزوں نہیں ہو پایا، میں نے استادِ محترم کی خدمت میں صرف "ہدیۂ تہنیت" پیش کیا اور انھوں نے جواب میں غزلیں اور نظمیں ارسال کیں۔ اب یہ حال ہے کہ میں پابندی سے انہیں ہدیۂ خلوص و احترام پیش کرتا ہوں اور وہ منظومات سے مجھے نوازتے ہیں"۔

شاعری کرنے کا یہ انداز ہمیں اچھا لگا۔ بحر، قافیہ اور ردیف کا جھگڑا اور نہ ہی تراکیب کی اُلجھن۔ ڈاک کے ذریعہ ہمیں "تازہ کلام" ملنے لگا۔ اشعار پڑھنے کے سلیقہ سے واقفیت ہمیں پہلے ہی تھی جسے مشاعروں میں شرکت کے وسیلے تجربہ نے آسان بنا دیا تھا۔ ویک اینڈ مشاعروں میں کرتہ اور پاجامہ میں ملبوس ہم ایک ایک کر غزلیں سنانے لگے۔ احباب جی کھول کر واہ واہ کرتے۔ یوں محسوس ہونے لگا، جیسے ہمیں وہ تمام داد واپس لوٹائی جا رہی ہے جو اب تک مشاعروں میں ہم دیتے آئے تھے۔ بیگم کی نظریں بچا کر داد کے جواب میں ہم آداب بھی بجا لاتے۔
ہماری شاعری کے چرچے وطن پہنچنے لگے۔ رسائل کے مدیران ہم سے مالی اور قلمی تعاون کی درخواست کرنے لگے۔ مالی زیادہ اور قلمی کم۔ ہم نے زرِ کثیر سے چند رسالوں کی خریداری اور بعض جرائد کی سرپرستی قبول کی۔ تمام ادبی رسالوں (یہیں ہی کتنے، انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے) میں نوجوانی کی تصویر کے ساتھ "ہمارا کلام" چھپنے لگا۔ اپنے خرچے پر مشاعروں کی دعوتیں بھی آنے لگیں۔ مشاعرہ کا کُل خرچہ برداشت کرنے کی صورت میں مسندِ صدارت کی پیشکش بھی ہوئی۔ ہم نے جلد بازی مناسب نہیں سمجھی اور مشقِ سخن جاری رکھی۔ یوں ہم اردو کی ترقی کے کارِ خیر میں حسبِ مقدور حصہ لینے لگے۔ ہم خوش اور بیگم بھی مطمئن کہ ہم شاعر بنے بغیر شاعری کر رہے ہیں لیکن ہماری خوشی زیادہ عرصہ تک برقرار نہ رہ سکی۔

ایک مشاعرہ میں پُر زور الفاظ میں ہمارے تعارف کے بعد تالیوں کی گونج میں ہم اپنا تازہ کلام پیش کرنے اٹھے۔ احباب کا شکریہ ادا کیا۔ صدرِ محفل سے اجازت لی اور ایک تازہ غزل پڑھنے لگے۔ دو اشعار سنا چکے تھے اور

تیسرا صدرِ مشاعرہ کی نذر کر رہے تھے کہ ایک صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے اور دعویٰ کیا: "یہ غزل میری ہے"۔
ہم سٹپٹا گئے۔ ہمارا پریشان ہونا فطری بات تھی۔ غزل ہماری یقیناً نہیں تھی لیکن ان صاحب کی بھی نہیں تھی۔ ہمیں معلوم تھا کہ غزل کس کی ہے۔ اسی لیے ہم نے غصہ سے کہا: "جناب والا آپ ہوش میں تو ہیں۔ مجھے اس قسم کا مذاق بالکل پسند نہیں"۔

"مجھے بھی۔ میں یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ کوئی میرے سامنے میری غزل کو اپنی کہہ کر سنائے اور داد بھی پائے۔ میں نے یہ غزل صرف دو ہفتے پہلے ایک مشاعرہ میں پڑھی ہے"۔ موصوف غصے سے لال پیلے ہوتے ہوئے بولے اور دوڑ کر دو گواہوں کو پکڑ لائے گواہوں نے اقرار کیا کہ انھوں نے موصوف کو ہو بہو یہی غزل پڑھتے ہوئے سنا ہے۔

ہمارا موقف بہت نازک ہو چلا تھا۔ کیا اعتراف کرلیں کہ ہم شاعر نہیں ہیں۔ اگر نہیں تو پھر ہمیں ثابت کرنا تھا کہ غزل ہماری اپنی ہے۔ ہم نے ایک جھوٹ کو نبھانے کے لیے دوسرا بڑا جھوٹ تراشا: "اوہ ہاں، اب ہمیں یاد آیا! اس غزل کو تو خود ہم نے لکھ کر ایک شاگرد کے نام معنون کردیا تھا۔ ہمیں چاہیے تھا کہ اس غزل کو اپنی بیاض سے علیحدہ کردیتے۔ چھوٹی سی بھول سے یہ کھڑاگ پیدا ہوا ہے۔

"کیا کہا!" کہہ کر مخالف شاعر تھوک اڑاتے اور آستین چڑھاتے ہمارے مدِ مقابل آگئے۔ محسوس ہوتا تھا کہ وہ فری اسٹائل کشتی لڑ کر غزل کی ملکیت کا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں وہ تو خیریت رہی کہ احباب بیچ بچاؤ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے کچھ ہمارے ہمنوا اور چند ان کے طرفدار۔ غزل کی ملکیت کا فیصلہ تو نہ ہوا لیکن اس ہنگامہ کے سبب مشاعرہ برخواست کرنا پڑا۔

استادِ محترم سے رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ غزل کے دوسرے دعویدار صاحب بھی ان ہی کے شاگرد ہیں۔ استاد کی بیماری اور کسمپرسی کے سبب ایک ہی غزل دو سپوتوں کے پاس بھیج دی گئی تھی!
اس واقعہ نے ہماری ساکھ کو شدید متاثر کیا۔ شاعری جاری رکھنے سے مزید بے عزت ہونے کے وسیع امکانات تھے۔ ہم نے محسوس کیا کہ ہمیں شاعری ترک کردینی چاہیے۔ بیگم کا حکم بھی یہی تھا اس طرح اردو کی خدمت ہوگی بالآخر ایک ویک اینڈ مشاعرے میں ہم نے "اب بھی عرض کیا ہے" نہ کہنے کا اعلان کردیا۔ ■■

وجاہت علی سندیلوی

چوہے اور ہم

کسی بھوکے سے ایک شخص نے پوچھا، ایک اور ایک کتنے؟ بھوکے نے فوراً بلا تامل جواب دیا۔ "دو روٹیاں اور وہ بھی خوب موٹی اور اچھی سینکی ہوئی اور کافی گھی چپڑی ہوئی۔" ہمارے خیال میں بھوکے کا جواب بالکل درست تھا کیونکہ بھوکا انسان اپنے دماغ سے نہیں بلکہ معدے سے سوچتا ہے۔ اسی طرح جب ہم نے اپنے ایک وزیر با تدبیر کی تقریر جو انھوں نے چوہے کھانے کے فائدوں پر اسمبلی میں کی تھی سنی، تو اس کے خوش ذائقہ امکانات سے ہمارے منہ میں پانی بھر آیا اور پیٹ میں بے اختیار چوہے کودنے لگے۔ چنانچہ دماغ کو معطل کر کے معدے نے فوراً اعلان کر دیا کہ وہ چوہے کھائے گا اور ضرور کھائے گا۔ ہم نے اپنے آپ کو اپنے عزت مآب وزیر سے اس مسئلے پر بالکل متفق پایا اور ہم بے ساختہ بول اٹھے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ چوہا کوئی میرے ذہن ہے

واقعی ہمارے وزیر صاحب کتنی دور کی کوڑی لائے تھے بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انھوں نے پہاڑ کھود کر چوہا برآمد کر لیا تھا۔ ان کی دریافت تھی کہ چوہے میں دودھ انڈے، مچھلی اور تیتر بٹیر وغیرہ سے بھی زیادہ پروٹین اور دیگر حیاتین پائے جاتے ہیں اور اس کو بطور خوراک استعمال کرنے سے انسانی صحت کو نقصان پہنچنا تو بہت دور رہا سراسر فائدہ ہی پہنچتا ہے۔ مطلب صاف تھا کہ چوہے کھاؤ اور بہت دن جیو خالباً وہ دن دور نہیں جب ہر سرکاری دفتر اور ریلوے اسٹیشن پر عوام کی عاقبت سدھارنے کی خاطر اس قسم کے اشتہار چھپے ہوئے نظر آئیں گے اور پر کسی صحت مند ترین زیادہ تندرست فیتا کی تصویر اور نیچے یہ الفاظ، یہ انسان کے بچے ہمیشہ کھاتے ہیں چوہے۔"

چوہے کھانے کے چٹکلے سے ہمارے وزیر صاحب نے ہم کو نہ صرف ایک بہت لذیذ، صحت بخش اور بہت افراط سے مل جانے والی غذا سے متعارف کر دیا بلکہ چٹکی بجاتے ملک میں غلے کی کمی کی لعنت کو صرف چھو منتر سے ہمیشہ کے لیے ملک بدر کر دیا آپ چوہے کھائیں گے اور ان کو لذیذ، صحت بخش اور بالکل مفت پا کر زیادہ کھائیں گے تو ظاہر ہے کہ پھر غلہ کم کھائیں گے۔ ایک بچت تو یہ ہوئی اور دوسری یہ کہ جو چوہے آپ کے منہ کا

کا نوالہ بن جائیں گے، وہ جو غلہ زہر مار کر جاتے . . . . وہ خود بخود بچ جائے گا۔ اسی کو شاید ہم خواب کہتے ہیں البتہ یہ اندیشہ ضرور ہے کہ اگر ہندوستان کی وہ آبادی جو اب تک پروٹین، حیاتین اور اسی قسم کی دوسری عیاشیوں سے محروم تھی۔ اگرچہ چوہوں کی بدولت ان کا استعمال کرنے لگی تو اس کی عمر میں بہت اضافہ ہو جائے گا اور یقیناً اس کی شرح پیداوار میں بھی۔ اور پھر جب بڈھوں اور بڈھیوں کی زیادہ تعداد گھر میں بیٹھے لیٹے نظر آنے لگے گی تو کھائے ہوئے چوہے کے خمیازے کی صورت میں غلے کی مانگ بھی بڑھ جائے۔ لیکن یہ اندیشہ آج کل کا نہیں بلکہ مستقبل بعید کا ہے اور اس وقت نہ ہم آپ ہوں گے اور نہ ہمارے ا[illegible] چوہے نوش بہادر۔ چوہے ہوں تو ہوا کریں۔ ہوں گے نہیں تو کھائے کیسے جائیں گے؟

زیادہ دن نہیں گزرے جب محکمۂ زراعت کے ایک اونچے صوبائی افسر نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ چوہے ہمارے اناج کا نہ صرف کھیتوں، کھلیانوں اور گوداموں میں بلکہ خود ہماری ناک کے نیچے ہمارے گھروں میں بڑا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں فوراً سے پیشتر ان کا قلع قمع کر دینا چاہیے۔ اس کے بعد ہمارے ضلع کے ایک افسر نے چوہا مار ہفتہ منانے کے سلسلے میں ایک باقاعدہ مقابلے کا اشتہار چھپوا کر جس میں چوہے کے ساتھ ایک ایسے وزیر صاحب کی کہ جن کی مونچھیں چوہے کی مونچھوں سے بس کچھ ہی انیس بیس تھیں تصویر بھی اس میں چھپوا دیا تھا۔ ایک وفادار شہری کی حیثیت سے کمر ہمت کس کر ہم نے اس ہفتے کو کامیاب بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ چوہے دان ناکارہ ثابت ہوئے تھے لہٰذا مجبوراً لاٹھی اٹھا کر ہم تن تنہا اپنے سارے گھر میں چوہوں کی تلاش اور ان کا ناش کرنے کی غرض سے لٹھ بازی کرتے رہے تھے۔ اس مہم میں ہم نے ایک الماری کا شیشہ، دو چینی کی طشتریاں اور ایک پانی کا مٹکا توڑ ڈالا تھا لیکن ہماری بدقسمتی سے ہم سے کوئی لیڈر قسم کا چوہا تو کیا ایک سوکھی چوہیا تک اپنے کیفر کردار کو نہیں پہنچ سکی تھی۔ پتہ یہ چلا کہ ان کی پوری قوم انتہائی چالاک اور پینترے باز واقع ہوئی ہے۔ ہر طرف سے محصور ہو جانے کے بعد بھی وہ ہماری لاٹھی کا وار اس صفائی سے بچائے جاتے جیسے اسٹیج پر پھینکے ہوئے گندے انڈوں اور جوتوں کو، کوئی بہت تجربہ کار اکھاڑ باز نیتا۔

عاجز آکر مجبوراً ہم نے ایک مری ہوئی چھپکلی کی دم کاٹ کر اسے دو حصوں میں تقسیم کیا اور لفافے میں بند کر کے اپنے ضلع کے محکمۂ زراعت کے افسر اعلیٰ کی خدمت میں روانہ کر دیا تھا۔ اس کارگزاری پر ہم کو پہلا انعام ملا اور جب ایک وزیر باتدبیر بھرے جلسے میں پر تکلف دعوت کے بعد اور پرجوش تالیوں کے درمیان، ہم کو انعام دے چکے تو انھوں نے چلتے چلاتے ہمارے کان میں یہ بھی پھونک دیا کہ آئندہ چناؤ کے موقع پر ہمیں پارٹی ٹکٹ دیئے جانے کی وہ بھرپور سفارش کریں گے۔

کوشش کے باوجود ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس چوہے مار ہفتے کا کیا نتیجہ نکلا۔ ہو سکتا ہے کہ اتنے چوہے مار ڈالے گئے ہوں کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے ہوں اور اتنی بہت سی غذا کو ضائع ہوتے دیکھ کر وزیر صاحب کو اس کے پروٹین اور دیگر حیاتین اور ساتھ ہی ساتھ ہمارے بھوکے پیٹ یاد آ گئے ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چوہے جس طرح ہم فرسٹ پرائز پانے والے کو جل دے گئے تھے دوسروں کو بھی دے گئے

ہوں اور مانتے نہ گئے ہوں اور ہمارے وزیر صاحب کو مجبوراً یہ سوچنا پڑتا ہو کہ ان کو پکڑنے اور مارنے کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ ان کو کھا لیا جائے۔ اس سے پیشتر بھی ایک لال بجھکڑ نے کسی اناڑی کو اسی قسم کا مشورہ چڑیا پکڑنے کے سلسلے میں دیا تھا۔ چڑیا کے سر پر سویرے سویرے تھوڑا سا موم رکھ دو۔ جب سورج نکلے گا تو یہ موم پگھل کر چڑیا کی آنکھوں میں چلا جائے گا اور اسے کچھ سجھائی نہ دے گا۔ اس وقت چپکے سے جا کر اسے پکڑ لو۔ چوہے پکڑ کر مارے نہیں جا سکتے۔ اب انھیں کھا لیجیے گا تو یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔

اور سب سے بڑی بات یہ کہ محض چند الفاظ سے ایک جادو کی چھڑی بنا کر ہمارے وزیر صاحب نے ہمارے نیم فاقہ کش ملک کو نمبر ایک قسم کی غذا سے بھرپور دیش بنا دیا اور ہم پلک جھپکاتے غذا کے معاملے میں نہ صرف خود کفیل ہو گئے بلکہ اس قابل بن گئے کہ اب بہت جلد امریکہ اور روس جیسے خوش حال ملک ہم سے ہماری فاضل غذا مانگنے آئیں گے اور ہم طرح طرح کے شتر غمزے دکھا کر ان کو اس بات پہ مجبور کریں گے کہ وہ پہلے اپنے گیہوں کی قیمت گھٹائیں اور پھر ہم سے کچھ چوہوں کی دُمیں نقد داموں لے جائیں۔ اس کے علاوہ چوہوں کی یہ فراوانی اور بڑھتی ہوئی آبادی دیکھ کر خود ملک کے اندر اب کس کے منہ میں طاقت ہے جو یہ آواز تک اٹھا سکے کہ حکومت غذا کی فراہمی کا انتظام نہیں کر پاتی۔ غذا آپ کے گھر میں موجود ہے۔ اب اگر آپ اسے تو لانہ کھائیے تو اس میں بے چاری حکومت کا کیا قصور؟

کوئی فریادی اگر آ کر گڑگڑائے گا: "حضور گھر میں کھانے کو ایک دانہ بھی نہیں۔ چوہے ڈنڑ پیل رہے ہیں" تو ہمارے وزیر صاحب فوراً جواب دیں گے " اجی ان کسرتی چوہوں کو کیوں نہیں کھاتے؟ آپ کی غذا خود آپ کے گھر میں پھدک رہی ہے اور آپ میرا وقت خراب کر رہے ہیں جائیے جائیے مجھے فلاں ناری نکیتن کا ادگھاٹن کرنے کے لیے ابھی جانا ہے وہاں چوہوں کی ایک نئی قسم کی پھلوری پکائے جانے کا بھی تجربہ کیا جائے گا!"

پلنگ پر لیٹے لیٹے ہم نے دو چوہوں کو اپنے سامنے الماری پر دوڑتے دیکھا۔ ایک چوہیا طاق پر رکھے ہوئے ڈبے پر چڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک قوی ہیکل چوہا ہمارے کھونٹی پر ٹنگے ہوئے کوٹ کی جیب سے نکل کر ایک ہی جست میں نعمت خانے کی چھت پر جا بیٹھا لیکن چوہوں کی ان حرکتوں پر روز کی طرح ہمیں کسی تشویش کا احساس نہیں ہوا بلکہ یہ سوچ کر ایک قسم کی خوشی ہوئی کہ ہمارے گھر میں غذا کی کوئی کمی نہیں ہے لہٰذا اب محلے والوں سے بوقت ضرورت سیر بھر آٹا یا پاؤ بھر دال ادھار مانگنے کے بجائے ہم خود دوسرے ضرورت مندوں کو جن کے گھروں میں چوہے نہ ہوں گے، کبھی کبھار ایک آدھ چوہا اپنی سیر چشمی سے دے دیا کریں گے۔

گھر کی غذائی صورت حال سے جو ہمیشہ اپنے ملک کی غذائی صورت حال کی طرح تشویش ناک رہتی تھی کچھ اطمینان ہوا تو ہماری ذرا آنکھ لگ گئی۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک فیل پیکر چوہا ہمارے سامنے کرسی پر بیٹھا بڑے غصے سے چلا رہا ہے" تم انسانوں کی پوری قوم انتہائی چالاک اور مکار ہے۔ پہلے ہم چوہے جن گھروں میں پہنچ جاتے نہ صرف طرح طرح کے اناج اور کھانے کی چیزوں کی بلکہ گھی دودھ اور

بالائی کی ریل پیل دکھائی پڑتی تھی۔ تم نے نہیں معلوم اب یہ ساری چیزیں کہاں سمیٹ کر رکھ دی ہیں۔ ہر گھر میں جھاڑو پھری دکھائی دیتی ہے۔ بڑے سے بڑے گھر میں غلہ بڑی بڑی مٹکوروں کے بجائے چھوٹے چھوٹے ٹین کے ڈبوں میں رکھا جاتا ہے۔ گھی دودھ اور بالائی کا کہیں پتہ اور نشان بھی نہیں ملتا اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ بدبختوں نے ہر چیز میں ملاوٹ کر رکھی ہے۔ تمہارے دیئے ہوئے زہر کو ہم کھاتے ہیں تو ہمارا کچھ بھی نہیں بگڑتا لیکن جب تمہاری غذا کھاتے ہیں تو اینٹ، پتھر، چونا، برادہ، گھاس، مٹی اور کیچڑ کا تیل اور موبل آئل وغیرہ کا میل خود غذا سے کہیں زیادہ بڑھ گیا ہے تو ہماری صحت پر بہت خراب اثر پڑتا ہے اور ہم بے موت مرنے لگتے ہیں۔"

چونکہ اس ناشدنی نے ہماری پوری نسل انسانی کو بدنام کیا تھا لہٰذا ہمیں صبر کا یارا نہیں رہا اور ہم برس ہی تو پڑے اس پر "بس! بس! چوہے کے بچے اپنا منہ بند کر! ناشکری کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ صدیوں سے تیری نسل ہم انسانوں کی پیدا کی ہوئی غذا پر حرام خواری سے پل رہی ہے اور آج تو آیا ہے ہم کو نام دھرنے! ہمارے محکمۂ اعداد و شمار نے باقاعدہ چوہے شماری کے بعد بتایا کہ ہمارے ملک میں انسانوں سے آٹھ گنا زائد چوہے بستے ہیں لہٰذا آٹھ چوہے ایک انسان کے برابر غذا کھا جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہاری نسل اسی قدر غلہ زہر مار کر جاتی ہے جس قدر کہ ہم انسان کھا پاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں غلہ کا جو کال پڑا ہے اس کا اصل سبب ہمارے غذائی وزیروں کی نااہلیت نہیں بلکہ تم چوہے ہو لیکن خیر اب وقت آگیا ہے کہ تمہاری نسل ہماری نسل کا قرضہ اصل مع سود چکا دے۔ تم ہماری غذا کھاتے ہو ہم خود تمہیں کھائیں گے......"

ہمارے سر کے قریب ایک زور دھماکا ہوا اور ہم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے تو دیکھا کہ سرہانے کی الماری پر سے چنے کا ڈبہ زمین پر گر پڑا ہے اور گرانے والا ایک مسٹنڈا اور چھچھوندر چوہا دہیں بیٹھا ......ہم سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہا تھا "کہیں بے کیسی رہی؟" ہم قاضی نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود ہمارے گھر کے چوہے بڑے سیانے ہیں۔ وہ نقصان کر کے الٹا ہمیں کو آنکھیں دکھاتے ہیں اور اس وقت تک ہماری موجودگی کو خاطر میں نہیں لاتے جب تک ان کو بھگانے کی کوئی خاص کوشش نہ کی جائے لیکن اس وقت جب کہ ہم نے اس چوہے کو نفرت اور غصے سے نہیں بلکہ اس تیار اشتہا انداز سے دیکھا کہ اس کی سری اور پائے اور کلیجی اور گردے کیسے ہوں گے اور اس میں کتنا گوشت نکلے گا تو وہ ہم سے نظریں ملاتے ہی ایسا بھاگا جیسے کسی آوارہ نظر باز سے کوئی باکبار حسینہ۔ ایک نعرۂ مستانہ لگا کر ہم اس کی طرف جھپٹے اور اگر اس وقت وہ ہمارے ہاتھ آجاتا تو ہم اپنے چوہے کھانے کی مہم کا افتتاح شاید اسی کو کچا چبا کر کر دیتے۔ الماری سے لڑ جانے کے باعث ہم اپنی ناک سہلاتے ہوئے بیٹھ گئے اور ہمارا شکار الماری کے کسی سوراخ سے نکل کر اللہ کا پیارا نہیں بلکہ نو دو گیارہ ہو گیا۔

ہم نے خود تو پکا ارادہ کر لیا تھا کہ چوہوں کو کھائیں گے۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ ہمارا یہ ارادہ ہماری نصف بہتر کے تعاون کے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ہماری...... بیگم دنیا میں صرف دو چیزوں سے ڈرتی ہیں۔ ایک تو چوہے سے اور دوسرے اپنے چچا سے۔ چچا کے متعلق تو ابھی تک کوئی سرکاری احکام جاری نہیں ہوئے تھے۔ کیونکہ چھپکلی، چھچھوندر سے لے کر ہاتھی تک ابھی بہت سے جانور وقت ضرورت کے لیے چھوڑ دیئے گئے تھے، البتہ چوہے کھانے کے متعلق انھیں اپنا ہم خیال بنانا بھی

کی گردن میں گھنٹی باندھنے سے بھی زیادہ مشکل کام تھا۔

ہم اسی ادھیڑبن میں تھے کہ ہماری بیگم نے اکتا کر ایک تھان بلکہ رہائی سے کہا "آج ٹھیلے والا ترکاری نہیں لایا۔ منڈی سے جاکر کوئی ترکاری لے آئیے۔ شام کو پکانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔"

"بہت کھا چکے ترکاری ورکاری ہم اب ہرگز نہیں کھائیں گے۔" ہم ٹھنک کر بولے۔

"تو صرف دال کھائیے گا اس وقت؟"

"دال کھائیں ہمارے دشمن! ہم تو کھائیں گے انڈے، مچھلی، تیتر اور بٹیر کا مرکب۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ چوہے! یہ جو مفت کا منوں گوشت ہمارے چاروں طرف پھدک رہا ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے ہم پاگل ہیں جو اس گرمی اور دھوپ میں منڈی جاکر دھکے الگ کھائیں اور اپنی گاڑھی کمائی کے پیسے الگ خرچ کریں؟"

"کیا ہو گیا ہے تم کو؟ کدھر پھدک رہا ہے یہ منوں گوشت؟"

"تمھیں نہیں دکھائی پڑتے یہ چوہے؟ وہ دیکھو ایک تو سامنے ہی بیٹھا تمھیں اپنی دم سے سلام کر رہا ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟" بیگم کی مارے خوف کے گھگھی سی بندھنے لگی۔

"مطلب یہ کہ آؤ ہم تم مل کر گھر کے یہ سارے چوہے ہڑپ کر جائیں" ہم نے ابھی اپنا جملہ بھی پورا نہیں کیا تھا کہ ایک چوہیا ہمارے بستر کی تکیہ کے نیچے سے نکل کر بھاگی اور ایک چیخ کے ساتھ بیگم سامنے رکھی ہوئی کرسی پر گر پڑیں اور کچھ بے سدھ سی ہو گئیں۔ اسی وقت دخل در معقولات کرتے ہوئے ایک موٹا سا چوہا نعمت خانے پر سے "لانگ جمپ" کر کے پھاندا۔ ہم بے تحاشہ اس کے پیچھے دوڑے اور ایک دوسری چیخ کے ساتھ ہوش میں آتے ہوئے بیگم دوڑ کر چھلانگ لگا کر ہمارے بستر پر کھڑی ہو گئیں۔ سامنے دیوار سے ٹکرانے کے بعد ہم خالی ہاتھ لوٹ آئے۔ چوہا جست لگانے کے ساتھ ہی ساتھ تیز دوڑنے میں بھی بڑا "فرنٹ" تھا۔

بیگم قریب قریب روتے ہوئے بولیں "ایسی گھناؤنی باتیں کر کے مجھے پریشان کرنے سے فائدہ؟"

ہم نے... بڑے لیڈرانہ انداز میں انھیں سمجھانا شروع کیا کہ چوہے کھانے سے کیا روحانی، مادی، اقتصادی اور سیاسی فائدے ہیں اور ہو سکتے ہیں مثلاً وقت اور پیسے اور زحمت کی بچت کے علاوہ ایک بہت بڑی بچت گھی، تیل، نمک، شکر، صابن، کاغذ اور کپڑے وغیرہ جنہیں یہ ہضم کر جاتا ہے کے بجٹ میں بھی اس موذی جانور سے چھٹکارا پاکر ہو جائے گی۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ کیسے کیسے لذیذ اور چٹپٹے کھانے اور پکوان، زبان کی رونق اور معدے کی زینت بنیں گے اور پھر اگر یہ تجربہ کامیاب رہا تو ہم دوسرے غیر ضروری جانوروں پر اس سے بھی زیادہ دل چسپ تجربے کر سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ہماری اس بے ربط گرما گرم تقریر کے دوران بیگم منھ ڈھانپے برابر سسکیاں لے رہی تھیں، ٹیپ کے بند پر جب ہم نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ چوہوں کو کھا جانے کی تلقین کی تو انھیں ایک بڑے زور کی ابکائی آئی اور وہ بھاگیں غسل خانے میں۔ کچھ دیر بعد ہم اپنے کمرے سے اس بات کا جائزہ لینے کے لیے کہ گھر میں کتنے چوہے یعنی ہمارے غذائی سرمائے کی موجودگی کا امکان ہے، باہر نکلے تو ڈرائی

سے معلوم ہوا کہ بیگم ٹکٹ بلوا کر اپنے میکے جا چکی ہیں۔

وہ چوہے مخالف سمتوں سے ہمارے سامنے بھاگے اور ہم ان کو پکڑنے کچھ اس انداز سے دو طرفہ دوڑے کہ چوہے تو بھاگ نکلے اور ہم نوکرانی کے حیرت سے پھیلے ہوئے پائنچوں کے درمیان کچھ اس والہانہ طور سے داخل ہو گئے جیسے کوئی سعادت مند چوہا چوہے دان میں داخل ہوتا ہے۔ وہ ایک چیخ مار کر اور نہیں معلوم کیا بڑبڑاتی ہوئی بھاگی اور نہ صرف گھر سے باہر ہو گئی بلکہ ہمیشہ کے لیے داغِ مفارقت دے گئی۔

نوکرانی کم بخت نے باہر نکل کر نہیں معلوم کیا گل کھلایا کہ تھوڑی ہی دیر بعد ہمیں اپنے صدر دروازے پر کچھ گڑبڑ اور شور و غل سنائی دیا۔ ہم دروازہ کھول کر باہر آئے تو دیکھا کہ ہمارے گھر کے سامنے ناک پر رومال رکھے ہوئے لوگوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہے۔ ہم کو دیکھتے ہی اس ہجوم میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ کسی ناشدنی نے نعرہ بلند کیا "ہمارے محلے میں چوہا خور" اور سارا مجمع ایک زبان ہو کر چیخا "نہیں رہے گا! نہیں رہے گا!" یہ اور پاجی نے ہانک لگائی: "جو کھائے موس کا ماس" اور غالباً پہلے سے طے شدہ اسکیم کے ماتحت سارا مجمع پھر گرجا "اس کا کر دیں ستیاناس" اور پھر یہ اور اسی قبیلے کے دوسرے خطرناک نعرے ایسے دھڑا دھڑ داغنے لگے جیسے کسی میدانِ جنگ میں توپیں۔ مجمعے نے ایک دم سے بڑھنا اور پھیلنا شروع کر دیا اور ذرا سی دیر میں نہ صرف سڑک کی ساری ٹریفک بند ہو گئی بلکہ جہاں تک دکھائی پڑتا ناک پر رومال رکھے ہوئے آدمیوں کا دریا موجیں مارتا ہوا نظر آنے لگا۔ ہمارے غریب خانے سے تھوڑے ہی فاصلے پر جو سرکس ہو رہا تھا اس کے سارے تماشائی اس کو چھوڑ کر ہمیں دیکھنے امنڈ آئے تھے۔ ہم نے اپنے گھر میں واپس ہونا چاہا لیکن اب ہمارے اور ہمارے دروازے کے درمیان آدمیوں کی قطاروں کی کئی دیواریں کھڑی ہو چکی تھیں۔

مختلف اقسام کے نعرے برابر لگ رہے تھے اور تھوڑی دیر کے بعد ہمیں یہ تعجب خیز احساس ہوا کہ ہم اپنے پیروں پر کھڑے نہیں بلکہ کچھ لوگوں کے کندھوں پر بیٹھے ہیں۔ نعروں کے درمیان اس قسم کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

"آپ ہی چوہے کھاتے ہیں؟"

"شکل بھی تو چوہوں جیسی پائی ہے!"

"اس کا منہ کالا کر کے باقاعدہ جلوس نکلنا چاہیے۔"

"اسی چوہے خور کی بدولت سارے محلے میں سڑاند اور بدبو پھیلی رہتی ہے۔"

"میں نے اس کے دروازے پر ایک آدمی کھائی ہوئی کتے کی لاش بھی دیکھی تھی۔" وغیرہ وغیرہ۔

ہماری خوش قسمتی سے پولیس کے امن دستے نے آنے میں دیر نہیں کی۔ چراغ جلنے سے پیشتر ہم سڑک پر ناجائز مجمع اکٹھا کرنے اور امن عامہ کو خطرے میں ڈالنے کے سلسلے میں گرفتار کر لیے گئے۔ اور مجمع کے ہاتھوں تھوڑی سی مار پیٹ کے بعد ہم پرجوش نعروں کے درمیان بڑی دھوم دھام سے پولیس کی لاری میں ٹھونس کر حوالات بھیج دیے گئے۔ حوالات پہنچ کر ہم نے تھانہ صاحب کی خوشامد درآمد کر کے اپنے ہم حزب منتری کو فون کرایا لیکن وہ کسی تاریخی تحقیق کا افتتاح کرنے جا چکے تھے۔ اپنی بیگم کے چچا کو فون کرنا چاہا تو پتا چلا کہ ان کے ٹیلی فون کا تار کوئی چوہا پہلے ہی کتر چکا تھا۔

پرویز یداللہ مہدی (بمبئی)

ملاوٹ نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے

بمبئی میں کبھی یہ کہاوت مشہور تھی کہ باہر والوں کو نہ یہاں کا پانی پچتا ہے نہ شہرت۔ غالباً یہ اس وقت کی بات ہے جب بمبئی کا محکمۂ آب رسانی عرف ڈپارٹمنٹ آف واٹر ورکس گھر گھر کوچہ کوچہ کھولی کھولی خالص پانی سپلائی کیا کرتا تھا گویا نل کی ٹونٹی کھولتے ہی کثافت و غلاظت سے پاک پانی کی دھار بہنے لگتی تھی۔ رہی شہرت تو اگلے وقتوں میں یہ صرف بے لوث، بے ریا، سچے، کھرے، بالفاظ دیگر شریان ستیہ وادی قسم کے عوامی خدمت گاروں کی بلا شرکت غیرے میراث ہوا کرتی تھی لیکن بھلا ہو ملاوٹ کی گرم بازاری کا اب نہ یہاں خالص پانی رہا ہے نہ شہرت خدا جھوٹ نہ بلوائے، ان دنوں جو پانی یہاں بالخصوص پینے کے استعمال میں آتا ہے اس میں جراثیم کش دواؤں اور جراثیم دونوں کا تناسب برابر برابر ہوتا ہے بلکہ کبھی کبھی تو ان دیکھے جراثیم کے ساتھ ہمہ اقسام کے جیتے جاگتے حشرات الارض بھی بن بلائے مہمانوں کی صورت نلوں سے ٹپک پڑتے ہیں۔ ان ناخواندہ مہمانوں کی آمد سعید سے صرف اہل خانہ ہی محظوظ نہیں ہوتے بلکہ ان مہمانان خصوصی کے شان نزول کی خبریں مقامی اخباروں میں مع تصویر کے شائع کروا کے دیگر خانہ داروں کو بھی اپنی خوشی میں برابر کا شریک کرتے ہیں اور یوں حشرات الارض کے اشرف المخلوقات کی روزمرہ زندگی میں بے جا عمل دخل کے سلسلے میں مزید مہر تصدیق ثبت فرماتے ہیں۔ جب کہ محکمۂ آب رسانی کے ارباب مجاز ان حیرت انگیز انکشافات پر بجائے شرمندہ یا نادم ہونے کے معترضین کا منہ بند کرنے کے لیے ڈھٹائی کے ساتھ اس قسم کے بیانات جاری کرتے ہیں کہ اگر کبھی کبھار پانی کے ساتھ کیڑے مکوڑے جھینگر، مینڈک، بچھو اور سنپولے وغیرہ نلوں سے ٹپکتے ہیں تو اس سے عوام الناس کو چراغ پا نہیں ہونا چاہیے بلکہ خوش ہونا چاہیے کیوں کہ عوام سے صرف پانی کا ٹیکس لیا جاتا ہے، حشرات الارض کی سپلائی ٹیکس فری ہوتی ہے!

جہاں تک شہرت کا معاملہ ہے اس میں فی زمانہ بدنامی کی ملاوٹ اس حد تک ہو چکی ہے کہ بدنامی کو شہرت اور شہرت کو بدنامی سے الگ کرنا، اسرائیل کو فلسطین سے بے دخل کرنے کے برابر ہے۔ یوں بھی شہرت کے پیمانے ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں کسی زمانے میں آدمی کی نیک نفسی و بے لوث چلن شہرت کی ضمانت ہوا کرتی تھی لیکن آج بدنام والا ہی ہے جس کا کردار مشکوک مگر پی آر شپ (P.R. SHIP) مضبوط ہو۔ مضبوط اگر آدمی جانے انجانے میں کسی اسکینڈل میں ملوث ہو جائے تو پھر اسے راتوں رات مشہور ہونے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ چنانچہ بمبئی کی بیشتر مشہور

و نامور شخصیتوں کی شہرت کے ڈانڈے کسی نہ کسی ساختہ پرداختہ اسکینڈل سے ضرور ملتے ہیں۔ اس قماش کے شہرت یافتہ اصحاب باکمال ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں۔ مختلف قسم کے فلاحی، رفاہی انجمنوں، اداروں، سوسائٹیوں کی صدارتیں ان کے قدم چومتی ہیں۔ ادبی سیاسی، ثقافتی پروگراموں کی مہمان خصوصی والی کرسیاں ان کی راہوں میں آنکھیں بچھاتی ہیں۔ سرکار دربار میں ان کے نام کا بول بالا ہوتا ہے۔ ان کی رسوائی کی ہر جگہ پیشوائی ہوتی ہے۔ ان کی بدنامی کے آگے ہر مجلس پر، ہر محفل میں نیک نامی سرنگوں ہوتی ہے۔ اس لیے تو کسی شاعر نے کہا ہے ؎

بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔

سچ تو یہ ہے کہ بمبئی میں ملاوٹ نے ماشاء اللہ اتنی ترقی کرلی ہے کہ اب یہ پاپ نہیں بلکہ پیشہ بن گئی ہے ظاہر ہے جو کاروبار آدمی کا پیٹ پالتا ہے وہ پیشہ ہی کہلائے گا۔ اور ملاوٹ کا تعلق تو براہِ راست پیٹ ہی سے ہے۔ چنانچہ یہ ایک طرف چند ملاوٹ بازوں کا پیٹ پالتی ہے تو دوسری طرف ہزاروں لاکھوں عوام الناس کا پیٹ چھلنی کرتی ہے۔ یوں بھی اشیائے خورد و نوش میں ملاوٹ سازی کا ہنر ہم بھارت واسیوں کو ورثے میں ملا ہے ہمارا دن دودھ میں پانی ملانے سے شروع ہوتا ہے اور رات میں نیند میں نیند کی گولی ملانے پر ختم ہوتا ہے۔ گویا جن کی بسم اللہ اور تمت بالخیر دونوں ہی ملاوٹ سے اس قدر پُر ہوں ان کی ملاوٹ سازی و ملاوٹ بازی میں کس کلام کی گنجائش ہی ممکن نہیں، البتہ اگلے وقتوں کے ملاوٹ باز کھانے پینے کی چیزوں جیسے چاول آٹے دال اور مسالوں میں کنکر پتھر، مٹی پسی ہوئی اینٹیں۔ نقلی رنگ، گھوڑے کی لید، ہڈیوں کا چورہ لکڑی کا بُرادہ بڑی ہنرمندی اور صفائی سے ملایا کرتے تھے جب کہ آج یہ تناسب و ترتیب یکسر اُلٹ گئی ہے۔ یعنی آج کے ملاوٹ ساز و ملاوٹ باز مذکورہ ملاوٹی اشیاء میں مسالہ چاول آٹا دال ملا دیتے ہیں۔ یقین کیجیے اس الٹی ترتیب و تناسب پر ہمیں قطعاً کوئی اعتراض نہیں کیوں کہ چھری خربوزے پر گرے یا خربوزہ چھری پر، جان بہرحال خربوزے کی جاتی ہے۔ سچ کہتے ہیں ملاوٹ سے پُر غذا کھاتے کھاتے اب ہمارا معدہ اس قدر لکڑ ہضم، پتھر ہضم ہو چکا ہے کہ خدانخواستہ اگر کبھی بھولے سے اصل اور خالص غذا کھانے کو مل جائے تو بلا مبالغہ پہلا ہی لقمہ ہمارے ملاوٹی وجود کو لقمۂ اجل کر دینے کے لیے کافی و شافی ہوگا اس لیے ہم دن رات ان پیشہ ور ملاوٹ بازوں کے حق میں یہی دُعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ملاوٹ کے جنم داتاؤ تم جیو ہزاروں برس اور ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار وہ بھی ملاوٹ سے پاک۔

ذرا سوچیے اگر اپنے دیش میں ایسے پہنچے ہوئے ملاوٹ ساز و ملاوٹ باز نہ ہوتے تو آئے دن اخباروں میں ایسی دھماکہ خیز خبریں کہاں سے پڑھنے کو ملتیں۔ شادی کی ایک دعوت میں ملاوٹی غذا کھانے کی وجہ سے دولہا دلہن دونوں بجائے سہاگ کی سیج کے اسپتال کے بیڈ پر پہنچ گئے۔ دو سَو باراتی بھی ان کا ساتھ دینے کے لیے مذکورہ اسپتال میں منتقل کر دیئے گئے۔ اس اندوہناک واقعہ سے ثابت ہوا کہ ؎

جہاں بجتی ہے شہنائی وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں۔

ملاوٹی وڑا پاؤ کھا کر ایک پرائمری اسکول کے تین ٹیچروں سمیت پچاس اسکولی بچے پیٹ کا شکار ہوگئے اور پیٹ بھرنے کے جرم میں اسپتال میں بھرتی ہوگئے۔

یہ سچ ہے کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ زہر کو زہر ہی سے مارا جاتا ہے لیکن ملاوٹ یقیناً وہ واحد ستم قاتل ہے

جو پہلے کھانے پینے کی اشیاء کو مارتا ہے پھر کھانے والے کو مار دیتا ہے گویا وہی بات نہ بانس بچے نہ کُتّا کھائے۔
اسی لیے تو ملاوٹ کے آگے کیا فرد کیا جماعت، کیا حکومت، کیا سماج سبھی کی بولتی بند ہو جاتی ہے۔ اگر مرزا غالب
اس ملاوٹی دور میں ہوتے تو زمانے کے بجائے ملاوٹ کو اپنی تباہی و بربادی کا اس طرح ذمہ دار گردانتے۔ ؎

مارا ملاوٹوں نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی!!

ملاوٹ سازی و ملاوٹ بازی کی کل ہند دوڑ میں بمبئی کسی جیک پاٹ دوڑ جیتنے والے خوش نصیب گھوڑے
کی طرح سب سے آگے ہے۔ ملک کے دیگر ترقی یافتہ شہروں میں ملاوٹ کی کاریگری و بازی گری اگر فن کے درجہ
پر فائز ہے تو بمبئی میں حیرت انگیز طور پر ترقی کر کے فن کی تمام بلندیوں کو پار کر کے صنعت کی حدود میں داخل
ہو گئی ہے۔ چنانچہ یہاں اس کی باقاعدہ انڈر گراؤنڈ انڈسٹریاں اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں اور بعض ملاوٹ
دن رات اس کارِ خیر میں لگا رہتی ہیں۔ کبھی کبھی ہم سوچتے ہیں اگر یہ ملاوٹی انڈسٹریاں اور کارخانے راؤنڈ دی
کلاک (ROUND THE CLOCK) اس کارِ خیر میں ہمہ تن مصروف نہ ہوتے تو ملک کی لامحدود آبادی اور محدود
اشیاء خورد و نوش کی پیداوار میں تناسب و توازن برقرار رکھنا کس قدر مشکل ہو جاتا۔

کاروبار چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، سرمایہ کے بغیر نہ تو شروع کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی یہ پھولتا پھلتا ہے اور
فی زمانہ کسی چھوٹے موٹے نٹ پاتھی دھندے کے لیے بھی اچھی خاصی رقم درکار ہوتی ہے لیکن ملاوٹ کا منافع بخش
دھندا تا حال ایک ایسا تیر بہدف دھندا ہے جو معمولی سرمائے سے بھی شروع کیا جا سکتا ہے بلکہ کبھی کبھی تو یہ
سرمایہ کے بغیر بھی کیا جا سکتا ہے۔ بس اس کے لیے شرط صرف اتنی ہے کہ امیدوار کے پاس سرمایہ بھلے ہی نہ ہو
لیکن اس کے سر میں مایا ضرور ہونا چاہیے۔ اس طرح اس کے سر کا مایا دوسروں کے سرمائے کو یوں اپنی طرف کھینچتا
ہے۔ جیسے مقناطیس لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ حالانکہ کہاوت مشہور ہے کہ روپیہ، روپے کو کھینچتا ہے۔
لیکن ملاوٹ کے دھندے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ملاوٹ باز کے سر کا مایا مارکٹ کے سرمائے کو اپنی
طرف شرطیہ کھینچتا ہے۔ البتہ یہ دھندا، صرف انہی لوگوں کو راس آتا ہے جو ہمدردی، خلوص محبت، شرافت
انسانیت جیسے بیچے اور کھرے جذبوں کو محض بے معنی لفظ سمجھ کر کھرچ دیتے ہیں اور ضمیر کو اپنی ترقی کی راہ
کی زنجیر جان کر کاٹ دیتے ہیں۔

آج دھنوان لوگ، جن کا وجود ملاوٹ کے خمیر کا مرہونِ منت ہے۔ کھلم کھلا ملاوٹ کے کاروبار میں سرمایہ
کاری کر کے، ثواب دارین کی جگہ بینک کی دولت اکٹھا کرتے ہیں اور پل چاہ، مسجد اور تالاب کے بجائے ہوٹل،
مےخانہ، جوئے خانہ اور سوئمنگ پول تعمیر کر کے چاندی کے بدن اور سونے کی تن والی حسیناؤں کو باہوں میں لیے ہوئے
عیش و عشرت کے سمندر میں ڈبکیاں لگاتے ہیں اسی لیے تو کسی شاعر نے کہا ہے۔ ؎

ملاوٹ کے دھندے میں کیا کچھ نہیں ہے
ملاوٹ نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے

ملاوٹ بازوں کے سروں پر سینگ تو نہیں ہوتے تاہم ان کی کمائی پہچان یہ ہے کہ یہ ہمیشہ ایسی چیزوں

کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جو آسانی سے اشیائے خورد و نوش میں گھل مل جانے کی صلاحیتیں رکھتی ہوں آزادی کے بعد سے اپنے ملک میں ملاوٹ کی صنعت نے جتنی ترقی کی ہے اتنی ترقی کسی اور صنعت نے نہیں کی۔ یہ انہیں ملاوٹ بازوں کی ملاوٹی کارستانیوں کا ادنیٰ سا ثبوت ہے کہ بمبئی میں اشیائے خورد و نوش کے ساتھ انسانی قدریں بھی ملاوٹ کی شعبدہ کاری سے بڑی طرح متاثر ہو چکی ہیں۔ چنانچہ یہاں آپ کو دھرم اور ایمان میں، بے ایمانی اور ہٹ دھرمی کی ملاوٹ ملے گی۔ سچ میں جھوٹ کی ملاوٹ، ہمدردی میں خود غرضی کی ملاوٹ، وعدوں قسموں رسموں میں دغا، فریب اور دھوکے کی ملاوٹ، عبادت و ریاضت میں دکھاوے اور لالچ کی ملاوٹ، خلوص میں اداکاری کی ملاوٹ، پیار و محبت میں ریاکاری کی ملاوٹ، دشمنی میں مکاری کی ملاوٹ حسن میں میک اپ کی ملاوٹ، عشق میں ہرجائی پن کی ملاوٹ۔ یہاں تک کہ ملاوٹ میں مزید ملاوٹ۔ ■□

غزل

اقبال شانہ (جدہ، سعودی عرب)

کچن میں جب چلی جائے تو وہ کفگیر ہو جائے
ڈرائنگ روم میں بیٹھے تو اک تصویر ہو جائے

ہمارے گھر کے ہر کمرے کی زینت بن گئی ہے وہ
مگر بیڈ روم میں آ جائے تو شمشیر ہو جائے

بہو بن جاؤ گر تم میری امی جان کی جاناں
تو میری زندگانی وادیٔ کشمیر ہو جائے

دلہن بن کر قدم رکھے گی جیسے ہی وہ میرے گھر
مرا گھر اس کے ابا جان کی جاگیر ہو جائے

کروں گا انتظارِ یار اپنے آخری دم تک
مگر میں روٹھ جاؤں گا اگر تاخیر ہو جائے

وہ وعدہ کر گئے ہیں پیر کے دن لوٹ آنے کا
مرے اللہ ہفتے کا ہر اک دن پیر ہو جائے

سنائیں آج جو بھی آپ میں برداشت کر لوں گا
غزل کہنے سے بہتر ہے کوئی تقریر ہو جائے

یہ کاغذ پر کریں گے شاعری کب تک میاں شانہ
کہاں ایسی غزل "لاری" پہ جو تحریر ہو جائے

انٹرنیشنل غزل

اقبال شانہ

بہت جس کو تلاشا انڈیا میں
ملا وہ مجھ کو انڈونیشیا میں

محبت ہو گئی "رومانیا" میں
ہوا ہے عقد "موریتانیا" میں

خدا کا شکر ہے بچے کی ان کے
ولادت ہو گئی ہسپانیا میں

نہیں ثانی مرا جغرافیہ میں
بلوچستان ہے کمبوڈیا میں

شمالی کوریا کو جب میں پہنچا
وہ جا بیٹھا جنوبی کوریا میں

ہمارے بیچ خطِ استوا ہے
میں انگولا میں وہ منگولیا میں

ہماری ذات گویا بٹ گئی ہے
عرب میں جسم ہے جاں انڈیا میں

تڑپتا ہوں میں کولمبو میں یارو
مرا محبوب ہے کولمبیا میں

تمہارے عاشقوں نے جانِ جاناں
بہت مارا مجھے "بلغاریہ" میں

میں اک حبشن پہ شانہ مر مٹا ہوں
ملی تھی مجھ کو وہ تنزانیہ میں

غزل

شجاع الدین عاطف
(آسٹریلیا)

کوئی امید بر نہیں آتی
لاٹری بھی ادھر نہیں آتی

سب نے پہنی ہیں پتلونیں آج
کوئی لڑکی نظر نہیں آتی

پہلے [illegible] تھی آجکل
[illegible] سال بھر نہیں آتی

روز آئیں فضول سی خبریں
کوئی اچھی خبر نہیں آتی

ہم بھی [illegible]
شاعری ہم کو کر نہیں آتی

[illegible]
[illegible] رات بھر نہیں آتی

[illegible] منہ سے [illegible] عاطف
شرم تم کو مگر نہیں آتی

ڈاکٹر محمد یونس بٹ

جھوٹ کے بارے میں سچ

صاحب! ہمیں جو بندہ کہے میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا ہمیں اس پر بڑا ترس آتا ہے، گو گونگے بندے پر کسے ترس نہیں آتا! جھوٹ تین طرح کا ہوتا ہے سادہ جھوٹ، سفید جھوٹ، اور سرکاری اعداد و شمار۔ کہتے ہیں عورتیں مردوں سے زیادہ جھوٹ بولتی ہیں جس کی وجہ شاید یہ ہوگی کہ وہ مردوں سے زیادہ جو بولتی ہیں۔ خلیل جبران کہتا ہے کہ سچ تو دو بندوں کا محتاج ہوتا ہے ایک سچ بولنے والے کا اور ایک سچ سننے والے کا پر جھوٹ کسی کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ جھوٹ بولنے والا اسی کا محتاج ہوتا ہے۔

ہمیں جھوٹ کے بارے میں یہ تحریر لکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ پتہ چلا آج کل کسی کے منہ پر سچ بولنا اسے برا بھلا کہنا ہے اور جھوٹ بولنا مہذب ہونے کا نام ہے ہم نے مانا کہ جھوٹ بولنا ایک تخلیقی کام ہے۔ کیوں کہ سچ بولنے والا تو وہی بات کرتا ہے جو ہوئی ہوتی ہے پر جھوٹا نئی بات کرتا ہے۔ جھوٹ بچہ بولے تو غلطی اور اگر بزرگ بولے تو جھوٹ، سچ ہوتا ہے۔ مجھے ایک سیاست دان نے بتایا کہ میں نے تب تک کبھی جھوٹ نہ بولا جب تک میں دو سال کا نہ ہوگیا۔
ایک ماں نے بیٹی سے پوچھا تم فلاں سے شادی کرنا کیوں چاہتی ہو؟ اس نے کہا اس لیے وہ کہتا ہے میں شہر کی سب سے خوبصورت لڑکی ہوں۔ ماں نے کہا اس سے شادی کر لو جو پہلے دن ہی جھوٹ بولنے لگا ہے وہ اچھا خاوند ثابت ہوگا۔

اگر آپ جاننا چاہیں کہ دیکھنے میں سر درد کیسا ہوتا ہے تو آپ پنجابی فلم دیکھ لیں اور اگر دیکھنا چاہیں کہ جھوٹ دیکھنے میں کس طرح کا ہوتا ہے تو کسی سیاست دان کو دیکھ لیں۔ کسی نے پوچھا یہ کیسے پتہ چلتا ہے کہ کب سیاست دان جھوٹ نہیں بول رہا جواب ملا جب اس کے ہونٹ ہلتے نظر نہ آئیں کچھ کہتے ہیں گر جھوٹ نہ ہوتا تو ہر طرف سچ ہوتا یہ ایسے ہی ہے جیسے بندہ کہے کہ پانی نہ ہوتا تو دودھ خالص ملتا ہر لڑکی کو یہ بیماری تنگ کرتی ہے کہ ہر روز اس کی عمر میں اضافہ ہو جاتا ہے وہ عمر کو بڑھنے سے روکنے کے لیے کئی ٹونے ٹوٹکے استعمال کرتی ہے پر میں ایک طریقہ بتا سکتا ہوں جس سے عمر بڑھنے سے روکی جا سکتی ہے اور وہ ہے جب کوئی آپ سے آپ کی عمر پوچھے تو آپ جھوٹ بول دیں آنے والے وقت کے بارے میں جھوٹ کو امید کہتے ہیں۔ امید آدھا جھوٹ ہوتی ہے پر آدھا جھوٹ آدھے سچ سے کم جھوٹا ہوتا ہے۔ ناامیدی میں بھی پوری امید ہوتی ہے کیوں کہ ناامید لکھنے کے لیے پہلے نا لکھنا ہے پھر امید۔

غزل

خالد عرفان
(کراچی)

نہیں تعلیم کی اب قدر و قیمت کھیل کے آگے
ہو جیسے ایک ناکارہ سا انجن ریل کے آگے

یہاں کرکٹ کے مستقبل کی مجھ کو تو پشیمانی ہے
بجائے علم و دانش کھیل میں اسکوپ کافی ہے

رسائی کھیل کو حاصل ہوئی سارے زمانوں تک
کتابیں ہو گئیں محدود الماری کے خانوں تک

جو ہیں ان پڑھ "کھلاڑی" ان پہ دنیا نے نظر کی ہے
ہوں "ایم اے" پاس کی قسمت میں بالآخر کلرکی ہے

بزرگ اب اپنے بچوں سے نہیں کہتے پڑھو بیٹا
یہی کہتے سنا ہے کھیل میں آگے بڑھو بیٹا

کتابوں سے کوئی اب استفادہ بھی نہیں کرتا
کوئی اب "چین" تک جانے کا ارادہ بھی نہیں کرتا

کھلاڑی کھیلنے ہاکی و کرکٹ "چین" تک جاتے ہیں
خلا میں جس طرح اڑتے ہوئے شاہین جاتے ہیں

اگر سید و حالی بھی ہوتے اس زمانے میں
تو وہ بھی آج کل مصروف ہوتے رن بنانے میں

حسیناؤں کا دل ملتا نہیں ایسے عنادل سے
پڑھے لکھوں کی اب تو شادیاں ہوتی ہیں مشکل سے

یہ شرطِ عقد مجھ پہ لڑکی والوں نے لگائی ہے
کبھی کرکٹ کے ٹورنامنٹ میں سنچری بنائی ہے؟

وہ دن بھی آ رہا ہے جب مدارس کم سے کم ہوں گے
جہاں کالج بنے ہیں اس جگہ اسٹیڈیم ہوں گے

پڑے گی اہلِ دانش کو ضرورت گیند بلّے کی!
کتابوں کی جگہ ہوگی اشاعت گیند بلّے کی

کھلاڑی ہی معلم ہوگا تعلیمی ادارے میں
پڑھایا جائے گا بچوں کو محسن خاں کے بارے میں

مدارس بھی کبھی اب کھیل کا میدان ہوتا ہے
وہاں ہوتا ہے "مانیٹر" یہاں "کپتان" ہوتا ہے

وہاں پڑھنے میں تھک جاؤ تو سستانے کا وقفہ ہے
یہاں بھی میچ کے دوران اک کھانے کا وقفہ ہے

وہاں بھی داخلہ ملتا ہے کالج میں گزارش سے
یہاں بھی ٹیم کا کپتان بنتا ہے سفارش سے

وہاں بھی دیکھتے ہیں حال و مستقبل کو ماضی سے
یہاں بھی رن بنانے کا تعلق ہے ریاضی سے

کہیں ایسا نہ ہو یہ صورتِ احوال ہو جائے
کتابیں گیند بن جائیں قلم فٹ بال ہو جائے

غزل

نسیم سحر (جدہ)

زینتِ ٹیلی ویژن اسکرین ہو جانے لگے
مولوی صاحب تو اب بے دین ہو جانے لگے

صنفِ نازک کی کمی محسوس کیا ہوتی ہے اب!
بیشتر حضرات ہی خواتین ہو جانے لگے

فرض ہے عشاق پر، تبدیلِ محبوبہ کریں
جذبۂ چاہت جونہی روٹین ہو جانے لگے

ہو چکے ہیں عشق میں حد سے زیادہ خرچ وہ
شیخ بھی محتاجِ اردو لشین ہو جانے لگے

جب خیال آیا کروں ارسال اپنا پیش انہیں
اُن کے آنسو بھی ذرا نمکین ہو جانے لگے

مجھ سے انٹرکان میں عمدہ ڈنر کھلانے کے بعد
وہ بڑے شیریں، بہت نمکین ہو جانے لگے

مستقل رہ کر جوانی کاٹ دی ہم نے نسیم
اس بڑھاپے میں مگر شوقین ہو جانے لگے

وہ جگہ جہاں جھوٹ بولنے کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک سیانا ہو وہ جگہ کورٹ کہلاتی ہے سچ کو سچ ثابت کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا جھوٹ کو سچ ثابت کرنا یقین نہ آئے تو کسی وکیل سے پوچھ لیں ہم خود سچ سب کے سامنے ظاہر کر دینے کے حق میں نہیں کیوں کہ ہم پردے کے حامی ہیں۔ سیانے کہتے ہیں کہ جھوٹ اور عورت دونوں پردے میں ہی سجتے ہیں سچ تو ننگا ہوتا ہے ننگا عریانی ہی پھیلائے گا، اوروں کو بھی ننگا ہی کرے گا جھوٹ بولنا ہر ایرے غیرے کے بس کی بات نہیں یہ بڑے ذہین اور تیز حافظے والے بندے کا کام ہے کیوں کہ اسے یاد رکھنا پڑتا ہے کہ کس بندے کے ساتھ کیا جھوٹ بولا ہے۔ سچ اور جھوٹ کا کیا مقابلہ جتنی دیر میں جھوٹ پوری دنیا کا چکر لگا آتا ہے سچ ابھی تسمے باندھ رہا ہوتا ہے کسی دانشور کا قول ہے کہ مجھے امیر ہونے کا طریقہ تو نہیں آتا ہے غریب ہونے کا کلیہ بتا دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ہمیشہ سچ بولو۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ جھوٹ نہ بولیں تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے آپ چپ ہو جائیں۔ پہلی بار جھوٹ بولنا مشکل دوسری مرتبہ جھوٹ بولنا آسان اور تیسری مرتبہ سچ بولنا مشکل ہے۔ سچ کی آج جتنی بھی عزت ہے وہ جھوٹ کے وجود سے ہے جھوٹ جوں جوں بوڑھا ہوتا جاتا ہے سچ بنتا جاتا ہے جب سچ جوں جوں بوڑھا ہوتا جاتا ہے شک بنتا جاتا ہے اپنی کہاوت ہے کہ مچھلی کھانے اور جھوٹ بولنے کے لیے آنکھیں کھلی رکھنا پڑتی ہیں دنیا میں جو جھوٹ سب سے زیادہ بولا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ حکومت آپ کے مسئلے حل کرنا چاہتی ہے ہم خود سارا دن جھوٹ بولتے رہتے ہیں۔ بے روزگاروں سے کہتے ہیں آپ کو نوکری مل جائے گی مظلوموں سے کہتے ہیں آپ کو انصاف ملے گا۔ غریب ماؤں سے کہتے ہیں آپ کی بیٹیوں کے سر ننگے نہ ہوں گے ہم سچ بول کر انہیں نا امید کرنا نہیں چاہتے۔ ■□

علیم جہانگیر
(اورنگ آباد)

آئینہ اور عکس

ریلیں پہلے بھی چلا کرتی تھیں۔ اور اب بھی چلا کرتی ہیں۔ لیکن ریل اور دیش کے چلانے پر دو متضاد رائیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً اب ریلیں چلتی نہیں، بلکہ چلائی جاتی ہیں۔ دیش کے تعلق سے بڑی عجیب و غریب رائے سننے کو ملتی ہے۔ ایک دفعہ ہماری ملاقات جاپانی بھائی سے ہوئی۔ وہ دنیا میں رائج الوقت حکومتوں کے نظم و نسق پر تحقیق کر رہے تھے۔ اور اسی سلسلے میں وہ یہاں آئے ہوئے تھے۔ دوران گفتگو انھوں نے بتایا کہ مغربی اور ترقی یافتہ ممالک میں مشینیں انسانوں کو نہیں، انسان مشینوں کو چلاتے ہیں۔

ہم نے پوچھا "ہمارے دیش کے بارے میں آپ کی تحقیق کیا کہتی ہے"

وہ بولے "دنیا میں اگر ایشور نہیں ہے تو وہ بے شک نہیں ہے! نہیں ہے۔ اور وہی بھارت کو چلا رہا ہے۔"

یہ تو خیر معترضہ جملہ تھا۔ عموماً ایسے جملوں کے بعد کوئی ایسی بات ہونی چاہیئے۔ جس پر کوئی معترض نہ ہو۔ لہٰذا ہم مودبانہ عرض کرتے ہیں کہ ہمارے ملک کے طول و عرض میں ریلوں میں بڑی بڑی تبدیلیاں آگئی ہیں۔ اور ان میں خاصہ تنوع بھی پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً پہلے تھرڈ کلاس کے کمپارٹمنٹ ہوا کرتے تھے۔ جو اب سرے سے غائب ہو گئے ہیں۔ ان ڈبوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں صرف فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے لوگ رہتے اور بستے ہیں۔ لیکن ان ڈبوں میں سفر کرنے پر رائے بدلنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

ریلوں کی رفتار کی مناسبت سے ان کے نام بھی سننے کو ملتے ہیں۔ مثلاً شیرا ایکسپریس، جنتا ایکسپریس اور سوپر فاسٹ وغیرہ وغیرہ۔ ان میں جنتا ایکسپریس ٹرینیں قابل ذکر ہیں۔ وہ یوں کہ جنتا ایکسپریس میں ایک لفظ راشٹریہ بھاشا یعنی ہندی اور دوسرا ترقی یافتہ زبان یعنی انگریزی لفظ کا حسین مجموعہ ہے اس سنگم سے بڑی گہری معنویت پیدا ہو گئی ہے۔

ایکسپریس ٹرین کی دلچسپ خوبی یہ ہے کہ اس میں سفر کرنے پر ٹکٹ تو ایکسپریس کے ادا کرنا پڑتے ہیں لیکن چند اسٹیشنوں تک خرگوش کی رفتار سے چلنے والی ایکسپریس از خود کچھوے کی رفتار اختیار کر لیتی ہے۔ ایسے موقعے پر ٹرین سے اتر کر دوڑتے یا بھاگتے ہوئے منزل مقصود تک پہنچنے کو دل بے چین

اور بے قرار ہو اُٹھتا ہے۔

ریلوں کی اور بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ اہم وہ ریل ہوتی ہے جسے مال گاڑی کہتے ہیں۔ اس کی وضاحت کی ضرورت یوں آن پڑی کہ مال گاڑی میں حیوان نہ صرف معقول جگہ، معقول بندوبست بلکہ معقول حیوان ناطق کی نگرانی میں سفر کرتے ہیں۔ جب کہ عام ٹرینوں کے ڈبوں میں اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ سانس لینا دشوار ہوتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ کچھ لوگ اپنی جگہ بنانے میں ماہر ہوتے ہیں۔ وہ یا تو ڈبوں میں گھس کر کسی نہ کسی طرح جگہ بنا لیتے ہیں یا پھر ڈبوں کے اوپر اطمینان سے بیٹھے یا لیٹے سفر کرتے رہیں۔ اکثر ایسے نظارے اس وقت دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جب خاص موقعوں پر ٹرینوں کا سفر مُفت ہو جاتا ہے۔ گویا ٹرینیں ان ہی کی خاطر چلائی جاتی ہیں۔

ریل کے ڈبوں اور ہاسپٹل کے جنرل وارڈ میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ سوائے اس کے کہ مختلف اسٹیشنوں پر بھانت بھانت کے لوگ اپنی اپنی بولیاں بولتے چڑھتے اور اُترتے ہیں۔ تو جنرل وارڈ میں مختلف النوع امراض میں مبتلا مریض داخل کئے جاتے ہیں۔ جن میں سے چند خوش نصیب صحت یاب ہو کر خوشی خوشی گھر کی راہ لیتے ہیں۔

ہم آپ کی توجہ بطور خاص اس جانب مبذول کروانا چاہتے ہیں کہ ریل کے حادثہ میں مرنے والوں کے اعزاز میں ریلوے انتظامیہ کی فیاضی سے مرحوم کے ورثا یا متعلقین کی مالی پوزیشن نہ صرف مضبوط ہو جاتی ہے۔ بلکہ وہ اس کے رنج و ملال میں یہ گنگناتے پھرتے ہیں ؎

ایکسیڈنٹ ہو گیا ربّا ربّا

انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ جنرل وارڈ میں "اعلیٰ ڈگری یافتہ ڈاکٹروں کے زیر علاج شہید ہونے والے مریضوں کے ورثا یا متعلقین کو بھی ایسی ہی سہولت مہیا ہو جائے تو ہر دو محکموں میں نہ صرف یکسانیت آجائے گی۔ بلکہ ان کے لواحقین کو یہ کہنے میں آسانی ہو جائے گی ؎

کتنی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کے

ریلیں اکثر لیٹ چلتی ہیں۔ دراصل یہ سمجھ کا دھوکا ہے۔ ایک دفعہ ہم کہیں جا رہے تھے۔ رخت سفر باندھنے سے کچھ دیر پہلے ہم نے فون پر اسٹیشن ماسٹر سے وقت پوچھا۔ اس نے بتایا کہ آج ریل وقت پر آرہی ہے۔ ہم نے ریلوے اسٹیشن جاتے ہوئے راستہ سے پھولوں کا ایک قیمتی اور خوبصورت ہار خریدلیا۔ جب ٹرین پلیٹ فارم پر رُکی تو ہم نے وہ ہار ڈرائیور کے گلے میں ڈال دیا۔ اور ٹرین کو وقت پر لانے کی دلی مبارکباد دی۔ اس نے وہ ہار گلے سے اُتارتے ہوئے کہا "بھائی صاحب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ دراصل یہ ٹرین کل شام سات بجے کی ہے۔ جو آج شام ٹھیک سات بجے یہاں پہونچی ہے۔"

ریلوے پلیٹ فارم سے ہمارا جذباتی لگاؤ ہے کیوں کہ ہماری بیوی ایک دل چسپ سفری کا تو عطیہ ہے۔ ہمارا یہ معمول تھا کہ ہم جب بھی سفر کی نیت سے ریلوے اسٹیشن پہنچتے تو وہاں حسینوں کے غول کو دیکھ کر انھیں ہیلو کہتے۔ ایک عرصہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ایک دن ہمارے ہیلو کا جواب ہیلو سے دینے والی حسین مہ جبیں ہماری جیون ساتھی بن گئی۔ وہ دن ہے۔ اور آج کا دن۔ ہم حسینہ کو

کیا۔ دوستوں کو بھی ہیلو کہنے سے بد کتے ہیں۔

ہماری شادی ہوئے پاؤ صدی بیت گئی ہے۔ آج بھی کچھ لوگ حسین و جمیل لڑکیوں کو دیکھ کر ہیلو کہتے ہیں کہ وہ اس ایک معمولی لفظ کے عواقب و نتائج سے بے خبر ہیں۔

ہمارے سفر کی دلچسپ روداد درج ذیل ہے:

یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب آئینہ کا استعمال فرنیچر میں سجاوٹ کے لیے ہونے لگا تھا اسی نظریئے کے تحت ریلوں کے بیت الخلاء بھی آئینوں سے سج دھج گئے تھے۔ ریل کسی چھوٹے اور ویران اسٹیشن (ایسے اسٹیشن آج بھی دیکھنے کو ملتے ہیں) پر رکی۔ اس اسٹیشن سے ایک دیہاتی جوڑا نہ صرف ہمارے ڈبے میں در آیا۔ بلکہ ہماری سیٹ پر پھیل پسر کر بیٹھ بھی گیا۔ ریل چل پڑی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ عورت اپنی جگہ سے اٹھی اور بیت الخلاء کی طرف جانے لگی۔ جونہی اس نے بیت الخلاء کا دروازہ کھولا گھبرا کر دروازہ بند کر کے سیٹ پر آ بیٹھی۔ اس کے بعد اس کے مرد نے بھی ایسا ہی کیا۔ غرض کبھی بیوی اور کبھی شوہر کا لیٹرین تک جانے اور آنے کا یہ سلسلہ یکے بعد دیگرے جاری ہو گیا۔

ہمارے خیال میں ان دونوں نے اس سے پہلے آئینہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے وہ آئینہ میں اپنا اپنا عکس دیکھ کر حیران و پریشان تھے۔ کچھ دیر بعد اس دیہاتی جوڑے میں تو تو، میں میں ہونے لگی۔ اور قریب تھا کہ شوہر بیوی کا گال لال کر دے۔ اتنے میں ٹی ٹی آئی نمودار ہوا۔ اسے دیکھ کر دونوں نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ آہستہ آہستہ ٹکٹ چیک کرتا ہوا جیسے ہی ان کے نزدیک پہنچا۔ دیہاتی جوان پھٹ پڑا اور لیٹرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "حضور اس ڈبہ میں کوئی خوبصورت بانکا جوان بیٹھا ہے۔ جس پر میری بیوی بری طرح فدا ہو گئی ہے۔"

یہ سنتے ہی اس کی بیوی نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا "اے ہے میرا ہی بولے جا رہا ہے۔ کچھ اپنا بھی تو بول۔" پھر ٹی ٹی آئی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہنے لگی "سرکار یہ جھوٹا ہے۔ اس ڈبہ میں کوئی سندر ناری بیٹھی ہے۔ جسے یہ دیکھنے وہاں بار بار جاتا ہے اور دروازہ کھول کر جی بھر کے دیکھ کر آتا ہے۔"

ٹی ٹی آئی نے یہ سن کر ان دونوں سے کہا "مزید اس ڈبہ میں کوئی جوڑا بلا ٹکٹ سفر کر رہا ہے۔" اتنا کہتا ہوا وہ اس شان سے لیٹرین کی طرف بڑھنے لگا۔ جیسے کوئی بہت بڑا معرکہ سر کرنے جا رہا ہو۔ لیٹرین کا دروازہ کھولنے پر اس میں لگے آئینہ میں اپنا عکس دیکھتے ہی "سوری" کہتا ہوا۔ یوں دروازہ بند کر دیا جیسے اندر کوئی عزیت چھپا بیٹھا ہے۔ وہ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا ان دونوں کے پاس آیا اور کہنے لگا "بہن جی اور بھیا جی اس ڈبہ میں نہ تو کوئی آدم زاد ہے اور نہ ہی کوئی آدم زادی۔ بلکہ وہ ہمارے صاحب کا کیبن ہے جس میں ٹی ٹی آئی بیٹھا ہوا ہے۔"

یہ سن کر ان دونوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

غزل ——— سرآج نزلی

کلکٹر سے بھی اعلیٰ گر ہو افسر ٭ تو اس کو بِگ کلکٹر بولتے ہیں
سدا رہتے ہیں وہ اک ماہ آگے ٭ نومبر کو دسمبر بولتے ہیں
کرے جو انتظار اپنی لور کا ٭ اسی عاشق کو ویٹر بولتے ہیں
میں اپنی لیڈی کو چمکا رہا ہوں ٭ مجھے کیوں لوگ لوفر بولتے ہیں
سرآج ان کی ہے خوش فہمی کہ خود کو ٭ الہ آبادی اکبر بولتے ہیں

غزل ——— اسماعیل ظریف (حیدرآباد)

فلم سازی کے فن کا یہ کمالِ فن ہے پردے پر
جو نو بچوں کی ماں ہے نوجواں معلوم ہوتی ہے
خصوصاً دور سے نظروں کو دھوکا ہی جاتا ہے
کہ دہقانی بوا بھی ریشماں معلوم ہوتی ہے
بڑے صاحب کی شاید مہربانی کا نتیجہ ہے
جو کل آیا تھی اب عشرت جہاں معلوم ہوتی ہے
محض فیشن کی خاطر سے گھنی زلفوں کو کٹوا کر
جو بے بی تھی وہ اب بابو میاں معلوم ہوتی ہے
ہوئی ہے کم سنی میں جس کی شادی گاؤں میں یارو
وہ لڑکی دور سے اب نانی ماں معلوم ہوتی ہے
بھانی ہو چکی ہے دن میں تاروں کا نظارہ ہے
سفالی چھت مکاں کی آسماں معلوم ہوتی ہے
جسے کچھ بات کرنے کا سلیقہ تک نہیں آتا
اسی کے منہ میں گز بھر کی زباں معلوم ہوتی ہے

مفلسی ——— کوثر صدیقی (بھوپال)

اپنی قسمت میں لکھی ہے مفلسی
زیست سے لپٹی ہوئی ہے مفلسی
صنعتوں کے اقتصادی جسم میں
درد بن کر پل رہی ہے مفلسی
شکل میں بچوں کے سوکھے کھیت میں
خوب پیدا ہو رہی ہے مفلسی
ایشیا سے لے کے افریقہ تلک
ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے مفلسی
ہوتی جاتی ہے یہ ہر پل لاعلاج
کینسر سا بن گئی ہے مفلسی
اُجلے اُجلے دامنِ تہذیب پر
گندگی ہی گندگی ہے مفلسی
مفلسی سے ہی مری پہچان ہے
ایشور کا بس یہی دربان ہے

غزل ——— مجید عشقی (ناندیڑ)

پھول صحرا میں کھلا دے یا رب
کانٹے سڑکوں پہ بچھا دے یا رب
تیرگی حد سے نہ بڑھنے پائے
نوجوانوں کی پڑھا دے یا رب
جن کو ہے شیر و شکر سے نفرت
شہد میں ان کو ڈبا دے یا رب
جو شریفوں کو ہے بی پی کا مرض
ان کو نمکین سزا دے یا رب
لوگ سب چیخنے چلانے لگیں
ایک دم پردہ اٹھا دے یا رب

خانہ بدوش
(مقیم حال پونہ کے قلم سے)

مطالعۂ دیوانِ غالب

جانِ وفا پرست کو، ایک شمیمِ نو بہار
فرقِ ستیزہ مست کو ابرِ تگرگ بار ایک

آج دیوانِ غالب کھولتے ہی اس شعر پر نظر پڑی تو ہماری تفہیم کے سوتے خشک ہو گئے۔ بہت ہاتھ پیر مارے، سر کھجایا۔ پیشانی رگڑی، انگڑائی لی، جمائی لی، پہلو بدلا، لغت اٹھایا۔ معنی تلاش کیے، حرف سے حرف جوڑ کر الفاظ کی تہوں میں خوب ڈبکی لگائی مگر بے سود، ذہن کی ایک گرہ بھی نہیں کھلی تفہیم کا ایک نقطہ بھی روشن نہیں ہوا۔ سچ ہے شعرِ غالب کا مطالعہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں بلکہ بڑوں کا کھیل بھی نہیں ہے ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے جب بارش نہیں ہوئی تھی آسمان پر بادل بھی نہیں چھائے تھے۔ مطلع قطعی صاف تھا، فضا میں گرد و غبار بھی نہیں تھا۔ ہم موسم کا فائدہ اٹھانے کی نیت سے قلم کا غلاف کر بیٹھے ہی تھے کہ مقامی کالج کے ایک ڈاکٹر پروفیسر غریب خانے پر تشریف لائے، تمباکو کی پیک ہٹا کر زبان کی آڑ میں دفن کرتے ہوئے بولے۔

"سنا ہے آپ کے پاس دیوانِ غالب ہے؟ اور آپ اس کے مطالعے سے مستفید ہو کر ان دنوں شعروں کے انبار لگا رہے ہیں؟"

ہم نے کہا یہ درست ہے کہ ہمارے پاس یہ دیوانِ غالب ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ ہم اس کا مطالعہ کرتے اور مستفید بھی ہوتے ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ ہم اچھے اچھے شعر بھی کہہ رہے ہیں مگر آپ کو اس سے کیا مطلب ۔۔۔؟

بولے ۔۔۔ "میں وہ دیوانِ غالب دیکھنا چاہتا ہوں ۔۔۔"

ہم نے کہا ۔۔۔ "آپ نے آج تک دیوانِ غالب نہیں دیکھا ۔۔۔؟"

انھوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

ہم نے پوچھا ۔۔۔ "آپ تو اردو کے اسکالر ہیں۔

آپ نے اردو ہی میں پی ایچ ڈی کی ہے اور آج آپ کالج میں اردو ادب پڑھاتے ہیں۔ اردو کی مختلف انجمنوں کے سربراہ ہیں۔ پھر بھی آپ نے آج تک دیوانِ غالب نہیں دیکھا کہنے لگے ـــــ "ان تمام باتوں سے دیوانِ غالب کا کیا تعلق ہے۔؟

ہم نے کہا ـــــ

"شعلۂ رس" کے عنوان سے اردو اور دیوناگری میں آپ کا دیوان بھی شائع ہو چکا ہے پھر بھی دیوانِ غالب کے مطالعے سے محروم رہے؟"

کہنے لگے ـــــ "اپنا دیوان مرتب کرنے سے پہلے ساحر لدھیانوی کی 'تلخیاں' کالج کی لائبریری سے اٹھا لایا تھا ـــــ اس نے اتنا ساتھ دیا کہ دیوانِ غالب کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی ـــــ" ہم نے پوچھا "اب کیسے ضرورت پیش آئی؟" کہنے لگے ـــــ "دوسرا دیوان مرتب کر رہا ہوں۔"

ہم نے کہا ـــــ "اتنی بڑی چھلانگ کیوں لگاتے ہیں آپ؟ ساحر اور غالب کے درمیان معتبر اور قابلِ تقلید شعراء کرام کی ایک کھیپ موجود ہے کوئی اور نام منتخب کیجیے۔

کہنے لگے ـــــ "چوری ہمیشہ بڑے گھر میں کرنی چاہیے۔"

ہم نے کہا ـــــ "مگر غالب کی تفہیم کے لیے آپ کو ایک عدد ٹیوٹر رکھنا پڑے گا۔ غالب براہِ راست آپ کی سمجھ میں کبھی نہیں آئیں گے۔

کہنے لگے ـــــ "ہمیں غالب کو سمجھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ ہمیں دیوانِ غالب مرحمت فرمادیجیے۔ ہمارا کام ہو جائے گا۔"

ہم حلیمی سے بولے۔

"دیوانِ غالب قیمتاً خرید کر گھر میں رکھ لیجیے۔ آپ کے انتقال کے بعد بچے اسے پڑھ کر روزانہ آپ کو ثواب بھیجا کریں گے۔"

کہنے لگے ـــــ "ہمارے بچے اردو کہاں پڑھتے ہیں وہ تو سب کے سب انگلش مرغے ہیں۔"

ہم نے کہا ـــــ "یہ تو غداری ہے۔ جس زبان نے آپ کو روزی روٹی فراہم کی، آپ نے اسی سے اپنے بچوں کو محروم رکھا۔

کہنے لگے ـــــ "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہماری ہونہار بیٹی اچھی غزل سنگر ہے بس کبھی کبھی تلفظ بگڑ جاتا ہے ورنہ بہت عمدہ گاتی ہے کبھی کبھی شعر ناموزوں بھی پڑھ دیتی ہے لیکن گاتی اچھا ہے۔"

ہم نے کہا ـــــ "ہماری سماعت پر رحم کیجیے اور ویسے بھی ہم خالص نہیں تو نیم خالص ہی سہی مگر ہیں شرعی آدمی! شعر کہتے ہیں مگر ساز نہیں سنتے۔"

ہم نے غالب کی شراب اور سود والی بات سے قطعی فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

کہنے لگے ـــــ "آپ نے یہاں بھی غالب سے استفادہ کر لیا۔ شراب کو شعر بنا دیا اور ساز کو سود!"

ہم نے کہا ـــــ آپ کو تو ساز پسند ہے، ہم آپ کے فلیٹ میں طبلے سے لے کر سارنگی اور بانسری سے

لے کر الغوزہ تک دیکھ چکے ہیں "۔

پروفیسر ڈاکٹر صاحب تھوڑے سے کھسیا گئے — "دراصل ہماری بھی بڑی ضدّی ہے۔ بس دن رات ساز، آواز، سُر اور سرگم ہی سے واسطہ رکھتی ہے "۔

ہم نے کہا — "ہاں یاد آیا آپ تو کسی درگاہ کے مجاور بھی ہوا کرتے تھے نا — "؟

چمک کر کہنے لگے — اب بھی ہیں "۔

ہم نے کہا — "پھر تو قوالوں سے رشوت ضرور ملتی ہوگی "؟

کہنے لگے — " یہ تو ہمارا موروثی حق ہے "۔

ہم نے کہا — " الحذر "

کہنے لگے — "کیا مطلب "

ہم نے کہا — الغیاث

بولے — "کیا مطلب "

ہم نے کہا — " الخاموشی "۔

کہنے لگے — الرجی Allergy ہے "۔

ہم نے کہا — " اسفل السافلین کا مطلب جانتے ہیں "۔

برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے — "آپ کو دیوانِ غالب کیا مل گیا، آپ ہماری عزت و آبرو کے دشمن ہوگئے — "

ہم نے کہا — "آپ کے منہ سے یہ بات کچھ الٹی سی لگتی ہے — "

سخت ناراضگی کے عالم میں کہنے لگے کیا آپ کی نظر میں ہم عزت دار نہیں ہیں۔ ہم ڈبل ایم۔ اے ہیں۔ تین بار ہم نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ہے —

ہم پروفیسر بن چکے ہیں — ہماری ایک عدد کتاب بھی چھپ چکی ہے "۔

ہم بھی مسکرا دیئے — " اگر ہماری جگہ چچا غالب ہوتے تو ایسے نازک موقع پر ایک عدد غزل ارشاد فرماتے اور کہتے کہ ؎

اس شاعری میں عزّتِ سادات بھی گئی

ہمیں مسکراتا دیکھ کر چراغ پا ہوئے اور کہنے لگے —

" دیکھ لوں گا تم کو "!

ہم نے کہا "کیا اب تک آنکھیں بند تھیں — "؟

پھر بھڑک اٹھے — " آپ کو بات کرنے کا سلیقہ نہیں ہے "۔

ہم نے زیرِ لب مسکراہٹ کا ساتھ نہیں چھوڑا اور کہنے لگے —

"آپ سکھا دیجیے "

کہنے لگے — "اس کے لیے آپ کو ہمارے کالج میں داخلہ لینا ہوگا "۔

ہم نے کہا ـــــ ہم نے کبھی اسکول میں داخلہ نہیں لیا تو کالج میں کون ہم کو داخل کرے گا ـــ "
کہنے لگے ـــــ پیسہ پھینکو تماشا دیکھو ـ تحسن تحسن گوپال ، ساری بلائیں ٹال !
ہم نے کہا ـــــ " پھر کالج میں داخلہ لینے کی کیا ضرورت ہے ـ رشوت دے کر تو ہم دنیا کا سلیقہ اور شرافت اپنے نام لکھوا سکتے ہیں "
کہنے لگے ـــــ تم ان پڑھ لوگوں کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی ـ جو رشوت نہیں ہے اسے رشوت کہتے ہو ، تجارت کا مطلب نہیں سمجھتے ، سودے بازی کے گر سے ناواقف ہو ـ اگر پڑھ لکھ کر کوئی ڈگری حاصل کر لیتے تو آج کہاں سے کہاں ہوتے ـ "
ہم نے پھر زیر لب مسکراہٹ کا استعمال کیا ـ
" جیسے آپ ؟ "
" ہاں ہاں ہماری مثال کافی ہے ـ ہم نے اپنے دونوں بیٹوں کو ڈگری دلوائی ہے ـ کالج میں پروفیسری کا قرعہ ان کے نام نکلوایا ہے ـ فلیٹ خرید ا ہے ، اسکوٹر ایک نہیں دو دو ، تیسری کی بات چل رہی ہے لڑکی کو غزل سنگر بنایا ہے ـ فی الحال اس کی شادی کا کوئی ارادہ نہیں ـ فلم میں چانس مل جائے تو ہیروئن بھی بنا سکتے ہیں ـ مکالمے اور گیت تو ہم بچپن سے لکھتے چلے آرہے ہیں ـ بیٹی کو اوشا کھنہ کے بعد ہندوستانی فلموں کی دوسری خاتون موسیقار کا درجہ بھی ہم دلا سکتے ہیں ـــ آپ نے کیا کیا ؟ ـــ
بیٹیوں کو برقعہ لگا دیا ، پھر ان کو بیاہ دیا ـــ سسرال بھجوا دیا ـ یہ بھی کوئی باپ کی ذمہ داری ہوئی ـــ
ہم نے کہا ـــــ " وہ دیوان غالب آپ کو چاہیے تھا "
کہنے لگے ـــــ بیٹا ، بیٹی کے معاملات میں دیوان غالب کی بات کرتے ہیں آپ ، ہم تو کسی بھی کتاب کو نہیں مانتے ـــــ "
ہم نے کہا ـــــ یہ کتابوں کا زمانہ ہے ـ علم کی روشنی گلی گلی میں پھیل رہی ہے اور آپ کتابوں سے انکار کرتے ہیں ـــ "
کہنے لگے ـــــ " ہم جاتے ہیں ـ تازہ غزل پر استاد محترم حکیم طوفانی الطفیلیؔ سے اصلاح لینی ہے ـ وہ مطب بند کر کے چلے گئے تو ہم آج رات مشاعرے میں کس منہ سے جائیں گے ـــــ "
ہم نے کہا " ویسے منہ دکھانے کے قابل تو آپ کبھی نہیں رہے ـ اب اس عمر میں اس کی کوئی اہمیت بھی نہیں ، یہ دیکھنے دکھانے کے چونچلے تو جوانی میں ہوا کرتے ہیں ـ اب تو پیشانی اور سر خدا کے فضل سے ایک جیسے ہو گئے ہیں " لیکن ہم خاموش ہی رہے ـ ہماری خاموشی کو انھوں نے قطعی محسوس نہیں کیا اور کہنے لگے ـــ
" چونا ہے ؟؟ "
ہم نے کہا وہ تو ہم نے آپ کو لگا دیا "
پھر پوچھا ـــــ " تمباکو ہے ؟ "
ہم نے کہا " ہم ایسی کریہہ اللذت چیز کھانے والے کی میت ـ مہ ، مہ ، ہنہ ، ہنہ ، ملاحظہ

کہنے لگے ـــــ "آپ کا ذوق سلیم ختم ہو چکا ہے"
ہم نے کہا ـــــ "ایسا ذوق سلیم آپ ہی کو مبارک، آپ دیوان غالب مانگنے کے لیے آئے تھے اور اب تمباکو مانگ رہے ہیں یہ معیار کی پستی کا کون سا مقام ہے"
کہنے لگے ـــــ "مقام تو ہم صرف مشاعرے میں تلاش کرتے ہیں۔ زندگی کے دیگر شعبوں میں معیار و مقام کی کیا اہمیت ہے ـ ؟ اتنا کہہ کر محترم پروفیسر اور ڈاکٹر اٹھے اور جوتے پہنے اور ہم سے اجازت کے بنا ہی رخصت ہو گئے۔
ہم نہ ان کو چائے پلا سکے، نہ چونا دے سکے، نہ ان کی تمباکو کی فرمائش کو پورا کر سکے۔ رہا دیوان غالب کا سوال تو ؟ یہ نعمت غیر مترقبہ ان کو دے کر ہم ادب عالیہ کی توہین کیسے گوارا کر سکتے ہیں۔
○○

بابو آر کے (ہماچل پردیشی)

بھارت درشن

گزشتہ زمانے میں کیروسین سے اسٹو اور چراغ جلتے تھے لیکن نئی زمانہ کیروسین جلنے اور چلنے کے کاموں میں مصروف ہے۔ بجائے اسٹو اور چراغوں کے اس سے بہوؤں کے جسم جلتے ہیں۔ لاری، ٹرک اور ٹرینکٹر چلتے ہیں۔ ویسے سرکار نے بہت کوشش کی کہ کیروسین صرف جلنے جلانے کے کام آئے، چلنے چلانے کے نہیں۔ اس لیے سرکار نے پالیسی بنائی اور اپنی رنگین مزاجی کو بروئے کار لاکر کروسین، یعنی مٹی کے تیل کو بجائے مٹی کے رنگ کے نیلے آسمانی رنگ میں رنگ ڈالا تاکہ کیروسین پر چلنے چلانے کے معاملے میں روک لگائی جاسکے لیکن سرکار کی سابقہ پالیسیوں کی طرح یہ پالیسی بھی مات کھاگئی اور نتیجہ میں کیروسین زیادہ شدت کے ساتھ چلنے چلانے میں مصروف ہوا اور بات یہاں تک پہنچی کہ جلانے کے لیے اسے پانا کارِ محال ہوگیا۔ یہ واقعہ ہے کہ لائنوں میں لگنے، دھکے کھانے اور ہاتھ پاؤں تڑوانے کے بعد ایک آدھ لیٹر کیروسین ہاتھ آنے لگا ہے۔ اب کیروسین کی اس قلیل مقدار سے کوئی اپنے کام کیسے بنائے؟ یعنی اتنی کم مقدار سے لوگ اسٹو جلاکر اپنے پیٹ کی آگ بجھائے، بہو کا جسم جلائے یا چراغ جلائے۔ نیز فسادات میں املاک جلائے؟ اس لیے کیروسین کی ان ہمہ مصروفیات کو دیکھتے ہوئے سرکار سے ہماری التجا ہے کہ وہ راشن کارڈ پر دستیاب ہونے والے کیروسین کی مقدار ضرور بڑھائے اور یہ سرکار کی ذمہ داری ہے کہ جن صارفین کے گھروں میں بہوئیں ہوں انھیں وافر مقدار میں کیروسین بہم پہنچائیں۔

بڑا اچھا لگتا تھا جب گزشتہ زمانے میں ہمارے فلمی شاعر اپنے گیتوں میں فلمی سجنی کے زلف و رخسار، لب و چشم کی باتیں کیا کرتے تھے۔ آسمان کے تارے توڑنے اور ہونٹوں کے کنول کھلانے کے مژدے سناتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کا "میں نے پیار کیا" اور "زمانہ دیا" بھی کانوں کو بھلا لگتا تھا۔ لیکن پتہ نہیں آج کے فلمی شاعروں اور فلمی ناظرین و سامعین کے ذوق کو کیا ہوا ہے کہ جو وہ سجنی کے پیکروں کی بجائے کے ملبوسات خبیثہ پہ جان چھڑکنے لگے۔ چولیوں، چنریوں اور لہنگوں اور دوپٹوں کے بکھان کرنے لگے ہیں۔ ویسے ہمارے فلمی شعرا ماضی میں دو پایوں کے ساتھ ساتھ چوپایوں پہ بھی مشقِ سخن کرتے رہے ہیں۔ یعنی گدھے، بھینس اور ہاتھی بھی ان کے موضوعِ سخن رہے ہیں اور پنکھ پکھیروؤں کوئل، بلبل، مینا، طوطا، مرغا اور کوّا بھی فلمی شاعری میں اڑان بھرتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ حشرات الارض جیسے سانپ اور بچھو بھی گیتوں

میں استعمال ہوئے ہیں لیکن آج کل کے گیتوں میں تیتر اور کبوتر کچھ زیادہ ہی ذو معنی و من مانی غٹرغوں کیے جارہے ہیں۔ گویا تیتر اور کبوتر ان دنوں ہمارے شعرا کو خوب لبھا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل کے گیتوں میں کبوتر کی غٹر غوں اور تیتر کی مستی بے انتہا دھوم مچا رہی ہے۔ فلمی گیتوں کے اس موجودہ ماحول میں ہم فلمی شعرا کو دعوتِ سخن دیتے ہیں کہ وہ اپنے گیتوں میں گرگٹ کی نیرنگیوں، چھپکلی کی کراہت اور گھوڑ پھوڑ کی گرفت کو بھی موضوعِ سخن بنائیں اور فلمی موسیقی و شاعری کی نئی تاریخ مرتب کرکے گیتوں کی مقبولیت کے سابقہ ریکارڈ توڑ دیں۔

پچھلے دنوں ہمارے قومی اخبارات کی سب سے مہذب خبر یہ تھی کہ اجمیر میں ہمارے پولیس افسران خواندگی کی مہم میں حصہ لے رہے ہیں۔ اس مہم کی روشنی میں ہماری فہم چکا چوند ہے اور ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ اب ملک میں خواندگی کے مشن کا خدا ہی حافظ نہیں ہے بلکہ ناخواندہ افراد کا بھی خدا ہی حافظ ہے۔ کیونکہ خواندگی کی اس مہم سے قبل ناخواندہ افراد بھلے ہی ان پڑھ سہی . . . .

. . . . لیکن وہ ایمان داری اور نیک نیتی کی زندگی تو جی رہے تھے جبکہ پولیس افسران کے ذریعہ زیورِ تعلیم سے آراستہ ہونے کے بعد یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ ایمان داری اور نیک نیتی جیسی ہستیاں ان سے چھن جائیں گی اور بدلے میں انھیں رشوت ستانی، بدعنوانی، مکر و فریب اور دشنام طرازیوں کی خباثتیں میسر آئیں گی۔ ویسے خواندگی کی اس مہم کا ایک مثبت پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گاؤں کے بھولے بھالے ان پڑھ افراد کی صحبت کے باعث شاید ہمارے پولیس افسران میں تھوڑی بہت ایمان داری اور نیک نیتی آجائے۔ اس لیے خدا کرے کہ ہماری خوش گمانی صحیح ثابت ہو اور پیش گوئی غلط۔

ooo

یوسف ناظم

سلیمان خطیب کی یاد

(چنچگوپہ میں منعقدہ جلسہ کے لیے لکھا گیا۔ لیکن محترم یوسف ناظم جلسہ میں شریک نہ ہو [illegible] [illegible])

یقین مانیے مجھے اس بات کا قطعی کوئی علم نہیں تھا کہ سلیمان خطیب چنچگوپہ میں پیدا ہوئے تھے اور اس وادی میں میری ابھی گزر رہی تھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ چنچگوپہ میں ایک مزاح گو شاعر کا پیدا ہونا کوئی معیوب بات ہے بلکہ ایک لحاظ سے ایسا سوچنا اور وہ بھی چنچگوپہ میں بذات خود موجود رہ کر یہ سوچنا . . . . خطرہ مول لینے کے برابر ہے اور اسی لیے ہمارے کلچر میں یعنی اردو تہذیب میں یہ طریقہ رائج ہے کہ جب ایک شاعر کسی مشاعرے میں شرکت کے لیے کہیں بلایا جاتا ہے یا رضاکارانہ طور پر خود چلا جاتا ہے تو اس جگہ کی تعریف میں جہاں یہ مشاعرہ منعقد ہوتا ہے۔ وہ ایک قطعہ (وزن میں یا بلا وزن) ضرور کہے اور اپنا کلام پیش کرنے سے پہلے لازمی طور پر یہ قطعہ پڑھے اور بعد میں اپنا پرانا کلام پیش کرے یہ قطعہ سن کر سامعین کے دل میں شاعر کے لیے ایک نرم گوشہ پیدا ہو جاتا ہے اور شاعر محفوظ حالت میں اپنے گھر واپس ہو سکتا ہے۔ یہ ایک اچھی روایت ہے اور اب تو یہ اتنی جڑ پکڑ چکی ہے کہ سامعین صرف اپنی جائے رہائش کی تعریف کا قطعہ سنتا ہی پسند کرتے ہیں۔ باقی کا کلام نہ بھی سنایا جائے تو ان کا کچھ بگڑتا نہیں ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں وہ دل ہی دل میں خوش ہوتے ہیں کہ ترنم نہیں سننا پڑا (معلوم نہیں یہ خیال کیسے عام ہو گیا ہے کہ اب ترنم صرف خواتین کو زیب دیتا ہے) ان حالات میں اگر میں چنچگوپہ کی تعریف میں کوئی شعر کہنے کی عادت نہیں رکھتا تو کم سے کم خاموشی تو اختیار کر سکتا۔ لیکن یہاں پیدا ہونا سلیمان خطیب کا ذاتی مسئلہ تھا اور ایسا ذاتی مسئلہ جس میں خود ان کی رائے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ آخر ہمارے ایک مزاح گو شاعر تخلص جن کا احمق تھا پھپھوندہ میں پیدا ہوئے اور کسی نے ان کا کیا بگاڑ لیا۔ جیسے جیسے وہ بڑے ہوتے گئے مشہور اور پھر معروف ہوتے گئے۔ ان کے وطن مالوف کی بھی کافی شہرت ہوئی اور آج بھی لوگ پھپھوندہ سے واقف ہیں۔ سلیمان خطیب کے معاملے میں وقت یہ ہوئی کہ انھوں نے ترک وطن کرنے کے بعد اپنی شاعری کو بام شہرت پر پہنچایا اور لوگوں کو پتہ نہیں چلا کہ ہیرے موتی جیسے اشعار کا خالق خود چنچگوپہ کی سرزمین کی تخلیق ہے اور شاعر سلیمان خطیب نے اپنی جائے ولادت کا حق بجا طور پر ہی نہیں سارے ہندوستان میں ڈنکا بجا کر ادا کر دیا۔ ان کی سعادت مندی

نے چنگوپہ کو بھی وہی شہرت عطا کی جو احمق پھپھوندوی نے پھپھوندہ کو اور اصغر گونڈوی نے گونڈہ کو عطا کی تھی۔ میں انھیں یعنی سلیمان خطیب کو ہمیشہ گلبرگہ کا متوطن سمجھتا رہا اور اب بھی سمجھتا ہوں اس غلط فہمی کو پھیلانے میں خود سلیمان خطیب کا بھی ہاتھ رہا لیکن بہت دن بعد پتہ چلا کہ سلیمان خطیب کا گلبرگہ سے تعلق صرف آبی تھا، خاکی نہیں۔ خاک چنگوپہ کی، ہوا بیننگی، پانی گلبرگہ کا اور آگ تو اس شاعر کے دل میں اتنی تھی کہ مشاعرہ پڑھتے تو ایسا معلوم ہوتا آتش بازی ہو رہی ہے۔ پٹاخے، پھلجھڑیاں، انار، سرسریاں، ماکڑ اور بم یہ سارا غیر قانونی سامان شاعر کے پاس موجود رہتا تھا۔ وہ خود ساختہ یعنی سیلف میڈ شاعر تھے اور ان کا سارا شعری اثاثہ ان کی کاریگری، ذہنی اپج اور بے ساختگی کا خوب صورت نمونہ، یہ سب کچھ ان کا اپنا تھا اس پر کسی دوسرے کی چھاپ نہیں تھی۔ ان کا ذہن ربیع اور خریف کا پابند نہیں۔ ہمیشہ زرخیز رہا۔ انھوں نے اچھا کہا اور بہت کہا۔ ان کی شاعری پر غالب کے اس قول کا اطلاق ہوتا ہے جو انھوں نے آموں کے بارے میں فرمایا تھا۔ یعنی میٹھے ہوں اور بہت ہوں۔ سلیمان خطیب کی پوری شاعری فصلِ آنبہ ہے۔ قلمی تخمی ہر قسم کے پھل اس میں موجود ہیں اور وافر مقدار میں یہ وہی آم ہیں جن کی گٹھلیوں کے بھی دام ہوا کرتے ہیں۔ دکھنی شاعری کو خطیبانہ انداز انھوں نے ہی دیا اور ایک بوریا نشین زبان کو تخت سلیمان تک پہنچایا اور کمال یہ ہے کہ اس کا رشتہ ایک عام آدمی سے برقرار رکھا ورنہ آپ جانتے ہیں وہ کرسی ہو یا تخت، صوفہ ہو یا قالین اس پر بیٹھ کر آدمی اگر عوام دشمنی نہیں بھی کرتا ہے تو عوام بیزاری کا اظہار تو کرتا ہی ہے، سلیمان خطیب کی شاعری خالص عوامی شاعری تھی۔ اس شاعری نے غریبی میں نام پیدا کیا اور خود شاعر کی قلندرانہ روش بھی آخر تک برقرار رہی۔

سلیمان خطیب کے مزاج میں وہ چھچھوراپن نہیں تھا جو شاعروں میں ہوتا ہے۔ (اور ہونا بھی چاہیے ورنہ ان میں اور آدمیوں میں فرق کیا رہا) میری ان سے شناسائی، آشنائی کی منزل پر یوں پہنچی کہ میرے اور ان کے درمیان ایک مشترکہ دوست مرحوم محمد علی بھی موجود تھے جو جامعہ عثمانیہ میں میرے ایک دو سال کے فرق کے باوجود خاص الخاص ساتھی تھے۔ وہ قانون کے طالب علم تھے اور میں برائے نام ادب کا۔ میرا گلبرگہ آنا جانا بھی انہی کی وجہ سے شروع ہوا۔ اور میں کالج کے زمانے میں جتنی مرتبہ اپنے وطن گیا ہوں اتنی ہی مرتبہ گلبرگہ بھی گیا اور پھر جب محمد علی، (جو پہلے کانگریس کمیٹی کے صدر ... اور بعد میں منسٹر بھی ہو گئے تھے) بنگلور منتقل ہوئے تو میں نے بھی بنگلور کے سبزہ زاروں کا معائنہ شروع کر دیا۔ سبز باغ دیکھتے رہنا میرا بہت پرانا شوق ہے اور ہمارے یہاں سبز باغ دکھانے بھی بہت جاتے ہیں)۔ گلبرگہ کے علاوہ بنگلور میں بھی سلیمان خطیب سے مڈبھیڑ ہوتی رہی۔ ملاقات اور مڈبھیڑ میں وہی فرق ہے۔ گفتگو اور ڈُو ڈُو جو بچوں میں ہوتا ہے۔ ملاقات وہ ہوتی ہے جو آداب، ضوابط اور تکلفات کے آرائشی سامان سے لدی پھندی ہو۔ جب کہ مڈبھیڑ میں یہ سب کچھ نہیں ہوتا وہ ملنے والے آدمیوں کی طرح ملتے ہیں وزرائے خارجہ کی طرح نہیں۔ سلیمان خطیب سے ایک مرتبہ پٹنہ میں بھی ملاقات ہوئی۔ آپ جانتے ہیں پٹنہ کہاں واقع ہے۔ یہ صرف برائے نام ہندوستان میں ہے ورنہ نیپال اور تبت سے اس کا تعلق زیادہ قریبی ہے۔ وہاں ۱۹۷۹ء میں ایک جشن ظرافت کا انعقاد عمل میں آیا تھا وہیں یہ ملے اور ملتے ہی بولے بہت تھکا ہوا ہوں۔ جب میں نے کہا آپ

کو گھبر کہتے یہاں تک پیدل نہیں آنا چاہیے تھا تو خفا ہو گئے اور بولے کیا میں پیدل آتا ہوں اور غصے میں سارا
مشاعرہ لوٹ لیا۔ مشاعرہ لوٹنا ان کی پرانی عادت تھی۔ سلیمان خطیب نے مشاعرہ گاہ کو ہمیشہ پانی پت کا
میدان سمجھا اور جب بھی شعر سنایا اس طرح سنایا جیسے شیر حملہ کر رہا ہو۔ سامعین کے پیٹ میں ہنستے ہنستے
بل پڑ جاتے اور پھر نکالے نہیں نکلتے۔ مشاعرے آپ نے بھی بہت دیکھے ہوں گے۔ دل لگا کر سنے بھی ہوں گے۔
مشاعرے کے دوران مشاعرہ گاہ میں بھی کافی ہل چل رہتی ہے۔ شاعر کلام پڑھتا رہتا ہے اور سامعین
اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ ان کا آنا جانا، چلنا پھرنا، کھانسنا، کھسر پھسر کرنا، یہ سارے مشاغل
جاری رہتے ہیں۔ لیکن میں نے سلیمان خطیب کو جس مشاعرے میں بھی پڑھتے سنا کیا مجال جو کوئی شخص
اپنی جگہ سے ہلا ہو بلکہ وہ لوگ بھی جو کسی مجبوری کی بنا پر یا منہ کا مزہ بدلنے کے لیے پنڈال سے باہر چلے گئے ہوں
دوڑ دوڑ کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے تھے اور سلیمان خطیب کو بیٹھنے نہیں دیتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے سلیمان
خطیب کو شاید اسکول کے زمانے ہی سے کھڑے رہنے کی مشق تھی اس لیے خوب کھڑے رہتے۔ گھنٹوں ثابت قدمی
کے ساتھ ان کے قدم کبھی نہیں ڈگمگائے اور نہ زبان لڑکھڑائی۔ مزے سے کلام سناتے رہتے۔ پانی سے ان کا
اتنا گہرا تعلق رہا کہ ان کا بیشتر کلام لوگوں کو پانی کی طرح یاد تھا۔ ان کی شاعری میں پنگھٹ، موٹھا اور باولی جگہ جگہ
پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ سنا ہے وہ نہاتے بھی تھے اور پابندی کے ساتھ نہاتے تھے۔ حمام میں نہانے جاتے
تو بڑی مشکل سے واپس آتے۔ یہ بھی سنا ہے کہ برسات کے موسم میں بہت خوش رہتے تھے اور یہ بھی مشہور ہے کہ
وہ گھر والوں کی آنکھ بچا کر کبھی کبھی برستے پانی میں بھی شرابور ہونے سے نہیں چوکتے تھے لیکن اس کے باوجود سلیمان
خطیب اپنی زندگی میں کہیں پھسلے نہیں۔ نثر نگار ہوتے تو ضرور پھسل پڑتے۔

وہ معمولی قد و قامت کے آدمی تھے لیکن شاعروں کا قد درزی کے فیتے یا کسی نقشہ نویس کے ٹیپ سے
نہیں ناپا جاتا۔ اس میں ایک دقت یہ بھی ہے کہ شاعروں کا قد ہمیشہ بڑھتا رہتا ہے اور سلیمان خطیب کا قد تو اب
بھی اونچا ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے اہلِ ادب اسے از سرِ نو جانچ رہے ہیں۔ میں نے اپنے اس مضمون میں ان کے اشعار
نہیں نقل کیے کہ کرتا تو پھر آپ میری نثر کیوں سنتے اور یوں بھی ان کے شعر تو صرف آپ کو نہیں آپ کے بچوں کو بھی یاد
ہیں۔ مجھے بھی یاد ہیں۔ صرف یہ یاد نہیں تھا کہ وہ چٹگوپہ میں پیدا ہوئے تھے۔

کرناٹک اردو اکادمی نے انھیں یاد رکھا تو اس سے خود اکادمی کے وقار میں اضافہ ہوا۔ ہاں یہ صحیح ہے
کہ اس موقع پر مجھے یاد کیا گیا تو اس سے میری عزت افزائی ہوئی۔ میری مشکل یہ ہے کہ جب بھی میں شکریے
کے لیے الفاظ تلاش کرتا ہوں وہ مجھے ملتے نہیں یا یہ الفاظ بھی سلیمان خطیب ہو کر رہ گئے ہیں۔ ●●

ڈاکٹر حشمت فاطمہ خانی
(شعبۂ اردو، کرناٹک کالج، بیدر)

سلیمان خطیب کی نظم "ساس بہو" ایک تجزیاتی مطالعہ

سلیمان خطیب دکنی اردو کے عظیم المرتبت اور عوامی شاعر تھے۔ انھیں ملک گیر شہرت حاصل تھی۔ وہ شمال سے لے کر جنوب تک جانے پہچانے اور پسند کیے جاتے تھے۔ یکساں طور پر انھیں بچے، جوان اور بوڑھے سبھی پسند کرتے تھے۔ ان کا کلام عوام کے دلوں کی ترجمانی کرتا تھا۔ سلیمان خطیب نے کبھی اپنا کلام ترنم سے نہیں سنایا۔ وہ نہایت موثر انداز میں اپنے کلام کو پیش کرتے تھے۔ ان کی بلند خوانی کا یہ عالم تھا کہ جب وہ نظم پڑھتے تو سارا مجمع جامد و ساکت ہو جاتا۔ ان کا نظم پڑھنے کا یہ انداز بالکل منفرد تھا جو انہی کا حصہ تھا۔ ہمارے عہد کے بعض شعرا اسٹیج پر جب کلام سناتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے گلے بازی ہو رہی ہے۔ خطیب کے کلام کا بعض حصہ تو ایسا ہے جس کی بلند خوانی صرف انہی کی مرہون منت تھی۔ " لندن پلٹ بیٹا باپ کی قبر پر" اس کی بہترین مثال ہے۔ انھوں نے اپنی نظم "روٹی" میں ترنم کے علاوہ شاعری کے موضوع، مواد، ہیئت اور پیش کش پر اچھوتا طنز کیا ہے:

اشعار کے گلانے میں استاد ہیں حضور — دلیاں بدل دیتے ہیں عقیدت کے نام سے
بے وزن شعر، صرف ترنم سے پڑھ لیے — بے معنی نظمیں لکھی ہیں جدت کے نام سے
ہر شکل بد کو کہتا ہے تجریدی آرٹ ہے — بیلی بنا کے رکھ دیا عورت کے نام سے

مندرجہ بالا اشعار سے سلیمان خطیب کے نظریۂ شعر پر روشنی پڑتی ہے کہ وہ شاعری میں ہیئت: موزونیت اور معنویت کو کس حد تک اہمیت دیتے تھے۔ نثر میں بھی انھوں نے "پہلی بات" کے تحت اپنی شاعری، مزاج، ماحول، دکنی زبان، رسم و رواج، الفاظ کا استعمال، قافیہ کی تنگ دامنی، روزمرہ اور محاورہ اور تشبیہات وغیرہ پر مکمل کر اظہار خیال کیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ دکنی ادب پر ان کی کتنی گہری نظر تھی۔ ان کی شاعری میں صنائع و بدائع ہاتھ باندھے کھڑے نظر آتے ہیں۔ اس لیے ان کا کلام عوام و خواص میں مقبول رہا۔ آج بھی

دکنی علاقوں کے اوسط درجے کے مرد و خواتین کے سینوں میں ان کا کلام محفوظ ہے۔ وہ خود یوں رقم طراز

> "میرا ماحول دکنی تھا اس لیے میں نے دکنی زبان اپنائی۔ میری شاعری کا مزاج دکنی ہے۔ اس کی تشبیہات دکنی ہیں، روزمرہ دکنی ہے۔ رسم و رواج دکنی ہیں، زبان کا بانکپن بھی دکنی ہے۔ میں نے ساکن لفظ کو دکنی کے انداز میں بھی متحرک باندھا۔ قوافی سے بغاوت کی ہے یا صوتی اعتبار سے الفاظ استعمال کیے ہیں"۔[1]

سلیمان خطیب نے "کیوڑے کا بن" کی شعری تخلیقات کو مختلف عنوانات کے تحت ترتیب دیا ہے جیسے گھر گھر کی بات، دھنک، محبت کی چھاؤں، ہمالہ کی چاندی، نئے رستے، پھر ڈھیرک اڑی، اور یو تا بوتا پھولاں مرجھا گئے۔ ان عنوانات کی تراکیب پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ عنوان کی استعاراتی اور علاماتی کیفیات کلام کی ترسیل میں افہام و تفہیم کا نیا راستہ فراہم کرتی ہیں۔ شعری تخلیقات میں الفاظ سیاق و سباق کے بغیر حتمی مطالب پیش نہیں کیے جا سکتے۔ ان باتوں سے قطع نظر اس طرح کے ذیلی عنوانات سے خود فن کار کے فکر و شعور کا بھی پتہ چلتا ہے۔

سلیمان خطیب کی جو نظمیں سب سے زیادہ مقبول ہوئیں ان میں، پہلی تاریخ، ساس بہو، یاد، روٹی، بڑی چھوٹا چھوری، پگڈنڈی، دکنی عورت کا انتظار، ہمالہ کی چاندی، ہیراج کا پلنگ، موت کا پانی اور کالو کھیتاں کا ٹوڑنے کا بل وغیرہ ہیں۔

نظم ساس بہو دراصل ہر گھر کا موضوع ہے۔ اس نظم میں جاہل ساس اور تعلیم یافتہ بہو کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے یہ ڈرامے کے قریب ہے کیونکہ ساس بہو کے خیالات کو مکالموں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے اور پھر بعض مقامات پر حرکات و سکنات، غم و غصہ، آنکھوں کا آنا، چڑھاؤ، رونے بیٹھنے اور بچے سننے کے عمل کو قوسین میں قلمبند کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ نظم میں روزمرہ اور محاورہ کو ٹھیٹ مکالمے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ ایک پابند نظم ہے جو فاعلاتن مفعلن فعلن کے وزن پر کہی گئی ہے۔ پوری نظم میں تسلسل موتیوں کی لڑی کی طرح موجود ہے۔

یہ نظم ساس کے اظہار خیال سے شروع کی گئی ہے۔ پہلے بند میں جملہ آٹھ اشعار ہیں۔ جن میں ساس کی طرف سے بہو کی کردار کشی کی گئی ہے۔ اس میں کلیدی الفاظ چالی، لالی، بال، جال اور ڈبا ہیں۔ اور یہ قافیے بھی ہیں۔ ابتدائی تین مصرعوں میں پیکر تراشی کی گئی ہے۔ یعنی چلنے کا انداز، ہونٹوں کی لالی، منہ پر بکھرے ہوئے بال، ایک مبہم تصویر بناتے ہیں۔ بعد کے تینوں مصرعوں میں آنچ لگانے، جال بچھانے، کھیا ڈبانے کا ذکر ہے اور بہو کے کردار پر سیاست وار بھی۔ آخری پانچ اشعار میں بیٹے کا کردار پیش کیا گیا ہے کہ کس طرح بہو نے بیٹے کو جال میں پھانس کر دیوانہ، بندر اور لٹو بنا رکھا ہے۔ روزمرہ کے علاوہ دو نادر تشبیہات بھی ہیں۔ جو ٹھیٹ دکنی کا حصہ ہیں۔ جیسے "بیٹے" کو "لٹو" کے گھومنے سے اور بہو کو مکڑی کے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں محاورہ بندر بنانا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ انہی مصرعوں میں دو جگہ لفظ پورا کا استعمال بھی اہمیت رکھتا ہے۔ پہلی بار لفظ 'پورا' کو کھینچ کر پڑھنے سے دوسری بار معانی سے پڑھنے سے معنویت میں اضافہ ہوتا ہے جیسے:

پورا بندر بنا کو بیٹھی ماں

دوسرے بند میں بہو، ساس کی طرف سے لگائے گئے الزامات کی تردید یا تائید کرنے کے بجائے دیوان

---

[1] پہلی بات، کیوڑے کا بن، سلیمان خطیب ص ۲۱

غالب کا ایک صفحہ الٹ کر تین اشعار پڑھتی ہے۔ غالب کے اشعار کے انتخاب سے بہو کی ایک علمی تصویر ابھرتی ہے۔ غالب کے کے اشعار سننے کے بعد ناخواندہ ساس ہاتھ ہلا ہلا کر خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جس غم و غصہ کا اظہار کرتی ہے اسے شعر میں سوال و جواب کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے:

کون غالب! یہ تیرا سگا ہے؟ کی؟ کیسے کو تھام لیتی ہے
کتاب ہوید؟ دلبری بولوں ماں ؛؛ غیر مردوں کا نام لیتی ہے

استفہامی علامتیں کون غالب؟ کی؟ اور کتاب؟ کے بعد لگائی گئی ہیں۔ دراصل یہ علامتیں اس لیے برتی گئی ہیں کہ لفظوں اور جملوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا جاسکے اور افہام و تفہیم میں زور پیدا ہو۔

ان بند کے تینوں اشعار فنی محاسن کے اعتبار سے تین الگ الگ خصوصیات کے حامل ہیں۔ پہلے شعر میں صنائع معنوی کے تحت سوال و جواب ہے۔ دوسرے شعر میں روزمرہ اور محاورہ اور تیسرے شعر میں رعایت لفظی کا اہتمام ہے جیسے ایک ہی قبیل کے الفاظ ہنسا، دانتاں توڑنا اور دات کیلی وغیرہ کا استعمال۔

مندرجہ بالا اشعار میں خطیب نے ساس کی جہالت کو پیش کرنے کے لیے حروف "ن" اور "م" کی آوازوں سے استفادہ کیا ہے۔ جیسے: کون، تھام، ماں، مردوں، نام، ہنسی، دانتاں، جس کی بنا پر تینوں اشعار میں گنگناہٹ والا عمل بھی موجود ہے۔ ان اشعار کے جواب میں حسب معمول بہو، غالب کا صرف ایک ہی شعر پڑھنے پر اکتفا کرتی ہے:

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

خطیب نے غالب کے اشعار کے انتخاب میں بھی ایک انوکھا انداز اختیار کیا ہے۔ یعنی یہ شعر بہو سے کہلوایا ہے۔ جس سے ساس کی جہالت کے تمام اثرات جو غم و غصہ یا ذہنی تناؤ کی شکل میں قاری کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، ایک ہی وار میں کافور ہو جاتے ہیں۔

نظم کے ایک اور بند میں ساس اپنی بہو کی مسلسل دل آزاری کرنے کے بعد خود اپنے آپ پر لعنت ملامت کرتی ہے۔ اسے کسی پل چین نہیں آتا۔ کچھ لمحوں کے لیے اپنے ماضی کو کریدنے لگتی ہے تو کبھی بہو کی طرف دوبارہ رخ کرتی ہے۔ اس بند میں ساس کا ایک ایسا روپ سلیمان خطیب نے پیش کیا ہے جو بوکھلاہٹ کا شکار ہے۔ ان اشعار میں بلا کی روانی پائی جاتی ہے۔ اس بند کے آخری شعر میں تجنیس تام تماثل کو خوب صورتی سے برتا گیا ہے۔ تجنیسی الفاظ "سادی" کا استعمال ملاحظہ کیجیے:

سیدھی سادی ہے کی بجلی ہے
سادی مانگے میں جا کو کھلی ہے

ان اشعار کو ملاحظہ کیجیے جن میں سلیمان خطیب نے تشبیہ اور تجنیس کو بڑی خوب صورتی سے نبھایا ہے، طرفین تشبیہ کا تعلق چکھنے یا ذائقے سے ہو تو تشبیہ ذوقی کہلاتی ہے جیسے:

کھٹی باتوں سے دل یہ کھٹا ہے ؛؛ دہی کرنے سے دودھ پھٹتا ہے

تشبیہ لمسی کی مثال پیش خدمت ہے:

کون لڑیگا جب کو تیرے سے
کا چکوری کی تو ڈھانی ہے

اس شعر میں طرفین تشبیہ ایسے ہیں جن کا تعلق چھونے سے ہے۔ اسی قبیل کی ایک اور تشبیہ ملاحظہ کیجیے:

سارے گھر میں دھواں سا پکڑی ہے
چٹ پٹے کی اجاڑ لکڑی ہے

اس تشبیہ کی خصوصیت یہ ہے کہ دھواں اور سا کو جدا کر کے ادا کریں تو معنی میں ہلکی سی تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور لفظ سا ادوات تشبیہ بن جاتا ہے لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے۔ دھواں سا ٹھیٹ دکنی لفظ ہے۔ یعنی وہ لکڑی جس کی اوپری پرت مسلسل دھواں لگنے سے کالی پڑ جاتی ہے۔ علاوہ ازیں لفظ لکڑی اور پکڑی میں تجنیس مضارع ہے یعنی یہ متقد المخرج یا قریب المخرج الفاظ ہیں جن کو ادا کرنے میں حلق کا ایک ہی حصّہ یا اس کے قریب کا حصہ کام میں لایا جاتا ہے۔

نظم 'ساس بہو' کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ابتدائیہ۔ درمیانہ اور اختتامیہ سلیمان خطیب نے ابتدائی حصہ میں واقعہ نگاری کی تکنیک کو استعمال کیا ہے، جس کے تحت ساس کے توسط سے بہو کے مختلف روپ سامنے آتے ہیں، جو ساس کی الزام تراشی کا سبب ہیں۔ اس کے برعکس بہو ٹائپ کردار بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کا سب سے اہم سبب یہ ہے کہ بہو کے ذریعہ صرف غالب، میر اور حالی کے اشعار پیش کیے گئے ہیں۔ جس کی بنا پر قاری کچھ دیر کے لیے اس الجھن کا شکار ہوتا ہے کہ یقیناً ایسی بہو بھی اس ارض دکن میں موجود ہے جو ساس پر ظلم و زیادتی کا سبب بنتی ہے۔

دوسرے اور تیسرے حصے کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سلیمان خطیب نے غالب، میر اور حالی کے اشعار کے بجائے بہو کو اپنی شعری زبان دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس حصّہ میں بہو کا کردار ٹائپ کے بجائے گوشت پوست والی عورت کا نظر آتا ہے۔ جس میں وہ ہر الزام کو فرشتے کی طرح سہنے کے بجائے انسان کی پوری محبت، خلوص، انکساری، عاجزی اور نیک نیتی کے ساتھ اپنے خیالات کو پیش کرتی ہے۔ فنی اعتبار سے بھی دونوں حصوں کی اہمیت اس لیے ہے کہ ان میں پیکر تراشی، تشبیہات، محاکات نگاری، الفاظ کی تکرار اور دخیل الفاظ کا استعمال موضوع کو بلندی عطا کرتا ہے۔

"تخلیق کار بسا اوقات اپنی باطنی کیفیات کا اظہار براہ راست نہیں کرتا بلکہ کائنات کی بعض اشیا اور احوال سے ان کی مماثلت و مناسبت پیدا کر کے نفس مضمون کو روشن کرتا ہے اور معنوی جہات میں اضافہ کرتا ہے۔ اس طرح اس کے مافی الضمیر کی بالواسطہ ترسیل ہوتی ہے۔ اس عمل کو تخلیق کار کی مخصوص پیکر تراشی کہا جاتا ہے۔" [1]

---

[1] پیکر تراشی کے حوالے سے۔ ڈاکٹر شہپر رسول، صفحہ ۳۔ کتاب نما مارچ ۱۹۹۲ء

مندرجہ بالا نکات کی روشنی میں سلیمان خطیب کی نظم کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے :

کوا لہرا کے چھت پہ گاتا ہے ۔۔۔ توا رہ رہ کے مسکراتا ہے
مرغی آنگن میں پر سکھاتی ہے ۔۔۔ کون مہمان گھر پہ آتا ہے
دل میں لڈو سے پھوٹ جاتے ہیں ۔۔۔ میرے میکے سے لوگ آتے ہیں

کوے کا گانا ، توے کا مسکرانا ، مرغی کا پر سکھانا ، سب مہمان کی آمد کے اشارے ہیں۔ خطیب نے توے کے مسکرانے کو شاعری میں برت کر ضائع ہونے سے بچا لیا ہے۔ اب وہ لوگ کیا جانیں جن کے گھر نہیں پکوان ہوتا ہے جس پر پکی ہوئی روٹیاں کھانے کے بعد نہ مرد مسکراتا ہے اور نہ عورت ، توا کہاں سے مسکرائے گا ۔ توے کا مسکرانا تو بس وہ لوگ جانتے ہیں جن کے گھر لکڑی ، بھوسہ یا گھاس پھوس کا ایندھن استعمال ہوتا ہے ، جس کی وجہ سے توا کو کالک لگ جاتی ہے جس پر آسمان کے تاروں کی طرح جھلملاہٹ پیدا ہوتی ہے ۔ یہی توے کا مسکرانا ہے ۔

نظم کے دوسرے حصے میں بعض جگہوں پر انگریزی الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں جیسے فلیش ، ہوٹل اور ڈگریاں وغیرہ اس کے علاوہ غنائیہ الفاظ بھی جیسے ناچ ، گانا ، فیشن ، کون ، دگینگا ، نشانی ، رنگ ، جوانی ، صندل ، کونلی ، لاآ لاآدھما ماپنگی اور اُنّے وغیرہ ۔

مندرجہ ذیل بند کے تین شعر ایسے ہیں جن کو ایک ہی لہجہ میں ادا نہیں کیا جا سکتا جیسے :

چار پیسے کما کو وارنگی	منہ لو جوتے ہزار مارنگی	(خودداری لہجہ)
میرے بھائی کی اک نشانی تھی	کرنا بولی تھی کیسی مانی تھی	(پچھتاوے کا لہجہ)
اُنّے اوندھا پڑیا تھا پڑ پڑ کو	اسے ڈگریاں اٹھا کو لانا تھا	(طنزیہ لہجہ)

سلیمان خطیب نے الفاظ کے استعمال میں صوتی تجربے بھی کیے ہیں ۔ یعنی کہیں ساکن کو متحرک باندھا ہے اور کہیں اس کے برعکس عمل کیا ہے ۔

اختتامی حصے کے تین بند نظم کا ماحصل ہیں ۔ لفظ " بات " کے عنوان سے آٹھ اشعار قلمبند کیے ہیں ۔ چودہ مصرعوں میں لفظ 'بات' کی تکرار ہے ۔ تقریباً تمام اشعار تشبیہہ کی ذیل میں آتے ہیں لیکن معنوی کیفیت سے علامتی ماحول پیدا ہوتا ہے ۔ بات ، کو ہیرا ، موتی ، لاج ، داغ ، باغ ، ثواب اور عذاب بتا کر باندھا گیا ہے تو کبھی گلاب ، عتاب ، رب ارنی ، ام الکتاب ، حتی کہ خنجر کی کاٹ بھی ثابت کیا گیا ہے ۔ اس کے بعد والا بند عجب العجاب ہے ۔ ٹھیٹ دکنی ہے ۔ ٹھیٹ دکنی تشبیہات جیسے ، کیر دکھنی تو ناٹ ، دق کے مریضوں کی کھانسی گھر بو چھکے سو ناٹ ، چیکیا سو چبو ، ترخیا سو بمبو ، دنیا کی کٹنی ، لال مرچیاں کی بکنی ، دمہ کی دھکنی اور بھٹی سو پھکنی وغیرہ کو خوب برتا گیا ہے ۔ اسی بند کے ایک شعر میں صنعت ابہام کو برتا گیا ہے جیسے :

سکتے جاتے ہیں تو بھی جانا گے
آکے نئے دس تجھے بجھانا گے

اس شعر میں جانا چلنے کے معنی میں نہیں بلکہ مرجانا کے معنی میں استعمال ہوا ہے ۔ اس بند کے آخری اشعار بھی اپنے اندر معنوی پرتیں سموئے ہوئے ہیں ۔

نظم کی ابتدا ساس سے ہوتی ہے اور اختتام بہو پر، جو آنکھوں میں آنسو بھر کر گڑگڑاتی ہوئی کہتی ہے کہ میری بھی عزت ہے۔ میری بھی وضعداری ہے اور مجھے گھر کی عزت کا پاس و لحاظ ہے ورنہ میں بھی بہت کچھ کہہ سکتی تھی۔ میں چونکہ تعلیم یافتہ ہوں اس لیے تعلیم میرے آڑے آتی ہے۔ یہ مت بھولو کہ تم بھی بیٹی ہو، بیٹی کے کئی روپ ہیں۔ یہ مریم بھی ہے زہرا بھی، رحمت بھی ہے جنت بھی سیتا بھی ہے۔ ساوتری بھی۔

سلیمان خطیب نے نظم ساس بہو کو دو مختلف اور منفرد اسالیب بیان میں پیش کیا ہے۔ ساس کے ضمن میں جتنے شعر ہیں سب کے سب ٹھیٹ دکنی اردو کے اور بہو کے لیے ٹھیٹ غیر دکنی زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں دو کرداروں کی منفرد حیثیتیں سامنے آتی ہیں۔ جن میں تضاد ہے لیکن سلیمان خطیب اس تضاد کو اپنے فن کے ذریعے یکسانیت میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ یکسانیت سے میری مراد یہ ہے کہ بیٹی ہو کہ بہو، اور ماں ہو کہ ساس! خطیب ہر کیف عورت کو مریم اور زہرا کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

سلیمان خطیب

شاعر اور فقیر

(ایک مردم شناس فقیر، غالب شناس شاعر کے دروازے پر)

فقیر:

روٹی آتی نظر نہیں آتی — کوئی امید بر نہیں آتی
نہ تو سالن بگھارا جاتا ہے — گوبھی اے چارہ گر نہیں آتی

شاعر:

شور کرتے ہو کس لیے بھائی — گھر کی حالت نظر نہیں آتی

فقیر:

میں تو چیخوں گا اور چیخوں گا — میری آواز گر نہیں آتی

شاعر:

ہٹے کٹے ہو بھیک لیتے ہو — شرم تم کو مگر نہیں آتی

فقیر:

پہلے پہلے بہت ہی آتی تھی — اب کسی بات پر نہیں آتی

شاعر:

آپ لوگوں کے پھر سنبھلنے کی — کوئی صورت نظر نہیں آتی
کرلی ہوتی ذرا سی محنت تو — ایسی حالت پہ پھر نہیں آتی

فقیر:

پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

شاعر: ایک لقمے پہ جان دیتے ہو — موت آتی ہے پر نہیں آتی
کبھی سوچا ہے اپنی حالت پر؟

فقیر: یہی سوچا ہے گانجا پی پی کر — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
ہم ہیں جنت میں یا جہنم میں — کچھ ہماری خبر نہیں آتی

شاعر:

ہم بھی چپ ہیں اسی تغافل پر — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
جو بھی کرنا ہے آج ہی کرلو — عمر بارِ دگر نہیں آتی

اچھے اچھوں پہ وقت آتا ہے
آتی جاتی نظر نہیں آتی

سلیمان خطیب

پہلی تاریخ

شوہر:
تجھے معلوم ہے، کی اِتّا خوشی سے آیوں
منجے آتے سو بی، نیں آتے سو گانے گایوں
آدمی بریانی بھی ہوٹل میں دبا کو کھایوں
دیکھ جیبق میں ترے واسطے کیا کیا لایوں
آج تنخوا ہے مری آج ہے چاندی سونا   بول گلّے میں ترے واسطے کیا کیا ہونا

بیوی:
بَس کرو، بھَوت ہوا شیخی بگھارو نکّو
کھٹّے مٹّھے منجے باتاں میں مٹھارو نکّو
گھولتاں سے تے شیشے میں اتارو نکّو
باتاں باتاں میں تمے لاتاں بی مارو نکّو
کی شرم نیں سو کتیں بات کو تنخوا آریئے   آنے کی دیر بھی نیں سیٹھ کے گھر کو جاریئے

شوہر:
سیٹھ کا پیٹ پھٹو کی یہ دلندر آیا
کی گے پہلیچ نوالے میں یہ کنکر آیا
پھلاں لگتیچ مرے جھاڑ پو بندر آیا
پیسہ آتیچ اِدھر چور بھی اندر آیا
سیٹھ کا چھوڑ، اری کیا ہے اُتا لقمہ ہے وہ   ہمے تھوکے سو گھراں پو کا نوالہ ہے وہ
آج جنّت ہے مرے ہاتھ میں جیبق ہے گرم
کھن کھنا کھن کی یہ آواز بھی اللہ کی قسم
اس کی آواز کی مٹّھی میں ہے دُنیا کا بھرم
اس کی آواز پو بک جاتا ہے لاکھوں کا دھرم
اس کی آواز پو گمّت کرے پیرانِ حرم   دھر کو پیشانی لگانے لگے پتھّر کے صنم
کھن کھنا کھن کی یہ آواز بھی اللہ کی قسم
اس کی آواز پو ہو جاتا ہے پتھّر بھی نرم

اس کی آواز پہ اٹھ جاتے ہیں گھنگرو کے قدم
اس کی آواز پہ ڈھل جاتی ہے آنکھوں کی شرم
پیسہ نئیں میں سو جگہ جئینگا رسائی دیکھو   باپ کاں ہے کی خدا، اُس کی خدائی دیکھو

بیوی: کی پڑیں اِتّا اُتانے تمے کیکو تن ترین
سونے چاندی کے دوالاں تمے کاں کے بن رین
ہتھیاں گھوڑے کیا دروجے پو تمارے ٹھن رئی
نئیں تو چھپّر سے تمارے کتو موتیاں چھن رئی
چار رُپڑی پو تمے کِتّا مرستے جارین   الّو! دُنیا کا خزانا بچ اٹھا کو لارین

شوھر: سونے چاندی کے دوالاں میں بنوں گا کاں سے
ہیرے موتیاں کی ین بنگوئی میں جھلوں گا کاں سے
تونس لگتی ہے تو پانی نہیں ملتا منجے
ہاتھاں گھی دودھ سے تیرے دھلوں گا کاں سے
چار روپڑی کو مرے اللہ کا ناؤں سمجھو   تیز دھپالے میں پیپل کی ہے چھاؤں سمجھو

بیوی: کب کتیوں ماٹی پڑو مجے پیمبر ہونا
منجے ہو کاچ لگئے لاکو پہنانا سونا
یہ تو عمر کا رہیا روگ، جنم کا رونا
کیا کروں انگ چھپانے کو تو چندی ہونا
کاں بھی جاریج نئیں گھر میچ یئں مرتیوں دیکھو   اللہ کاں ہے کی فقط بندیاں سے ڈرتیوں دیکھو

شوھر: گھر کو آریچ، لگی آکو مصیبت ماروں
دیریچ ہونے کی بلانے کی ہے عادت ماروں
تجے کتّا بی کرو سب ہے اکارت ماروں
اچھی لیٹی یہ سجے کاں کی نحوست ماروں
ایک بجلی ہے کہ ہر وقت کڑکتی رہیتے   تو تو نومن کی ہے مشال بھڑکتی رہیتے

بیوی:
تمے سونچو تو ذرا کیا میں کما کو لونگی
کیا بھکاریاں کے سرپکا میں گھرے گھر جونگی
گھر میں دانہ تو رہیا، لکڑی کا چورا نیں ہے
پاواں چولہے میں لگا کو کیا پکا کو بھوں گی
کیا تمارا ہے، تمے کاں تو بی جاکو کھاتیں　　رات کے بارہ بجے سیٹیاں بجانے آتیں

شوہر:
تجے، اللہ کی قسم بول اکیلا کھاتوں
جتنا ملتا ہے سبیچ لاکو میں تمنا بھاتوں
کیا میں لوگاں کے سر پکا جرا یاں واں جاتوں
چاند تاروں کے اُجالے میں کیا دھوتوں نہاتوں
ایک دیمک ہے مری جان کو کھاتے جارئے　　دھرکو گھر بار کا کمپا چ بٹھاتے جارئے

بیوی:
تنخوا دینے کو منجے لاکو تو پوری دیتیں
پیسہ پیسہ مجے پھسلا کو جھٹک کو لیتیں
اونٹنا، کڑھنا، فقط جی کو جلا لینا ہے
کتے بلیاں کا یہ جینا ہے کیکو جیتیں
ایو ماں آکو پڑی کیسے کے پالے دیکھو　　میرے ماں باپ مجے بوڑی میں ڈلے دیکھو

شوہر:
میرا احسان سمجھ لے تجھے لایا کر کو
نیئں تو جاتی تھی پھگٹ میں یہ جوانی سر کو
تو تو بیٹھی تھی فقط تاکتے میرے گھر کو
اماں بادا ترے کیا لاکو دیئے تمے مرکو
تیرے لوگاں کی فقط خالی حماقت دیکھو　　اینٹ کو بینچ کا کپڑا ہے نزاکت دیکھو

بیوی:
میرے لوگاں کے تمے نام نکالو نکو
عوداں لوبان تمے فاتیاں میں ڈالو نکو
دل میں نیئں ہے تو تمہارے بچے پالو نکو
تمنا اللہ کی قسم ہمنا سنبھالو نکو
ایک ٹکڑے کا مرا کیا ہے میں کاں بھی بجوں گی　　ہاتاں پاواں ہیں سلامت تو کما کو کھوں گی

شوہر:
ایسے لاکھوں کو ہزاروں کو میں دیکھیوں جاگے
اِتّا ایرا ہے تو میکے سے آٹھا کو لاگے
تو بھی اچھی ہے تیرے بھاگ بھی اچھے ہیں گے
ہاتاں پاواں کو غلاماں مرے بچّے ہیں گے

بیوی:
لاڑ کے تلنے تمارے کیا بِٹھا کو رکھتیئں
ایک لوٹا تو بی پانی کا وہ لاکو رکھتیئں
دیسے لے لے کو مجھے اُلٹا ڈرا کو رکھتیئں
باوا بیٹے مجے سب بِل کو کھپا کو رکھتیئں
چھوریاں کو بی بگاڑے تمے لاڑاں کرکو کرنے والے مجھے کو سینگے جی عمر بھر کو
صبح ہیچ گرم ان کو تو کھانے ہونا
پٹیاں پلٹا لے کو اسکول کو جانے ہونا
کپڑے فیشن کے زمانے کو دکھانے ہونا
ان کو رکشا تو بی، موٹر تو بی آنے ہونا
گاڑ کو گٹھڑی میں چھلّے میں دبا کو رکھیوں ان کے دادا کا خزانہ ہے چھپا کو رکھیوں
اڑو مٹھی پڑو وستاداں بی کیسے آرئیں
نوے نویچ، نوے فیساں لگاتے جارئیں
پیسے کاپیاں کے کتاباں کے بڑھاتے جارئیں
اِنو اَوندھیچ پڑے، پڑ کو پڑھاتے جارئیں
علم پیسہ ہے تو پیسے کا اُجالا نکّو دکھاں پہلیچ ہیں یہ دُکھ پو دنبالہ نکّو

شوہر:
یوں تو لانے کو میں کھنڈیاں سے کما کو لاتوں
تھاناں کے تھاناں میں کپڑے بھی اٹھا کو لاتوں
کیا میں دنیا کو بتلانے کو بتا کو لاتوں
تجھے آرام سے گھر میں میں بِٹھا کو لاتوں
گھر میں شیطان گھسیں کون یہ کھا کو جارئیں بالو بھا کو میری آنکھیاں میں دبا کو جارئیں

بیوی:
تمے سمجھو نکّو سگّے [illegible] آتے ہمنگے
آ کو پچھواڑے کے دروازے سے کھاتے ہمنگے

گھر کے چوہاں ایں شیچ کون پکڑنے والا
گوداں بھر بھر کو مرے گھر سے لے جاتے ہینگے
یہ بھری شام ہے اللہ کی قسم کھاتی ہوں   کچے بالاں سے میں قرآن اُٹھا لاتی ہوں
ایک دانہ بھی گیا ہنگا تو کیڑے پڑجاؤ
اپنے ہاتھاں سے یّں دی ہنگی تو ہاتاں جھڑ جاؤ
نیں سو بھوتاناں اُٹھی، دُنیا کے باتاں بڑجاؤ
آخری وقت زباں پو مری کلمہ اڑجاؤ
آڑے آنا تھا مری نیکی بچا لینا تھا   اللہ صاحب مجھے دنیا سے اٹھا لینا تھا
سچے باتاں تو سدا کڑوے کسالے ہوتیں
چپکے بیٹھو جی میرے نام پو کیکو روتیں
اماں بھاناں تو تمارے ہیچ کتّا دھوتیں
جیتے جی روز قبر میں ہیچ جاکو سوتیں
ہے مرا کون سیچ لوگاں تو مرکو بیٹھیں   کیسی دوزخ کے حوالے مجھے کرکو بیٹھیں

شوہر: ایل لگا! چپکے ہے بیٹھے تو بڑتے جاریئے
ایک نیھو کالے کی ندی ہے کہ چڑتے جاریئے
دل سے باتاں نوے نیں سو بی گھسڑتے جاریئے
بیری کی کانٹی مرے آنگ پو پڑتے جاریئے
تیری جب چلنے لگی جیب تو قینچی کیا ہے   چیر کو ٹکڑے کروں گا مجھے سمجھی کیا ہے

بیوی: تمنا نئیں بولی تو بولو جی میں کن کو بولوں
کو تلک بیٹھ کو چانول کی کرک کو ڈھولوں
کیا کتیں میں پی گھلوں ہور کیا تمنا گھولوں
بند مٹھی کے بھرم کو بھلا کیسے کھولوں
میری ہر بات تمارے کو فقط کھیل ہوئی   چھوکری بڑ کو ہرے منڈوے کی اب بیل ہوئی
دیکھتے دیکھتے نکلے ہوئے، جھاڑاں پورے
قداں بد نیچ لگیں، بلے میں تاڑاں پورے
ان کا ہیبت سے مجے راتاں کو نینداں نئیں ہیں
ایتو ماں کیسے اٹھیں گے یہ پہاڑاں پورے

بے فکر تان کو چھلاتے سوتے رہتیں   میرے شبنم کے نصیباں ہیں کہ روتے رہتیں
ابتے بلوجی پنیاماں کدر سے لائیں
تے بھو نکو پہلے کے سیریکا آئیں
چیزاں انکھیاں میں برے سل ننے تے گروی ڈالے
گرداں کن کے مُدڑ کو تے چیزاں بھاتیں
چھوریاں زر کے فقط زور پو بڑتیں دیکھو   جنتاں گود میں دوزخ کے بی پڑتیں دیکھو

شوھر:
اری نادان مَیں جو کچھ بی کما کو لاتوں
کتا مرکھپ کو میں جیو جان کھپاکو لاتوں
ایک عزت کی یہ روٹی کے لیے کیا بولوں
کتے جوتے مَیں کمینیاں کے اٹھا کو لاتوں
اپنی انگار میں خود آپ میں جل کو مرتوں   ایک دیپک ہوں اندھارے میں اُجالا کرتوں
ہڈیاں کن کے تُٹے سونچ یہ دولت کن کی
دوزخی ہاتھ بناتے ہیں یہ جنّت کن کی
سب کو کرسیاں پو بٹھادے کو زمیں پو سوتیں
ہم کمینیچ بڑھا دیتے ہیں عزت کن کی
ہمنا کاماں سے محبّت ہے کوئی کام نہیں   تاج مرمر کے بناتے ہیں مگر نام نہیں
ہمنا سب باغ بغیچے بی لگانے آتائے
پھولاں کھلتے ہیں تو پاواں میں بچھانے آتائے
بھکّے سوجا کو زمانے کو کھلانے آتائے
وقت پڑجائے تو گلّے بی کٹانے آتائے
ہو کو ماٹی کبھی ماٹی تلے مل جاتے ہیں   پھول بن کر کبھی ماٹی سے نکل آتے ہیں
دینچ پھولاں کسی چوٹی میں لگا دیتے ہیں   دینچ پھولاں کسی تربت پہ چڑھا دیتے ہیں
ہم غریباں ہیں غریباں کو غذا کچھ بی نکّو
درد اُٹھتا ہے تو اُٹھنے دو، دوا کچھ بی نکّو
ہم کو دیول کی بی دزقاں کی دُعا کچھ بی نکّو
نکّو بھگوان تیری ہم پو دَیا کچھ بی نکّو
بے سہارا ہیں غریباں تو سہارا کئیکو   ڈبنے والیچ ہے کشتی تو کنارا کئیکو

راتی بس اسی پو جیتے ہیں اُجالا ہنگا
کالے داناں کا کبھی تھوں بی تو کالا ہنگا
لگے کندھے پو ہمارے بی دشالا ہنگا
پیلے ہاتاں میں بھرا سونے کا پیالا ہنگا

دھرتی ناچے گی مرے کام پو صدقے جا کو چاند سورج مرے قدماں پہ گریں گے آکو

دیکھو امرئی کے ہرے منڈوے میں کوئل بولے
دھن مٹی اوڑھ کو ہریالا دوپٹہ ڈولے
بولو دُنیا کو ہنسے، جھوم کے بادل جھولے
جھک کو آکاش میری دھرتی کے پاواں چُھولے

جب بھی موڑ کا کوئی دھرتی سے نکل آئے گا ہم غریباں کے پسینے کی قسم کھائے گا

بیوی کا پیام خاوند کے نام

تمُنّا دیکھو ثواب ہنگا جی!
پوری تنخواہ بھجانے بولو یا!
ان کی عادت خراب ہے دیکھو
سیدھا گھر کوچ آنے بولو یا
ان کو دیکھے تو چاند کو دیکھے
ان کو دیکھے تو عید ہوتی ہے
عید ہمنا پھیکی ہوتی ہے
نہیں تو مٹی پلید ہوتی ہے

میاں کا جواب

تمے زندہ ہیں میں تو سمجھا تھا
قرض تمُنّا کچل دیا ہنگا
ہنگی اپنے بجٹ پو بمباری
ناک نقشہ بدل دیا ہنگا
چھوری کتے پچھا کو بیٹھنگی
چھورا غصہ میں چل دیا ہنگا
اپنی اماں سے نپٹے جھگڑیگے
گھر میں اجلاس بلدیہ ہنگا

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۲۹ شمارہ ۸

اگست ۱۹۹۶ء

ایڈیٹر

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

کتابت: محمود سلیم، محمد غالب، محمد عبدالرؤف
طباعت: دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:
۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
فون آفس: 595716 رہائش: 521064

فی پرچہ ۱۰ روپیے
زر سالانہ ۱۰۰ روپیے
بیرونی ممالک ۳۰ ڈالر

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے (فہرست)

مالِ مفت (انشائیے)

یہ ہے بمبئی مری جان

اُڑتے خاکے

چُورن (منظومات)

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن

رجسٹرڈ آفس : 825/B ـ I ـ 4 سکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ عابدس حیدرآباد

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے۔ یہ قرضہ جات 2 اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں۔ (۱) غربت ہٹاؤ اسکیم (2) خود روزگار اسکیم۔ غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کے جملہ لاگت کے کاروبار تک کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائینڈنگ، ترکاری فروش، میوہ فروش، اگربتی کا کارخانہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 25% کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود 4% کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور مابقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی چھ ہزار 6000 روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین، آٹو رکشا، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 20% کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح سود 6% پر دیا جاتا ہے۔ کارپوریشن مندرجہ بالا 2 اسکیموں کے تحت اپنے قیام سے لے کر ۳۱ مارچ 96ء تک 57837 افراد میں 12,66,60,000 روپے بطور مارجن منی قرض جاری کر چکا ہے۔ جس کی جملہ لاگت 5698,15,000 روپے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جاریہ سال 96-95ء سے مرکزی حکومت کا قائم کردہ نیشنل اقلیتی ڈیولپمنٹ اینڈ فینانس کارپوریشن کے اشتراک سے اب تک جملہ 868 افراد میں (16) منظور کردہ اسکیمات کے تحت 106,30,000 روپے مارجن منی قرض مزید جاری کر چکا ہے جس کی جملہ لاگت 270,03.000 روپے ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ کارپوریشن سنہ 93ء سے اقلیتی طبقہ کے نوجوانوں کو سالانہ مفت ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے چکا ہے۔ حیدرآباد میں 531 نوجوانوں کو نظام آباد میں 192 گنٹور میں 243 افراد کرنول میں 76 نوجوانوں کو تقریباً ۱۰ لاکھ روپے کے صرفہ سے کمپیوٹر میں، موٹر ڈرائیونگ، لیاب ٹیکنیشین، ٹیلرنگ، ٹائپ رائٹنگ وغیرہ میں ٹرینڈ کرایا گیا ہے۔

○ کارپوریشن کی شاخیں اضلاع کے ہیڈ کوارٹر پر بھی کام کر رہی ہیں خواہشمند حضرات کارپوریشن کے دفاتر سے ربط پیدا کریں۔

محمد علی رفعت
ایم کام ۔ ایل ۔ ایل ۔ ایم
نائب صدر نشین و مینجنگ ڈائرکٹر۔

مجتبیٰ حسین

بجٹ اور اردو شاعری

اس سال کے مرکزی بجٹ کے بارے میں عام طور پر اس رائے کا اظہار کیا جارہا ہے کہ یہ پچھلی سرکار کے بجٹ کا ایک تسلسل ہے۔ سچ پوچھئے تو ہمیں آج تک کوئی بجٹ سمجھ میں نہیں آیا۔ نہ پچھلی سرکار نہ موجودہ سرکار کا۔ لیکن اس کے باوجود ہمارا بھی ذاتی خیال یہ ہے کہ موجودہ بجٹ پچھلی سرکار کے بجٹوں کا ایک تسلسل ہے۔ تسلسل ان معنوں میں کہ وزیر فینانس مسٹر چدمبرم نے بھی اپنی تقریر میں اردو کے دو شعر پڑھے ایک شعر تو خیر ہماری سمجھ میں نہیں آیا البتہ وزیر فینانس نے یہ ضرور کہا کہ یہ شعر علامہ اقبال کا ہے اور ہوگا بھی ان کا ہی کیوں کہ وزیر فینانس نے جس طرح اس شعر کو ادا کیا اس میں ہمیں صرف ایک لفظ سمجھ میں آیا اور وہ ہے "شاہین" اور شاہین اگر کوئی پرندہ ہے بھی تو وہ علامہ اقبال کے سوائے کسی اور کی شاعری میں داخل ہونے کی جسارت نہ کرسکا۔ ہم ٹیلی ویژن پر مسٹر چدمبرم کی بجٹ تقریر کو بڑے غور سے سن رہے تھے۔ جیسے ہی انھوں نے علامہ اقبال کا نام لیا ہمارا دل باغ باغ ہوگیا۔ سچ تو یہ ہے کہ جب تک مسٹر منموہن سنگھ وزیر فینانس رہے ہم بجٹ کی تقریر صرف اس لیے سنا کرتے تھے کہ دیکھیں اس میں کتنے اردو شعر استعمال ہوتے ہیں۔ مسٹر منموہن سنگھ اردو شاعری کے دلدادہ رہے ہیں اس لیے بجٹ جیسے خشک موضوع کو آسان بنانے کے لیے وہ اپنی ہر بجٹ تقریر میں جابجا اردو شعروں کا استعمال کرتے رہے۔ ان کی بجٹ تقریر کے بعد لوگ تو یہاں تک پوچھتے تھے کہ بتائیے وزیر فینانس نے اس سال کتنے نئے ٹیکس اور کتنے اردو شعر کہے ہیں۔ بعض تو ایسے بھی تھے جو اردو شعر کو ٹیکس کے مماثل کوئی چیز سمجھتے تھے۔ مسٹر منموہن سنگھ کے بارے میں تو یہ سمجھ میں آجاتا تھا کہ چونکہ خود اردو جانتے ہیں اس لیے اردو شعروں کا اپنی بجٹ تقریر میں استعمال کرتے ہیں بلکہ بعض تو یہاں تک کہا کرتے تھے کہ بجٹ تو صرف ایک بہانہ ہے ورنہ بجٹ تقریر کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ منموہن سنگھ اپنے پسندیدہ شعر سنا سکیں۔ بالکل اسی طرح جیسے مولانا ابوالکلام آزاد نثر صرف اس لیے لکھتے تھے کہ اس میں جابجا اپنے پسندیدہ شعر پیش کرسکیں۔ یہ خیال ہم نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ مسٹر چدمبرم بھی اپنی بجٹ تقریر کو گوارا بنانے کے لیے اردو شعروں کا استعمال کریں گے۔ یہ اور بات ہے کہ علامہ اقبال کے شعر کو انھوں نے اپنے مخصوص شمالی لہجہ میں کچھ اس طرح سنایا کہ لگتا تھا علامہ اقبال نے یہ شعر خود تامل میں کہا ہو۔ اگر وہ "شاہین" کے لفظ کا صحیح تلفظ ادا نہ کرتے تو ہمیں پتہ بھی نہ چلتا کہ یہ اردو کا شعر ہے۔ بجٹ اور اردو شاعری میں بظاہر ہمیں کوئی مطابقت نظر نہیں آتی کیوں کہ اردو شاعری ہمیشہ سے فاقہ کشوں، قلندروں، مظلوموں اور مجبوروں کی

کی شاعری رہی ہے اور خاص طور پر علامہ اقبال کی ساری شاعری میں تو "فقر و فاقہ" کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے اور جا بجا عوام کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ وہ غریبی میں نام پیدا کریں (اور حکومت کو کوئی ٹیکس نہ ادا کریں) ظاہر ہے کہ جو آدمی غریبی میں نام پیدا کرے گا وہ شہرت تو کمائے گا لیکن دولت نہیں کمائے گا اور نتیجہ میں اس پر کوئی ٹیکس بھی عائد نہیں ہوگا۔ دیکھا جائے تو ساری اردو شاعری بجٹ کے خلاف جاتی ہے۔ عملی طور پر بھی اردو کے بہت کم شاعر ایسے ہوں گے جو حکومت کو اپنی آمدنی پر ٹیکس ادا کرتے ہوں گے۔ یہ ضرور ہے کہ مشاعروں کے بعض مقبول شاعر مشاعروں سے ملنے والی آمدنی پر کچھ ٹیکس ادا کرتے ہوں لیکن مشاعروں کے شاعر، شاعروں کے زمرے میں کہاں سے آتے ہیں۔ یہ تو ایک الگ ہی مخلوق ہے جو اگر ٹیکس بھی ادا کرتی ہے تو اس سے اس کی شاعری کے وقار میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ بھلے ہی اصلی اردو شاعری کا مال متاع، زر دولت سے کوئی تعلق نہ ہو لیکن وقتِ ضرورت اسے رئیسوں، صاحبانِ اقتدار اور امرا کے حق میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمیں یاد ہے کہ پچھلے سال مسٹر منموہن سنگھ نے اپنی بجٹ تقریر میں شعر پڑھا تھا۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے　؎　دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

یہ جاننے کے لیے ہم نے سر کھپایا کہ سرفروشی کی یہ تمنا آخر کس کے دل میں ہے کیوں کہ جو وزیر ٹیکس لگاتا ہے (چاہے وہ پگڑی ہی کیوں نہ پہنتا ہو) اس کے دل میں سرفروشی کی تمنا تو پیدا نہیں ہو سکتی۔ سرفروشی کی تمنا تو ٹیکس ادا کرنے والے کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ پھر ٹیکس لاگو کرنے والے کو خود قاتل تصور کیا جاتا ہے اسے آخر کیوں بازوئے قاتل کا زور جاننے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ اسے تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ مقتول کے گلے میں کتنا زور ہے تاکہ وہ اس مناسبت سے مقتول کے گلے پر چھری پھیرنے میں طاقت لگا سکے مگر بجٹ تقریر میں اردو شعر قاتل اور مقتول کو سامنے رکھ کر تھوڑی استعمال کیے جاتے ہیں۔ انھیں تو صرف بجٹ تقریر میں چاشنی پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

اب یہی دیکھیئے کہ مسٹر چدمبرم نے اس سال کی بجٹ تقریر میں علامہ اقبال کے اس شعر کا حوالہ دیا تھا جس میں "شاہین" کا لفظ استعمال ہوا تھا۔ بھلا بتائیے شاہین کا بجٹ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ نہ وہ ٹیکس ادا کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی ٹیکس عائد کر سکتا ہے۔ علامہ اقبال نے شاہین کا جو تصور پیش کیا ہے اس کے مطابق تو وہ ایک ایسا پرندہ قرار پاتا ہے جو ہمیشہ پرواز کرتا رہتا ہے اور ایسا اڑنے والا پرندہ کبھی ٹیکس کی زد میں نہیں آ سکتا۔ کسی ٹیکس دہندہ کو اگر شاہین کی طرح کی "طاقتِ پرواز" عطا ہو جائے تو وہ کبھی ٹیکس ادا نہ کرے یوں بھی شاہین کا بسیرا کبھی بھی "قصرِ سلطانی کی گنبد" پر نہیں ہوتا بلکہ وہ تو پہاڑوں کی چٹانوں پر رہتا ہے اور اردو شاعری کا بیشتر حصہ "قصرِ سلطانی کی گنبد کے خلاف کیے گئے شعری سرمایہ پر مشتمل ہے۔ اردو کے بیشتر شاعروں نے اپنے آپ کو اقتدار اور جاہ و حشمت سے دور رکھا لیکن یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ ان دنوں صاحب اقتدار لوگ بھی اپنے بچاؤ کے لیے اردو شاعری کا ہی استعمال کرنے لگے ہیں۔ کیا کریں اردو شاعری میں ہر آدمی اپنے مطلب کی چیز ڈھونڈ لیتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں بھارتیہ جنتا پارٹی کی تیرہ روزہ سرکار کو گرانے کے لیے پارلیمنٹ میں جو بحث ہوئی تھی اس میں بھی اردو شعروں کا بے دریغ استعمال کیا گیا تھا۔ رکن پارلیمنٹ مسز میرا کمار نے تو

تقریر کم کی اور اردو شعر زیادہ پڑھے۔ تھوڑی دیر کے لیے یوں لگا جیسے ہم پارلیمنٹ کی بحث نہ سن رہے ہوں بلکہ کسی مشاعرہ میں بیٹھے ہوں، بیرا کمار کا تلفظ تو خیر بہت صاف اور واضح تھا۔ حد ہوگئی کہ پارلیمنٹ کی سب سے جوشیلی رکن ممتا بنرجی نے بھی خالص بنگالی لہجہ میں اردو کا ایک شعر داغ دیا تھا۔ ابراہیم جلیس مرحوم نے بنگالی لہجہ کے بارے میں اپنے ایک کالم میں لکھا تھا کہ ایک دن وہ گھر واپس ہوئے تو ان کے بنگالی ملازم نے انھیں اطلاع دی کہ اس دن گھر میں "سیریا کا بادشاہ" آیا تھا اب یہ پریشان ہوگئے کہ سیریا کے بادشاہ کو کسی اطلاع کے بغیر ان کے گھر آنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی۔ مگر بہت بعد میں انھیں پتہ چلا کہ اس دن ان کے گھر میں "سیریا کا بادشاہ" نہیں آیا تھا بلکہ "چڑیا کا بچہ" آیا تھا۔

بہر حال پارلیمنٹ کی اس بحث کے بعد ہمارے ایک دوست نے کہا تھا "ہم تو یہ سمجھتے آئے تھے کہ اردو شاعری صرف انگریزوں کی حکومت کو گرانے کے ہی کام آسکتی تھی لیکن اب احساس ہو رہا ہے کہ آزادی کے بعد بھی اس میں دیسی حکومت کو گرانے کی بھی صلاحیت موجود ہے۔ بجٹ پیش کرتے وقت وزیر فینانس چاہے کتنے ہی اردو شعروں کا استعمال کیوں نہ کریں لیکن ٹیکس ادا کرنے والوں نے بھی اردو کے ہی ایک مصرعہ کو اپنی گرہ میں باندھ لیا ہے اور وہ مصرعہ ہے۔ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں۔

پس نوشت :-

مسٹر چدمبرم نے علامہ اقبال کا جو شعر اپنی تقریر میں اپنے مخصوص لہجہ میں پڑھا تھا اسے جاننے کی بہت کوشش کی لیکن پتہ نہیں چلا۔ بالآخر ہم نے پارلیمنٹ کی ایک اعلیٰ عہدیدار کو جو خود بھی ٹامل ناڈو کی رہنے والی ہیں اس سلسلہ میں زحمت دی اور انھوں نے ہمارے کالم کے لکھے جانے کے بعد ابھی ابھی اطلاع دی ہے کہ جو شعر مسٹر چدمبرم نے پڑھا تھا وہ حسب ذیل ہے :

شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا ⁂ پردم ہے اگر تو تو نہیں خطرہ افتاد

شعر سننے کے بعد ہم نے موصوفہ سے پوچھا۔ "محترمہ سچ سچ بتایئے کیا ٹامل نیاں میں" "خطرہ افتاد" ہوتا ہے؟" بولیں "بیٹے لیتا کے ساتھ ان دنوں جو کچھ ہو رہا ہے وہ خطرہ افتاد نہیں تو اور کیا ہے؟"

ہمیں بڑا اطمینان ہوا کہ دوسری زبانوں میں بھلے ہی شاہین نہ ہو "خطرہ افتاد" تو ہے۔ آخر میں وہ دوسرا شعر بھی سن لیجئے جو انھوں نے پڑھا تھا۔

چلے چلیئے کہ چلنا ہی دلیل کامرانی ہے!
جو تھک کے بیٹھ جاتے ہیں وہ منزل پا نہیں سکتے!

■■

اقبال شانہ (سعودی عرب)

میاں

ابھی تک ہے باقی نشانی میاں
مرے عقد کی شیروانی میاں

مرے دل کے دار الحکومت پہ ہے
مرے یار کی حکمرانی میاں

کسی دل ربا کے دوانے تھے ہم
ہماری بھی تھی اک دوانی میاں

حسینوں کے جھرمٹ میں رہتے تھے ہم
جواں تھی بہت ہی جوانی میاں

مرے سر پہ نازل ہوئی عقد میں
بلا تھی کوئی ناگہانی میاں

انھیں دیکھ کر خود بہ خود ہو گئی
ہماری غزل زعفرانی میاں

نہیں نیند آتی تھی جب رات کو
کہانی سناتی تھی نانی، میاں

جو بچپن میں لکھی تھی میں نے غزل
مجھے یاد ہے "منہ زبانی" میاں

سناتا ہے شانہ تو اپنی غزل
سناؤ تم اپنی کہانی میاں

غزلیں

اپنی ایکٹنگ سے بہت دھوم مچا رکھا ہے
اس نے ہر شخص کو دیوانہ بنا رکھا ہے

وہ جو چندے میں غبن تم نے کیا تھا مسٹر
کون سے ملک میں وہ مال چھپا رکھا ہے

چال بنڈی سے بھی آہستہ ہے اس کی لیکن
نام راکٹ کا مگر اس پہ لگا رکھا ہے

دال گلتی ہی نہیں ناشتہ ملتا ہی نہیں
کب سے اس دیگ کو چولھے پہ چڑھا رکھا ہے

کس کے دیوان سے تم نے یہ چرائی ہے غزل
کس کے مقطع میں تخلص کو لگا رکھا ہے

اپنے پاگل کو بھی گھسنے نہیں دیتے پاگل
تم نے کتوں کو بہت سر پہ چڑھا رکھا ہے

نام جھنڈے پہ یہ تم نے چڑھا رکھا ہے
میرے پیچھے کئی غنڈوں کو لگا رکھا ہے

مرغیوں کا تو تھا پہلے ہی سے آرام حرام
تم نے مرغوں کو بھی انڈوں پہ بٹھا رکھا ہے

صرف چیک بک کی وہ کرتا ہے نمائش ہر دم
کیش بیفے میں کہیں اس نے چھپا رکھا ہے

جس میں گھوڑا ہے نہ جوڑا نہ ہزاروں کا جہیز
آپ ہی کہیے کہ اس عشق میں کیا رکھا ہے

داستانِ شبِ غم سن کے وہ بولے ال ہیں
ففٹی پرسینٹ بلف تم سے ملا رکھا ہے

دیکھ کر ہنستے تھے ہم لوگوں کی چکنی تالو
آج قسمت نے تمھیں گنجا بنا رکھا ہے

پاگل عادل آبادی

وجاہت علی سندیلوی

چمچا بابو

صرف ایک چمچے نے۔ جی ہاں چائے کے ایک چھوٹے اور حقیر چمچے نے جو ہر جگہ اور ہر موسم میں پایا جاتا ہے۔ نہ صرف ہمارا سکون و آرام درہم برہم کر دیا بلکہ اگر ہم یہ کہیں کہ ہمیں ناشاد و برباد کر کے کہیں کا نہ رکھا تو ہرگز کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

ہوا یہ کہ ۳۵ سال کی ملازمت کے بعد جب ہم ریٹائر ہوئے تو ہم اپنے ذہن میں یہ جنت بسائے وطن لوٹے کہ اب اپنے آبائی مکان میں چین اور عافیت کے ساتھ مدت کے بچھڑے ہوئے اہلیان محلہ اور اعزا و اقربا کے درمیان خلوص اور محبت کی فضا میں زندگی کے باقی دن بسر کریں گے' اور ہر روز۔ روز عید اور ہر شب۔ شب برات کا لطف آئے گا۔ ہمارا سب سے بڑا ارمان یہ تھا کہ ہم کچھ دنوں کے لیے اپنی گھڑی اتار کر رکھ دیں گے کیوں کہ اپنے وقت کے مالک ہم خود ہوں گے۔۔۔۔۔ سویرے جب تک جی چاہے گا ٹانگیں پھیلا کر سوئیں گے اور دفتر میں فائلوں کی آڑ میں چوروں کی طرح جھپکی لینے کے بجائے اب دوپہر کے کھانے کے بعد ڈٹ کر کم سے کم دو گھنٹے قیلولہ فرمایا کریں گے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کو یہ ہدایت نامہ جاری کریں گے کہ اب ہم سرکاری طور پر معذور اور ماؤف قرار دیئے جا چکے ہیں۔ لہٰذا آؤ اور ہماری خدمت دل و جان سے کرو۔ ہم نے اپنا وصیت نامہ ابھی نہیں لکھا ہے۔ اور یاد رکھو کہ ؏

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

ہم ایک دنیائے آرزو سینے میں چھپائے اپنے وطن مالوف پہونچے تو اپنی توقع سے بھی زیادہ ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ حتیٰ کہ ان لوگوں نے بھی جن کے متعلق ہمیں سوئے ظن تھا کہ وہ در پردہ ہمارے بدخواہ اور ہم سے حسد کرتے ہیں۔ ہماری آؤ بھگت کرنے میں ہمارے دوستوں سے بھی سبقت لے گئے، اور ہم مارے خوشی کے پھولے نہ سمائے۔

اپنی آمد کے چند ہی روز بعد مرزا صفدر بیگ کے یہاں جگل کشور اور ہم چائے پی رہے تھے۔ شکر دان میں ایک نئے قسم کا چمچا پڑا ہوا تھا جس کا ایک سرا تو عام چمچوں جیسا تھا لیکن اس کو پکڑنے کا حصہ خلاف معمول چوڑا اور مخروطی شکل کا تھا جس پر کوئی انگریزی مونوگرام بنا تھا جو گھس جانے کی وجہ سے پڑھنے میں نہ آتا۔ جگل کشور نے چمچے کی کی تعریف کے پل باندھ دیئے۔ اور جب مرزا صاحب کی باری آئی تو انھوں نے اس کے متعلق ایک ایسی داستان ہوش ربا بیان کر کے رکھ دی کہ ہمارے نہ صرف کان کھڑے ہوگئے بلکہ منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس داستان کا لب لباب یہ تھا

کرکن گورنر جنرل کو اس کی محبوبہ نے دو چمچے جن میں سے ایک ہم لوگوں کے سامنے تھا کرسمس میں بطور تحفہ انگلستان سے بھیجے تھے۔ کسی شکار کے دوران مرزا کے پردادا نے اس گورنر جنرل کو شیر کے چنگل سے چھڑایا تھا اور اس نے اظہارِ احسان مندی میں ان دو میں سے ایک چمچا انھیں دے دیا تھا۔ اور ٹیپ کا بند یہ تھا کسی امریکی سیاح نے مرزا کو اس چمچے کو خریدنے کے لیے پانچ ہزار کی پیش کش کی تھی لیکن انھوں نے اسے نفرت سے ٹھکرا دیا تھا۔ اس رات ہمیں بڑی دیر تک نیند نہیں آئی اور جب آئی بھی تو ہم نے خواب میں دیکھا کہ ایک خوفناک شیر کے منہ سے گورنر جنرل کی محبوبہ اپنا چمچہ کھینچ رہی ہے۔ جنگل کشور نے اس خواب کی تعبیر یہ بتائی کہ مرزا کے پردادا کو ایسا تاریخی چمچا ہرگز نہیں ملنا چاہیئے تھا۔ شیر گورنر جنرل کو مرزا کے پردادا سمیت کھا ہی کیوں نہ جاتا۔ اس واقعہ کے چند روز بعد اتوار کو نخاس میں ہم اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے بخشو کباڑی کی دکان پر پہونچ گئے اس سے ہماری یاد اللہ تھی۔ دفعتاً اس کے سامان میں گورنر جنرل کی محبوبہ کے دوسرے چمچے پر ہماری نظر پڑی۔ ہم نے بے ساختہ چمچا اٹھا لیا اور کانپتی ہوئی آواز میں اس کے دام پوچھے: بخشو نے کہا سات ہم مجھے کہ سات ہزار مانگ رہا ہے۔ تفننِ طبع کے لیے میں نے کہا پانچ ہزار لو گے؟ بخشو بھی مسخرا سا ہے۔ بولا جی نہیں۔ بوہنی کا وقت ہے لائیے اس وقت صرف پانچ روپے دیدیجیے۔" اور پھر پلک جھپکتے ہمارا پانچ روپے کا نوٹ بخشو کے ہاتھ میں اور گورنر جنرل کی محبوبہ کا وہ تاریخی چمچا ہماری جیب میں تھا۔

ہم نے سوچا تھا کہ یہ چمچا جاکر مرزا کو دے دیں گے تاکہ ان کے پاس گورنر جنرل کی محبوبہ کی دونوں نشانیاں یکجا ہوجائیں۔ لیکن ہمارے ضمیر نے جس کا شیوہ ہے کہ وہ ہمیشہ ہمارے ہر پہلے خیال کی مخالفت کرتا ہے، ہماری سادہ لوحی پر ہم کو ملامت کی اور ہم مرزا کے بجائے اپنے پرانے دوست جنگل کشور کے پاس پہونچ گئے۔ دوسرے روز سارے شہر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ ہم نے ایک امریکی سیاح سے پانچ ہزار روپوں میں گورنر جنرل کی محبوبہ کا دوسرا چمچا خرید لیا ہے۔

پھر کیا ہوا؟ آگے کی تفصیلات بہت رقت انگیز ہیں ہماری تباہی، رسوائی اور اضطراری حرکات کی ہوش ربا داستان۔

چمچے کی نمائش کے لیے ہمارے گھر پہ سویرے اور شام دوست احباب، اور پھر ان کے دوستوں احبابوں اور شناساؤں کی دعوتیں ہونے لگیں۔ چمچے کے شایانِ شان گھر میں چائے کی پیالیاں نہیں تھیں۔ لہٰذا ہم کو مشورہ دیا گیا کہ ہم امپورٹڈ چمچے کے لیے کوئی بہت اچھے قسم کا امپورٹڈ چائے کا سیٹ لے آئیں۔ جائے کا سیٹ لینے پہونچے تو جو سیٹ پسند کیا اس کے متعلق پتہ چلا کہ وہ تو صرف چار سو کا ملتا ہے لیکن اگر ہم پندرہ سو میں اسی کے جوڑ کا ڈنر سیٹ خرید لیں تو وہ مفت میں مل جائے گا۔ چنانچہ پندرہ سو خرچ کر کے ہم چائے کا سیٹ گھاٹے میں لے آئے ہم خوش خوش یہ چیزیں لے کر گھر پہونچے تو یار دوستوں نے مبارکباد دینے کے بجائے مذاق اڑایا۔ گرجا شنکر جی بولے۔ یار اتنا بڑھیا یہ ڈنر سیٹ اور اس کے استعمال کے لیے تمہاری لارڈ ڈلہوزی کے زمانے کی ہلتی ڈلتی چرچراتی بے میل کرسیاں! ان کے درمیان تو تمہارا سیٹ ٹاٹ میں کمخاب کا پیوند معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات ہمارے دل کو بھی لگی اور ہم اسی وقت جاکر کھانے کی میز اور بارہ کرسیاں لے آئے۔

اس ساز و سامان کے بعد کھانے کے کمرے کا فرش خود ہم کو بھی مور کے پاؤں جیسا معلوم ہونے لگا۔ گورنر جنرل

کی محبوبہ کا چمچہ، اتنا چمچماتا ہوا دیدہ زیب چاہیے اور ڈنر سیٹ آتنی شاندار میز اور کرسیاں اور کھانے کے کمرے کا اوبڑ کھابڑ فرش! ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پانچ ہزار روپے کا ایک سبز ایرانی قالین لاکر اس کی ستر پوشی کردی. لائق صاحب نے قالین دیکھ کر زندگی میں پہلی دفعہ ہمارے ذوقِ سلیم کی بے ساختہ داد دی اور اپنی نالائقی کے ثبوت میں یہ بے محل شعر پڑھا ے

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی ؛ بن گیا روئے آب پر کائی

فرش کا خاطر خواہ انتظام ہوچکا تو ہمارے مخلصوں نے عرش یعنی چھت کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی چنانچہ ہم نے قالین ہی کے جوڑ کی چھت بنوائی سارے کمرے کا پلاستر جگہ جگہ شیشے کی الماریاں، کھڑکیاں آتش دان، منٹل پیس بنوانا اور پھر ان میں رکھنے کے لیے مناسب سامان فراہم کرنا، واش بیسن بجلی کے راڈ پنکھے، کولر انگیٹھیاں اور پھر آرائش کے متفرق لوازمات مثلاً تصاویر گملے گلدان وغیرہ خریدنا یوں تو جزوی باتیں تھیں. لیکن ان پر ہماری گاڑھی کمائی کے پندرہ ہزار روپے صرف ہوگئے. ان دنوں ہم پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی شاہجہاں کو اگر ہماری طرح سمینٹ کے لیے کلکٹریٹ کے اتنے چکر کاٹنے پڑتے اور پھر دکاندار کے یہاں دھینگا مستی کرنا پڑتی یا لوہے سے متعلق بابو کے گھر پر جاکر ان کے ضرورت سے زیادہ موٹے بچے کی ہم وزن مٹھائی کے روپے دینے پڑتے تو وہ یقیناً تاج محل یعنی اپنی بیوی کا مقبرہ بنوانے سے تائب ہو جاتا لیکن ہم تو گویا اپنا مقبرہ بنوا رہے تھے لہٰذا دشواریاں اور رکاوٹیں ہمارے جوش و انہماک کے لیے مہمیز ثابت ہورہی تھیں کیوں کہ ہمارے دل میں تو گورنر جنرل کی محبوبہ کا چمچہ ایک تیرِ نیم کش کی طرح کھٹک رہا تھا.

ہماری بدحواسیاں دیکھ کر ہماری بیوی کا یہ گمان یقین میں تبدیل ہوگیا کہ ہم جس چمچے کے لیے اس قدر حیران اور پریشان ہیں وہ کسی گورنر جنرل کی محبوبہ کا نہیں بلکہ خود ہماری کسی محبوبہ کا ہے. چنانچہ اس کی زیارت کے لیے دور دور سے آنے والی عورتوں کا جو تانتا سا بندھا رہتا اس کو اس نے ہنکانا اور بھگانا شروع کردیا. ہمارا اندوختہ اور پراویڈنٹ فنڈ تو پہلے ہی ختم ہوچکا تھا نصف کے قریب پنشن بھی بک چکی تھی اب بیوی کی محبت کا کھاتا بھی اپنے لیے بند ہوتا دیکھا تو ایک سہانی صبح کو ہمارے ذہن کی تاریک کوٹھری میں عقل کی بجلی کوندی. اور ہم نے گورنر جنرل کی محبوبہ کا چمچہ جھپٹ کر اٹھایا اور اس کو دریا میں پھینکنے کے لیے چل پڑے.

راستے میں اپنے مکان کے سامنے مرزا مل گئے. پوچھا کہاں جارہے ہو؟ عرض کیا کہ آپ کو گورنر کی محبوبہ کا جوڑی دار چمچہ نذر کرنے آرہا تھا. مرزا پر قہقہوں کا ایک دورہ سا پڑ گیا. کچھ قابو میں آئے تو بولے "اجی وہ گورنر جنرل والا قصہ تو میں نے جگل کشور کی ٹانگ کھینچنے کے لیے تصنیف کردیا تھا میں نے تو گھر کے پرانے برتنوں کے ساتھ اس بے جوڑ چمچے کو بھی بھنڈو کباڑی کے ہاتھ کئی مہینے ہوئے فروخت کردیا تھا ـــــ ہم نے ایک دلدوز چیخ کے ساتھ زبردستی مرزا کو وہ چمچہ تھمادیا اور بھاگے. ہم اس منحوس کم بخت ناشدنی چمچے کی یاد اپنے دماغ سے کھرچ کر پھینک دینا چاہتے ہیں لیکن اس کو کیا کیجیے کہ محلے والے اب ہمیں بڑے بابو کے بجائے چمچا بابو کے نام سے یاد کرتے ہیں.

□□

نسیم سحر (جدہ)

غزلیں

چوکھٹِ یار کو بت خانہ بنا لیتے ہیں
"لوگ تو بات کا افسانہ بنا لیتے ہیں"

تیری بس ایک نظر کے لیے بے چین ہیں لوگ
تیری آنکھوں کو شفاخانہ بنا لیتے ہیں

اپنے اشکوں میں نہاتے ہیں ترے گھر آکر
اس کو عشاق غسل خانہ بنا لیتے ہیں

جب صراحی میں سے پینے کو برتن نہ ملے
اپنے جوتوں کو بھی پیمانہ بنا لیتے ہیں

ہم سجاوٹ کے بہانے سے سجا کر گڑیاں
گھر کے کمرے کو بت خانہ بنا لیتے ہیں

جاکے میلوں میں نظر بازی کریں گے ہم بھی
اک ذرا طرزِ فقیرانہ بنا لیتے ہیں

○

میں نے جس دوست سے تھوڑی سی بھلائی کی ہے
اس نے پھر مدتوں بڑھ چڑھ کے برائی کی ہے

نوکری ملتی نہیں، بھوک سے مرتا ہوں مگر
کیسے مزدوری کروں میں نے پڑھائی کی ہے

عشق کی راکھ کے ڈھیر آج نکل آئے ہیں
عشق نے آج جو جھاڑو سے صفائی کی ہے

دل دھڑکتا ہے تو ٹک ٹک کی اک آواز کے ساتھ
ساتھ سینے کے گھڑی اس کی کلائی کی ہے

نہ ہوا یہ نہ ہوا دُور مرے عشق کا روگ
پانچ برسوں میں بہت اس کی دوائی کی ہے

ہم نے خود کتنے ہی رومان لڑائے ہیں مگر
اکثر عشاق کی سڑکوں پہ پٹائی کی ہے

○

عشق کا ٹائر جو پنکچر ہو گیا
سر میں جھٹکے سے فریکچر ہو گیا

فلم میں ہیرو سے کھائی ہے چپت
دوستو اب میں بھی ایکٹر ہو گیا

نوکری مجھ کو نہ جب کوئی ملی
تنگ آکر میں بھی ٹیچر ہو گیا

پینٹ امریکی پہننی پڑ گئی
اک بٹیرا آج تیتر ہو گیا

گالیاں میری تھیں سینڈل آپ کے
یوں حساب اپنا برابر ہو گیا

سر پہ انگلش طرز کے رکھے ہیں بال
مولوی بھی اب تو مسٹر ہو گیا

یوں کٹاری تیری آنکھوں کی چلی
مثلِ بکرا میں سلاٹر ہو گیا

منظور الامین
حیدرآباد

پل

ہمارے ایک دوست ہیں جنھوں نے ایک جرمن لڑکی سے شادی کی ہے۔ انھوں نے ایک بار ہمیں بتایا تھا کہ جرمنی میں رہائش کے دوران جب ان کا معاشقہ اس لڑکی سے چل رہا تھا تو انھوں نے ایک دفعہ اس لڑکی سے کہا تھا کہ اگر وہ یعنی ان کی محبوبہ انھیں حاصل نہ ہوسکی تو وہ خودکشی کرلیں گے ـــــ جملہ معترضہ کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے دوست نے بہترین ہندوستانی روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسا کہا تھا ـــــ ضمنی طور پر یہ بھی ہم کہنا چاہیں گے کہ اردو زبان کے مشہور شاعر مرزا غالب دراصل کائیاں اور بہانہ ساز تھے تبھی تو خودکشی کے موضوع پر انھوں نے یہ فرمایا تھا:

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستم گر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

ذرا سوچیے اگر مرزا واقعی خودکشی کرنا چاہتے تو کیا چاندنی چوک اور بلی ماران کا علاقہ جہاں مرزا قیام فرما تھے ـــ اتنا بھی گیا گزرا تھا کہ بازار میں زہر تک کھانے کو نہ ملتا بہرحال بات ہندوستانی عاشق اور جرمن معشوقہ کی ہو رہی تھی۔ جرمن لڑکی نے خودکشی کی بات سن کر ہندوستانی مرد کی تنبیہہ کی اور کہا "مرنے کی بات کیوں کرتے ہو، یہ کیوں نہیں کہتے کہ جب ہم میاں بیوی بن جائیں گے تو اس طرح سے جئیں گے کہ اوروں کو بھی رشک ہو"۔ جرمن خاتون کی بات تو ٹھیک ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ہندوستانی طرز معاشرت کا high point تو یہی ہے کہ عاشق مرنے کی بات کرکے معشوق کا دل دہلا دے یا اس کے دل میں جذبہ رحم پیدا کرکے اس کا دل جیتنے کی کوشش کرے۔

خودکشی کا ذکر چل نکلا ہے تو ذرا غور کریں کہ مایوس انسانوں نے کس طرح خودکشی کے نت نئے طریقے ایجاد کیے ہیں خود کو پھانسی دے دینا، ٹرین کے نیچے آجانا، زہر کھا لینا، کنویں میں چھلانگ لگا دینا جبکہ تیرنا نہ آتا ہو وغیرہ، ایک مقبول طریقہ پل پر سے نیچے کود جانے کا ہے۔ پل پر سے کودنے کی رسم خودکشی کرنے والوں میں مقبول رہی ہے۔ امریکہ کا گولڈن گیٹ پل اس کی کلاسیکی مثال ہے۔

یہ پل ۱۹۳۷ء میں تعمیر ہوا تھا اور اب تک کوئی ایک ہزار انسان اس پل پر سے نیچے کود کر وفات پاچکے

ہیں۔ اس طرح اس پل کو سنہری در کا پل نہیں بلکہ آہوں کا پل کہنا مناسب ہوگا۔ ویسے آہوں کا پل یا magna of Bridge اٹلی کے شہر وینس میں موجود ہے۔ یہ وینس کے چار سو پلوں میں سے ایک پل ہے، وینس کی نہریں کی ہیں، اس پل کو سولھویں صدی میں CONTINO نے بنایا تھا۔ جب کی آہیں ہوئیں مربوط یہ پل بنا۔ یہ پل ڈیوک کے محل کو قید خانے سے جوڑتا تھا —— جملہ ہائے معترضہ کے طور پر کہنا یہ ہے کہ تاریخ گواہ ہے کہ محلوں کا راستہ اکثر قید خانوں تک ہی جایا کرتا ہے۔ مثلاً صاحبقران شہاب الدین شاہ جہاں کو آگرے کے قلعے میں بیس سال تک قید میں رکھا گیا تھا —— شاہ جہاں کا جمنا پر سے راستہ تاج محل تک جانے کے پل کا خواب، خواب ہی رہا اور وہ پل بن ہی نہ پایا، اشبیلیہ کے بادشاہ معتمد کو بھی اس کے قصر سے نکال کر قید خانے میں ڈال دیا گیا تھا۔ ان بادشاہوں کی تیغ دودم قید خانے کی زنجیر میں تبدیل ہو گئی تھی ——

ادیب ہم نے مرزا غالب کا ذکر کیا، انھیں غالب کا پل ہی سے متعلق ایک نہایت عمدہ شعر ہے۔

چوں عکس پل بہ سیل بہ ذوق بلا برقص
جا را نگاہ دار و ہم از خود جدا برقص

ہماری زبان میں اس شعر کا منظوم ترجمہ مضطر مجاز نے بڑی خوب صورتی سے کیا ہے۔

جل سایۂ پل، سیل پہ با ذوق بلا ناچ
رکھ خود پہ نگہ اور ذرا خود سے جدا ناچ

آب دریا میں کمانوں والے پل کا سایہ ناچتا ہے تو بھی تباہی کے خرابے میں اپنے وجود سے الگ ہو کر خود پر نگاہ رکھ مگر اپنا توازن برقرار رکھ کر رقص کر —— اسی کا دوسرا نام انفرادیت ہے کہ انسان خود پر نگاہ رکھے اور خود سے جدا ہو کر بھی اپنی ذات، اپنی انا کا محاسبہ کرتا رہے۔

یہ سوال اکثر نادان لوگ کیا کرتے ہیں کہ انسان پل کیوں بناتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ کچھ افراد تو اپنے نام نمود کی خاطر ایسا کیا کرتے ہیں۔ یہ شعر اسی بات کی وضاحت کرتا ہے:

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

غرض ہے کہ گو راقم کا نام بھی منظور ہے لیکن واضح ہو کہ شاعر نے اس خاک سار کو مخاطب کر کے یہ شعر تحریر نہیں کیا تھا۔

اسی شعر سے یہ پہلو بھی نکلتا ہے کہ پل کا بنانا عوام الناس کو فیض پہنچانے کے زمرے میں آتا ہے۔ حکومتیں پل بناتی ہیں تو جنتا کو فائدہ پہنچانا تو وہ چاہتی ہی ہیں لیکن جس پارٹی کی حکومت ہوتی ہے وہ اپنی پارٹی کا image اونچا اٹھانے کی خاطر بھی ایسا کیا کرتی ہیں کہ آنے والی نسلیں یاد رکھیں کہ فلاں پارٹی کے دور حکومت میں فلاں زریں پل بنایا گیا تھا، یہ بھی ایک طرح سے لفظوں کا کھیل ہے۔ لفظ ایک تشکیلی شئے ہے، لفظ کو Bridge of matter بھی کہا جاتا ہے یعنی لفظ دو روحوں کے درمیان مادے کا پل ہوتا ہے۔ مگر یہ ترسیل و ابلاغ کا مسئلہ ہے!

دنیا کے تمام شہروں میں کسی نہ کسی طرح کے پل موجود ہیں۔ سری نگر کو سات پلوں کا شہر کہتے ہیں۔

ہمارے پیارے حیدرآباد شہر میں بھی کئی پل ہیں جیسے مسلم جنگ کا پل، نیا پل، پرانا پل۔ ان سب پلوں کی خاصیت یہ ہے کہ یہ پل آج بھی ان ہی جگہوں پر موجود ہیں جہاں انھیں تعمیر کیا گیا تھا۔ لیکن اسی شہر میں ایک پل ایسا بھی ہے جسے ہم National پل کہہ سکتے ہیں جو صرف لوگوں کے تصور ہی میں ہے حقیقت میں موجود نہیں اور وہ ہے لکڑی کا پل۔ لکڑی کے پل کے علاقے سے ریل ٹریک گزرتا ہے۔ وہاں ایک over bridge ہے جس پر سے سمنٹ کانکریٹ کی مضبوط سڑک گزرتی ہے، ہمارے اسی شہر میں کچھ پل ایسے بھی ہیں جہاں ریل ٹریک اوپر ہے اور نیچے سے انسانوں اور گاڑیوں کا ٹریفک گزرتا ہے۔ یہ الفاظ تحریر کرتے ہوئے ہمیں ہمارے شہر کا پینڈر گھاسٹ روڈ یاد آرہا ہے۔ جس پر سنجوپا پارک روڈ سے الحاق کرنے والا ریلوے کا ایک پل ہے، ٹرین کے بعض قابلِ رحم مسافر ٹرین میں سفر کرتے ہوئے اس ریل پر سے اکثر وہ سب کچھ نیچے انڈیل دیتے ہیں جس کا شمار ناقابل گفتنی میں کیا جانا چاہیے۔ اس پل کے نیچے سے گزرتے ہوئے اکثر معصوم آلائش کا شکار ہوتے دیکھے گئے ہیں کیونکہ ٹرین کے ٹریک کے نیچے ایسے gaps ہیں جو چشم زدن میں آلائش کو نیچے تک پہنچا دیتے ہیں، الحذر از نوع انسان الحذر!

ہماری جنتا یہ اچھی طرح جان گئی ہے کہ ہمارے زیادہ تر نیتا الکشن کے موقع پر ایسے وعدے کرتے رہتے ہیں جن سے مجبور، غریب و سادہ ووٹر بہلاوے میں آجاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں بہت معصوم پروانے فریب نور کھاتے ہیں، مثلاً ایک نیتا نے ایک بیان دیا تھا کہ الکشن جیتنے پر وہ اپنے حلقے میں ایک بڑا پل بنوا دیں گے۔ جب کہ ان کے علاقے میں نہ تو کوئی دریا تھا نہ پہاڑی راستے نہ ایسے شہر تھے جن میں rivers - پل کی ضرورت پیش آتی، دراصل وہ نیتا High - flying کی مشق کر رہے تھے۔

انگریزی کی ایک مشہور فلم ہے Bridge on the river Kwai۔ ایک پل کی تعمیر کے لیے جان کو جوکھم میں ڈالنے والی یہ ایک معرکے کی فلم تھی جس طرح سے اسے فلمایا گیا تھا وہ خود ایک Hazardous عمل تھا۔

دنیا کے ہزاروں شہروں اور پہاڑوں اور دیہاتی علاقوں اور دریاؤں پر لاکھوں پل علاقوں اور آبادیوں کو آپس میں جوڑتے ہیں یہ پل عوام کو آسانیاں بہم پہنچانے کے لیے بنائے گئے ہیں بعض پلوں کے نام خاصے Esoteric یا پراسرار سے ہیں مثلاً سری نگر کا زیرو برج، الہ آباد کا پھاپھا مئو برج دلی کا پل بنگش، لندن کا واٹرلو برج، نیویارک بندرگاہ کے دہانے پر ویرازانو نیروز برج جو دنیا کا سب سے طویل معلق پل ہے (جس کی لمبائی تقریباً چودہ ہزار فیٹ ہے)

انسان صدیوں سے پل بناتا آیا ہے۔ آج کل پلوں کی تعمیر میں فولاد زیادہ استعمال میں لایا جاتا ہے، پل بنانے کی تکنیک وقت کے ساتھ بدلتی رہی ہے، ہمارے انجینئر بتاتے ہیں کہ پلوں کے چار خاص اقسام ہیں، محرابوں اور کمانوں والا پل، Girders (کڑی دو ستونوں پر ہموار رکھی جاتی ہے) والا پل Cantilever برج یا ناٹ یا تی والا پل اور چوتھا معلق پل، ویرازانو نیروز معلق پل تو دنیا کا ایک پل ہے لیکن ایک پل وہ ہے جو معلق ہے دوزخ کے درمیان اور اس کا نام ہے پل صراط، یہ پل بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز دھار کا ہے۔ کہتے ہیں نیک بندے اس پر سے بہ آسانی گزر جائیں گے اور گنہگار کٹ کٹ کر جہنم میں گرتے جائیں گے، اسی لیے

شاعر نے کہا ہے:

رکھنا سمجھ سمجھ کے قدم چاہیئے یہاں
دنیا نہیں صراط ہے یوم الورود کی

اسی پل صراط سے متعلق ایک مشہور واقعہ ہے، محمود غزنوی کے عہد حکومت میں ایک دن بادشاہ غزنی کے ایک مشہور پل پر سے گزر رہا تھا فوج کے جوان ساتھ تھے۔ ایک جانب سے ایک بوڑھی عورت اچانک بادشاہ کے سامنے آئی، محمود نے باگ کھینچ لی اور بڑھیا سے وجہ جاننا چاہی، بڑھیا نے کہا:

وائے گر میرا ترا انصاف اس پل پر نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع تھی کہ یاں ہو جائے گا

کیا چاہتی ہو؟ بادشاہ نے پوچھا:

"بادشاہ یہ بتاؤ میرے مقدمے کا فیصلہ تم اس پل پہ کروگے یا پل صراط پر"، بڑھیا کا جواب بلکہ سوال تھا، بادشاہ یہ سن کر لرز گیا اس نے فوراً متعلقہ افسروں سے کاغذات منگوائے اور اس پل پر بڑھیا کے مقدمے کا فیصلہ صادر کر دیا۔

کرشن چندر کی مشہور کہانی ہے "مہالکشمی کا پل" اس کہانی کے مطابق آپ کسی بھی پل کے اِس طرف ہوتے ہیں یا اس طرف، انسان کا بیک وقت پل کے دونوں طرف ہونا ناممکنات میں سے ہے۔

انگریزی زبان میں پل کے لیے Bridge کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ ویسے Bridge گنجفے کا ایک کھیل بھی ہوتا ہے جو یونان میں اختراع ہوا اسی کا ایک شاخسانہ ہے Auction bridge جو ہندوستان کے آئی سی ایس افسروں کی ایجاد تھی اس کے علاوہ Contract Bridge بھی مقبول ہوا Bridge town، post اور Bridge water پلوں کے نہیں بلکہ مشہور بندرگاہوں کے نام ہیں۔

انگریزی زبان ہی کا لفظ Push بھی بہت جاندار لفظ ہے۔ اگر کسی کو کوئی اہم کام بنانا ہو تو کہتے ہیں اس کے لیے Push چاہیے یعنی کسی طاقت ور ہستی کی سفارش یا مدد۔

اردو کی مشہور شاعرہ زہرہ نگاہ نے پل کے ٹوٹنے کا ذکر بڑے خوب صورت لفظوں میں کیا ہے:

ندی میں باڑھ آجائے کوئی پل ٹوٹ جائے تو
کسی لکڑی کے تختے پر
گلہری، سانپ، چیتا اور بکری ساتھ ہوتے ہیں
سنا ہے جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے
خداوندا
ہمارے شہر میں اب جنگلوں ہی کا کوئی دستور نافذ کر

چوبے، اینٹ، مٹی، پینے، گارے، سمنٹ، لوہے اور فولاد وغیرہ سے پل بنتے ہی ہیں لیکن ایک پل وہ ہوتا ہے جسے انگریزی میں Bridge of understanding اور ہماری زبان میں سمجھ بوجھ؟

پل کہتے ہیں ، یہ پل ایک قسم کا [illegible] پل ہوتا ہے - آج جب ناسمجھی ، کم عقلی ، خودغرضی ، آپسی دشمنی کا دور دورہ ہے تو دنیا کو اس پل کی اشد ضرورت ہے تاکہ ان برائیوں کی خلیج پاٹی جا سکے - یہ پل ملکوں قوموں اور ملتوں کے دلوں کو جوڑنے والا پل ہوگا ، اگر یہ پل قوموں اور ملتوں کے ذہنوں میں تعمیر ہو جائے تو پھر دنیا کو نہ تو نیوکلیائی ہتھیاروں کی ضرورت ہوگی ، نہ بڑی بڑی نوجوان ہلاکت خیز مشینوں کی -

اقوام متحدہ کا ایک آرگن ہے UNESCC یعنی اقوام متحدہ کا تعلیمی ، سماجی اور ثقافتی ادارہ ، اس کا چارٹران الفاظ سے شروع ہوتا ہے -

" چونکہ جنگیں انسانی ذہن کا اختراع ہوتی ہیں اس لیے یہ اہم ہے کہ انسانوں ہی کے ذہنوں میں دفاع امن تعمیر کیا جائے "

دوسرے لفظوں میں انسان کو آج اسی سمجھ بوجھ کے پل کی ضرورت ہے !

غزل

رؤف رحیم (حیدرآباد)

کبھی تو ناز سے لوٹا کبھی اداؤں سے
یہ چھیڑ ٹھیک نہیں ان کی بے نواؤں سے

پریشاں روز میں رہتا ہوں ان بلاؤں سے
خدا بچائے مجھے حسن کے خداؤں سے

بچے ہوئے ہیں خرافات کی ہواؤں سے
ہماری جھونپڑی اچھی محل سراؤں سے

خدا کے واسطے افلاس کو نہ لاؤ یہاں
پیام آتے ہیں لیڈر کو یہ خلاؤں سے

عجب ہے وقت کی یہ آج تیز رفتاری
کہ بوڑھی لگتی ہیں اب بیٹیاں بھی ماؤں سے

بتائیں کیا جو ہے خلوت میں ماجرا ان کا
دکھائی دیتے ہیں ہم کو جو پارساؤں سے

مریضِ عشق ہوں آگے رہے کوئی لیلیٰ
دوا سے کام چلے گا نہ اب دعاؤں سے

سیاسی مولوی

اسرار جامعی (دہلی)

ہر چند مولوی ہوں سیاست بھی دین ہے
ملت ہے میری ساتھ مجھے یہ یقین ہے

کیونکر نہ ہو کہ میری سیاست میں دھاک ہے
ہاتھوں میں فتوے ڈھالنے کی بھی مشین ہے

کل تک جسے اچھال رہا تھا بزور و شور
فتوے سے میرے آج وہ کوڑی کا تین ہے

نکلے گی قوم میرے شکنجے سے کس طرح
دنیا ہے دائیں ہاتھ میں بائیں میں دین ہے

صاف صاف

منہ پھٹ ناگپوری

کیا جائزہ کسی مست جمال کا
چشمہ خرید لائے ہیں ستر ریال کا

شاعر بھی ہے ادیب بھی ہے ایکٹر بھی ہے
سالا ہمیں ملا تو ملا ہے کمال کا

رشوت نے سارے ملک کو برباد کر دیا
پیسہ کسی کے پاس نہیں ہے حلال کا

کالونی کو اٹھا لیا انگلی کی نوک پر
نشہ ہے خوب ہاتھ کی بھٹی کے مال کا

جاتے ہوئے شباب کی تاب و تواں سنبھال
معشوق مل رہا ہے مجھے بیس سال کا

منہ پھٹ کوئی بھی تیر چلائے تو غم نہیں
کپڑا سلا لیا ہے مگرمچھ کی کھال کا

○

عشق ہم جب سے کر کے بیٹھے ہیں
ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھے ہیں

راستہ ہے تو راستہ ہی سہی
سامنے اپنے گھر کے بیٹھے ہیں

جان سو آفتوں میں ہے اپنی
آپ تو بن سنور کے بیٹھے ہیں

بخدا ہم تمہارے کوچے میں
آسماں سے اتر کے بیٹھے ہیں

آج کپڑے کلر کلر ہوں گے
آپ پچکاری بھر کے بیٹھے ہیں

علم ذاتی کے سارے بڑبولے
نیچے زیر و زبر کے بیٹھے ہیں

ایرے غیرے کسی تو نہیں منہ پھٹ
یہ سبھی کھیت چر کے بیٹھے ہیں

ڈاکٹر محمد یونس بٹ
پاکستان

برسی پر مبارکباد

صاحب جس بندے کو یہ پتہ ہو کہ اسے کس دن اور کس وقت مرنا ہے وہ یا تو کوئی ولی اللہ ہوتا ہے یا کوئی قاتل ڈاکو جسے یہ صحیح پتہ ہوتا ہے جب کہ شاعروں کو تو یاد بھی نہیں رہتا کہ وہ کہاں کہاں مرے تھے اور کس کس پہ مرے تھے۔ ہم نے ایک ماہر اموات سے پوچھا شاعروں میں ڈیتھ ریٹ کیا ہے ؟ کہا وہی جو دوسروں میں ہے ایک موت فی فرد ہم نے ایک آمر کے بارے میں لکھا تھا کہ اس نے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو کچھ کیا اس میں سب سے اہم اس کا مرنا تھا ایسے ہی ادب کی خدمت کرنے کے لیے سانگلہ ہل کے شاعر نعمت سانگلوی صاحب نے پچھلے دنوں اپنی دوسری برسی منائی یہ واحد شاعر ہیں جن کی برسی ان کی زندگی میں منائی جاتی ہے یہ ان کی دوسری برسی تھی حالانکہ ان کا کلام پڑھ کر لگتا ہے یہ برسی کئی برس پہلے ہی شروع ہو جانا چاہیئے تھی اخبار کے مطابق ان کا کلام بوروں میں بھر کر محفوظ کر لیا گیا ہے ہمیں یہ تو پتہ نہیں ایک بورہ کا کلام کتنے بوروں کو بھر سکتا ہے بہرحال کلام کو بروقت بوروں میں بھر کر لوگوں کو محفوظ کر لیا گیا ہے موصوف کو ہم پہلے سے نہیں جانتے لیکن پتہ چلا ہے کہ ان میں شروع ہی سے مرحوموں والی خوبیاں پائی جاتی ہیں غربت کی وجہ سے ان کی شاعری کی کتابیں نہ چھپیں صاحب اگر ان کی کوئی کتاب ابھی تک نہیں چھپی تو پھر ان کی برسی کی کوئی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔

ہمارے ہاں کچھ شاعروں کی تاریخ وفات دراصل ان کے دیوان کی تاریخ اشاعت ہوتی ہے کچھ اور یوں شاعروں کا بروقت مرنا ہی ان کی ادبی خدمت ہے جیسے ہدایت کار ڈیوڈ لین نے نئے اداکار سے کہا کہ میں نے تمہارے ساتھ فلم میں سب سے بڑا احسان یہی کیا ہے کہ پہلی ریل میں ہی مروا دیا ہے نعمت سانگلوی کی شہرت ان سے ہمیشہ دور دور پھیلی ہے ویسے بھی شاعر کی اپنے گھر میں عزت ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ گھر والے اسے شاعر نہیں مانتے نعمت سانگلوی صاحب کہتے ہیں میں شعر سنا رہا ہوں تو لوگ جب اٹھ کر جاتے ہیں تو میں نہیں گھبراتا البتہ تب گھبراتا ہوں جب لوگ اٹھ کر میری طرف آتے ہیں ہمارے ہاں بزرگ شعراء اپنی سالگرہ مناتے ہیں صرف اسی خوشی میں کہ سال گزر گیا ہم نہیں گزرے نعمت سانگلوی صاحب کی برسی کا ٹن کر سب سے زیادہ خوش ان کے نزدیکی ہوئے لیکن انہیں بتا دیا گیا کہ یہ حقیقی برسی نہیں جیسے اسٹیج کے ایک اداکار نے مرنے کا سین ایسا کیا کہ ہال میں بیٹھے لوگ رونے لگے کسی نے کہا آپ کیوں رو رہے ہیں مرا تو نہیں ایکٹنگ کر رہا ہے تو ان میں سے ایک بولا اسی لیے تو رو رہے ہیں لولا بھی دنیا میں سب سے بڑے بیہودہ سی

آپ کے ہمسائے ہیں۔

اس سے پہلے اصغر چھپالوی صاحب نے اپنی زندگی میں اپنی برسی منوانے کا پروگرام بنایا تھا مگر وہ اپنی پہلی برسی تک زندہ رہے لہٰذا ان کی پہلی برسی نہ منائی جا سکی چھپالوی صاحب کے بارے میں نقادوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ انھوں نے شہرت چھپے پکڑنے سے حاصل کی حالانکہ انھوں نے یہ ایک کتاب لکھ کر حاصل کی کتاب کا نام تھا عورتوں پر حکومت کرنے کے طریقے مگر اسے چھپوا نہ سکے کیوں کہ بیوی نے انھیں یہ کتاب چھپوانے کی اجازت نہ دی بیوی کی وفات پر انھوں نے بیوی کی یاد میں قریبی مسجد کو ایک لاؤڈ اسپیکر کا عطیہ دیا تھا کہ مرحومہ کی یاد آتی رہے نعمت سانگلوی صاحب کی برسی سے جتنی شہرت اور عزت مل رہی ہے صاحب مرنے سے اتنی عزت اور شہرت ملتی ہے تو مرنا بھی بہتر ہے معاشرہ شاعروں کے مرنے کے بعد ان کی اتنی عزت اس لیے کرتا ہے کہ سب عزت کرانے کے لیے یہی طریقہ اختیار کریں کہتے ہیں جتنے ادیب شاعر اس سال مرے پہلے کبھی نہیں مرے واقعی جو ادیب شاعر اس سال مرے پہلے کبھی نہیں مرے لیکن ہم جانتے ہیں کہ مر جانے والوں کی برسی نہیں منائی جاتی برسی ان کی منائی جاتی ہے جنھوں نے زندہ رہنا ہو بہرحال سانگلوی صاحب کو دوسری برسی پہ ہماری طرف سے مبارکباد۔ ■■

پرویز یداللہ مہدی

یہ ہے بات میری جان

قصہ ایک جدید نظم کا...

بمبئی میں ملاوٹ کی دن دونی اور رات چوگنی ترقی نے انسان اور اشیا کو تو ملوث کیا ہی تھا اس نے یہاں آب و ہوا کو بھی نہیں بخشا، ان کو بھی آلودہ کرکے چھوڑا۔ اس وقت ہمیں برسوں پرانی ایک بات یاد آرہی ہے۔ اس وقت تک عروس البلاد بمبئی نے ہم پر اپنا حق زوجیت لاگو نہیں کیا تھا، لہٰذا ہم اپنے وطن مالوف حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں چین کی بنسی اور سکون کا ایک تاشہ بجایا کرتے تھے۔ اور جب ہر دو ساز بجاتے بجاتے بور ہوجاتے تو ادبی وشعری مجلسوں ومشاعروں میں بحیثیت سامع شریک ہوتے، بڑھ چڑھ کر داد دیتے، مصرع اٹھاتے کہ اس زمانے میں مصرعے اُٹھانا سامعین کے فرائض میں داخل ہوا کرتا تھا۔ اتفاق سے ان دنوں اردو ادب میں جدیدیت کی لہر نئی نئی اٹھی تھی۔ سورج کو چونچ میں لیے ہوئے مرغوں نے ادب میں نیا نیا داخلہ لیا تھا۔ اور داخلہ لیتے ہی سورج کو چونچ میں لیے ہوئے ان جدید مرغوں نے اگلے وقتوں کی روایتی شاعری کے مرغ قبلہ کے ٹھونگیں مارنی شروع کردی تھیں۔ اتفاق سے ہم جس مخصوص ادبی محفل کی روداد آپ کو سنا رہے ہیں اس میں ایک جدید شاعر نے اپنی ایک انتہائی جدید نظم سنائی جس کا عنوان تھا "ہوا حاملہ ہوگئی ہے"۔ عنوان سن کر دیگر سامعین کرام کے ساتھ ہم پر بھی سکتہ طاری ہوگیا۔ کیوں کہ ہماری معلومات کے مطابق صرف جانداروں ہی میں "حاملہ" ہونے کی سکت اور صلاحیت پائی جاتی ہے۔ لیکن شاعر موصوف نے بہ یک جنبش قلم بلکہ بہ یک جنبش زبان ہوا کو حاملہ کردیا تھا۔ جدید شاعروں سے چونکہ کچھ بھی بعید نہیں ہے اس لیے محفل پر چھایا ہوا سکتہ چند لمحوں میں خود بہ خود رفع ہوگیا اور اس کی جگہ ایک زبردست قہقہہ بلند ہوا۔ قہقہوں کے ساتھ شاعر موصوف پر چاروں طرف سے طنز ومزاح کے زبانی تیر بھی برسائے گئے۔ مثال کے طور پر ہماری بغل میں بیٹھے ہوئے ایک خرانٹ قسم کے سامع نے طنزیہ لہجے میں فرمایا نئی نسل کے شاعروں میں یہی تو خرابی ہے کہ سوچے، سمجھے، غور کیے بغیر جو منہ میں آیا بک دیتے ہیں! اسی لیے تو دانا لوگ کہتے ہیں کہ پہلے تولو، پیچھے بولو!

ایک اور معمر جہاندیدہ قسم کے بزرگ راست شاعر کی ذاتیات پر حملہ آور ہوئے۔ میاں صاحبزادے صورت شکل سے تو تم ماشاءاللہ بالغ دکھائی دیتے ہو مگر باتیں لاحول ولا قوۃ، نابالغوں کی سی کرتے ہو۔ ارے میاں، ہوا بھی کیا، پاشو خان کی بھینس، ابو میاں کی بکری یا منی بائی کی کتیا ہے جو اِدھر اُدھر بھٹک بھٹکا کر حاملہ ہوکے چلی آئی!!

قصہ ! قصر یہ کہ طرح طرح کے طعنوں سے بےچارے شاعر کی شاعری و شخصیت دونوں کو چھلنی کرکے ہُوٹ آؤٹ کر دیا گیا۔ لیکن افسوس آج برسوں بعد ہمیں اپنے رویئے پر شرمندگی اور ندامت کا احساس ہو رہا ہے۔ کیوں کہ ممبئی کی ملاوٹی ہوا میں سانس لینے کے بعد ہم پر یہ عقدہ پوری طرح کھل چکا ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے طفیل ہوا بھی شرطیہ حاملہ ہو سکتی ہے گویا شاعر موصوف نے ازراہِ تفنن اپنے زورِ سخن بلکہ زورِ قلم سے ہوا کو حاملہ کرنے کی کوشش ہرگز نہیں کی تھی، دراصل حاملہ ہوا سے ان کی مُراد تھی آلودہ ہوا یعنی شاعر دور اندیش نے بڑے ہی علامتی انداز میں ابہام کے سہارے فضائی آلودگی کی طرف نہ صرف ایک لطیف اشارہ کیا تھا بلکہ اس پر بھرپور طنز کیا تھا اپنی طرف سے ضرب کاری لگائی تھی۔ برسوں پہلے جو بات محض ایک اندیشہ تھی مستقبل کا ایک نامعلوم خوف تھا، وہ آج فضائی آلودگی کی صورت میں ہر بڑے اور صنعتی شہر کا مقدر بن چکی ہے۔ فضائی آلودگی کے تعلق سے اس سے بہتر اور موزوں عنوان تاحال دریافت نہیں ہو سکا اور نہ ہی آگے اس کی اُمید ہے۔

اگلے وقتوں کے مشہور شاعر پنڈت برج نارائن چکبست دہلوی نے زندگی اور موت کا انتہائی سائنٹفک تجزیہ دو مصرعوں میں کچھ اس طرح کیا تھا۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

چنانچہ ماضی بعید میں چونکہ ماحول ہر قسم کی فضائی آلودگی سے یکسر پاک و صاف ہوا کرتا تھا۔ اس لیے وقت آنے پر ہی زندگی کے ضروری عناصر کے ظہورِ ترتیب میں اٹکل پچّو کا ٹل کارفرما ہوتا اور موت کا ہاتھ ان اجزاء کو پریشان کرکے آدمی کو چین کی نیند سلا دیا کرتا۔ لیکن دورِ حاضر کی فضائی آلودگی، زندگی کے عناصر کی ظہورِ ترتیب کو وقت سے پہلے ہی بے ترتیب کرکے آدمی کے اعضائے رئیسہ و غریبہ کو پریشان کرکے اسے موت سے پہلے ہی مار دیتی ہے۔ گویا پہلے جو کام حضرت ملک الموت بلاشرکتِ غیرے تن تنہا انجام دیا کرتے تھے اس میں فضائی آلودگی، غیر محسوس طور پر ساجھے دار ہو گئی ہے۔ بلکہ بڑے شہروں میں صورتِ حال یہ ہے کہ فرشتۂ اجل جب بھی کسی کو لقمۂ اجل کرنے کی نیت سے پہنچتے ہیں اسے فضائی آلودگی کی مہربانی سے پہلے ہی نزع بہ دست مردہ کی حالت میں پاتے ہیں اور مرتے ہوئے کو مارتے ہوئے یقیناً انہیں بھی افسوس ہوتا ہوگا۔ چنانچہ پہلے تو وہ قریب المرگ شخص کی حالتِ زار پر کفِ افسوس ملتے ہوں گے پھر بڑے پیار سے متوفی کی روح کی انگلی تھامے اس جہانِ فانی کی طرف نکل جاتے ہوں گے جو ہر قسم کی دنیاوی کثافتوں، آلائشوں اور ملاوٹوں سے یکسر پاک ہے۔!!

ابھی کچھ روز پہلے کی بات ہے ہمارے پڑوس میں بڑا عجیب و غریب تماشا ہماری اپنی چشم گنہگار کے روبرو انجام ہوا۔ ہمارے قریب ترین پڑوسی طاہر بھائی ڈبہ باٹلی والا، ہماری اور ان کی کھولی کی مشترکہ راہداری میں اپنے بازو پر امام ضامن باندھے باچشمِ نم اس طرح اپنے اہلِ خانہ سے فرداً فرداً گلے مل رہے تھے جیسے تیسری جنگ عظیم میں حصہ لینے کے لیے رخصت ہو رہے ہوں۔ یہ دلخراش رخصتی منظر دیکھ کر ہم پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس سے پہلے کہ ہم کچھ کہتے طاہر بھائی ہم سے بغلگیر ہو کر رقت آمیز لہجے میں بولے کبھی اپن تم کو کچھ اُلٹا سیدھا بول دیا ہو، کوئی بھول چوک شنیک ہو گئی ہو تو معاف کر دینے کا کیا۔ سائیکو لوگ لوگ بولے تو وہ تمہارا اردو بھاشا کا شاعر بھائی بولیلا ہے نا ؎

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا ؎ آدمی بلبلہ ہے پانی کا

کوئی اور وقت ہوتا تو ہم یقیناً مذکورہ شعر میں پھڑپھڑاتی ہوئی پانی کی بلبل پر مفصل تبصرہ کر کے موصوف کی غلط فہمی دور کر کے انہیں سمجھاتے کہ طاہر بھائی اس شعر میں شاعر نے بلبل کا نہیں بلبلے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن موقع کی نزاکت چونکہ اس بات کی متقاضی نہیں تھی لہٰذا راست مطلب کی بات پر آگئے اور ان سے استفسار کیا۔ کیا بات ہے طاہر بھائی یہ اس طرح زرہ بکتر پہنے خدانخواستہ کہیں لام پر تو نہیں جا رہے ہیں آپ!

ٹھنڈی سانس بھر کر بولے "اس سے بھی زیادہ ڈینجر جگہ جا رہا ہے اپن۔ لام پہ تو پھر بھی آدمی کے بچنے کا تھوڑا بہت چانس ہوتا، پن اِدھر سالا آدمی لوگ کا بنٹا دھار نکی سمجھو۔"

ہم نے حیرت سے کہا۔ گویا آپ جان بوجھ کر موت کے منہ میں جا رہے ہیں؟ موصوف نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا، ہم نے بے بسی سے کہا "خیر جیسی آپ کی مرضی" ویسے کم سے کم اتنا تو بتاتے جائیے کہ موت کی جس وادی کی طرف آپ کوچ کر رہے ہیں اس کا نام کیا ہے؟

ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔

چھوٹا بھوپال۔

ہم نے گڑبڑا کر کہا۔ چھوٹا بھوپال۔ یہ تو میرے لیے ایک نیا انکشاف ہے۔ طاہر بھائی جہاں تک میری ناقص معلومات کا تعلق ہے۔ تا حال میں نے چھوٹا ناگپور بلکہ چھوٹا ونا پور کے بارے میں ضرور سنا ہے لیکن چھوٹا بھوپال آخر کس جگہ کس صوبے میں واقع ہے؟!

تحقیر آمیز لہجے میں بولے۔ تم ہر ہفتہ اخبار کے اندر اکھی بمبئی کے بارے میں لکھتا رہتا ہے اور تم کو سالا چھوٹا بھوپال کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم! ارے لیکھک بھائی یہ سالا چھوٹا بھوپال کدھر دور نہیں اپن کی بمبئی میں بسیلا ہے کیا؟

ہم نے غیر یقینی لہجے میں کہا بمبئی میں چھوٹا بھوپال بسا ہوا ہے۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں طاہر بھائی؟ منہ بنا کر بولے ارے بھائی ہماری بات کا بسواس کرو۔ ہم کوئی بے فضول بات نہیں بولتا۔ جب سے سالا بھوپال میں گیاس کا ٹریجڈی ہوا ہے، بمبئی کا ہم ٹیکا آدمی لوگ چمبور ایریا کو چھوٹا بھوپال کر کے بولنے لگا ہے۔ کائیکو بولے گا تو ادھر بی سالا بڑا بڑا پیٹرو کیمیکل کا ریفائنری۔ سرکاری انوشکتی بھنڈار اکھی جگہ کے اوپر پھیلا ہوا ہے۔ اور اس میں سے سالا دریم گیس نکلتا رہتا ہے۔ چوبیس کلاک اکھے چمبور ایریا میں گیاس کا باس مارتا رہتا ہے..!

چھوٹے بھوپال کی جغرافیائی نشاندہی اور اس کی وجہ تسمیہ کی مکمل تفصیل سننے کے بعد ہم نے متحیر لہجے میں کہا۔ تعجب ہے اتنا سب کچھ جاننے کے باوجود آپ اس زہریلے علاقہ کا قصد کر رہے ہیں۔ آخر وہ کونسی مجبوری ہے جو آپ کو خودکشی کے راستے پر لیے جا رہی ہے! آہ بھر کر بولے اس مجبوری کا نام ہے جورو کا بھائی۔ وہ کیا ہے اپن کا سالا ادھر میں رہتا ہے اور سالا چاہے جہنم میں رہتا ہو اس سے ملنے کو جانا ہی پڑتا ہے نہیں تو عورت سالا گھر کو جہنم بنا دیتی ہے۔ اچھا چلتا ہے پھر ملے گا اگر اوپر والا اپن کو واپس زندہ لایا تو!

طاہر بھائی ڈبہ باٹلی والا با حسرت و یاس یہاں سے رخصت ہو گئے لیکن ہماری آنکھیں ضرور کھل گئے اور جب ہم نے اپنی کھلی آنکھوں سے بمبئی کے مختلف مقامات کا جائزہ لیا تو عقدہ کھلا کہ ایک چمبور ہی پر کیا موقوف بھوپال کے زہریلی گیس کے اخراج والے سانحے کے بعد سے بمبئی میں بے شمار چھوٹے چھوٹے بھوپال ظہور میں آ گئے ہیں۔ پتہ نہیں ... سائنس اور

ٹکنالوجی کے نام پر کب تک یوں انسانی زندگیوں کے ساتھ کھلواڑ کرتے رہیں گے۔ دیش کی ترقی کی آڑ میں انسانی لاشوں کے ڈھیر پر اپنے سونے چاندی کے محل تعمیر کرتے رہیں گے !! ■■

"ارتکاز" سہ ماہی کا غزل نمبر

جناب حسن چشتی، جنرل سکریٹری، بزم اردو شکاگو، نے اطلاع دی ہے کہ سہ ماہی "ارتکاز" (کراچی)، سن ۱۹۹۶ء میں "غزل نمبر" شائع کر رہا ہے اس غزل نمبر میں پاکستان اور ہندوستان کے علاوہ دنیا بھر کے ان ممالک کے ممتاز اور نمائندہ شعراء کرام کی غزلیں شائع ہوں گی جہاں جہاں اردو بولی، پڑھی، لکھی اور سمجھی جاتی ہے۔ "ارتکاز" کا یہ غزل نمبر آزادی کے بعد سے موجودہ دور تک کی غزل کا جامع ترا انتخاب اور مستند ترین دستاویز ثابت ہوگا۔ یہ شمارہ کم و بیش ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہوگا اور آرٹ پیپر پر شعراء کرام کی تصاویر شائع ہوں گی۔ جناب حسن چشتی نے تمام شعراء کرام سے خواہش کی ہے کہ وہ اپنی دو مطبوعہ اور دو غیر مطبوعہ غزلیں پاسپورٹ سائز تصویر کے ساتھ مندرجہ ذیل پتوں میں سے کسی ایک پر روانہ فرمائیں:

جناب راغب شکیب

مدیر "ارتکاز" سہ ماہی، ایف ۲/۸۴۳ مارٹن کوارٹرز

جہانگیر روڈ، کراچی، پاکستان۔

یا

جناب حسن چشتی

7130 N. KEDVALE,

LINCOLNWOOD, ILLINOIS _ 60646 U. S. A.

یوسف امتیاز
ٹورانٹو
(کینیڈا)

اللہ کرے زورِ اونگھائی اور زیادہ

اونگھائی جانداروں کے لیے قدرت کا بڑا ہی خوب صورت تحفہ اور انعام ہے۔ قابلِ رحم ہیں وہ لوگ جو اس سندر نعمت سے محروم ہیں وہ جانتے ہیں کہ قدرت نے انھیں نہ جانے کس جنم کے پاپوں کی سزا دی ہے کہ انھیں نہ ستانا آتا ہے اور نہ اونگھنا۔ بعض تو اس نعمت سے دوسروں کے مالا مال ہونے پر رشک کرتے ہیں۔ اس نعمت سے محرومی ان کو بعض اوقات حاسد، چڑچڑا بور، اور ناقابلِ برداشت بنا دیتی ہے۔ وہ لوگ جو اونگھنے کی اس بے بہا دولت سے محروم ہیں انھیں یہ بھی گوارا نہیں ہوتا کہ دوسرے اس دولت سے مالا مال رہیں اور حاسدانہ انداز میں اونگھنے والے کو دھکا دے کر اٹھا بھی دیتے ہیں اور نہایت کھسیانہ ہنسی کے ساتھ معافی بھی مانگتے ہیں یا انتہائی دیدہ دلیری سے آنکھیں بھی لڑاتے ہیں۔

یہ صرف اونگھنے والے ہی جانتے ہیں کہ اونگھنا گہری نیند اور ستانے کے درمیان ایک خوشگوار وقفہ ہے جو کبھی ہلکے ہلکے خراٹوں میں تبدیل ہو جاتا ہے مگر یہ گہری نیند ہرگز نہیں ہے۔ پھر ستانے اونگھنے اور جھپکی لینے میں بھی فرق ہے۔ جھپکی لینا اونگھنا بالکل نہیں ہے۔ جھپکی تو وہ ہے جس میں سفر کرنے والے منزلِ مقصود سے آگے بھی نکل جاتے ہیں۔ آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو END STATION پر پایا۔ یہ انسان کا اونگھنا ہی تو ہے جو اس کی شدید تھکن اور گردش کو کچھ ہی منٹوں میں آبِ حیات پلا دیتا ہے۔ پھر سے نئی امنگ بخشتا ہے اور یہ محسوس ہونے لگتا ہے جیسے سات آٹھ گھنٹے کی نیند سے جاگ گئے۔

اونگھنا تہذیبی اعتبار سے تو بہت اچھی چیز ہے کہ اس سے وہ جولانی اور تازگی لوٹ آتی ہے جس کا آپ کو ہمیشہ انتظار رہتا ہے۔ نہ کسی کشتے کی ضرورت نہ معجون کی تلاش نسخہ بہت آسان ہے آنکھیں بند کر لیں اور دوسری دنیا میں پہنچ گئے۔ اونگھنا تو سیاسی اعتبار سے بہت ہی کامیاب ہتھیار ہے۔ ہر وہ بات جو سننا نہ چاہتے ہوں یا اس کا جواب نہ دینے میں ہی جان بچ سکتی ہے تو اونگھنے سے بہتر راہ فرار اور کیا ہے۔ کتنا سا اچھا بہانہ ہے جس کے ذریعہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی

R.No. 15822/68 | SHUGOOFA | Postal Regd. No. H/HD-6
Vol. 29 Copy : 12 | HYDERABAD | December 1996
Phone : 595716

یہ ایک خوش گوار علامت ہے۔ اٹلی، اسپین، پرتگال وغیرہ جیسے لاطینی زبان بولنے والے ممالک میں سہ پہر کا SIESTA کسی اجنبی چڑیا کا نام نہیں ہے۔ ایک زمانہ پہلے تین چار بجے اکثر کاروبار اور دوکانیں بند ہو جاتیں اور ایک دو گھنٹے سستانے کے بعد کاروبار شام میں دیر تک جاری رہتا۔ خدا بھلا کرے نارتھ امریکہ کا کہ یہاں اس کا رواج ہی نہیں ہے۔ صنعتی اور سائنسی ترقیات نے زندگی کے ایک اہم حصے کو ترقی اور کارگزاری کی دہلیز پر قربان کر دیا ہے۔ یہاں سستانے والے کو جگا دینا ایک بڑا کارنامہ اور فرض ہے۔ ساری سائنسی ترقی اور کارگزاری کے باوجود لوگ یہ نہیں جانتے کہ اونگھائی بھی ایک طرح توانائی کی کفالت ENERGY CONSERVATION ہے جو جسم کو ایک نئی حیات بخشتی ہے۔

کسی اہم میٹنگ، سمینار، کانفرنس میں اعلیٰ افسروں اور مالکوں کے سامنے شرمندگی سے محفوظ رکھتی ہے۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے نیند کا دوران کم ہوتا جاتا ہے کچھ لمحوں کی اونگھائی کے بعد بے خوابی کے کئی گھنٹوں کی لعنت کا کوئی شکوہ نہیں رہتا۔ جس طرح ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اسی طرح اونگھائی بھی نئے زاویوں کی دریافت کا ایک ذریعہ ہے۔ پکاسو اور کاسلز کے جیتے جاگتے کارنامے اونگھائی کی نادر مثال ہیں۔ چارلس ڈاروِن کے بہت سے نظریات کوچ پر بیٹھے بیٹھے یا لیٹے لیٹے غوطہ لگانے کے رہین منت ہیں۔ دنیا کے سادھو سنت، ملّا، مولوی سب ہی تو آنکھیں بند رکھتے ہیں مگر دیکھتے سب کچھ ہیں۔ ان کے کان ان کی آنکھوں کا کام دیتے ہیں اور دماغ روشن رہتا ہے۔ یہ لوگ اگر آنکھ بند کر کے رام رام جپنا پرایا مال اپنا کی رٹ چپکے چپکے نہ لگاتے اور فرمان جاری نہ کرتے ہوتے تو دنیا کے آدھے سے زیادہ مذہبی تفرقات اور فسادات کبھی کے ختم ہو چکے ہوتے۔ ملّاؤں کی بند آنکھیں اور تسبیح پر تیزی سے چلتی ہوئی انگلیاں مرغن غذاؤں کی آرزو میں مصروف رہتی ہیں بند آنکھوں کے ذریعہ وہ اپنے لیے ایک سے زیادہ بیویوں کا انتخاب بھی کرتے ہیں اور فسادی فتوے دینے میں جھکتے نہیں۔

یہی اونگھائی شاعروں کو محبوب کی سیاہ زلفوں کے سائے میں سکون بخشتی ہے سنہرے خوابوں کی سیر انھیں محبوب کی خوابگاہوں میں گزرنے کا ویزا دیتی ہے۔ آنکھیں بند کیں۔ گردن جھک کر سینے کی طرف گئی تو سمجھیے دلی مراد بر آئی۔ جس رنگ اور جس انداز میں چاہا دیکھ لیا۔ سارے حقوق یا کاپی رائٹس بنام عاشق محفوظ ہو گئے۔

اونگھنا ایک صحت مند علامت ہے۔ یہ کوئی افیون کی گولی نہیں ہے اور نہ گانجہ کا سُرور کہ دنیا دمافیہا کی خبر ہی نہیں رہتی جس کو مے سے نشاط غرض نہیں ہے اور یک گونہ بے خودی کی تلاش ہے اس لیے اونگھنے سے بہتر سستا اور کامیاب نسخہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ جیسے انسان سو برس سو کر اٹھا ہو پھر محبوب کے سینے پر سر رکھ کر سارے خلاؤں اور آسمانوں کی سیر ہو جاتی ہے۔ موجودہ خلائی جہاز بھی ایسی سیر کروانے سے محروم ہیں۔ اس کے لیے فرصت کے دو دن کی ضرورت ہے اور نہ چار کی۔ ذرا غور کیجیے اگر آپ پچاس سال یا اس سے اوپر کے ہو گئے۔ دل یادوں کی بھول بھلیوں میں گھومنا پھرنا چاہتا ہے۔ نوجوان جوڑوں کے مسکراتے چہرے، ان کی دبی دبی ہنسی، نظروں کی شوخیاں، چھیڑ چھاڑ

کا نظارہ آپ کو بھی یادوں کے شہر میں واپس لوٹا دیتا ہے۔ سہ پہر کے آخری حصے میں اندھیرے سے پہلے کھڑکیوں اور دروازوں کے پردے گرادیئے۔ ہاضمہ کی چورن یا الکا سیلٹزر ALKASELTZER کا ایک گلاس پیا تقویت معدہ کا معقول انتظام ہوگیا اور کروٹ پر دراز ہو گئے اور پھر ایک طرفہ راستے ONE WAY STREET پر گامزن ہوگئے۔ آپ کی بند آنکھوں کے سامنے فلم کی ریل REEL جیسے تیز بھاگنے لگتی ہے۔ محبوب کا روٹھنا اس کے گلے شکوے، شکایتیں اور نئی نئی حکایتیں۔ دروازہ بند کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ یہ سب خلوتوں کے نظارے ہیں۔

سلیم مقصود
(پٹنہ)

ماڈرن دیو جانس کلبی

دیو جانس کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ اسے کتوں سے سخت محبت تھی اور اس نے ایک کتے کی ہم جلیسی میں ایک لکڑی کے صندوق میں ساری عمر گزار دی۔ اس کا خیال تھا کہ پچھلے جنم میں اس کا موجودہ دوست کتا دراصل ایک بہت ہی خلیق و محسن دوست تھا۔ دیو جانس کے نام کے ساتھ "کلبی" ایسے جڑ گیا جیسے اکثر لوگوں کے نام کے ساتھ قبیلے کا نام بھی جڑا ہوتا ہے۔ دیو جانس کلبی کا عالمی ریکارڈ خلیج کے ایک ماڈرن دیو جانس نے توڑ دیا۔ ان کے گھر میں قسم قسم کے کتے ہیں۔ ہر کتے کی نسل کا شجرہ ان کے ہاں آسانی سے مل جاتا ہے۔ لیلیٰ کی گلی کے کتے سے لے کر شہزادہ دلیر کے کتے تک اس زمانے میں جب کہ کوئی نہ چیز غیر مخلوط اور خالص نہیں ملتی۔ اس شیخ کے ہاں کتوں کی نسل خالص مل جاتی ہے۔ ان کے ہاں سب خاندانی کتے ہیں۔ چین کے بادشاہ لنگ کے کتوں کی نسل کے کتے تک ان کے ہاں مل جاتے ہیں۔ انھیں اپنی نسل (اولاد) سے زیادہ کتوں کی نسل کا خیال رہتا ہے۔ ایک آسٹریلین کتیا جب بالغ ہو گئی تو ان کی راتوں کی نیند اڑ گئی۔ ہر وقت اس فکر میں ڈوبے رہتے کہ اس لاثانی کتیا کی نسل کو معدوم ہونے سے کیسے بچایا جائے۔ بہت دوڑ دھوپ کی تو پتہ چلا کہ اس نسل کا آخری چشم و چراغ آسٹریلیا میں ایسے ہی حالات سے دوچار ہے۔ شیخ نے (۵، ۷) ہزار ڈالر خرچ کر کے ان دونوں کے وصل کا موقع فراہم کروایا۔ تب ان کی مایوس آنکھوں میں روشنی عود کرائی۔ اگر ہم پنر جنم کے قائل ہوتے تو اس شیخ کا تعلق ضرور دیو جانس کلبی کے دوست سے جوڑ دیتے۔ انسانی نسل کے دشمنوں کو اس شیخ سے سبق سیکھنا چاہیے۔ انسانی نسل کو ختم کرنے کے لیے فیملی پلاننگ سے لے کر قسم قسم کے مہلک ہتھیار انسان نے بنا رکھے ہیں اور جانوروں کی نسل کی افزائش کے لیے کروڑہا روپے خرچ کیے جا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے فی زمانہ انسانوں کی نہیں صرف جانوروں کی ضرورت رہ گئی ہے اور ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ دنیا میں کتے بلیاں تو ہوں گے مگر انسان خال خال نظر آئیں گے یعنی سو دو سو کتوں میں ایک انسان دکھائی دے گا۔ اور جانوروں میں انسانوں کے لیے لڑائیاں ہوں گی۔ اردو ادب میں پطرس محض کتوں سے دشمنی کے سبب جانے جاتے ہیں اور شیخ کو کتوں کے محسن کے طور پہ یاد رکھا جائے گا۔ شیخ نے کتوں کو انسانوں سے بھی اشرف کر دیا کیوں کہ سینکڑوں انسان

ان کتوں کی خدمت پر مامور ہیں اور انسانوں کا معیار زندگی (living standard) شیخ صاحب نے کتوں سے بدتر کر رکھا ہے۔ کوئی کتا غربت کی حد (poverty line) سے نیچے زندگی نہیں گزارتا۔ جس طرح مقامی باشندے غیر مقامی باشندوں کو حقارت سے دیکھتے ہیں شیخ کے کتے بھی اسی طرح بڑی بڑی موٹر کاروں میں گھومنے جاتے وقت شہر کے آوارہ کتوں کو حقارت سے دیکھتے ہیں بلکہ بعض انگریزی کتے تو دیکھتے بھی نہیں۔ البتہ شیخ کے اہل خانہ اور کتوں میں اس قدر بھائی چارگی پائی جاتی ہے کہ سارے من و تو کے جھگڑے اور تشخص کے بکھیڑے گہری وفاداری نے ختم کر دیئے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ جاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ دونوں میں اشرف المخلوقات کون ہے۔ شیخ کتوں پر بے تحاشہ دولت خرچ کرتے ہیں۔ جب کوئی انھیں منع کرنا چاہتا ہے تو کہتے ہیں کہ انھیں کے لیے تو کما رہا ہوں۔ ان پر خرچ نہیں کروں گا تو کس پر کروں گا۔ شیخ کے کتوں کو انسانوں میں رہتے رہتے نہیں انسانیت آئی کہ نہیں۔ البتہ شیخ کے مزاج میں کٹکھنا پن ضرور آگیا ہے۔ اور اب تو نوبت اس مصرعے تک آ پہنچی ہے :

زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

ہمارے ایک فارسی داں دوست نے بتلایا کہ اکبر کے زمانے میں کتوں کی بہت بہتات تھی یہ کوئی عجیب بات نہیں کیوں کہ ہر بادشاہ کے زمانے میں اکثر ایسا ہوا کرتا تھا لیکن تحقیق کی بات یہ ہے کہ (ہمارے دوست کی بموجب) فارسی کے مشہور شاعر عرفی نے اکبر بادشاہ کے حکم پر کتوں کی بہتات پر قطعہ تاریخ بھی کہا تھا۔ شاید ہمارے دوست نے فارسی سے ہماری عدم واقفیت سے فائدہ اٹھا کر یہ بات ہانک دی ہو۔ لیکن انگریزی ادب میں یہ بات مشہور ہے کہ شہزادہ ویلز نے انگریزی شاعر پوپ سے اپنے کتے کی شان میں ایک دو مصرعے کہنے کی فرمائش کی تھی۔ شیخ کو اس بات کا دکھ ہے کہ ان کے بیٹے تو اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں لیکن ان کے کتے علم کے زیور سے آراستہ نہیں۔ اس سال آبادی کی کمی کا نوبل انعام مصر کو دیا گیا ہے۔ کیوں کہ مصر نے دو طرح اپنی آبادی کم کی ہے۔ ایک تو اسقاط حمل کی گولی سے دوسرے بندوق کی گولی سے۔ شیخ موصوف انعام کے معاملے میں مصر کے حریف تو نہیں البتہ آبادی سگاں میں اضافے کے لیے نوبل انعام کے مستحق ضرور ہیں کیونکہ انھوں نے کتوں کی افزائش نسل میں کوئی نسلی تعصب کو روا نہیں رکھا۔ اس ذکر پر ہمیں بھی اپنا ماضی یاد آگیا۔ ہم نے بھی اعلیٰ ذات کی ایک سفید کتیا پال رکھی تھی جو ایک دن ایک آوارہ کتے کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس کتیا کا نام ہم نے بجلی رکھا تھا۔ بہت ہی لحیم شحیم سرتاپا سفید فام بلکہ گل فام، پیشانی پر بالوں کی آوارہ لٹیں، چال جیسے کڑی کمان کا تیر" ہم تو اسے پیار سے "نچ" کہا کرتے تھے۔ پتہ نہیں اس کے عاشق کتے اسے کس پیار بھرے نام سے پکارا کرتے تھے۔ کبھی کبھی بجلی، سفید فام میموں کی طرح سماجی پابندیوں کی زنجیروں کو توڑ کر رات بھر گھر سے غائب رہتی اور صبح جب وہ گھر لوٹ آتی تو بے اختیار فراق کا یہ شعر ہماری زبان پر آجاتا :

یہ اڑی اڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو
تری صبح کہہ رہی ہے تری شام کا فسانہ

بے چاری لاولد ہو کر ایک حادثے میں ماری گئی اور ہمیں اسے یہ دعا دینے کی نوبت ہی نہیں آئی کہ دودھوں نہاؤ

اور یوتوں پھلو۔ جب تک یہ بقید حیات رہی اسے کوئی کتا پسند ہی نہیں آیا۔ اس نے الزبتھ ٹیلر سے زیادہ معاشقے کیے لیکن اسی کی طرح لاولد رہی۔ اس میں اور کلیوپیٹرا میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ مرے ہوؤں کی برائی نہیں کرنا چاہیے سو ہم اس تذکرہ کو یہیں ختم کرتے ہیں۔

انگریز ہندوستانیوں کو "گندہ کتا" کہا کرتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد یہ ذمہ داری انھوں نے بھٹو کو سونپ دی تھی۔ چنانچہ وہ ہندوستانیوں کو اسی نام سے پکارا کرتے تھے۔ حالانکہ زندگی بھر یہ پٹہ ان کے گلے میں پڑا رہا اور اسی پٹے نے ان کی جان لی۔ اب یہ پٹہ ان کی صاحب زادی کے ورثے میں آیا ہے بلکہ گلے میں پڑا ہے۔ تاریخ ہند کا یہ عجیب واقعہ ہے کہ انگریز ہندوستانیوں کو غصے میں کتا کہتے تھے۔ لیکن کلائیو اپنے وفادار ہندوستانی دوست میر جعفر کو غصے اور محبت دونوں حالتوں میں "گدھا" کہا کرتا تھا چنانچہ میر جعفر کا نام ہی کلائیو کا گدھا پڑ گیا تھا لیکن انگریزوں نے میر جعفر کو کتے کی طرح دھتکار کر یہ ثابت کر دیا کہ ع

"وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے"

ہم نے کہیں پڑھا تھا کہ جب بادشاہ اتفاقاً انصاف پرور ہوتا تو رعایا اسے پاگل سمجھتی تھی۔ اور وزرا اسے نااہل سمجھ کر اس کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔ ایسے بادشاہوں کے زمانے میں جنگل کا ڈسپلن بھی الٹ پلٹ ہو جاتا تھا۔ جس کے نتیجے میں شیر اور بکری مجبوراً ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے۔ ایسا ہی نظام ہم نے ایک ملک میں اپنی عینک والی آنکھوں سے دیکھا۔ وہاں موٹے موٹے چوہے بلی کی زیر نگرانی ایک گھر سے دوسرے گھر خیر سگالی دورے پر نکل جاتے۔ بلی کوئی سیاسی یا غیر سیاسی قسم کا اعتراض نہیں کرتی۔ بلکہ بعض اوقات شریر چوہے بلی سے ٹام اینڈ جیری کی سی شرارت بھی کرتے لیکن کیا مجال بلی کوئی غیر قانونی حرکت کر بیٹھے۔ اسی طرح کتے بھی بلی کو دیکھ کر نظریں جھپکا لیتے۔ بلی خشمگیں نگاہوں سے دیکھتی گویا کہہ رہی ہو "ادھر کیسے آ گئے؟" ہم کتے دم ہلا کر ممیا کر کہتے: "خالہ جان کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہو گئے تھے۔" بلی غرا کر کہتی "آئندہ کبھی نہ آنا۔"

غزل

عبدالحفیظ لقب عمران
(ایلچپور)

آکے نمبر ڈکی میں مجھے شکل دکھا دی جائے
میری تقدیر بھی اے دوست جگا دی جائے

کچھ بھی آج ترے در سے عطا ہو ساقی
مے نہیں ہے تو مجھے چائے پلا دی جائے

اس تکلف کی نہیں چنداں ضرورت حضرت
جب غزل کہہ لی ہے تم نے تو سنا دی جائے

بھول ہی جائیں ہمیشہ کے لیے اترانا
دھونس اغیار پہ اب ایسی جما دی جائے

مجھ کو کرنا ہی پڑا ترکِ تعلق تم سے
دل نہیں کہتا کہ صحرا میں صدا دی جائے

ان کے حصّے میں بھی آجائے ذرا لطفِ حیات
شیخ صاحب کو بھی تھوڑی سی پلا دی جائے

مفلسوں کی تو ہر اک بات اچھالے دنیا
مال داروں کی ہر اک بات چھپا دی جائے

ساٹھ کے پیٹھے میں اب آپ نے رکھا ہے قدم
حسن والوں کو نہ اب دل میں جگہ دی جائے

عقل کہتی ہے کہ ٹھکرا دوں میں آفر اس کی
دل مگر کہتا ہے پھر دادِ وفا دی جائے

زندہ دل دنیا کے ہو جائیں گے واقف تم سے
ایک تخلیق شگوفہ میں چھپا دی جائے

کوئی مہوش مرے سینے سے چرا لے گیا دل
جا کے تھانے میں رپٹ ایسی لکھا دی جائے

بعد مدت کے مرے ہاتھ لگے ہو صاحب
آج میرے لیے ہر قید اٹھا دی جائے

ہو گیا ہے تری الفت میں لقب دیوانہ
اس کی دیوار پہ یہ بات لکھا دی جائے

غزل

عبدالحفیظ لقب عمران
(ایلچ پور)

حقِ وفا کا ادا کرے کوئی
نام، تیرا جپا کرے کوئی

وعدہ چھٹی کا یاد آئے گا
مجھ کو تم سے جدا کرے کوئی

مجھ سے وہ پیار کرتا ہے ایسے
جیسے قرضہ ادا کرے کوئی

آگ لگ جائے ایسی الفت کو
پانی کب تک بجھا کرے کوئی

دال بھاجی کو ہے کوئی محتاج
مرغ کا ناشتہ کرے کوئی

ہائے یہ بے لگام مہنگائی
مر نہ جائے تو کیا کرے کوئی

چل رہا ہوگا کوئی فلم ضرور
بے سبب ہی ہنسا کرے کوئی

میرے جذبات زخمی ہوتے ہیں
آپ سے نہ ملا کرے کوئی

اس کا ہو جاؤں میں سدا کے لیے
میرے حق میں دعا کرے کوئی

بے سبب کیوں مجھے ستاتے ہو
ان سے جا کر گلہ کرے کوئی

میری خواہش بھی ہے سدا مجھ کو
ساتھ اپنے رکھا کرے کوئی

اس طرح پیاس تو بجھے گی نہیں
آنسو کب تک پیا کرے کوئی

مجھ کو تکلیف دیتا ہے لیکن
دشمنوں کا بھلا کرے کوئی

ہائے کیوں کر سہے بچارہ لقب
دس برس سے جفا کرے کوئی

انیس سلطانہ
(بھوپال)

کیا کھویا؟ کیا پایا؟

اڑائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے کچھ گل نے

آج بیگم انجمن آرا اپنا محاسبہ کرنے بیٹھی تھیں۔ کیا کھویا، کیا پایا۔ پتہ چلا جو کچھ پایا تھا وہ تو مدخانے میں پڑا ہے لیکن جو کھویا ہے اس کی کہانیاں، دوست دشمن سب کی زبان پر ہیں۔

عرصہ سے وہ خود بیمار تھیں۔ زندگی سے تو خیر پیمانا یارانہ تھا، لیکن صحت کو ان سے سدا بیر۔ بری بھلی گزر ہو ہی رہی تھی کہ ان کے مجازی خدا (جو خیر سے ریٹائر بھی ہو چکے ہیں) پڑھنے پڑھانے نیز لکھنے لکھانے کو شغل بے کاراں سمجھتے ہیں) سخت بیمار ہو گئے۔ ادھر خود انجمن آرا کی ٹیڑھی ترچھی چالیں (کہ ٹانگ کے فریکچر کے بعد بھی کچھ بیچ رہا تھا —) اور ادھر جناب کے صاحب، صاحب فراش لکھیں تو کیا اور یکسوئی ہو تو کیسے۔ اپنے کو بہلاتی رہیں۔ پہلے بھی کونسا اچھا لکھتی تھیں، اب تو انداز میں کچھا ور اکھڑا پن آ گیا ہے جملے بنانے سنوارنے کی کوشش کرتیں کہ ان کی توجہ ادھر سے ہٹالی جاتی —! بھلا کس حکیم نے کہا ہے کہ وہ ضرور لکھیں؟ آج کل پڑھتا ہی کون ہے؟ لو بھلا "اردو" اردو کرتے ان کی ساری عمر گزر گئی، بچوں کو جب تک وہ بچے تھے (واقعی) انھوں نے اردو لکھنا بھی سکھایا اور پڑھنا بھی لیکن اب وہ سب یا تو ساچار سنتے یا ٹیپ ریکارڈ ٹیک۔ جبر دل سے کسی کو سروکار نہ تھا!

ریل کا سفر، ان کی زندگی میں ہمیشہ سے اہم رہا ہے۔ اس بار بھی یہی کچھ ہوا۔ شوہر نامدار کو بغرض علاج بمبئی لے جانا طے پایا کہ یہاں شہر بھوپال میں مرض کی صحیح تشخیص ہی ممکن نہ تھی۔ وہ اکیلی جان کہیں بھی چلی جاتیں لیکن یہاں مریض کو لے جانا تھا جو خود ان کے بس میں نہ تھا — چنانچہ بادست دگرے، دست بدست دگرے مریض کو پہلی منزل تک پہنچایا گیا، وھیل چیر کا سہارا لے کر ریلوے اسٹیشن تک لے جایا گیا....
مریض سفر نا آشنا، ہم سفر فرط تجسس سے بھرپور:

وہ اکیلی ہی چلی تھیں جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ایک سے دو بھلے، دو سے چار بھلے ـــــ اور ان چار کو آٹھ میں بدلتے کتنی دیر لگتی ہے۔ ایک انار سو بیمار تو سب نے سنا ہوگا ـــــ ایک مریض دس تیماردار نئی کہاوت وجود میں آئی ـــــ میاں کی ہر دل عزیزی کا یہ عالم کہ سارا خاندان اسٹیشن پر سی آف کرنے والوں میں شامل تھا جس میں چیف بردار نعل نے اپنی ذمہ داری سنبھالی۔ ٹرین آئی ...... آتے آتے آئی ـــــ صرف چار گھنٹے دیر سے آئی ـــــ سو یہ بھی غنیمت کہ آئی کہ ابھی تک اسے کئی منزلوں پر رکنا تھا، رک رک کر چلنا تھا ـــــ اور چلتے چلتے جانا تھا ـــــ!!

انجمن آرا کو اپنے اور شوہر نامدار کے علاوہ دو نمبر دو حضرات کے بارے میں بخوبی ہم سفر ہونے کی جانکاری تھی ـــــ لیکن یہاں تھی کرکٹ کی پوری ٹیم ـــــ جس میں کیپٹن، اوپننگ بلے باز، اسپنر سبھی شامل تھے ـــــ کوچ کے طور پر ایک عدد تجربہ کار بزرگ وار مع ان کی اہلیہ محترمہ بھی ہم سفر تھے۔ کیپلی جسے جہاں چاہے فٹ کر دے ـــ جب چاہے جس سے بیٹنگ کرا لے ـــــ

انجمن آرا کو نہ یہ معلوم تھا کہ کون سے کلاس کا سفر ہے نہ یہ کہ کتنے لوگ اور کون کون ساتھ جا رہے ہیں۔ وہ جن جن کو سی آف کرنے والوں میں گمان کرتی رہیں وہ سبھی ان کے ہم سفر تھے۔ ان کا سامان جو دو چھوٹے چھوٹے سوٹ کیسوں پر مشتمل تھا، بار کیا جا چکا تھا ـــــ لیکن کہاں اس کی خبر نہ تھی۔ منتظمین نے کچھ یوں کیا کہ چار سیٹیں کسی ایک ڈبے میں، دو کسی اور میں اور تین کسی اور میں مہیا کی گئیں۔ پھر یہ یقین کرنے کے بعد کہ سامان سبھی مختصر ہے ایک ایک مسافر نے اس کی ذمہ داری قبول کی انجمن آرا کے حصّہ میں کھانے کا سامان آیا کہ وہ تو خاتونِ خانہ ہیں اور ان کا پورنا ہونے کا فخر کچھ انھیں کو زیب دیتا تھا۔

ایک ایک کر کے بقول راوی سامان انھیں کے ڈبے میں چڑھایا گیا۔ سکنڈ کلاس میں ریزرویشن تو نام کو ہوتا ہے۔ ان کی ریزرو سیٹوں پر کچھ دوسرے مسافروں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ وھیل چیئر سے اتار کر ان کے مریض کو بٹھانا بذاتِ خود مسئلہ تھا۔ جب تک اس مسئلہ کو حل کیا جائے۔ نہ جانے کس پل میں ان کا پورا سامان بھوپال اسٹیشن پر ہی اتار لیا گیا۔ جس کی انھیں کانوں کان خبر تب ہوئی جب بیمار کے لیے تکیہ کی جستجو کا مرحلہ آیا تو پتہ چلا :

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

مشکل یہ بھی تھی کہ نازک مزاج مریض کو وہ اس سانحہ کی خبر بھی نہ دے سکتی تھیں۔ دل تھا کہ بیٹھا جائے تھا اور دنیا پر سے اعتماد اٹھتا جا رہا تھا۔ نہ اس وقت انھیں یہ یاد تھا کہ سوٹ کیس میں کتنے کپڑے تھے، نہ یہ یاد آ رہا تھا کہ کتنے پیسے تھے۔ یاد تھا تو صرف اتنا کہ مریض کو اس سے بے خبر کیسے رکھا جائے ـــ؟؟ اس ہنر سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ پولس یا ہمارے نام نہاد لیڈر ـــــ کہ سب کچھ جانتے اور اظہارِ ناواقفیت میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اور یا پھر شاعر کہ تجاہلِ عارفانہ سے کام لے کر حسنِ شعری کی داد دیتے ہیں (شعری بھوپالی کی نہیں)

خدا خدا کر کے یہ سفر ختم ہوا۔ شام کو ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ تھا۔ اتنے عرصے کا میڈیکل ریکارڈ انھیں

سوٹ کیسوں میں بند تھا جو اٹھائی گیروں نے ان کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اٹھا لیے تھے۔ خدا گواہ کہ چور چکار کے معنی تو ان کی سمجھ میں ہمیشہ سے آئے تھے۔ کبھی کبھی چھوٹی موٹی چوریاں بھی کی تھیں۔ چوری کی کیریاں توڑ کر جب کھائی تھیں۔ اس مزہ کو آج تک نہیں بھولیں ـــــ لیکن اٹھائی گیروں کے کاروبار سے پہلی بار واقفیت ہوئی۔ لمبے سفر کی تکان نہانے ہی سے اترتی ـــــ وہ تو خیر ہوئی کہ مریض کی نہانے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ ورنہ بدلنے کے لیے کپڑے کہاں سے لاتیں۔ ادھر یارانِ نکتہ داں نے بہلا پھسلا کر بمبئی اسپتال لے گئے ادھر ان کی جان ناتوان حیرو فکر نا گہاں کہ مریض کا حال اب صرف مریض کی زبانی ہی سنا جا سکتا تھا۔ ساری میڈیکل رپورٹیں نذرِ سفر ہو چکی تھیں۔ انھیں جتنی دواؤں کے نام یاد تھے۔ جس جس کیفیت سے آشنا تھیں وہ لکھ کر ساتھ کر دیں کہ شاید کام آئیں۔ مریض بھی وہ کہ عرصے سے اٹھنا بیٹھنا ترک ہو چکا تھا۔

اب اس کیفیت کو درویشانہ تو خیر کیا کہتیں، البتہ بے سروسامانی کی اس فضا میں بھی انھوں نے چین کی سانس اس وقت لی جب مریض ڈاکٹروں کی پرسش جا و بے جا سے نپٹنے کے بعد اسپتال میں بغرض علاج داخل ہوا۔ ڈرتے جھجکتے اپنے آپ سے پشیمان، خستہ و خراب حالت سے دوچار جب وہ بھی اپنے بیمار کے پاس پہنچیں تو اس توقع پر کہ سامان کی گم شدگی کی بازپرس تو ضرور ہو گی ـــــ لیکن اس وقت تک مریض نے بھی حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ دسمبر کی کڑکڑاتی سردی میں بھوپال سے روانگی کے وقت کافی تعداد میں گرم کپڑے اور بستر رکھے گئے تھے۔ علاوہ بستر اور کھانے کے تمام سامان کھویا جا چکا تھا اور اب کہ اسپتال میں نہ کپڑے کی فکر تھی اور نہ گرم کپڑوں کی کہ موسم بمبئی کا معتدل ہی تھا سو ان کا مزاج بھی معتدل ہو چکا تھا۔ ایک عدد قیمتی مسکراہٹ کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ اتنا پوچھنے کا حق تو میاں کو بہر حال تھا کہ آخر سامان گم کیسے ہوا ـــــ وہ کیا بتاتیں ـــــ کیسے بتاتیں ـــــ؟

اپنے بمبئی پہنچنے کی اطلاع بذریعہ ٹیلی فون بھوپال دی جا چکی تھی اور سامان کی گم شدگی بھی ـــــ جہاں جہاں شہر نا پرساں (بمبئی) تک آ رہیا، ان کی بے سروسامانی کے چرچے تھے۔ بدلنے کو کپڑے نہ سہی قسمیں تو وہ ہرگز نہ کھاتیں اور بھوپینے کا بھی یارانہ تھا۔ ناچار مہانگر کے بازار سے کم سے کم دو عدد سوٹ خرید سکے کہ اچھا لباس بھی شخصیت کی تعمیر میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ مریض کی طرف سے بے فکری تھی۔ اسپتال سے مہیا کیے گئے کپڑوں نے انھیں فکرِ فردا سے آزاد کر دیا۔ اب کوئی سامان ہی نہ رہا تو حفاظت کا خیال کیسے آتا؟

صبح اٹھ کر جو غور کرتی ہیں تو صابن ندارد، منجن ناپید، اور سب سے بڑھ کر میاں کے لیے اہتمام سے بنائے گئے مدراسی پان، باریک باریک کتری ہوئی چھالیا۔ ہیہات سب غائب ـــــ ارے ہاں وہ تو سوٹ کیس میں ہی تھا۔ میاں کا یہ حال کہ کھانے کے بغیر ایک دو وقت رہ لیں گے لیکن پان کے بغیر جینا بھی کوئی جینا ہے۔ تازہ تازہ پان، نفاست سے لگایا ہوا چونا اور کتھا، اپنے حساب کا خوب تر دکھائی دینے والے پان اور مشغل چھالیہ کے ٹکڑے ـــــ ساہ پان بھی اپنی ایک شخصیت رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی پان کی گلوری، اسے قیمہ بیڑا منہ میں رکھ کر داے جگر مرادآبادی کو یاد کرتے:

دل کو سکون روح کو آرام آ گیا۔

لیکن یہاں پان کی گلوری جیسی کوئی چیز کہاں ؟ چھالیہ کے دانوں کے بجائے ڈلی کو سروتے سے یا اس جیسی کسی چیز سے توڑا گیا تھا۔ سروتوں کا آج کی تہذیب میں گزر کہاں ــــ ؟ سلیقہ تو چھوڑا گیا ہوتیں، انھیں بدشکل بھی نہ کہیے چھالیہ کے بے ڈھنگ ٹکڑے۔ وہی پان من حیث المجموع مہیا کر کے پیش خدمت کیے گئے۔ جو پان کی شکل تو رکھتے تھے لیکن نہ وہ مزہ نہ ادا ــــ جسامت میں دیو قد ــــ سختی میں پارۂ سنگ

اسپتال کے شب و روز مریض پر تو گراں گزرتے ہی ہیں، تیمارداروں کے لیے گراں تر ہو جاتے ہیں۔ مریض کے پاس ایک سے زیادہ ملاقاتی ٹھہر نہ سکتے تھے اور جتنی بار کوئی آتا تین روپے کا پاس بنوایا جاتا جو ریل کے ٹکٹ کی طرح ایک سے زیادہ بار استعمال نہ ہو سکتا۔ ملاقاتیوں میں ان کی کرکٹ کی ٹیم دن میں کم سے کم ایک بار ضرور درشن دیتی۔

انجمن آرا چوبیس گھنٹے مریض کے سر پر سوار رہتیں، نہ کوئی کام تھا نہ کوئی ہم سخن۔ ادھر ایوب میاں کے صبر کا پیمانہ چھلک رہا تھا۔ مرض اپنی جگہ . . . . مریض اپنی جگہ . . . . ڈاکٹر انھیں ان کے شوق دستر خوان آرائی سے روک نہ سکتے تھے۔ بہت دن دال بھات پر گزارا کیے۔ اب انھوں نے بھی ہاتھ پاؤں نکالنا شروع کر دیے۔ مرغ و ماہی کی متلاشی طبیعت مکدر ہو رہی تھی۔ آتے جاتے ان کے لیے حسب دل خواہ کھانے کا بندوبست کیا جاتا اگر چہ یہ نہ ہوتا تو روز واپسی کی ضد کرنے لگتے۔

بھوپال میں جس مرض کی دوائیں استعمال کی جاتی رہی تھیں سرے سے وہ مرض ہی موصوف کو لاحق نہ تھا۔ کچھ ملنے والے یوں بھی کہتے ہیں کہ اتنی دوائیں کھائی گئیں کہ پرانا مرض ختم ہو کر نئے مرض نے جنم لیا۔ وہاں ڈاکٹر پیروں کے درد کے لیے دوائیں بدل بدل کر دیتے رہے۔ یہاں ورزش نے مریض کے رنگ ڈھنگ بدل دیے۔ لیکن ابھی کھڑے نہ ہو سکتے تھے۔ آپریشن ہونا طے تھا۔ ہر چند کہ اس میں وقت تھا اور یہاں وقت کی ہی کمی تھی چنانچہ پھر ملیں گے اگر خدا لایا کہہ کر پروانۂ واپسی حاصل کیا گیا۔

دو ہفتہ کے اس عرصہ میں اتنا سامان خریدا جا چکا تھا کہ اس کے لیے پھر سوٹ کیس خریدے گئے اور قافلہ دو دو چار چار کی ٹولی میں روانہ ہوا۔ آخر میں بچ رہنے والی کھیپ میں وہی چار عدد روانہ ہوئے جن کے بغیر سفر ہی نہ ہو سکتا تھا۔

گھر آ کر ایسا لگا کہ سال دو سال سے بچھڑے ہوں۔ وہ شہر میں سرکاری نوکر دس بجے تک واپس پہنچ چکی تھیں، اس لیے ڈیوٹی پر پہنچنے میں ہرج نہ تھا۔

ناچار لباس فاخرہ کی تلاش ہوئی۔ اب کے معاملہ ذرا ٹیڑھا تھا۔ ساڑیاں جو کھو چکی تھیں وہ تو انھیں ہم نشینوں کی یاد تھیں لیکن ملتی جلتی پرینٹ بلاؤز اور پیٹی کوٹ ان کے ذہن سے نکل چکے تھے۔ نتیجہ میں فی الوقت جتنی ساڑیاں نکالیں پیٹی کوٹ کی عدم موجودگی میں انھیں رد کر دیا۔ ایک عدد خوش بخت ساڑی نے کہ ہم رنگ بلاؤز بھی رکھتی تھی اور پیٹی کوٹ بھی اس آڑے وقت میں ساتھ دیا۔

انجمن آرا سوچنے لگیں، آخر ساڑی کے ساتھ بلاؤز کا رنگ میچ کرنے کی کیا ضرورت ہے . . . . ؟ قدرت نے کہاں ہر کسی کو میچ کر کے بھیجا ہے۔ ابا ساڑھے چھ فٹ لمبے تھے تو والدہ محترمہ صرف چار فٹ کی

حق دار قرار پائیں۔ والد صاحب شب فراق سے رنگ مانگ کر لائے تھے تو والدہ صاحبہ مید سے کی لوئی . . . یا دونوں گورے چٹے، حسین اور خوش شکل ہوئے تو اولاد ایسی ناکارہ کہ بس . . . . سوچنے کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اس لیے اپنی لاتعداد سوچوں پر انھوں نے پہرہ بٹھا دیا اور جا پہنچیں نوکری بجا لانے ــــــ کرچی دستور ہے ـــ واپسی پر شہر کے ہر جان کار حلقہ سے ان کے سامان کے کھو جانے پر اظہار افسوس کیا گیا۔ صبح سے شام تک پیلی خون کھر دکھر ملاتے رہے کہ بھئی بڑا افسوس ہوا۔ کسی نے سامان کھو جانے پر اظہار افسوس کیا اور کسی نے ان کے حواس کھو جانے پر تنبیہ کی۔ انھوں نے لاکھ کہا کہ ان کے بہ خیریت لوٹ آنے پر خوشی کا اظہار کیا جائے ــــــ جشن برپا ہو، محفل میلاد ہو . . . . . . لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ البتہ ایوب میاں نے چین کی سانس لی اور لہک لہک کر پڑھتے بھی رہے اور انجمن آرا کا حوصلہ بھی بڑھاتے رہے :

لوٹ کے بدھو گھر کو آئے

اور کبھی کبھی یوں بھی گہر افشانی کرتے :

کاہے نہ لینی کھبر یا ہمار ــــــ

نامور شاعر

مصطفیٰ علی بیگ

کے

کلام کا پر بہار مجموعہ

آئی ایم ساری

قیمت : ایک سو روپیہ

نامور شاعر

طالب خوندمیری

کا مجموعہ کلام

سخن کے پردے میں

قیمت :

ایک سو روپے

شجاع الدین عاطف (آسٹریلیا)

غزلیں

ہند میں اردو کا مستقبل و حال اچھا ہے
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

جیب کے چاقو سے جو چھائی ہے منہ پر ہیبت
وہ سمجھتا ہے مرے بٹوے کا حال اچھا ہے

ہو عزیز آپ کو گر اپنی گرفتاری دوست
خوب صورت سی گھنی زلفوں کا جال اچھا ہے

اور جاپان سے لے آئے اگر جوڑی ٹیپا
ٹیری کاٹن سے مرا دیسی رومال اچھا ہے

دیکھ کر مجھ کو ڈرامے میں کسی نے یہ کہا
اس اداکار سے بندر کا کمال اچھا ہے

حسن کی بھیڑ سی محفل میں لگی تھی عاطف
ہر حسینہ نے کہا اس کا جمال اچھا ہے

○

یہ زلفیں مری سب تو دکھلانے کے لیے ہیں
کچھ بال خضابوں سے چھپانے کے لیے ہیں

جو ساتھ لیے پھرتے ہیں اس شہر میں حوریں
وہ لوگ مرے دل کو جلانے کے لیے ہیں

یہ چھوڑ کے جاتے ہیں بُرے وقتوں میں مجھ کو
احباب مرے جوتے کھلانے کے لیے ہیں

ہر حال میں ہنس بول کے جی لیتے ہیں انساں
ہم لوگ تو ہنسنے یا ہنسانے کے لیے ہیں

معصوم سی باتوں پہ نہ جاؤ کبھی عاطف
یہ ظاہرا انداز پھنسانے کے لیے ہیں

○

ابتدا میں مرا عشق تو ہٹ گیا
بعد میں ہائے قسمت بُرا پٹ گیا

میری بیٹنگ گوسکر سے بہتر گئی
خواب میں کھیلنے جب میں کرکٹ گیا

چور بھی تھے وہاں اور پولس بھی تھی
کون جانے لیے میری پاکٹ گیا

اک حسینہ بنی مرکزِ ہر نظر
اس کا شوہر جو لانے کو بسکٹ گیا

یہ نتیجہ نظر کی مزائیل کا ہے
ان کے قدموں میں دل بن کے راکٹ گیا

اس کے کتوں نے پہچان کیسے لیا
جب کہ وہ پہنے پولس کی جاکٹ گیا

میں نے جس گھوڑے کو آزمایا میاں
ریس میں وہ ہمیشہ اپوزٹ گیا

سید طالب حسین زیدی
(حیدرآباد)

چہ درست است....؟

دُنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو دوستوں کے بغیر گزارہ کر رہا ہو۔ یہ نہ ہوں تو زندگی پھیکی، بے رنگ اور بے کیف ہو جائے۔ دوستوں سے زندگی میں رنگوں کی بہار آجاتی ہے خوشیوں کی مہک اور زندہ دلی کی چہک مزاج کی بے رنگی کو ختم کر کے "زندگی زندہ دلی کا نام ہے" سے عبارت ہو جاتی ہے۔

ہم شکرگزار ہیں کہ اس نعمت سے محروم نہیں ہیں، تھکے ہوئے ذہنوں اور بوجھل لمحوں کو تھوڑی سی آسودگی دینے کے لیے آج گلدستۂ احباب سے اپنے دو ایک دوستوں کی بوقلمونیوں کا تذکرہ کرتے ہیں، ان سے ملئے اور ملاقات کے مزے لیجئے۔

یار طرحدار فریدالحسن کمالی۔ خوش مزاج و خوش اطوار ناخوشی سے بیزار حُسن کے دیوانے رومانس کے متوالے۔ ایک بنک کی منیجری کرتے کرتے جی جو اکتایا تو خلیج جانے کی دُھن سمائی، گئے اور ایک عرب ملک کی ایئرلائینس میں فینانس ڈپارٹمنٹ کے کھاتوں کو سنبھال لیا۔ ایئرلائینس کے گیسٹ ہاؤس میں قیام تھا اور تنہا ہی رہتے تھے۔ اسی زمانے میں اتفاق سے وزٹ پر ہمارا بھی وہاں جانا ہوا، قیام فرید ہی کے ساتھ رہا۔ دفتر سے واپسی کے بعد شام کے اوقات میں اکثر ہم کو اپنی کار میں لے کر سیر کو نکل جاتے اور گھوم گھام کر رات دیر گئے واپسی ہوتی۔ ایک دن سمندر کے کنارے کنارے گزرتے ہوئے ہماری نظر ان حبشیوں پر پڑی جو وہاں اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ پوچھا، یہ سالے غالباً صومالیہ کے باشندے ہیں۔ فرید، جو ڈرائیونگ کرتے ہوئے بھی اطراف واکناف کے ہر گوشے کو اپنی نظروں میں رکھنے کے ماہر ہیں، بولے چھوڑو یار اُن صومالیوں کو ذرا اُدھر دیکھو "سمولیوں" کو۔ ہم اُن کی نگاہ کا تعاقب کرتے ہوئے جب موصوف کے مرکز نگاہ پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں چند مغربی خواتین اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ "شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عُریاں ہوگئیں" کا مرقع بنی ہوئی نہا کر سمندر سے برآمد ہو رہی تھیں.....

شادی کے ایک دو سال بعد ہی بیوی کا انتقال ہوگیا، آپس میں بے حد پیار تھا دائمی جدائی کے صدمے سے بے حال ہوگئے اپنی حالت اس قدر بُری بنالی کہ دیکھا نہ جاتا تھا صبر و ضبط کی تلقین کی جاتی تو اور ہاتھوں سے نکل جاتے سنبھالے نہ سنبھلتے۔

دل سے دیوانے کو مت چھیڑ یہ زنجیر نہ کھینچ

اٹواٹی کھٹواٹی لے کر پڑ گئے احباب سے ملنا جلنا، ہنسنا بولنا اور نظاروں کی گھاتیں جو روزمرہ کا معمول تھا سب کچھ یکلخت ترک ہو گیا، جو بیسیوں گھنٹے صورت پر محرم طاری رہنے لگا۔ دوستوں کو بڑی فکر ہوئی کہ یار ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے ایکدن ان کی تسلی اور دل دہی کی خاطر ہم اور دیگر احباب ملنے گئے۔ ملے۔ مگر جونہی ان کے زخموں پر پھایا رکھا روتے روتے ہچکی بندھ ہو گئی پچھاڑیں کھانے لگے، کچھ رو لیتے درمیان میں مرحومہ کے اوصافِ حمیدہ بیان کرتے پھر ایک ہچکی لیتے اور رونا شروع کر دیتے اس صورتِ حال جو سابقہ پڑا تو ہمارے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے، ایک ہچکی کا سہارا لے کر بولے، اب زندہ رہنا بے کار ہے تمہاری بھابی مرحومہ نے جو داغ دیا ہے وہ ہمارے مرنے ہی پر مندمل ہوگا اور پھر روتے، ہچکی لیتے۔ کسی نے بانڈوں کو تھاما کسی نے کمر پر ہاتھ رکھ کر سہارا دیا لیکن کسی طور قابو میں نہیں آ رہے تھے۔ دریں اثنائے "قدر گریدوہم بر سر افسانہ رود" موصوف کے والد بزرگوار تشریف لے آئے اور گمبھیر لہجے میں ہم سے فرمایا، میاں! آپ لوگ ان کو سمجھائیں کھانا پینا ترک کر دینے سے اور اپنے آپ پر دیوانگی طاری کر لینے سے کیا گئے ہوئے لوگ واپس آ سکتے ہیں؟ جو ہوا سو ہوا صبر کریں، اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے اس نے چاہا تو نعم البدل مل جائے گا۔ یہ فرما کر وہ تو ادھر رخصت ہوئے اور ادھر یہ پچھاڑ کھا کر پلنگ پر گرے اور پھر شروع ہو گئے دنیا بڑی بے وفا ہے ابھی تو کفن بھی میلا نہ ہوا ہوگا کہ نعم البدل کی سازشیں شروع ہو گئیں۔ میں کیوں کر صبر کر لوں کیوں کر اس جانِ وفا کو بھولوں؟ کس طرح اپنے دل ناکام کو سمجھاؤں؟.... ہچکی.... ہر دو ہچکیوں کے درمیان دنیا کو اور اس کی ستم شعاریوں کو کوستے، آخر نڈھال ہو کر آنکھیں موندلیں، سیدھے سیدھے دراز ہو گئے ہم نے موقع غنیمت جان کر نکل جانا بہتر سمجھا اور اٹھ کر چلے آئے۔ اس کے بعد جب بھی ملاقات ہوتی ہماری کوشش یہ ہوتی کہ وہ بھابی مرحومہ کی یاد اور غم کو بھول کر دنیا کی مصروفیتوں میں اپنا دل لگائیں اور دوسری شادی کر کے نئے سرے سے اپنی زندگی کی شروعات کریں، مگر جب بھی ایسا مشورہ دیا جاتا فوراً ہتھے سے اکھڑ جاتے اور سخت ناراض ہو کر تنبیہ کرتے کہ خبردار! جو آئندہ کبھی نئی زندگی کی بات چھیڑی...... بخار ابھی اترا نہیں تھا.... احباب جب کہہ کہہ کر تھک گئے اور نیکی برباد گناہ لازم کی مثل صادق آنے لگی تو سب نے طے کر لیا کہ مریض کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور کوئی کچھ نہ بولے دوسری شادی کا نام بھی لینا بھول جائیں۔ اور چپ سادھ لی گئی۔

اس حال میں چار چھ مہینے اور گزرے آہستہ آہستہ ان کے کاروبار معمول پر آنے لگے آفس کا جانا، دوستوں سے بھی ملنا جلنا، ہنسی مذاق اور سیر و تفریح میں بھی حصہ لینے لگے۔ اپنی طرف سے دوران ملاقات و گفتگو چھیڑ چھیڑ کر شادیوں کا ذکر ضرور نکالتے کہیں سے دعوت آتی تو اشتیاق سے شریک ہوتے اور خصوصاً ان شادیوں کا ذکر ضرور کرتے جو دوسری کر چکے تھے یا کرنے والے تھے۔ ہم کو محسوس ہونے لگا کہ اب صبر کی گارنٹی ختم ہو رہی ہے اور اکسپائیری ڈیٹ (EXPIRY DATE) دبے قدموں قریب آنے لگی ہے لیکن ہم ان کی سب سنتے پر اپنی نہ بولتے، رومانس بھی عود کر آ گیا تھا راہ گزرتے تو نظریں دھنک رنگ لباسوں کا پہلے ہی کی طرح پیچھا کرنے لگیں اور پھر رنگوں کے ساتھ ساتھ رنگ بکھیرتے والوں پر بھی سرگوشیوں میں رائے زنی ہونے لگی۔ ہماری توجہ مبذول کرنے کی خاطر پھیر پھیر کر شادی کا ذکر درمیان میں لاتے اور کچھ

تلاش کر کے حاصل کرتا ہوں اور پچھلے سات آٹھ سال سے پابندی سے پڑھتا ہوں۔ اپنی خاص طرز کا یہ رسالہ پڑھکر آپکی محنت اور لگن کی تعریف نہ کرنا کفر ہوگا۔ دُعا کرتا ہوں کہ اس کو اللہ اور ترقی دے اور آپ کو حوصلہ عطا کرے کہ اسے خوب سے خوب تر کے سفر میں منزل سے ہمکنار کرے۔ یوں تو اس کے طنز و مزاح کے مضامین دلچسپ ہوتے ہیں اور تھکے ہوئے ذہنوں کو آسودگی ملتی ہے مگر ادھر چند شماروں سے اس میں جناب طالب حسین زیدی کو بھی اس کی محفل میں آپ نے شریک کیا ہے جن کے مضامین پڑھ کر بے حد لطف آتا ہے اس مرتبہ چار مینار سے نیاپل کا سفر پچاس سال پہلے کا آنکھوں دیکھا حال ہے ان کا مخصوص اندازِ الفاظ کے استعمال کی شوکت اور طنز سے بھرپور تیکھاپن دلوں کو چھو لیتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ منجھے ہوئے قلم کی نوک سے گل افشانیاں ہو رہی ہیں اور پھول جھڑ رہے ہیں۔ ہر مضمون بڑا ہی جاندار ہوتا ہے قرآن کے ایک واقعہ سے استنا کر کے "چہ درست است" نے جو گل کھلایا ہے اور جو نتیجہ نکالا ہے وہ صد در صد لائق تعریف ہے میں تو گھبرا رہا تھا کہ اس نازک مسئلہ کو چھیڑ کر کہیں کوئی گستاخی سرزد نہ ہو جائے بوٹر کا بیان۔ موتری اور کرشنا کا کیڑ واقعی اس دور میں نادیا جان کا وہی کارنامہ ہے جوش پیدا کرتا تھا غالب کے اشعار پر تضمین خوب ہے ڈاکٹر سکینہ کا بیان بخیالات کے پیچھے ذہن رسا کی داد دینے کو جی چاہتا ہے اسلیے خط لکھ کر آپکو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپکی کاوش اور سعی تلاش ہمیشہ اچھے لکھنے والوں کو پیش کرتی رہتی ہے۔ اردو کی ناگفتہ بہ حالت کے زمانہ میں جو اپنے ہی ہاتھوں ہو رہی ہے ایسے اہل قلم کو پیش کر کے ہم کو مایوس ہونے سے بچا رہے ہیں۔ ہماری زبان یتیم نہیں ہے اسمیں اب بھی دم خم اور زور ہے اور اسکو سنبھالنے والے موجود ہیں۔

تنزیل الرحمٰن
اکبر باغ حیدرآباد

اِدارِیہ

بزرگ شاعر جناب اسمٰعیل ظریف کے اِنتقال کے بعد بیشتر تعزیتی قراردادوں اور انفرادی بیانات کے ذریعہ مرحوم کے مجموعۂ کلام کی عدم اشاعت پر تعلق خاطر کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ یقیناً بڑے دکھ کی بات ہے کہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ پر محیط تخلیقی سفر کا شاعر اپنے دیوان کی اشاعت سے محروم رہا۔ اس ضمن میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیرِ اہتمام ۱۹۶۸ء میں مطبوعات کی اشاعت کے کام کا آغاز ہوا تھا بے شمار کتابیں شائع ہوئیں۔ لیکن کتابوں کی نکاسی ہمیشہ مسئلہ بنی رہی۔ چنانچہ بعد میں مکمل طور پر خرچ برداشت کرنے کی بجائے جزوی مالی امداد دینے کا فیصلہ ہوا۔ اب یہ صورتِ حال ہے کہ کتابوں کی اشاعت اور نکاسی میں شخصی طور پر خود مصنف یا اس کے چاہنے والے دلچسپی لیں تو کتاب کی اشاعت کے ساتھ اس کی نکاسی کے مراحل بھی آسان ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ ظریف صاحب کے کلام کی اشاعت کی طرف توجہ کی جائے گی — زیرِ نظر شمارہ کے ذریعہ ہم نے جناب اسمٰعیل ظریف کی شخصیت اور فن کے چند پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ ہم ظریف صاحب کے ارکان خاندان اور ڈاکٹر عقیل ہاشمی اور جہاندار افسر صاحب کے قلمی تعاون کے ممنون ہیں جن کی مدد کے بغیر خصوصی گوشہ کی اشاعت ممکن نہ تھی۔

▫ بڑی تاخیر کے بعد محترمہ فاطمہ عالم علی خاں کے ذریعہ یہ افسوس ناک اطلاع ملی کہ نامور طنز و مزاح نگار جناب وجاہت علی سندیلوی کا گزشتہ مہینے لکھنؤ میں انتقال ہو گیا۔ موصوف کئی کتابوں کے مصنف تھے اردو تحریکات سے بھی ان کا تعلق تھا۔ طنز و مزاح کے علاوہ بچوں کیلئے بھی انہوں نے کتابیں لکھیں شگوفہ سے انھیں خاص قلبی لگاؤ تھا۔ اپنا ہر مضمون وہ شگوفہ ہی اشاعت کے لیے بھیجنا ضروری سمجھتے تھے۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کی سالانہ تقریبات میں بھی وہ شریک ہو چکے تھے۔ وجیہہ و شکیل دلنواز شخصیت کے مالک وجاہت صاحب اردو کے فروغ اور ترویج سے بھی خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ اترپردیش اردو اکیڈیمی سے بھی وہ منسلک تھے ان کے انتقال سے ایک منفرد طنز و مزاح نگار، اردو کے سپاہی اور خلیق و ہمدرد انسان اور شگوفہ کے مستقل قلمی معاون سے ہم محروم ہو گئے۔ دعا ہے کہ اللہ انھیں جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ■

البتہ اتنا ہے کہ نشاندہی ضرور کریں گے کہ یہاں آپ سے زیر و زبر میں سہو ہو رہا ہے۔ جب اس کو تو تو میں میں نے ذرا طول کھینچا تو بولے آپ یوں نہیں مانیں گے حق بات کی قبولیت کا مادہ جو نہیں ہے آپ میں ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ ابھی چل کر اس کا فیصلہ اہل زبان سے کروا لیتے ہیں تاکہ آپ کو اپنی اوقات معلوم ہو جائے۔ اہل زبان، وہ یہاں کہاں؟ فرمایا! شہر میں ایرانی ہوٹلوں اور ان کے ایرانی مالکوں کی کمی نہیں ہے۔ وہ سب اہل زبان ہی تو ہیں۔ چلیے ہم تو ابھی میں معلوم ہو جائے گا کہ صحیح کون ہے۔ اس نزدیک کی کوڑی لانے پر ہم عش عش کر کے رہ گئے۔ اور محض تفریح کی خاطر ساتھ ہو لیے، قریب ہی کے ایک ایرانی ہوٹل میں ہم کو کشاں کشاں لے کر پہنچے اور سیدھے کاؤنٹر کا رخ کیا، جہاں ایک سرخ و سپید رنگت کا کھڑے ناک نقشے والا تنومند ادھیڑ عمر ایرانی جس کا "کلے پر کلّہ" چڑھا ہوا تھا گولک میں ہاتھ ڈالے ریزگاری سے شغل کرتا ہوا بیٹھا تھا۔ پہنچتے ہی ٹھیٹ ایرانی لہجے میں اس کی طرف سلام پھینکا اور ساتھ ہی سوال جڑ دیا۔ آقائی! از روئے قواعدِ پارسی چہ درست است "بگیر OR بگیر" ایرانی اس درمیانی "آر" پر پہلے تو چکرا کر ان کی طرف دیکھنے لگا پھر مسکرایا بولا، "صاب" امارا ہوٹل میں ہر چیز تازہ ہے چائے بھی تازہ دم ملے گا" اس جواب سے کھسیانے ہو کر تلملا گئے اور اسی تلملاہٹ کے عالم میں کاؤنٹر پر اپنی اسکوٹر کی چابیاں پٹخ کر بولے، جہنم رسید تازہ دم۔ آئی ام آسکنگ یو۔ (AM ASKING YOU) چہ درست است بگیر آر بگیر، بہایت لاتعلقی سے ایرانی کا جواب تھا۔ صاب، شاید کہ شما شعر شیریں می گوئید، افسوس کہ من شعر نمی دانم۔ سرتاپا "موئے آتش دیدہ ہو کر" بولے، چلیے کسی دوسرے کے پاس چلتے ہیں یہاں تو عالم بالا میں سخت فتور معلوم ہوتا ہے۔ جب پلٹے تو پیچھے سے ایرانی سیٹھ کی آواز آئی "آقائی" بگیر یور (YOUR) وہیکل کیز...... اب چکرانے کی باری مولانا کی تھی۔ چکرائے اور جھپٹ کر چابیاں اس کے ہاتھ سے لیں، ہمارا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے باہر نکل آئے، ہم نے اس قضیے سے پیچھا چھڑانے کے لیے کہا، حضرت! چھوڑیے اس قضیے کو کہاں اپنے ساتھ ہم کو بھی اس مخمصے میں الجھا رکھا ہے۔

تم ہی پیچھے رہی اس بات کا جھگڑا کیا ہے

ایک دن صبح صبح ہی نازل ہو گئے اور کرسی پر اپنے آپ کو ٹکانے سے پہلے ہی فرمانے لگے اماں، یارو! ایک پتے کی بات سنو، یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ ہم شعر و شاعری کے ہاتھوں تنگ۔ ہیں، مجھ کو تو بعض شعرائے ہند و فارس کا تعلق قومِ لوطؑ کے بچے کچھے افراد سے معلوم ہوتا ہے، کیوں۔؟ ان کے کلام میں بھی وہی بو باس نسلاً بعدِ نسل منتقل ہوتے ہوئے وراثت میں زبانی جمع خرچ کی حد تک ہی سہی ان کو بھی ملی ہے اور...... ہم درمیان میں بولے مگر جناب عالی اس خطے کو تو خدا نے اپنے حکم سے خوبصورت، حسین فرشتوں کے ہاتھوں تباہ و برباد کر کے اس کا تختہ ایسا پلٹ دیا تھا کہ اس مغضوب اور لعنتی قوم کا ایک فرد بھی باقی نہیں رہا۔ تو پھر...... ہمارے اس اعتراض پر سخت ناراض ہو کر بولے میاں! بڑی بری عادت ہے تمہاری ــــــ جی وہ تو ہے مگر کونسی ــــ؟ ہم نے پوچھا، یہی کہ پوری بات سنتے نہیں اور بیچ میں اڑنگا لگا دیتے ہو، بندۂ خدا ذرا عقل کو کام میں لاؤ کیا یوں نہیں ہوا ہوگا کہ جس وقت ان فرشتوں نے حضرت لوطؑ کو اپنا ہم راز بنا کر اور پٹی پڑھا کر رات کے رات اپنے گھر والوں کے ساتھ (بیوی کے بغیر) اس مقام سے نکل جانے پر آمادہ و تیار کر کے صبح ہوتے ہوتے اس خطے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور وہ ناہنجار قوم اس عذابِ عظیم کا ایسا شکار ہوئی کہ ایک متنفس بھی باقی نہ بچا، مگر، کیا یہ بات ممکنات میں سے نہیں ہو سکتی کہ اس قہر کے وقوع ہونے سے پہلے کچھ لوگ بغرض

تجارت، یا سیر و سیاحت اُس مقام سے نکل گئے ہوں، اور قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ایک شاخ ایران گئی اور دوسری ہندوستان آئی ہوگی، اور جب ان کو اپنے ملک اور وطن و اہلِ وطن کے حشر کا حال معلوم ہوا تو واپس لوٹنا بے سُود سمجھ کر اپنے اپنے گھر والوں اور دوستوں کو رو دھو کر جہاں تھے وہیں رہ پڑے ہوں اس طرح یہ بات ممکن ہوجاتی ہے کہ ہمارے بعض شاعروں کا تعلق ان ہی پسماندہ افراد کے سلسلے سے ہے، نتیجہ تو موصوف نے بڑے پتے کا نکالا تھا مگر اس میں سے ایک لطیفے نے بھی اس طرح اپنا سر نکالا جیسے چوہا بِل کے باہر آنے سے پہلے نکالتا ہے۔ ہم نے پھر اڑنگا لگایا مگر حضرت! ایسے بے مثال اور نادر الوقوع پتھر کے زمانے کے تاریخی واقعہ کے لیے ثبوت بھی تو درکار ہوتا ہے اپنی اس گرانمایہ تحقیق کو ثابت کرنے کے لیے وہ آپ کہاں سے لائیں گے؟...... ثبوت؟ ہم کوئی بھی دعویٰ آپ کی طرح بلا ثبوت اور دلیل کے کرتے ہی نہیں ـــــ مثلاً یہ کہ ان شاعروں کے محبوب ہی کو لو جو صرف نوخیز لڑکے ہوا کرتے ہیں۔ اپنے شعر میں اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے جو صرف محبوبیت اور چاہت ہی کے لیے خلق ہوئے ہیں اور یہ بدعتِ سیئہ سوائے ان دونوں الّولی جوّلی بھنوروں کے کسی اور زبان کی شاعری میں نہیں ملے گی۔ ہندی ہی کو لو ہندی شاعری کا باوا آدم نرالا ہے یہاں گنگا اُلٹی بہتی ہے جس کو عاشق ہونا چاہیے وہ معشوق ہوتا ہے اور معشوق، عاشق ـــــ اُدھر ایران میں حضرت حافظ خدا کے حسن ایک نوخیز لڑکے کے گال کے صرف ایک تل کی خاطر اس کو سمرقند و بخارا کی ریاستیں بخشش میں دے دیتے ہیں[1]، تیمور نے پوچھا حضرت! یہ کیا غضب فرماتے ہو جو سلطنت ہم نے تلوار چلا کر اپنی جان بازیوں اور جان فشانیوں سے سروں کو کٹا کر قائم کی تھی اُس کو آپ نے پلک جھپکنے میں ایک تل یا مسّے کے عوض بخش دی۔ فرمایا، اسی فیاضی کی عادت نے تو ہم کو کنگال کر رکھا ہے....

اور اِدھر ہندوستان میں حافظ شیراز کے "کاؤنٹر پارٹ" میر تقی میر ایک عطار کے لونڈے پر ریجھ کر اپنی بے نام فرضی بیماری کی خاطر اُس سے روز، روز یونانی دواؤں کی پڑیا خریدتے اور نالی میں بہا دیتے ہیں[2] اور یوں جو تھوڑی بہت فتوحات آصف الدولہ کے دربار سے ہوا کرتی تھیں اس کو اپنے ہی ہاتھوں گنوا کر عزت سادات کے جانے کا رونا روتے رہتے ہیں۔

ایسا اٹل اور ٹھوس ثبوت پیش کر کے موصوف نے بڑے فخر و مباہات سے پوچھا کیوں کیسی رہی....؟ کچھ پلے پڑا.....؟ اب آ گئے ہوش ٹھکانے.....؟......

ایسے ہیں ہمارے وہ زندہ دل اور من موجی دوست جن کے وجود نے ہماری زندگی میں رنگ بکھیر رکھے ہیں۔

اور خدایا[3]! ہم اگر ایسے بے مثال دوستوں کی رفاقت سے محروم رہے ہوتے تو ہماری خوش فعلیوں اور زیست کے مزدلا کے گراف میں کس قدر گراوٹ واقع ہوجاتی۔؟..........

---

[1] اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ ما را + بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

[2] میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب + اُسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

[3] اپنے اللہ میاں کو "پھسلانے" کا یہ والہانہ اور دل گداز سلیقہ ہم نے پہلے پہل چچا غالب سے اور پھر پوری شرح و بسط کے ساتھ کرنل محمد خاں سے سیکھا۔

□□

حامد لطیف حامد
(ممبئی)

آئیے فلم دیکھیں

"خیریت تو ہے؟ یہ آج صبح سویرے کیسے آن دھمکے آپ؟" ہم نے میر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔
"تمھیں دھمکانے کے لیے" میر بولے۔
"بھلا وہ کیوں؟"
"وہ اس لیے کہ اگر آج بھی تم میرے ساتھ تھیٹر میں فلم گویا کہ خود بخود دیکھنے نہیں چلے تو ......
"تو کیا ہوگا؟"
"تو یہ ہوگا کہ میں تمھیں گویا کہ خود بخود مار بیٹھوں گا۔"
"یعنی کہ آپ مجھے مار کر بیٹھ جائیں گے۔ کرسی یا صوفے پر، یا پھر فرش پر آلتی پالتی مار کر گوتم بدھ کی طرح" ہم نے" ہم نے ان کو چھیڑا۔
"مار بیٹھنا محاورہ ہے بے وقوف" میر چڑ کر بولے۔
"یہ صبح سویرے مار پیٹ کیوں اور کس کی ہو رہی ہے؟" بیگم نے آتے ہوئے پوچھا۔
"ہماری، اور کس کی" ہم نے مسکرا کر کہا "اور وہ بھی بدستِ دوست"!
"آپ نے ضرور کوئی ایسی ویسی بات کی ہوگی" بیگم بولیں۔
"آپ گویا کہ خود بخود بالکل ٹھیک کہتی ہیں بھابی" میر منہ بنا کر بولے۔
"اچھا اب غصہ تھوک دیجیے، میں ناشتہ لے کر آتی ہوں۔"
"غصہ یہاں قالین پر نہیں، باتھ روم میں جا کر تھوکیے" ہم نے میر کو مزید چھیڑا۔
"دیکھو مجھے بلاوجہ تنگ نہ کرو۔ میں گھر سے گویا کہ خود بخود صرف ایک کپ کافی پی کر آرہا ہوں" میر تنگ کر بولے۔
"آئندہ کافی پینے سے پہلے "اللہ شافی، اللہ کافی" کہہ لیا کریں تو کافی پینے کے کافی دیر بعد تک نہ بھوک لگے گی اور نہ ہی غصہ آئے گا" ہم نے کہا۔ جائیے، غصہ اور پان دونوں تھوک آئیے۔"
بیگم ناشتے کی ٹرے لے کر آتے ہوئے بولیں "یہ آپ کافی دیر سے کافی کافی کی رٹ کیوں لگائے ہوئے ہیں؟ میں کافی دیر سے سن رہی ہوں۔"

"اس کی وجہ جان کر آپ کافی خوش ہوں گی"۔ ہم نے کہا۔ میر باتھ روم سے آتے ہوئے بولے۔ "بھابی میں گزشتہ کئی روز سے گویا کہ خود بخود کافی، کافی پی چکا ہوں۔ آج کافی بالکل نہیں پیوں گا۔ ہاں ناشتے کے بعد ایک کپ چائے کافی ہوگی"۔

"چائے، چائے ہی رہے گی، کافی کیسے ہو سکتی ہے" ہم نے میر کی پسلی میں انگلی چبھوتے ہوئے کہا بیگم بولیں۔ اب بس بھی کیجیے، کافی کا ذکر کافی سے زیادہ ہو چکا۔ ناشتہ کیجیے۔ پراٹھا اور لیجیے بھائی صاحب"۔

"جی نہیں بھابی" میر بولے۔ بس ایک پراٹھا ہی کافی .... اس سے پہلے کہ میر اپنا جملہ پورا کرتے، اچانک ایک "پھو" کی آواز آئی، اور ہمارے منہ میں چائے کا آخری نیم گرم گھونٹ بوچھار کی شکل میں میر کا منہ دھلاتا ہوا ان کی داڑھی سے رس رس کر دامن پر ٹپکنے لگا۔ میر لاحول ولا قوۃ کے نعرے کے ساتھ اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ بیگم پیٹ پکڑ کر دوہری ہو گئیں اور ہم لپک کر باتھ روم میں جا گھسے اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

بیگم نے بہ مشکل تمام مصالحت کروائی۔ میر ہمارا کرتہ، پاجامہ پہن کر سامنے آئے تو بالکل SCARE CROW یعنی کوا ہکنی لگ رہے تھے۔ اب بحث یہ چھڑی کہ فلم کون سی دیکھی جائے۔ ہم نے کہا گھر پر ویڈیو ہے۔ بیگم نے ہونے والی مسلسل بارش کی طرف توجہ دلائی تو میر کچھ ٹھنڈے پڑے۔ ہم نے کہا آپ فلم کا نام بتائیں۔ ہم کیسٹ منگوا لیتے ہیں"۔ میر پان کے بیڑے کو تیسری بار دائیں سے بائیں کلے میں منتقل کرتے ہوئے چبا کر پیک کا مہکتا گھونٹ نگل کر بولے، ایک فلم کا نام ہے" اگر تیری شادی مجھ سے نہ ہو تو میں تیرے باپ کو جلا کر راکھ کر دوں گا"۔

"لاحول ولا قوۃ" ہم نے کہا "بولے" یہی منگوا لو، کوئی گویا کہ خود بخود مسلم سوشیل فلم معلوم ہوتی ہے"۔ ہم نے کہا "یہ کسی فلم کا نام نہیں ہو سکتا"۔

"یقین کرو، یہی اس فلم کا نام ہے"۔ میر بولے "پچھلے برس بھائی میں دو ماہ کیلئے مدراس گیا تھا۔ گویا کہ خود بخود گیا تھا۔ وہاں ایک دوست کے ہمراہ .... ہوٹل سے اسٹوڈیو جا رہا تھا کہ دیکھا راستے میں ایک سینما پر گویا کہ خود بخود لگ بھگ ہال سے باہر ٹکٹ کی کھڑکی پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ میں نے اپنے دوست سے پوچھا "یہ کون سی فلم ہے" جواب ملا ......

"کہیے حضور! اب کیسے مزاج ہیں؟ میں نے سنا تھا آپ کی طبیعت کچھ دنوں سے خراب چل رہی ہے"۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ جناب آپ اچانک میری طبیعت کا حال کیسے پوچھنے لگے، میں نے تو گویا کہ خود بخود آپ سے فلم کا نام پوچھا تھا۔ وہ صاحب ہنس کر بولے "یقین کریں۔ صاحب یہی ہے اس فلم کا نام۔

"جھوٹ کی بھی حد ہوتی ہے"۔ ہم نے کہا "خدا سے ڈرو میر"

"اچھا چلیے، تو پھر یہ فلم دیکھتے ہیں گویا کہ خود بخود نام ہے" ......

"میری جوتی تیری کھوپڑی عرف تھپڑ مار دھاڑ کی حرام زادے۔ مجھے چھیڑتا ہے"

اس فلم میں ہیرو، ہیروئن ہیں، بلی کباب لچی، اور رنگین تارا ڈھکن"۔

"کیا ہزیان بک رہے ہیں" ہم نے ہنستے ہوئے کہا۔ میر تسنی ان سنی کر کے بولے "یہ تو تھیں گویا کہ خود بخود کمرشیل یعنی تجارتی مسالحہ دار فلمیں"۔ اب سنیے کچھ تجرباتی نئی لہر یا جدید فلموں کے نام جیسے کہ کلیم اندھے پر مت ہنسو"، "پھوپا الو کا پٹھا" لیلیٰ کا کتا" مجنوں کی بلی" بیگم ہماری کا پلو منہ میں ٹھونس کر باورچی خانے میں

میں چلی گئیں۔ ہم نے بہ مشکل ہنسی ضبط کرتے ہوئے پوچھا "یکسر بچے"؟
"نہیں" میر چڑ کر بولے "آج مجھے دل کی بھڑاس نکال لینے دو۔"
"اب بس کیجیے اور یہ بتلائیے کہ آج کون سی فلم دیکھنا ہے۔" میر بولے "فلم کا نام ہے۔ حاتم طائی عرف مکّن قصائی اور ڈائرکٹر نے یہ تاریخی انکشاف کیا ہے کہ حاتم طائی دراصل قصائی تھا اور مکّن، اس کی عرفیت عرف تخلص تھا اور گویا کہ خود بخود وہ اس قدر سخی تھا کہ ایک بار اس نے ایک گدھا، جو (نہ گھر کا تھا نہ گھاٹ کا) ذبح کرکے اپنی دکان پر لٹکا دیا تھا اور جسے گویا کہ خود بخود لوگ بکرے کا گوشت جان کر نوش جان کر گئے اور وہ بھی بالکل مفت! اور وہ کیا ہے" ہم نے پوچھا "لیلیٰ کی بلی...." میر ٹوک کر بولے "لیلیٰ کی بلی نہیں" "لیلیٰ کا کتا، مجنوں بلی کی۔" یہ فلم بھی اسی فاضل ڈائرکٹر نے بنائی تھی جو کہ صرف تاریخی فلمیں ہی بناتا ہے۔ اس نے اس فلم میں یہ بات ثابت کرنے کی سر توڑ کوشش کی ہے کہ دراصل وہ دونوں اپنے اپنے پالتو جانوروں کو تلاش کرتے ہوئے اس چشمے کے کنارے آنکلے تھے، جہاں اکثر وہ دونوں یعنی کتا اور بلی پانی پینے آیا کرتے تھے۔ اسی چشمے کے دونوں کناروں پر کھڑے ہو کر دونوں نے (لیلیٰ اور مجنوں نے) ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔
اس سے پہلے کہ ہم کچھ اور کہیں' دروازے کی گھنٹی بجی، دروازہ کھولا تو معلوم ہوا کراچی سے فون آیا ہے۔ جلدی آئیے۔ بیگم قریب دس منٹ بعد مسکراتی ہوئی واپس آئیں' ہم نے پوچھا "خیریت؟ بیگم مسکرا کر بولیں، آج ایک بجے کی دہلی فلائیٹ سے ماموں، ممانی اور ان کی دونوں لڑکیاں جمیع آ رہی ہیں۔"
سنیما حال تو رہا ایک طرف گھر میں ویڈیو پر بھی فلم دیکھنے کا پروگرام ملتوی کرنا پڑا بقول میر گویا کہ خود بخود......

محمد اظہر حیات (ناگپور)

محبوب لیڈر

محبوب لیڈر کا پورا نام محبوب خان ہے۔ لیڈر کا دُم چھلّہ ان کے نام کے ساتھ کیوں، اور کب جڑ گیا اس کا علم شاید ان کو بھی نہیں ہے۔ گمان غالب ہے کہ کسی خاتون نے پہلی بار انھیں میرے محبوب کہا ہوگا جس پر دوسری کا اعتراض ہوا ہوگا اور پھر تو تو میں میں کی تکرار کے بعد سمجھوتا ہوا ہوگا کہ محبوب صاحب کو صرف لیڈر صاحب ہی کہا جائے۔ یوں بھی محبوب خان کی اہلیہ بھی اِنھیں میرے محبوب کہنے کی حقدار نہیں ہے۔ کیوں کہ قوم و ملک کے یہ لیڈر تو عوام کی میراث اور ملک کا سرمایہ ہیں۔

محبوب لیڈر کا حلیہ بھی پیدائشی طور پر لیڈرانہ ہے ان کے قد و قامت میں وہ تمام خوبیاں نمایاں طور پر موجود ہیں جو ایک لیڈر میں ہونی چاہئیں۔ اونچی پیشانی جو بقول جوتشی کامیابی کی نشانی ہے۔ بلند قد کہ قد آور کہلانے کے بجا طور پر مستحق۔ ستواں ناک جس پر کبھی مکھی بیٹھنے نہ دیتے۔ ہاں غصّہ اکثر ان کی ناک پر ہوتا۔ اکثر وہ اسی سے ناک میں دَم بھی کرتے ہیں۔ بڑی بڑی سُرخ آنکھیں جن میں لیڈری کا نشہ اور ملک و قوم کا درد جھلکتا ہے۔ بڑے بڑے دو عدد کان) جو بڑے لیڈر ہونے کا ثبوت ہیں کہا جاتا ہے کہ لیڈر صاحب کے کان اتنے بڑے نہیں تھے۔ (زمانۂ طالب علمی میں اساتذہ ٹھس دماغ کی وجہ سے ان کے کان نہ صرف مروڑتے بلکہ کھینچتے بھی رہتے۔ جس کے نتیجے میں ان کے کان ضرور بڑے ہو گئے مگر اپنے موروثی دماغ کی وجہ سے تیسری سے آگے نہ بڑھ سکے۔ بہرحال لیڈر صاحب اب ان کانوں سے سُن کر اَن سُنی کرنے کا کام لیتے ہیں جو ہر بڑے لیڈر کی بڑی خوبی ہے۔

محبوب لیڈر میں فرض شناسی، قیافہ شناسی، موقع شناسی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ان ہی صفات کی بناء پر اب تک دسوں دل بدل چکے ہیں پھر بھی بد دل نہیں ہوئے۔ غالباً انھوں نے دل بدلنے کو ہی اپنا اصول بنالیا ہے۔

لیڈر صاحب اللہ کی رزاقیت کے نہ صرف قائل ہیں بلکہ عمل بھی کرتے ہیں اور فیملی پلاننگ پر یقین نہیں رکھتے۔ اللہ کے فضل سے کثیر الاولاد ہیں۔ مگر جب کبھی اس موضوع پر تقریر کرنے کا موقع ملتا تو وہ حکومت کی پالیسی کی حمایت کرتے تھے ٹھیک اس طرح جس طرح اردو کے شاعر ادیب پروفیسر اور اساتذہ اردو کی روٹی روزی کھاتے ہیں اور اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم دلواتے ہیں۔ مگر لیڈر صاحب ایسی منافقانہ روش اختیار نہیں کرتے۔ وہ اپنے بچوں کو اردو کیا کسی بھی زبان میں تعلیم دلوانے کے خلاف ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ملک و قوم کے لیے قربان کر رہے ہیں۔ ان کے

خیال میں یہ بچے تعلیم حاصل کر کے ملک کی بے روزگاری میں اضافہ ہی کریں گے۔ اس لیے بچوں کو تعلیم سے بے بہرہ رکھ کر لیڈر صاحب ملک کو مسائل سے دو چار ہونے سے بچا رہے ہیں۔

محبوب لیڈر کا محبوب مشغلہ تقریر کرنا ہے۔ خواہ کوئی بھی موضوع ہو لیڈر صاحب دھواں دھار تقریر کرنے کے عادی ہیں۔ ایک مرتبہ فٹ بال کے فائنل میچ میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے مدعو تھے۔ آپ نے کھیل کے آخر میں دھواں دھار تقریر کر کے لوگوں کا دل جیت لیا۔ اس سے ملک کے لیے ان کے دلی درد کا اندازہ ہوتا ہے۔ فرمایا۔ بھائیو اور بہنو! آج کا میچ دیکھ کر مجھے جہاں خوشی ہوئی وہیں دل دکھ سے بھر گیا۔ خوشی اس بات کی کہ ایسا میچ برازیل اور جرمنی میں بھی ہم نے نہیں دیکھا۔ (یہ اور بات ہے کہ لیڈر صاحب ناگپور چھوڑ کر کبھی کہیں نہیں گئے)۔ دکھ اس بات کا ہو رہا ہے کہ آج ہمارا ملک کتنا پچھڑا ہوا اور غریب ہے۔ کہ ہمارے پاس کھلاڑیوں کے لیے بال تک برابر نہیں ہے اور سارے کھلاڑی صرف ایک بال سے ہی کھیلنے پر مجبور ہیں۔

ایک مرتبہ لیڈر صاحب نے عوام کو بتایا کہ بنگلہ دیش میں سیلاب آگیا ہے۔ یہ خبر ہم نے آج ہی انگریزی اخبار ناگپور ٹائمز میں پڑھی جو دلی کا مشہور اخبار ہے۔

لیڈر صاحب اردو میڈیم کی تیسری جماعت میں فیل ہو گئے تھے! انگریزی کیا اردو بھی ٹھیک سے لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے۔ مگر سیاسی بصیرت اور لیڈرانہ مہارت گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اسی لیے شہر کے ادیب و شاعر اپنی کتابوں کا اجراء ان کے دستِ مبارک سے کروانا باعثِ فخر سمجھتے۔ لیڈر صاحب معاملہ فہمی اور حاضر دماغی کی وجہ سے بھی مقبولِ خاص و عام ہیں کئی انجمنوں اور اداروں کے صدر اور ذمہ دار بھی ہیں۔

لیڈر صاحب عام طور پر سفید کرتا پاجامہ ہی زیب تن کرتے ہیں۔ مگر خاص خاص موقعوں پر شیروانی اور ٹوپی کا بھی موقع فراہم کرتے ہیں اس لباس میں وہ زیادہ پر وقار اور منفرد نظر آتے ہیں۔ ویسے شیروانی پہننے کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ دعوتوں میں نظر بچا کر شیروانی کی بڑی بڑی جیبوں میں بچوں کے لیے بھی حصہ رکھ لیتے ہیں

لیڈر صاحب بڑے بے باک نڈر اور منہ پھٹ ہیں۔ کسی سے نہیں ڈرتے۔ مگر اپنی بیگم کے سامنے بھیگی بلی نظر آتے ہیں۔ ایک دفعہ ٹیلی فون پر کسی شخص نے دھمکی دی اور کہا کہ میں خوب سمجھتا ہوں کہ تم کس کے اشارے پر ناچتے ہو۔ لیڈر صاحب نے عاجزانہ انداز میں کہا ــ دیکھو سیاسی معاملات میں میری بیوی کو نہ کھینچو۔ !!!

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

ایڈیٹر : ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

جلد : ۲۸
شمارہ : ۹

بیاد دلیپ سنگھ

ستمبر ۱۹۹۶ء

ایڈیٹر اوورسیز :
عابد معز (ریاض)

اوورسیز کمیٹی : مصلح الدین سعدی (جدہ) ، شجاع الدین غوری (جدہ) ، سعید شوکت (جدہ)
ایس۔ ایم حسینی (آسٹریلیا) ، غلام نجم الدین (دوبئی)

مجلس مشاورت :
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین
یوسف ناظم
عنایت اللہ

سرورق کیری کیچر :
شکیل اعجاز

مجلس ادارت :
مظفر مجاز
طالب خوندمیری
صلاح الدین نیر
رحیم الدین توفیق

کتابت : محمد سلیم ۔ محمد غالب ۔ محمد عبدالرؤف
طباعت : دائرہ پریس چھتہ بازار ۔ حیدرآباد

فی پرچہ : ۱۰ روپے
زرِ سالانہ : ۱۰۰ روپے
بیرونی ممالک سے : ۳۰ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :
۱۶۱، بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

فون آفس : 595716 رہائش : 521064

فہرست

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن!

رجسٹرڈ آفس :۔ 4-1-825/B سکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ عابد روڈ حیدرآباد

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا یہ ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے۔ یہ قرضہ جات 2 اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں (1) غربت ہٹاؤ اسکیم (2) خود روزگار اسکیم۔ غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار بنک کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائینڈنگ، ترکاری فروش، میوہ فروش، اگربتی کا کارخانہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں اس جملہ لاگت کا 25% کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود 4% کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور ما باقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی چھ ہزار 6000 روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین، آٹو رکشہ، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 20% کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح سود 6½ پر دیا جاتا ہے۔ کارپوریشن مندرجہ بالا دو اسکیموں کے تحت اپنے قیام سے لے کر 7 مارچ 96ء تک 57857 افراد میں 12,66,60,000 روپے بطور مارجن منی قرض جاری کرچکا ہے جن کی جملہ لاگت 56,98,15,000 روپے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جاریہ سال 95-96 سے مرکزی حکومت کا قائم کردہ نیشنل اقلیتی ڈیولپمنٹ اینڈ فینانس کارپوریشن کے اشتراک سے اب تک جملہ 868 افراد میں (16) منظور کردہ اسکیمات کے تحت 1,06,30,000 روپے مارجن منی قرض مزید جاری کرچکا ہے جس کی جملہ لاگت 3 0 ,270 روپے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کارپوریشن 1996 سے اقلیتی طبقہ کے نوجوانوں کو سالانہ مفت ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے چکا ہے حیدرآباد میں 551 نوجوانوں کو، نظام آباد میں 192، گنٹور میں 24 افراد، کرنول میں 76 نوجوانوں کو تقریباً 10 لاکھ روپے کے صرفہ سے کمپیوٹر میں، موٹر ڈرائیونگ، لیاب ٹیکنیشین، ٹیلرنگ، ٹائپ رائیٹنگ وغیرہ میں ٹریننگ کرایا گیا ہے۔

کارپوریشن کی شاخیں اضلاع کے ہیڈ کوارٹر پر بھی کام کررہی ہیں۔ خواہشمند حضرات کارپوریشن کے دفاتر سے ربط پیدا کریں۔

محمد علی رفعت
ایم کام۔ ایل ایل۔ ایم
نائب صدر نشین و مینجنگ ڈائرکٹر

یوسف ناظم

دلیپ سنگھ کی یاد میں

اخبار میں ان کے انتقال کی خبر پڑھی تو جی چاہا کہ یہ خبر بھی اخباری خبروں کی طرح کی ہو اور دوسرے دن اس کی تردید چھپ جائے ہمارے کتنے ہی ادیب اور شاعر ایسی افواہوں کا شکار ہوئے ہیں۔ جگر مرادآبادی کا نام سرفہرست ہے پھر چند سال پہلے مجنوں گورکھپوری کے انتقال سے پہلے ان کی وفات کی خبر ہندوستان کے اخباروں میں چھپ گئی تھی کاش دلیپ سنگھ کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوتا۔ دلیپ سنگھ میرے بہت ہی عزیز دوست تھے۔ کھلے دل سے دوستی کے قائل تھے۔ اردو کے ادیب تو تھے ہی لیکن اس سے زیادہ اردو تہذیب کے علمبردار اور پاسدار تھے۔ مجھے (خواہ مخواہ) اپنا بزرگ مانتے اور برملا اس کا ملاقات میں ذکر بھی کرتے تھے یعنی زبردستی اس پر یہ تاکید کہ پیا ہوگا میں تو سمجھتا ہوں وہ خلوص اور محبت کے معاملے میں بے حد چوکنا رہنے والے لوگوں میں سے تھے۔ خود ہی اپنے آپ پر شک کرتے کہ کہیں ان کی طرف سے خلوص میں کوئی کوتاہی تو نہیں ہو رہی ہے۔ ملاقات ہوتی تو تقریباً بچھ جاتے خط لکھتے تو اس طرح لکھتے موتیا اور بیلے کے پھولوں کا ہار مرتب کر رہے ہوں۔ اب میں ان کے خط ڈھونڈ رہا ہوں جو پچھلے دس سال کے عرصے میں وقفہ وقفہ سے مجھ پر عطر چھڑکتے رہے۔ میں نے چند ہی دن پہلے تو انہیں خط لکھا تھا۔ یہاں اخبار میں خبر چھپی تھی کہ سی بی آئی کے ڈائرکٹر جوگیندر سنگھ جو مزاح نگار ہیں اور ان کی دو تین کتابیں چھپ چکی ہیں میں نے فوراً دلیپ سنگھ سے رجوع کیا اور انھیں خط لکھا کہ یہ ہیں کون صاحب کیا آپ کی ان سے دوستی ہے۔ اور اگر ہے تو کیسی اور کتنی پرانی۔ میں سمجھتا ہوں یہ خط ان کی میز پر ہی کھلا پڑا رہ گیا۔ انتقال سے دو یا تین دن پہلے انہیں ملا ہوگا اور وہ جواب نہیں لکھ سکے۔ ان کے ساتھ خط و کتابت کا معاملہ کچھ اس نوعیت کا تھا کہ میں اسے دوبدو گفتگو سمجھتا تھا۔ میں نے آج کچھ پوچھا اور کل اس کا جواب مل گیا۔ ان کے انتقال کو اتنے دن ہو گئے ہیں لیکن اب بھی مجھے یہ گمان ہوتا ہے کہ ان کا خط جو انھوں نے میرے خط کے جواب میں لکھ دیا ہوگا ضرور مجھے ملے گا۔

دلیپ سنگھ اور مقروض، یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک خط میں تو انھوں نے یہ تک لکھا کہ "سیکھا ہے جب چاہا ڈانٹ دیتے ہیں" کل اور حیدرآباد میں ان سے جو ملاقاتیں اور مکالمات ہوئے وہ دل پہ نقش رہیں گے۔ نفیس آدمی تھے۔ اپنے آپ کو نک سک سے درست اور چست رکھنے میں طاق۔ دلیپ باتیں کرنے کے مشتاق۔ اپنے ہر سفر کی روداد بیان کرنے کے شوقین جس سے ان کی معصومیت جھلکتی تھی۔ پچھلے سال ایک محفل طنز و مزاح میں ان کے ساتھ ۳ دن مسقط میں گزرے۔ میری ہی طرح وہ بھی خوش تھے۔

خوشی کا جہاں تک تعلق ہے دلیپ سنگھ نہ صرف اسے سمیٹتے تھے بلکہ دوسروں میں بانٹتے بھی تھے۔ ورنہ بہتوں کا معاملہ تو یہ ہے کہ دوسروں کے دُکھ میں شریک ہوتے ہیں ان کے حصّہ کی خوشیاں بھی لپک لیتے ہیں۔ مسقط سے واپس ہونے پر ایک پوسٹ کارڈ لکھا (پوسٹ کارڈ لکھنے کے فن سے میں نے ہی انہیں آشنا کیا تھا ورنہ وہ ہمیشہ خوبصورت اسٹیشنری پر خط لکھتے اور لفافے میں رکھ کر بھیجتے تھے)۔ اصل خط یوں ہے:

"برادر محترم یوسف ناظم صاحب۔ میرا خط مل گیا ہوگا۔ یہ خط دو خبریں دینے کے لیے لکھ رہا ہوں۔
شاہد علی خاں صاحب نے مسقط کے جشن کے بارے میں پوچھا تو میں نے کہا کہ جشن اتنا کامیاب
تھا کہ یوسف ناظم صاحب [illegible] ختم کرنے تک وہ ہنس رہے تھے"۔

خط میں جو دوسری [illegible] اس کا تعلق [illegible] ہے۔ دلیپ سنگھ کو پابندی سے خط لکھنے کی عادت ہوگئی تھی اور میرا خیال ہے ان کا [illegible] وقت اسی مشغلے میں ہوا کی طرح نکل جارہا تھا۔ ایک خط میں مجھے لکھا "میں جون کی تیس تاریخ کو امریکہ چلا گیا تھا اور کل رات کو لوٹا ہوں" واپسی پر آپ کا ۲ اگسٹ کا خط دیکھا اور دیکھ لیجیے فوراً جواب لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ امریکہ میں ذاتی نوعیت کا ایک کام تھا لیکن سفر کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے ایک امریکی پبلشر کو ایک ناول کا خاکہ بھیجا تھا۔ اسے پسند آیا اور وہ اس سلسلہ میں مجھ سے ذاتی بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ بات چیت ہوگئی۔ اب صرف ناول لکھنا باقی ہے۔ ایک معمولی کام" آپ کا لکھا ہوا تبصرہ مجھے نہیں ملا مجھے تو شک ہے آپ نے لکھا ہی نہیں ورنہ ضرور ملتا۔ آپ کا خط ملا ہے اس سے ظاہر ہے کہ محکمہ ڈاک کو مجھ سے کوئی بیر نہیں ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آپ سچ بولنا عمر کی کس منزل میں شروع کریں گے۔ ویسے تبصرہ آپ نے مجھے کیوں بھیجا کتاب نما کو بھیجئے۔ انقلاب کو بھیجئے تاکہ مجھے کچھ شہرت ملے"۔

ایک دوسرے خط میں دلیپ سنگھ نے میری "حوصلہ افزائی" ان الفاظ میں کی "آپ کی کتاب میں نے جہاز کے سفر میں پڑھ لی۔ بہت سے مضمون پہلے ہی پڑھے ہوئے تھے لیکن خاکے تمام پہلی بار پڑھے اور بے حد لطف لیا۔ یہ کہنا کہ آپ خوب لکھتے ہیں تو بالکل ایسے ہوگا جیسے ایک شاگرد استاد کو شاباشی دے لیکن سچی بات یہ ہے کہ آپ خوب لکھتے ہیں" میں نے اس لیے تو عرض کیا کہ دلیپ سنگھ اردو کے ادیب نہیں تھے اردو تہذیب کے دلدادہ اور پاسدار تھے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں نے دلیپ سنگھ کے بیان کو سچ سمجھ لیا لیکن ان کی فراخ دلی کا تو قائل ہونا ہی پڑا۔ یہ فراخ دلی خود مجھ میں نہیں ہے تو دلیپ سنگھ کے علاوہ اس کی توقع دوسروں سے کرنا ایسا ہی ہے۔ اب جانے دیجیے۔ لیکن دلیپ سنگھ کی مجھ سے یہ محبت موقتی یا عارضی نہیں تھی ایک خط میں جو حال حال کا ہے انھوں نے لکھا "مجھے خیال تھا کہ آپ سے حیدرآباد میں ملاقات ہوگی اور آپ سے خوب باتیں ہوں گی لیکن وہاں جاکر معلوم ہوا کہ آپ ناسازیٔ طبیعت کی وجہ سے نہیں آئیں گے بہت مایوسی ہوئی۔ آپ جانتے ہیں کہ حیدرآباد میں ہماری سرگرمیاں تو بس دو تین گھنٹوں کے لیے ہوتی ہیں۔ باقی وقت تو دوستوں کے لیے ہوتا ہے۔ آپ آئے نہیں۔ نریندر لوتھر [illegible] وہاں سے ناراض تھے۔ باقی کا تمام وقت ہوٹل کے کمرے میں لیٹ کر گزارا کرکٹ دیکھتا رہا۔ اتنا کرکٹ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا دیکھ دیکھ کر یہ حالت ہوگئی کہ اتنے رن تو میں خود بنا سکتا ہوں جتنے محمد اظہر الدین بناتا ہے۔ سب حیدرآباد کے جلسے آپ کی غیر حاضری کے باوجود کامیاب رہے۔ اول اجلاس میں پہلے تو سامعین کچھ کم نظر آئے لیکن ہال بھر گیا میری باری آنے تک کوئی کرسی خالی نہیں تھی۔ اس بار صرف

طور پر مجھے احساس ہوا کہ اہل حیدرآباد میری ہر حرکت کو پسند کرتے ہیں۔ میں کوئی مضمون پڑھوں وہ داد دینے کو تیار رہتے ہیں۔ خدا کرے یہ سلسلہ بنا رہے کہ اسی کے سہارے تو ہم لوگ زندہ ہیں۔"

اچھا ہوا کہ دلیپ سنگھ کے سارے خط تلاش کرنے پر بھی مجھے نہیں ملے ورنہ میں صرف خط ہی نقل کرتا رہتا۔ دلیپ سنگھ باضابطہ مزاح نگار تھے انھوں نے ہنسی کا کاروبار کیا تھا اور یوں مجھے اس گھاٹے کے سودے کے بڑے تاجر تھے۔ ان کے ساتھ میں کئی جلسوں میں شریک رہا اور ہر جلسہ میں میں نے دیکھا کہ دلیپ سنگھ ہی دلیپ سنگھ ہوتے تھے (طرفداری کی بات اور تھی) ایک نوجوان کا رکھ رکھاؤ، سلیقہ، پڑھنے کا انداز اور پھر بے ساختہ مزاح۔ اپنے آپ پر جملے کس کر بے حد خوش ہوتے۔ مسقط کے جلسے میں میں نے اپنی سماخاکہ پڑھا تھا جلسے میں ایک خاتون نے مجھے مبارکباد دینے آئیں (شاید بھی ہوگی) میں نے ان کا رخ دلیپ سنگھ کی طرف موڑ دیا۔

دلیپ سنگھ کے تو ہزاروں دوست ہوں گے۔ کچھ ایسے کہ ان کی ابھی ابھی شناسائی تھی جو جلد ہی آشنائی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے ہیں یا پھر دلی میں۔ پچھلی مرتبہ (دو سال پہلے) جب میں دلی گیا تھا تو وہ اپنی "ٹوئیٹا" میں جس کا ذکر وہ اکثر اپنے کالموں میں کرتے رہتے ہیں مجھے لئے گھومے اور ڈرتے ڈرتے پاکستانی ایمبیسی کے دفتر بھی لے گئے۔ کہتے رہے کہ ان کی کار کا نمبر نوٹ کر لیا جائے گا۔ ایک گیٹ سے دوسرے گیٹ اور دوسرے گیٹ سے پھر پہلے گیٹ۔ میں نے کہا بھی کہ ہر گیٹ پر اپنی کار کا نمبر کیوں درج کروا رہے ہیں ہنسے اور بولے شہرت بشہرت۔

دلیپ سنگھ نے لوگوں میں بہت مسکراہٹیں اور قہقہے بانٹے۔ میں نے تو حساب نہیں رکھا لیکن وہ جہاں جہاں بھی گئے ہوں گے وہاں کی ہواؤں میں ان کے شگوفوں کی مہک بس گئی ہوگی۔ کلکتہ میں ان کی ایک کتاب کی رسم اجراء کا جلسہ تھا۔ دعوت نامہ مجھے بھی ملا لیکن بدقسمتی سے میں جا نہیں سکا۔ جس کا دلیپ سنگھ نے مجھ سے محبت آمیز شکوہ بھی کیا تھا لیکن صرف یہ کہ آپ آ جاتے تو اچھا ہوتا۔ دلیپ سنگھ نے شاید خود بھی حساب نہیں کیا ہوگا کہ انھوں نے کتنے قلعے فتح کر لیے تھے۔ حیدرآباد میں تو وہ اتنے مقبول تھے کہ رویندرا بھارتی اور نمائش کلب کی چھتوں کی مرمت کروانی پڑتی تھی دیواروں میں الگ دراڑیں پڑ جاتی تھیں۔ رواں دواں تحریر آب منظر کی طرح صاف (میونسپلٹی کے پانی کا نشان تک نہیں) شستہ اور شائستہ مزاح۔ پٹی یا افتادہ موضوع پر بھی ان کے مخصوص انداز کی چھاپ فوری طور پر گرفت میں آ جانے والی نکتہ بجی دوکان آتش بازی کے سامان کی لیکن خطرہ کوئی نہیں۔ یہ سب دلیپ سنگھ کی مزاح نگاری کی خصوصیات تھیں۔ وہ بھی مضمون سنا کے فرحت و انبساط کا ماحول پیدا کر دیتے۔ میری رائے ہے کہ جب کوئی مزاح نگار اسٹیج پر مضمون سنانے کھڑا ہو تو تصویر اس کی نہیں سامعین کی کھینچنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ ایسے موقعوں پر کیمرے کا رخ سامعین کی طرف ہی ہونا چاہیئے۔ دلیپ سنگھ نے اچھی زندگی گزاری خود کے لیے بھی اور دوسروں کے لیے دلی کی محفلوں میں بھی وہ پابندی سے شریک ہونے لگے تھے۔ جب رشید حسن خاں دلی سے رخصت ہونے لگے تو ان کے وداعی جلسے میں دلیپ سنگھ نے بھی مضمون پڑھا۔ میں تو وہاں موجود نہیں تھا۔ لیکن لوگوں سے میں نے سنا کہ ان کے مضمون نے سب کو خوش کر دیا، دل ماشاد کر دیا یہ جملہ ہر کسی کی زبان پر تھا۔ اگر کوئی یہ خبر مجھ تک نہ بھی پہنچاتا تو میرا کوئی نقصان نہ ہوتا کیوں کہ میں بخوبی جانتا ہوں جلسے میں دلیپ سنگھ شریک ہوتے میلہ لوٹ لیا کرتے تھے۔ مسقط میں ان کی جو پذیرائی ہوئی اس کا اندازہ کم لوگوں کو ہوگا وہاں کی ہندوستانی ایمبیسی سے کے

عہدیداران سے اس طرح ملے جیسے دلیپ سنگھ اب بھی برسرِ کار رہیں۔ دلیپ سنگھ نے مجھے وہاں بھی اپنے ہر سردار دوست سے ملایا۔ اور مجھے اتنی اہمیت دی کہ ان کے دوست اور شناسا ان کی مردم شناسی پر رشک کرنے لگے۔ دلیپ سنگھ یوں اچانک چل بسیں گے اس کا گمان تک نہیں تھا۔ وہ دل کے مریض ضرور تھے لیکن یہ کسی نے نہیں سوچا تھا کہ زندگی اور زندہ دلی سے معمور یہ دل کچھ کہے سنے بغیر یوں خاموش ہو جائے گا۔ حادثہ شاید اسے ہی کہتے ہیں۔ بعض موقعوں پر زبان اور قلم ساتھ دینے سے انکار کر دیتے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ آدمی اپنا آپ کی کیفیت کو کیسے ظاہر کرے۔ میں زندہ دلانِ حیدرآباد کے حالیہ اجلاسوں میں شریک نہیں ہو سکا اس کی کوئی معقول وجہ تھی یا نہیں پتہ نہیں لیکن اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کسی بہانے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔ دلیپ سنگھ کی عدم موجودگی ریڈ سگنل بن گئی ہے۔ حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد۔

□□

دلیپ سنگھ

ہائی کو

[جب سے اردو کے سنجیدہ شاعروں نے جاپان کی صنف شاعری "ہائی کو" سے آگاہی پائی ہے وہ اپنے خیالات کے دھاروں کو ہائی کو کے جامہ میں لپیٹنے کی کوشش میں جٹ گئے ہیں۔ مزاح اور طنز نگاروں نے اس طرف زیادہ توجہ نہیں کی یہ محسوس کرتے ہوئے کہ یہ طوقِ جاپانی مجھے ہی اپنے گلے میں ڈالنا ہوگا، میں "ہائی کو" کے کچھ نمونے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں]

(۱)

ایک مصرعے کی لنگڑی تین ٹانگیں دیکھ کر
میں نے پوچھا کیا ہوا، کہنے لگا
ہائی کو

(۲)

جانتا ہوں میرے کہنے پر چلے
کار چلتی ہے مگر
پیٹرول سے

(۳)

دوستوں سے مل کے لوٹا
تو بہت حیران تھا
جیب میں بٹوا نہ تھا۔

(۴)

وہ رقم جو مجھ کو پہلی کو ملی
آج دسویں ہے
کدھر رخصت ہوئی۔

(۵)

تیرے والد نے مجھے کوٹھی نہ دی
میں نے منگنی توڑ دی تو لیل
دھو کر کس کی جانب سے ہوا

(۶)

تم سناؤ آٹھ غزلیں
ہم فقط ایک ہائی کو؟
"سستا بکا کو"؟

مجتبیٰ حسین

دلیپ سنگھ کی یاد میں

سردار دلیپ سنگھ بھی بالآخر ساتھ چھوڑ گیا۔ جس تیزی سے وہ ادب میں آیا تھا اسی تیزی سے چلا بھی گیا۔ اس کا مجھے کچھ کچھ اندیشہ تو تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۸۴ء کے اوائل میں جب مجھے اردو طنز ومزاح کے لیے پہلا غالب ایوارڈ ملا تھا تو ایک دن صبح صبح ویانا سے ایک فون آیا۔ آواز آئی "میں دلیپ سنگھ بول رہا ہوں۔ ویانا سے۔ غالب ایوارڈ ملنے پر دلی مبارکباد قبول کریں۔ آپ سے پچھلے دنوں فکر تونسوی کے گھر پر سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ ہندوستان لوٹ کے آؤں گا تو آپ سے تفصیلی ملاقاتیں ہوں گی۔"

دلیپ سنگھ ان دنوں آسٹریا کے ہندوستانی سفارت گھر میں کام کرتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد وہ سچ مچ ہندوستان لوٹ آیا۔ فکر تونسوی مجھے بہت عزیز رکھتے تھے ان سے ہر روز یا تو ملاقات ہو جاتی تھی یا پھر ان سے فون پر رابطہ قائم ہو جاتا تھا۔ دلیپ سنگھ کی ہندوستان کو واپسی کے بعد احساس ہوا کہ وہ بھی فکر تونسوی کا گہرا اور پرانا عقیدتمند ہے فکر کی معرفت ہی میری ملاقات دو اور سرداروں یعنی تارا سنگھ کامل اور رگھوبار سنگھ بج سے ہو چکی تھی۔ اب دلیپ سنگھ کا بھی اضافہ ہو گیا۔ اس وقت تک دلیپ سنگھ کی کوئی تحریر کسی رسالہ میں شائع نہیں ہوئی تھی۔ وہ زیادہ تر ریڈیو کے لیے ہی لکھتا تھا اور برسوں سے لکھ رہا تھا۔ ایک دن دلیپ سنگھ نے مجھ سے کہا "یہ کیا آپ مضامین اور کالم وغیرہ لکھتے رہتے ہیں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے لکھئے۔ اس میں پیسہ بہت ہے۔"

میں نے کہا "دلیپ سنگھ میں ریڈیو کے لیے تقریریں وغیرہ تو لکھتا رہتا ہوں ٹیلی ویژن پر بھی گاہے بگاہے چلا جاتا ہوں لیکن میں ایسی تحریروں میں زیادہ یقین نہیں رکھتا اور نہ ہی میں اپنا زیادہ وقت ایسے کاموں کے لیے دینا چاہتا ہوں کیوں کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے تم جو کچھ لکھتے ہو وہ کچھ عرصہ بعد ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ پکی روشنائی میں چھپنے کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے صدیوں بعد بھی کوئی اہل نظر تمہاری کوئی کتاب نکال کر پڑھ لے اور اگر اسے احساس ہو کہ تمہیں تب تک ادب میں کوئی مقام نہیں ملا ہے تو وہ تمہیں وہ مقام بالآخر دلادے گا۔ اس لیے اسلام میں "کتاب" اور "اہل کتاب کی" اہمیت کو زیادہ واضح کیا گیا ہے۔

کچھ عرصہ بعد مجھے لگا کہ دلیپ سنگھ کو میری بات کچھ کچھ سمجھ میں آگئی ہے! اس وقت تک ٹیلی ویژن پر اس کے دو ایک سیریل بھی آچکے تھے۔ ریڈیو پر اس کی جھلکیاں تو آتی ہی رہتی تھیں۔ اس عرصہ میں فکر تونسوی نے بھی اسے پکی روشنائی

یں چھپنے کے لیے اُکسایا بالآخر دلیپ سنگھ نے "معذرت نامہ" کے عنوان سے ایک مزاحیہ لکھا جس میں کتابوں پر لکھے جانے والے تبصروں کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ اس کا یہ مضمون "شاعر" بمبئی میں چھپا اور ظ۔ انصاری نے اس کی تعریف میں ایک خوبصورت خط اسے لکھا۔ پھر کیا تھا دلیپ سنگھ آپے سے باہر ہو گیا۔ پی روشنائی سے اس کی وابستگی کو مزید پکا کرنے کے لیے میں نے اسے ورغلایا کہ وہ میرے اور فکر تونسوی کے ساتھ میرٹھ کی ایک مزاحیہ محفل میں چلے۔ وہاں اس کے مضمون "معذرت نامہ" کو بے حد پسند کیا گیا۔ وہ پڑھتا بھی بہت اچھا تھا۔ اسی سال میں اسے "زندہ دلانِ حیدرآباد" کے سالانہ ادبی اجلاس میں لے گیا۔ وہاں بھی اسے بے پناہ کامیابی ملی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ حیدرآباد کے ادبی حلقوں کا محبوب بن گیا۔ پچھلے دس برسوں میں زندہ دلانِ حیدرآباد کے جتنے بھی ادبی اجلاس ہوئے ان میں دلیپ سنگھ نے نہ صرف شرکت کی بلکہ اس کی شرکت کو ضروری سمجھا جانے لگا۔

وہ ایک باغ و بہار آدمی تو تھا ہی کسی بھی محفل میں چلا جاتا تو اپنی لطیفہ اور پر مزاح باتوں سے لوگوں کے دل جیت لیتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی اور غیر اہم باتوں میں بھی وہ مزاح کی گنجائش نکال لیتا تھا۔ زبانی طور پر مزاح سے اس کا سروکار تو غالباً بچپن سے ہی رہا ہوگا۔ تحریری طور پر مزاح نگاری سے اس کی وابستگی کی عمر دس گیارہ برس بنتی ہے۔ اسے یہ احساس تھا کہ اس نے مزاح نگاری دیر سے شروع کی ہے اس لیے وہ بے پناہ لکھنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی پہلی کتاب "سلطے جہاں کا درد" حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ پھر مکتبہ جامعہ نے اس کے مزاحیہ مضامین کا دوسرا مجموعہ "گوشے میں قفس کے" شائع کیا پیچھے پیچھے اس کا سفرنامہ "آوارگی کا آشنا" بھی شائع ہوا۔ رسالہ "بیسویں صدی" میں اس نے "پیچھے تری سرکاریں" کے عنوان سے آپ بیتی لکھنی شروع کی جس میں اس نے حکومت ہند کی وزارت خارجہ میں اپنی ملازمت کے تجربات کو نہایت دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ اس عنوان سے اس نے کئی قسطیں لکھیں کچھ عرصہ بعد اس نے روزنامہ "قومی آواز" میں "گل گفت" کے عنوان سے ہفتہ وار مزاحیہ کالم لکھنا شروع کیا۔ اس نے بعض دوستوں کے دلچسپ خاکے بھی لکھے گویا کہ گیارہ برس کے عرصہ میں اس نے مزاح نگاری کے سارے ہی گوشوں اور امکانات کو آزمایا اور کامیاب رہا۔

دلیپ سنگھ کے ساتھ مجھے بیسیوں محفلوں میں جانے کا موقع ملا۔ پچھلے سال ہم دونوں مسقط بھی گئے تھے۔ وہاں اس کے مضامین کو بے حد سراہا گیا۔ آٹھ نو برس پہلے اس کے قلب پر شدید حملہ ہوا تھا اور سچ پوچھو تو اسے دوسری زندگی ملی تھی۔ جب بھی ہم دہلی سے باہر کسی ادبی محفل میں جاتے تو میں اسے ہمیشہ ٹوکا کرتا تھا کہ وہ وقت پر سو جائے اور اپنی دوائیں پابندی سے لیا کرے۔ کبھی کبھی وہ اس بات پر مجھ سے ناراض بھی ہو جاتا تھا کہ لوگ اس کی صحبت میں کچھ وقت گزارنا چاہتے ہیں اور میں انہیں بھگا دیتا ہوں۔ بعض اوقات تو خود مجھے بھی کوفت ہوتی تھی کہ آخر میں دلیپ سنگھ کو کیوں ٹوکتا ہوں وہ تو بھلا چنگا ہے۔ یقین مانیے پچھلے آٹھ نو برس میں جب بھی میں نے اسے دیکھا ہمیشہ ہنستے ہنساتے اور دھومیں مچاتے ہوئے دیکھا وہ اپنی بیماری کو تقریباً بھول چکا تھا بلکہ اپنے اکثر مضامین میں وہ بیماری کا مذاق اڑایا کرتا تھا پچھلے سال دسمبر میں مسقط سے واپسی کے سفر میں میں نے اسے سمجھایا تھا کہ میاں ادب میں تم اب اپنی جگہ بنا چکے ہو لہٰذا اپنے لکھنے کی رفتار کم کرو اور اپنے آپ کو دیکھ سمجھ کر خرچ کرو۔ میری اس بات کو بھی وہ مذاق میں ٹال گیا۔ دلیپ سنگھ کی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے مزاحیہ مضامین میں ایک نہایت بے تکلف فضا پیدا کر دیتا تھا۔ زندگی کے چھوٹے موٹے مسائل اور واقعات کو وہ کسی لاگ لپیٹ اور بناوٹ کے بغیر پوری خوش دلی کے ساتھ بیان کرنے کا ہنر جانتا تھا۔ ایک سچا پنجابی جس طرح بے باک، بے لاگ

اور بے لوث قہقہہ لگاتا ہے اس کی گونج اس کے مزاحیہ مضامین میں صاف سنائی دیتی تھی۔

6/اگست کو میرے پاس اس کا فون آیا کہ بشیر مالیر کوٹلوی ستمبر میں مالیر کوٹلہ میں ایک مزاحیہ محفل رکھنا چاہتا ہے تمہیں بھی چلنا ہوگا۔ ۸/اگست کو جس دن اس کا انتقال ہوا، میں اسے فون کرنے ہی والا تھا کہ میاں تم کہتے ہو تو پنجاب چلے چلتے ہیں مگر ہم نارنگ ساقی کے ساتھ چلیں گے تاکہ ان کے آبائی قصبہ فیروز پور میں بھی دو ایک دن گزار آئیں مگر قبل اس کے کہ میں اسے فون کرتا میرے پاس برراج کومل کا فون آگیا۔

کومل نے کہا "یار ایک بہت بری خبر ہے"۔

میں نے کہا "یار کومل! اگر تم مجھے خود میرے اپنے مرنے کی خبر بھی سناؤ تو میں اس بری خبر کو ہنسی خوشی برداشت کرلوں گا"۔

کومل نے کہا "مگر یہ اس سے بھی زیادہ بری خبر ہے۔

دلیپ سنگھ کا ابھی کچھ دیر پہلے انتقال ہوگیا"۔

میں نے کومل کو کوئی جواب نہیں دیا اور فون کا ریسیور رکھ دیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اب تک بھی ایک بری خبر ایسی رہ گئی تھی جسے سننے کا مجھ میں سچ مچ حوصلہ نہیں تھا۔ اس یار طرحدار کی باتیں ہیں تو یاد آتی ہی رہیں گی لیکن پچاس روشنائی میں چھپی ہوئی اس کی باتیں آنے والی نسلوں کو بھی اس کی یاد دلاتی رہیں گی۔

نریندر لوتھر

دلیپ سنگھ کا کچ

میری بیوی کو میرا دہلی جانا اچھا نہیں لگتا۔ ان کا کہنا ہے کہ میں جب بھی دہلی جاتا ہوں اس پر کوئی نہ کوئی مصیبت نازل ہوجاتی ہے۔ ایک بار مسز گاندھی کا قتل ہوگیا تھا۔ دوسری بار ایک حفاظت گرگئی۔ تیسری بار ایک وبا پھوٹ پڑی۔ ایک بار "اسکام" ہوگیا۔ اب اور کیا کیا ہوا آپ میری بیوی یا دہلی سے پوچھیے۔ لیکن غور کرنے کی بات ہے کہ دہلی کی ساری مصیبتیں میرے نام تو نہیں مڑھی جاسکتیں۔ دہلی میں جب نادر شاہ نے قتلِ عام کیا تھا تو میں وہاں نہیں تھا۔ غدر کے بعد مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو اپنی شاعری کی طرف زیادہ توجہ دینے کے لیے سہولتیں مہیا کرنے کے لیے رنگون بھیجا گیا تھا اس وقت میں دہلی سے باہر تھا۔ تقسیمِ ہند کے وقت کے فسادات کے دوران میں کہیں اور قتل کیا جارہا تھا۔

پھر بھی جہاں تک ممکن ہو میں دہلی جانے سے احتراز کرتا ہوں! اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کل وہاں بہت زیادہ شور و غل اور دھواں دھار ٹریفک ہوگئی ہے۔ چھوٹی چھوٹی رشوت پر بڑے بڑے ہنگامے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ہر کالونی کی حصار بندی کردی گئی ہے۔ رات کے دس بجے کے بعد ایک کے سوائے سب گیٹ بند کردیے جاتے ہیں اور اس گیٹ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے باقی کی رات نکل جاتی ہے۔ اس لیے دہلی میں سرِ شام ہی گھر واپس آجانا پڑتا ہے اس صورتِ حال میں دہلی جانے کا کیا مزا ؟!

لیکن دہلی میں میری بیٹی رہتی ہے اس لیے ان تمام نقائص کے باوجود گاہے بگاہے وہاں جانا ہی پڑتا ہے۔ اور پھر دہلی ملک کی راجدھانی ہے۔ اس کی یاترا کبھی کبھی تو کرنی ہی پڑتی ہے کبھی کبھار حکومت بھی طلب کرلیتی ہے۔

اس بار میں تقریباً چھ ماہ کے بعد دہلی گیا۔ ایک ضروری میٹنگ کے لیے۔ حیدرآباد کے مرگ سال کو چھوڑ کر دہلی کی دہکتی ہوئی بھٹی میں جانا پڑا۔

دہلی میں کچھ لوگوں سے فون پہ بات ہوجاتی ہے۔ کچھ لوگ کھانے کے لیے بلا لیتے ہیں اور کچھ یونہی اِدھر اُدھر اتفاقاً مل جاتے ہیں۔ اس طرح دہلی کی حالیہ کیفیت سے آگہی بھی ہوجاتی ہے۔

دلیپ سنگھ ان لوگوں میں سے تھا جو ہمیشہ مجھے کھانے کے لیے مدعو کرتا اس بار جب میں نے فون کیا تو وہ گویا

اچھل پڑا۔" میں نے کل ہی "ٹائمز آف انڈیا" میں آپ کا مضمون پڑھا۔ بہت پسند آیا۔ آپ کو خط لکھنے ہی والا تھا کہ آپ کا فون آگیا۔" میں نے کہا "چلو آپ کا ڈاک کا خرچ بچ گیا۔"

پھر اس نے پوچھا "میں آپ کو لکھ کر یہ بھی پوچھنے والا تھا کہ آپ نے اردو میں لکھنا کیوں چھوڑ دیا۔"

میں نے کہا "یہ میدان میں نے آپ لوگوں کے لیے چھوڑ دیا ہے۔"

دلیپ سنگھ نے کہا "اردو کا دامن چھوڑنے کی نہیں سنبھالنے کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "وہ ذمہ داری بھی آپ کو سونپی۔"

پھر اس نے کہا "کل لنچ میرے ساتھ کھائیے۔ اگر آپ فری ہوں تو میں ۱۲/۳۰ بجے پریس کلب آف انڈیا کے گیٹ پر آپ کا انتظار کروں گا۔ اس کے بعد ذرا رش ہو جاتا ہے۔"

بارہ بجے میری ایک میٹنگ شاستری بھون میں تھی۔ پریس کلب شاستری بھون کے سامنے ہی ہے۔ میں دس منٹ دیر سے پہنچا۔ گیٹ پر کوئی نہیں تھا۔ دلیپ سنگھ کی پہچان ان کی پرانی فیاٹ کار سے بھی ہوتی ہے۔ پارکنگ میں دیکھا تو کوئی دیسی کار نظر نہیں آئی۔ میں کلب کے اندر چلا گیا۔ کافی دیر اکیلے بیٹھا رہا۔ پاس ہی ایک سردار جی بیئر پی رہے تھے میں نے ان سے پوچھا "آپ نے سردار دلیپ سنگھ کو کہیں دیکھا ہے؟"

"کئی بار۔" انھوں نے جواب دیا۔ "ہم ایک ہی برادری کے ہیں۔"

"میں آج کی بات کر رہا ہوں۔"

"نہیں آج تو نہیں دیکھا۔"

"اس نے مجھے لنچ پر بلایا تھا۔"

"پھر تو اسے یہاں ہونا چاہیے تھا۔ بلکہ گیٹ پر ہونا چاہیے تھا۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ میں انتظار کرتا ہوں۔"

انہوں نے مجھے دیکھ کر کہا "آپ کو لنچ ہی کھانا تھا نا۔ چلئے میرے ساتھ کھائیے۔ وہ آئے گا تو شرمندہ ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ مسکرا پڑے۔

میں نے کہا "میں اسے شرمندہ نہیں کرنا چاہتا۔ ضرور کوئی خاص وجہ ہوگی جو اسے دیر ہو گئی ہے۔ ورنہ وہ وقت کا بڑا پابند ہے۔"

تھوڑی دیر اور انتظار کرنے کے بعد میں نے اس کے گھر فون کیا۔ فون engaged تھا۔ یا پھر خراب ہوگا۔ دہلی میں عموماً فون انہیں دو حالتوں میں پائے جاتے ہیں۔ آخر ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد میں گھر واپس چلا گیا۔ اس دن میری بیوی کا فون بھی اچانک خراب ہو گیا تھا۔ اس لیے میں گھر سے بھی فون نہ کر سکا۔ مجھے جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر پروفیسر (حمید الدین؟) کو بھی پوچھنا تھا کہ ایک دن پہلے وہ کیوں مجھے پک اپ کرنے والے تھے اور آئے نہیں تھے (بعد میں پتہ چلا کہ انھوں نے گھر کا نمبر غلط نوٹ کیا تھا اور بے چارے کافی دیر تک بھٹک کے چلے گئے)۔

اگلی صبح فون اچانک ٹھیک ہو گیا۔ ایسی بات دہلی میں بہت کم ہوتی ہے۔ فون خراب اچانک ہو جاتے ہیں لیکن ٹھیک ہونے میں کئی دن لگ جاتے ہیں۔ میں نے سب سے پہلے دلیپ سنگھ کا نمبر ملایا تاکہ اس سے کل کے لنچ کی رد لینے کی

[illegible]

فون سے ایک مردانہ آواز آئی۔ "ہیلو"
میں نے پوچھا "کیا یہ دلیپ سنگھ جی کا نمبر ہے؟"
"جی ہاں"
"کیا میں ان سے بات کرسکتا ہوں؟"
آواز پھر آئی۔ "جی ان کا تو کل دیہانت ہوگیا ہے"۔
میں سکتے میں آگیا۔ "کیسے"؟
"صبح ساڑھے سات بجے ہارٹ اٹیک ہوا اور ساڑھے نو بجے ہسپتال میں وہ پرلوک سدھار گئے"۔

گھر کا پتہ میرے پاس تھا۔ پھر بھی ڈھونڈنے میں کافی وقت ہوئی۔ لنچ کے وقت وہاں پہنچا۔ وہاں ماتم چھایا ہوا تھا۔ دلیپ سنگھ کی بیگم نے مجھے بتایا کہ "انہیں اس بات کا بڑا ملال رہا کہ وہ آپ کو لنچ کے کینسل کرنے کے بارے میں خبر تک نہ کرسکے"۔

اس دن میں نے لنچ نہیں کھایا۔ وہ دلیپ سنگھ کے نام کردیا۔ اس کے علاوہ انسان اور کر ہی کیا سکتا ہے؟

دلیپ سنگھ سے میری پہلی ملاقات غالباً مجتبیٰ حسین کی وساطت سے ہوئی تھی۔ غالباً نہیں بلکہ یقیناً کیوں کہ مجتبیٰ ہی لوگوں کو ملاتا رہتا ہے غالباً ۱۹۸۰ء کی بات ہے جب ان دنوں دہلی میں ہی پوسٹڈ تھا۔ دلیپ سنگھ ویانا سے واپس آیا تھا۔ مجتبیٰ حسین نے تعارف کروایا۔ فارن سروس میں ہیں لیکن اردو سے بڑی محبت ہے۔ ہماری کچھ سرسری بات ہوئی اور اس طرح ایک نیا دروازہ کھل گیا۔ اس کے بعد گاہے بگاہے ملاقات بھی ہوتی رہی۔

دلیپ سنگھ غالباً ۱۹۸۵ء میں پہلی بار حیدرآباد آیا۔ زندہ دلان کے سالانہ ادبی اجلاس اور محفل لطیفہ میں نہایت کامیاب رہا۔ اس کے بعد ہر سال باقاعدہ اسے بلایا جاتا اور ہر سال اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہا۔ پھر اسے ہر طرف سے دعوتیں آنا شروع ہوگئیں۔

وزارت خارجہ کا نیا جریدہ INDIA PERSPECTIVES دلیپ سنگھ نے ہی شروع کیا تھا۔ ایڈیٹر کی حیثیت سے اسے EXTENSION بھی ملی۔ اس وقت کے وزیر اعظم نرسمہا راؤ صاحب کو بیرونی ممالک سے جو بھی خطوط اس جریدہ کے متعلق آتے دکھائے جاتے۔ خط لکھنے والوں میں سے چند غیر ملکی لوگوں کو وزیر اعظم خود خط لکھتے اور چند کو ہندوستان مدعو بھی کرتے اور چائے پر بلاتے۔ ایک بار دلیپ سنگھ نے انگریزی میں ایک "ہلکا" آرٹیکل لکھا اور شکایت کی کہ وہ ان کو خط لکھنے والوں کو تو بلاتے ہیں لیکن انہیں کبھی چائے کا ایک پیالہ بھی آفر نہیں کیا۔

دوسرے دن وزارت خارجہ سے فون آیا کہ کل آپ وزیر اعظم کے لنچ پر آئیں جو وہ ایک مشرقی یورپ کے کسی ملک کے وزیر اعظم کو دے رہے ہیں۔ دلیپ سنگھ نے جواب دیا "جی میں آؤں گا تو ٹیکسی ہوگی۔ اگر آپ مجھے لے جائیں تو آجاؤں گا"۔ اگلے دن پولیس کی ایک کار ان کے گھر کے سامنے پہنچ گئی اور دلیپ سنگھ سوٹ پہن کر اس میں سوار ہوگئے۔

پارٹی میں پہنچے تو وزیر اعظم ان کی طرف بڑھے ان سے ہاتھ ملایا اور کہا "اب تو آپ کا گلہ دور ہوگیا ہوگا"؟ دلیپ سنگھ نے جواب دیا "جناب میں نے تو چائے مانگی تھی اور آپ نے کھانا کھلا دیا"۔ اس پر وہ دونوں ہنس پڑے۔ دلیپ سنگھ کے ساتھ

وزیر اعظم کو اس طرح بات کرتے دیکھ کر سب بڑے بڑے لوگ دلیپ سنگھ کی طرف متوجہ ہوگئے۔ دلیپ سنگھ دلی کے سرکاری کلچر کا یہ قصہ بڑے مزے سے سنایا کرتا تھا۔

وہ ہر قصہ بڑے مزے سے سنایا کرتا تھا۔ اس کے لطیفے عام لطیفوں سے ہٹ کر عموماً گاؤں کی زندگی یا آپ بیتی پر مبنی ہوتے۔ اس کا انداز بیان انتہائی سیدھا اور سادہ تھا اور اس لیے لوگوں کو بہت متاثر کرتا۔ بات بھی وہ دو ٹوک کرتا۔ اگر کوئی اس سے لکھنے کی فرمائش کرتا تو بغیر ہچکچاہٹ کے پوچھتا معاوضہ کیا ہوگا۔ اگر معاوضہ مناسب نہ لگتا یا کوئی ادب کی خدمت کی بات کرتا تو اسے کہتا کہ اگر ادب کا معیار بڑھانا ہے تو اس کی قیمت ادا کرنا سیکھیے۔ وہ برنارڈ شا کے عقیدہ میں یقین رکھتا کہ صرف بے وقوف لوگ ہی بغیر معاوضے کے لکھتے ہیں۔

دلیپ سنگھ نے دوردرشن کے لیے کچھ سیریل بھی لکھے اور دوسروں کو بھی تلقین کرتا رہتا کہ آپ بھی لکھیے۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ ان لوگوں کو اپنی قیمت لگانا نہیں آتا۔ اس کی رائے تھی کہ یہ لوگ مل کر سیریل تیار کر سکتے ہیں۔

دلیپ سنگھ انگریزی میں بھی بڑا اچھا لکھتا۔ اس وقت وہ فائنانس سروس کا افسر لگتا۔ اردو میں وہ پنجاب کا سکھ لگتا۔ وہ ہر صحبت میں کھلتا۔ بحیثیت انگریزی سے بحیثیت پنجابی کے ماحول میں وہ بڑی آسانی سے گھل مل جاتا۔ مجھے اس کی اردو تحریروں میں پنجاب کے دیہات کی زندگی اور وہاں کے رسم و رواجوں کی مستند چھاپ ویسے ہی لگتی ہے جیسی مسیح انجم کی تحریروں میں حیدرآباد کے مضافات اور دکنی کلچر کی۔

وہ ایوارڈوں کے بارے میں اکثر مذاق کیا کرتا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اردو میں ایوارڈ حاصل کرنے کی کوشش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں آخر اردو میں اور خاص طور پر طنز و مزاح میں لکھنے والے ہیں ہی کتنے؟ انھیں چاہیئے کہ وہ آرام سے لکھتے رہیں۔ ایوارڈ دینے والوں کو ایوارڈ تو دینا ہی ہے۔ ایک نہ ایک دن ان کی باری بھی آجائے گی اور ممکن ہے شاید دوسری باری بھی آجائے۔ وہ ساہتیہ اکیڈیمی کے ایوارڈوں کے لیے ادیبوں کی "چوہوں کی دوڑ" کے قصے بڑے مزے سے سنایا کرتا۔ اس کی ہر بات سے لطافت اور مزاح ٹپکتا۔

کچھ عرصہ سے دلیپ سنگھ دو اردو اخباروں کے لیے کالم بھی لکھ رہا تھا۔ مضامین اور سیریل سے اس کی آمدنی خاصی تھی۔ اور اس نے کبھی مہنگائی وغیرہ کی شکایت نہیں کی۔ اس کی زندگی مست ملنگ کی تھی۔ میرے لیے اس کا وہ چہرہ بھلانا مشکل ہوگا۔

اب اس صدمہ کے بعد سوچتا ہوں کہ میری بیوی کی بات صحیح تھی۔ میں جب بھی دہلی جاتا ہوں کچھ نہ کچھ انہونی بات ہوجاتی ہے۔ اس بار تو میرا ذاتی نقصان ہوا۔ طنز و مزاح کا نقصان ہوا اور حیدرآباد کے زندہ دلان جنھوں نے دلیپ سنگھ کو حیدرآباد کا آنریری شہری بنا دیا تھا، ان کا نقصان ہوا۔ اور یہ نقصان واقعی ناقابل تلافی ہے۔ اب ہمارے عزیزوں میں سے ایک اور لالہ و گل میں نمایاں ہوگا۔ زندگی کے ایسے سانحوں سے ہی پتہ چلتا ہے کہ میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔

نور جہاں ثروت

ایک تہذیبی سانحہ

دلیپ سنگھ کل تک ہمارے ساتھ تھے، ہمارے درمیان تھے۔ ہر ملاقات کے بعد کسی نئی ملاقات کی خواہش اور خوشی ہمارے ساتھ رہتی تھی۔ اس کی وجہ صرف اور صرف ان کی شخصیت اور ان کا تہذیبی شعور تھا۔ مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے تھے، لہجے میں نرمی اور ایک گونہ نغمگی تھی۔ چھوٹے چھوٹے جملے بولتے تھے جن میں کھلاپن اور ایک طرح کا والہانہ انداز ہوتا تھا۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے کی بات ہے، ۳۱ر جولائی کو جب اردو اکادمی کا ایوارڈ فنکشن ہوا تھا، وہ خود آگے بڑھے، شاباشی دی، خوشی کا اظہار کیا اور کہا "بہت دن جیو، اور اسی طرح بہت سی کتابیں لکھو، یونہی ایوارڈ ملیں اور تمہاری شناخت بڑھتی جائے" کانوں میں ابھی تک یہ الفاظ گونج رہے ہیں اور جیسے ہوا میں تحلیل نہیں ہوئے لیکن وہ ہم سے دُور بہت دُور جا چکے ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ اب دلیپ سنگھ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔

تعزیت کے لیے ان کے گھر گئی تو ان کی غیر شادی شدہ لڑکی جلین نے ان کے بہت سارے فوٹو میرے سامنے رکھ دیئے ایک ہی چہرہ بہت سے چہروں میں نظر آیا اور ان کے لمحات زندگی کی تصویریں آنکھوں میں پھرنے لگیں۔ اب وہ فلاں جگہ ہیں، فلاں کے ساتھ ہیں، اس سے ہاتھ ملا رہے ہیں، اس کو رخصت کر رہے ہیں، یہاں تنہا بیٹھے ہیں اور وہاں بہت سے لوگوں کے ساتھ ہیں۔

وقت کو ایک لمحہ کے لیے ہم ٹھہرا نہیں سکتے۔ دل کی دھڑکن ٹھہر جاتی ہے، گھڑی کی سوئی رک جاتی ہے مگر وقت نہیں رکتا۔ اور اسی لیے جب دلیپ سنگھ کے جانے کا وقت آیا تو ایک لمحے کی بھی تقدیم و تاخیر نہیں ہوئی! انھوں نے آنکھیں بند کیں اور کسی دوسرے عالم میں چلے گئے جہاں پہنچ کر ہر روح اور ہر وجود ایک لافانی حقیقت کا حصّہ بن جاتا ہے۔ مسکراہٹ کا تصوّر خوشبو کی طرح پراسرار بھی ہوتا ہے اور پرکشش بھی۔ دلیپ سنگھ کی شخصیت میں یہی خوبی تھی۔ وہ لکھتے تھے...... لکھتے رہے۔ "دیدۂ حیراں" نے تماشا کیا، اور اب ان کے دیدۂ حیراں کی "تماشا بینی" بھی ختم ہوئی۔

ان کے بارے میں سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ انہوں نے دنیا سے اپنے رشتے کتنی جلدی توڑ لیے اور یہ کون کہے کہ وہ رشتے توڑ کر گئے ہیں یا جوڑ کر، ان کے لیے اردو کے ہر ادارے میں تعزیتی جلسے ہوئے وہ بھی اس طرح کہ کسی کو اطلاع ہو سکی، کسی کو نہ ہو سکی۔ اب ان کا ذکر چھڑتا ہے تو وہ لوگ جو ان سے ملے تھے کہا ہے ایک آدھ بار ہی کیا ملے ہوں وہ ان کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جیسے دلیپ سنگھ سے ان کی دیرینہ ملاقات ہو اور تب اس حقیقت کے معنی سمجھ میں آتے ہیں۔

یہ ایک جشن غم تھا کیسے بیتا ہے۔

شخص اور شخصیت میں اکثر بہت فاصلہ ہوتا ہے دو کناروں جیسا فاصلہ ...... لیکن دلیپ سنگھ کے یہاں شخص اور شخصیت کو الگ کر کے دیکھنا مشکل تھا، وہ ایک لمحہ میں جو کچھ ہوتے تھے وہی ایک لمحہ آبی دائروں کی طرح پھیلتا رہتا تھا۔ جب ہم دوسروں کے تاثرات ان کے بارے میں سنتے یا صفحۂ قرطاس پر مرتسم دیکھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں ان کی شخصیت سے متعلق ہمارے اہلِ علم اور ارباب ادب کے تاثرات کیا ہیں اور کیا رہے ہیں:

جوگیندر پال نے دلیپ سنگھ کی شخصیت اور ان کی طرزِ نگارش پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

"۷ اگست کی رات کو دیر تک فون پر ان سے بات ہوئی۔ چمن لال چمن بلونت کارگی کو لندن بلانا چاہتے تھے ایک کانفرنس میں، مگر ان کا فون نہیں مل رہا تھا۔ میں نے دلیپ سنگھ کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ معلوم کرکے بتائے۔ مگر جب معلوم نہ ہو سکا تو دلیپ سنگھ نے کہا کہ مجھے ہی بھیج دو، وہاں تو انگریزی میں بولنا ہوگا چنانچہ میں نے چمن سے کہہ دیا اس رات اسی سلسلے میں لمبی بات چیت ہوئی۔ دلیپ سنگھ نے ایک کام شروع کیا تھا پنجابی کہانیوں کو اردو میں لکھنے کا۔ بہت اچھی کہانیاں لکھیں اس نے۔ اس کی کہانیوں سے معلوم ہوتا تھا کہ پنجاب کے پانچوں دریا اردو ادب کی نئی جہت کو سیراب کریں گے۔

مزاح کا معاملہ یہ ہے کہ لوگ مزاح لکھتے ہیں، لگتا ہے گدگدی کر رہے ہیں۔ بات کو پوری طرح اس کے سیاق سے جوڑ کر پیش نہیں کرتے۔ اردو میں ایسے مزاح کی ضرورت ہے جس کی بنا دلیپ سنگھ نے ڈالی۔ یہ ادا اچھی پطرس بخاری کے ہاں نظر آتی ہے۔ دلیپ سنگھ بات کو پوری طرح اس کے سیاق سے جوڑ کر پیش کرتے تھے، جی کھول کر ہنستے تھے مجھے خاص طور سے اس کی ارضیت پسند تھی وہ زندگی کو پوری طرح چکھنا چاہتا تھا اور لکھنے میں بھی تمام ذائقہ بھر دینا چاہتا تھا۔ بات کو بغیر کسی آرائش کے بے دھڑک کہہ دینا اس کی فطرت تھی۔ اردو اکادمی کی میٹنگوں میں بھی اس کا یہی رویہ ہوتا تھا آرٹسٹ کے پاس جرأت ہوتی ہے اور وہ اس میں تھی۔ وہ خوف زدہ ہو کر بات نہیں کرتا تھا۔ اس کی بے ساختگی لوگوں کو پسند آتی تھی، متاثر کرتی تھی۔ وہ بہت تیز قدم تھا۔ جس تیزی سے وہ میدان میں آیا اس سے ڈر لگتا تھا کہ کہیں تھک نہ جائے جو خاکے میں نے دیکھے ان میں بہت سادگی ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اسٹار بن کر نکلتا تھا، خواہ وہ ناروے میں پڑھے یا دلی یا کسی اور شہر میں۔ صاف گوئی اور حق پرستی اس میں بے حد تھی اور ہر دلعزیزی کے معیار پر وہ پورا اترتا تھا۔

"انڈیا پراسپکٹ" میں جب وہ اڈیٹر تھا تو اردو والوں کو ڈھونڈتا تھا اور پوری مالی امداد کرتا تھا، نذرانہ بہت عاجزی سے پیش کرتا تھا۔ جس طرح کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ میں یہ بات تھی کہ جو ان سے ملتا تھا اسے لگتا تھا کہ ان کی پوری توجہ اسی پر ہے اور وہ گہرائی سے اسے جانتے ہیں، یہی بات دلیپ سنگھ میں بھی تھی۔ ایلورہ میں گوتم بدھ کا ایک مجسمہ ہے جسے اس طرح تراشا گیا ہے کہ اگر بیس آدمی ایک ساتھ اسے دیکھیں تو سب کو لگتا ہے وہ اسی طرف دیکھ رہا ہے۔ زندگی کرنے کا یہ گر دلیپ سنگھ نے پا لیا تھا۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے ان کی ادبی شخصیت کا ایک خصوصی پہلو مزاح نگاری کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"لطیفوں، چٹکلوں اور بے ساختہ پر مزاح جملوں سے ہنسانے والا دلیپ سنگھ سب دوستوں کو رلا کر اچانک چلا گیا۔ دلیپ سنگھ کے کالم ہوں یا مزاحیہ مضامین، وہ ابتداء ہی میں اپنے قاری کو پوری گرفت میں لے لیتا تھا اور [illegible]

کے ناہموار بے ہنگم حالات کا رخ ایسے زاویوں سے دکھاتا تھا، ایسا شگفتہ ماحول پیدا کرتا تھا کہ قاری دل ہی دل میں مسکراتا اور داد دیتا۔

یوں تو انہوں نے سیریل بھی لکھے اور سفرنامے بھی لیکن ان کا اصل جوہر اصل مقام ظرافت ہی ٹھہری۔ اس میں طنز اگر ہوتا بھی تھا تو مزاح کی نرم میٹھی کوٹنگ میں۔ تلخی، زہرخند اور نشتر زنی ان کے مزاحیوں میں کہیں نظر نہیں آتی۔ دلیپ سنگھ نے چند سال پہلے ہی اپنے اس جوہر کو تلاش کیا تھا لیکن دیکھتے دیکھتے صفِ اول کے مزاح نگاروں میں اس نے جگہ بنالی اور سب کو متوجہ کرلیا لیکن جیسے ایک سورج پوری آب و تاب سے نکلا ہی تھا کہ گہنا گیا۔"

پروفیسر شمیم حنفی نے ان کی مزاح نگاری کی طرف بہت خوبصورتی سے اشارے کیے لیکن اہم بات یہ کہی کہ ان کی سنجیدہ تحریر اپنی شگفتگی کے امتیاز سے بھی ایک ایسی تحریر تھی جو آتی ہی دلچسپی سے پڑھی جاتی جتنی وہ لطیف مزاح کے ساتھ پڑھی جاتی رہی۔ یہ ایک ایسا ناقدانہ نکتہ ہے جس تک ان کے قارئین کی رسائی ضروری ہے۔ ان کا کہنا ہے:

دلیپ سنگھ کے انتقال کی خبر اچانک ملی۔ یقین نہیں آتا کہ کچھ ہی دن پہلے جب ان سے ملاقات ہوئی تھی وہ زندگی سے بھرپور اور مسرور دکھائی دیتے تھے۔ ایک اعتدال کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہوگی۔ دلیپ سنگھ کے اٹھ جانے کا افسوس محض اس لیے نہیں کہ وہ ایک پرانے دوست تھے! افسوس اس لیے بھی ہے کہ اس زمانے میں جب پریشان اور افسردہ رہنے کے بہانے، خوش رہنے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں تو ایک ایسا شخص جو زندگی کی بوالعجبی اور بے ڈھنگے پن پر ہنسنے کا حوصلہ رکھتا تھا، اس کا چلا جانا ایک تہذیبی سانحہ بھی ہے۔ مجھے تو کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے زمانے میں جو شخص مزاح کا راستہ اختیار کرتا ہے وہ شاید ہمارے زمانے کے غموں کا زیادہ شعور رکھتا ہے۔

دلیپ سنگھ ایک فطری مزاح نگار تھے۔ ایک نیچرل رائٹر۔ اپنے یا دوسرے کے معمولی سے تجربے کو بہت شگفتہ انداز میں بیان کرنے کا سلیقہ رکھتے تھے۔ ان کے ہاں کبھی آورد کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی تھی۔ میں نے ان کی ایک آدھ سنجیدہ کہانی پڑھ کر ایک بار یہ کہا تھا کہ اگر آپ مزاح کا لبادہ اپنے اوپر نہ چڑھائیں تب بھی اتنے پڑھے جانے کے قابل ادیب کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ لیکن دلیپ سنگھ کو زیادہ دلچسپی اس بات سے تھی کہ وہ پڑھنے والوں کے بڑے سے بڑے حلقے تک پہنچ سکیں۔ ایک بار انھوں نے لکھا تھا کہ میں چاہتا ہوں میرے کالم بھی اسی طرح پڑھے جائیں جس طرح ملک کے بہت سے مقبول انگریزی کالمنسٹ کے پڑھے جاتے ہیں۔ انگریزی میں انہوں نے بہت اچھے مڈلس لکھے جو ہمارے مقبول قومی روزناموں میں شائع ہوئے۔ بہت رواں دواں تحریر ان کی انگریزی میں بھی ہوتی تھی اور اردو میں بھی۔ دلیپ سنگھ اپنے ایک اور کارنامے کے لیے بھی یاد رکھے جائیں گے وہ ہے ان کی ادارت میں شائع ہونے والا انگریزی رسالہ 'انڈیا پراسپکٹ' جسے اردو میں بھی وہ ہندوستانی تناظر کے نام سے نکالتے رہے۔

بڑا سلیقہ تھا اس شخص میں زندگی گزارنے کا . . . . اور خوب لکھنے کا۔ اور واقعی ان کے چلے جانے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب انسان پر یا یوں کہنا چاہیے کہ زندہ رہنے کی جدوجہد پر بہت بھروسہ نہیں کر سکتا۔"

پروفیسر شارب ردولوی نے اس نقطہ نظر کو وسعت دیتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا:

دلیپ سنگھ کے انتقال کا سانحہ اردو والوں کے لیے بہت تکلیف دہ سانحہ ہے۔ دلیپ سنگھ ایک بہت اچھے

انسان، بہت اچھے دوست اور بہت اچھے مزاح نگار تھے۔ انھوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں اردو مزاح نگاری میں اپنی جگہ بنالی جو اب ان کے بعد ہمیشہ خالی رہے گی۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ زیادہ لکھنے والا، خراب لکھتا ہے۔ دلیپ سنگھ نے ادھر بہت لکھا، ایسا لگتا تھا کہ جیسے انہیں سب کچھ کہہ دینے کی جلدی ہے لیکن اس کے باوجود جو کچھ لکھا خواہ وہ اخبار کے کالم ہوں، خاکے ہوں، سفرنامے ہوں، یا مضامین ہوں، ہر ایک میں ان کا انفرادی رنگ نمایاں ہے۔ جن لوگوں نے دلیپ سنگھ کو دیکھا ہے یا ملے ہیں وہ ہمیشہ ان کی جدائی کی کسک محسوس کرتے رہیں گے۔"

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے بھی دلیپ سنگھ کی اسی خوبی کا ذکر جمیل کیا اور اس طرف اشارہ بھی کہ شخصیت ہی اسلوب ہے۔

چند برسوں میں جو طنز نگار اور مزاح نگار نمایاں ہوئے ہیں، دلیپ سنگھ ان میں ایک خصوصی امتیاز رکھتے ہیں۔ انہیں نثر لکھنے کا بڑا اچھا سلیقہ تھا جو آج کل ہمارے مصنفوں میں کم پایا جاتا ہے۔ ان کی عبارت، بڑی فطری، شگفتہ اور رواں دواں تھی۔ وہ اپنی تحریروں میں مصنوعی حربہ استعمال نہیں کرتے تھے۔ نہ مزاح پیدا کرنے کے لیے نہ نثر کو خوبصورت بنانے کے لیے۔ عبارت کا حسن اور مزاح کا لطف خود بخود ان کے فقروں سے فطری طور پر ابھرتا تھا۔ ہم اردو والوں کو بہت صدمہ ہے کہ ایک بہت اچھا ادیب جس سے ہماری بڑی توقعات تھیں، اچانک ہماری نظروں سے غائب ہو گیا، مگر اس کی تحریریں، اس عہد کے طنز و مزاح کے سرمایہ کا قیمتی حصہ ہیں اور رہیں گی۔"

ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"دلیپ سنگھ ہمارے صفِ اول کے مزاح نگاروں میں تھے۔ ان کے بارے میں سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ پچاس سال کی عمر تک ان میں مزاح نگار ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے، ہاں ان کی شگفتہ گفتگو اور دلچسپ لطیفوں سے یہ اندازہ ضرور ہوتا تھا کہ وہ محفلوں کے آدمی ہیں، مگر جب انہوں نے کچھ مزاحیہ مضامین لکھے تو اردو کے سنجیدہ قاری چونک گئے کیونکہ ان مضامین میں وہ تمام باتیں موجود تھیں جو ان کے اعلیٰ درجے کے مزاح نگار ہونے کا ثبوت تھیں۔

دلیپ سنگھ نے آخری عمر میں لکھنا شروع کیا اور مختلف اصنافِ ادب میں کامیاب طبع آزمائی کی۔ ان کے ٹی وی سیریل اور ڈرامے بہت مقبول ہوئے۔ ان کے مزاحیہ مضامین کے مجموعوں کو اہلِ ذوق نے آنکھوں سے لگایا۔ یہ فقرہ بہت رسمی ہوتا ہے کہ فلاں کے اٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ اب کبھی پُر نہیں ہوگا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دلیپ سنگھ پر یہ بات پوری طرح صادق آتی ہے۔ اب اردو میں دلیپ سنگھ جیسا مزاح نگار پیدا نہیں ہوگا۔"

انور عظیم نے دلیپ سنگھ کے حوالے سے کہا:

"میری آخری ملاقات دلیپ سنگھ سے پریس کلب میں ہوئی تھی۔ دوستوں میں دلیپ سنگھ اور اوتار سنگھ جج خود بھی لوٹن کبوتر بن گئے اور دو سروں کو بھی لوٹن کبوتر بناتے رہے۔ دونوں سے میرے بہت پرانے مراسم تھے اور اب خیال آرہا ہے کہ میں پھر پریس کلب کیوں نہیں گیا؟ مگر یہ ایک فضول سا سوال ہے۔ اصل حوالہ یہ ہے کہ میں دلیپ سنگھ سے کترایا کرتا تھا۔ جب سے میں ان کے سامنے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا تھا۔ وہ ہندوستانی تہذیب، تاریخ، اخلاقیات ہر پہلو کا تعلق اتنی نفاست سے چھاپتے تھے کہ یقین نہیں آتا تھا کہ وہ قہقہے بھی لگاتے ہوں گے۔ وہ کرسیِ عدالت پر بیٹھ کا کردار

پوری کرچکے تھے۔ ان سے ملاقات ادھر ادھر کی ادبی باتیں ہوتی رہیں، پھر ایک دم بولے، "انور عظیم، میں چاہتا ہوں کہ اس GLOSSY PAPER پر آپ کا نام بھی چھپے، اس سے پہلے کہ میں یہاں سے رفوچکر ہو جاؤں۔" PIO میں یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ سوچا، بار کر پہلی فرصت میں مضمون لکھوں گا، "اپنے عزیز دوست، دلیپ سنگھ کے لیے"۔ اس کے بعد جب بھی ملے آنکھوں میں چمک پیدا کر کے کہتے "مضمون کا شکریہ۔ بہت اچھا لکھا ہے۔" وہ فاتح اور میں مفتوح اور سب قہقہہ زن۔ لیکن ایک دن قہقہہ بجھ گیا ہے اور مجھے شرمسار چھوڑ گیا ہے۔ بعض مرتبہ مذاق کتنا خطرناک ہو سکتا ہے! "اگر میں رفوچکر ہو گیا ہوں تو پھر ہاتھ نہیں آؤں گا اور تم اپنے کالم لکھتے رہ جاؤ گے ..." ہزاروں اور باتیں ہیں جو یاد آرہی ہیں لیکن سب گچھوں میں بند ہیں جو دلیپ سنگھ کی موت کی طرح سربہ لب ہیں!

مجتبیٰ حسین نے اپنے مخصوص لہجہ میں دلیپ سنگھ کے فن پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی:

"وہ ایک باغ و بہار آدمی تھا۔ کسی محفل میں چلا جاتا اور اپنی لطیف و گل مزاج باتوں سے لوگوں کا دل جیت لیتا، چھوٹی چھوٹی اور غیر اہم باتوں میں بھی وہ مزاح کی گنجائش نکال لیتا تھا۔ اسے چونکہ یہ احساس تھا کہ اس نے مزاح نگاری دیر سے شروع کی ہے اس لیے وہ بے پناہ لکھنے لگا اور دس بارہ برس کے عرصہ میں اس نے مزاح نگاری کے سب ہی گوشوں اور امکانات کو آزمایا اور کامیاب رہا۔ اس نے بعض دوستوں کے دلچسپ خاکے بھی لکھے۔ اپنے مزاحیہ مضامین میں وہ بے تکلف فضا پیدا کر کے، زندگی کے روزمرہ کے مسائل اور واقعات کو کسی تصنع اور بناوٹ کے بغیر پوری خوش دلی کے ساتھ بیان کرنے کا ہنر جانتا تھا۔ ایک سچا پنجابی جس طرح بے باک بے لاگ اور بے لوث قہقہہ لگاتا ہے اس کی گونج اس کے مزاحیہ مضامین میں صاف سنائی دیتی تھی۔ ایسے دوست کا اچانک بچھڑ جانا ایک ایسا خلا ہے جسے پُر نہیں کیا جا سکتا۔"

رفعت سروش نے ان کے ادبی شعور کے مختلف عناصر اور ان جہتوں کا ذکر کیا جو ان کی زندگی اور ان کے لسانی دائرے سے وابستہ رہیں:

"دلیپ سنگھ کی زبان ہمارے دوسرے مزاح نگاروں سے مختلف ہے۔ یہ کوئی شعوری کوشش نہیں تھی، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر نہ اردو بولنے علاقے کے رہنے والے تھے نہ شروع سے اردو میں لکھتے تھے۔ ان کی زبان اور اس کا محاورہ، رشید احمد صدیقی، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین تو کیا فکر تونسوی سے بھی مختلف ہو گیا اور انہوں نے وہ لہجہ اختیار کیا جو ان سے ہی عبارت ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ دلیپ سنگھ کی تحریروں کے وسیلے سے ہمیں ہندوستانی سفارت خانوں کے ماحول کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ چونکہ وہ وزارت خارجہ میں ملازمت کے باعث جگہ جگہ ہندوستانی سفارت خانوں میں رہے اس لیے انہوں نے اپنے طور پر تو اپنی آپ بیتی ہی لکھی ہے لیکن آج وہ تحریریں اردو کے دامن میں موضوع کے اعتبار سے اہم اضافہ کرتی ہیں۔

فنی اعتبار سے وہ چونکہ پنجابی اور اردو، ریڈیائی تحریروں سے ہو کر باقاعدہ ادب کی طرف آئے تھے اس لیے جب ان کے کالم سامنے آئے تو ان کا لہجہ بے ساختہ اور انداز بیان دو ٹوک اور بے باک تھا اور چونکہ سفارتکار مل رہے تھے اس لیے کسی کی دل شکنی نہ کرنا ان کا مزاج بن گیا تھا۔

دلیپ سنگھ اپنی عمر کے آخری دہے میں اردو ادب میں آئے۔ بڑی تیزی سے انہوں نے اپنی جگہ بنائی اور

محفل میں اپنا رنگ جما کر مسکراتے ہوئے خاموشی سے اُٹھ گئے، اور ہم سب کو سوگوار کر گئے۔ میں بھی ان سوگواروں میں ہوں۔"

بیگم ممتاز مرزا نے ان کی تحریروں سے متعلق اپنی دلچسپی اور فکری ہم آہنگی کا اظہار ایک دوسرے زاویے سے کیا "میں دلیپ سنگھ جی کو نزدیک سے تو چار پانچ سال سے ہی جانتی تھی لیکن ان کی تحریریں اکثر میرے غمگین لمحات کو خوشگوار بنانے میں مددگار ثابت ہوتی رہی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ جو ریڈیائی ڈرامے یا فیچر لکھتے تھے ان میں، میں نے اکثر کام کیا اور ان کی تحریروں میں اپنی آواز سے جان ڈالی۔

ادھر جو سفرنامے انہوں نے بیسویں صدی میں لکھے قومی آواز اور انقلاب کے ویکلی کالم گویا اخبار کی جان ہوتے تھے۔ سب سے پہلے میں انہی کو پڑھا کرتی تھی۔ ان کی تحریریں نہایت سادہ زبان میں اور شگفتہ ہوتی تھیں کہ انسان بے اختیار ہنسنے پر مجبور ہو جاتا۔ ان کی جگہ ہمیشہ خالی رہے گی۔ ہم جب ہنسیں گے انہیں یاد کریں گے۔"

ڈاکٹر صغریٰ مہدی نے دلیپ سنگھ کی شخصیت اور ادبی کاموں کا احاطہ کرتے ہوئے پُر اثر انداز میں اظہارِ تعزیت کیا:

"دلیپ سنگھ سے سب سے پہلی ملاقات مکتبہ جامعہ میں ہوئی تھی کیوں کہ طنز و مزاح مجھے بھی پسند ہے اس لیے ان کی فقرہ بازی مجھے بہت پسند آئی۔ پھر میں نے ان کی چیزیں پڑھیں۔ پھر کتابیں۔ اس کے علاوہ ان سے ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں۔ دلیپ سنگھ کی عادت تھی کہ خود باتیں شروع کر دیا کرتے تھے۔ مجھے لوگوں سے ملنے میں جو ایک جھجک اکثر ہوتی ہے ان کے اس انداز سے دور ہو گئی۔ پھر یوں ہوا کہ اس سال فروری میں ہم افسانہ شب افسانہ سیمینار میں ہریانہ اردو اکیڈمی روہتک گئے، جوگندر پال جی بھی ساتھ تھے۔ اس وقت مجھے دلیپ سنگھ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ خواتین کے لیے ان میں ایک تہذیب تھی! وہ نہایت مہذب انسان تھے۔ ان سے ادبی صورتحال پر بھی اکثر گفتگو ہوئی۔ ریاکاری جو آج کا طرۂ امتیاز ہے، ان میں قطعی نہیں تھی۔ سیمینار میں جو کہانی انھوں نے سنائی بہت اچھی تھی اور تب میں نے کہا تھا، میں تو مزاح نگار دلیپ سنگھ کو جانتی تھی، مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اتنی اچھی کہانیاں بھی لکھتے ہیں۔ میں چاہوں گی کہ آپ مزاح نگاری جاری رکھیں لیکن کہانی بھی لکھتے رہیں۔

میں بھی کبھی کبھی طنز و مزاح میں طبع آزمائی کر لیتی ہوں۔ ہوتا یوں ہے کہ اگر آپ کسی کے فیلڈ میں قدم رکھیں تو وہ ناک بھوں چڑھاتا ہے اور آپ کو RECOGNISE کرنے پر تیار نہیں ہوتا لیکن دلیپ سنگھ مختلف تھے۔ وہ میری طنزیہ تحریریں پڑھ کر فون کرتے۔ اپنی رائے کا اظہار کرتے اور بہت خوش ہوتے۔ یہ وصف آج کل ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ میں نے جب ان کے انتقال کی خبر اخبار میں پڑھی تو بے اختیار میرے منہ سے چیخ نکل گئی دیکھنے میں وہ اتنے کم عمر لگتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم ان سے بڑے ہیں۔"

دلیپ سنگھ کے بارے میں یہ تاثرات دراصل ان کے کام پر تنقید اور تبصرے بھی ہیں اور ان کی اہمیت بنیادی ہے کہ اس میں ایسے لوگوں کے بیانات سامنے آئے ہیں جو دلیپ سنگھ سے بھی واقف ہیں اور ان کے فن سے بھی اور ان دونوں کا رشتہ اپنے زمانے اور زندگی سے ملاتے ہیں جس میں دلیپ سنگھ سانس لیتے رہے۔ ■

دلیپ سنگھ

معذرت نامہ

یہ ایک خط کا جواب ہے جو بلیاران دلی کے کسی نسیم صاحب نے لکھا ہے۔ اپنے خط میں نسیم صاحب مجھ پر بہت برسے ہیں، خوب گالیاں دی ہیں۔ ایسی گالیاں جنھیں کھا کر میں بہت بدمزہ ہوا۔ اور باتوں کے علاوہ مجھے انھوں نے گرہ کٹ کا بھائی چور کہا ہے۔ صرف گالیوں پر اکتفا کیا ہوتا تو شاید میں برداشت کر جاتا، لیکن انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر میں کبھی ان کے ہتھے چڑھ گیا تو میری ہڈی پسلی ایک کر دیں گے۔
نسیم صاحب نے اپنے خط میں بڑے بھاری بھرکم الفاظ استعمال کیے ہیں — کچھ اس وزن کے الفاظ جو عبادت بریلوی صاحب اپنے تنقیدی مضامین میں کیا کرتے تھے۔ ان کے وزن دار الفاظ سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پہلوان قسم کے آدمی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ایسے آدمی کے دل میں میرے لیے پرخاش کا خیال رہے اس لیے میں اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لیے خط لکھ رہا ہوں۔
میرا خط پڑھنے سے پہلے نسیم صاحب کی ناراضگی کا پس منظر دیکھ لیجیے۔
کچھ مہینے پہلے مرزا عبدالودود کے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ "گٹھلیوں کے دام" شائع ہوا تھا۔ مرزا اپنی کتاب میرے پاس لائے تھے کہ میں اس پر تبصرہ کر دوں۔ وہ تبصرہ دلی کے رسالہ "گھامڑ" میں شائع ہو گیا۔ نسیم صاحب نے وہ تبصرہ پڑھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ "گٹھلیوں کے دام" مزاحیہ ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔ چنانچہ بیس روپے میں انھوں نے یہ کتاب خرید لی۔ جب کتاب پڑھی تو انھیں احساس ہوا کہ وہ ٹھگ لیے گئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کتاب پڑھ کر انھیں یوں لگا جیسے کسی نے ان کی جیب کاٹ لی ہو۔ جس میں بیس روپے تھے۔ اور چونکہ انھوں نے یہ کتاب میرے تبصرہ کی بنا پر خریدی تھی۔ اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ میں اس جیب کترے کا رشتہ دار ہوں۔
نسیم صاحب آپ کے خط کو پڑھنے سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ کو کتاب پڑھنے کی تمیز تو شاید ہے۔ تبصرہ پڑھنے کی ہرگز نہیں ہے۔ میں نے ہرگز یہ نہیں لکھا کہ یہ کتاب مزاحیہ ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔ میں جانتا ہوں۔ میں نے یہ بھی نہیں لکھا کہ مرزا عبدالودود کی کتاب بالکل واہیات چیز ہے لیکن اگر میں اس طرح لکھتا تو مرزا اسی طرح میرے خون کے پیاسے ہو جاتے جیسے آج آپ ہیں۔ اور ماشاءاللہ ان کی صحت آپ کی صحت سے کسی لحاظ سے کم نہیں۔
آئیے، میں آپ کو تبصرہ پڑھنا سکھا دوں۔ میں نے لکھا تھا کہ،

"مرزا عبدالودود نے بہت ہی قلیل مدت میں مزاح نگاروں کی صف میں اپنی جگہ بنالی ہے۔"

آپ نے سمجھا میں یہ کہہ رہا ہوں کہ مرزا جب مزاح کے میدان میں داخل ہوئے تو وہاں پہلے سے موجود مزاح نگاروں نے اپنی اپنی نشست چھوڑ کر ان کی خدمت میں گزارش کی کہ حضور یہ کرسیاں دراصل آپ ہی کے لائق ہیں۔ تشریف رکھیے۔ نہیں صاحب میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ میں نے تو تبصرے کی زبان میں یہ کہنے کی کوشش کی تھی کہ مرزا نے مزاح نگاروں کی صف میں بالکل ایسے جگہ بنائی ہے جیسے ریل کے ایک بہت ہی بھرے ہوئے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں ایک نیا مسافر اپنی جگہ بناتا ہے۔ یعنی دروازہ بند پاکر پہلے انہوں نے کھڑکی سے بستر اور صندوق پھینکا، پھر اسی رستے خود کود پڑے، بستر کسی کے سر پہ پڑا صندوق نے کسی اور کو زخمی کیا۔ ایک دو مسافر ان کے بوجھ کے نیچے دب گئے۔ ایسا بھونچال آنے پر لوگ خود ہی ادھر ادھر سرک گئے اور اس طرح مرزا نے اپنی جگہ بنالی۔

میں نے لکھا تھا کہ:

مرزا نے ابھی ابھی اس دشت میں قدم رکھا ہے۔ اس دشت کی سیاحی کے لیے تو عمر پڑی ہے۔"

آپ سمجھے میں کہہ رہا ہوں کہ ان کا قدم پڑتے ہی اس دشت میں پھول اُگ آئے ہیں۔ جب وہ پوری عمر اس دشت میں قدم رکھے رہیں گے تو یہ دشت "نشاط باغ" بن جائے گا۔ حضور میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں تو مرزا صاحب کو بڑے پیار سے مشورہ دے رہا تھا کہ بھیا اس دشت کی سیاحی کے لیے عمر پڑی ہے ابھی سے اس میں کیوں کود رہے ہو۔ بیس پچیس سال اور صبر کرو۔ جب کوئی اردو پڑھنے والا نہیں رہے گا تو آپ شوق سے اس دشت کی سیاحی کیا تر تاکہ کوئی آپ کی اس بے راہ روی پر اعتراض نہ کرسکے۔

میں نے لکھا ہے کہ:

"مرزا کا لکھنے کا انداز ریسی (RACY) ہے۔"

آپ نے سمجھ لیا کہ ان کے انداز بیان میں وہی روانی ہے جو ریس کے گھوڑوں میں ہوتی ہے۔ یعنی ایک خوب صورتی ایک ادائے بے نیازی کے ساتھ تیزی سے منزل تک پہنچنے کی آرزو نہیں صاحب میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔ ریسی سے میرا مطلب گھوڑ دوڑ سے ضرور تھا لیکن ان گھوڑوں کی دوڑ سے نہیں جو بمبئی کے مہالکشمی میدان میں دوڑتے ہیں۔ بلکہ ان گھوڑوں سے تھا جو تانگوں کے آگے جتتے ہیں اور جو سڑکوں پر پیدل اور سیکل سوار لوگوں کو روندتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور اگر اڑ جائیں تو ایسے اڑتے ہیں کہ کوچوان کا چابک بھی انہیں اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا۔

میں نے لکھا تھا کہ:

"کتاب کے تمام جملے مصنف کی محنت کے آئینہ دار ہیں۔"

آپ سمجھے میرا مطلب یہ ہے کہ مصنف نے ایک ایک جملے پر وہ محنت کی ہے جو ایک ذہین لڑکا اپنے امتحان کی تیاری میں کرتا ہے تاکہ وہ کلاس میں اول آسکے۔ نہیں صاحب میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ میرا اشارہ اس محنت کی طرف تھا جو ایک مزدور ایک گڑھے میں سے بیل نکالنے کی کوشش میں کرتا ہے۔

یعنی پیٹر بار بار کر اتنے زور سے مارنے کے باوجود کہیں پھوٹ جاتا ہے پٹرول نہیں نکلتا۔

میں نے لکھا تھا کہ:

"مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔"

آپ نے سمجھا کہ یہ کتاب یوں بکے گی جیسے متھرا کے پیڑے یا ناگ پور کے سنگترے یا بمبئی کی بھیل پوری۔ نسیم صاحب! میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ پہلی بات تو آپ یہ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اردو کی کوئی کتاب آج کل ہی ہاتھوں ہاتھ نہیں لی جاتی۔ یہ ہمیشہ ہاتھوں ہاتھ دی جاتی ہے۔ یعنی کتاب کو آپ خود شائع کرتے ہیں اور پھر اسے آپ دوسرے ادیبوں کو ہاتھوں ہاتھ بانٹتے ہیں اور وہ بھی کچھ اس طرح کہ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے یعنی وہ بھی آپ کو اپنی کتابیں اسی طرح پیش کریں۔

جہاں تک مرزا کی کتاب "تتلیوں کے دام" کا تعلق ہے۔ میرا مطلب یہ بھی نہیں تھا۔ جب میں نے لکھا کہ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی تو میرا مطلب تھا کہ پبلشر سے یہ کتاب سیدھے ردی والے لے جائیں گے وہاں سے یہ کتاب حلوائی کے ہاتھ پہنچے گی اور پھر گاہکوں کے پاس جائے گی۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ اتنی سی بات سمجھ کیوں نہیں پائے۔ خیر بیس روپے خرچ کرنے کے بعد تو سمجھ ہی گئے ہوں گے۔

آپ نے لکھا ہے کہ میں نے تبصرے میں مرزا کے مضامین میں سے کچھ ایسے فقرے نقل کیے ہیں جو بہت خوب صورت اور معنی خیز ہیں۔ ان سے آپ کو دھوکہ ہوا کہ شاید ساری کتاب ہی خوب صورت ہوگی۔

ایسے کتنے فقرے میں نے نقل کیے تھے؟ کل چار۔ اور یہ میں ہی جانتا ہوں کہ انھیں کتاب میں سے ڈھونڈنے میں مجھے کتنی ریاضت کرنی پڑی۔ تقریباً پوری رات میں کتاب کو کھنگالتا رہا۔ تب کہیں جا کر یہ فقرے ہاتھ لگے..... ویسے ایک گزارش کردوں کہ ہر مصنف کی کتاب میں سے دو چار جملے تو اچھے نکل ہی آتے ہیں۔ بھائی جان وہ گھڑی جو کئی سال سے بند پڑی ہو وہ بھی دن میں دو بار صحیح وقت بتا سکتی ہے۔

آپ کی شکایت ہے کہ میں نے اپنے تبصرے میں لکھا ہے کہ:

"میں تمام اردو داں حضرات کو اس کتاب کے مطالعے کے لیے پرزور سفارش کروں گا۔"

جی میں نے ضرور لکھا ہے لیکن آپ کو یہ تو دیکھنا چاہیے تھا کہ سفارش کرنے والے کی اپنی حیثیت کیا ہے۔ میں تو دن میں سینکڑوں لوگوں کو سفارشی خط دیتا رہتا ہوں۔ کبھی وزیر نشر و اشاعت کے نام، کبھی وزیر تعلیم کے نام، کبھی شہر کے میئر کے نام کہ اس کو ریڈیو اسٹیشن کا ڈائرکٹر بنا دو۔ اس کو کالج کا پرنسپل بنا دو۔ اس محلے میں پانی کا نل لگوا دو۔ لیکن آج تک میرے سفارشی خط والے لوگوں کو کسی نے سرکاری دفتر کے قریب نہیں گھسنے دیا۔ میری سفارش پر لگے ہوئے نل سے کسی نے پانی نہیں پیا۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آپ نے میری سفارش کیوں مان لی۔

تبصرے کو جلدی ختم کرتے ہوئے میں نے لکھا کہ:

"میں مصنف اور قاری کے درمیان کھڑا نہیں رہنا چاہتا۔"

نسیم صاحب آپ اس کا مطلب سمجھے کہ کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ آپ چاہتے ہیں کہ قاری جلد از جلد اس کا مطالعہ شروع کردے [illegible] میرا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا میں

جانتا تھا کہ جو قاری بھی اس کتاب کو پڑھے گا مصنف کی گردن پر ہاتھ ڈالنا چاہے گا۔ اس لیے میں جلد از جلد راستے سے ہٹ جانا چاہتا تھا۔

اب صرف اتنی سی بات رہ گئی کہ تبصرے اس طرح کیوں لکھے جاتے ہیں کہ آپ جیسا سیدھا سادھا قاری ان کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ تبصرے کا یہی اصول ہے۔ اور یہ اصول میں نے نہیں بنایا۔ ایک عرض اور کردوں کہ جب مرزا صاحب اپنی کتاب میرے پاس تبصرے کے لیے لائے تھے تو ساتھ ہی برفی کا ایک ڈبہ بھی لائے تھے۔ برفی بڑھیا اعلیٰ قسم کی تھی ہوسکتا ہے کہ اس کی خوشبو نے کتاب کے بارے میں میری رائے میں مداخلت کی ہو۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ اچھے جہیز کے ساتھ ایک معمولی لڑکی ایک اچھی دلہن بن جاتی ہے۔ اور ساس سسر کے علاوہ دلہا میاں کو بھی خوب صورت لگنے لگتی ہے۔ تبصرہ نگاری میں اگر مجھ سے کچھ غلطی ہوئی ہے تو محض برفی کی وجہ سے۔

امید ہے اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ تبصرہ کس طرح پڑھا جاتا ہے۔ یقین مانیے بیس روپے میں یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔ پھر بھی اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے تو بندہ معافی کا خواستگار ہے ——

آپ کا خیر اندیش
تبصرہ نگار

دلیپ سنگھ

ایمان کی کہیے

مرزا وحید الدین صاحب سے میری ملاقات ادیبوں کے ایک جلسے میں ہوئی مجھے بتایا گیا کہ وہ بڑے مقبول ادیب ہیں. میں نے پوچھا کہ ادب کی کس صنف سے اُن کا تعلق ہے تو کہنے لگے "میں قصیدہ گو ہوں" یہ سُنتے ہی میری ہنسی چھوٹ گئی. میں نے کہا حضور میرا خیال تھا کہ قصیدہ گوئی کے دن لد گئے ہیں. وہ زمانے گئے جب ایک نواب تخت پر بیٹھ کر اپنے درباری شاعر کو اپنی تعریف کے پُل باندھتے ہوئے دیکھتا تھا اور شرمندہ ہونے کی بجائے اُسے خلعت اور جاگیر انعام میں دیتا تھا. شاعر جتنا بڑا جھوٹ بولتا اتنا ہی بڑا انعام پاتا تھا ایسا نواب جس کی پوری ریاست کا رقبہ چار ایکڑ سے زیادہ نہ تھا، اپنے قصیدہ گو سے یہ سُن کر کہ وہ والیٔ دو جہاں ہے یہ سمجھتا تھا کہ شاعر سچ بول رہا ہے. اب جب بادشاہت ہی نہ رہی تو کیسی قصیدہ گوئی اور کس کی قصیدہ گوئی.

مرزا ہنسے اور کہنے لگے کہ آپ مغالطے میں ہیں. بادشاہت کے زمانے میں لے دے کے کُل دو ایک شخص ہوتے تھے. جن کی شان میں قصیدے کہے جا سکتے تھے۔ ایک بادشاہ سلامت خود اور دوسرے ان کے ولی عہد. ملکۂ معظمہ کا قصیدہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ ان کا صرف حسن ہی تعریف کے لائق ہوتا تھا۔ اور بادشاہ سمجھتا تھا کہ ان کے حسن کا قصیدہ کہنے کا حق صرف اسی کو تھا لیکن آجکل ایسے لوگوں کی بھرمار ہے جو اپنا قصیدہ سُننے کے خواہشمند ہیں. میں نے پوچھا مثلاً؟ کہنے لگے مثلاً وہ جنکے ہاتھوں میں انعامات تقسیم کرنے کی قوت ہے وہ جو آپکو مشاعروں میں بلا سکتے ہیں. وہ جو آپ کی کتابیں چھپوانے کا بندوبست کر سکتے ہیں. وہ جو آپکی کتابیں خریدنے کا حکم صادر کر سکتے ہیں وہ جو آپ کو ایک ایسے ملک میں اپنا کلام سنانے کو بھیج سکتے ہیں جہاں کوئی آپکا شعر تو کیا آپکی زبان بھی نہیں سمجھتا وہ جب آپکے لیے اتنے اہم کام کر سکتے ہیں تو آپ کیا اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ ان کی شان میں ایک عدد قصیدہ ہی لکھ دیں۔

مجھے یکایک احساس ہوا کہ مرزا کی بات میں وزن ہے. تھوڑا سا افسوس بھی ہوا کہ میرا دھیان ادب کی اس فائدہ مند صنف کی طرف کیوں نہیں گیا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ ایسے لوگوں کی شخصیت میں کہاں ایسی صفات ہوتی ہیں، جن پر قصیدے لکھے جا سکیں.

بادشاہت کے دِنوں میں قصیدہ گو شاعر کبھی بادشاہ کو لنگڑاتے ہوئے دیکھ کر یہ کہہ سکتا تھا کہ آپ کی

رگوں میں یقیناً تیمور لنگ کا خون ہے۔ یا جب شاعر نے دیکھا کہ بادشاہ سلامت کی ایک آنکھ کسی حادثہ کا شکار ہو گئی ہے تو قصیدہ گو کہہ دیتا تھا کہ تیری ایک آنکھ میں ہی جلال اس قدر ہے کہ کوئی تیری نگاہ کی تاب نہیں لا سکتا۔ اگر دوسری رہتی تو خدا جانے رعایا پر کیا گزرتی یا جب شاعر کو پتہ چلتا کہ بادشاہ سلامت اپنے سگے بھائی کا مملکت ہڑپ کرنا چاہتے ہیں تو وہ کہہ اٹھتا تھا کہ آپ کا فتوحات کا جذبہ سکندر اعظم کا سا ہے۔ کسی نواب نے اپنی بیوی اور اس کی ایک باندی کے معمولی سے جھگڑے میں فیصلہ باندی کے حق میں دے دیا تو قصیدہ گو کہہ اٹھتا کہ آپ کا انصاف عدل جہانگیری کی یاد دلاتا ہے۔ لیکن ایک سادھارن آدمی کی تعریف میں کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ ایسے آدمی کی قصیدہ گوئی کوئی کیا کرے جسے دیکھ کر خدائے برتر سے شکوہ کرنے کو جی چاہے کہ کچھ لوگوں کی تشکیل میں اس نے غیر ضروری عجلت سے کام لیا ہے۔

میں نے پوچھا "مرزا کیا ہمارے زمانے میں ایسے ممدوحوں کا ملنا ممکن ہے جن پر قصیدہ لکھنے کو جی چاہے۔" کہنے لگے "نہیں ہے"۔ میں نے پوچھا تو پھر آپ اپنے قصیدوں میں کہتے کیا ہیں؟" کہنے لگے "تو گویا آپ میری قصیدہ گوئی کا راز جاننا چاہتے ہیں"۔ میں نے کہا "اگر آپ اس راز کو اپنے ساتھ قبر میں لے کر جانا چاہتے ہوں تو بے شک نہ بتائیے۔" مرزا نے قہقہہ لگایا اور کہا "چلئے صاحب بتائے دیتے ہیں، آپ بھی کیا یاد کریں گے"۔

مرزا نے بتایا "یہ صحیح ہے کہ آج کل کے ممدوح میں اول تو سرے سے کوئی قابلِ ذکر خوبی ہوتی ہی نہیں اور اگر کوئی ایک آدھ ہے بھی تو مرزا کو فرصت نہیں کہ وہ ممدوح کے اندر جھانک کر اسے تلاش کرتے پھریں۔ ان کا طریقۂ کار یہ ہے کہ وہ کوئی بھی من گھڑت خوبی اپنے ممدوح کے ساتھ چسپاں کر دیتے ہیں۔ لیکن کچھ استادی کے ساتھ کہ ممدوح سمجھنے لگتا ہے کہ یہ خوبی اس میں ہے۔ ممدوح کی خوبی اس قدر اہمیت نہیں رکھتی جتنا اسے چسپاں کرنے کا طریقہ۔ ممدوح پھر زندگی بھر اس خوبی کو اپنے ساتھ چسپاں کئے رکھتا ہے۔

ایک ممدوح کے بارے میں انھوں نے لکھ دیا تھا کہ وہ بڑا مہمان نواز ہے جب تک اس کے دسترخوان پر کوئی مہمان نہ ہو وہ کھانا نہیں کھاتا۔ اب کیا تھا ممدوح بے چارہ صبح سویرے گھر سے نکل کر مہمان کی تلاش میں سڑک کے کنارے جا کھڑا ہوتا۔ مہمان ملے تو وہ کھانا کھائے نا۔ دوپہر تک بڑی مشکل سے کوئی مہمان ملتا تھا جسے بہلا پھسلا کر وہ گھر لے آتا تھا۔ ویسے تو بڑی شفقت سے اُسے کھانا کھلاتا تھا، لیکن کھانا اِس کا اس طرح کا ہوتا تھا جس طرح کا عام طور پر بیماروں کو کھلایا جاتا ہے۔ مہمان بھلا ایسا کھانا کیوں کھائے گا۔ اگر دال روٹی ہی کھانی ہے تو پھر اپنے گھر میں کیا برائی ہے۔ چنانچہ ممدوح کو دیکھتے ہی لوگ کھسکنا شروع ہو جاتے تھے۔ مہمانوں کی جب قلت ہونے لگی تو ممدوح قصیدے کی عزت بنائے رکھنے کے لیے خود فاقے کرنے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ مرزا کا قصیدہ ہی اس کی موت کا سبب بنا۔ باوجود انتہائی کوشش کے ہفتہ بھر اسے مہمان نصیب نہ ہوا اور مجبوراً اسے فاقہ کرنا پڑا۔ اور اس طرح جنت کے دروازے اس پر وا ہو گئے۔

مرزا نے کسی ممدوح کے بارے میں لکھ دیا کہ حالانکہ وہ اسّی برس کے ہو گئے ہیں لیکن آج بھی وہ چلتی ریل گاڑی پر اس طرح پھدک کر سوار ہوتے ہیں کہ انھیں دیکھ کر نوجوان شرما جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ممدوح نے کبھی ریل گاڑی پر سفر کیا ہی نہیں تھا۔ اس قصیدے کو سننے کے بعد نہ صرف اُس نے ریل گاڑی پر بغیر مطلب کے سفر کرنا شروع کر دیا۔ بلکہ وطیرہ بنا لیا کہ کھڑی ریل گاڑی پر سوار نہیں ہوں گے پلیٹ فارم پر جا کر گاڑی کے چلنے کا انتظار کرتا اور جب چل

پڑتی تو پھدک کر اس پر سوار ہو جاتا۔ میں نے اس واقعہ کی تصدیق کرنا چاہی لیکن اس میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ مجھے پتہ چلا کہ ممدوح حاتی کا تحکا پر سوار ہونے کے سلسلے میں ایک ایسے سفر پر نکل گیا جہاں سے کوئی واپس نہیں لوٹتا۔

مرزا نے ایک ممدوح کے بارے میں لکھ دیا کہ اس کے خاندان کا سلسلہ حاتم طائی سے ملتا ہے۔ اس تحریر کو پڑھنے کے بعد ممدوح صبح سویرے گھر سے مٹھی بھر آٹا رومال میں باندھ کر چیونٹیوں کے بل تلاش کرنے کے لیے نکل جاتا ہے۔ جہاں کہیں چیونٹیاں نظر آئیں وہ ان کے لیے روزی کا ڈھیر لگا دیتا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ شہر میں چیونٹیوں کی تعداد میں جو قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے اس کا سہرا مرزا کے ممدوح کے سر ہے۔ ممدوح کی اس عادت کا ضمنی نتیجہ یہ نکلا کہ خواتین اسے دیوانہ سمجھنے لگیں اور کوئی اس سے شادی کرنے کو رضامند نہ ہوئی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اس کے سر پر کوئی دوسرا سہرا سجایا نہ جا سکا۔

مرزا کی تقریر سننے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ ممدوح میں خوبیاں تلاش نہیں کرتے بلکہ خوبیوں سے اُسے مزین کرتے ہیں کچھ اس طرح سے کہ ممدوح حیران ہو کر اپنے اوپر لعنت بھیجنا شروع کر دیتا ہے کہ فلاں فلاں خوبی اُسے قدرت نے عطا کر رکھی تھی لیکن اُسی قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ خود ممدوح کو اِن خوبیوں کا احساس نہیں ہونے دیا۔

میرے ایک سوال کے جواب میں مرزا نے بتایا کہ وہ اپنے قصیدے زیادہ تر نثر میں لکھتے ہیں۔ کیونکہ آج کل کے ممدوح کی جملہ خوبیوں کو نظم میں سمیٹنا مشکل ہو گیا ہے اور کوزے میں دریا بند کرنا انہیں کبھی نہ آیا۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ ممدوح کو نثر آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ اگر قصیدہ ممدوح کی سمجھ میں نہ آئے تو پھر کونسا انعام اور کیسا انعام۔

میں نے کہا "مرزا ایک بات بتائیے۔ آپ کا ضمیر کبھی کبھی اس بات کے خلاف پروٹسٹ نہیں کرتا کہ آپ ایک ایسے آدمی کی تعریفوں کے پُل باندھ رہے ہیں جس میں تعریف کے لائق کچھ ہے ہی نہیں؟" کہنے لگے "صاحب یہ تو ایک طرح کا کاروباری کام ہے۔ جب آپ نے سہرا لکھنے کو اپنا پیشہ بنا لیا تو پھر اس بات سے آپ کا کیا سروکار کہ دولہا کی شکل و صورت کیسی ہے اور عمر کتنی ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ضمیر کو بھی اب نوٹ گننا آ گیا ہے۔ اس پر جب چار پانچ ہزار روپوں کا بوجھ پڑتا ہے تو اس کی آواز اگر مکمل طور پر دب نہیں جاتی تو اتنی مدھم ضرور ہو جاتی ہے کہ میرے کانوں تک پہنچ نہیں پاتی۔"

مرزا میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس قیمتی راز سے آگاہ کیا لیکن میں اس سے فائدہ اُٹھانے کا اہل نہیں ہوں کیوں کہ میرا رشتہ تو قاری سے ہے۔ اگر اُسے میری کتاب پسند آئے گی تو وہ اسے خریدے گا۔ اس کا قصیدہ کہنے سے مجھے کچھ فائدہ ہونا ممکن نہیں۔ مرزا کہنے لگے میں نے آپ کو نسخہ بتا دیا ہے اسکو کس طرح استعمال میں لانا ہے یہ تو آپ پر منحصر ہے ۔ مرزا نسخہ بتا کر چلے گئے۔ میں اپنی جگہ تہیہ کیے بیٹھا ہوں کہ انکے نقشِ قدم پر نہیں چلوں گا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں آج کل ہر اہلِ ثروت اور اہلِ اقتدار شخص کے چہرے کے اطراف مجھے ایک ہالا سا نظر آنے لگا ہے۔ اور میرا قلم خود بخود کہنے لگا ہے "مجھے دیکھا جو خادم نے ہوا ایمان کی یہ ہے ..." ■■

دلیپ سنگھ

ہم جو اپنی شرافت میں مارے گئے

قبرستان کے جس حصے میں میری قبر واقع ہے وہاں رونق رتی بھر نہیں ہے۔ میری قبر کے اردگرد بہت سی جگہ خالی پڑی ہوئی ہے۔ لیکن جب بھی کوئی نیا مردہ قبرستان میں لایا جاتا ہے تو وارثین کی کوشش ہوتی ہے کہ اسے میرے پڑوس کے بجائے سامنے والے حصے میں دفن کیا جائے جہاں پہلے ہی قبر پہ قبر چڑھی ہوئی ہے۔ وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہاں بڑے بڑے آدمی دفن ہیں۔ کوئی وزیر ہے تو کوئی کروڑپتی تاجر، کوئی فوج کا جرنیل ہے تو کوئی کمپنی کا چیرمین۔ وارثین سمجھتے ہیں کہ پڑوسیوں کی وجہ سے اُن کے مردے کی قدر و منزلت بھی بڑھ جائے گی۔ اردو کے ایک ایسے ادیب کے قریب جو لکھتا بھی طنز و مزاح تھا کون اپنی آرام گاہ بنانا چاہے گا۔ چاہے وہ اس کی آخری آرام گاہ ہی کیوں نہ ہو۔

اس تنہائی سے میں بہت پریشان تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ آس پاس کوئی پڑوسی ہو کہ میں بھی کبھی آدھی رات کو اٹھ کے اس سے دو باتیں کر سکوں۔ میں نے اکثر کچھ گورکنوں کو کہتے سنا تھا کہ کچھ سالوں میں جب دوسری طرف رش زیادہ ہو جائے گا تو قبرستان کا میرے والا حصہ بھی بس جائے گا۔ لیکن جیسا کہ میرے زمانے کے ایک شاعر نے کہا تھا :

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

مجھے ٹھیک طرح سے احساس نہیں ہے کہ یہ مصرع یہاں فٹ بیٹھتا ہے یا نہیں۔ اتنے سال قبر میں پڑے رہنے کی وجہ سے میری سمجھ بوجھ میں اب وہ دم خم نہیں رہا جو کبھی تھا۔ ویسے قبر میں پڑا پڑا قیامت کا انتظار تو کر ہی رہا تھا پڑوسیوں کا انتظار کرنے میں کیا قباحت تھی لیکن پتہ نہیں کیوں انتظار، میرے خون کا دباؤ ہمیشہ بڑھا دیتا ہے۔ قبر کے باہر بھی اور قبر کے اندر بھی۔

کل اچانک مجھے احساس ہوا کہ میری قبر کے اردگرد خاصا ہنگامہ ہو رہا ہے لگتا تھا کوئی نئی قبر کھودی جا رہی ہے۔ میرا جی چاہا کہ دیکھوں کون صاحب تشریف لائے ہیں۔ کم از کم یہ تو دیکھوں کہ صاحب ہیں یا صاحبہ۔ لیکن دن کا وقت تھا۔ اس لیے میرا قبر سے نکلنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا ممکن تھا کہ میری اچانک رونمائی

سے مردے کے کچھ وارثین وہیں دم توڑ کر قبرستان کی آبادی کے اضافے کی وجہ بن جاتے۔ اس لیے میں چپ چاپ پڑا رہا۔ لیکن رات کو جب میں اپنی قبر سے باہر نکلا تو دیکھا کہ پڑوس واقعی آباد ہو گیا ہے۔ میری قبر کے بالکل بغل میں ایک نئی قبر تھی۔ میں نے اس کا تابوت کھٹکھٹایا تو اس میں سے بوڑھے قسم کا ایک شخص نمودار ہوا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا کہ میں آپ کا پڑوسی ہوں۔ میں نے شکایت بھی کی کہ نو وارد ہونے کی وجہ سے آپ کا فرض بنتا تھا کہ آپ خود آکر مجھ سے اپنا تعارف کرواتے۔ کہنے لگا۔ میں آپ کی نیند میں مخل نہیں ہونا چاہتا تھا اور ویسے بھی پڑوسیوں سے خواہ مخواہ ملاقات کرنے کو سوسائٹی کے آداب کے خلاف سمجھا جاتا ہے جس جگہ سے میں آیا ہوں وہاں پڑوسیوں کا نام جاننا بھی آداب شرافت کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ میں نے کہا "میرے زمانے میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ کہنے لگے" اس سے ظاہر ہوا کہ آپ بہت پرانے مردے ہیں کیونکہ سوسائٹی کے آداب بدلے تو قریب چالیس سال ہو چکے ہیں"۔

میں نے کہا حضور آپ کو وہاں کیوں نہیں دفنایا گیا جہاں بڑے بڑے لوگ نیند کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ کہنے لگے "بنیادی طور پر میں تنہائی پسند ہوں۔ لیکن ایک ضمنی وجہ یہ بھی تھی کہ گورکن اس علاقے کے زیادہ پیسے مانگ رہا تھا۔ میری بیوی کا خیال تھا کہ فضول خرچی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ جسے یہ ضمنی وجہ کہہ رہے ہیں وہی اصل میں بنیادی وجہ تھی۔ اس شخص نے جب اپنی زندگی میں اپنے گھر والوں کو نہایت ہی معمولی محلے میں رکھا تھا تو وہ اسے مرنے کے بعد اہل ثروت کے کونے میں کیسے بسا سکتے تھے۔

مردوں کی ایک مشکل ہے کہ جب اکٹھے ہوتے ہیں تو بات کرنے کا کوئی موضوع نہیں ملتا۔ زندہ لوگ اگر اور کچھ نہیں تو گھنٹوں اپنی بیوی کے خلاف بول بول کر وقت گزار لیتے ہیں۔ بچوں کی نااہلی کا شکوہ کر سکتے ہیں۔ اور اگر کچھ نہ بھی ہو تو حکومت وقت کے خلاف رائے زنی کرتے ہوئے وقت گزار لیتے ہیں۔ لیکن مردوں کو یہ سہولتیں میسر نہیں ہیں جب کوئی حاکم ہی نہیں تو پھر شکوہ کس کا۔ ایک بار مجھے یاد ہے، ایک مردے نے اس بات پر پریشانی کا اظہار کیا تھا کہ کمبخت مرنے سے پہلے گھر کی چھت پر بہت سا ایندھن جمع کر آیا تھا۔ لیکن اس کی نالائق بیوی چھت پر جا کر دیکھے گی ہی نہیں اور بازار سے اور ایندھن خرید لائے گی۔ اس پر باقی مردوں نے اسے بہت ڈانٹا کہ اب اُس کو یہ شکوہ شکایت زیب نہیں دیتا۔ محفل میں جو لوگ حاضر نہیں ہیں ان کے خلاف کچھ کہنا آداب محفل کے خلاف ہے۔

زندہ لوگ تو ایک دوسرے کی صحت کے متعلق پوچھتے پوچھتے صبح سے شام کر لیتے ہیں لیکن مردے بیچارے یہ بھی نہیں کر سکتے۔ اسی لیے میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنے نئے پڑوسی سے کیا بات کروں۔ آخر میں نے پوچھا "قبرستان تک پہنچنے کے لیے آپ نے کس بیماری کا سہارا لیا تھا۔" کہنے لگے "زکام ہو گیا تھا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا "حضرت آج پہلی بار سن رہا ہوں کہ کوئی زکام سے مر گیا ہو۔" کہنے لگے:

"درحقیقت میں بھی زکام سے نہیں مرا۔ میری موت تیمارداری سے واقع ہوئی۔" اس نئی بیماری کا نام سن کر میں نے گزارش کی کہ وضاحت فرمائیے۔ اب وہ آلتی پالتی مار کر اپنی قبر کے اوپر بیٹھ گئے اور یوں گویا ہوئے۔ "میں زندگی بھر صحت مند اور چاق و چوبند رہا۔ اس سے میری بیوی اکثر ناراض رہتی تھی کہ جب

ہم رشتہ داروں اور دوستوں کی تیمارداری کے سلسلے میں منوں سنگترے کیلے اور موسمیاں ان کے گھر بھیج چکے ہیں تو ہمارے گھر فروٹ کیوں نہیں آتا اور اس نے مجھ پر الزام رکھا کہ ان کے ساتھ یہ زیادتی میری اچھی صحت کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ میں نے کہا تو خود کیوں نہیں چند دنوں کے لیے بیمار ہو جاتی۔ کہنے لگی تمہیں فروٹ وصول کرنا ہے تو نہیں آتا۔"

پھر ایک دن کرنا خدا کا کیا ہوا کہ مجھے زکام ہو گیا۔ میری بیوی نے اسے اپنی دعاؤں کا نتیجہ سمجھا۔ دن رات رشتہ داروں اور دوستوں کو ٹیلی فون اور ڈاک کے ذریعہ اطلاع دیتی رہی اور اس طرح گھر میں لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ فروٹ کے ساتھ ساتھ لوگ میرے لیے علاج بھی تجویز کریں گے۔ شروعات ہی ہمارے لیے نہایت خطرناک ثابت ہوئی۔ میری بیوی کے خسر آئے اور کہنے لگے۔ زکام کا بہترین علاج گیگمہ کے چھال کی چائے ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ مشورہ دے کر چلے جائیں گے لیکن وہ بضد تھے کہ چھال ابھی منگوائی جائے اور ان کے سامنے چائے بنا کر پی جائے۔ چنانچہ انھوں نے چھال منگوائی۔ میں گزارش کی کہ میں بہت دوائیں پہلے ہی پی چکا ہوں۔ کہنے لگے۔ دیسی دواؤں کا کمال یہ ہے کہ وہ اگر فائدہ نہ بھی کریں نقصان ہرگز نہیں کرتیں۔ میں نے کہا " لیکن میں نے ابھی ابھی چائے پی ہے۔ کہنے لگے اس چائے اور اس چائے میں فرق ہے۔ وہ پیٹ بھرنے کے لیے تھی۔ یہ بیماری دور کرنے کے لیے ہے۔ مجبوراً چائے کا ایک گھونٹ میں نے گلے کے اندر انڈیلا اور پھر بیوی کے کان میں کہا کہ چائے انتہائی کڑوی ہے میں کسی حالت میں نہیں پیوں گا۔ وہ کہنے لگی۔ ہمارا ان کے ساتھ بڑا نازک رشتہ ہے۔ پی جائیے۔ ورنہ ہماری بیٹی کو ہمارے گھر میں بٹھا دیں گے۔ چنانچہ میں چائے پی گیا۔ اب تک تو مجھے زکام تھا اب گردے میں درد بھی ہونے لگا۔ اس کے بعد میں نے بہو کے چچا کی خوشی یا ڈر کی وجہ سے جوشاندہ پیا۔ اپنے ماموں کو خوش کرنے کے لیے سرخ مرچوں کا دھواں آدھ گھنٹے تک لیا۔ اپنے بیٹے کے افسر کی ناراضگی کے ڈر سے سر پر مٹی کے تیل کی مالش کی۔ اپنے ایک عزیز دوست کو خوش کرنے کے لیے نوشادر پیس کر پھانکا۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ زکام تو اپنی جگہ قائم رہا لیکن مجھے گردے کا درد ہو گیا۔ پتھری ہو گئی۔ جوڑوں میں درد ہونے لگا۔ نبض کی رفتار دھیمی پڑ گئی اور دماغ میں خشکی ہو گئی۔ مطلب یہ کہ میری ننھی سی جان پر وہ آفتیں نازل ہوئیں کہ خدا کی پناہ۔ ان حالات میں میری جان نکلی نہیں بلکہ میری روح میرے جسم سے جان چھڑا کر بھاگی اور میں نے مرنے کے بعد سکھ کا سانس لیا۔"

میں نے پرندے میسر کی تاسف کر کہا:

"مجھے یقین ہے کہ آپ کے وفات پانے کے بعد گھر کے لوگوں، رشتہ داروں اور دوستوں کو خاصا افسوس ہوا ہو گا کہ ان کے مشوروں پر عمل کرنے کی وجہ سے آپ کی جان گئی۔

کہنے لگے: "پیچھے کیا ہو رہا ہے اس کا تو مجھے علم نہیں کیونکہ میں تو ادھر آ گیا ہوں۔ میں نے کچھ رشتہ داروں کو آنسو بہاتے تو دیکھا تھا لیکن اس کا اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ دنیا داری کے آنسو تھے یا وفاداری کے۔"

میں نے پروفیسر مذکور سے کہا کہ اسے گھر جا کر دیکھنا چاہیے کہ اس کی موت کے بارے میں اس کے رشتہ داروں اور دوستوں کا رویہ کیا ہے۔ پوچھنے لگا کیا یہ ممکن ہے؟ میں نے کہا "آپ اپنی موجودہ شکل و صورت میں گھر تو نہیں جا سکتے ہاں، البتہ آپ کی روح کو بھیج کر پتہ لگایا جا سکتا ہے۔"

چنانچہ روح کو مناسب ہدایات دے کر پروفیسر کے گھر روانہ کیا گیا۔ واپسی پر اس نے رپورٹ دی کہ ٹھیک طرح سے یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ رشتہ داروں کا پروفیسر کی موت کے بارے میں رویہ کیا ہے کیونکہ لوگ رو بھی رہے تھے اور حلوہ بھی کھا رہے تھے۔ لیکن ایک بات کی بڑی چرچا تھی کہ پروفیسر نے اپنی زندگی میں کسی دوست یا رشتہ دار کا دل نہیں دکھایا جو کچھ بھی اسے کہا گیا وہ اس نے کر دکھایا تھا اس میں جان جانے کا خطرہ رہا ہو۔ میں نے پروفیسر کو سمجھایا کہ یہ جملہ ایک طرح سے اقرار جرم تھا۔ لیکن اس جرم کی سزا خدا سے ہی بھگتنی ہے۔ اور کسی کو نہیں۔ پروفیسر کہنے لگا "جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اس پر کف افسوس ملنے سے کچھ فائدہ نہیں لیکن اگر ممکن ہو تو میں چاہوں گا کہ اپنی وصیت کے ذریعہ اپنی قبر پر لکھے جانے والے کتبے کی عبارت خود تجویز کر سکوں۔" میں نے پوچھا "کیا آپ کو ہجے یا گرامر کی غلطی کا شک ہے؟" کہنے لگا وہ تو نہیں البتہ یہ خواہش ضرور ہے کہ جو کچھ لکھا جائے وہ حسب حال ہو۔ پروفیسر کی روح نے یقین دلایا کہ اس کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ اسے عبارت لکھ کر دی جائے وہ اسے پروفیسر کی بیوی کے بنک لاکر میں رکھوا دے گی۔ پروفیسر نے اپنی قبر پر لکھے جانے والے کتبے کی جو عبارت تجویز کی وہ مندرجہ ذیل تھی۔

"پروفیسر خدا بخش ایم اے، پی ایچ ڈی ——— وہ جو اپنی شرافت میں مارا گیا۔"

دلیپ سنگھ

زندہ باد ۔ مُردہ باد

پُرانی بات ہے ایک بار ہم اپنے ایک دوست سے ملنے گئے جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ دروازہ اُس کی بیوی نے کھولا اور بتایا کہ خاوند بیمار ہیں۔ پوچھا "یہ اچانک کیا ہوا۔" کہنے لگی کل شاپنگ کے لیے چاندنی چوک گئے تھے۔ شاید وہاں انہوں نے کوئی گندی چیز کھائی جس سے پیٹ خراب ہو گیا۔" میں نے کہا "غلطی سے انھوں نے کوئی صاف ستھری چیز کھائی ہوگی جس سے پیٹ خراب ہو گیا ہوگا۔ گندی چیزیں تو وہ بچپن سے کھا رہا ہے۔"

ایسی ہی پریشانی ہم ہندوستانیوں کو ہوتی ہے جب ہم امریکہ یا یورپ جاتے ہیں۔ وہاں کا ایک دم صاف ستھرا کھانا ہمارے پیٹ کو موافق نہیں آتا۔ وہاں ہمیں یاد آتی ہیں وطن کی جلیبیاں جن پر سڑک کی گرد کا ورق لگا ہوتا ہے۔ یاد آتے ہیں وہ سموسے جن کو قریبی بِل کا دھواں کچھ سلیٹی سا رنگ دے دیتا ہے۔ اور جب یہ چیزیں ہمیں وہاں میسّر نہیں آتیں تو ہم بیمار پڑ جاتے ہیں۔

میں جب ملازمت کے سلسلے میں چار سال کے لیے یورپ گیا تو مجھے ان چیزوں کے علاوہ جس چیز کی وجہ سے وطن کی یاد آتی تھی وہ تھے جلسے، جلوس۔ پورا ایک سال گزر گیا۔ میں نے وہاں کوئی جلوس نہ دیکھا۔ میرے کان زندہ باد، مُردہ باد ہائے ہائے اور ارے رے کے نعرے سننے کو ترس گئے۔ کبھی کوئی آواز نہ سنی کہ یہ لے کے رہیں گے۔ نہ کسی نے کہا کہ یہ دے کے رہیں گے۔ میں نے سوچا اگر یہی حال رہا تو اپنا یہاں گذارا کیسے ہوگا۔

آپ تو جانتے ہیں کہ جلسے، جلوس ہماری زندگی کا ایک ضروری حصّہ ہیں۔ اس سے بے کار لوگوں کو روزگار ملتا ہے نعرے لگانے کی وجہ سے گلا صاف اور بیماری سے پاک رہتا ہے۔ جلوس میں چلنے کی وجہ سے اہلِ جلوس کی ورزش ہو جاتی ہے اور اس طرح ان کی صحت ٹھیک رہتی ہے۔ غصّے میں آ کر جب اہلِ جلوس بسوں کو جلا دیتے ہیں تو سرکار کوئی بسیں خریدنی پڑتی ہیں۔ اس سے ملک کی اقتصادی ترقی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی بظاہر یوں لگتا ہے جیسے جلسے جلوسوں کی وجہ سے کچھ لوگوں کا نقصان ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں پتہ چلتا ہے کہ اس ظاہری نقصان کے پیچھے کتنا بڑا فائدہ چھپا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میں یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ تو میرا ایک ہم جماعت جلوسوں میں اس شدت سے حصّہ لیا کرتا کہ بے چارہ بی۔ اے میں لگاتار کئی سال فیل ہوتا رہا۔ لیکن سیاست کا تجربہ ہو جانے کی وجہ سے بعد میں وزارت کے عہدے تک جا پہنچا اور اُسے محکمہ تعلیم کا انچارج بنا دیا گیا۔ آپ ہی بتائیے تعلیم میں سدھار لانے کے لیے اس سے بہتر کون ہو سکتا تھا جس نے ہم سے کئی زیادہ سال یونیورسٹی کے اردگرد چکر

[illegible]

[illegible] کہ اگر یورپ میں لوگ جلسے نہیں کرتے یا جلوس نہیں نکالتے تو شاید اس لیے کہ وہ ان کے فوائد سے واقف نہیں ہیں۔ میں نے سوچا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے سے کچھ نہیں ہوگا۔ چنانچہ کچھ کر گزرنے کی خواہش میں میں ایک دن گزر یا کی مخالف پارٹی کے سکریٹری جنرل سے ملنے چلا گیا۔ علیک سلیک کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ "آپ کیسے سیاستداں ہیں کہ آپ جلوس ہی نہیں نکالتے"۔ کہنے لگا "جلوس کس لیے نکالیں"۔ میں نے کہا "یہ کیا سوال ہوا ــــ اگر آپ حکومت کو بتانا چاہتے ہیں کہ آپ اس کی پالیسیوں کے خلاف ہیں۔ یا آپ چاہتے ہیں کہ وہ آپ کے مطالبات پر غور کرے تو جلوسوں سے بڑھ کر اور کیا طریقہ ہوسکتا ہے۔ اگر آپ جلوس نہیں نکالیں گے تو آپ کی آواز حکومت تک کیسے پہنچے گی۔ جتنا لمبا جلوس ہوگا اور جتنا اونچا نعرہ ہوگا اتنی جلدی آپ کی شنوائی ہوگی۔ اس نے میری طرف کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے اُسے میری دماغی صحت پر کچھ شک ہوا اور کہنے لگا کہ حکومت کوئی بہری عورت تو نہیں ہوتی کہ وہ سوائے نعروں کے اور کوئی آواز سن نہیں سکتی۔ ہمارا اپنا اخبار ہے اس میں ہم اپنی پالیسیوں کی چرچا کرتے رہتے ہیں جکومت وہ اخبار پڑھ کر سمجھ جاتی ہے کہ ہمیں کیا چاہیے۔ میں نے کہا بھائی جان میں آپ کی خود اعتمادی کی داد دیتا ہوں کہ آپ سمجھتے ہیں کہ حکومت نہ صرف اخبار پڑھتی ہے بلکہ مخالف پارٹی کا اخبار بھی پڑھتی ہے لیکن اگر آپ کی خود اعتمادی کا یہی حال رہا تو آپ کا کام ہوچکا"۔ وہ کہنے لگے آپ کی بات اگر درست بھی ہے تو آپ ہی بتائیے جلوس میں شامل ہونے کے لیے آدمی کہاں سے آئیں گے۔ لوگوں کی اکثریت تو حکومت کے ساتھ ہے۔ تبھی تو انہیں ہم سے زیادہ ووٹ ملے۔ میں نے کہا اگر آپ کو جلوس نکالنے کے لیے بھیڑ اکٹھا کرنا بھی نہیں آتا تو پھر آپ سے بات کرنا ہی فضول ہے۔ آپ کبھی ہندوستان آکر دیکھیے، جب جنتا پارٹی جلوس نکالتی ہے تو اس میں صرف جنتا پارٹی کے حمایتی شامل نہیں ہوتے۔ نہ ہی کانگریس کے جلوسوں میں کانگریس کے حمایتی۔ جلوسوں میں تو بس جلوسیے ہی شامل ہوتے ہیں۔ پوچھنے لگا یہ جلوسیے کیا ہوتے ہیں۔ میں نے کہا یہ وہ پیشہ ور لوگ ہیں جو جلوسوں میں حصہ لینے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ انہیں اس بات سے کیا سروکار کہ جلوس کس پارٹی کا ہے۔ نعرہ کیا لگانا ہے۔ انہیں تو اپنی دھاڑی ملنی چاہیے۔ جو پیسے دے گا اس کے جلوس میں شامل ہوجائیں گے۔ کہنے لگا یہی تو چکر ہے۔ پہلے تو یہاں آدمی ملیں گے نہیں کیا کہ سب اپنے اپنے دھندے میں لگے ہوئے ہیں اور اگر کوئی جلوس میں حصہ لینے کے لیے رضامند بھی ہوجائے تو کم از کم پچاس روپے فی گھنٹہ سے کم پیسے نہیں لے گا۔ میں نے کہا اگر آپ کے عوام میں سیاسی شعور ہی نہیں ہے تو میں کیا کرسکتا ہوں۔

یوں تو میں مخالف پارٹی کے سکریٹری جنرل سے مکمل طور پر مایوس ہوچکا تھا لیکن پھر ہمت کر کے کہا کہ اگر آپ جلوس نہیں نکال سکتے تو اپنے مطالبات کو منظور کروانے کے لیے کم از کم بھوک ہڑتال کا انتظام تو کر ہی سکتے ہیں۔ اس سے بھی آپ کے دیش میں کچھ چہل پہل آسکتی ہے۔ ہم تو سیاسی مقاصد کے لیے بھوک ہڑتال کا استعمال اکثر کرتے ہیں۔ وہ کہنے لگا میں نے تو سنا ہے کہ آپ کے ہاں ویسے ہی ہزاروں لوگوں کو کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ میں نے کہا وہ الگ بات ہے لیکن بھوک ہڑتال کو سیاسی ہتھیار کے طور پر وہ لوگ استعمال کرتے ہیں جنھیں اتنا کھانا نصیب ہوتا ہے کہ اس سے دس آدمیوں کا پیٹ بھر سکتا ہے۔ وہ صرف اپنے مقصد کے حصول کے لیے کھانا کھانے سے انکار کردیتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ حربہ بڑا کامیاب گنا جاتا ہے۔ سرکار پہلے تو ان کی منت سماجت کرتی ہے کہ بھائی کھانا کھالو تو تمہارے مطالبات پر غور کریں گے لیکن اگر وہ پھر بھی انکار کریں تو ان کے مطالبات کو اکثر مان بھی لیا جاتا ہے۔

وہ کہنے لگا مان لیجیے ایک آدمی بھوک ہڑتال کرتا ہے اور سرکار اس کے مطالبے کو ماننے سے انکار کردیتی ہے تو

وہ آدمی تو مر جائے گا نا۔ اس طرح ایک قیمتی جان چلی جائے گی۔ میں نے کہا بھوک ہڑتال سے کبھی کوئی نہیں مرتا کہنے لگا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے اگر کوئی آدمی لگاتار کئی دن تک فاقے کرے گا تو یقیناً مرے گا میں نے خود اخبارات میں پڑھا ہے کہ آپ کے ہاں مسلسل فاقوں کی وجہ سے کئی لوگ مر جاتے ہیں۔ میں نے کہا۔ وہ ٹھیک ہے۔ لیکن میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ بھوک ہڑتال اس طرح بھی کی جا سکتی ہے کہ بھوک ہڑتال بھی چلتی رہے اور موت بھی نہ ہو۔

میں نے جب مخالف پارٹی کے سکریٹری جنرل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ میری بات اس کے پلے پڑ نہیں رہی میں نے سوچا اس پر مزید وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ان تلوں میں تیل نہیں ہے اب یہاں سے کھسکنا چاہئے۔

وہاں سے نکل کر میں سیدھا برسرِ اقتدار پارٹی کے دفتر پہنچا اور اس کے سکریٹری جنرل سے ملاقات کی حالانکہ میرے سوال وہی تھے جو میں مخالف پارٹی کے سکریٹری جنرل سے پوچھ چکا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ اسے سمجھانا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا اس کے مخالفین کو۔ اس نے بھی شروع شروع میں کہا کہ ہم کیوں جلوس نکالیں، لوگ تو ویسے ہی ہمارے ساتھ ہیں۔ میں نے پوچھا آپ کو کیسے پتہ، کہنے لگا انھوں نے ہمیں ووٹ دیئے ہیں تبھی تو ہم حکومت میں آئے ہیں۔ میں نے کہا بھیا ان کے بھروسے نہ رہنا۔ ان کا کیا پتہ کب کس بات پر آپ سے روٹھ جائیں اور اگلے الیکشن میں آپ کو ہاتھ ملتا چھوڑ کر ووٹ مخالفوں کو دے دیں۔ اس لیے آپ کا فرض ہے کہ انہیں ہر دم یاد کراتے رہئے کہ آپ ان کے لیے کتنے اچھے کام کر رہے ہیں۔ اور پھر لوگ جلوسوں میں شامل ہو کر آپ کے کئے ہوئے کاموں کی تعریف کریں گے تو باقی جنتا کے ساتھ خود آپ کو بھی محسوس ہوگا کہ لوگ واقعی آپ کے ساتھ ہیں۔

برسرِ اقتدار پارٹی کے سکریٹری جنرل نے مجھ سے پوچھا کہ جلوس میں شامل ہونے کے لیے لوگوں کو اجرت کیسے دیں گے تو میں نے اس کا دھیان سرکاری ملازموں کی طرف دلایا۔ میں نے کہا کہ ان لوگوں کو جلوس میں شامل کیجیے تنخواہ تو وہ دفتر سے لے ہی رہے ہیں۔ ایک دن کام نہیں ہوگا تو کیا ہو جائے گا۔ میں نے دیکھا کہ بات اس کے پلے پڑ رہی ہے۔ پھر اس نے پوچھا ان لوگوں کو جلوس میں شامل کرنے کے لیے بسیں اور ٹرک کہاں سے لائیں گے۔ میں نے کہا ٹرکوں اور بسوں کے پرمٹ اپنے ہاتھ میں لیجئے پھر دیکھیے وہ لوگ اپنے ٹرک اور بسیں آپ کی خدمت میں پیش کرنے میں کتنی خوشی محسوس کرتے ہیں۔

سکریٹری جنرل نے پھر پوچھا کہ اگر ہم جلوس نکالیں تو اس میں مطالبات کیا رکھیں۔ میں نے سوچا اتنا بڑا آدمی اور اتنا سا سوال ارے بھائی مطالبات وہ رکھو جو بہر حال آپ نے منظور کرنے ہی تھے۔ پہلے تو کہہ دیجیے کہ مطالبات کو منظور کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس پر اور جلوس نکلیں گے۔ تیسری بار اس طرح کر دیجیے بعد مطالبات مان لیجیے۔ وہ پوچھنے لگا اس سے فائدہ کیا ہوگا۔ میں نے کہا فائدہ یہ کہ ان جلوسوں کا لیڈر جو آپ ہی کی پارٹی کا ہوگا۔ اگلی بار الیکشن یقیناً جیت جائے گا۔

مجھے گنڈوریا سے آئے ہوئے اب تین چار برس ہو چکے ہیں۔ میں نے سنا ہے آج کل وہاں جلوس جلوسوں کا زور شور ہے جس کی وجہ سے گنڈوریا کے شہروں میں اکثر ٹریفک جیم دکھائی دیتا ہے۔ دفتروں میں کوئی کام کرتا نظر نہیں آتا۔ لاؤڈ اسپیکروں کے کرائے بڑھ گئے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میرا لگایا ہوا پودا پنپ رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اگر دوبارہ وہاں جاؤں تو لوگ میرے نام پر بھی زندہ باد کے نعرے لگائیں گے۔

دلیپ سنگھ

ہدایت نامہ مصنفین

میرا خیال تھا کہ ہندوستان میں سب سے آسان کام بچے پیدا کرنا ہے۔ کیوں کہ یہاں ان لوگوں کے بچے بھی ہیں جن کے ابھی عقل داڑھ نہیں نکلی (اگر نکلی ہوتی تو شاید وہ اس کام میں سمجھ بوجھ سے کام لیتے) لیکن کچھ عرصہ سے مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ بچے پیدا کرنے سے بھی زیادہ آسان کام اردو کتابیں پیدا کرنا ہے۔ ہر ہفتہ ڈاک سے مجھے کم از کم دو کتابیں وصول ہوتی ہیں جنھیں دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ ایسے ایسے مرد اور عورتیں مصنف بنتے جا رہے ہیں جن کی عقل داڑھ تو کیا چہرے پر مونچھ تک نہیں نکلی (میں مردوں کی بات کر رہا ہوں)۔

کہا جاتا ہے کہ کتابوں کی اس افراط کی ذمہ دار اردو اکیڈمیاں ہیں کیونکہ یہ سب کچھ ان کی جزوی امداد سے ہو رہا ہے۔

اولاد کے پیدا کرنے میں کسی زمانے میں دائی اور آج کل میٹرنیٹی ہوم کی جزوی امداد شامل ہوتی ہے لیکن اس جزوی امداد کی ضرورت اس وقت محسوس کی جاتی ہے جب ماں باپ بہت سا کام خود کر چکے ہوتے ہیں۔ لیکن اردو اکیڈمیوں کی جزوی امداد تو ایک طرح کا بیج ہے جو ایک ادیب کو صاحب اولاد بننے کی ترغیب دیتا ہے۔

نہ جانے اکیڈمیوں کو نابالغ لوگوں کو صاحب اولاد بنانے میں مزہ آتا ہے۔ لیکن اس میں کچھ ہے ضرور، کیونکہ میرے اندازے کے مطابق اس وقت اردو کتابوں کی مجموعی تعداد اردو پڑھنے والوں کی مجموعی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔

سمجھ دار لوگوں کا کہنا ہے کہ اکیڈمیوں کو جزوی امداد کی درخواست دیتے وقت اگر سمجھ بوجھ سے کام لیا جائے تو نہ صرف ایک کتاب چھپ سکتی ہے بلکہ صاحب کتاب کو تن ڈھانپنے کے لیے ایک پتلون بھی مل سکتی ہے۔ ہمیں اس کام کا ابھی تک کچھ ذاتی تجربہ نہیں لیکن اگر یہ صحیح ہے تو ہم اکیڈمیوں کے کام کی سراہنا کرتے ہیں کہ وہ ادیبوں کا تن ڈھانپنے کا ایک نیک کام کر رہی ہیں۔ لیکن اسی ادیب کی کتاب چھپوا کر اسے ننگا کرنے میں انہیں کیا لذت نصیب ہوتی ہے۔ اس کا ہمیں علم نہیں۔

کچھ پیشہ ور نقاد اور کچھ بھلے مانس ادیب دیباچے، پیش لفظ اور کتاب کی جیکٹ پر رائے لکھ کر مصنف کی عریانی کو ڈھانپنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ بعض اوقات یہ دیباچے اور یہ پیش لفظ مصنف کے ساتھ ان نقادوں اور ادیبوں کو بھی عریاں کر دیتے ہیں۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ اردو میں چھپی ہوئی کتابوں کی تعداد، اردو پڑھنے والوں سے زیادہ ہو گئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کتاب کے خریدار ملنے مشکل ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ کوئی حوصلہ شکن بات نہیں ہے۔ کتاب کو تحفتاً لینے کے لیے دوسرے ادیب ہر دم تیار رہتے ہیں۔ ایک مصنف جب دوسرے مصنف کو اپنی کتاب پیش کرتا ہے تو یہ رسم دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ تحفہ لینے والا کتاب کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر آنکھوں تک لے جاتا ہے۔ مصنف کو محسوس ہوتا ہے کہ تحفہ لینے والا کتاب کو آنکھوں کا بوسہ دے رہا ہے لیکن حقیقتاً تحفہ لینے والا کتاب کے وزن کا تخمینہ کر رہا ہوتا ہے وہ جانتا ہے کہ ردّی کا بھاؤ آج کل تین روپیے کلو ہے۔ بھاری کتاب کو دل و جان سے قبول کیا جاتا ہے۔ کتاب کی جیکٹ پر جب ناقد لکھتا ہے کہ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی تو یونہی جھوٹ نہیں لکھتا۔

میں مصنفین کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا نہیں چاہتا۔ صرف اتنا چاہتا ہوں کہ مصنف بننے سے پہلے ادیب اگر اس کام کی تھوڑی بہت ٹریننگ لے لیں تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ اس بات کو ذہن میں رکھ کر میں یہ ہدایت نامہ لکھ رہا ہوں۔ میں ... مصنفین سے درخواست کروں گا کہ مصنف بننے سے پہلے اس ہدایت نامہ کو پڑھ لیں۔ جب بڑھئی یا لوہار اپنا اپنا کام ٹریننگ لیے بغیر شروع نہیں کرتے تو پھر میری دانست میں مصنف بننے سے پہلے ذرا سی ٹریننگ لینے میں کیا مضائقہ ہے۔ ہونے والے ماں باپ بھی بازار سے خرید کر یا پڑوسی سے مانگ کر ایک بے بی بک ضرور پڑھ لیتے ہیں۔

میری دانست میں اردو میں آج تک کل دو ہدایت نامے لکھے گئے ہیں۔ ایک ہدایت نامہ خاوند اور دوسرا ہدایت نامہ بیوی۔ اور میں نے سنا ہے کہ ہدایت نامہ خاوند کو بیویاں اور ہدایت نامہ بیوی کو خاوند لوگ مزے اور لحاف لے کر پڑھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان پر عمل نہیں کرتے۔ میں امید کرتا ہوں کہ میرے ہدایت نامہ کو مصنف بننے کا ہر امیدوار بلا تفریق جنس پڑھے گا۔ اور اس پر عمل کرے گا۔ اتنا عرض کر دوں کہ یہ ہدایت نامہ پڑھتے وقت قاری کو لحاف اوڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس ہدایت نامہ کی خاطر میں ادب کو دو حصوں میں تقسیم کر دوں گا۔ تنقیدی اور تخلیقی۔ تخلیقی کام قدرے مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے میں اس کا ذکر بعد میں کروں گا پہلے تنقیدی حصے سے نپٹ لیں۔

تنقیدی ادب کا مصنف بننے کے لیے یوں تو کسی خصوصی قابلیت کی ضرورت نہیں۔ لیکن اردو میں ایم اے ہونا مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اردو میں ایم اے کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ویسے بھی اردو میں ایم اے عام طور پر وہی کرتے ہیں جنھیں دوسرے مضامین شرف قبولیت نہیں بخشتے۔ اگر آپ کو اردو میں بہت زیادہ لوگ ایم اے کرتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایم اے میں داخلہ لینے کے لیے بی اے پاس ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ شرط ہٹا دی جائے تو مجھے یقین ہے کہ دودھ پیتے بچے اردو میں ایم اے [illegible]

بھرے نظر آئیں گے۔

اگر آپ اردو میں ایم۔ اے نہیں ہیں تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ پھر بھی تنقیدی کتاب کے مصنف بن سکتے ہیں۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ تنقیدی کتابوں کو صرف تنقید نگار ہی پڑھتے ہیں۔ دوسرا کوئی نہیں۔ اس لیے آپ کچھ بھی لکھ دیں گے تو چل جائے گا۔ یوں بھی تنقید نگار کا کام عام طور پر تخلیقی کام میں نقص نکالنا ہے۔ نقص نکالنا کچھ اتنا مشکل کام نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے۔ آپ نے اگر کسی عورت کو دال میں کنکر چنتے دیکھا ہو تو آپ جانتے ہوں گے کہ وہ صاف ستھری دال کو ادھر ادھر کرتی ہوئی ایک آدھ کنکر نکال ہی لیتی ہے۔ جب وہ صاف ستھری دال میں سے کنکر نکال سکتی ہے تو آپ اچھے بھلے شعر میں نقص کیوں نہیں نکال سکتے۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ امیر خسرو کا کلام پڑھ رہا تھا۔ خسرو کا دوہا ہے:

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس
چل خسرو گھر اپنے، سانجھ بھئی چو دیس

میں نے تو خسرو کو والہانہ داد دی لیکن میرے دوست گہری سوچ میں کھو گئے۔ میں نے پوچھا "کیا ہوا؟" کہنے لگے: "سوچ رہا ہوں دوہے میں کہیں گڑبڑ ہے۔ دیکھیے نا" گوری اگر سیج پر سوئی ہوتی ہے تو اس کے کیس تو اس کے گردن کے پیچھے، پیٹھ کے نیچے اور بستر پر ہوں گے۔ مکھ پر کیسے آ گئے؟" میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے اس نے خود بکھیر لیے ہوں۔" کہنے لگے "ایسا کرنے سے بال ناک میں گھسیں گے اور چھینکیں آئیں گی۔ اس لیے وہ جان بوجھ کر ایسا نہیں کرے گی۔" میں تھوڑا سا گرم ہو کر بولا "تو آپ کیا امیر خسرو کو گھٹیا شاعر سمجھتے ہیں؟" کہنے لگے "فی الحال تو میں ایسا نہیں کہوں گا۔ البتہ دوہے میں کچھ گڑبڑ ضرور ہے" پھر ایک دم چہک کر بولے "ارے صاحب ساری گڑبڑ تو کاتب نے کی ہے۔ سیدھی سی تو بات ہے۔ خسرو نے لکھا ہوگا،

"گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈالے کھیس"

کیونکہ کھیس سوئے ہوئے لوگوں کو ہلکی سردی سے بچاتا ہے اور کاتب نے کھیس کو کیس کر دیا ہوگا۔" میں سمجھ گیا کہ کاتب کی غلطی سے ہی سہی، ادب میں ایک تنقید نگار کا اضافہ ہو گیا ہے۔

چند سال پہلے کی بات ہے۔ میں نے ایک رسالہ میں ایک مضمون پڑھا تھا جس میں ایک ناقد نے ساحر لدھیانوی کو بڑی ڈانٹ پلائی تھی۔ ساحر نے ایک نظم میں اپنی محبوبہ سے کہہ دیا تھا کہ مجھے تاج محل کے پاس نہیں بلکہ کہیں اور ملا کرو۔ ناقد نے قریب چوبیس صفحوں کے ایک مضمون میں اس کو خوب کھری کھری سنائی کہ کیوں بھائی تمھیں تاج محل کے پاس ملنے میں کیا تکلیف ہے۔ کہتے ہیں ساحر نے ناقد کے بہت ہاتھ پاؤں جوڑے اور کہا کہ حضور میں نے تو یوں ہی لکھ دیا تھا۔ آپ لڑکی سے ملنے کا انتظام کروا دیجیے۔ جہاں آپ کہیں گے وہیں ملنے آ جایا کروں گا۔ لیکن ناقد بار بار یہی کہتا تھا کہ تم نے پہلے تاج محل کے پاس ملنے سے انکار کیوں کیا۔

آپ اگر اسی طرح دن میں چار شاعروں کو بھی ڈانٹ پلا دیں تو یقیناً دس دن میں ایک کتاب آسانی سے

تیار ہو سکتی ہے۔

آپ کی کتاب بکے نہ بکے۔ اس کو کوئی پڑھے یا نہ پڑھے۔ ناقد بننے سے آپ کا رتبہ ادب میں بہت بلند ہو جاتا ہے کیونکہ کتاب کی رسم اجرا یا کسی ادیب کے مرنے کے بعد جو جلسے ہوتے ہیں ان میں ناقد کی تقریر ضروری سمجھی جاتی ہے۔ ادیب کے مرنے کے بعد ناقد جو تقریر کرتا ہے اس میں مرنے والے کی خوبیوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اس تقریر کو سن کر اکثر لوگ حیران رہتے ہیں کہ یہی ناقد تو ادیب کی زندگی میں اس کے نقص نکالا کرتا تھا۔ اب اسے کیا ہو گیا۔ ان کو یہ معلوم نہیں کہ اگر دال میں ناموجود کنکر تلاش کیے جا سکتے ہیں تو انہی کنکروں کو موقع کی مناسبت سے نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے۔

اب ہم تخلیقی ادب کی طرف آتے ہیں:

اس ہدایت نامہ کے لیے ہم نے تخلیقی ادب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ شعری ادب اور نثری ادب ـــــ شعری ادب تین طرح کا ہوتا ہے۔

(۱) پابند شاعری　(۲) آزاد شاعری　(۳) نثری نظم

پابند شاعری: اگر آپ شاعر بننے پر تل ہی گئے ہیں تو پابند شاعری کیجیے۔ کیونکہ یہ شاعری بہت آسان ہے۔ مشکل اس میں صرف یہ ہے کہ اس میں وزن کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اور اس میں گڑبڑ ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس سے ڈرنے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ وزن جب بنیے کے ترازو سے غائب ہو گیا ہے تو شاعری پر یہ پابندی کیوں۔ آسانی پابند شاعری میں یہ ہے کہ سارا سامان بنا بنایا مل جاتا ہے۔ قافیے اور ردیف تیار مل جاتے ہیں۔ معشوق کے جسم کے کون کون سے پرزے حسین ہیں۔ وصل میں مزا کیوں ہے۔ ہجر میں تکلیف کیوں ہوتی ہے یہ سارے فیصلے اساتذہ پہلے ہی کر چکے ہیں۔ آپ نے اس سامان کو صرف آگے پیچھے یا نیچے اوپر کرنا ہے۔ نہ سمجھے ہوں تو کسی عورت سے پوچھیے کہ پرانی ساڑی میں سے غرارہ کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ یا کرتے میں سے بلاوز کیسے نکلتا ہے۔ آپ پابند شاعری کے تمام رموز سے واقف ہو جائیں گے۔

آزاد نظم: شروع شروع میں آزاد نظم اس نظم کو کہتے تھے جس میں ردیف و قافیہ یا وزن کی قید نہ ہو آج کل اس کو کہتے ہیں جو سمجھ میں نہ آئے اور کمال یہ ہے کہ شاعر خود اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ان کی شاعری میں پیچ و خم اس قدر زیادہ ہیں کہ قاری کا پورا وجدان میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہمارے اشعار میں معنی نہیں ہیں تو نہ سہی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ بس کہتے ہی ہیں۔ دل ہی دل میں وہ سوچتے ہیں کہ نظم تو کہیں کوئی سرپھرا ناقد اس کا کچھ نہ کچھ مطلب نکال ہی لے گا۔ مرزا غالب کا ایک شعر ہے:

نہ ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی پرواہ
گر نہیں میرے اشعار میں معنی نہ سہی

مجھے بی۔ اے کے امتحان میں غالب کا "نقش فریادی" والا شعر تشریح کے لیے دیا گیا۔ میں نے صاف صاف لکھ دیا کہ شعر میں معنی تلاش کرنا بے سود ہے کیوں کہ خود مرزا نے کہا ہے کہ میرے اشعار میں معنی نہیں ہیں۔ پروفیسر تلوک چند محروم نے جو میرے ممتحن تھے میرے پرچے پر لکھ دیا کہ شعر میں معنی تلاش کیجیے معنہ

ہم سمجھیں گے کہ آپ کو صلے کی پرواہ نہیں ہے اس لیے ہم آپ کو زیرو نمبر دے رہے ہیں

نثری نظم: شاعری کی یہ قسم ابھی تک خود ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ کو کیا سمجھائیں۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی چیز نثر ہے تو نظم نہیں ہے اور اگر نظم ہے تو نثر نہیں ہے پھر نثری نظم کیا چیز ہے۔ آخر تھک ہار کر اپنے آپ کو سمجھا لیا ہے کہ اگر کوئی باپ اپنے ناخلف اور آوارہ پیٹھے بچے کو فرزند ارجمند کہنے پر تل جائے تو ہم اس کا کیا بگاڑ لیں گے۔

آئیے۔ اب نثری ادب پر کچھ بحث ہو جائے۔

نثری ادب کی سب سے اہم صنف ہے افسانہ۔ کسی زمانے میں افسانے کا مطلب کہانی ہوتا تھا۔ وہی کہانی جو آپ دادی اور نانی سے سنتے آئے ہیں۔ آج کل افسانے کا مطلب حساب کا سوال ہوتا ہے۔ جسے حل کرنے کے لیے ایک فارمولے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مصنف کو آسانی یہ ہے کہ اسے ممتحن کی طرح سوال لکھ دینا ہے۔ اس کا جواب کیا ہے یہ اسے خود معلوم نہیں۔ وہ فارمولا بھی نہیں جانتا جس سے وہ سوال حل کیا جا سکے۔ مثال کے طور پر مولی کا افسانے میں مطلب عورت بھی ہو سکتا ہے اور ترکاری بھی۔ میں سمجھتا ہوں یہ صورتِ حال نئے افسانہ نگاروں کے لیے بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ ایک مرتبہ مجھ سے کسی نے سوال کیا تھا جو کچھ اس طرح تھا۔

"ایک پہاڑ کے پاس ایک درخت تھا جس پر کچھ چڑیاں بیٹھی تھیں۔ ایک شکاری نے بندوق سے کچھ چڑیاں مار دیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ پہاڑ درخت سے کتنی دوری پر جا گرا۔"

میں نے جواب دیا کہ جناب نہیں معلوم، آپ ہی بتا دیجیے۔ کہنے لگے:

"اگر ہمیں پتہ ہوتا تو ہم آپ سے کیوں پوچھتے"

مجھے یقین ہے اگر آپ اس سوال کو ذہن میں رکھیں تو آسانی سے جدید افسانہ نگار بن سکتے ہیں۔

مزاح نگاری: یہ نثری ادب کی دوسری صنف ہے۔ ویسے تو مزاح نگار بننا کچھ مشکل کام نہیں کیونکہ ہمارے سیاسی رہنما اور سرکاری ملازم آئے دن ہمیں اپنے اوپر ہنسنے کے بے شمار مواقع بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔ اور کچھ نہ ہو تو آپ گھر کی بیگم کو تختۂ مشق بنا سکتے ہیں۔ لیکن آج کل مزاح نگاری کی سند لینے کے لیے حیدرآباد کا ایک چکر لگانا ضروری ہو گیا ہے بلکہ اگر آپ یہ ثابت کر سکیں کہ آپ پیدا ہی حیدرآباد میں ہوئے تھے تو آپ کے مزاح نگار بننے میں اور آسانی ہو جائے گی۔ برتن چاہے کہیں بھی بنے اس پر مرادآباد کی مہر لگ جائے تو اس کا بکنا آسان ہو جاتا ہے۔

سفرنامہ: یہ نثری ادب کی جدید ترین صنف ہے یوں تو اس کے لکھنے کے لیے ایک سفر کرنا ضروری ہے لیکن اگر آپ اس کے اہل نہیں ہیں کہ اگر کوئی آپ کو یورپ یا امریکہ سے فری ٹکٹ بھجوائے تو ہم آپ کو ایسے ہتھکنڈے بھی بتا سکتے ہیں کہ آپ گھر بیٹھے سفرنامہ تصنیف کر سکتے ہیں۔ اتنا تو آپ جانتے ہوں گے کہ ہر ہدایت نامہ کے ساتھ ایک سربمہر لفافہ منسلک ہوتا ہے جس میں کچھ خفیہ ہدایات درج ہوتی ہیں جو صرف اس کے نصیب میں آتی ہیں جو وہ کتاب خریدتا ہے۔ سفرنامہ لکھنے کے لیے ہماری ہدایات بھی ایک سربمہر لفافے میں بند ہیں۔ اگر آپ میں سے کوئی صاحب وہ ہدایات پڑھنے کے خواہش مند ہوں تو ہمیں منی آرڈر بھیجیے، لفافہ آپ کو بذریعہ رجسٹری بھجوا دیا جائے گا۔

دلیپ سنگھ

اردو ادب کا سائیں بابا

میرے گھر میں رواج ہے کہ میری غیر حاضری میں جو فون آتے ہیں ان کی نہ صرف مجھے اطلاع دی جاتی ہے بلکہ مجبور کیا جاتا ہے کہ میں آتے ہوئے فون کا فوراً جواب دوں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مجھے اکثر فون میرے پروڈیوسروں کے آتے ہیں جن کے لیے یا تو میں ٹیلی ویژن سیریلز لکھ رہا ہوں یا وہ مجھ سے لکھوانا چاہتے ہیں اور اس طرح وہ میری آمدن کا معقول ذریعہ ہیں۔ گھر کے لوگ یہ نہیں چاہتے کہ میرے فون نہ کرنے کی وجہ سے کوئی آیا ہوا گاہک لوٹ جائے۔

کوئی دو ہفتے پہلے بلراج ورما کا فون آیا۔ مجھے میرے گھر کے رواج کے مطابق اطلاع دی گئی اور مجھ پر دباؤ ڈالا گیا کہ میں بلراج کو فوراً فون کروں۔ میں نے بہتیرا کہا کہ بلراج ورما سے کسی طرح کی آمدن کی امید نہیں۔ اس لیے اسے فون کرنا فضول ہوگا۔ میری بیوی نے کہا۔ فون کرنے میں کیا حرج ہے۔ کیا پتہ کوئی پروڈیوسر اس کے ذریعہ تم تک آرہا ہو۔ میں نے کہا یہ ناممکن ہے۔ ہندوستانی کلچر کے مطابق میرا گاہک اگر کسی دوسری دکان پر چلا گیا تو اس دکان پر مال ہو یا نہ ہو وہ اسے میری طرف نہیں بھیجے گا۔

بیوی نے کہا پھر بھی فون کرنا ضروری ہے۔ بلراج تمہارا اتنے سالوں کا دوست ہے۔ چلو مان لیا فون سے فائدہ نہیں ہوگا۔ اس کی خیر خیریت تو معلوم ہو جائے گی۔ میں نے کہا مجھے تو اس کی بھی امید نہیں کیوں کہ میں نے جب بھی بلراج کو فون کیا ہے یہی خبر ملی ہے کہ اس کو دل کا دورہ پڑا ہے یا اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ ایسی خیر و عافیت جاننے سے نہ جاننا اچھا۔

خیر صاحب۔ بیویاں کہاں مانتی ہیں۔ میری بیوی نے فون ملا کر مجھے تھما دیا۔ بلراج کی آواز آئی تو اس نے کہا۔ "تمھیں پتہ ہے نا میری ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک کا تو پتہ ہے دوسری بھی کیا ٹوٹ گئی۔" بلراج کہنے لگا۔ "گھبراؤ مت۔ میرا اور کچھ نہیں ٹوٹتا۔ میں تمھیں یہ اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا کہ شاعر کا نیا شمارہ آگیا ہے۔"

میری بیوی نے جب میری بات سنی تو کہنے لگی تم خواہ مخواہ ڈر رہے تھے۔ دیکھ لو بلراج کی دوسری ٹانگ

صحیح سلامت ہے۔ میں نے کہا یہ تمہارا خیال ہے۔ اردو کا ادیب جب اپنا خود کا رسالہ نکالتا ہے تو سمجھو اس کی دوسری ٹانگ بھی ٹوٹ گئی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلی حادثے میں ٹوٹی تھی۔ دوسری اس نے خود توڑ لی ہے۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ بلراج ورما سے میری پہلی ملاقات کوئی پینتیس چھتیس برس پہلے ہوئی تھی۔ میں ان دنوں بی۔اے میں پڑھ رہا تھا اور بلراج کچھ پڑھ لکھ کر کسی سفارش کے زور پر محکمہ تعلیم میں ملازم تھا۔ دونوں ادبی شوق رکھتے تھے اور کبھی کبھار کسی رسالے میں ہماری کوئی تخلیق شائع ہو جایا کرتی تھی۔ میرا ایک پروفیسر ہر ہفتے اپنے گھر میں ایک محفل رکھتا تھا۔ جہاں ابھرتے فن کار اپنی تخلیقات پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ ہم دونوں باقاعدگی سے جایا کرتے تھے۔ مجھے جہاں تک یاد ہے ہم دونوں نے کبھی وہاں کچھ نہیں پڑھا۔ لیکن پھر بھی دوسروں کے مقابلے میں خود کو بڑے ادیب سمجھا کرتے تھے اور اپنے مشوروں سے دوسروں کو نوازا کرتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ بلراج اپنے آپ کو مجھ سے بڑا ادیب سمجھتا تھا اور بڑی شفقت سے میری پیٹھ ٹھونک کر کہا کرتا تھا۔ "دلیپ، یار تم کمال کے آدمی ہو ایک دن بہت اونچا جاؤ گے۔ اس کا آشیرواد میرے لیے ایسے ہی تھا جیسے ایک مریل شخص ایک اور مریل شخص کو کہے کہ تم ایک دن رستم ہند بنو گے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے ہمیشہ ایسا لگتا تھا کہ ایک دن میں واقعی بڑا ادیب بنوں گا۔ اپنی عقل و فراست سے نہ سہی، بلراج کے آشیرواد سے ہی سہی۔

مجھے اس کے آشیرواد سے ایک دو شکایتیں بھی تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ اور دوسری یہ تھی کہ وہ جب بھی مجھے آشیرواد دیتا تھا، مجھے لگتا تھا مجھے محسوس کروا رہا ہے کہ وہ مجھ سے کسی نہ کسی لحاظ میں بڑا ہے کیوں کہ آشیرواد تو ہمیشہ بڑے ہی دیتے ہیں۔ ایسا تو کبھی ہوتا نہیں پوتا دادا کو بھی بنگار خد تمہیں بڑی عمر عطا... میں نے دل ہی دل میں ٹھان لیا کہ کسی نہ کسی طرح بلراج سے بڑا بننا ہے اور ایک دن اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر اسے آشیرواد دینا ہے۔

میں پڑھ لکھ کر سرکاری ملازم ہو گیا۔ رتبہ ہمارا برابر ہو گیا۔ میں نے نوکری کے علاوہ ریڈیو کے لیے لکھنا شروع کر دیا اور اس طرح بلراج سے زیادہ کمانے لگا اور کچھ شہرت بھی ملی۔ میں نے سوچا یہ موقع ہے بلراج کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر کہنے گا کہ بھائی محنت کرو اور میری طرح نام اور دام کماؤ۔

چنانچہ اگلی بار جب بلراج سے ملاقات ہوئی اور میں نے ابھی اپنا ہاتھ اس کی پیٹھ کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ اس نے کہا۔ آؤ یار، تمہیں گھر لے چلوں۔" گھر جا کر اس نے مجھے مکتی بھابی سے ملوایا۔ اچھی پیاری لڑکی سے اس کی شادی کب ہوئی۔ اس کا مجھے علم نہ تھا۔ لیکن حسد ضرور ہوا کہ اس کو اتنی پیاری بیوی کیسے مل گئی۔ میں نے سوچا اس نے اپنی تمام ادبی صلاحیتوں کو کام میں لاکر کچھ ایسا افسانہ گھڑا ہوگا کہ اس کے سسر نے سمجھ لیا ہوگا کہ اپنی بیٹی ایک بڑے ادیب سے بیاہ رہا ہے۔ مجھے خیال آیا کہ اس نے تو ادبی صلاحیتوں کے زور پر ایک خوب صورت بیوی بیاہ لی۔ میں نے ریڈیو پر ڈرامے لکھ کر کیا تیر مارا ہے۔ میرا ہاتھ بلراج کی پیٹھ کی طرف جانے کی بجائے اپنے آپ نیچے گر گیا۔

جب اگلی ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ بلراج کے ہاں ایک بہت ہی پیاری بچی نے جنم لیا ہے۔ پھر پتہ

جلا کہ بچیوں کی تعداد تین تک پہنچ گئی ہے۔ بلراج پر سبقت لے جانے کا میرے پاس اب ایک بڑا ہی آسان راستہ تھا۔ میرے ہاں ایک لڑکا پیدا ہو اور میں بلراج کی پیٹھ پر شفقت بھرا ہاتھ رکھ کر کہوں۔ جا ہم نے کہہ دیا ہے تیرے ہاں بھی لڑکا پیدا ہوگا۔ لیکن قدرت نے میری یہ اسکیم بھی رد کر دی کیوں کہ میں خود یکے بعد دیگرے دو لڑکیوں کا باپ بن گیا۔ چناں چہ کس منہ سے اسے آشیرواد دیتا۔

انہی دنوں میں نے اسٹیج کے لیے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ میرے دو ڈراموں نے خاص طور پر بہت شہرت حاصل کی۔ ان کے کئی کئی شو ہوئے۔ مجھے یاد ہے ایک دن ایک ڈرامے کے خاتمے پر جب مصنف کو بھی مجھے اسٹیج پر بلایا گیا تو حاضرین نے پر زور تالیوں سے مجھے داد دی۔ میں کامیابی کے نشے میں سرشار حاضرین کی طرف دیکھ رہا تھا کہ میں نے اس بھیڑ میں بلراج کو پہچانا! میں نے دیکھا وہ اسٹیج کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں نے سوچا کھسکو بھائی، ورنہ بلراج تمہاری پیٹھ پر شفقت بھرا ہاتھ پھیر کر کہے گا۔ "یار دلیپ اچھا لکھ رہے ہو۔ یونہی لکھتے رہے تو ایک دن کچھ بن جاؤ گے۔" یہ خیال آتے ہی میں وہاں سے چپکے سے کھسک گیا۔ اگلے دن میں نے ایک اخبار میں اپنے ڈرامے پر ایک پورے کالم کا ریویو دیکھا جس میں ڈرامے کی بے حد تعریف کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ "دلیپ سنگھ ایک دن بہت بڑا ڈرامہ نویس بنے گا۔" ریویو لکھنے والے کا نام تھا بلراج ورما یعنی بلراج نے اپنا شفقت بھرا ہاتھ اخبار کے ذریعہ میری پیٹھ پر رکھ دیا۔

۱۹۸۰ء میں ملازمت کے سلسلے میں یورپ چلا گیا۔ واپس لوٹنے پر ایک دن فکر تونسوی کے گھر ایک رسالے پر نظر پڑی۔ نام تھا تناظر اور ایڈیٹر تھا بلراج ورما۔ میں نے کہا "فکر" ہمارا بھی ایک یار ہے بلراج ورما" کہنے لگے یہ وہی تو ہے۔"

تھوڑی اور پوچھ تاچھ کی تو پتہ چلا کہ بلراج ورما نہ صرف تناظر کا ایڈیٹر ہے بلکہ اپنی کہانیوں کے تین مجموعے شائع کر چکا ہے۔ میں نے پوچھا۔ "یہ کہانیاں اس نے لکھیں کب؟" کہنے لگا "ملازمت سے سبک دوشی کے بعد۔"

یہ سن کر مجھے یاد آیا ہمارے گاؤں میں ایک شخص نے بڑھاپے میں شادی کی اور پے در پے پانچ بچے پیدا کر دیے۔ لوگوں نے پوچھا "باباجی اس عمر میں بچے؟" کہنے لگا۔ "یار ہماری جوانی کہیں بھی تھوڑے ہی گئی تھی۔ اس بوڑھے جسم کے اندر بہ حفاظت رکھی ہوئی تھی۔

بلراج ورما کی ادبی زندگی کا کچھ ایسا ہی حال ہے۔ جوانی میں اس نے کچھ نہیں لکھا لیکن اس نے زندگی کے تجربات ضائع نہیں کیے سنبھال کر رکھے اور جب ملازمت سے فرصت ملی تو انہیں نکال کر سفینہ کاغذ پر الٹ دیا۔

کہانی لکھنا تو خیر ہوا۔ لیکن یہ ایڈیٹری کس لیے؟ اس کام میں تو بڑے بڑے دھنوان کنگال ہو جاتے ہیں۔ سب سوچنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تناظر کے وجود میں آنے کی وجہ بلراج کی آشیرواد دینے کی عادت . . . ہے جب تناظر کے . . . لیے ادیب اسے اپنی تخلیقات پیش کرتے ہیں تو وہ ان کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہے کہ برخوردار بہت اچھی کہانی لکھتے ہو۔ دیکھنا کسی دن بہت

اونچا مقام حاصل کروگے۔

اس طرح آشیرواد دینے میں بلراج کی پنشن پر کیا گزرتی ہے۔ اس کی تو وہ ہی جانے لیکن لوگ پتنگ بازی اور کبوتر بازی کے شوق میں تباہ ہو جاتے ہیں۔ بلراج تو پھر بھی رسالہ نکال رہا ہے۔

تناظر کے جس پرچے کا آج اجرا ہو رہا ہے۔ وہ میں دیکھ چکا ہوں۔ میں نے اسے تنقیدی نظر سے دیکھا تو اس میں ایک آدھ نقص بھی ڈھونڈ لیا۔ لیکن اس نقص کا میں ذکر نہیں کروں گا۔ مجھے آج برسوں کے بعد موقع ملا ہے بلراج ورما کو آشیرواد دینے کا۔ اسے میں کیوں کھو دوں۔ چنانچہ آج تناظر کے ستارھویں اشوع کی رسم اجرا کے موقع پر میں بلراج ورما کو آشیرواد دیتا ہوں کہ اگر تناظر یونہی اسی طرح محنت کرتے رہوگے برخوردار تو اس کا ہندوستان کے بہترین رسالوں میں شمار ہوگا۔ میری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔

غزل

دلیپ سنگھ

یہ چلن ٹھہرا کہ ہر کام بہ شمشیر کریں
دلِ معشوق کو بندوق سے تسخیر کریں

دل میں خواہش ہے کہ ہم بھی کبھی اندر جا کر
پارلیمنٹ میں بے معنی سی تقریر کریں

رات یہ خواب نظر آیا کہ ہم پکڑے گئے
کیوں نہ اس خواب کی اس طرح سے تعبیر کریں

ہتھکڑی بن کے جکڑ لے ہیں گیسو تیرا
اور تری زلف کو اپنے لیے زنجیر کریں

عاشقی کو کسی بابو نے کہا "صبر طلب"
کیونکہ یہ لوگ ہر اک کام میں تاخیر کریں

سب کو معلوم ہے انعام ہیں ملتے کیسے
تم کو لینا ہو تو پھر ویسی ہی تدبیر کریں

تم ہو گر نورجہاں تو یہ کبوتر تھامو
تاکہ ہم خود کو گھڑی بھر کو جہانگیر کریں

وہ رلانے کو لکھیں اور میں ہنسانے کو لکھوں
کیا ضروری ہے کہ میں وہ کروں جو میر کریں

لاکھ ڈھونڈا کہیں ملتی نہیں ممتاز محل
جس کے دفنانے کو ہم تاج کی تعمیر کریں

رسم اجرا ہو کتابوں کا چلن یہ ٹھہرا
مجتبیٰ خاکہ پڑھیں گوپی چند تقریر کریں

ہم سے بڑھ کر کوئی شاعر ہی نہیں اردو میں
اس حقیقت کی ذرا کھل کے آپ ہی تشہیر کریں

دلیپ سنگھ

(ڈرامہ)

دوسرا موقع

کردار

۱. رام لال ۲. پاروتی ۳. گوبند رام گپتا
۴. منشی ۵. مجسٹریٹ ۶. ریٹا

پہلا سین

(رام لال کے گھر کا ایک کمرہ۔ رام لال کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہے اس کے سامنے چھوٹے سے ایک ٹیبل پر ڈرائی فروٹ کی ایک پلیٹ ہے۔ اور چائے کا کپ۔ پلیٹ میں سے ڈرائی فروٹ کھا رہا ہے۔ اور چائے پی رہا ہے۔ سامنے تخت پوش پر بیٹھی اس کی بیوی پاروتی سبزی کاٹ رہی ہے۔ بیچ بیچ میں وہ غصّے کی نظر سے رام لال کی طرف دیکھتی ہے۔ پر وہ اس کی پرواہ کئے بغیر اپنے کام میں مصروف ہے)۔

پاروتی :۔ ایسا بے شرم آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ کیا آرام سے بیٹھا بادام کھا رہا ہے۔ ہے اس کو ذرا بھی خیال کہ کسی اور کو بھی پوچھ لے۔

رام لال :۔ پاروتی تم تو یوں ہی ناراض ہو رہی ہو۔ میں بادام کوئی خوشی سے کھا رہا ہوں؟

پاروتی :۔ نہ نہ، تمہارے سامنے تو کوئی بندوق لیکر کھڑا ہے۔ اور کہہ رہا ہے۔ کہ رام لال بادام کھا نہیں تو جان سے مار دوں گا۔

رام لال :۔ تم جو چاہو کہہ لو۔ پر میں بادام کھا رہا ہوں دوائی کے طور پر۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ کھاؤ تو کھا رہا ہوں۔ تم ہی بتاؤ پہلے کبھی کھائے ہیں میں نے بادام؟

پاروتی :۔ بادام کھانے کے لیے ڈاکٹر نے کہا ہے تمہیں؟

رام لال :۔ اور کیا؟

پاروتی :۔ ہائے میں مر جاؤں اتنی کڑوی دوائی دے دی ہے اُس ظالم نے تمہیں۔

رام لال :۔ اب تم تو خواہ مخواہ ہر بات کا مذاق بنا لیتی ہو۔ بھگوان قسم مجھے ڈاکٹر نے کہا ہے۔ کل سے مجھے زکام سا ہو رہا تھا۔ آج سویرے جب میں سیر کرنے کو نکلا تو ڈاکٹر مہتہ کے گھر چلا گیا۔ میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب کچھ زکام سا ہو گیا ہے"۔ وہ تو بگڑ گیا ایک دم۔ کہنے لگا "کچھ زکام سا" کہتے ہو۔ ارے بھائی یہ بڑی خطرناک بیماری ہے۔ اس کا ابھی سے علاج کرو ورنہ ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے"۔ میں نے کہا اگر یہ بات ہے تو دے دو کوئی گولی گولی۔ کہنے لگا گولی کی ضرورت نہیں ہے۔ پاؤ بھر بادام لو۔ اس میں تھوڑے سے کاجو اور کچھ دانے پستے کے ڈال دو۔ اور یہ سب گرم گرم چائے کے ساتھ کھا جا۔

زکام جاتا رہے گا ۔ ۔ ۔ ۔ میں تو پاروتی دوائی کھا رہا ہوں
کوئی عیاشی نہیں کر رہا ۔

پاروتی :۔ ڈاکٹر کے ہاں گئے تھے تو کم از کم مجھے بتا کر
تو جاتے ۔ مجھے بھی تو کل سے زکام ہو رہا ہے ۔
میرا بھی پوچھ آتے ۔

رام لال :۔ اور تم کیا سمجھتی ہوئی نے نہیں پوچھا ؟ ارے
بھائی میں تو جب بھی ڈاکٹر کے پاس جاتا ہوں
پورے خاندان کی بیماریوں کا علاج پوچھ کر آتا
ہوں ۔ اس طرح ایک ہی فیس میں جان چھوٹ
جاتی ہے ۔

پاروتی :۔ تمہیں پتہ تھا مجھے زکام ہو رہا ہے ؟

رام لال :۔ تم نے کل شام کو چھینک ماری تو میں نے
سوچا یا تو تم ہم کو کیا کرو گی ۔ زکام ہی ہو رہا
ہوگا ۔

پاروتی :۔ تو پھر ڈاکٹر نے کیا کہا ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ لو میں بھی سٹھیا
گیا ہوں نا کہنا کیا تھا ! یہی کہا ہوگا چائے کے
ساتھ بادام کھاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ذرا باداموں کی
پلیٹ اِدھر کرنا ۔

رام لال :۔ نہیں پاروتی تمہیں بادام کھانے کو نہیں کہا ۔

پاروتی :۔ تو پھر کیا کہا ۔ دیسی گھی کا سیرا کھانے کو کہا
تھا ۔

رام لال :۔ نہیں ۔

پاروتی :۔ تو کیا کوئی گولی دی اُس نے ؟

رام لال :۔ نہیں ۔

پاروتی :۔ تو پھر کیا کہتا تھا ؟

رام لال :۔ کہتا تھا ۔ سبزی بناتے وقت پتیلے سے
جو بھاپ نکلتی ہے اُسے سونگھو ۔ زکام ٹھیک
ہو جائے گا ۔

پاروتی :۔ میں پتیلے کی بھاپ سونگھوں ؟

رام لال :۔ ہاں ۔

پاروتی :۔ اور تم بادام کھاؤ ۔

رام لال :۔ ہاں ۔

پاروتی :۔ زکام تجھے ۔ زکام مجھے ۔ پھر دوائی الگ
الگ کیوں ؟!

رام لال :۔ ڈاکٹر کہتا تھا مردانہ اور زنانہ زکام میں
فرق ہوتا ہے ۔

پاروتی :۔ ڈاکٹر کہتا تھا یا تم کہہ رہے ہو ؟

رام لال :۔ میں کیوں کہوں گا ؟ مجھے اس میں کیا فائدہ ہے ؟

پاروتی :۔ کوئی بات نہیں میں سونگھ لوں گی پتیلے
کی بھاپ ڈاکٹر کے ہاں گئے تھے تو وہ بھی پوچھ
لینا تھا ؟

رام لال :۔ کیا ؟

پاروتی :۔ تمہیں بتایا تو تھا ۔ کہ میرا وزن کچھ بڑھ سا
رہا ہے ۔

رام لال :۔ اچھا تمہارے مٹاپے کا علاج ۔

پاروتی :۔ شرم تو نہیں آتی ۔ ذرا سا وزن بڑھ گیا ہے
اُسے مٹاپا کہہ رہے ہو ۔

رام لال :۔ تم بھی تو اچھے خاصے مٹاپے کو ذرا سا وزن
بڑھنا کہہ رہی ہو ۔ میں نے پوچھا تھا ڈاکٹر سے
اس کا علاج ۔ ۔ ۔ ۔

پاروتی :۔ سنا ہے آج کل گولیاں نکل آئی ہیں جن کے
کھانے سے وزن اپنے آپ کم ہو جاتا ہے ۔

رام لال :۔ ڈاکٹر نے ایسی کوئی گولی نہیں دی ۔

پاروتی :۔ ڈاکٹر نے کیا کہا ؟

رام لال :۔ کہہ رہا تھا ۔ نوکرانی نکال دو ۔ اور فرش
پر پوچھا آپ لگایا کرو ۔ وزن اپنے آپ
گھٹ جائے گا ۔

پاروتی :۔ نوکرانی نکال دوں ؟

رام لال :- ہاں۔ کہہ رہا تھا۔ جھاڑو دینا۔ پونچھ لگانا۔ بہت اچھی ورزشیں ہیں۔
پاروتی :- اچھا مجھے زکام ہو تو میں پتیلے کی بھاپ سونگھوں۔ میرا وزن بڑھے تو فرش پر پونچھ لگاؤں۔ کیا سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے۔؟
رام لال :- پاروتی اس میں میرا کیا قصور ہے۔ یہ تو ڈاکٹر نے کہا ہے۔
پاروتی :- ٹھیک ہے۔ اگر مجھے جھاڑو ہی دینا ہے تو اور کہیں دے لوں گی۔ تم سنبھالو اپنا گھر۔ میں چلی۔
رام لال :- چلی ؟۔ کہاں چلی ؟
پاروتی :- کہیں بھی جاؤں، یہاں نہیں رہوں گی ـــ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی سیٹھ کاشی رام کی بہو۔ کہ جہاں عزت نہ ہو وہاں رہنے سے کیا فائدہ
رام لال :- چھوڑو پاروتی۔ ایسی باتیں تمہیں شوبھا نہیں دیتیں۔ تم تو اس گھر کی رانی ہو۔
پاروتی :- رانیاں گھروں میں جھاڑو نہیں دیتیں۔ پتیلے کی بھاپ نہیں سونگھتیں۔ تم سنبھالو اپنا راج پاٹ میں جا رہی ہوں۔
رام لال :- تمہیں شاید یاد نہیں رہا پاروتی، میں تمہیں اس گھر میں بیاہ کر لایا ہوں۔
پاروتی :- میں تم سے طلاق لے رہی ہوں۔
رام لال :- کیا ؟
پاروتی :- طلاق لے رہی ہوں میں۔
رام لال :- چھوڑو بھئی سویرے سویرے اس قسم کا مذاق مجھے اچھا نہیں لگتا۔
پاروتی :- یہ مذاق نہیں ہے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔
رام لال :- یعنی تم سچ مچ مجھے چھوڑ کر جا رہی ہو ؟ !
پاروتی :- ہاں۔

رام لال :- اتنی اچھی خبر اور تم نے مجھے بغیر منہ میٹھا کرائے سنادی۔ یہ جھوٹ ہے۔ کہ تم مجھے اس عمر میں اس قید سے رہائی دے رہی ہو جس میں ہم زندگی بھر کے لیے بندھ گئے تھے ـــ جھوٹ ہے نا ؟
پاروتی :- کتنی بار کہوں کہ یہ جھوٹ نہیں، سچ ہے۔
رام لال :- مجھے یقین نہیں آتا
پاروتی :- میں سچ کہہ رہی ہوں۔ سچ کہہ رہی ہوں سچ کہہ رہی ہوں۔
رام لال :- بھگوان تمہیں اپنے پرن کو پورا کرنے کی شکتی دے۔
پاروتی :- پورا کروں گی۔ میں نے اگر کہا ہے تو پورا کرکے دکھاؤں گی۔
رام لال :- میں نے کہا وکیل کوئی اچھا سا کرنا۔ تاکہ کام ہو جائے تمہارا۔
(پاروتی اُٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے)
رام لال :- میں نے کہا اِسی گلی کے موڑ پر ایک بڑا قابل وکیل ہے گوبند رام گپتا۔ اُس کے ہاں چلی جانا۔ میرا نام لوگی تو فیس میں رعایت کر دے گا۔
پاروتی :- [ایک قدم چل کر] ہاں اُسی کے پاس جاؤنگی۔
رام لال :- فیس کے پیسے میں کہ میں دوں ؟
(غصے میں پاروتی باہر نکل جاتی ہے]
رام لال :- طلاق دے گی ؟ ایسی قسمت کہاں میری ایسا ہی نصیب والا ہوتا تو اس سے شادی کیوں ہوتی ؟ طلاق دے گی۔ ایسا بیوقوف اسے ملے گا کہاں ؟
(ہنستا ہے)
[فیڈ آؤٹ]

دوسرا سین

[گووِندرام گپتا اپنے دفتر میں بیٹھا ہے۔ اُس کے لباس اور کمرے میں پڑے فرنیچر سے پتہ لگتا ہے کہ وہ ایک معمولی وکیل ہے۔ منشی کے ساتھ پاروتی اندر آتی ہے]۔

منشی :۔ [پاروتی سے] آجائیے۔ آجائیے۔ شرمانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کوئی انوکھا کام نہیں کررہے ہیں۔ وہ زمانے گئے، جب لوگ طلاق لیتے ہوئے ڈرتے تھے۔ اب تو طلاق لینا یا دینا ایک معمولی کام بن گیا ہے سیکڑوں لوگ ہر روز طلاق لے رہے ہیں۔ آپ کا نام ان لوگوں میں لکھوا کر ہمیں بہت خوشی ہوگی نہیں جی، یہ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ آپ ٹھیک جگہ پر آگئی ہیں۔ طلاق کے معاملے میں شری گووِندرام گپتا سے بڑا وکیل کم از کم اس شہر میں تو نہیں ہے۔ یہ گپتا جی کی ہی ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہے کہ جن گھروں میں روز تُو تُو مَیں مَیں ہوتی تھی وہاں طلاق کی وجہ سے آج سکھ اور شانتی کا راج ہے۔
[وکیل سے] گپتا جی پاروتی بہن کا کام کرنا ہے۔ باقی سب کام چھوڑ دیجئے۔

گُپتا :۔ آؤ بہن جی بیٹھیے۔ طلاق چاہیئے آپ کو؟

پاروتی :۔ ہاں۔

گُپتا :۔ کس سے لینا ہے طلاق آپ کو ؟

پاروتی :۔ طلاق کس سے لیتے ہیں۔ پتی کے علاوہ بھی کوئی طلاق دے سکتا ہے۔

گُپتا :۔ م م میرا مطلب ہے آپ کے پتی کا نام کیا ہے؟

پاروتی :۔ شری رام لال۔ آپ شاید انھیں جانتے ہیں۔

گُپتا :۔ مَیں اگر جانتا بھی ہوں تو سمجھ لیجئے نہیں جانتا۔ اگر مجھے اس کے ساتھ مقدمہ لڑنا ہے تو سمجھ لیجئے وہ آج سے میرا دشمن ہوگیا۔

مُنشی :۔ اِسے کہتے ہیں اصول کی پابندی اِدھر آپ کا مقدمہ لیا اُدھر آپ کا پتی، اُن کا وکیل، اُن کے دوست یار سب گپتا جی کے دشمن ہوگئے۔

گُپتا :۔ سچ مانیئے بہن جی۔ صرف اصولوں کی اِس پابندی کی وجہ سے آج اِس شہر میں ستّر، فیصد لوگوں کے ساتھ میرا بیٹھنا اُٹھنا، کھانا پینا بند ہے۔

پاروتی :۔ وکیل صاحب مجھے طلاق چاہیئے اور جلدی چاہیئے۔ مَیں نے عہد کیا ہے اپنے خاوند کے آگے۔ اب یہ کرکے ہی دکھاؤں گی۔

گُپتا :۔ بہن جی آپ سمجھ لیجئے آپ کی طلاق ہوگئی ہم کل ہی مقدمہ دائر کردیں گے۔ پہلے آپ کو ملے گی ٹمپریری سیپریشن اور پھر باقاعدہ طلاق مل جائے گی۔

پاروتی :۔ ٹمپریری سیپریشن مِلنے میں کوئی چکّر تو نہیں ہوگا۔

منشی :۔ کیا بات کررہی ہو بہن جی ؟ گپتا جی کو آپ نے سمجھ کیا رکھا ہے؟ طلاق دِلانا اِن کا خاندانی پیشہ ہے۔ اور ٹمپریری سیپریشن دلانے میں تو اِن کا کوئی ثانی نہیں ہے معلوم ہے آپ کو کہ شکنتلا کی راجہ دشینت سے ٹمپریری سیپریشن کس نے دلوائی تھی ؟ گپتا جی کے پردادا نے۔

گُپتا :۔ وہ تو . . . . . وہ تو شکنتلا کی اپنی مرضی نہیں تھی ورنہ پردادا جی نے طلاق بھی دلوادی

ہوتی۔

پاروتی :۔ مجھے بتائیے طلاق لینے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے۔

گپتا :۔ اگر آپ ہی کو کرنا ہے تو پھر ہم کس مرض کی دوا ہیں۔ آپ کو کچھ نہیں کرنا ہے بس فیس دینی ہے۔ ہاں بس اتنا بتا دیجیے کہ آپ کا آپ کے پتی کے ساتھ جھگڑا کیا ہے؟ کیا وہ آپ کو خرچ کرنے کو پیسے نہیں دیتا؟

پاروتی :۔ کیا بات کر رہے ہیں آپ وکیل صاحب؟ تنخواہ رکھوا لیتی ہوں پوری کی پوری۔

گپتا :۔ مارپیٹ کرتا ہے کیا؟

پاروتی :۔ (ہنستی ہے) وہ مجھے مارے گا۔ چڑیا جیسی تو جان ہے اُس میں۔

گپتا :۔ شراب پیتا ہوگا۔

پاروتی :۔ میرے گھر میں شراب۔ میں نے تو کبھی اسے دوسرا کپ چائے کا پینے نہیں دیا۔

گپتا :۔ تو پھر۔۔۔ میرا مطلب ہے کوئی دوسری عورت۔۔۔

پاروتی :۔ (ہنستی ہے) وکیل صاحب دوسری عورت اُس کے ساتھ دوستی کرے گی۔ میرے ساتھ اس کی شادی اِس لیے ہوگئی کہ میں نے شادی سے پہلے اسے دیکھا نہیں تھا۔

گپتا :۔ تو پھر طلاق آپ کس بناء پر لینا چاہتی ہیں؟

منشی :۔ آخر کوئی وجہ تو ہونی چاہیے نا بہن جی۔

پاروتی :۔ وجہ آپ ڈھونڈ لیجیے۔ آپ فیس کس بات کی لے رہے ہیں۔

منشی :۔ چلو اگر یوں ہے تو یوں ہی سہی۔ اس چھوٹی سی بات کے لیے کیس تھوڑا ہی چھوڑ دیں گے ہم وجہ ڈھونڈ نکالیں گے۔

گپتا :۔ ایسا کیجیے بہن کہ آپ سب ہم پر چھوڑ دیجیے ہم کل مقدمہ دائر کر دیں گے۔ مقدمہ دائر کرنے کے بعد میں آپ کو اطلاع کر دوں گا۔ آپ اُس دن عدالت میں حاضر ہو جانا۔ باقی ہم سنبھال لیں گے۔ فیس جاتے ہوئے منشی جی کو دے جانا۔

پاروتی :۔ کتنی؟

منشی :۔ آپ چلیے تو میں آپ کو بتا دوں گا۔ آئیے میرے ساتھ۔ [پاروتی اور منشی باہر چلے جاتے ہیں۔ گپتا انھیں جاتا ہوا دیکھ رہا ہے]۔

(فیڈ آؤٹ)

تیسرا سین

[مجسٹریٹ کی کچہری۔ گپتا، منشی اور پاروتی ایک طرف کھڑے ہیں مجسٹریٹ کی کرسی ابھی خالی ہے۔ رام لال آتا ہے:]

رام لال :۔ پاروتی یہ تم نے کیا غضب کیا؟ پگلی میں نے تو مذاق کیا تھا۔ اور تم نے سچ مچ مجھے کچہری میں لا کھڑا کیا۔ آؤ چلو گھر چلیں۔

گپتا :۔ (رام لال اور پاروتی کے بیچ آکر) آپ کو میرے موکل سے بات کرنے کا کوئی حق نہیں۔

رام لال :۔ میں اپنی پتنی سے بات کیوں نہیں کروں گا؟ ہٹو پیچھے کالا کوٹ پہن کر اپنے آپ کو تیس مار خاں مت سمجھو۔

گپتا :۔ میں نے کہا خیریت چاہتے ہو تو چپ چاپ ہٹ جاؤ یہاں سے۔ اب شریمتی پاروتی پر آپ کا کوئی حق نہیں۔

رام لال :۔ پاروتی اِن بدمعاشوں کی باتوں میں نہ آنا۔ یہ تو فیس کے لالچ میں کچہری کرنے کو

تیار ہیں۔ تو آجا میرے پاس، چل گھر چلیں۔

منشی :۔ بہن جی کو گھر لے جانے والے تم ہوتے کون ہو؟

رام لال :۔ تم چپ رہو۔ آیا بڑا بہن کا رشتہ دار۔

(مجسٹریٹ اندر آتا ہے)

مجسٹریٹ :۔ (کرسی پر بیٹھ کر) وکیل صاحب یہ کیا تماشہ ہو رہا ہے؟

گپتا :۔ اسے پوچھئے حضور یہی شور کر رہا ہے۔

مجسٹریٹ :۔ یہ آدمی کون ہے؟

گپتا :۔ حضور یہ ملزم ہے۔

رام لال :۔ میں کوئی ملزم نہیں ہوں۔ یہ فضول بک رہا ہے

مجسٹریٹ :۔ آپ کو جو بھی کہنا ہے اُس کٹھہرے میں کھڑے ہو کر کہیئے۔ (رام لال ملزموں کے کٹھہرے میں جا کھڑا ہوتا ہے)

مجسٹریٹ :۔ یہ عورت کون ہے؟

گپتا :۔ حضور یہ ملزم کی پتنی ہے۔ یہ آپ کی عدالت میں فریاد لے کر آئی ہے۔ کہ اسے طلاق دیا جائے۔

مجسٹریٹ :۔ کیا میں طلاق دے سکتا ہوں؟

رام لال :۔ حضور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو ضرور دے سکتے ہیں۔

(قہقہہ)

گپتا :۔ حضور آپ نے طلاق دینا نہیں، دلوانا ہے۔

مجسٹریٹ :۔ لیکن کیوں دلوانا ہے؟

گپتا :۔ حضور یہ آدمی جو آپ کے سامنے کھڑا ہے مجھ لیجئے یہ بکرے کی کھال میں ایک بھیڑیا ہے یہ آپ کو دکھائی تو انسان دیتا ہے لیکن اس کے اندر جو شیطان چھپا ہوا ہے، اسے دیکھئے۔

رام لال :۔ ارے یار۔ مجسٹریٹ صاحب یہاں انصاف کرنے بیٹھے ہیں کوئی ایکسرے کرنے نہیں بیٹھے۔

مجسٹریٹ :۔ آرڈر آرڈر۔

گپتا :۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ آدمی سماج کے جسم پر ایک پھوڑے کی طرح ہے۔ یہ اپنی بھولی بھالی اور معصوم پتنی کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ایک دوسری عورت کے ساتھ پیار کا ناٹک رچا رہا ہے لیجئے آپ کو کنوارا بتا کر اس عورت کے ساتھ بیاہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے آپ ہی بتائیے حضور کہ یہ بے چاری ایسے پتی کے ساتھ کیسے رہ سکتی ہے۔ جس کے اندر کچھ اور باہر کچھ اور ہے۔ ویسے تو ایسے سماج دشمن کی سزا یہ ہے کہ اُسے چوک میں کھڑا کر کے گولی سے اُڑا دیا جائے۔ لیکن میں شریمتی پاروتی کے وکیل کی حیثیت سے بس اتنی گزارش کروں گا کہ میری موکل کی طلاق کی درخواست منظور کی جائے۔

رام لال :۔ دوسری عورت کے ساتھ میں نے محبت کی ہے

گپتا :۔ ہاں۔

رام لال :۔ کمال ہے محبت میں کر رہا ہوں اور مجھے پتہ ہی نہیں۔

مجسٹریٹ :۔ وکیل صاحب

گپتا :۔ حضور یہ آدمی جان بوجھ کر بھولا بن رہا ہے ہمارے پاس اس کی حرکتوں کا ثبوت ہے۔

مجسٹریٹ :۔ کیوں شری مان جی اب بولو؟

رام لال :۔ بولوں گا۔ پہلے اِن سے کہیئے ثبوت پیش کریں۔

مجسٹریٹ :۔ ثبوت حاضر کیا جائے۔

(ایک خوبصورت سی لڑکی جس کا نام ریٹا ہے عدالت میں آتی ہے)۔

مجسٹریٹ :۔ آپ کا نام کیا ہے۔ کماری جی؟

ریٹا :۔ بس ریٹا سر۔

مجسٹریٹ :۔ آپ ملزم کو جانتی ہیں؟
ریٹا :۔ ہاں سر۔
پاروتی :۔ (گپتا سے) سرگوشی میں یہ کلموہی کون ہے؟
گپتا :۔ یہ ہماری گواہ ہے، آپ دیکھتی جائیے۔
مجسٹریٹ :۔ آرڈر آرڈر۔ مس ریٹا آپ ملزم کو اچھی طرح پہچانتی ہیں۔
ریٹا :۔ جی ہاں سر۔ مسٹر لال میرا بوائے فرینڈ ہے۔ اس نے پرامز کیا ہے کہ وہ میرے ساتھ میرج کرے گا۔
مجسٹریٹ :۔ اچھا۔
ریٹا :۔ حضور ہم روز اکھٹے سینما جاتے ہیں۔ ہوٹلوں میں جاتے ہیں۔ پارکوں میں جاتے ہیں۔ ہی اِز ،اِیوری تھنگ فار می سر۔
پاروتی :۔ وکیل صاحب یہ بال کٹی کیا بک رہی ہے۔
وکیل :۔ [آہستہ سے] آپ دیکھتی جائیے۔ یہ جو کچھ کہہ رہی ہے سب اپنا سکھایا ہوا ہے۔ یہ ہماری گواہ ہے ہماری۔
مجسٹریٹ :۔ آرڈر آرڈر۔ بڑی شرمناک بات ہے کہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اپنی بھولی بھالی بیٹی کو اس طرح دھوکا دے رہا ہے۔ ایسے آدمی سوسائٹی کے لیے کتنے خطرناک بن رہے ہیں کیوں رام لال یہ لڑکی جو کچھ کہہ رہی ہے وہ سچ ہے کیا؟ کیا تم واقعی اس کے بوائے فرینڈ ہو؟
رام لال :۔ [اپنے آپ سے] اگر میں اس وقت کہہ دوں کہ یہ لڑکی سچ بول رہی ہے۔ تو ایک بار رُعب تو بڑھ جائے گا سارے شہر میں مل کر رام لال ہے کوئی چیز جو اتنی خوبصورت لڑکی سے محبت کر رہا ہے۔ سویرے اخباروں میں میری اور اس کی تصویریں چھپ جائیں گی۔ پاروتی سے بعد میں نپٹ لوں گا۔ پہلے شہر میں اپنا ڈنکا تو بجالیں۔
مجسٹریٹ :۔ رام لال، ہم نے اپنے سوال کے جواب کا انتظار کر رہے ہیں۔ بولو اِس لڑکی کے ساتھ تمہارا کیا رشتہ ہے؟
رام لال :۔ حضور عدالت میں کھڑے ہو کر میں جھوٹ تو بول نہیں سکتا۔ سچی بات یہ ہے کہ اس لڑکی کے ساتھ پیار پیار کا رشتہ ہے۔ یہ میری گرل فرینڈ ہے۔
مجسٹریٹ :۔ اس کے ساتھ روزانہ سینما دیکھتے ہو؟
رام لال :۔ تینوں شو حضور۔
مجسٹریٹ :۔ ہوٹلوں میں کھانا کھاتے ہو؟
رام لال :۔ دونوں وقت حضور۔
پاروتی :۔ وکیل صاحب یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ لڑکی تو مان لیا تمہاری سکھی سکھائی بول رہی ہے پر میرا پتی تو آپ کا سکھایا ہوا نہیں ہے۔
گپتا :۔ بہن جی یہ تو ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ رام لال ایسا کیوں کہہ رہا ہے۔ پر جو کچھ وہ کہہ رہا ہے۔ وہ سب اپنے حق میں جا رہا ہے سمجھ لیجیے ہمارا کام ہوگیا۔
مجسٹریٹ :۔ آرڈر آرڈر ...... یہ آدمی واقعی بکر کے رُوپ میں بھیڑیا ہے۔ یہ آدمی بالکل بے شرم ہے اور ....
پاروتی :۔ حضور مائی باپ۔ میری ایک گزارش ہے
گپتا :۔ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ بولنے کے لیے میں جو کھڑا ہوں۔
پاروتی :۔ تمہارے کھڑے رہنے کو میں کیا کروں؟ میری دُنیا لُٹ رہی ہے۔ اور میں چپ رہوں؟
گپتا :۔ پر آپ تو طلاق لینا چاہتی ہیں؟

پاروتی :۔ ہاں لیکن میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ کہ وہ تو بڑھاپے میں عیش کرے اور میں مزدور کی ٹھوکریں کھاؤں۔ (مجسٹریٹ سے) حضور مائی باپ میری ایک گزارش ہے۔

مجسٹریٹ :۔ آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟

پاروتی :۔ حضور میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ غلطی کرنیوالے کو معاف کر دینا ایک بہت بڑی بات ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ میرے پتی نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ پر میں چاہتی ہوں کہ اُسے پیار محبت سے سیدھے راستے پر لے آؤں۔

مجسٹریٹ :۔ واہ! کتنے عظیم جذبات ہیں آپ کے لیکن اگر یہ آدمی پھر ٹیڑھے راستے پر جائے تو واپس اسی جگہ پر آجانا۔

پاروتی :۔ ٹھیک ہے حضور پہلے اخبار ہے۔ اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

[پاروتی غصّے سے رام لال کی طرف دیکھتی ہے]

رام لال :۔ [ڈر کر] حضور میری تو گزارش ہے کہ مجھے جیل بھیج دیجئے۔ وہاں میں چکی پیس پیس کر اپنے گناہوں کا ازالہ کروں گا۔

پاروتی : آپ گھر چلئے اس کا انتظام بھی ہو جائیگا۔

[بازو سے پکڑ کر رام لال کو باہر لے جاتی ہے]

(پردہ)

□□

غزل

دلیپ سنگھ

چور آئے گا تو شرمندہ کرے گا جان رکھ ÷ شرم سے بچنے کو گھر میں قیمتی سامان رکھ

لڑکیوں کو خط جو لکھنے ہوں تو کام آئے گا وہ ÷ اس لیے کہتا ہوں گھر میں داغ کا دیوان رکھ

عاقبت میں کام آئے گا خدا کو دل میں رکھ ÷ لیکن اس دنیا میں اپنے ساتھ تو شیطان رکھ

کیا پتہ کب دل بدل کر دشمنوں سے جا ملے ÷ ووٹ جب دینے لگے اس بات کا بھی دھیان رکھ

رشتے اپنے آپ آئیں گے تو اک کوٹھی بنا ÷ پھول آئیں گے تو اپنے پاس اک گلدان رکھ

عشق کا اپنے ڈھنڈورا دوستوں میں پیٹ خوب ÷ اپنی بیوی کو مگر اس عشق سے انجان رکھ

اب جو تجھ کو گالیاں دیتی ہے کیوں روتا ہے تو؟ ÷ اور اپنے گھر میں اپنی ساس کو مہمان رکھ

ہم کو لیڈر کہہ رہے ہیں لوگ سترہ سال سے ÷ تیری حالت بھی سدھاریں گے تو اطمینان رکھ

تو کہے گا اور کچھ ناقد سمجھ لے گا کچھ اور ÷ اپنے شعروں کی زبان آسان سے آسان رکھ

○

دلیپ سنگھ
(دہلی)

(پہلی قسط)

اردو شاعری میں طنز و مزاح

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو   بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مرزا غالب یہ شعر تو شاید اپنی رندی اور سرمستی کے جواز میں کہہ گئے اور ان کے اس بیان پر کئی لوگ معترض بھی ہوں گے اور دعویٰ کریں گے کہ مشاہدۂ حق کی گفتگو بادہ و ساغر کہے بغیر بھی بن سکتی ہے لیکن اس بات پر یقیناً کسی کو اعتراض نہیں ہوگا کہ اردو شاعری کی کسی بھی صنف کا ذکر ہو غالب کا حوالہ دیئے بغیر بات نہیں بنتی۔ مثال کے طور پر طنز و مزاح کو لیجیے۔ بظاہر اس صنفِ سخن سے مرزا کا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن ان کے کلام میں مزاح کے ایسے ایسے نمونے مل جاتے ہیں جنھیں پڑھ کر قاری کے چہرے پر وہی لایقینی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے جو واعظ کو مے خانے میں اچانک داخل ہوتے دیکھ کر مرزا غالب کی اپنی ہوئی تھی :

کہاں مے خانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ   پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

صرف یہ شعر نہیں مرزا کے کلام میں ایسے اشعار کی معقول تعداد ہے جن کی بنا پر یہ کہنا ذرا بھی مشکل نہیں کہ وہ اس میدان کے بھی شہ سوار تھے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار :

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق   آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے   کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے   آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں
میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی   سن کر ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ   جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

ان خالص مزاحیہ اشعار کے علاوہ مرزا نے اعلیٰ پائے کے طنزیہ اشعار بھی کہے ہیں۔ قصیدہ جاناں کے لیے فرصت کے شب و روز کا حوالہ جب بادشاہ کے دربار میں ملازم ہو گیا تو اپنی کیفیت اس شعر میں

یوں بیان کرتے ہیں۔

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا / وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

اور جب لوگ غالب کو شاہ کے مصاحب ہو جانے کی وجہ سے معمول سے زیادہ عزت دینے لگے تو مرزا سے یہ شعر صادر ہوا۔

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا / وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

ان اشعار کی روشنی میں تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو شاعری میں پہلا بڑا طنز نگار غالب ہے۔ غالب کے طنز و مزاح کی بنیاد نظر و خبر اور بصیرت و بصریہ ہے۔ غالب کے ہاں سلیقہ بڑی چیز ہے اور یہی ان کے فن کی جان ہے۔

غالب کے طنز کی خصوصیات میں ایک تو یہ کہ وہ اشاروں میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ جس پر وار کرتے ہیں اسے اول تو اس کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ ان کے طنز کا نشانہ تھا اور اگر ہوتا ہے تو اس وقت جب طنز اپنا کام کر چکا ہوتا ہے۔ ان کا طنز بالکل ان کی اپنی چیز ہے اور اس میں انفرادیت بہت زیادہ نمایاں ہے یہ بڑا ہی خوشگوار اور بڑا ہی موثر ہے۔

غالب کے بعد اردو کے ایک بڑے شاعر نے باقاعدہ اس دشت میں قدم رکھا اور ظریفانہ رنگ میں کئی نظمیں کہیں۔ ہماری مراد اقبال سے ہے۔ ان کے مزاحیہ کلام کے نمونے ملاحظہ ہوں:

یہ کوئی دن کی بات ہے اے مرد ہوش مند / غیرت نہ تجھ میں ہوگی، نہ زن اوٹ چاہے گی
آتا ہے اب وہ دور کہ اولاد کے عوض / کونسل کی ممبری کے لیے ووٹ چاہے گی

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ / دفع مرض کے واسطے پل پیش کیجیے
تھے وہ بھی دن کہ خدمت استاد کے عوض / دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجیے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق / کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجیے

ان اشعار کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال بڑے شاعر تھے ضرور لیکن طنز و مزاح کے میدان میں کوئی ایسا گل نہ کھلا سکے جو اس رنگ میں بھی ان کی شہرت کا باعث بنتا۔ ان کے مزاحیہ کلام میں آمد کی نہیں آورد کی کیفیت ہے۔ ان کا نام اگر طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں لیا جاتا ہے تو محض اس لیے کہ انھوں نے کوشش تو کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ اصل میں یہ میدان کار دیگر است اور ہر بڑے شاعر کے بس کی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کی طنز و مزاحیہ شاعری میں پہلا بڑا نام اکبر الہ آبادی کا ہے۔

اکبر ۱۶ / نومبر ۱۸۴۶ء کو الہ آباد کے نزدیک ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ بعد میں جمنا ہائی اسکول میں داخل ہوئے لیکن میٹرک پاس کرنے سے پہلے ہی سکول چھوڑ دیا۔ ۱۸۶۳ء سے مختلف سرکاری ملازمتوں سے گزرتے ہوئے ۱۸۸۹ء میں سب جج مقرر ہوئے۔ بڑھاپا پریشانی میں گزرا کہ صحت بھی بگڑ گئی اور کئی ذاتی صدمے سہنے پڑے۔ اسی پریشان حالی میں ۱۹۲۱ء میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

طنز و مزاح سے اکبر کا تعلق اودھ پنچ کے ذریعہ پیدا ہوا لیکن بہت جلد ان کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری

اردو پنچ میں شائع ہونے والی تحریروں سے کہیں آگے نکل گئی۔ ان کی طنزیہ شاعری نے سرسید احمد کی علی گڑھ تحریک سے جلا پائی۔ یہ نہیں ہے کہ وہ سرسید کی شخصیت اور ان کے جوش و خروش سے متاثر نہ ہوئے لیکن ماضی کے ساتھ ان کا تعلق اتنا گہرا تھا کہ وہ سرسید کے کام کا صحیح اندازہ کرنے کے اہل نہیں تھے۔ ماضی سے محبت اور حال سے آنکھیں پھیر لینے کے باوجود اکبر نے ایسے اشعار کہے ہیں جن کی بنا پر طنز و مزاح کی صنف میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ ان کے کچھ اشعار اس بات کے ثبوت میں ملاحظہ ہوں:

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں	کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

سید کی روشنی کو اللہ رکھے قائم	بتی بہت ہے موٹی، روغن بہت ہی کم ہے

مسلمانوں کو لطف و عیش سے جینے نہیں دیتے	خدا دیتا ہے کھانا، شیخ جی پینے نہیں دیتے

اکبر کی ایک خالص غزل کے کچھ مزاحیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

اک بوسہ دیجیے مرا ایمان لیجیے	گو بت ہیں آپ بہر خدا مان لیجیے
دل لے کے کہتے ہیں تری خاطر سے لے لیا	الٹا مجھی پہ رکھتے ہیں احسان لیجیے
غیروں کو اپنے ہاتھ سے ہنس کر کھلا دیا	مجھ سے کبیدہ ہو کے کہا پان لیجیے
مرنا قبول ہے مگر الفت نہیں قبول	دل تو نہ دوں گا آپ کو میں جان لیجیے
حاضر ہوا کروں گا میں اکثر حضور میں	آج اچھی طرح سے مجھے پہچان لیجیے

اکبر کی یہ نظم بے حد مقبول ہوئی تھی:

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر	مجھے تو ان کی خوشحالی سے ہے یاس
یہ عاشق شاہد مقصود کے ہیں	نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس
سناؤں تم کو اک فرضی لطیفہ	کیا ہے میں نے جس کو زیب قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے	کہ بیٹا تو اگر کر لے ایم اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے	بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی	کجا عاشق کجا کالج کی بکواس
کجا یہ فطرتی جوش طبیعت	کجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس
بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے	ہرن پہ لادی جاتی ہے کہیں گھاس
یہ اچھی قدر دانی آپ نے کی	مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرن داس
دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود	نہیں منظور مغز سر کا آماس

یہی ٹھہری جو شرط وصل لیلیٰ
تو استعفا مرا، باحسرت و یاس

(باقی آئندہ)

دلیپ سنگھ

پیدائش ۱۹۳۲ء بمقام ضلع گوجرانوالہ (پاکستان)
وفات: ۸ر اگست ۱۹۹۶ء
ملازمت: وزارت خارجہ حکومت ہند
کتابیں: سارے جہاں کا درد مضامین ۱۹۹۰ء
گوشے میں قفس کے مضامین ۱۹۹۲ء
آوارگی کا آشنا سفرنامہ ۱۹۹۴ء
موم کی گڑیا (ڈرامہ)
دل دریا (ناول)
جنم دن کی تلاش۔ مزاحیہ مضامین ہندی میں
پسماندگان: بیوہ، دو لڑکیاں اور ایک داماد

دلیپ سنگھ — غزل

کون ہے کس پارٹی کا ہے نہیں ہے نام یاد
دس روپے جس نے دیئے اُس کو کہیں گے زندہ باد

ٹی وی پہ اقبال کا قومی ترانہ پھر بجا
پھر کہیں شاید ہوا ہے فرقہ وارانہ فساد

ناقد اس عقدے کو حل کرنے سے پہلے مر گیا
حال کیا ہوگا ادب کا میرے مر جانے کے بعد

عشق کا پودا پنپتا ہے دلِ معشوق میں
ڈھیر ساری ڈالیئے اس میں اگر دولت کی کھاد

ہاتھ میں دو بوتلیں جب دیکھ لیں تو میرے دوست
بن گئے اشعار میرے سب کے سب تھے مجھ کو داد

○

اداریہ

اگست کے شمارہ کی کاپیاں پریس جا چکی تھیں کہ نامور مزاح نگار دلیپ سنگھ کے سانحۂ ارتحال کی خبر ملی۔ برسوں سے پتہ تھا کہ دلیپ سنگھ دل کے مریض ہیں۔ دل پر شدید حملہ کے بعد وہ اکثر اپنی بیماری، احتیاط اور پرہیز کا ذکر کرتے تھے لیکن آہستہ آہستہ چاق و چوبند اور نارمل ہوتے گئے۔ اب جو انتقال کی خبر سنی تو ذہن اس المناک خبر کے لیے تیار نہ تھا۔ ایک زود گو، زود نویس، زندہ دل اور پُرخلوص شخص کے مستقل سکوت کا تصوّر ہی مشکل ہوتا ہے — دلیپ سنگھ نے پہلی بار ۱۹۸۵ء میں حیدرآباد میں منعقدہ عالمی مزاح کانفرنس کے پنجابی سشن میں شرکت کی تھی۔ اور ۱۹۸۶ء کے ادبی اجلاس سے مسلسل مضمون نگار، مہمان خصوصی، کنوینر اور صدر کی حیثیت سے زندہ دلان حیدرآباد کی سالانہ تقریبات میں شریک ہو رہے تھے۔ شگوفہ کی مجلس مشاورت میں شامل تھے۔ ایک بار مزاحیہ مشاعرہ میں کلام سنا کر داد بھی بٹور لی تھی لیکن پھر منع کر دیا کہ مشاعرہ کے لیے ان کے نام کا اعلان نہ کیا جائے — البتہ ادبی اجلاس کے علاوہ لطیفوں کی محفل میں وہ پابندی اور کامیابی کے ساتھ حصہ لیتے رہے۔ اہل حیدرآباد نے انھیں ہمیشہ سراہا۔ داد و تحسین سے نوازا۔ زندہ دلان حیدرآباد اور شگوفہ سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ ان اداروں کی سرگرمیوں اور تنظیمی معاملات پر بڑی اپنائیت کے ساتھ گفتگو کرتے، اور عملی تعاون کیلئے تیار رہا کرتے۔ دلیپ سنگھ کا انتقال اردو طنز و مزاح، زندہ دلان حیدرآباد اور شگوفہ کا ہی نہیں ان سب کا نقصان ہے جنھیں اس پُرکشش، مخلص اور زندہ دل سردار کا قرب حاصل تھا — ہم بیگم دلیپ سنگھ جی ان کی لڑکیوں اور داماد کے غم میں شریک ہیں۔ اور یہ یادگار شمارہ دلیپ سنگھ کو چاہنے والوں کی خدمت میں بطور خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ▫

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

حیدرآباد

جلد : ۲۸
شمارہ : ۱۰

اکتوبر ۱۹۹۶ء

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :
۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
فون آفس : 595716 رہائش : 521064

فی پرچہ : ۱۰ روپے
زرِ سالانہ : ۱۰۰ روپے
بیرونی ممالک سے : ۳۰ ڈالر

اِس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن

رجسٹرڈ آفس : 4-1-825/8 سکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ عابڈ روڈ حیدرآباد

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان سکھ، عیسائی، پارسی، جین اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے۔ یہ قرضہ جات 2 اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں [1]۔ غربت ہٹاؤ اسکیم [2] خود روزگار اسکیم۔ غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار تک کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائنڈنگ، ترکاری فروش، میوہ فروش، اگربتی کا کارخانہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا ٪25 کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود ٪4 کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور ما بقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی چھ ہزار 6000 روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین، آٹو رکشہ، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا ٪20 کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح سود 6½٪ پر دیا جاتا ہے۔ کارپوریشن مندرجہ بالا دو اسکیموں کے تحت اپنے قیام سے لے کر 7 مارچ 96ء تک 57837 افراد میں 12,66,60,000 روپے بطور مارجن منی قرض جاری کر چکا ہے جس کی جملہ لاگت 5698,15,000 روپے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جاریہ سال 96-95 سے مرکزی حکومت کا قائم کردہ نیشنل اقلیتی ڈیولپمنٹ اینڈ فینانس کارپوریشن کے اشتراک سے اب تک جملہ 868 افراد میں (16) منظور کردہ اسکیمات کے تحت 106,50,000 روپے مارجن منی قرض مزید جاری کر چکا ہے جس کی جملہ لاگت 270,05,000 روپے ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ کارپوریشن سنہ 93ء سے اقلیتی طبقہ کے نوجوانوں کو سالانہ مفت ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے چکا ہے۔ حیدرآباد میں 551 نوجوانوں کو، نظام آباد میں 192، گنٹور میں 243 افراد، کرنول میں 76 نوجوانوں کو تقریباً 15 لاکھ روپے کے صرفہ سے کمپیوٹرس، موٹر ڈرائیونگ، لیاب ٹیکنیشین، ٹیلرنگ، ٹائپ رائٹنگ وغیرہ میں ٹریننگ کرایا گیا ہے۔

کارپوریشن کی شاخیں اضلاع کے ہیڈکوارٹرس پر بھی کام کر رہی ہیں
خواہشمند حضرات کارپوریشن کے دفاتر سے ربط پیدا کریں!

محمد علی رفعت ایم کام۔ ایل۔ ایل۔ ایم
نائب صدر نشین و منیجنگ ڈائرکٹر

مجتبیٰ حسین

دیوے گوڑا-بال ٹھاکرے ... بات چیت

پچھلے دنوں وزیراعظم دیوے گوڑا نے شیوسینا کے سربراہ بال ٹھاکرے سے جو ملاقات کی تھی اس پر اب تک بیانات اور وضاحتی بیانات کا سلسلہ جاری ہے۔ وزیراعظم دیوے گوڑا نے کہا ہے کہ بال ٹھاکرے سے ان کی ملاقات خالصتاً نجی نوعیت کی تھی جس میں سیاسی مسائل پر کوئی بات چیت نہیں کی گئی۔ ان دونوں لیڈروں کے درمیان سیاسی مسائل سے ہٹ کر جس طرح کی بات چیت ہوئی ہوگی یا ہوسکتی تھی اس کا ایک خاکہ ہمارے ذہن میں ہے جسے ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں:

وزیراعظم: نمستے!

بال ٹھاکرے: نمستے!

وزیراعظم: آپ کیسے ہیں؟

بال ٹھاکرے: جی! میں اچھا ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟

وزیراعظم: آپ اچھے ہیں تو میں بھی اچھا ہوں۔

بال ٹھاکرے: آپ تو اور بھی اچھے رہ سکتے ہیں کیوں کہ آپ تو اس ملک کے وزیراعظم ہیں۔

وزیراعظم: دیکھئے میں آپ کے ہاں وزیراعظم کی حیثیت سے نہیں آیا ہوں اور نہ ہی میرا ارادہ آپ سے کسی سیاسی مسئلہ پر بات چیت کرنے کا ہے۔

بال ٹھاکرے: تو پھر ہم کس طرح کی بات چیت کریں گے۔

وزیراعظم: میں آپ کی خیریت پوچھوں گا، آپ میری خیریت پوچھ لیں، بال بچوں کا حال بھی پوچھ لیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ موجودہ موسم (غیر سیاسی) پر بھی بات چیت ہوسکتی ہے۔

بال ٹھاکرے: اس طرح تو یہ بات چیت تین چار منٹ میں ہی ختم ہو جائے گی۔ آپ کب تک میری اور میں آپ کی خیریت پوچھتا رہوں گا۔ بال بچوں کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

وزیراعظم: ہم بات چیت شروع کریں گے تو خودبخود بات میں سے بات نکلتی چلی جائے گی۔

بال ٹھاکرے: دیکھ لیجئے! کہیں بات کا بتنگڑ نہ بن جائے۔

وزیراعظم: جی، بات چیت کا بتنگڑ بنا کم ہی بنتا ہے ... تو پھر کریں بات چیت شروع؟

بال ٹھاکرے: شروع کیجئے، کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں کیوں کہ ایسی بات چیت اس سے پہلے کبھی نہیں کی

وزیر اعظم : اچھا یہ بتلایئے آپ کیسے ہیں ؟
بال ٹھاکرے : یہ سوال آپ پہلے بھی پوچھ چکے ہیں۔
وزیر اعظم : لیکن پھر ایک بار پوچھ لینے میں کیا قباحت ہے ۔
بال ٹھاکرے : لوگ خیریت پوچھتے ہیں تو یہ فرض کرکے پوچھتے ہیں کہ آپ جواب میں یہ کہیں گے کہ آپ خیریت سے ہیں، میں نے آج تک یہ نہیں دیکھا کہ آپ کسی کی خیریت پوچھیں اور وہ جواب میں اپنی ساری مشکلات اور پریشانیوں کا پٹارہ کھول کر بیٹھ جائے اور سوال پوچھنے والے کی خیریت خود خطرہ میں پڑجائے ۔
وزیر اعظم : تو کیا اس جواب سے میں یہ سمجھوں کہ آپ خیریت سے ہیں ۔
بال ٹھاکرے : ایسا سمجھنے میں ہی عافیت ہے ۔
وزیر اعظم : اچھا یہ بتایئے آپ کے بال بچے کیسے ہیں ؟
بال ٹھاکرے : اگر آپ اخبار پڑھتے ہیں تو آپ کو میرے بال بچوں کا حال کو معلوم ہی ہوگا ۔ سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی اپنے بال بچوں کا حال اخباروں سے ہی معلوم کرلیتا ہوں۔ عملی سیاست میں رہنے کا یہی تو فائدہ ہے کہ آپ کو اپنے بال بچوں، بھتیجوں، بھانجوں وغیرہ کا حال اخباروں سے معلوم ہوجاتا ہے کسی سے پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔
وزیر اعظم : آپ بات تو ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کے اس جواب سے کہیں ہماری بات چیت کا رُخ سیاست کی طرف نہ مُڑ جائے اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں آج کی ملاقات میں ہمیں کوئی سیاسی بات چیت نہیں کرنی ہے ۔
بال ٹھاکرے : اچھا کیا آپ نے بتادیا ورنہ میں تو سچ مچ بھٹک جاتا۔
وزیر اعظم : (کچھ دیر سوچ کر) اور سنایئے کیا حال ہے ؟
بال ٹھاکرے : حال تو آپ کو بتا چکا ہوں۔ پھر بھی ہم ہندوستانیوں کی کمزوری ہے کہ بات چیت کے لیے کوئی موضوع نہیں ملتا تو بار بار پوچھتے رہتے ہیں کہ " اور سنایئے کیا حال ہے ؟"
وزیر اعظم : اصل میں یہ سوال ہماری تہذیب سے جُڑا ہوا ہے ۔ ہم دوسروں کا حال جاننے کے لیے اتنے فکرمند رہتے ہیں کہ جب تک مخاطب کا حال بُرا نہ ہوجائے تب تک یہ سوال پوچھتے رہتے ہیں۔
بال ٹھاکرے : تو کیا آپ مجھ سے کچھ ایسا ہی جواب سُننا چاہتے ہیں ؟
وزیر اعظم : آپ نے غلط سمجھا، میں تو ایک عام بات کررہا تھا۔
بال ٹھاکرے : تو پھر کوئی دوسرا سوال پوچھئے۔
وزیر اعظم : (سوچ کر) اچھا یہ بتایئے آج صبح آپ نے کیا کھانا کھایا تھا ؟
بال ٹھاکرے : مجھے اس وقت کچھ بھی یاد نہیں ہے ۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے پرائیویٹ سکریٹری کو بلاکر پوچھ لوں کہ میں نے صبح میں کیا کھانا کھایا تھا ۔
وزیر اعظم : سکریٹری کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے، میں نے تو بس یونہی بات چیت کو جاری رکھنے کے خیال سے یہ سوال پوچھا ہے۔ اس کے جواب سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے ۔

بال ٹھاکرے : اچھا یہ بتلایئے، آج آپ نے صبح میں کیا کھایا تھا؟
وزیراعظم : اڈلی کھائی تھی - دوسہ بھی کھایا تھا۔
بال ٹھاکرے : بہت خوب! آپ تو چھوٹی چھوٹی باتیں بھی یاد رکھتے ہیں۔ ایسی باتوں کو یاد رکھنا تو پرائیویٹ سکریٹری کا کام ہوتا ہے۔
وزیراعظم : کسان کا بیٹا ہوں، اپنے پیٹ کو، اپنا پیٹ بھر کر کھاتا ہوں۔ اس میں سکریٹری کا کیا کام ہے۔ اچھا یہ بتایئے آپ کے ہاں پیاز کا کیا بھاؤ ہے؟ گندم کس بھاؤ مل جاتی ہے؟
بال ٹھاکرے : معاف کیجئے، میں کسان کا بیٹا تو ہوں نہیں کہ ایسی چیزوں کے دام بھی یاد رکھوں۔ پہلے تو چیزوں کے دام جاننے کی مجھے ضرورت پیش نہیں آتی۔ اگر آتی بھی ہے تو سکریٹری کو بلا کر پوچھ لیتا ہوں۔
وزیراعظم : مگر آپ چونکہ عوام کے رہنما ہیں اس لیئے ایسی باتوں کے بارے میں بھی آپ کو جانکاری رکھنی چاہیئے۔
بال ٹھاکرے : دیوے گوڑا جی! آپ یہ نہ سمجھیں کہ مجھے چیزوں کے دام نہیں معلوم ہیں۔ مجھے سب معلوم ہیں لیکن میں جان بوجھ کر اس لیے انجان بن رہا ہوں کہ اگر چیزوں کے دام پر بحث شروع ہوگی تو اس کا سلسلہ سیاسی بات چیت تک چلا جائے گا اور پھر آپ کی سرکار بھی زیر بحث آئے گی، اس لیے گریز کر رہا ہوں۔
وزیراعظم : آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ ہمارا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ مجھے بھی اس کا اندیشہ ہے کیونکہ ساری خرابی چیزوں کے دام سے ہی شروع ہوتی ہے۔
بال ٹھاکرے : آپ چیزوں کی بات کر رہے ہیں، ان دنوں تو لیڈروں کے بھی دام لگتے ہیں۔
وزیراعظم : اور مجھے بھی ان کے دام معلوم ہیں لیکن مسئلہ پھر وہی اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ کہیں ہم پھر سیاسی موضوعات پر بات چیت نہ کرنے لگ جائیں!
بال ٹھاکرے : خیر، جانے دیجئے اِن باتوں کو۔ پندرہ اگست کو آپ نے ہندی میں جو تقریر کی تھی، وہ مجھے پسند آئی تھی۔
وزیراعظم : لیکن یہ بھی تو ایک سیاسی مجبوری تھی۔
بال ٹھاکرے : پھر ہم کس پر بات کریں؟
وزیراعظم : کچھ نجی مسائل کے بارے میں بات چیت کیجئے۔
بال ٹھاکرے : ہمارا ایسا کون سا نجی مسئلہ ہے جو اخبار والوں کو نہیں معلوم ہے، اسی لیے اس پر بھی کیا بات کرنی ہے —— اخباروں میں پڑھ لیجئے۔
وزیراعظم : اور ہاں پچھلے دنوں آپ کے ساتھ کچھ سانحات پیش آئے تھے، ان کا پُرسہ قبول کیجئے۔
بال ٹھاکرے : لیکن ان سانحات کو گزرے ہوئے کافی لمبا عرصہ بیت گیا۔ پھر بھی آپ کہتے ہیں تو پُرسہ قبول کر لیتا ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ ہم لوگ پُرسہ کچھ اس طرح دیتے ہیں کہ لگتا ہے کہ بھرے ہوئے زخموں کو پھر سے کُرید کر اُن پر نمک چھڑک رہے ہیں۔
وزیراعظم : معاف کیجئے، اس معاملہ میں ذرا دیر ہوگئی۔
بال ٹھاکرے : اچھا یہ بتلایئے، دہلی کا موسم کیسا ہے؟
وزیراعظم : سیاسی موسم یا طبعی موسم!
بال ٹھاکرے : میں تو طبعی موسم کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔
وزیراعظم : گرچہ گرمی بہت زیادہ ہے لیکن طبعی موسم پھر بھی سیاسی موسم سے اچھا ہے۔

بال ٹھاکرے : دیکھئے آپ پھر سیاسی باتیں کرنے لگے۔
وزیر اعظم : میرا ایسا خیال ہے کہ مستقبل میں ہمیں کبھی نجی مسائل پر بات چیت نہیں کرنی چاہیئے۔
بال ٹھاکرے : آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔
وزیر اعظم : اچھا اب اجازت دیجئے۔
بال ٹھاکرے : پھر کب ملیں گے ؟
وزیر اعظم : جب میرے پاس فالتو وقت ہوگا۔
بال ٹھاکرے : بہرحال آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔
وزیر اعظم : شاید اس لیے کہ اب میرے دکھوں میں اضافہ ہوگا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔
بال ٹھاکرے : آپ کا بھی شکریہ۔

نامور مزاح نگار **دلیپ سنگھ** کی آخری تحریر

زیرِ نظر مضمون "ڈرامے کا آخری سین" جناب دلیپ سنگھ کے ادبی سفر کا آخری سین ہے۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے خازن جناب محمد علی رفعت مینیجنگ ڈائرکٹر مینارٹیز فینانس کارپوریشن نے اپنے دورۂ دلی کے موقع پر جناب دلیپ سنگھ کی بیگم اور دوسرے خاندان کے افراد سے ملاقات کی اور زندہ دلانِ حیدرآباد کی طرف سے انھیں پُرسہ دیا۔ میں نے رفعت صاحب سے خواہش کی تھی کہ دلیپ سنگھ کا کوئی غیر مطبوعہ مضمون مل جائے تو شگوفہ کے لیے حاصل کر لیجیے۔ چنانچہ انھیں پتہ چلا کہ دلیپ سنگھ کی میز پر ایک مضمون کا مسودہ رکھا ہوا ہے جس کا عنوان تھا "ڈرامہ کا آخری سین" ——— ! عجیب اتفاق ہے کہ اپنے آخری مضمون کو دلیپ سنگھ نے یہ عنوان دیا تھا۔ لیکن اس مضمون کا اختتامیہ وہ لکھ نہ پائے۔ مسودہ کے آخری صفحہ کا ¾ حصہ انھوں نے معریٰ چھوڑ دیا۔ کانٹ چھانٹ کی ہوئی چھ سات سطریں صفحہ کے آخری حصہ میں انھوں نے لکھی تھیں۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ دلیپ سنگھ آخری سین کا کلائمکس والا پیراگراف دوبارہ لکھنے والے تھے کہ وہ خود دوسرے ہی دن زندگی کے آخری سین کے کلائمکس سے دوچار ہوگئے!!

یہ مضمون بیگم دلیپ سنگھ کے شکریہ کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔ — مدیر

دلیپ سنگھ

ڈرامے کا آخری سین

میری زندگی میں ایک سال ایسا بھی رہا جب میں دوردرشن کے دلی اسٹیشن کے لیے ہر ہفتہ پندرہ منٹ کا ایک ڈرامہ لکھا کرتا تھا۔ ڈرامہ سیکشن کی انچارج ایک بہت ہی پیاری سانولی سلونی سی لڑکی تھی انیتا۔ اسے میرے لکھنے کا انداز اتنا بھا گیا کہ وہ میرے سوا کسی دوسرے سے ڈرامہ لینے کو تیار نہیں تھی۔ مجھے وہ خود اتنا بھا گئی کہ مجھے دوردرشن کے کسی دوسرے سیکشن کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ تھا۔

اگر آپ فلمیں دیکھتے ہیں تو آپ کو اتنا پتہ تو ہوگا ہی کہ ایک لڑکے کی سائیکل اگر ایک لڑکی کی سائیکل سے ٹکرا جائے تو اُن میں محبت ہو جاتی ہے۔ میں اور انیتا ہر ہفتے ایک ڈرامہ تیار کیا کرتے تھے جو سائیکل ٹکرانے کی نسبت زیادہ دلچسپ کام ہے۔ ایسے حالات میں ہمارا ایک دوسرے کا دوست بن جانا کوئی غیر فطری بات نہیں تھی۔

محبت کے کھیل میں تو میں جانتا ہوں کہ ایک ولن ضروری ہوتا ہے لیکن یہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ دوستی میں بھی ایک

ولن اپنا کردار نبھانے کے لیے کہیں سے نمودار ہو جاتا ہے۔ ہماری دوستی میں یہ کردار نبھانے کی ذمہ داری اَنیتا کے افسرِ اعلیٰ نے اپنے ذمہ لے لی۔ جونہی میں اَنیتا کو ڈرامہ دے کر آتا وہ منظوری کے لیے اُسے اپنے افسرِ اعلیٰ کے پاس بھیج دیتی۔ وہ حضرت یہ لکھ کر ڈرامہ واپس کر دیتے کہ دلیپ سنگھ سے کہیئے مجھے یہ ڈرامہ سنائے کہ وہ اردو میں لکھتا ہے میں یہ سوچ کر ڈرامہ سنانے کے لیے تیار ہو جاتا کہ وہ شاید اردو نہیں پڑھ سکتے۔ یہ بات بہت بعد میں مجھے معلوم ہوئی کہ وہ اردو کے سوا کوئی اور زبان نہیں پڑھ سکتے۔ وہ تو مجھے اس لیے بلاتے تھے کہ کسی طرح میرا ڈرامہ رد کر کے مجھے انیتا سے دور رکھیں۔

راکیش کھتری (یہ اُن کا نام تھا) ولن کا رول اس طرح نبھا رہے تھے کہ انہیں پہچاننا ممکن نہیں تھا۔ وہ اس طرح کے ولن تھے کہ آپ کو اُن پر دوستی کا گمان ہوتا تھا۔ ان کا اصلی روپ پہچاننے میں میرے کئی ڈرامے نکل گئے۔ لیکن آخرکار ایک دن یہ راز کھل گیا۔

اُس دن بھی انھوں نے مجھے ڈرامہ سنانے کے لیے بلایا تھا۔ میں نے ڈرامہ سُنانا شروع کیا:

"عبدل اخبار پڑھ رہا ہے"۔

کھتری صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے رُکنے کا اشارہ کیا اور پوچھا "آپ نے ہیرو کا نام عبدل کیوں رکھا ہے؟ گوتم کیوں نہیں"۔ میں نے جواب دیا "کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ چلیئے گوتم رکھ لیتے ہیں"۔ میدان ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر کھتری صاحب بولے۔

"کوئی وجہ تو ہوگی۔ نام یونہی تو رکھے نہیں جاتے"۔

میں نے کہا "کھتری صاحب مجھے اب یاد نہیں آرہا لیکن جب میں ڈرامہ لکھنے کے لیے بیٹھا تو شاید مجھے کسی عبدل غفور کا فون آیا تھا۔ میں نے ہیرو کا وہی نام رکھ لیا۔ آپ کو پسند نہیں آیا تو بدل دیتے ہیں"۔

کھتری صاحب بولے "دیکھ لیں گے۔ آپ آگے چلیئے"۔

میں نے آگے پڑھنا شروع کیا۔

"سلیمہ اُن کے پاس بیٹھی سبزی کاٹ رہی ہے"۔

کھتری صاحب نے پوچھا "کونسی سبزی"؟

میں نے کہا "شاید آلو ہوں گے کہ آج کل سب سے سستی ترکاری وہی ہے لیکن آپ اگر کوئی مہنگی سبزی اس سے کٹوانا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا"۔

کھتری صاحب ہنستے ہوئے بولے "آگے چلیئے"۔

میں نے سلیمہ کا ڈائلاگ پڑھا۔ "آپ کو کچھ پتہ بھی ہے منے کو کل اسکول جانا ہے اور اس کے پاس ڈھنگ کے کپڑے نہیں ہیں"۔

کھتری صاحب نے پوچھا "عبدل کے کتنے بچے ہیں"؟

میں نے کہا "ڈرامے میں تو ایک ہی ہے۔ کل کتنے ہیں یہ میں اس کے پڑوسیوں سے پوچھ کر آپ کو بتا دوں گا"۔

کھتری صاحب کھل کر ہنسے اور بولے "بائی دی وے آپ کے اپنے کتنے بچے ہیں"؟

پہلے تو میں نے سوچا پوچھوں میری اولاد کی تعداد کا ڈراما سے کیا تعلق ہے لیکن پھر خیال آیا کہ اس بحث میں اور وقت برباد ہوگا۔ چنانچہ میں نے جواب دیا "میرے دو بچے ہیں۔" کھتری صاحب نے پوچھا "آپ اپنی بیوی سے محبت کرتے ہیں؟" میں نے کہا "بہت"۔ کھتری صاحب بولے "اس کے باوجود آپ انیتا کے لیے ڈرامے پر ڈرامے لکھے جا رہے ہیں؟"

اس دن مجھے احساس ہوا کہ میری اور انیتا کی دوستی کے سلسلے میں کھتری صاحب ولن کا رول ادا کر رہے ہیں لیکن دوستی کے دلوں میں ولن کی پرواہ کس کو ہوتی ہے۔ چنانچہ میں انیتا کے لیے ڈرامے لکھتا رہا اور کھتری صاحب انھیں بادلِ نخواستہ منظوری دیتے رہے کہ ڈرامے نامنظور کرنے کی وہ کوئی معقول وجہ ڈھونڈ نہ پائے۔ ایک سال کے بعد انھوں نے انیتا کا تبادلہ ایک ایسے سیکشن میں کر دیا جہاں میرے لیے کوئی کام نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے تبادلہ کرنے میں بہت دیر کر دی کہ ہماری دوستی کی جڑیں تب تک اتنی مضبوط ہو چکی تھیں کہ ہمارے لیے اُسے نبھاتے جانا اور کھتری صاحب کے لیے اُسے برداشت کیے جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

انیتا بنیادی طور پر ایکٹرس تھی۔ گاتی بھی بہت اچھا تھی لیکن ٹیلی ویژن والے اُس سے ڈائرکٹر کا کام لے رہے تھے۔ ایک دن اُس نے مجھے بتایا کہ وہ اسٹیج پر کوئی ایسا ڈرامہ کرنا چاہتی ہے جس میں وہ طوائف کا رول کر سکے۔ کیا میں اس کے لیے ایک ایسا ڈرامہ لکھوں گا؟

میں نے پوچھا "انیتا تم طوائف کا رول کیوں کرنا چاہتی ہو؟" وہ بولی "ہر عورت کے اندر ایک چوتھائی طوائف ہر وقت موجود رہتی ہے لیکن اس کا پتہ اس لیے نہیں چلتا کہ باقی کی تین چوتھائی عورت اُسے دبائے رکھتی ہے۔ میں اپنے اندر کی طوائف کو اس طرح باہر لانا چاہتی ہوں کہ طوائف کھل کھیل سکے اور کسی کو برا بھی نہ لگے۔" "کسی کو" سے مراد اُس کا خاوند تھا۔ میں نے پوچھا "تمہارا خاوند تو بُرا نہیں مانے گا؟" وہ بولی "اُس کو ڈرامے میں کوئی غیر ضروری رول دے دیں گے۔"

اُس کی ایسی ہی باتوں پر تو مجھے پیار آتا تھا۔

میں نے کئی ڈراموں کے خاکے بنائے جن میں مرکزی کردار ایک طوائف تھی لیکن انیتا کی تسلی نہ ہوئی۔ آخر کار فیصلہ یہ ہوا کہ ہمارا ڈرامہ مرزا ہادی رسوا کے ناول امراؤ جان ادا پر مبنی ہو۔ کہ ادا ایک طوائف ہونے کے علاوہ ایک شاعرہ اور مغنیہ بھی تھی اور انیتا اُس کے کردار کو نبھاتے ہوئے اپنی تمام تر خوبیوں کا جن میں اداکاری، رقص اور موسیقی شامل تھی مظاہرہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے اس ناول پر مبنی ایک ڈرامہ لکھا جس کا نام تھا "موم کی گڑیا"۔ انیتا نے ادا کے کردار کو اس محبت سے نبھایا کہ ڈراموں پر تبصرہ کرنے والوں نے اُس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ لیکن یہ قلابے بھی ہماری دوستی میں دراڑ پیدا نہ کر سکے۔

ڈرامے کی کہانی مختصراً یوں تھی کہ ادا کا تعلق ایک شریف گھرانے سے تھا جہاں سے کوئی غنڈہ اُسے اغوا کر کے ایک ڈیرہ دار طوائف کے ہاں بیچ دیتا ہے۔ کوٹھے پر مجرہ کرتے ہوئے اُس کی ملاقات سلطان شیدا سے ہوتی ہے جو اس سے شادی کرنے کا خواہش مند ہے۔ ادا بھی اسے دل و جان سے چاہنے لگتی ہے۔ لیکن شیدا کی امی کو یہ رشتہ پسند نہیں وہ کسی طرح شیدا کے دل میں شک پیدا کر دیتی ہیں کہ امراؤ ادا اچھی عورت نہیں ہے۔ چنانچہ شیدا شادی سے مکر جاتا ہے۔ جب اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو وہ دوبارہ امراؤ جان ادا سے محبت کی بھیک مانگتا ہے۔

میں یہاں تک پہنچ گیا اور ڈرامے کا آخری سین لکھنے بیٹھا تو مجھے بڑی مشکل پیش آئی۔ سوال میرے سامنے یہ تھا کہ

کیا مجھے ان کی شادی کروا دینی چاہیئے یا پھر ادا سے یہ کہلوادوں کہ وہ خیرات میں ملی ہوئی محبت کے مقابلے میں کوٹھے پر پڑے رہنا بہتر سمجھتی ہے۔ ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کے لیے دوسرا نسخہ زیادہ موثر تھا۔ چنانچہ جب رشیدا اس کے کوٹھے پر آکر دوبارہ اس کی محبت کا طلب گار ہوتا ہے تو ادا اسے جواب دینے کے بجائے سارنگی نواز سے کہتی ہے "استاد جی ساز چھیڑیے شائقین کے آنے کا وقت ہو گیا ہے"!

ڈرامہ ختم ہونے پر بہت تالیاں بجیں لیکن بہت سے تماشائیوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ جناب آپ کو ادا اور رشیدا کی شادی کروا دینی چاہیئے تھی۔ یہ سن کر مجھے شک سا ہونے لگا کہ ڈرامے کا آخری سین لکھتے ہوئے کہیں میں نے غلطی تو نہیں کی۔ چنانچہ جب میں نے فیصلہ کیا کہ اس ڈرامے کو اشاعت کے لیے کسی رسالے کو بھیجوں تو میں نے اپنے ادیب دوستوں کی ایک میٹنگ بلائی اور پوچھا کہ ان کے خیال میں ڈرامے کا آخری سین کیا ہونا چاہیئے۔ میرے دوست کھل کر اپنی رائے کا اظہار کر سکیں اس لیے میں نے وسکی کی دو بوتلوں کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ بحث بہت دیر تک چلی یہاں تک کہ وسکی ختم ہونے کو آ گئی لیکن میرے دوست کوئی فیصلہ نہ کر پائے۔ ایسے موقعوں پر عام طور پر میرا دوست شگفتہ بہت کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے اس کی طرف اس طرح دیکھا کہ جیسے اسی کی رائے اس مسئلے کو سلجھا سکتی ہے۔ شگفتہ نے اپنے گلاس میں سے وسکی کا آخری گھونٹ حلق سے نیچے اتارا اور پوچھا۔

"اس ڈرامے کو کونسے رسالے میں چھپوانا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

شگفتہ بولے "بہت فرق پڑتا ہے بھائی۔ اگر تم اسے کسی سرکاری رسالہ میں چھپوانا چاہتے ہو تو ادا اور رشیدا کی شادی کرا دو کہ اس طرح کی شادی سرکار کی پالیسی کے عین مطابق ہوگی کہ وہ ذات سے بھٹکی ہوئی عورتوں کو پھر سے بسانا اپنے فرائض کا حصہ سمجھتے ہیں۔ اگر تم اسے کسی ڈائجسٹ قسم کے فیملی میگزین میں شائع کروانا چاہتے ہو جنہیں گھریلو عورتیں آٹا گوندھتے ہوئے پڑھتی ہیں تو بھی شادی ہی بہتر رہے گی۔ تم نے اگر ان رسائل کا مطالعہ کیا ہے تو تمہیں پتہ ہوگا کہ ان رسائل میں شائع ہونے والی کہانیوں کی ہیروئین کچھ عرصہ غلط راہ پر چلنے کے بعد ہمیشہ گھر لوٹ آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے رسالے شریف گھروں میں پابندی سے پڑھے جاتے ہیں۔ خاوند حضرات ان کہانیوں کا وہ حصہ چٹخارے لیکر پڑھتے ہیں جب کہانی کی ہیروئین غلط راہ پر چل رہی ہوتی ہے اور بیویاں یہ پڑھ کر خوش ہوتی ہیں کہ اللہ کی ماری ہیروئین غلط راہ پر چل کر اس مقام پر لوٹ آئی جہاں وہ بھی ان کی طرح آٹا گوندھے گی اور آٹا گوندھتے ہوئے ایسی کہانیاں پڑھے گی۔ وہ یہ بھی چاہتی ہیں کہ سب طوائفیں شادی کر لیں تاکہ شریف عورتوں کے خاوند وقت پر گھر آنے لگیں۔

شگفتہ ذرا سی دیر سانس لینے کے لیے رکے اور پھر بولے "اگر تم اسے کسی اسلامی پرچے میں شائع کروانا چاہو تو بھی بے شک ان کی شادی کروا دو۔ میں جانتا ہوں کہ شیدا کی امی کو یہ رشتہ پسند نہیں لیکن وہ جب چاہیں شیدا کی شادی اپنے خاندان کی کسی دوسری لڑکی سے بھی کروا سکتی ہیں کہ اسلام میں چار شادیوں کی اجازت ہے۔ لیکن اگر تم یہ ڈرامہ کسی کٹر ہندو جماعتی پرچے میں چھپوانا چاہتے ہو تو شادی نہ کروانا ہی بہتر ہوگا" میں نے جب وجہ پوچھی تو بولے "ایک مسلمان طوائف کے گھر بسا لینے پر انہیں اعتراض یہ ہوگا کہ اس رشتے سے جو بچے پیدا ہوں گے ان کی وجہ سے مسلمانوں کی آبادی میں مزید اضافہ ہوگا اور وہ شاید بعد میں ایک اور پاکستان کا مطالبہ کرنے لگیں"۔

میں نے کہا شگفتہ صاحب اگر میں اس ڈرامہ کو کسی خالص ادبی رسالے میں شائع کرانا چاہوں تو آپ کیا مشورہ دیں گے۔

شگفتہ بولے اگر تم اسے سوغات، شب خون، ذہن جدید یا سب رس میں شائع کرانا چاہو تو ڈرامے کا آخری سین کچھ بھی رکھ لو انھیں فرق نہیں پڑے گا۔ وہ آزاد خیال لوگ ہیں اور انھیں رنڈیوں اور شریف زادیوں میں بس اتنی ہی دلچسپی ہے کہ وہ ان کے قارئین کی دلچسپی کا باعث بن سکتی ہیں یا نہیں۔

شگفتہ کا مشورہ سننے کے بعد میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ ایک طوائف کی زندگی کا آخری فیصلہ اس کی کہانی سننے والے لوگوں کی اجارہ داری بن کر رہ گیا ہے جنھیں اس بات سے سروکار نہیں کہ اس کے لیے کیا اچھا ہوگا بلکہ اس بات سے ہے کہ انھیں کیا اچھا لگے گا!
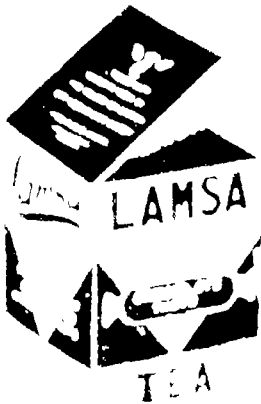
ڈاکٹر محبوب راہی

بے چارے نرسمہا راؤ صاحب!

لگا کے سینے پہ دھرتی ماں کے کتنے ہی گہرے گھاؤ صاحب
چلے ہیں مکتی پراپتی کو نہ جانے کس دھام راؤ صاحب

کہاں چلاؤ گے کھوٹے سکے، بکو گے اب کون بھاؤ صاحب
ہر اک زباں پر سوال ہے اب تمہارا کیا ہوگا راؤ صاحب

دُہائی دے کر سیارام کی چلالیا خوب اپنا دھندا
ہٹاؤ مجمع یہاں سے اپنا دکان اپنی بڑھاؤ صاحب

لگائی ہے آگ تم نے جس سے سبھی دشائیں سلگ رہی ہیں
کرو نہ چنتا کسی کی اب تم بس اپنے گھر کو بچاؤ صاحب

ہمیشہ کرتے رہے ہو کیا کچھ بنا کے کیسے رہ سکو گے
تو یوں کرو اب ایودھیا جا کے رام مندر بناؤ صاحب

ڈھکیل کر کانگریس کو جس کنوئیں میں تم نے ڈبو کے چھوڑا
اسی کنوئیں کی اتاہ گہرائیوں میں خوب ڈوب جاؤ صاحب

لبادہ کھدر کا اوڑھ رکھا تھا اب تو اس کو اتار پھینکو
پہن رکھی ہے جو خاکی چڈی اٹھا کے دھوتی دکھاؤ صاحب

کہاں تک آخر یہ تیرتی بھی اسے جو تھا ڈوبنا سو ڈوبی
جو چلتی رہتی تو کتنا چلتی تمہارے کھیلوں کی ناؤ صاحب

فلک پہ کل تھا دماغ جن کا ہوا ہے گل اب چراغ جن کا
ہمارے نرسمہا راؤ صاحب بے چارے نرسمہا راؤ صاحب

★

غزل

رؤف رحیم

گھر کا رکھوالا ہے اگرچہ نام کا سکھ رام ہے
رکھ کے دولت گھر میں کہتا ہے کسی کے نام ہے

ہیں منسٹر جیل میں کیا گردشِ ایام ہے
جس جگہ شہنائیاں تھیں اب وہاں کہرام ہے

ڈائری جو جین کی تھی کھول دی ہر اک کا پول
جو کبھی تھا نامور وہ آج کل بدنام ہے

جو تھی پوشیدہ وہ دولت سی بی آئی لے گئی
"کھیر کُتّے کو نہیں پچتی" کہاوت عام ہے

کیا زمانہ ہے ضمانت تک نہیں ہوتی قبول
اب سنا ہے جیل میں آرام ہی آرام ہے

پڑھ کے لکھ کے ہم ہیں پیدل اور وہ مسند نشین
ہم کو پھلی بھی نہیں اُن کے لیے بادام ہے

دیکھتے جاؤ ہوا ہے دیش کتنا کھوکھلا
یہ حوالہ کیس تو چھوٹا سا اک انعام ہے

لاکھ ہوں کرتوت کالے تن پہ ہوں کپڑے سفید
آج کل کے بعض نیتاؤں کا یہ پیغام ہے

دیکھنے کے واسطے گاندھی کا چیلا ہے مگر
جھانک کر دیکھو تو اندر سے وہ ناتھو رام ہے

سامنے آ کے وہ اس واسطے آتے نہیں
سچ اگلوایا تو سمجھو پھر بُرا انجام ہے

ہم حوالے کے حوالے سے یہ کہتے ہیں رحیم
سارے ننگے ایک جا ہوں گے یہ وہ حمام ہے

عابد معز
(ریاض)

پیشگی خطبۂ صدارت

(بزم اردو ادب الاحساء، سعودی عرب کے ہند و پاک مشاعرہ میں پڑھا گیا)

میں شکرگزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس محفل مشاعرہ میں منصب صدارت پر فائز کیا۔ یقین جانیے میں اس انتخاب سے مطمئن نہیں ہوں۔ یہ کہنے کی جسارت میں نہیں کرسکتا کہ آپ نے غیر دانشمندانہ فیصلہ کیا ہے لیکن میں آپ کی مجبوریوں کا اندازہ ضرور کرسکتا ہوں۔

. . . . غریب الوطنی میں آپ کو ایسی شخصیت میسر نہ آئی جو صدر کا خاصہ ہوتی ہے۔ وطن میں صدارت کے لیے اس شخص کا انتخاب کیا جاتا ہے جو محفل سجانے کے انتظامات میں دامے درمے تعاون کرتا ہے۔ محفل کا سارا خرچہ، بشمول صدر کے پھولوں کی قیمت اپنی جیب سے ادا کرتا ہے۔ آپ حضرات کے ساتھ ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے کہ صدارت بیچتے پھریں۔ الحمدللہ یہاں ہر کوئی صاحب استطاعت ہے۔ اس طرح محفل سجا کر صدارت کا طوق اپنے گلے میں لٹکانے سے بہتر آپ نے خیال کیا ہوگا کسی دوسرے شہر سے صدر کو بلایا جائے۔

دوسری صورت میں منصب صدارت صلہ رحمی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جب محفل کے انتظامات مختلف ذرائع سے ہوجاتے ہیں تب ایک ایسے صدر کو ڈھونڈا جاتا ہے جو ضعیف ہو اور جس کے قویٰ کمزور ہوں تاکہ منتظمین اپنی مرضی کے مطابق کارروائی چلا سکیں اور جلسہ کی صدارت کرکے صاحب صدر طیب اور خوشی کے ساتھ ملک عدم کی راہ لیں۔ اب اس کو کیا کیجیے کہ صدارت کے بعد بوڑھے صدر نہ صرف صحت یاب ہوجاتے ہیں بلکہ آئندہ بھی صدر بننے کے متمنی رہتے ہیں۔ دیار غیر میں ایسے بزرگ کا دستیاب ہونا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ شاید اسی لیے اصل کی نقل کے لیے میرا انتخاب کیا گیا ہے۔

حق بہ حق دار رسید کی خاطر بھی صدارت عطا کی جاتی ہے۔ محفل کی صدارت کے لیے ایسے شخص کا انتخاب عمل میں لایا جاتا ہے جس کی خدمات گراں قدر ہوں۔ اس نے ادب اور اردو زبان کی انتھک خدمت کی ہو۔ اس قسم کا صدر چننے میں بعض مرتبہ نقص امن کا بھی اندیشہ لاحق ہوتا ہے۔ کئی حق دار صدر

بننے کا دعویٰ کر بیٹھتے ہیں۔ یقین جانیے۔ میں اس درجہ میں ہوتا ہی نہیں۔ اگر آپ حضرات اجازت دیں تو میں مجھ سے بہتر صدر کے حق میں صدارت سے دستبردار ہونے کے لیے تیار ہوں۔

حالیہ عرصے میں صدارت کی اہلیت کے لیے دوسری قسم کے لوگ بھی پائے جاتے لگے ہیں۔ سیاست دانوں اور ارباب اقتدار کو بھی مسندِ صدارت پر فائز کیا جا رہا ہے۔ وجوہات مختلف ہوتی ہیں۔ جلسہ کے انعقاد اور مجمع لگانے میں سہولت ہوتی ہے۔ حکومت سے مالی مدد حاصل ہوتی ہے۔ منتظمین جلسہ کے روٹی روزگار کے مسائل بھی حل ہو سکتے ہیں۔

میں صدر قرار پانے کی وجہ کے تعلق سے صرف قیاس کر سکتا ہوں۔ اصل وجہ جناب محمود شاہد جانتے ہیں۔ محمود صاحب نے میری ایک نہ مانی۔ میری ہر درخواست رد کرتے گئے۔ آپ جیتے میں ہارا۔ آپ کی خواہش سر آنکھوں پر۔ میں اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں صدر ہوں۔ ہاں میں آج کے مشاعرہ کا صدر ہوں لیکن ایک نثر نگار کو مشاعرہ کا صدر گرداننے میں چھپی مصلحت میری سمجھ سے باہر ہے۔ کہیں آپ حضرات غلط فہمی کا شکار تو نہیں ہیں کہ میں شاعر ہوں یا آپ کو خدشہ ہے کہ میں مستقبل میں شعر کہوں گا۔ انسان کو بگڑتے دیر نہیں لگتی۔ میں اس مشاعرہ میں اعلان کرتا ہوں کہ میں نے آج تک شعر نہیں کہا ہے اور نہ ہی مستقبل میں ایسا کوئی نیک ارادہ ہے۔

جب صدارت کے لیے اہل لوگوں میں میرا نام شامل ہو گیا تو مشاعرہ کا صدر بننے پہ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ مشاعرہ کا صدر بننا دوسرے کئی محافل کے صدر بننے سے لاکھ درجہ بہتر ہے۔ عین ممکن ہے کہ شعراء حضرات کو ایک نثار وہ بھی طنز و مزاح نگار کے صدرِ مشاعرہ ہونے پر اعتراض ہو۔ اگر ایسا ہے تو میں شعرا کی تائید کرتا ہوں۔ مجھے فوراً صدارت سے ہٹ جانا یا بصورت دیگر ہٹا دینا چاہیے۔

شعر گوئی اور شعر فہمی ایک الگ ہی فن ہے۔ میں اس فن میں بالکل کورا ہوں۔ اس عیب کو چھپانے کے لیے میری کوشش ہوتی ہے کہ مشاعرہ میں کسی ایسے شخص کے ساتھ بیٹھوں جس کے ذوق کی دھاک جمی ہوتی ہے۔ جب وہ داد دیتے ہیں مکرر مکرر کا نعرہ بلند کرتا ہوں اور جب وہ خاموش ہوتا ہے تو میں گردن جھکا لیتا ہوں۔ اس طرح سے میں نے اپنا بھرم قائم رکھا ہے۔ اب تو میں خود مشاعرہ کی صدارت پر ہوں گا۔ شعرا و سامعین کی نظریں مجھ پر ہوں گی تو میں سوچتا ہوں کہ ایسے وقت مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ داد دینی پڑے گی۔ اگر داد غلط سلط ہو جائے تو شعرا برادری سے درخواست ہے کہ وہ درگزر کریں۔ بہ حیثیت صدرِ مشاعرہ میں شعرا حضرات پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ کلام سنانے کے لیے مجھ ناچیز سے اجازت لینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ طبیعت سیر ہونے تک جتنا بھی چاہے اپنا کلام سنائیں میں سننے کے لیے تیار بیٹھا ہوں صدر بنایا اسی لیے جاتا ہے کہ وہ گھنٹوں صبر و تحمل سے بیٹھا رہے۔ آگے سامعین کی مرضی اور خواہش۔

مشاعرہ اردو تہذیب اور اردو زبان کی کئی روایتوں میں سے ایک ہے جو آج بھی باقی و برقرار ہے۔ اردو زبان بہ حیثیت ذریعہ تعلیم ختم ہو چکی ہے۔ مادری زبان ہونے کے باوجود کئی حضرات کو اردو نہیں آتی۔ اردو رسم الخط تبدیل کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ دفتروں سے اردو غائب ہے۔ اردو اخبار اور

رسالے بند ہو چکے ہیں یا ان کی تعداد اشاعت مستقل گھٹ رہی ہے۔ بک اسٹالس اور لائبریریوں سے اردو کتابیں غائب ہیں۔ ایسے حالات میں مشاعرہ ہی وہ مرکز ہے جہاں لوگ اردو کے حوالے سے اکٹھا ہوتے ہیں۔ اردو بولتے سنتے اور محظوظ ہوتے ہیں۔ چند احباب پسند آنے والے اشعار نوٹ بھی کرلیتے ہیں۔ خدا را مشاعروں کی کامیابی سے اردو زبان کے زندۂ جاوید ہونے کا اندازہ مت لگائیے۔ میں چاہتا ہوں کہ مشاعروں میں اشعار سننے اور داد دینے کے ساتھ چند لمحوں کے لیے ہم اپنا محاسبہ کرلیں۔ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہ ہم اپنی زبان کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ ہم اردو بول اور سن لیتے ہیں، حتیٰ کہ اردو میں سوتے اور جاگتے خواب بھی دیکھتے ہیں؛ کیا ہم اردو پڑھتے اور لکھتے بھی ہیں؟ کیا ہماری نئی نسل اردو جانتی ہے؟ ہم نے اپنی زبان کے لیے ماہانہ بجٹ میں کتنا حصہ مختص کیا ہے؟ اردو کی ترقی اور ترویج میں ہمارا حصہ کیا ہے؟

ہمیں جنگی بنیادوں پر اردو زبان کے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔ اردو کو پھر اپنے دلوں اور گھروں میں بسانا ہے۔ اردو پڑھنا اور لکھنا سیکھنا اور سکھانا ہے۔ اردو رسائل اور روزنامے خریدنا ہے۔ اگر اب بھی ہم اپنی زبان کی بقا میں ناکام رہے تو خدشہ ہے کہ تہذیبی ورثے کی منتقلی رک جائے گی اور آنے والی نسلیں اپنی شناخت سے محروم ہوں گی۔

بحیثیت صدر میرے ذمے چند فرائض ہیں جنھیں ادا کرتے ہوئے مجھے دلی مسرت ہو رہی ہے۔ اصولاً یہ کام مشاعرے کے اختتام پر ہوتا ہے لیکن نثری [illegible] والے سے مجھ سب سے پہلے طلب کرلیا گیا ہے۔ میں بھی روایت کو توڑتے ہوئے ابتدا ہی میں شکریہ ادا کر رہا ہوں۔ اس کا بھی خدشہ ہے کہ مجھے دوسری مرتبہ موقع نہ ملے۔

ہم منتظمین مشاعرہ کے ممنون ہیں کہ انھوں نے صحرا میں ایسی سرسبز اور شاداب محفل کا انعقاد کیا۔ سننے اور سنانے والوں کو جمع کیا ورنہ انھیں کیا پڑی تھی کہ اردو کی محفل سجانے کے لیے بھاگ دوڑ کرتے۔ آرام سے ایرکنڈیشنر کے آگے بیٹھے کوئی رنگین فلم ہی دیکھ لیتے۔

میں شعرا حضرات کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔ گھاٹے کا سودا جو کرتے ہیں۔ خون دل جلا کر شاعری کرتے ہیں۔ حالات اور جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ بدلے میں انھیں کیا ملتا ہے۔ ان میں اکثر کو اپنا مجموعۂ کلام خود چھپانا پڑتا ہے۔ ادبی رسالوں کی سرپرستی قبول کرنی پڑتی ہے اور اپنے خرچے پر مشاعروں میں شرکت کرنی پڑتی ہے۔ اس صورت حال کے ذمہ دار شعرا نہیں بلکہ ہم سب اردو والے ہیں۔ بہرحال میں شعرا حضرات کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ وہ سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے مشاعرے میں شرکت کر رہے ہیں۔

میں آپ تمام سامعین حضرات کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ حضرات کا شمار اب "جنس نایاب" میں ہونے لگا ہے۔ اردو [illegible] غلوں کے ساتھ اردو کتابوں اور رسالوں کے قاری تیزی سے غائب ہو رہے ہیں۔ اپنی ویک اینڈ مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر گھنٹوں ہونٹ اور ناک آمنے کیے بغیر مسلسل سنتے رہنے کے امتحان میں آپ اپنی مرضی سے شریک ہو رہے ہیں۔ میری دعا ہے کہ آپ امتیازی کامیابی سے ہمکنار ہوں اور طلائی تمغے کے حق دار ٹھہریں۔ آپ سے محفل میں زندگی رہے گی۔ جس کے لیے میں سپاس گزار ہوں۔

خطبہ استقبالیہ کے دوران میں سوچ رہا تھا کہ صدر مشاعرہ تو میں ہوں لیکن موصوف کسی دوسرے شخص کی خوبیاں بیان کر رہے ہیں۔ ممکن تھا کہ میں بھی تالیاں بجاتا سکندر صاحب نے اشارے سے بتایا کہ میرے بارے میں گل افشانی ہو رہی ہے۔ اس بارے میں اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ صدر محفل کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملانا محفل کی رسمی کارروائی کا ایک جز ہے۔ صدر مشاعرہ کی اس طرح تعریف و توصیف کم و کاست میں نے ہر مشاعرہ میں سنی ہے۔ اس کے باوجود میری درخواست ہے کہ آپ دعا فرمائیے کہ صدر صاحب کے خیالی پیکر میں رنگ بھرنے کی مجھے توفیق عطا ہو، آمین۔

پرویز ید اللہ مہدی

سستا آدمی مہنگی سواری

ایسا نہیں ہے کہ بمبئی کے طول و عرض میں لوکل ٹرینوں اور بسوں کا ممنون احسان ہوئے بغیر آدمی ایک مقام سے دوسرے مقام تک نقل مقام نہیں کر سکتا۔ خدا رکھے یہاں آبادی کے سرکولیشن کو باقاعدہ جاری و ساری رکھنے کے کم سے کم دو ذرائع ایسے ہیں جن کے ذکر کے بغیر مقامی حمل و نقل کا یہ باب ادھورا اور تشنہ رہے گا۔ آمد و رفت کے یہ دو تیز رفتار ذرائع ہیں ٹیکسیاں اور آٹو رکشہ۔ جہاں تک ٹیکسیوں کا تعلق ہے، بمبئی کے بلدی حدود میں ان کے کہیں بھی آنے جانے پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ البتہ آٹو رکشہ کی دوڑ صرف مضافات کی حد تک محدود ہے۔ آمد و رفت کے یہ ذرائع چونکہ ذرا مہنگے ہیں اس لیے صرف انہیں کے آگے رام ہوتے ہیں جن کے جیب میں خاصے دام ہوتے ہیں گویا ان سے زیادہ تو وہی لوگ مستفیض ہوتے ہیں جن کے گھروں میں پیسوں کے جھاڑ اور نلوں سے پانی کی جگہ پیسوں کی دھار بہتی ہو۔ اب رہے آپ کی ہماری طرح کے عام آدمی، تو وہ صرف آسمانی سلطانی افتاد پڑنے پر ہی ان اونچی سواریوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ اور بعد ازاں اس بجٹ شکن جرأت رندانہ کے نتیجہ میں مدتوں پیدل ناپتے پھرتے ہیں چنانچہ اپنے غریبانہ بجٹ کے باوجود جب بھی ہم کسی مجبوری کے تحت ٹیکسی میں بیٹھتے ہیں، دوران سفر ہماری نظر ہماری نظر، کیونکہ ٹیکسی کے میٹر پر مرکوز ہوتی ہے پل بھر کے لیے بھی نہیں ہٹتی، لہٰذا اپنے اس تجربے کی بنا پر ہم خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتے ہیں کہ میٹر کی رفتار سے ٹیکسی کی رفتار دگنی اور ہمارے دھڑکتے دل کی رفتار میٹر کی اسپیڈ سے چار گنی ہوتی ہے۔ گویا ٹیکسی کی رفتار، میٹر کی اسپیڈ اور ہمارے دل کی دھک دھک کے مابین ایک زبردست ریس ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اپنے دل کی سلامتی کی خاطر ایک اصول بنا لیا ہے یعنی اب ٹیکسی میں صرف اس وقت بیٹھتے ہیں جب کرائے کا بار کسی اور کی جیب اٹھاتی ہے۔

بمبئی میں چونکہ نہ تو مالداروں کی کمی ہے نہ ان کی ذاتی موٹر کاروں کی، اس لیے آر ٹی او والوں نے ٹیکسیوں کے لیے کالا اور پیلا رنگ مختص کر دیا ہے۔ بالفاظ دیگر ٹیکسیوں کا دھڑ کالا اور چھتیں پیلی ہوتی ہیں۔ اس طرح عوام الناس کو ٹیکسی اور پرائیویٹ کار میں تمیز کرنے میں آسانی ہوتی ہے، جن کی جیب میں مال ہوتا ہے وہ ہاتھ ہلا کر ٹیکسی روکتے ہیں۔ اور جن کی جیب خالی ہوتی ہیں وہ اپنے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کا رخ مطلوبہ سمت کی طرف کر کے پرائیویٹ کار والوں سے لفٹ (مجھ ہنائی) مانگتے ہیں اور اکثر منہ کی کھاتے ہیں یعنی پرائیویٹ کار والوں کے انگوٹھا دکھا کر نکل جانے پر پیدل ہی اپنی منزل مقصود کی جانب چل پڑتے ہیں۔ لفٹ مانگنے والے ہر طرح سے فائدے میں رہتے ہیں۔ لفٹ مل گئی تو

کیا کہیے نہ ہینگ لگتی ہے نہ پھٹکری اور رنگ آتا ہے چوکھا، اور اگر بنی تو بھی فائدہ وہ اس طرح کہ پیدل چلنے سے جسم کے رگ پٹھے مضبوط ہوتے ہیں بھوک کھلتی ہے، نیند اچھی آتی ہے۔ یوں تو ہمارے مہذب سماج میں کالی پیلی چیزوں کو کم تر اور حقیر گردانا جاتا ہے۔ ثبوت کے لیے ان بدنصیب لڑکیوں کو دیکھیے جو کالی پیلی ہوتی ہیں شادی کی منڈی میں ان کی کالی پیلی رنگت ایسے ایسے رخنے ڈالتی ہے کہ اپنے خوابوں کے شہزادے کی راہ تکتے تکتے ان کی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔ وقت کے ظالم ہاتھ ان کی مانگ میں سیندور کی جگہ سفیدی پھیر جاتے ہیں۔ جس سماج میں کالی پیلی رنگت کا مول اپنے انسانوں کے خون سے چکانا پڑتا ہے اس سماج میں یہ طرفہ تماشہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ وہی کالی پیلی رنگت جب کسی موٹر کار کا امتیازی نشان بن جاتی ہے تو بھی اس کے نخروں کے آگے یہ کہتے ہوئے سر جھکا دیتے ہیں کہ ؂

سر تسلیم خم ہے جو "مزاج کار" میں آئے

بمبئی چونکہ ایک شہر ہی نہیں اچھا خاصا طلسم ہے بلکہ زندہ طلسمات ہے۔ اس لیے یہاں عجوبوں کی کمی نہیں مثال کے طور پر ٹیکسیوں ہی کو لیجیے جتنی ٹیکسیاں یہاں کی سڑکوں پر دندناتی ہیں اور آپ کے اغل بغل سے زناٹے کے ساتھ گذر جاتی ہیں ان سے دوگنی تعداد میں ہنستی بولتی۔ اٹھلاتی مچلتی ٹیکسیاں قدم قدم پر آپ کو دعوتِ نظارہ دیتی ہوئی مست ہوا کے خوشبودار جھونکے کی طرح ادھر سے ادھر نکل جاتی ہیں۔ آخرالذکر ٹیکسیوں کے کوائف بلکہ گزارشِ احوالِ واقعی کا مکمل و مفصل علم ہمیں کچھ عرصہ قبل ان پنواڑی مہاشے کی زبانی ہوا جن کی دکان کو ہمارے ایک "شناسا" اپنی ملاقاتی بیٹھک کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اس روز ہم اپنے مذکورہ شناسا سے ملنے جیسے ہی مکان نمبر پر پہنچے۔ پنواڑی مہاشے نے کفِ افسوس کی طرح ہتھیلی پر مادا ملتے ہوئے مطلع کیا؛

"آپ کے آتے ہی بس دو منٹ کی ہیر پھیر ہو گئی ابھی ابھی ادھر سامنے فلائٹ پر بیٹھے چلم کا دم مار رہے تھے کہ اچانک پیچھے سے ایک ٹیکسی کا ساتھ کاٹ کے ان کی نظر کے سامنے سے نکل گئی۔ پھر کیا تھا چلم چھوڑ کے دھوئیں کے مانند اس کے پیچھے نکل لئے! اس انکشاف پر ہم نے پہلے تو قبر کی طرح تنگ گلی کے طول بلد اور عرض بلد کا جائزہ لیا پھر طنزیہ لہجے میں پنواڑی سے کہا مہاشے مذاق میں مبالغہ جائز ضرور ہے مگر اتنا بھی نہیں کہ بس تنگ گلی میں ایک سائیکل سوار کا گزر بھی مشکل ہو اس میں آپ ایک سالم ٹیکسی دوڑا دیں۔

پنواڑی نے جواب میں مسکراتے ہوئے کہا "بھیا آپ میری بات سمجھے نہیں، آپ جو ٹیکسی سمجھ رہے ہیں میں اس کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ میرا اشارہ اس ٹیکسی کی طرف ہے جو چھم چھم چھم کرکے آتی ہے اور چھما چھم، چھما چھم، چھما چھم کرتی ہوئی نکل جاتی ہے۔

ہم نے گڑبڑا کر کہا "مطلب آپ چار پہیوں والی ٹیکسی کی بات نہیں کر رہے ہیں۔" پٹاک سے بولے بالکل نہیں۔ میں تو دو ٹانگ والی ٹیکسی کی بات کر رہا ہوں۔ جس کی ناک میں نتھنی، کان میں جھمکا کمر پر چوٹی جھلا اور جسے جھٹکے دیکھ کے دل کو لگے ہچکی جھٹکے اور یوں ہم پر یہ عقدہ کھلا کہ ایک اچھے خاصے انسانی وجود کو محض اس جرم کی پاداش میں ٹیکسی گردانا جاتا ہے کہ پیٹ کی آگ اسے بھی ٹیکسیوں کی طرح گاہکوں کی تلاش میں سڑکوں پر لے آتی ہے۔ کیا مجبوری نے آدم و حوا کی اولاد کو بمبئی میں مشین کے درجے پر پہنچا دیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔!!

□□

سید طالب حسین زیدی
(حیدرآباد)

چار مینار سے نوے پل تک،

آج سے پچاس پچپن سال پہلے حیدرآباد کا نقشہ ایسا نہیں تھا جو آج نظر آتا ہے مخدوم نے جس کو شہر نگاراں باندھا تھا وہ ادھوری کی بات ہے، اپنے دل کو بہلانے کے لیے لاکھ کہتے رہیے کہ نہوں نے ترقی کی ہے مگر ہم اس ترقی کو ترقیِ معکوس ہی کہیں گے، ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ شہر سمنٹ اور کانکریٹ کا ایک بے ہنگم جنگل بن گیا آدھی سڑکوں پر برساتی مینڈکوں کی طرح ابل پڑے ہیں، پہلے لوگ گھروں میں رہا کرتے تھے۔ جن کے صحنوں کے چمپا چنبیلی کے منڈوے اور موتیا گلاب کی کیاریاں آنکھوں میں طراوت اور مشام جان کو معطر کیا کرتی تھیں، اور آج وہ گھونسلوں اور بلوں میں گذارہ کر رہے ہیں اگر اسی کا نام ترقی ہے تو

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!

آئیے! آج اپنی یادوں کے دریچے سے اس زمانے کے حیدرآباد "نگینہ" کے بھول پن اور بے ریائی کا تھوڑا سا نظارہ کروائیں۔ جب چار مینار "چیان منارا" اور نیا پل "نوا پُل" کہلاتا تھا۔ ان پچاس برسوں کے اندر وقفہ وقفے سے چند تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ اس کی کچھ مثالیں اور اس دور کی چند دلچسپ تصویریں بھی آپ کی ضیافت ذوق کے لیے پیش ہیں!

محلے میں چاند خاں گاؤ قصاب کی دکان ہوا کرتی تھی وہ ہے تو آج بھی مگر اس کے رنگ ڈھنگ کچھ نرالے ہو گئے ہیں، چاند خاں تو گزر گئے۔ بیٹے بھی خرچ ہو گئے اب نئی تہذیب کے پوتے نے گدی سنبھال رکھی ہے۔ نئی روشنی کی عینک آنکھوں پر چڑھا کر دکان کا حلیہ بدل ڈالا، اندر کی زیبائش کے ساتھ ساتھ باہر کی آرائش بھی ہو گئی پہلے کے جیسے لے بڑے کی زبان پر "چاند خاں گاؤ قصاب کی دکان" چڑھا ہوا تھا، آج یہاں چھپنے نام دکان کے ساتھ ایک سائن بورڈ بھی آویزاں کر دیا ہے۔ پڑھیے!

خدا بخش فضل رفیق "بیت اللحم" [illegible] حسینی قریشی مرحوم

ناموں کی یہ ادھوری لسٹ۔ بڑی دل چسپ ہے اس کو دیکھنے کے لیے چار مینار سے نئے پل کا چکر لگا آئیں مگر یہ بورڈ ہیں . . . . . پہلے گھر سے چار مینار تک کا احوال سنیئے جو آن دنوں پیش نظر رہا کرتا تھا۔

موتی رہی : مجتبیٰ کا دل چسپ مضمون "موتی رہی" بہت سوں نے پڑھا ہوگا مگر وہ حکایات درون خانہ ہم آپ کو واقعات بیرون در کی بعد ازاں سنا تے ہیں۔ یاد ہوگا پچاس برس پہلے راستہ طے کرتے ہوئے دیوار پر جگہ جگہ یہ وارننگ پڑھنے میں آیا کرتی تھی۔

یہاں پیشاب کرنا سخت منع ہے ورنہ چالان عدالت کیا جائے گا یا ورنہ چپل سے مارا جائے گا۔

وغیرہ وغیرہ ـــــ

مگر اس چالان عدالت کو لوگ چپل کے ساتھ گھول کر پی گئے تھے۔ کسی کو رتی برابر بھی اس کا ڈر تھا نہ پرواہ اور یہیں اس وارننگ کے نیچے والی زمین اور دیوار دور تک گیلی ہوا کرتی تھی۔ راہ گیر یہاں سے گزرتے وقت ناک پہ رومال رکھ کر تیزی سے گزر جاتے مگر سوائے ایک مقام کے۔ لکھا تھا!

"یہاں پیشاب کرنا سخت منع ہے۔ بیٹھتے ہی الٹ دیا جائے گا۔"

. . . . . ہم نے دیکھا دور تک یہاں کی زمین اور دیوار پاک و صاف تھی۔ کسی کو یہاں فارغ ہونے کی جرأت نہیں ہوئی اس تنبیہ کو پڑھ کر مارے خوف و دہشت کے وہاں سے گزرنے والوں کا پیشاب ہی بند ہو جاتا اور ایک جھرجھری لے کر تیزی سے گزر جاتے اور کسی "گوشۂ عافیت" ہی میں جا کر اپنے آپ کو ہلکا کر لیتے۔ جب یہ ذکر ہی چل نکلا تو ایک لڑکے کی داستان الم بھی سن لیجیے:

اسکول کے طالب علموں نے اپنے ایک ساتھی کو گلی میں پیشاب کر کے اٹھتے ہوئے دیکھا تو اس حرکت پر اس کا خوب مذاق اڑایا اور اس کو شرم بھی دلائی اور ساتھ ہی یہ فتویٰ بھی داغ دیا کہ تمھاری مسلمانی معرض خطر میں پڑ گئی کہ تم نے ڈھیلا نہیں سکھایا، یہ صریح گناہ ہے، اس تنبیہ پر اس کو شرم تو بہت آئی مگر وہ غریب اس پیشرِ خاص سے واقف ہی نہیں تھا اور مفتیان شرع متین نے "بہ چہرہ ترکیب استعمال" دیا نہ تھا۔ فتوے کو پلے سے باندھ کر عہد کر لیا کہ آئندہ وہ بھی ایسا ہی کرے گا اور بے طہارت نہ رہے گا۔

ایک دن شدت کے تقاضے سے مجبور ہو گیا تو ادھر ادھر تلاش کر کے ایک ڈھیلا اٹھایا اور زمین پر رکھا اور پیشاب کر دیا۔ ملائی کاغذ سے پکڑ کر ڈھیلا اٹھایا اور تیز دھوپ میں ایک دیوار پر رکھ دیا ـــــ!

اب چلیے چار مینار سے چار کمان کی طرف پہلے نکڑ والی "میگھراج حلوائی" کی دکان پر، بڑے میاں ناک پر مکھی بھی بیٹھنے نہیں دیتے تھے۔ کوئی کہتا اچھی مٹھائی دینا۔ جواب ملتا "اچھی" نہیں ہے راستہ ناپو۔ کوئی تازہ مٹھائی طلب کرتا تو پیسے واپس کھسکا کر فرماتے، تازہ نہیں ہے سب باسی ہے چلے جاؤ مگر لوگ پھر پیسے لفافہ واپس لیتے۔ منتیں کرتے اور منا کر وہ مٹھائی لے جاتے جس کے ذائقے کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

چار کمان : برابر میں بائیں طرف حیدر آباد کے مشہور اور معروف ترین قریشی ڈاکٹر محمود راج سکینۃ الہام کا مطب، مرجع بیماراں تھا ایسی شریف ہستیاں اب پیدا ہونے سے رہیں۔ مطب کے بورڈ پر لکھا تھا "یہاں بجلی سے علاج کیا جاتا ہے" وہ بجلی ڈاکٹر تھے، شروع شروع عوام نے گھبرایا کرتے تھے کہ پیٹ میں عوام نے کہا ڈاکٹر صاحب! ہم کو مارنا ہے تو اسی دم وہ بجلی کے ساتھ میں رنگ پہ ڈاکٹر واڑ کے دو مر

سر سے کے ننگے تار کو ہمارے بدن سے چھو دیں گے مگر کبھی ایسا حادثہ پیش نہیں آیا۔ صرف دواؤں ہی سے کام چل جاتا اس کی رپورٹ لاؤ نہ اس کی لاؤ نہ یہ امتحان نہ وہ امتحان صرف بارہ آنے کی دوا سے ہی بیماریاں رفو چکر ہو جاتی تھیں۔ جب ڈاکٹر کی نیت خالص ہے تو اس کے ہاتھ میں شفا کیوں نہ ہو؟

ڈاکٹر صاحب نہایت شریف المزاج، مرنجان مرنج قسم کے انسان تھے۔ تصوف کا رنگ غالب تھا۔ "حضرت امجد حیدرآبادی کے رنگ میں رباعیات کہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر زور مرحوم کے والد حضر زرم کے عرس کے موقع پر پیلی مُستقیم جنگ کے پاس درگاہ کے احاطے میں مشاعرہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف سیاہ شیروانی اور سیاہ رنگ ہی کی ٹوپی پہنے تشریف لائے۔ جامہ زیب آدمی تھے۔ گورا چٹا رنگ اس لباس میں بہت بھلے لگ رہے تھے۔ اپنی باری آنے پر ایک رباعی سنائی۔ آخری مصرعہ تھا،

میری قسمت کا محکول جاتا ہے

شعرا کی صف میں سے ایک بڑے سال خوردہ شاعر فصیح الدین اخگر تخلص، لہراتے ہوئے اٹھے اور ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کر کے کہنے لگے، "ڈاکٹر صاحب! اس مصرعے کو یوں ادا کیجیے:

"سوٹ[1] کی قسمت کا مجھ کو مل جاتا ہے"

ڈاکٹر صاحب کی وسیع پریکٹس کے پس منظر میں اس فقرے پر ساری محفل قہقہہ زار ہو گئی۔ ......

اب چادر کمان سے آگے گلزار حوض اس دور میں واقعی گلزار تھا نہ کہ آج کل جیسا کوڑا کرکٹ اور غلاظت سے بھرا ہوا تعفن اٹھاتا ہوا چوراہا ہے کے بیچوں بیچ ایک بڑا کھڈ۔ اس حوض سے گن کر چند ہی قدم کے فاصلے پر داہنی طرف کرشنا ٹاکیز "کم عمر طالب علموں کو پر دبال نکالنے کے لیے گویا درس گاہ" علم نو خیزیت" (شاہد صدیقی مرحوم کی روح سے اس تصرف پر معذرت کے ساتھ)

بچوں کو پڑھاؤ مدرسے میں ... ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
"کرشنا" جا کے وہ خود سمجھ لیں گے ... غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

جب نادیا اور جان کاؤس کا ظلم اس کے پردہ سیمیں پر لگتا تو اطراف کے تحتانی اور وسطانی مدرسوں کی جماعتوں میں انٹرول کے بعد (میٹنی شو کے وقت) حاضری کم ہو جایا کرتی تھی۔ اس دور کے فلموں کی کاسٹ بھی بڑی مزے دار چیز تھی۔

نادیہ۔ جان کاؤس۔ عبدالرحمن کابلی والا۔ اختری فیض آبادی (بعد کو بیگم اختر) زبیدہ۔ گیتا نظامی۔ گوپ۔ آغا یوس۔ بچہ۔ کتا۔ گھوڑا۔ فلم کے بورڈ پر جب بچوں کی نظر پڑتی اور نادیہ، جان کاؤس کا نام دیکھتے تو ان کا سینہ تن جاتا اور سانس پھول جاتی تھی اور مدرسہ کو آدھے دن کا "دمتہ" مار کر میٹنی شو ضرور دیکھتے اور گھر آ کر کپڑوں میں سگریٹوں کے دھوئیں کی بو بھی ہوتی جب چغلی کھاتی تو بزرگوں کے ہاتھوں پٹنے بھی خوب تھے۔ ......

مچھلی کمان: کمان کے درمیان بلندی پر ایک پتلی مچھلی تار سے بندھی ہوئی لٹکتی رہتی تھی۔ نیچے بیر ہوٹل

---

[1] حیدرآباد میں "شب" کا تلفظ عام طور پر "سُب" اور "سُوب" کیا جاتا ہے۔

کباب کی دکان اور اس کے سائن بورڈ پر یہ شعر ہر آنے جانے والے کی نظر سے ضرور گذرتا

قائم رہے الٰہی یہ ریاست نظام کی
ہر دم یہی دعا ہے اس ادنیٰ غلام کی

یہاں کے خستہ سوندھے سیخ کے کباب، چٹخارے دار چٹنی اور ریشم کی طرح ملائم پراٹھا ذوقِ کام و دہن کے لیے نایاب چیز ہوا کرتی تھی۔ یہ ملتے تو ہر جگہ آج بھی ہیں مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی اور ملی ملی! متقطع، متشرع، سفید ریش بزرگ ہوا کرتے تھے جو صرف چار آنے میں کباب اور پراٹھا بیچتے اور کاغذ میں لپیٹ کر دیتے جاتے تھے۔ مچھلی کمان کی داہنی سمت گزشتے کا ہوٹل دشہران ہوٹل کی ولادت ہوئی کی چیز ہے) اسی کے برابر کوچۂ نسیم، جس میں عمیق جذبۂ اسلامی سے سرشار خدمت گزاروں کی انجمنیں "انجمن خدمت المسلمین"، "انجمن ہدایت المسلمین"، "انجمن اخلاص المسلمین" اور نہ جانے کون کون "محسنی المسلمین" ذرا ان کے سائن بورڈ کے علاوہ بغلی بورڈوں کو بھی غور سے پڑھیے، آپ یہ چیدہ طبع ودلکش نہ ہو جائیں تو ہمارا ذمہ۔

کلّ من علیہا فان

"آبِ زم زم کا پانی" "کفن کے لیے نہایت عمدہ کپڑا۔ کافور۔ اگر بتیاں۔ سرمہ اور عبیر وغیرہ مکمل سامان مناسب داموں دستیاب ہوتا ہے۔ ہماری انجمن ماہر غسالوں کا بھی انتظام کرتی ہے۔

ایک مرتبہ آزمائش شرط ہے"

بھاگ چلیے یہاں سے اور آگے بڑھیے۔ حیدرآباد کا سب سے بڑا مرکزی کپڑا بازار پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے مگر اس کمپیوٹر کے دور نے اس کی دکانوں کے ناموں میں کمپیوٹرائزڈ تبدیلیاں کردی ہیں۔ نئی نئی اور قسم قسم کی نام رکھائیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑا ہے ہم یہاں صرف ایک آدھ مثال پر ہی اکتفا کرتے ہیں ویسے ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ بازار سامنے ہے آپ خود مشاہدہ کرسکتے ہیں۔

مثلاً پہلے یہاں "مدار صاحب، محبوب صاحب پارچہ فروشی" کا بورڈ نظر آتا تھا وہاں پارچہ فروشی تو آج بھی ہوتی ہے مگر رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ وقتے وقفے سے نام رکھائی ہوتی رہی۔ ان کا پہلا تبدیل شدہ نام کوئی تیس چالیس سال پہلے یہ تھا "مدار صاحب، محبوب صاحب، کلاتھ مرچنٹ"۔ کیونکہ پارچہ فروشی کہلانے سے کچھ شرم محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کے بیس سال بعد ہوگئے "ایم ایم اینڈ ایم ٹیکسٹائیلز" اور آج کل وہاں نظر آرہا ہے "مداریز میکسوریم" دکان میں گاہکوں کے لیے بجائے ہاتھ کے پنکھوں کے ایرکنڈیشنر لگوالیا گیا ہے۔ مداریز۔ دکنس اور بوسفس وغیرہ کا تلفظ صحیح ادا کرنے میں زبان کو خیر ایسی کوئی دشواری تو پیش نہیں آتی مگر جہاں "شمسز" وغیرہ سے سابقہ پڑتا تو اس کو چھٹی کا دودھ یاد آجاتا ہے کہ ہائے اللہ اب کیا کروں۔

یہ ساری آگ لگائی ہوئی ہے دراصل بمبئی کے عظیم الشان ڈپارٹمنٹل اسٹور "اکبر علیس" کی لگاؤں جلے زباں باہر۔ وہ تو سلگا کر بجھ ہوگئے مگر ہماری زبانوں کو پاپڑ بیلنے لگ گئے۔ ان کا سارا جھیرا ان ہی کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا۔

اس طرح پھل والوں نے بھی اپنا چولا بدل دیا جو پہلے صرف بخشی پھل والے مشہور تھے وہ "گلفروش" ہو گئے اب دکانوں پر سائن بورڈ بھی نظر آرہے ہیں "فلاور مرچنٹ" "فلاورس اینڈ فلاورس"

یہ مچھلی کمان سے ذرا آگے چلنے کے بعد سڑک کے بیچوں بیچ خانہ لنگر ہے۔ اس کی دیواروں پر لکھا ہوا اشتہار پڑھیے۔

"ہر ایمرلشن کا علاج بغیر آپریشن کے" - حکیم یا ڈاکٹر ..... کیا سمجھا آپ؟ "کچھ شبہ ہے خدا کرے کچھ ہو"۔ ادھر ادھر لال دیوار کی تحریر ملاحظہ کریں۔ "آپ مجھے جانتے ہیں میں کون ہوں"؟ میرا نام ہے طلسمی ماترا۔ جلاب کی ایک ہی دوا۔ اور یہ "دنیا میں کسی کو پاگل نہ رہنے دوں گا" وغیرہ وغیرہ۔ آگے جبلی چھپلنے نو بہ دست منڈی میر عالم کو جانے والا راستہ دونوں طرف کپڑے اور اچار وغیرہ کی دکانیں۔ ایک دکان جہاں دوسری چیزوں کے ساتھ یہ بھی لکھا ہوا تھا۔ "یہاں خالص بیدری گھی ملتا ہے"۔ اسی تہہ خانے کے برابر کالے خاں "آئس مرچنٹ" کا ہوٹل، آئس تو کبھی ملتا نہ تھا۔ ہاں گرما گرم چائے یہاں کی مشہور تھی۔

چار مینار تا نیا پل سڑک صاف ستھری ہوا کرتی تھی۔ دن میں دو دو مرتبہ دھلتی تھی، آج کل کی طرح ٹریفک کے ہنگاموں سے مبرا اور پرسکون۔ تانگے جھٹکے اور بگھیاں دوڑا کرتے تھے۔ ہاتھ کے رکشے بھی آ گئے تھے۔ جن کو پرانے زمانے کی مور تملی نے "تخت" اور "تملی کی سواری" کا نام دیا تھا۔ تانگے والے ان رکشہ والوں کا اپنی "مخصوص" زبان میں فقرے کس کر خوب مذاق اڑایا کرتے تھے۔ موٹر گھنٹے آدھے گھنٹے میں اکا دکا گزرتا تھا۔ اور اس زمانے میں اپنی صورت شکل اور آواز سے ہمیشہ مذکر ہوا کرتا تھا۔ اس کے رعب اور دبدبے کا یہ عالم تھا کہ نئے پل سے اترتا تو پتھر گٹی اور گلزار حوض پر ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے تک اس کی "پوں پوں" سن کر لوگ ہیبت کھا جاتے اور اچھل کر پتھر گٹی کی کمانوں میں پناہ لیا کرتے تھے۔ ابھی اس کی جنس تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو بعد کی چیز ہے۔ "موٹر آ رہا ہے"۔ "موٹر کھڑا ہے"۔ ہی سننے میں آتا تھا۔ علامہ اقبال نے نے بھی مذکر ہی باندھا ہے:

"موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش"!

اور آج کوئی پلٹ کر بھی یہ نہیں دیکھتا کہ یہ پیانو بجاتی ہوئی کون نزاکت خانم چلی آ رہی ہے —— اس صدی کے پہلے دہے ہی میں جب شہر میں نیا نیا موٹر آیا تھا تو اس کو دیکھنے کے لیے سنتے ہیں لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے تھے اور تعجب سے دیکھتے تھے کہ آخر بغیر گھوڑے یا بیل کے یہ "انگریزی بنڈی" چلتی کس طرح ہے۔؟

آخر کافی غور و فکر کے بعد ایک لال بجھکڑ صاحب نے اس گتھی کو سلجھا لیا اور اپنے نتیجہ فکر کا یوں اعلان کیا کہ انگریزوں نے اپنی سائنسی ایجادوں کے ذریعہ شیطان کے بچوں کو گرفتار کر کے اس کے پہیوں میں قید کر دیا ہے۔ اور کپتان اپنی سیٹ پر بیٹھ کر "لاحول" پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ جس کو سن کر یہ بچے بھاگتے ہیں اور پہیہ گھومتا ہے اور بنڈی چلنے لگتی ہے۔ اب جس رفتار سے وہ لاحول پڑھے گا اسی رفتار سے بنڈی بھی دوڑنے لگے گی۔

پتھر گٹی سے آگے مدینہ بلڈنگ علاء الدین وقف (مشہور تھا کہ یہ وہی علاء الدین ہیں جن کو چراغ ملا تھا) اور اسی کے روبرو سر سالار جنگ کی قیام گاہ "دیوان دیوڑھی" جس کے وسیع و عریض کمپونڈ کے ایک گوشے میں حیدرآباد کا مشہور نیلام گھر (ہراج خانہ) جو آج بھی موجود ہے۔ اس زمانے میں جمعہ کی تعطیل کے روز نیلام ہوا کرتا تھا اور ایک دن پہلے یعنی جمعرات کو ملاحظہ اسباب کے لیے مقرر تھا۔ ہر جمعرات

کو ایک نوعمر لڑکا ڈیوڑھی کے بڑے دروازے کے پاس اسٹول پر بیٹھا ہوا "بھونپو" منھ سے لگا کے یہ اعلان کیا کرتا تھا

"آج یہاں (طفلانہ) ازدواج ہے ...... کل ہراج ہوگا۔

اسی ڈیوڑھی سے آگے چل کر نئے پل کا تین دری دروازہ درمیانی بڑے دروازے سے موٹریں۔ تانگے گھیاں بشمول سیکل گزرتے اور دونوں چھوٹے دروازے پیدل راہروؤں کے لیے مخصوص تھے۔ اسی کے داہنی جانب جلال کا ہوٹل "تفریح دکن" جو اس زمانے میں بیشتر بے فکروں کی وقت گزاری کا اڈہ تھا۔ "کن میلئے" سے کان کی صفائی اور سر میں چمپی کرواتے ہوئے چائے بھی پیتے رہتے اور آپس میں ادھر اُدھر کی باتوں میں گھنٹوں وقت گزار دیتے۔ ہوٹل کی دیواروں پر چاروں طرف لانبے لانبے فریموں میں حالی کی مناجات، حمد اور نعتیں آویزاں تھیں:

آبِ رواں کے اندر مچھلی بنائی تونے
مچھلی کے تیرنے کو آبِ رواں بنایا

ان کے درمیان تھوڑے تھوڑے فصل سے "یہاں سیاسی گفتگو کرنا منع ہے" کی تختیاں بھی ہوا کرتی تھیں۔ اس تنبیہہ کے باوجود یار لوگوں پیٹ پھولے رہتے اور ان کی "پھلاوٹ" کو کم کرنے کے لیے سرگوشیوں میں تازہ خبریں ایک دوسرے کو سناتے رہتے۔

"اجی اسنیں حضرت آپ (اجی، سنا آپ نے۔؟) رنگون اور برما" کا بیڑہ غرق کر کو (کر کے) اب کلکتے کو "سترول" کرنے "حضر تاں" آریں کتے (دکھتے ہیں آرہے ہیں) بھوت نئیں (بہت نہیں) دو چار دن کی بات ہے

دروازے کے مغربی سمت "ڈھالیہ ہوٹل" (جہاں آج کل چپل مارکٹ ہے) جس کی خصوصیت یہ خاص اعلان تھا جو اندر داخل ہوتے ہی نمایاں نظر آتا تھا۔

"تندوری روٹی ایک آنہ۔ دال فری"

یہ تھا وہ حیدرآباد جو پچاس سال پہلے سارے ہندوستان کا تارہ تھا، شمال و جنوب سے لوگ اس کی طرف بے تحاشہ کھنچے چلے آتے تھے۔ بلکہ خلیجی ملکوں کے "چاوش" (عرب) لوگ بھی۔ آج کل اسی کی چار دیواری میں پیدا ہونے والے ایسے لوگ بھی ہیں جن کے باپ دادا دُں کی کے آنول یہاں گڑے ہوئے ہیں۔ نہایت "حقارت سے" پرانا شہر کہہ کر اتراتے اور اس کی تذلیل کرتے ہیں۔ ہمارے اخبار بھی "پرانا شہر پرانا شہر" کی رٹ لگا کر اس نامبارک نفرت کی آگ کو اور ہوا دیئے جاتے ہیں۔

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
داماں کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

کبھی اُدھر کے رہنے والے نئے پل کو پار کر کے اِدھر آنے کا ارادہ کرتے تو کہا کرتے "آج ہم شہر جارہے ہیں ......!

° سترول۔ الٹ پلٹ کر دینا۔ بگاڑ دینا ● اشارہ جاپان کی طرف

شکیل شاہجہان (سماجی)

"چھتری"

ایک وزیر نے ملکہ سے آکر شکایت کی کہ "دیش کی رعایا کے پاس پہننے کے لیے کپڑا نہیں ہے۔ ملکہ نے کہا "کیا ضروری ہے" پھر وزیر نے کہا۔ کھانے کے لیے روٹی نہیں ہے۔ ملکہ نے کہا: "روٹی نہیں ہے تو کیک کھاؤ" پھر وزیر نے کہا: "سر پر چھت کا سایہ نہیں ہے"۔ ملکہ نے کہا: "چھت کا سایہ نہیں ہے تو چھتری خرید دو"۔

جب نیلی چھتری والا آسمان پر بادل کی کالی چھتری تان دیتا ہے تو سمجھو برسات کا موسم آگیا۔ ماہرین موسمیات کا کہنا ہے کہ بارش ہندوستان میں چند مہینے رہتی ہے۔ لیکن سماجیات کے ماہرین کہتے ہیں کہ بارش کا موسم سال بھر رہتا ہے۔ دبے کچلے طبقے کے لوگوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش کبھی نہیں تھمتی۔ کسی نہ کسی کارن ان کی آنکھیں ساون بھادوں بنی رہتی ہیں طوفان، باڑھ، فسادات، غریبی، بھکمری، بے روزگاری اونچ نیچ کا بھید بھاؤ اور سیاسی داؤ پیچ اس بارش کا سبب ہوتے ہیں۔ بہرحال ابھی بارش کا موسم ہے۔ گھر کا عالم ہے کہ ایک دن کی مختصر سی بارش میں کئی دنوں تک چھت ٹپکتی رہتی ہے تو بھلا کوئی کیسے میگھ گیت اور کبیر و سور داس کے دوہے گا سکتا ہے۔

بارش کے موسم میں برسات کے پہلے ہلّے کے بعد بہت سے لوگ مکان کی چھت پر نظر آتے ہیں۔ ٹپکا سُدھارنے کے لیے۔ بہت سے لوگ بازار جاتے ہوئے نظر آتے ہیں چھتری خریدنے کے لیے۔ ایسے لوگ دوراندیش ہوتے ہیں۔ کیوں کہ چھتری کے سہارے ٹپکتے ہوئے مکان میں بھی زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے لوگ بارش کے موسم میں اسٹیٹ ٹرانسپورٹ کی بسوں میں چھتری کھول کر سفر کرتے ہیں۔ آخر کب تک اور کہاں تک ٹپکا سدھارتے رہیں گے۔ کیا سرکاری، کیا نیم سرکاری اور کیا غیر سرکاری ہر جگہ بیکاری ٹپکا ہے۔ کہیں بارش کا پانی ٹپک رہا ہے، کہیں غریبوں کے آنسو ٹپک رہے ہیں کہیں مزدوروں کا پسینہ ٹپک رہا ہے، کہیں بے گناہوں کا لہو ٹپک رہا ہے۔ چھتری کے ذریعہ ہم بارش اور بارش کے ٹپکے سے محفوظ رہ سکتے ہیں لیکن ہے کوئی ایسی چھتری جو آنسو اور خون کے ٹپکے سے بھی محفوظ رکھ سکے ۔۔۔؟

دُنیا میں شاید چھتری ہی وہ شئے ہے جو ادھار مانگ کر واپس نہ کی جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا کیوں کہ موسم باراں گزر جانے کے بعد چھتری دینے اور لینے والے دونوں کے لیے کام کی نہیں رہتی۔ جیسے ووٹ دینے والا ووٹ دینے کے بعد ووٹ حاصل کرنے والے کے لیے بے قیمت ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ چھتری کا ساتھ اس

وقت تک رہتا ہے جب تک بارش ہوتی رہتی ہے۔ بارش ختم ہو جانے کے بعد چھتری بوجھ بن جاتی ہے ایک غیر ضروری چیز ــــــ اس لیے چھتری کو کہیں رکھ کر بھول جانے کا رواج عام ہے۔

چھتری کے بہت سے فائدے ہیں۔ عام طور سے چھتری بارش کے پانی سے بچنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے کبھی کبھی دھوپ سے بچنے کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہے۔ عقلمند قسم کے قرضدار چھتری کا استعمال اپنا چہرہ چھپانے کے لیے کرتے ہیں۔ منچلے قسم کے "چھتری مار" نوجوان چھتری کا استعمال خوبصورت قسم کی لڑکیوں کو لفٹ دینے کے لیے کرتے ہیں۔ چھتری میں آدمی آدھا بھیگتا ہے آدھا سوکھا رہتا ہے۔ اس کے باوجود چھتری بہت کار آمد چیز ہے۔

لوگ واٹر پروف (رین کوٹ) کی بہ نسبت چھتری کو زیادہ اہمیت اس لیے دیتے ہیں کہ واٹر پروف میں آدمی باہر سے پورا بھیگ جاتا ہے۔ چھتری خریدنے کے بعد ہم سب سے پہلے آسمان کی جانب دیکھتے ہیں۔ اگر بادل ہیں تو ہماری خواہش ہوتی ہے کہ خوب زور کی بارش ہو تاکہ چھتری کا استعمال فوراً کیا جا سکے۔ عموماً چھتری تین طرح کی ہوتی ہے۔ چھوٹے، درمیانی اور بڑے گھیرے والی۔ چھوٹے گھیرے کی چھتری بچے استعمال کرتے ہیں درمیانی گھیرے کی چھتری چونکہ بٹن دبانے سے کھلتی ہے اس لیے شہروں میں استعمال ہوتی ہے۔ اور بڑے گھیرے کی چھتری چھوٹے شہروں اور دیہاتوں میں استعمال کی جاتی ہے۔

ایک دن زوروں کی برسات ہو رہی تھی۔ پانی تھا کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ہم کو گھر بھی جلد پہنچنا تھا اس لیے ایک دوست کی چھتری میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کر لیا۔ تھوڑی دور چلے تو اچانک ہماری نظر چھتری کے ایک بڑے سے سوراخ پر پڑی جو کسی سروے ڈپارٹمنٹ کے چپراسی کی کہانی تھی۔ جس نے شاید ہندوستان کا نقشہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ ہم نے اپنے دوست سے پوچھا،

"یار، چھتری میں سوراخ کس لیے؟"

تو اس نے تپاک سے کہا۔ "یہ دیکھنے کے لیے کہ بارش ہو رہی ہے یا نہیں۔"

اور ہم لاجواب ہو گئے۔

□□

سلیم مقصود
(جدہ)

عاشقی برائے شاعری

ہمارے ایک ناقد نے ہماری شاعری کا بغور جائزہ لینے کے بعد فرمایا۔ "یار! کیا تم شاعری نیزہ بکف یعنی گویا ہاتھ میں تلوار لے کر کرتے ہو؟" ہم نے جواب دیا۔ "بالکل نہیں۔" پھر کہنے لگے۔ "تمھاری شاعری سے جنگ و جدال بلکہ انسانی خون کی بو آتی ہے۔ جمالیاتی حس تم میں ہرگز نہیں بلکہ نازک احساسات کا فقدان ہے تمھاری شاعری میں۔" ایک دن ہمارے احساسات کے ماخذ تلاش کرنے کے لیے پوچھنے لگے۔ "تمھارے پسندیدہ شاعر کون کون سے ہیں؟" ہم نے کہا۔ "اقبال۔ صرف اقبال"۔ پھر پوچھا کس موضوع پر کتابیں پڑھتے ہو؟ ہم نے کہا کہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم پر لکھی ساری مشہور کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اس کے علاوہ فلسفہ، یاسیت، نفسیات، سیاسیات... بات کاٹ کر بولے۔ "آگے مت بڑھنا۔ ورنہ میرے گردے خراب ہو جائیں گے۔" ہم نے گھبرا کر پوچھا۔ "ان کتابوں کے حوالے سے آپ کے گردے کیسے خراب ہوں گے؟" ہنس کر بولے۔ "میاں یہ کتابیں اعضائے رئیسہ میں سے کسی نہ کسی پر اٹیک کرتی ہیں اور اعضائے رئیسہ میں تو صرف میرے گردے صحیح و سالم رہ گئے ہیں۔ دل و دماغ کبھی کے جا چکے۔" پھر انھوں نے پوچھا۔ "فلمیں دیکھتے ہو؟" ہم نے کہا۔ "جی ہاں! انگریزی فلمیں کبھی دیکھی تھیں۔ جیسے ڈراکیولا، گریٹ ٹرین روبری۔" سر پکڑ کر بیٹھ گئے بلکہ سکتے کے عالم میں تھوڑی دیر لیٹ گئے۔ پھر چونک کر بولے۔ "میں تمھیں بتلاؤں گا کہ تمھیں کیسی فلمیں دیکھنی چاہییں اور کیسی کتابیں تمھارے مطالعہ کے لیے ضروری ہیں۔" چند روز بعد جب وہ گھر آئے تو فلم لیلیٰ مجنوں قدیم و جدید، ہیر رانجھا (جدید و قدیم) اور مغل اعظم فلم کا ویڈیو کیسٹ بھی لیتے آئے اور کچھ رومانی کتابیں بھی جو عشق کا ذوق لطیف پیدا کرنے والی تحفے میں دے گئے۔ گھر میں جب اخبارات و رسائل کی ردی نکالی گئی تو نیک بخت نے وہ بھی ردی میں ڈال دیں۔ غضب ہو گیا۔ چند روز بعد تشریف آوری ہوئی اور مطالعہ وغیرہ کا امتحان شروع کر دیا۔ ہم نے صاف صاف کہہ دیا کہ کتابیں غلطی سے ردی میں بیچ دی گئیں۔ غصے میں کہنے لگے "سستے میں تحفہ والی کتابیں کوڑیوں کے مول بیچ دیں؟۔ انھیں کتابوں کے ذریعہ لوگوں نے عشق مجازی سے

عشق حقیقی تک رسائی حاصل کی تھی۔ آج کل ایسی کتابیں شائع کہاں ہوتی ہیں۔ وہ تو میں ایسے بزرگ کے پاس سے یہ کتابیں لے آیا تھا جنھوں نے انھیں کتابوں کو پڑھ کر معرفت حاصل کی تھی۔ تم نہیں جانتے۔ جب سے عشق کا معیار گھٹا ہے ان کتابوں کی مانگ بڑھ گئی ہے۔" پھر مشکوک لب ولہجہ میں پوچھا۔" فلمیں دیکھی تھیں؟ ہم نے جواب دیا۔" آپ نے عشق پر آمادہ کرنے والی جو فلمیں ہمیں دی تھیں ان میں سے ایک دو فلمیں دیکھیں۔ ایک فلم میں عشق میں گرفتار ہو کر ایک گستاخ شہزادہ اپنے باپ پرتھوی راج کو چیلنج کر دیتا ہے۔ ٹوکتے ہوئے بولے "پرتھوی راج کو نہیں شہنشاہ اکبر کو للکارتا ہے۔" ہم نے بیزار ہو کر فلم آگے بڑھائی "پھر سلیم اور مغل اعظم میں جنگ چھڑ جاتی ہے جس میں کپڑوں کے آدمی توپوں سے اڑائے جاتے ہیں۔" ہماری تصحیح کرتے ہوئے کہنے لگے "سلیم اور مغل اعظم میں جنگ نہیں ہوتی بلکہ سلیم اور اکبر اعظم میں جنگ چھڑ جاتی ہے۔ مغل اعظم تو فلم کا نام ہے۔" ہم کہانی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔" سلیم کی گستاخی پر برہم ہو کر اکبر اعظم نے توپ سے اڑا دیتا ہے۔ پھر دوسری فلم "تاج محل" میں سلیم کا بیٹا شاہ جہاں اپنے باپ کے انجام سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے اسی کے نقش قدم پر چل پڑتا ہے۔ حالانکہ اس کے باپ نے عاشقی میں ہی جان گنوائی تھی۔" غصے سے چیخ پڑے۔" غضب خدا کا۔ کیا واہیات بک رہے ہو؟" ہم نے کہا "سچ کہہ رہے ہیں۔" ہم نے خود دیکھا تھا سلیم کو توپ کے منہ کے سامنے کھڑا ہوا۔" سر پیٹ کر بولے۔" ایسا نہیں ہوا تھا۔ عین موقع پر مان سنگھ نے سلیم کی جان بچائی تھی۔ ہم نے شرمندگی سے جواب دیا۔" انارکلی کی طرح ہم تھے بھی شہزادہ سلیم کا دردناک انجام دیکھا دیا گیا۔ اس لیے ہم توپ چلنے سے قبل سو چکے تھے اور ہماری آنکھ اس وقت کھلی جب انارکلی دکن کی سرحدوں تک پہنچ چکی تھی اور اس نے رضیہ سلطان کا لقب اختیار کر لیا تھا۔" غصے سے چیخ پڑے۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور کانپتے ہوئے کہا۔ تم نے تاریخ کا ایسا ستیاناس کیا ہے کہ پی۔ این اوک نے بھی ایسا نہیں کیا ہوگا۔" ہم نے پوچھا آدمی عشق میں تاج محل جیسا قبرستان بناتا ہے۔ کالج اور دواخانے کیوں نہیں بناتا؟" جل کر بولے۔" تاج محل کو قبرستان نہیں محبت کی نشانی کہا جاتا ہے اور آج کل کالجس اور دواخانے عاشقی کے لیے ہی بنائے جا رہے ہیں۔" ہم سے یہ جھوٹ برداشت نہ ہوئی۔ ہم نے پھر سوال کیا۔" تاج محل میں جو قبریں ہیں ان کو کس کی علامت سمجھا جاتا ہے؟" ہار مانتے ہوئے بولے۔ میں تم میں نازک احساسات پیدا کرنا چاہتا تھا تاکہ تمھاری شاعری میں اثر پیدا ہو مگر افسوس تم پر میری کسی بات کا اثر نہ ہو سکا۔" غرض ان کی مسلسل اکساہٹ سے ہم نے نہایت قلیل مدت میں عشق بازی کی ساری منزلیں طے کر لیں اور جب عشق میں عزت سادات اور جان کا زیاں نظر آیا تو شیریں کے کوچے سے کوچ کر کے بدقسمتی سے پرویز کے شہر پہنچ گئے۔ وہاں سے دودھ کی نہر تو نکال نہیں پائے البتہ ایک دن والد نے عشق نے ہمیں پہچان لیا اور سر بازار گریبان پکڑ کر کہنے لگا۔ میں نے تمھیں پہچان لیا ہے۔ تم مجھ سے نہیں بھاگ سکتے۔ ہم نے کہا ہمیں پتہ تھا۔ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ ہمارے عشق کی خوشبو بھی بالآخر یہاں تک پہنچ گئی۔" اس نے جواب دیا۔" جی نہیں! یہ آپ کے عشق کی کرامت نہیں بلکہ آج کے اخبار میں آپ کا شیریں کے والد کے اشتہار اور آپ کی تصویر کی اشاعت کے سبب میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ اشتہار ہے،

یہ بھی لکھا ہے کہ اشتہار میں شائع شدہ شخص نے جس کا نام فلاں ابن فلاں ہے جوڑے کی رقم لے کر شادی کے دن فرار ہوگیا جو شخص اسے پکڑ کر زندہ یا مردہ شیریں کے والد کے حوالے کرے گا اسے سفر کے خرچ کے علاوہ جوڑے کی مطلوبہ رقم کا نصف فی الواقع ادا کیا جائے گا اور کنوارا ہوگا تو باقی رقم میں اس کی شادی کر دی جائے گی کنوارے اور بے روزگار بلکہ خلیج کو جانے کے خواہش مند حضرات بھی قسمت آزما کر دیکھیں۔ ہم نے اس شخص سے پوچھا (جس کے لیے ہم اب لاٹری کے ٹکٹ اور ریس کے گھوڑے سے کم نہ تھے) "بھائی جان ہمارا انجام کیا ہوگا؟" اس نے سفاکی سے جواب دیا۔ "تمھارا وہی انجام ہوگا جو فلم انارکلی میں بینا رائے کا ہوا تھا۔" ہم نے کہا "۔ یہ فلم ہماری پیدائش سے قبل بنی تھی اس لیے ہم نے یہ فلم نہیں دیکھی۔ ہمیں انارکلی کے انجام سے آگاہ کیا جائے۔" اجنبی بولا "انارکلی کو اکبر بادشاہ فلم ختم ہونے سے دس منٹ قبل دیوار میں چنوا دیتا ہے۔" ہم نے خوف زدہ ہو کر کہا "یہ کھلی درندگی ہے۔ حقوق انسانی کی خلاف ورزی ہے۔ آخر ہیومن رائیٹس (Human Rights) بھی کوئی چیز ہیں۔ وہ شخص بھی بڑا جہاں دیدہ تھا کہنے لگا "شیریں کے باپ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ U N O کی پابندیوں کی طرح سخت ہوتا ہے۔ تمھیں یہ سزا بھگتنی ہوگی۔" ہم نے اسے پھسلاتے ہوئے کہا "یار U.N.O میں بھی تو دھاندلیاں ہوتی ہیں۔ دہشت گردی کوئی کرتا ہے اور پابندیاں کسی اور پر لگائی جاتی ہیں۔" آنکھیں نکال کر بولا "کیا مطلب؟" ہم عاجزی سے بول پڑے "بھائی! روس کی طرح آنکھیں نہ دکھاؤ۔ سرد جنگ کا زمانہ بیت چکا۔ کوئی تدبیر سوچو۔" اس نے کہا "تدبیر سوچ لی۔" ہم نے پوچھا "کیا سوچا؟" "تم 25 ہزار روپے مجھے دے دو میں تمھیں چھوڑ دوں گا۔" ہم نے تو جوڑے کی رقم کا ٹراویلنگ چیک بنوا لیا ہے۔ تمھیں کیسے دیں؟ بعد میں ہم نے چیک بھنا کر اسے مطلوبہ رقم دے دی۔ دوسرے دن اچانک ہماری پناہ گاہ پر بلوائیوں نے ہلہ بول دیا۔ اس اجنبی نے ہمیں بہت پیٹائی کرنے کے بعد کہا "مجھے غور سے دیکھو اور پہچانو کہ میں کون ہوں؟" ہم نے غور سے دیکھا تو قدموں تلے زمین نکل گئی۔ یہ تو شیریں کا بھائی تھا جسے جل دے کر ہم یہاں بھاگ آئے تھے۔ پھر ہم چار آدمیوں کے کاندھے پر سوار قاضی کے روبرو لائے گئے۔ جس نے ہمارے ساتھ انصاف کرنے کے بجائے ہمارا نکاح پڑھا دیا۔ اس دن سے ہم اس شخص کی تلاش میں ہیں جس نے ہمیں عشق کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن خوف بھی ہوتا ہے کہ کہیں وہ ہمارے ہی سسرال کا کوئی آدمی نہ ہو۔

غزلیں

اقبال ہاشمی

خون جس کا سفید ہوتا ہے　　وہ جہنم رسید ہوتا ہے
جو ہوس کا مرید ہوتا ہے　　وہ سراپا یزید ہوتا ہے
عشق کا جو مرید ہوتا ہے　　عشق میں وہ شہید ہوتا ہے
جو قلم زر خرید ہوتا ہے　　اس کا لکھا پلید ہوتا ہے
اک جہنم ہے وہ شکم جس کے　　لب پہ ھل من مزید ہوتا ہے
گر نکل جائے باس کے منہ سے　　مشورہ وہ مفید ہوتا ہے
گھر کا بھیدی اگر نحیف بھی ہو　　اس کا حملہ شدید ہوتا ہے
ہاشمی نثر میں جو شعر کہے
ایسا شاعر جدید ہوتا ہے

○

رفعت صدیقی

شوریدہ سر و زشت نظر سب مزے میں ہیں　　ہیں سادہ لوح خاک بسر، سب مزے میں ہیں
ہے کس کو فکر آگ جو پھیلی ہے شہر میں　　جاری ہے یوں ہی رقصِ شرر سب مزے میں ہیں
گر لٹ گیا ہے میرا اثاثہ تو کیا کہ ہیں　　محفوظ، رہ نماؤں کے گھر سب مزے میں ہیں
آئینے، خیر خواہوں نے بانٹے ہیں چار سو　　کھوئی ہے جب سے ہم نے نظر سب مزے میں ہیں
الفاظ کے بھرم کا جنازہ نکل گیا　　ویسے تو پیش و زیر و زبر سب مزے میں ہیں
سننے کی چیز رہ گئی، اردو زباں فقط
قاری نہیں ہیں کس کو خبر سب مزے میں ہیں

○

روشن لال روشن بنارسی

کوئی گھر ہے نہ گھاٹ ہے صاحب　　یوں تو سب ٹھاٹ باٹ ہے صاحب
غیرتِ قوم بک رہی ہے جہاں　　وہ سیاست کی ہاٹ ہے صاحب
ہم ہیں دو گز زمین سے محروم　　اُن کو کوٹھی الاٹ ہے صاحب
معجزہ ہے کہ ہم ہیں خوابیدہ　　کوئی بستر نہ کھاٹ ہے صاحب
اس کو اخبار مت سمجھ یعنی　　یہ سیاست کی چاٹ ہے صاحب
اس کو اوڑھیں بھی ہم بچھائیں بھی　　گھر میں لے دے کے ٹاٹ ہے صاحب
یہ غزل ہے مزاحیہ روشن
اس میں نشتر سی کاٹ ہے صاحب

کی مکمل تصویر بنے بے بس بیٹھے رہے۔
ایک اور دفعہ یہ ہوا کہ ہم نے ایک نامور ادیبہ کو نئے سال کی مبارک باد دینے کے لیے فون ملایا
"ہیلو ــــ! ہیلو ہا! نیا سال مبارک ......" ہمارے لہجے میں نیا سال پوری طرح جلوہ گر تھا...
دوسری طرف سے، "ارے بھئی بہت بہت مبارک ہو تمھیں بھتیجا....."
ہم، جی کیا کہا؟ بھتیجا؟ یہ کہاں سے آگیا؟ ہمارے پاس کئی سوال تھے۔
دوسری طرف سے، "تو اب تم مٹھائی کھلانے سے بچنا چاہتی ہو، کیوں؟" لہجہ بتا رہا تھا کہ یہ کوئی عمر رسیدہ خاتون ہیں اور ہمارے خاندان کی بزرگ نہ ہونے کے باوجود ہم پر رعب جماتے جا رہی ہیں۔
ہم نے پوچھا، آپ کون ہیں؟
ارے ہے، کیا ہو گیا تمھیں؟ ارے میں تمھاری چچی ماں بول رہی ہوں۔
اوہ، چچی ماں! کب آئیں آپ پاکستان سے؟
بی بی! کیا تم باؤلی ہو گئی ہو؟ بھلا میں کیوں پاکستان سے آنے لگی؟ ساری عمر یہیں گزری، اب تو پاکستان جا کر کیا کرنا ہے۔
ہم سٹپٹا سے گئے: "دیکھیے ہمیں رفیعہ آپا سے بات کرنی ہے"، ہم نے وضاحت کر دی لیکن محترمہ نے آڑے ہاتھوں لے لیا۔
"یہ رفیعہ کب سے تمھاری آپا ہو گئی؟ تم اسے گود کھلایا کرتی تھیں، تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" لہجے میں بڑی تشویش تھی۔...... ہم نے ریسیور رکھ دیا اور سوچ میں پڑ گئے کہ آخر رفیعہ آپا کے گھر میں یہ بے تکلف سی چچی ماں کہاں سے آ گئیں؟ اور اتنی بزرگی کا شرف ہمیں کیسے مل گیا کہ بقول ان کے ہم نے رفیعہ آپا کو بہ حیثیت رفیعہ گود کھلایا ہے!!!
ہم نے پھر سے نمبر ملایا تو پتو کی آواز سنائی دی، ہم خوشی سے جھوم اٹھے کہ تیر نشانے پر لگ گیا ہے۔
نیا سال مبارک" یوں کہا جیسے ہم خود ہی نیا سال ہوں ــــ
ہاں، تجھے تمھیں بھی نیا سال مبارک ہو، خدا کرے نیا سال خوشیوں کی سوغات لے کر آئے..
ہاں، جانِ من! میں تمھارے لیے بہت سارے تحفے لے کر آیا ہوں...." نیا سال مردانہ آواز میں شاید ہم ہی سے مخاطب تھا۔ ہمارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ یہ رفیعہ آپا کی آواز مردانہ کیسے ہو گئی؟ اور پھر یہ تحفے؟ ریسیور سے ہم نے اپنا کان پوری توجہ سے لگا دیا، کیا سوچ رہی ہو یہی سوچ رہی ہو گی کہ میں نئے سال کے موقع پر تمھارے لیے کیا لا رہا ہوں، ارے مری جان، کیا نہیں لا رہا ہوں؟ یہ پوچھو! آخر تو ـ ار سے آیا ہوں ٹی آر یہ ــــ" اب ہم سمجھ گئے کہ یہ دوسری لائن ہے.....
اب ہم نے ڈائل کیا "بھابی" کا نمبر دراصل یہ بھابی ہمارے "ان" کے دوست کی "منکوحہ بیگم" ہیں ــ
فون ملتے ہی ہمارا تام ہمیں سنائی دیا۔
"فاطمہ تاج! نیا سال مبارک۔"

"ہاں یہ کیا؟ گھنٹی بجے بغیر ہمیں ریسیور مخاطب کرنے لگا" جی! آپ کو بھی مبارک" ہم نے خوشی دلی کا مظاہرہ کیا "[illegible] ہونا؟" "جی" ہاں! آپ مگر کہاں سے بول رہی ہیں؟"

"بھائی! بھول گئی مجھے، میں امریکہ سے بات کر رہی ہوں" تمہاری دوست . . . . . اور ہم پوری طاقت سے چلا پڑے "مبارک، مبارک، خدا کرے کہ نیا سال ہر روز آئے تاکہ آپ کا فون بھی روز آئے۔" خانم کی ہنسی سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی ایک اور آواز قریب سے سنائی دی۔ نیا سال مبارک! لیکن یہ آواز سمجھ میں نہ آسکی کہ مردانہ آواز تھی یا زنانہ۔ بہرحال ہم نے مبارک باد قبول کرکے ریسیور رکھ دیا۔ تفتیش کرنا مناسب بھی نہیں تھا ــــــ

ایک دفعہ ہمیں خود یاد نہیں کہ ہم نے کس کا نمبر ڈائل کیا لیکن ہماری لائن پر دو لائنیں مل گئیں اور اس طرح ملیں جیسے کسی ہاتھ میں دل و دماغ کی لکیریں ملتی ہیں۔ اتفاق سے یہ دونوں مرد حضرات تھے اور بے تکلف گفتگو کر رہے تھے بلکہ یوں سمجھیے کہ فون پر اچھی خاصی جھڑپ ہو رہی تھی۔

پہلی آواز: میں کہتا ہوں آپ لڑکی کو میکے کیوں نہیں جانے دیتے؟

دوسری آواز: وقت پر بھجواتے ہیں۔ گھر کی بہو بار بار میکے جائے تو بہو کا مطلب کیا ہوگا؟ آج کل نوکر بھی نہیں مل رہے ــــ سخت اور سپاٹ لہجہ تھا۔

پہلی آواز: آپ کو خیال ہونا چاہیے، نوشین کی ماں بیمار ہے، اُسے کچھ دن وہاں رہنے دیا جائے تو کیا حرج ہے؟ آخر انسانیت بھی تو کوئی چیز ہے؟ آپ بہو سے نوکرانی کا کام لیتے ہیں۔ شرم آنی چاہیے آپ کو اتنا جہیز لیا۔ جوڑے گھوڑے کی رقم بھی معقول وصول کی . . .

دوسری آواز: یہ میرا معاملہ ہے آپ فکر نہ کریں میں نمٹ لوں گا۔ آخر بہو خود بھی تو ماں ہے۔ اس کی معصوم بچی بیمار نانی کے پاس جاکر بیمار ہو جائے گی اور ان لوگوں نے ایسا کیا جہیز دیا ہے؟۔ جوڑے کی رقم تو ملازمین کے انعامات میں ہی تقسیم ہوگئی، آپ میرے معاملات میں دخل مت دیجیے۔ لہجے میں بڑی حقارت تھی۔

پہلی آواز: آخر میں تمہارا دوست ہوں کیوں دخل نہ دوں تم کو سوچنا ہی پڑے گا۔ بات آپ سے تم پر آگئی تو ہمارے بھی ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔ دو دوستوں میں اختلاف نظریات کا نہیں روایات کا تھا۔ ان کا غصیلہ لہجہ بتا رہا تھا کہ آمنا سامنا ہو جائے تو ہاتھا پائی یقینی ہے ــــــ

ایک بار یوں ہوا کہ کافی دیر سے ایک غیر ادبی لیکن انتہائی باادب شخصیت سے ہماری فون پر گفتگو جاری تھی۔ ہماری یہ دوست ہمیں اتنی عزیز ہیں کہ وہ اگر بیمار ہوں تو وہی عارضہ ہمیں بھی لاحق ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے قیس مار کھاتا تو لیلیٰ کے جسم پر نشان نمودار ہو جاتے۔ ہاں تو گفتگو کا دلچسپ سفر جاری تھا کہ نہ جانے کون "رقیب" ہمارے درمیان آگیا۔

اسے فون رکھو جی!

تم رکھو، ہم نے فون کیا تھا۔

میں رکھنے والا نہیں جی، تم رکھ دو . . . .

نہیں ہم پہلے سے بات کر رہے ہیں۔ ہم ضدی جو ٹھہرے۔

ادھر سے ہماری ہمدمِ دیرینہ نے بھی ہانک لگائی۔ رکھ دے کم بخت!

چپ کر دو جی! میں نہیں رکھتا، وہ شخص مسلسل اپنی ضد پہ اڑا تھا، ہم نے کہا ہم تمہارا حال بُرا کر دیں گے پولس کو کہہ کر جیل بھجوا دیں گے، ہم نے رعب جمانے کی کوشش کی۔ وہ کہنے لگا۔ میں جیل خانے سے بول رہا ہوں نا!

اور ہم نے فون رکھ دیا ____

ہم نے رمضان کا چاند دیکھا اور دوڑے ٹیلی فون کی طرف کہ اس بار مبارکباد دینے میں ہم پہل کریں گے۔

فون کے قریب پہنچنے تک گھنٹی بج اٹھی ہم نے ریسیور اٹھایا تو "چاند مبارک" کا فقرہ سنائی دیا بھی ہم نے اپنے مخصوص شوخ لہجے میں جواب دیا۔ تمہارے جیسا ہے۔ لچکیلی آواز تھی۔

ہم نے زبردستی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ شکریہ! مگر آپ کی آواز سمجھ میں نہیں آ رہی، کون ہیں آپ؟

میں تمہاری منہ بولی بہن سیما کی سوکن ہوں الفت ....

اونھ! ہم نے فون پٹک دیا۔ ہماری کوئی منہ بولی بہن نہیں اور نہ کسی کی سوکن کا نام الفت ہے ویسے اگر ہوتا بھی تو ہم سوکن کا نام الفت ہرگز تسلیم نہیں کریں گے۔ نہیں کریں گے۔

چاند کی مبارکباد زبردستی کا فریضہ ہے جسے ہم بڑے اہتمام سے پورا کرتے ہیں۔ ایک صاحبہ کو فون کیا (ہم نام نہیں بتائیں گے) "چاند مبارک" ____ کاہے کا چاند، یہاں تو ابرِ غم چھایا ہوا ہے۔" وہ بڑی ملول تھیں۔ تھوڑا برسنے کا موقع دے دو پھر مطلع صاف ہو جائے گا۔! ہم ان رنجیدہ صاحبہ کا دل بہلانے لگے۔ ....

"بھئی یہ تمہارے دولہا بھائی نے سارا مزہ کرکرا کر دیا ہم ان کے ساتھ ہی چاند دیکھنے چھت پہ چڑھے تھے۔ ہمیں دیکھ کر سڑک سے چند شریر لڑکوں نے ہانک لگائی:

تجھے چاند کے بہانے دیکھوں .. تجھ .... تجھ .... تجھ

تمہارے دولہا بھائی نے چاند دکھائے بغیر مجھے نیچے بھجوا دیا، حالانکہ میں نے سبز کپڑا اور چھری بھی اپنے ساتھ رکھی تھی کہ چاند دیکھتے ہی یہ بھی دیکھ لوں گی مگر .....

ہم کو ہنسی آگئی۔ خیر چلیے اب ہم نے چاند دیکھ لیا ہے آپ سبز کپڑا اور چھری دیکھ لیں کیا فرق پڑتا ہے۔ ہیلو ..... ہیلو اور یہ ہیلو کا شور ہمیں ہر طرف سے سنائی دینے لگا جیسے ٹریفک جام ہوتے ہی ہر طرف سے گاڑیوں کا ہارن سنائی دیتا ہے نہ جانے کتنے تاروں کے سلسلے ہمارے ٹیلی فون سے آملے تھے۔ ہنگامۂ حیات کے اس شور سے پریشان ہو کر ہمیں آخر فون رکھنا پڑا۔

ایک بار ہماری ایک شاعرہ دوست سے فون پر بات ہو رہی تھی بلکہ یوں کہیے کہ ہم دونوں پر شاعرہ ہوا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کو کلام سنا کر داد دے اور لے رہے تھے۔ اس لیے تو ہم شاعرہ کی واہ

فرزانہ سحاب مرزا
شارجہ (یو اے ای)

[illegible] جا رہے ہیں — جو زندہ ہیں وہ گاڑے جا رہے ہیں
چھپا دے کمبلوں کو رکھ دو اندر — کہ سردی آئی جاڑے جا رہے ہیں
بھری محفل میں دیکھو کس طرح سے — جو "تازہ" ہیں وہ تاڑے جا رہے ہیں
کہیں پگڑی کہیں ٹوپی پہن کے — شریفے اور پگاڑے جا رہے ہیں
کیا رخصت کی آئی نے [illegible] ہیرو — ابھی لونڈے لپاڑے جا رہے ہیں
بڑی [illegible] — جبھی ہم لوگ باڑے جا رہے ہیں
اکھاڑے تھے جہاں کچھ [illegible] شب — وہاں ہم دن دہاڑے جا رہے ہیں
پہلوان جو سیاست کے بڑے تھے — سیاست سے پچھاڑے جا رہے ہیں
کبھی جو تھی جو آنکھوں میں تم نے — وہی اب ڈھول پھاڑے جا رہے ہیں
وہ چہرے ہیں یقیناً خوبصورت — جو میک اپ سے بگاڑے جا رہے ہیں
سنگھار اس کا جو دیکھا لوگ بولے — ذرا دیکھو سنگھاڑے جا رہے ہیں

غزل میری سحاب ایسی نہیں تھی
بیاضیں لوگ پھاڑے جا رہے ہیں

●

ہر قدم پر اک نئے پیکر میں ڈھل جاتے ہیں لوگ — باپ کی دولت کے بل بوتے پہ پل جاتے ہیں لوگ
وہ نہ سدھرے تو ہے یہ اُن کی حماقت کا قصور — جوتیاں کھا کر تو سُنتے ہیں، سنبھل جاتے ہیں لوگ
عمر بھر کی چاہتیں یک دم ہی مٹی ہو گئیں — بات ماں بہنوں کی سنتے ہی بدل جاتے ہیں لوگ

شعر کے قالب میں اپنی داستانوں کو سحاب
کتنی آسانی سے محفل میں اُگل جاتے ہیں لوگ

●

کیا لطف کیا مزہ ہے خیالی پلاؤ میں — راکٹ میں اڑ رہی ہوں کہ بیٹھی ہوں ناؤ میں
مہنگائی کی بہار ہے اپنے عروج پر — اب بک رہی ہے دال بھی مرغی کے بھاؤ میں
چھوٹے سے ایک طنز پہ یوں بلبلا اُٹھے — جیسے چھڑک دیا ہو نمک تازہ گھاؤ میں
خالی ہے پیٹ تن پہ تو اُجلا لباس ہے — اک عمر ہو گئی ہے اسی رکھ رکھاؤ میں

دعویٰ ہے میرا غور سے تم بھی سنو سحاب
جیتے گی میری پارٹی اب کے چناؤ میں

وجاہت علی سندیلوی

(ڈرامہ)

الکشن اور مُرغا

کردار:- شرما جی ــــــ الکشن کے اُمیدوار
مرزا صاحب ــــــ شرما جی کے دوست
ایک عورت سلیمی، دو گُرو پہلوان :- الکشن کے ووٹر۔

(پہلا سین)

ایک آراستہ کمرہ جس میں مرزا صاحب لحاف اوڑھے بستر پر سو رہے ہیں۔ کمرے میں بہت ہلکی روشنی ہے۔

دروازے کی زنجیر کھڑکتی ہے۔ کئی دفعہ۔ پھر آواز سنائی دیتی ہے۔ "مرزا صاحب" "مرزا صاحب" "مرزا صاحب" جو تبدریج بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہے۔

مرزا صاحب خراٹوں کے درمیان گہری نیند سے بیدار ہوتے ہیں" اجی کون صاحب ہیں آپ؟ ــــ" "سو مرغ پا در سے بانگ پر بانگ دیے جا رہے ہیں"

ٹیبل لیمپ کا بٹن دبا کر کمرے میں تیز روشنی کر دیتے ہیں۔ سامنے گھڑی میں سوا پانچ بجا ہے۔

شرما جی:- اجی دروازہ بھی کھولو گے یا گھوڑے بیچ کر سوتے ہی پڑے رہوگے؟

مرزا صاحب:- اچھا آپ ہیں شرما جی۔ کیوں بھائی خیریت؟ یہ اس وقت آپ میری روح قبض کرنے کہاں آپہونچے!"

[مرزا صاحب اُٹھ کر دروازہ کھولتے ہیں اور شرما جی ایک کمبل لپیٹے کمرے میں داخل ہوتے ہیں]۔

شرما جی بستر کے پاس ایک صوفے پر بیٹھے ہوئے "بھئی آپ بھی سڑک پر گشت کرنے والے کانسٹبل کی طرح بات کرنے لگے۔۔ دونوں دودھ شریکے بھائی معلوم ہوتے ہیں"

مرزا صاحب (بستر پر بیٹھ کر) "سڑک پر گشت کرنے والے کانسٹبل سے میرا کیا تعلق؟"

شرما جی:- "تعلق یہ ہے کہ وہ بھی آپ ہی کی طرح اُوٹ پٹانگ باتیں کر رہا تھا خیر اس نے مجھے ووٹ دینے کا وعدہ تو کر لیا ہے"

مرزا صاحب:- اجی کیا بک رہے ہو۔ میں کچھ سمجھا نہیں"

شرما جی:- مطلب یہ کہ آج آنکھ ذرا جلدی کھل گئی۔ سوچا کہ آپ کو ساتھ لے کر کچھ ووٹروں کے گھر کا گشت بھی لگا لوں۔ اس وقت سب مُرغے تاپے ہی کے نیچے مل جائیں گے۔ ایک ہی ٹکڑے پر

وہ سمانے [illegible] کیا کہتے تھے یہ آدمی رات کو یہاں جا رہے ہو؟ پھر نے کہا صبح کی چہل قدمی کو جا رہا ہوں تو آپ کو معلوم ہے کہ اس مسخرے نے کیا کہا؟"

مرزا صاحب :- "کیا کہا اس نے؟"

شرما جی :- کہنے لگا کہ آدھی رات سے صبح کی چہل قدمی کرنا تھی تو چہل قدمی کر کے ہی کیوں نہیں سوئے تھے؟"

مرزا صاحب :- (قہقہہ لگاتے ہوئے) "بھی اُس نے غلط کیا کہا؟ دیکھیے نا کہ اِس وقت ساڑھے پانچ بج رہے ہیں اور آپ اس سے بہت پہلے نہیں معلوم کب گھر سے نکلے ہوں گے۔"

شرما جی :- "کہیے آپ بھی کہیے! لیکن جب میں نے سوتوں کو جگانا اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے تو مجھ پر کسی نصیحت یا فضیحت کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ ہر بڑے نیتا کو شروعات میں یہی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اچھا اب یہ چہ میگوئیاں کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھیے اور گشت کے لیے جلدی سے تیار ہو جائیے!"

مرزا صاحب :- "دیکھیے شرما جی میرے آپ کے تیس سال پُرانے تعلقات ہیں۔ آپ مجھے اپنا مخلص دوست اور بہی خواہ سمجھتے ہیں یا نہیں؟"

شرما جی :- "ارے بھائی کہتا نہ ہوتا تو اس وقت تمہارے پاس بیٹھا تمہاری یہ بکواس کیوں سُن رہا ہوتا۔ لیکن اب یہ لچھے دار باتیں چھوڑیے اور جھٹ پٹ چلنے کے لیے تیار ہو جائیے۔ اس وقت ہر دو گھر پر ہوگا اس کو بس وہیں دبوچ لیجیے۔"

مرزا صاحب :- "جس بھلے آدمی کے گھر پر اس وقت جا کر بانگ دیجیے [illegible] مجھ پر سے [illegible]"

شرما جی :- "ہم ہر کام کرنے سے پہلے [illegible] تلاش کر لیتے ہیں۔ ہمارے یہاں ٹالو ٹکسچر خوب چلتا ہے۔ ہم بیٹھے یہ رونا رو رہے ہیں کہ ابھی ٹھیک سے سویرا نہیں ہو پایا ہے اور یورپ اور امریکہ میں اسی وقت ہزاروں کارخانے چل رہے ہوں گے اور کروڑوں روپیوں کا مال کھٹا کھٹ بن رہا ہوگا!"

مرزا صاحب :- بھئی میں ایک دوسری بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ اب آپ اگر نگر پالکا کے الکشن و الکشن کے چکر میں نہ پڑیں تو زیادہ بہتر ہے"

شرما جی :- "واہ بھئی واہ یہ اچھی رہی۔ ہاتھ میں درد ہے تو ہاتھ کاٹ ڈالو۔ اجی الکشن کے چکر میں نہ پڑوں تو جنتا کی سیوا کیسے کروں؟"

مرزا صاحب :- جنتا کی سیوا کرنے کے بہت سے دوسرے طریقے ہو سکتے ہیں۔ کوئی اسکول کھولیے کوئی لائبریری شروع کیجیے۔ کسی اسپتال کے قائم کرانے کی کوشش کیجیے۔ کسی یتیم خانے میں چندہ دیجیے۔ رشوت خوری اور چور بازاری بند کروانے کی مہم شروع کروائیے ۔ ۔ ۔ ۔!"

شرما جی :- "جی ہاں جی ہاں! کوئی پاگل خانہ بنوائیں اور اُس میں آپ کے ساتھ بھرتی ہو جائیں۔ مرزا میں نے ساری خدائی کا ٹھیکا نہیں لے رکھا ہے۔ چراغ پہلے اپنے گھر میں جلایا جاتا ہے۔ مجھے پہلے اپنے وارڈ کی فکر ہے اور اپنے محلے کی۔ بہنوئی کو نگر پالیکا سے ٹھیکہ دلا کر فوراً اپنے وارڈ کی ساری سڑکیں ٹھیک کرا دوں گا۔ یہ کیا کچھ کم خدمت ہوگی جنتا کی۔ اور پھر سڑکوں پر یہ کیسے چھوٹے بلب لگے ہیں کہ چراغ سے بھی مدھم روشنی دیتے ہیں۔ میرے منجھلے لڑکے کی دکان میں سب سے

بڑی بجلی کے سامان کی دُکان ہے۔ ایسے جھلملاتے
بلب لگوادوں گا کہ رات دن کو مُنہ چڑانے لگے گی"۔
مرزا صاحب:۔ "شرما جی یہ آپ کا الکشن مینی فسٹو تو بہت
لمبا چوڑا ہے لیکن مصیبت تو یہ الکشن ہے
جس میں اپنے آپ کو گلی گلی اور گھر گھر نیلام
کرنا پڑتا ہے اور لوگ ووٹ کے بجائے چوٹ
دے جاتے ہیں۔ آپ غالباً دو الکشن ہار چکے ہیں۔
شرما جی:۔ (اُنگلی کے اشارے سے) دو نہیں تین۔
مرزا صاحب:۔ "اور غالباً آخری الکشن میں آپ کی ضمانت
بھی ضبط ہوگئی تھی"۔
شرما جی:۔ "اجی ضمانت ضبط کر لیے جانے کا قاعدہ میں نے
نہیں سرکار نے بنایا ہے اور بالکل غلط
اور مہمل بنایا ہے۔ ایک تو بیچارہ امیدوار
ہارے اور دوسرے سرکار کا جرمانہ بھی بھرے
میری مانی جائے تو ایسے امیدوار کی تسلی کے
لیے اس کو الٹی سرکاری امداد ملنا چاہیئے جیسے
کارخانوں یا ریلوے کے حادثوں میں مرنے
یا زخمی ہونے والوں کو ملا کرتی ہے"۔
مرزا صاحب:۔ "بھائی میں دوسری بات کہنا چاہتا ہوں یعنی
ضمانت ضبط ہو جانے کے بعد اب آپ کس
برتے پر پھر الکشن لڑنا چاہتے ہیں؟"
شرما جی:۔ "آپ ہمیشہ کوئی دوسری بات کہنا چاہتے
ہیں۔ ضمانت ضبط ہوگئی تو میری زبان اور
پیر تو نہیں ضبط ہوگئے۔ میرے دوست
اور ورکر تو نہیں ضبط ہوگئے۔ میں دیوالیہ
تو نہیں ہوگیا۔ ایک دفعہ ضمانت ضبط ہو جانے
پر میں میدان چھوڑ بیٹھتا تو جنتا مجھے کیا
کہے گی ضمانت بچانے کے لیے گھر میں دبک کر
بیٹھ رہا"۔

مرزا صاحب:۔ (ٹھنڈی سانس لے کر)
یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات!
دے اور دل اُن کو نہ دے مجھ کو زباں اور!
شرما جی:۔ "لیجئے اب آپ شعر و شاعری پر اُتر آئے۔
اجی یہ سب حماقتیں بعد میں کر لیجئے گا۔
اس وقت بس جلدی سے مُنہ دھو لیجئے اور
ساتھ چلئے میرے"۔

(دوسرا سین)

ایک گلی میں شرما جی ایک دروازے کی کنڈی
کھٹکھٹاتے ہیں۔ مرزا صاحب ساتھ ہی ہیں۔
شرما جی:۔ (ہانک لگاتے ہوئے) "بھولو لال جی! بھولو لال
جی! اجی شرما جی بھولو لال جی" (قریب ہی
کہیں مرغا بولتا ہے)
شرما جی:۔ شگون تو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میرے چناؤ
کے نشان والا مرغا بول رہا ہے"۔
مرزا صاحب:۔ "پہلے گھر والا مرغا تو دربے سے نکلے"۔
شرما جی:۔ (پھر چیختے ہیں) "بھولو لال جی" (اور کنڈی
بھی کھٹکھٹاتے ہیں)۔ "اجی بھولو لال جی
ذرا باہر تو تشریف لائیے"۔ (آہستہ سے
مرزا صاحب سے کہتے ہیں) "کسی کے آنے
کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔ مُراد آباد میں
مُردہ زندہ ہو گیا۔
ایک شریمتی جی:۔ [دروازے کے ایک پٹ کے پیچھے
سے] "یہ کون لوگ ہیں آپ جو چیخ چیخ کر
سارے محلے کی نیند خراب کر رہے ہیں"۔
شرما جی:۔ "بہن جی میں نگر پالیکا کے چناؤ میں آپ کے
وارڈ سے امیدوار ہوں۔ میرا انتخابی نشان
مُرغا ہے۔ بھولو لال جی ابھی آرام کر رہے ہیں کیا

تو ہم لوگ کسی وقت پھیر پھیرا لگا لیں گے۔"

شریمتی جی :- (بہت تلخ اور طنزیہ لہجے میں)

"بھولو مل کا آرام کر رہے ہوں تو ہم لوگ کسی وقت پھیر پھیرا لگا لیں گے! بہت خوب! میں کہتی ہوں کہ آخر آپ لوگوں کے بہنیں اور بیٹیاں ہیں کہ نہیں؟ آپ کو شرم نہیں آتی کسی شریف عورت پر اس طرح اتہام لگاتے؟ آخر بھولو مل کون ہوتے ہیں میرے گھر میں آرام کرنے والے۔ محلے والے سنیں گے تو کیا کہیں گے مجھے۔ (گلوگیر آواز میں) ایک ایک کی چار لگائیں گے اور میری عزت آبرو مٹی میں مل کر رہ جائے گی۔ بھولو مل ایسی ہی دوسری گلی میں رہتے ہیں۔ وہ آرام کر رہے ہوں گے تو اپنے گھر میں۔ . . ."

مرزا صاحب :- "بھئی شرما جی یہاں سے فوراً چل دیجئے ورنہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے"

شرما جی :- "اجی یہاں تو صاف پانی مر رہا ہے پاک دامنی سے چاک دامنی کی جھلک دکھائی دے رہی ہے چور کی داڑھی میں تنکا والا مضمون ہے لیکن خیر بھولو مل کے ذریعے سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

دونوں آگے بڑھتے ہیں۔ شرما جی ایک ہاتھ سے ایک راہ گیر کو روکتے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے ایک گھر کی کنڈی کھٹکھٹاتے ہیں۔

(تیسرا سین)

شرما جی اور مرزا صاحب ایک گلی میں جا رہے ہیں دوسری طرف سے ایک بڑی بی بڑی تیزی سے آتی دکھائی دیتی ہیں۔

شرما جی :- "ارے سلیمن۔ لو اسلام۔ سویرے سویرے اس تیزی سے کہاں چل پڑی؟"

سلیمن :- "جیتے رہو بھیا! کل سے میرا گھورو غائب ہے۔ اسی کو گھر گھر تلاش کر رہی ہوں۔"

شرما جی :- "تو آپ اور گھورو میرے چناؤ چھنہ مرغے ہی پر مہر لگایئے گا۔"

سلیمن :- "بس دعا کرو شرما جی کہ گھورو مل جائے۔ ہم دونوں آپ ہی کے نشان پر مہر لگائیں گے۔ لیکن کیا اب مرغوں کو بھی ووٹ دینے کا ادھیکار مل گیا ہے؟"

مرزا صاحب :- "کیا مطلب؟"

سلیمن :- "گھورو تو میرا مرغا ہے۔"

شرما جی :- "پرماتما کرے آپ کا گھورو ضرور مل جائے۔ دیکھئے اس پرچے پر جیسا مرغا بنا ہے اسی پر مہر لگایئے گا۔" (جیب سے پرچہ نکال کر دکھاتے ہیں۔)

سلیمن :- "ذرا دیکھوں تو بھیا" (شرما جی کے ہاتھ سے پرچہ لے لیتی ہے اور آنکھیں پھاڑ کر بڑے غور سے دیکھتی ہے۔ پھر اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتی ہے) "ہائے یہ تو بالکل میرے گھوروہی کی تصویر ہے۔ وہی چتوں، وہی کیس، وہی اکڑی ہوئی گردن، وہی ڈیل ڈول وہی آگے کو جھکی ہوئی چونچ، وہی نیتاؤں جیسی اکڑفوں چال ڈھال۔ بانگ دیتا تو سارے محلے کی مرغیاں کڑکڑانے لگتیں اور مرغے ڈھابیوں میں منہ چھپاتے پھرتے۔"

مرزا صاحب :- "شرما جی دیکھو آج تمہیں ایک سو فی صدی پکا ووٹ ملا ہے۔"

شرما جی :۔ (ہنستے ہوئے) بھئی میرے لیے دیر ہو سکتی ہے اندھیر نہیں! تو ہاں لوا کر یا کر کے آپ اپنے گھورو ہی کی تصویر پر اپنی مہر لگائیے گا۔ آپ کے محلے بھر کی مہریں اسی پر لگی جا ہیں۔ اپنے محلے کے جانور کو چھوڑ کر کسی دوسرے جانور کو آنکھ اٹھاکر نہیں دیکھنا چاہیئے"

سلیمن :۔ "مگر بھیا برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟ میرے گھورو کی یہ تصویر تمہیں ملی کیسے؟ میں کل شام سے ہلکان ہو رہی ہوں۔ ایک نوالہ منہ میں نہیں ڈالا۔ اپنے گھورو کے لیے انگاروں پر لوٹ رہی ہوں۔ آدھی رات سے ایک ایک مرغے کی بانگ پر کان لگائے بیٹھی ہوں اور تم میرے گھورو کی تصویر لیے اپنا مُوا ادوٹ مانگتے پھر رہے ہو۔ کسی غریب کا صبر ایسے نہیں سمیٹا جاتا۔ بتاؤ میرا گھورو، کہاں ہے"؟

شرما جی :۔ (گھگھیاتے ہوئے) "ارے لوا جی یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ میں آپ کے گھورو کو کیا جانوں؟"

سلیمن :۔ اب چھوٹے منہ سے بڑی بات نہ نکلوایئے جب گھورو کی تصویر آپ کے پاس ہے تو پھر گھورو کس کے پاس ہو سکتا ہے؟ ایک تو آپ نے میری اجازت کے بغیر اس کی تصویر کھنچوائی۔ کہیں اس کو کسی کی بری نظر لگ گئی تو میں تو کہیں کی نہیں رہوں گی۔ اور دوسرے آپ یہ سینہ زوری کر رہے ہیں (شرما جی کی آواز کی نقل کرتے ہوئے) میں آپ کے گھورو کو کیا جانوں؟"

مرزا صاحب :۔ "لو ذرا ہوش کے ناخن لو! یہ تصویر تو شرما جی کے پاس پندرہ دن سے ہے اور تمہارا گھورو کھویا ہے کل شام کو"

سلیمن :۔ تو یہ کہیئے کہ آپ کی اور شرما جی کی ملی بھگت ہے اور آپ لوگ پندرہ روز سے گھورو کی تصویر کھنچائے اسی کی تاک میں گھوم رہے تھے اور کل شام کو جب میں ذرا دیر کے لیے بازار چلی گئی تو آپ لوگوں نے اس پر ہاتھ مار دیا۔ دیکھئے میں ابھی سارے محلے کو جمع کرتی ہوں اور سب کے سامنے میرا اور آپ کا فیصلہ ہو جائے گا"

چیخ چیخ کر پکارتی ہے "سیتا رام بابا — جمن کاکا۔ رحمو ماما۔ کلو۔ جگو۔ نتھالال بھیا!"

ایک دم سے ایک مرغے کی بانگ سنائی دیتی ہے اور سلیمن یہ کہتی ہوئی بھاگتی ہیں۔ "ارے میرا شہزادہ گھورو تو میرے گھر ہی سے مجھے پکار رہا ہے۔"

مرزا صاحب :۔ "بھئی ابھی ابھی تو حجامت ہی بنتے بنتے رہ گئی تھی۔ اس سلیمن کی بچی نے تو محلے میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا تھا۔"

شرما جی :۔ گھورو ہی نے پھانسی پر لٹکایا تھا اور گھورو ہی نے پھانسی سے اتارا۔ دیکھیے کام آیا نہ میرا مرغا۔ بس اب اس طرف کے دوٹ تو پکے سمجھیے"

مرزا صاحب :۔ "میرا دل تو ابھی تک دھڑک رہا ہے میری مانیے تو بس اب لوٹ چلیے"

شرما جی :۔ "جی ہاں آپ کی مانیے تو سامنے والے کنویں میں پھاند پڑیئے۔ ابھی اتنے اچھے اچھے

تو شگون لیا کرتے ہیں۔ بس دو تین گھر اور جھانک
لیتے ہیں اور پھر چلتے ہیں۔"

(چوتھا سین)

شرما جی اور مرزا صاحب ایک گلی میں
جاتے ہیں۔ شرما جی ایک مکان کی کنڈی کھڑکھڑاتے
ہیں پھر چیختے ہیں "اجی دمڑو پہلوان جی! دمڑو
پہلوان جی! بھائی دمڑو پہلوان جی!"
(گھر کے اندر سے بہت سے کبوتر پھڑا پھڑا کر اڑتے ہیں)
دمڑو پہلوان دروازے کا پٹ زور سے
بند کرکے لاٹھی ٹیکتے، کھنکھارتے ہوئے بڑے
غصے سے نکلتے ہیں۔
دمڑو:- "کیوں جی کیوں یہ چل پوں مچا رکھی ہے؟
جان نہ پہچان خالہ اماں سلام۔ آخر کون
ہو تم لوگ؟ کہاں سے بھاگ کر آئے ہو؟
کیا دشمنی کی تھی میں نے جو اتنے سویرے
آکر اپنے غل غپاڑے سے میرا سارا مکان
ہلا کر رکھ دیا اور میرا بنا بنایا کھیل بگاڑ کر رہ
گیا۔"
شرما جی:- (گڑگڑاتے ہوئے) "اجی پہلوان صاحب
ہم نگر پالیکا کے ہونے والے چناؤ کے لیے
آپ کے قیمتی ووٹ مانگنے آئے ہیں۔"
دمڑو:- "خوب سامان کھول کر سن لیجئے۔ میں آپ
کو اپنا ووٹ ہرگز ہرگز نہیں دے سکتا۔ بڑی
مشکل سے دو نئے کبوتروں کو دانہ ڈال
کر منڈیر سے نیچے صحن میں اتارا تھا لیکن
آپ نے کنڈی کھٹکھٹا کر اور گلا پھاڑ کر
وہ ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ وہ کیا خود میرے گھر
کے کبوتر پھڑا مار کر اڑ گئے۔ سچ پوچھئے
تو بس خون اتر رہا ہے آنکھوں میں آپ کو دیکھ کر
اپنی خیریت اسی میں سمجھئے کہ آپ میرے سامنے سے
دور دفعان ہو جائیے۔ آپ کو اس گلی کا ایک
ووٹ بھی مل جائے تو میری ان مونچھوں کو چھچھوندر
کی دم سمجھئے گا۔"
(اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دمڑو
گھر کے اندر جا کر بڑی زور سے دروازے کا پٹ
بند کر دیتا ہے)
شرما جی:- (چیخ کر پکارتے ہوئے) چھچھوندر کی دم والے
پہلوان بچے کو دھو لیجئے گا۔ میرا چناؤ
چنہ بکرا ہے بکرا۔"
دروازہ کھلتا ہے۔ دمڑو نکل کر گرجدار آواز میں
چیختا ہے "کھڑے تو رہنا بکرے کی اولاد! ابھی اس
بدتمیزی کا مزا چکھاتا ہوں۔"
شرما جی اور مرزا صاحب بے تحاشا بھاگتے ہیں۔
(پانچواں سین) (مرزا صاحب کے سونے کا کمرہ)
مرزا صاحب:- (بُری طرح ہانپتے ہوئے) کمال ہی
کر دیا شرما جی۔ یہ کیا حرکت تھی آپ کی؟ سر
پر پاؤں رکھ کر بھاگتے نہیں تو اس وقت
اسپتال میں ہوتے یا قبرستان میں!"
شرما جی:- (قہقہہ لگاتے ہوئے) ایک ووٹ ملا تو
وہ بھی عقل سے ٹرپ۔ ارے مرزا صاحب اب اس
پوری گلی سے ایک ووٹ بھی بکرے کو نہیں مل سکتا۔
بکرے نے تو دمڑو پہلوان کے سب کبوتر بھگا دیئے
تھے۔ اب ووٹ ملیں گے خاکسار مرغے کو۔ سے
مرغ کو جتا دے
دم کو اٹھا دے
بول میرے مرغے ککڑوں کوں!

٥

علیم خان فلکی (جدہ)

قصّہ بیوی کا

بیویوں سے انتقام لینے کے واقعات تو بے شمار سُنے تھے لیکن جو واقعہ "اردو نیوز" کے ذریعے ہم تک پہنچا وہ نہ صرف الٹ کھا بلکہ تمام شوہروں کے لیے سبق آموز اور بیویوں کے لیے عبرتناک ہے وہ یہ کہ امریکہ میں ایک شخص نے دواخانے پر مقدمہ دائر کردیا صرف اس لیے کہ ڈاکٹروں نے اُس کی بیوی کا جو کہ کئی ماہ سے کوما (COMA) میں تھی لائف سپورٹ سسٹم منقطع کردیا تھا شوہر چاہتا تھا کہ اس کی بیوی سکون کی موت مرے اس واقعہ نے ہر سمجھدار شوہر کی آنکھیں کھول دیں نئی حکمتِ عملی کے دروازے کھول دیئے واقعی بیویوں کے لیے اس سے زیادہ دردناک سزا اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ سکون سے موت آنے تک زندہ رہیں شوہر صبر و تحمل کے ہتھیار سے ہمیشہ ان کو اذیت میں مبتلا رکھے جہاں بے چاری نے بات بے بات پر چلاّنا شروع کیا شوہر نے "خاموشی" کی گولی داغ دی اُدھر محترمہ نے طعنے تشنے شکایتوں کے دہانے کھولے شوہر نے میدان خالی کردیا اور باہر کی راہ لے لی جہاں عورت نے اپنا موثر ترین وار آنسو گیس استعمال کی شوہر قدموں میں گرنے کے بجائے اپنے قدموں میں بے ہوش ہوکر گر پڑے بے چاری اڑنے کیلیے ترسے بچے رحم کھاکر باپ سے اپیل کریں کہ ابو تھوڑا سا لڑ لیجیے لیکن ابو اسے مسلسل معاف کردینے اور معافی چاہ لینے پر مُصر ہوں۔ واقعی یہ انتقام بہت تکلیف دہ ہے اگر دو چار واقعات ایسے مزید ہوجائیں تو اندیشہ ہے کہ عورتیں شوہروں کے خلاف مقدمے دائر نہ کردیں۔ ہمارے مشرقی معاشرے میں تو عورت مظلومیت پر پورا حق رکھتی ہے بلکہ مظلوم کہلانے کے تمام کاپی رائٹ اس کے پاس محفوظ ہیں بالکل شوہر جب تک "تنگ آمد بجنگ آمد" نہ ہو عاجز آکر گالی گلوج اور مارپیٹ پر نہ اتر آئے بیوی مظلوم نہیں لگتی بلکہ شادی شدہ بھی نہیں لگتی اس کے ساتھ صبر و تحمل کا بے رحمانہ رویّہ اس کے ارمانوں پر پانی پھیر ڈالتا ہے اس لیے وہ اپنے بنیادی حق کو حاصل کرنے کے لیے قانونی نہیں سماجی جنگ لڑتی ہے چاہے اس کے لیے اسے میکے جانا پڑے یا اطراف کی عورتوں کو جمع کرکے شوہر کو باجماعت ملامت کرنا پڑے جیسے ایک الکشن میں ایک امیدوار کو صرف تین ووٹ ملے بیوی نے واویلا مچایا لوگ جمع ہوگئے پوچھا کوئی مرگیا کوئی حادثہ ہوگیا؟ بیوی نے کہا نہیں، پوچھا کیا دیوالیہ ہوگیا ہے کہا نہیں، آخر جب لوگوں نے پوچھا آخر یہ شکایت کیوں کی کچھ تو بتاؤ، بیوی نے کہا آپ لوگ میرے شوہر سے پوچھئے تیسرا ووٹ کس کا تھا؟ شاید یہی وجہ ہے کہ مشرقی معاشرے میں عورتیں کامیاب بیاہتا ثابت ہوتی ہیں ان کا راز ایک سیاسی شوہر نے یہ بتایا کہ شادی کے بعد سے آج تک بیوی شوہر کو قائد حزب اختلاف تصور کرکے بلاناغہ بحث

کی ریاضت کرتی رہی ہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ محترمہ نے بل پیش کیا شوہر نے بغیر کسی شرط یا اختلاف کے تائید کر دی تو محترمہ نے فوری بل واپس لے لیا۔ اس خوف سے کہ اپوزیشن کو یہ زعم نہ ہو جائے کہ اگر وہ تائید نہ کرتے تو بل پاس ہی نہ ہوتا۔ ہمارے ہاں بعض شوہر اب بھی ایسے پائے جاتے ہیں جو بیوی کو مرتے دم تک ہی نہیں بلکہ سفر آخرت بھی سکون سے طے کروانے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ جیسے ایک صاحب کی بیوی کی میت کو جب قبرستان لے جایا جا رہا تھا اتفاقاً راستے میں جنازہ کسی کھمبے سے ٹکرا گیا اور بیوی دوبارہ اُٹھ بیٹھی کئی برس بعد جب حقیقتاً بیوی کا انتقال ہوا تو میت کے آگے آگے شوہر صاحب یہ پکارتے جاتے تھے کہ "کھمبا بچا کے چلو کھمبا بچا کے چلو"۔ تدفین کے بعد بھی جب تک کوئی خواب یا کسی اور ذریعے سے یہ اشارہ نہ مل جائے کہ محترمہ سکون سے ابدی نیند میں پہنچ چکی ہیں شوہر کو یقین نہیں آتا کہ انتقام پورا ہو گیا ہے جیسے ایک صاحب کی بیوی کی تدفین کے بعد طوفانی بارش شروع ہو گئی بہت دیر بعد ایک زوردار کڑاکے کے ساتھ بجلی چمکی اُن صاحب نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا اب پہنچی۔ ◻◻

یالو آرکے
ایلاپورستی

اولمپک اور ہم

دس پندرہ سالوں سے اولمپک کھیلوں میں حصہ لینے کے لیے ہمارے کھلاڑیوں کا دستہ بڑے جوش وخروش اور طمطراق سے پہنچتا رہا ہے لیکن اولمپک کھیلوں میں کھلاڑیوں کی کارکردگی سے باور ہوتا ہے کہ ہمارے کھلاڑی بجائے کھیلوں میں شریک ہونے کے کھیلوں کی افتتاحی تقریب کی رنگا رنگ پریڈ میں صرف چہل قدمی کرنے کے لیے ہی شامل اولمپک ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ گزشتہ کئی سالوں سے کسی خوش قسمت میڈل کو ہمارے کسی کھلاڑی کے ہاتھوں کا لمس دستیاب نہیں ہو پایا ہے۔ خصوصاً ہماری ہاکی ٹیم تو زبردست ہار کا شکار رہی ہے۔ ماضی بعید میں ہاکی کا کھیل ہی وہ کھیل تھا جس کے میڈل اور کپ پر مقابلے سے قبل ہی ہمارے دیش کا نام کندہ کر دیا جاتا تھا۔ آج اسی کھیل کی دھار کند ہو چکی ہے اور بات یہاں تک پہنچی ہے کہ ہماری قومی ہاکی ٹیم کے کھلاڑیوں کے ہاتھوں میں ہاکی اسٹک لولے ہاتھوں میں سانپ کے مصداق نظر آتی ہے۔

یوں بھی موجودہ ماحول میں اولمپک کھیلوں کی فضا ہمارے کسی کھلاڑی یا اتھلیٹس کو راس آنے والی ہے ہی نہیں کیوں کہ اولمپک کھیلوں میں تمام مقابلے بڑے کانٹے کے ہوا کرتے ہیں۔ ہاں اگر یہ مقابلے کانٹے کے نہ ہو کر کانٹے بچھانے کے ہو گئے ہوتے تو ہم یقیناً سرخرو ہوئے ہوتے۔ اولمپک کھیلوں میں ہماری ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ گزشتہ سالوں سے ہم نے خود کھیل کود کے بجائے فسادات کے خونی کھیل میں مصروف رکھا ہے۔ اگر فسادات کے خونی کھیل کے انعقاد کی گنجائش اولمپک میں نکل آتے تو میڈلس کی ایک بڑی کھیپ . . . ہمارے ملک میں آ جاتی۔ اسی طرح اولمپکس کھیلوں میں کبوتر، بٹیر اور پتنگ بازی، تیتر، مرغ کی لڑائیاں قوالیوں، مشاعروں اور غزل ناٹوں کے مقابلے ہونے لگیں تو ہم دعوے کے ساتھ کہتے ہیں ہمارے ساتھ ساتھ ہمارا پڑوسی ملک بھی میڈلس کی دوڑ میں اگلی صفوں میں نظر آئے گا۔ لیکن کیا کیجیے کہ اولمپک کھیلوں کی باگ ڈور شروع ہی سے ایسے عناصر کے ہاتھوں میں رہی ہے جو اپنی پسند کے مقابلے تو منعقد کر والیتے ہیں اور دوسروں کی پسند ناپسند کا خیال نہیں رکھتے۔

ویسے اولمپک کھیلوں کی نوعیت میں ذرا سی تبدیلی کر دی جائے تو میڈلس کا حصول ہمارے لیے

بھی بالکل نامہ کا کھیل ہو جائے مثلاً تیرنے کی بجائے ڈوبنے کے مقابلے منعقد ہونے لگیں۔ اسی طرح جمناسٹک کے نام پہ ناچنے کے لیے سنگل بار ڈبل بار اور متوازی بار کی جگہ نازنینوں کے اشاروں یا بیوی کی انگلیوں کا انتظام ہو جائے۔ اس کے علاوہ تیز دوڑ گھٹنوں کے بل چلنے میں ہرڈلس دوڑ، اڑجانے میں، شمشیرزنی نشتر زنی میں اور کشتی ہمانی، کشتی ڈبونے میں بدل جائے۔ مزید برآں اولمپک کھیلوں میں ہم مزید میڈلس جیت سکتے ہیں بشرطیکہ ہماری فطرت اور مزاج کے مطابق کھیلوں کے مقابلے منعقد ہونے لگیں۔ اس ضمن میں... گلی ڈنڈا، بلی بلی کتاب ڈبلی اور کھوکھو جیسے کھیلوں میں بھی ہم سردست اپنا لوہا منوا سکتے ہیں۔ یہ خیال پہلے ہمارا اور بہت بعد میں دانش وروں کا ہے کہ اگر کبڈی کھیل کے مقابلے اولمپک کھیلوں کا حصہ بن جائیں تو اس کھیل کی چمپین شپ کے بلا شرکت غیرے ازل ابد تا آخر ہم ہی حق دار رہیں گے۔ کیونکہ اسپورٹس کی دنیا میں آج... کبڈی ہی وہ واحد کھیل ہے جس میں کبڈی کبڈی کہہ کر منہ چلایا جاتا ہے اور سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ مدمقابل کی ٹانگ بھی کھینچی جاتی ہے۔ ویسے بھی منہ بند کرنے اور ٹانگ کھینچنے میں ہمارا کوئی ثانی نہیں ہو سکتا۔ نہیں ہے اس لیے اس کھیل کا چمپین ہمارے علاوہ کوئی ہو کھیلوں کے تعلق سے جو ذرا سی بات ہمارے حق میں جاتی ہے یہ کوئنگ اور ویٹ لفٹنگ کے مقابلوں میں ہماری خواتین نے دوسروں کے جھنڈے اکھاڑ کر اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑے ہیں۔ کہاں ہیں؟ صنف نازک کو پھولوں کی چھڑی، بادِ صرصر اور چھوئی موئی کہنے والے؟ "نہ خنجر اٹھے گا نہ تلوار ان سے" کی گردان کرنے والے؟ لاؤ ان ادیبوں اور شاعروں کو اور انھیں دکھا دو کہ... بھارت کی نازنیں اور مہ جبینیں بھی اب دنیا کی دیگر خواتین کے ساتھ رفتار سے رفتار اور قدم سے قدم ملا کر چلنے اور دوڑنے لگی ہیں۔ کل تک ہماری انہی مستورات سے آنچل بھی ٹھیک سے سنبھالے نہیں جاتے تھے۔ کمر بند باندھنے کے لیے کمر کھوجنی پڑتی تھی... یہاں تک کہ خواب میں تصویر کا بوسہ لینے پر ان کے گال نیلے پڑ جایا کرتے تھے۔

لیکن آج یہی نازک اندام خواتین مردانہ وار میدان اولمپک میں ہنستے کھیلتے دو دو کوئنٹل وزن اٹھائے پھر رہی ہیں۔ ویسے خواتین کی اس مردانہ کارکردگی کے پیش نظر ہم مرد لوگ بھی کچھ کم مبارک باد کے مستحق نہیں ہیں کیونکہ یہ خواتین تو صرف مقابلوں میں کبھی کبھار ہی وزن اٹھاتی ہیں۔ جبکہ ہم مرد حضرات تو دن سے رات، ان وزن اٹھانے والیوں کے ناز اٹھاتے ہیں انہیں اپنے سر پہ بٹھاتے ہیں۔

نعیم جاوید (جدہ)

دانشِ گری

کہتے ہیں کہ ہر پیشے سے وابستہ افرادفن کی ہمالیائی چوٹی سر کرنے بلکہ اس چوٹی میں جھول ٹانکنے کے بعد بھی نہ اونچا بولتے ہیں اور نہ "انا الحق" کا نعرہ لگاتے ہیں۔ بلکہ کمالِ سادگی سے کہہ گزرتے ہیں کہ ہم تو فکر و فن کے ساحل سے سیپیاں چن رہے تھے ــــ لیکن آج حیرت ہوتی ہے قائدینِ کرام و دانشورانِ قوم کی بے قابو طبیعتوں پر، جو پنجوں کے بل ٹھہر کر بانگیں دینا شروع کر دیتے ہیں ہر شہر میں اس طرح کی دانش گزیدہ ہستیاں پائی جاتی ہیں۔ جو خالی سروں میں قومی فلاح کا سودا لیے سنجیدہ موضوعات سے چھیڑ خانی کرتے رہتے ہیں۔

کہنے والوں نے اس کو "دانش گری" بھی کہا ہے یعنی "داداگری" اور "چھچھ گری" کے وزن پر ایک دانش نما حماقت فروش افراد کی اجتماعی چیخیں پورے ماحول کو بوجھل کر دیتی ہیں جب کبھی قوم کے کسی حساس پہلو پر کسی جانباز دشمن کی کاری ضرب لگتی ہے ــــ ایسے میں ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لیے دانشور چیختے چلاتے اپنے اپنے خول سے نکلتے ہیں اور پہلا منظر اخبارات کی سرخیوں میں ابھرتا ہے۔ دوسرا منظر میٹنگ اور قراردادوں کے روپ میں برپا ہوتا ہے۔ تیسرا اور آخری منظر پھر کسی ہنگامی صورت حال تک "مکمل سکوت" ہوتا ہے۔ تا آنکہ ہمارے گھروں اور چوپالوں تک ڈاکو گھوڑے دوڑاتے آئیں دھمکیں بلکہ ہماری خوابیدہ زندگی کو دہلا نہ دیں۔ جب یہ جادہ جا بجا پھر چوپال سجتی ہے میٹنگیں برپا ہوتی ہیں پھر تمام انجمنِ ستائشِ باہمی کے رضاکار (بلکہ اداکار) اپنے خالی سروں کو جوڑ کر سوچ بچار کرتے ہیں۔

ہماری چشم گنہگار نے اس طرح کے دانش وروں کو مسئلے کی تشخیص سے پہلے روتے دیکھا ہے، بلکہ اندیشہ ہائے دور دراز سے گھبرا کر ہونے والے صدمات کا تخمینہ کر کے تعزیت کرتے دیکھا ہے اور پرسہ دیتے دیکھا ہے بلکہ۔ اس طرح کے دانشورانہ اعمال نے تو غم و خوشی کے پیمانے بدل ڈالے ہیں یہ ایک وبائی مرض ہے جس سے آن کی آن میں فضا میں تعفن پھیل جاتا ہے جس کے ساتھ ہی یہ RESCUE عملہ سرگرم ہو جاتا ہے۔ اسی قبیل کے ایک گمنام دانشور نے بے وقت [illegible] نے پیغام کو [illegible] وہ دانشمندی

چھوڑ دیں گے بلکہ دلیل یہ دی تھی کہ امن ہی دراصل دانشوری کا دشمنِ ازلی ہے۔

اب ایک فکری چوپال کی تصویر دکھا کر ہم اس عذابِ دانش سے رہا ہونا چاہیں گے۔ ایک متفکر نے کہا کہ آج بھارت ماتا کا انگ انگ اعصابی درد سے کراہ رہا ہے۔ ایسے میں فسادات کوئی نئی بات نہیں ہے اور اس میٹنگ سے کیا فائدہ جس میں ROUTINE پر بحث کی جائے۔ اس لیے اس سوچ منڈلی کو غیر اہم بات پر مت جمع کیا جائے۔ دوسرے دانشوروں نے کہا کہ اب جب کہ میٹنگ میں فوٹو گرافر بھی نہیں آیا ہے اور اخبارات میں فوٹو چھپے بغیر کوئی ہمارے اخلاص پر بھروسہ نہیں کر سکتا اس لیے میٹنگ ملتوی کر دیا جائے۔ کیوں کہ میڈیا آج کل عین الیقین کے ذریعے سے ایمانیات میں داخل ہو چکا ہے۔

ایک شریکِ محفل نے مُخل ہوتے کہا کہ فسادات کے مسئلہ پر نہ علامہ اقبال نے نظم لکھی ہے نہ غالب نے غزل لکھی۔ ان کی فہرستِ مضامین میں اس موضوع کا دور دور تک پتہ نہیں چلتا۔ میں ماہرِ فہرستِ اقبالیات و غالبیات کی حیثیت سے اس مسئلہ کو مسئلہ ہی نہیں سمجھتا۔ اس لیے احتجاجاً میں منہ پر سیاہ پٹی باندھے پورے اجلاس تک "مون ورت" رکھوں گا۔

صدرِ اجلاس نے کرسی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا کہ اس پُرفتن دور میں ان دانشورانِ حق کا دم غنیمت ہے جنھوں نے اس اجلاس کو THINK TANK بنا کر بھرا بھرا رکھا ہے۔ اب ہمارا کام ہے کہ ہم اس منصبِ فکر و فہم کو قابو میں رکھیں۔ یہی فکری اجارہ داری کہلاتی ہے۔ دوسرے مفکر ہمارے پاس ذِمّی مفکر کی حیثیت میں رہ سکتے ہیں۔

ایک دانشور جو موسیقی سے علاج پر یقین رکھتے تھے ایسی ایسی ناقابلِ تحریر تجویزیں پیش کرنے لگے جنھیں قلمبند کرنے پر فحش نگاری کا الزام لگ سکتا ہے۔ جس کی قطع و برید کے بعد جو چیز بچ جائے گی غالباً وہ لغو نگاری کہلائے گی۔ انھوں نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ راگ راگنیوں کا گیان عام کر دیا جائے۔ اُس تان سین دانشور نے کہا کہ مخصوص راگنیوں کی آکساہٹ سے آتنک وادی شانت ہو سکتے ہیں۔ ان کے من کو گویئے شانتی دے سکتے ہیں۔ اس THINK TANK کے مرکزی پرنالے کی حیثیت رکھنے والے ایک "دانش گر" بول اُٹھے کہ پینٹنگز اور مصوری کی طاقت کا لوہا دنیا مان چکی ہے۔ رنگوں کا جادو تو (خالی) سروں پر بھی چڑھ کر بولتا ہے تجریدی فنکاروں نے تو پورے کلاسیکی ذوق کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ ان کا تاثر بھی کچھ کم نہیں ہے۔ جبکہ ہمارے تجریدی آرٹ کو ان کے کٹر نقیبوں نے بہت بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ المناک المیہ ترسیل کی موت فطرت کا سانحہ اور فکری دیوالیہ پن اور نہ معلوم کتنی مشترک گالیاں دی ہیں جن کو ہم اور آزاد شاعری کے علم بردار سہارتے آ رہے ہیں۔ ایک شاعر نے کہا کہ فسادات جیسے اہم موضوع پر پابند شاعری سے نقصان پہنچ سکتا ہے پابند بحروں کے زیر و بم سے فسادیوں کو مزید تحریک ہو سکتی ہے۔ یاد رہے وہ ان سوہم جنھیں فرو کرانا ... آزادی کے ساتھ آزاد شاعری میں آ سکتی ہیں۔ ان کی وسعت ... کے ... [illegible]

[illegible] ... THINK TANK ... [illegible] ... کی طرح ذہنی ... [illegible]

چھیڑ غالب سے

کس نے کہا ہے یہ کہ خدا سے دعا نہ مانگ
لیکن بھلائی یار کی، اپنا بُرا نہ مانگ

گر جیب کاٹنی ہو تو اپنا بلیڈ رکھ
نائی سے اُس کے کام کا تُو استرا نہ مانگ

جس نے دیا ہے زہر تجھے کھیل کھیل میں
ایسے ستم ظریف سے تُو پھر دوا نہ مانگ

واجب ہے اختلاف، محبت کے واسطے
مل جل کے ساتھ سب رہیں ایسی دعا نہ مانگ

نیتا ہے دل کا چاہے تُو دل سے نکال دے
لیکن ہمارے کھیلوں کی فرد سزا نہ مانگ

محشر کی بھیڑ بھاڑ میں بچوں کی ریل پیل
"مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ"

سچی نماز وہ ہے جو احساں سے پاک ہو
مسجد کے مولوی سے کبھی بوریا نہ مانگ

دل میں خیال شادی نہ آئے دھیان رکھ
اے رازؔ جان بوجھ کر گھر کی بلا نہ مانگ

ہم کیا لکھیں مزاح

ڈاکٹر پرویز احمد
(ریاض)

راتب کی اس قطار میں ہم کیا لکھیں مزاح
جیون کی تیز دھار میں ہم کیا لکھیں مزاح

لاکھوں کما رہے ہیں سخن بیچ کر تو لوگ
بس ایک ہی ہزار میں ہم کیا لکھیں مزاح

ہے شاعری کا لطف میاں اپنے دیس میں
اس غیر کے دیار میں ہم کیا لکھیں مزاح

جس سے ملایا ہاتھ وہی وار کر گیا
زخموں کے کاروبار میں ہم کیا لکھیں مزاح

منزل جو سامنے ہو تو گائیں خوشی کے گیت
اس گرد اور غبار میں ہم کیا لکھیں مزاح

بس مصلحت کے گیت لکھو عافیت نصیب
اس عہدِ بے وقار میں ہم کیا لکھیں مزاح

غزل

نشتر کمت حلیم آبادی

مچھر چھپا ہے کھاٹ میں کھٹمل ہوا میں ہے
دونوں کے ہیر پھیر سے ہلچل ہوا میں ہے

ساقی یہ کیسا شور ہے رندوں کے درمیاں
شاید شراب کی کوئی بوتل ہوا میں ہے

سب کچھ کھلا کھلا سا ہے جی بھر کے دیکھئے
فیشن زدہ حسینوں کا آنچل ہوا میں ہے

جب مختصر زمیں پڑی جنگ کے لیے
تب سے زمیں کے واسطے دنگل ہوا میں ہے

ہنستی ہو بات بات پہ بیگم مگر یہ کیوں
میری ذرا سی بات پہ چپل ہوا میں ہے

میرا کلام سنتے ہی پبلک یہ کہہ اٹھی
نشتر کمت غزل تمہاری کل ہوا میں ہے

ناراض ہوگیا، حالانکہ قصور ان کے والدین کا تھا جنھوں نے ا
ننھے جیسا ہوا ہے۔ کہتے ہیں اس نے اپنی شاعری کی کتاب پر
نہیں، وہ تو پیاس کی بات بھی یوں کرتا ہے کہ بندہ پانی پانی ہو جا
کو سمجھنا بڑی نا سمجھی ہے۔ ایک بار رابرٹ براؤننگ نے اپنی
جب ان سے نظم کا مفہوم بتانے کو کہا گیا تو رابرٹ براؤننگ
لکھا تھا تو خود اور خدا کے علاوہ اس کا مطلب کوئی نہ جانتا تھا، لیکن اب صرف خدا ہی جانتا ہے
لکھا ہے بقول شخصے جسے پڑھ کر بندے کا طلاق لینے کو دل چاہتا ہے۔

صاحب! دنیا میں سب سے بوگس کتاب وہ ہوتی ہے جسے کوئی
بوگس کتاب وہ ہوتی ہے جسے کوئی ادھار بھی نہ مانگے۔ ویسے ہم کسی کو اپنی کتاب
یہی پوچھتا ہے ڈاکٹر صاحب نسخے کی ترکیب استعمال کیا ہے
کتاب کیسی ہے؟ چاہے کتاب سکاریات کے متعلق نہ بھی ہو لیکن ہم کتاب کے بارے میں
اچھی رائے کا اظہار کرتے ہیں جب تک اسے پڑھ نہ لیں۔ سوائیکل کی شاعری کی کتاب
سکتے ہیں کہ یہ شاعری کی کتاب ہے۔" ماہم الزبتھ ٹیلر نے کہا ہے اس کتاب میں
ہمارے ہاں چھپنے والی کتابوں میں بھی ہوتی ہے مگر اس کے لیے کتاب کا چھپ کر کھلنا ضروری ہے

نامور شاعر طالب خوندمیری کا مجموعہ

دستخط [خطوط]

ڈاکٹر صاحب۔

★ دلیپ سنگھ کی اچانک موت نے بڑا دکھ پہنچایا۔ معلوم نہیں اس سانحہ کی اطلاع آپ کو کب ملی۔ دو تین دن تک تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہو گیا۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔ دلیپ سنگھ کی وفات پر آپ کا دل گرفتہ ہونا فطری بات ہے۔ وہ حیدرآبادیوں کو بہت چاہتے تھے۔ اور خاص طور سے زندہ دلانِ حیدرآباد کو۔۔۔۔
آپ کی محنت اور محبت کا قائل ہو گیا۔ دلیپ سنگھ کو آپ نے یاد کیا۔۔۔۔

یوسف ناظم بمبئی ۳ر اکتوبر

★ آپ کے دلچسپ اور شگفتہ جریدے کے چند شمارے ملے۔ یہ پرچہ پڑھ کر بہت سی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ معز صاحب کا شکر گزار ہوں کہ ان کے ذریعہ یہ دلپسند جریدہ دیکھنے کو مل جاتا ہے۔

قیصر تمکین (لندن)

★ دلیپ سنگھ کا اچانک اٹھ جانا بہت بڑا سانحہ ہے۔ میرا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ اب حیدرآباد میں کوئی میرے کرنے میرے ساتھ رہنا پسند نہیں کرے گا
خیال احمد صدیقی (دبئی)

★ آج جملہ آپ نے دلیپ سنگھ [illegible]
[illegible]

حضرات اور خواتین سے تعارف کراتی نظر آتی ہیں۔ یہاں یہ لکھنا غیر ضروری ہے کہ وہ مسکا گو کے ادبی حلقوں میں ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں جو یہاں اردو کو رواج دینے کے سلسلے میں دامے درمے سخنے ہمیشہ پیش پیش رہتی ہیں۔
اس وقت اس خط کے لکھنے کی وجہ شگوفہ کے لیے ایک مشورہ پیش کرنا ہے کہ آپ شگوفہ کے دو تین صفحات ۵۵ یا ۸۸ کے لیے مختص کریں۔ آپ ہر شمارے میں کوئی ایک متین سنجیدہ غزل بطور غزل طرح، شائع کریں اور طنز و مزاح میں کہنے والے شعراء کو طبع آزما ہونے کی دعوت دیں جسے دوسرے ماہ کے شمارہ میں شامل کریں۔ خیال اس بات کا رکھنا ہوگا کہ سہل بحروں میں قافیہ اور ردیف رواں ہو تاکہ شعرا نئے مضامین پیدا کر سکیں۔ اس طرح وسعت اور گنجائش موجود رہے گی۔ اعلان میں اس تاکید کے ساتھ ہو کہ تصرف جتنا ہنسی آمیز رہے بلا تذلیل کا پہلو ہو۔ قدما کی غزلوں کی بجائے موجودہ رو بہ حیات شاعروں کی غزلیں اگر پیش کی جائیں گی تو شگوفہ کی شہرت میں اضافہ ہوگا اس لیے کہ سنجیدہ شعراء کی نظریں بھی ان صفحات تک تجسس کے ساتھ پہنچیں گی۔ ہم آپ یہ جانتے ہیں کہ پیروڈی کے اشعار اکثر اصل شعر سے زیادہ مشہور ہو جاتے ہیں مثلاً "رہنے کو گھر نہیں ہے سارا جہاں ہمارا"
خواجہ معین الدین عطش (شکاگو)

★ آپ کی صحت، سلامتی اور درازیٔ عمر کے لیے دعا کرتا ہوں۔ آپ خوب جئیں، خوب ہنسیں اور آپ کے قہقہے حیدرآباد سے نکل کر پورے برصغیر میں سنائی دیں
کوثر صدیقی، بھوپال

★ شگوفہ آپ کی محبت کی چاشنی میں ڈوبا ہوا دستیاب ہوا ورق ورق آپ کی محنت اور لگن کی گواہی دے رہا ہے۔

واحد انصاری

جلد : ۲۸
شمارہ : ۱۱

نومبر ۱۹۹۶ء

ایڈیٹر : ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

طباعت : دائرہ پریس۔ چھتہ بازار حیدرآباد

فی پرچہ : ۱۰ روپے
زر سالانہ : ۱۲۰ روپے
[illegible]

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :
۳۱- بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد-۱
ٹیلیفون : 595716 رہائش : 521064

"شگوفہ"

کا آئندہ شمارہ

بہ یاد

اسمٰعیل ظریف

شائع ہوگا

قیمت دس روپے

اِس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

گوشۂ مضطر مجاز

مال مفت (انشائیے)

پچُوران (منظومات)

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن !

رجسٹرڈ آفس : 5/825-1-4 سکنڈ فلور لکشمی اسٹیٹ عابد روڈ حیدرآباد

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا یہ ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے۔ یہ قرضہ جات 2 اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں (1) غربت ہٹاؤ اسکیم (2) خود روزگار اسکیم۔ غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار تک کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائینڈنگ، ترکاری فروش، میوہ فروش، اگربتی کا کارخانہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں اس جملہ لاگت کا 25% کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود 4% کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے اور ماباقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی چھ ہزار 6000 روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں، پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین، آٹو رکشا، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں اس جملہ لاگت کا 20% کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح سود ½6 پر دیا جاتا ہے۔ کارپوریشن مندرجہ بالا دو اسکیموں کے تحت اپنے قیام سے لے کر 7 مارچ 96ء تک 57837 افراد میں 12,66,60,000 روپے بطور مارجن منی قرض جاری کر چکا ہے جس کی جملہ لاگت 56,98,15,000 روپے ہوتی ہے اس کے علاوہ جاریہ سال 96-95ء سے مرکزی حکومت کا قائم کردہ نیشنل اقلیتی ڈیولپمنٹ اینڈ فینانس کارپوریشن کے اشتراک سے اب تک جملہ 868 افراد میں (16) منظور کردہ اسکیمات کے تحت 1,06,30,000 روپے مارجن منی قرض مزید جاری کر چکا ہے جس کی جملہ لاگت 2,70,03,000 روپیہ ہوتی ہے اس کے علاوہ کارپوریشن 93ء سے اقلیتی طبقہ کے نوجوانوں کو سالانہ مفت ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے چکا ہے حیدرآباد میں 531 نوجوانوں کو، نظام آباد میں 192، گنٹور میں 243 افراد، کرنول میں 76 نوجوانوں کو تقریباً 10 لاکھ روپے کے صرف سے کمپیوٹرس، موٹر ڈرائیونگ، لیاب ٹیکنیشین، ٹیلرنگ، ٹائپ رائٹنگ وغیرہ میں ٹریننگ کروایا گیا ہے۔

* کارپوریشن کی شاخیں اضلاع کے ہیڈ کوارٹر پر بھی کام کر رہی ہیں۔
* خواہشمند حضرات کارپوریشن کے دفاتر سے ربط پیدا کریں۔

محمد علی رفعت
ایم کام۔ ایل ایل ایم
نائب صدرنشین و مینیجنگ ڈائرکٹر

مجتبیٰ حسین

ہمارے گھر پر چھاپہ

کل رات ہم نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔ اس خواب کی تفصیل آپ کو بھی سنائے دیتے ہیں ملاحظہ فرمائیں۔

ہم رات کے پچھلے پہر اپنے کمرہ میں گہری نیند سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ہماری بیوی نے ہمیں جگاتے ہوئے کہا "ذرا سنیئے، دیکھئے تو سہی ہمارے گھر چھاپہ مارنے والے آگئے ہیں" ہم نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا "ان سے کہو معاف کریں اور آگے جائیں"

بیوی نے کہا "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ وہ لوگ نہیں ہیں جو معاف کر دیتے ہیں۔ یہ تو چھاپہ مارنے والے ہیں۔ ان کا معافی سے کیا تعلق؟"

ہم نے ایک اور کروٹ بدلتے ہوئے کہا "کونسے چھاپہ مارنے والے؟ ان دنوں چھاپہ مارنے والے بھی کئی قسم کے ہوگئے ہیں۔ انکم ٹیکس کے چھاپہ مار، سی بی آئی کے چھاپہ مار، انفورسمنٹ ڈائرکٹوریٹ، کمرشیل ٹیکس اور نہ جانے کس کس کے چھاپہ مار۔ پہلے پتہ تو کرو کہ کس ڈپارٹمنٹ سے آئے ہیں"

ہماری بیوی نے کہا "تم خود جاکر پوچھ لو۔ میں پوچھوں گی تو کہیں واپس نہ چلے جائیں۔ مجھے تو صورت سے یہ چھاپہ مارنے والے کم اور ......!

اس وقت تک ہم نیند کے خمار سے نکل آئے تھے۔ جب ہمیں پتہ چلا کہ ہمارے گھر سچ مچ چھاپہ مارنے والے آئے ہیں تو ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ ہم نے بیگم سے کہا "میں نہ کہتا تھا ایک دن ہمارا شمار بھی بڑے آدمیوں میں ہوگا خدا کا شکر ادا کرو کہ آج اس نے ہمیں یہ اعزاز بخشا ہے۔ اگرچہ لکشمی کبھی ہمارے گھر نہیں آئی لیکن چھاپہ مارنے والے تو آگئے ہیں، تم جلدی جلدی ان سارے پڑوسیوں اور رشتہ داروں کو اس خوش خبری کی اطلاع دیدو جو ہمیں دیکھ دیکھ کر بلاوجہ حسد کی آگ میں جلتے رہتے ہیں۔ انھیں مزید جلانے کا اس سے بہتر کوئی اور موقع نہیں ہو سکتا" بیگم نے کہا "کیسے اطلاع دوں ٹیلی فون کا بل بروقت ادا نہ ہونے کی وجہ سے آج ہی تو ہمارا ٹیلی فون کٹا ہے۔ کتنی بار تم سے کہا کہ ہمارے ٹیلی فون کا یوں بار بار کٹ جانا اچھا نہیں کوئی بھی ایمرجنسی آسکتی ہے۔

ہم نے کہا "تم پڑوسی کے ہاں سے جاکر ٹیلی فون کر دیں اتنی دیر میں چھاپہ مارنے والوں سے نپٹتا ہوں"۔
ہم دیوان خانہ میں آئے تو دیکھا کہ چار پانچ اصحاب دیوان خانہ کی ہر چیز کو نہایت غور سے دیکھ رہے ہیں اور دیکھنے سے کہیں زیادہ انہیں پرکھ رہے ہیں ہمیں دیکھتے ہی ان کے افسرِ اعلیٰ نے ہم سے کہا "معاف کیجئے ہم آپ کے گھر چھاپہ مارنے کے لیے آئے ہیں"۔

ہم نے کہا "زہے نصیب ضرور چھاپہ ماریئے۔ ہمیں تو آپ ہی کا انتظار تھا۔
افسر نے کہا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کو ہماری آمد کا پہلے ہی سے پتہ تھا"۔
ہم نے کہا "آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ اگر آپ کی آمد کا پہلے سے پتہ ہوتا تو ہم آپ کو یوں سوتے ہوئے ملتے۔ ہم تو آپ کے خیر مقدم کے لیے گھر پر چراغاں کرتے اور گلی کے موڑ پر ایک خیر مقدمی کمان کو کھڑی کر دیتے"۔
افسرِ اعلیٰ: دیکھئے مذاق نہ کیجئے۔ پہلے ہم آپ کے گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں"۔
ہم: ضرور لیجئے مگر ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ پہلے چائے وغیرہ تو پیجئے۔ ہم نے اپنے کچھ صحافی دوستوں اور فوٹو گرافروں کو فون پر اطلاع دینے کے لیے کہا ہے کہ وہ جلد از جلد یہاں آجائیں۔ وہ آجائیں تو تلاشی شروع کر دیجئے۔
افسرِ اعلیٰ: آپ نے صحافیوں اور فوٹو گرافروں کو کیوں بلایا۔ آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ لوگ تو چھاپے کی اطلاع کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہم: — "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہمارے گھر چھاپہ پڑے اور اس کی اطلاع اخباروں میں نہ آئے۔ پھر چھاپہ روز روز تو پڑنے سے رہا۔ اخبار والے آجائیں تو ذرا مزہ آجائے گا۔ ہمارے گھر سے اگر کوئی چیز نہ بھی ملے تو اخبار والے اپنی خبریں نکال لیں گے۔ اس طرح ہماری عزت اور احترام میں اضافہ ہوگا۔ چھاپہ مار ٹیم کا افسر ہم سے یہ بات چیت کر ہی رہا تھا کہ اچانک کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی دیکھا تو معلوم ہوا کہ ٹیم کے ایک کارندے نے ہماری وہ لاقیمت اور بے مثال دیوار گھڑی گرادی ہے جو ہمیں اپنے والد سے اور ہمارے والد کو ان کے والد سے ورثہ میں ملی تھی۔ یہ گھڑی فرانس کے ایک گھڑی ساز نے 1857ء میں اس وقت تیار کی تھی جب ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی لڑی جارہی تھی۔ ہمارے پاس یہ گھڑی پچھلے پچاس برسوں سے تھی۔ اس سے پہلے یہ ہمارے والد کے پاس تھی۔ ان کا بیان تھا کہ ان کے پاس بھی یہ گھڑی کبھی نہیں چلی۔ لگ بھگ سو برسوں سے یہ گھڑی دس بج کر پینتیس منٹ بجا رہی تھی یہ پتہ نہیں تھا کہ دن کے دس بج کر پینتیس منٹ بجا رہی تھی یا رات کے دس بج کر پینتیس منٹ بجا رہی تھی۔ البتہ مشہور یہ تھا کہ جس وقت ہمارے دادا کا انتقال ہوا تھا عین اسی وقت ہمارے ایک تایا نے اس گھڑی کو چلنے سے روک دیا تھا۔ گویا پچھلے سو برسوں سے وہ ہمارے اہلِ خاندان کو ہمارے دادا کے مرنے کا وقت بتا رہی تھی۔ ہمارے والد صاحب کہا کرتے تھے کہ بھلے ہی یہ گھڑی نہ چلے لیکن اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ دن میں دو دفعہ بالکل صحیح وقت بتاتی تھی۔ دیگر گھڑیوں کی طرح بالکل نہیں تھی جو دن کے کسی بھی وقت میں صحیح وقت نہیں بتاتیں۔ تاہم اس گھڑی میں ہم وقت نہیں دیکھتے تھے بلکہ اپنے اسلاف کے کارناموں کو ڈھونڈتے تھے۔ جیسے ہی یہ دیواری گھڑی گری ہمارے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ہم نے کارندے کو جاکر پکڑا کہ میاں جب تک اس گھڑی کا معاوضہ نہیں ادا نہیں کیا جاتا تب تک ہم تمہیں کسی اور چیز کو ہاتھ لگانے ——— اور مزید تلاشی کی اجازت نہیں دیں گے۔ افسرِ اعلیٰ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "آپ اطمینان رکھیں آپ کو اس گھڑی کا معاوضہ مل جائے گا"۔

ہم نے کہا "لیکن معاوضہ کیا ہوگا۔ پہلے یہ تو طے کیجیے۔"
افسرِ اعلیٰ نے گھڑی کے ٹوٹے ہوئے پرزوں کا جائزہ لینے کے بعد کہا "آپ کو اس کے پچاس روپے مل جائیں گے۔"

ہم نے چیخ کر کہا "کیا کہا پچاس روپے۔ بھائی صاحب میں اس گھڑی کے پچاس لاکھ روپے سے کم نہیں لوں گا۔ آپ نے اس گھڑی کو کیا سمجھا ہے۔ ہمارے باپ دادا کی نشانی ہے جس فرانسیسی کاریگر نے یہ گھڑی بنائی تھی اگر اس کے اہلِ خاندان کو اس گھڑی کا پتہ چل جائے تو وہ کروڑوں روپیوں میں اسے ہم سے خرید لیں گے۔" ہم یہ بحث کر ہی رہے تھے کہ کچھ صحافی حضرات اور فوٹوگرافر وہاں آ گئے۔ ہم نے انھیں سارا ماجرا کہہ سنایا اور بتایا کہ اس قدیم گھڑی کے دام پر ہم میں اور چھاپہ مارنے والوں میں اختلافِ رائے پیدا ہو گیا ہے۔ وہ ہمیں پچاس روپے دینا چاہتے ہیں اور ہم اس کے پچاس لاکھ سے کم نہیں لینا چاہتے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ایک جہاندیدہ صحافی نے اس گھڑی کے ٹوٹے ہوئے کل پرزوں کا بغور جائزہ لینے کے بعد کہا کہ اس کا دام آسانی سے ایک کروڑ روپے بھی تعین کیا جا سکتا ہے لیکن جب تم نے پچاس لاکھ روپے طے کر دیا ہے تو چلو یہی سہی۔ اس گھڑی کی قیمت اس کے کل پرزوں سے نہیں بلکہ اس کی عمر سے لگائی جانی چاہیے۔ بھلے ہی وہ بیسویں صدی میں ایک منٹ کے لیے نہیں چلی لیکن اس نے پوری ایک پرآشوب صدی کو گزرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس گھڑی سے تمہارے ارکانِ خاندان کا جو جذباتی رشتہ ہے وہ ایسا بیش قیمت ہے کہ اس کو تو کوئی ادا کر ہی نہیں سکتا۔ پھر بھی تم نے کہہ دیا ہے تو پچاس لاکھ روپے لے کر معاملہ رفع دفع کرو۔"

اس استدلال کے بعد افسرِ اعلیٰ نے اپنی ٹیم کے کارندوں سے کہا کہ وہ چھاپہ مارنے کی مہم روک دیں کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ ہم نے چھاپہ مارنے والوں کے یہ تیور دیکھے تو کہا "حضور! آپ کو اب چھاپہ تو مارنا ہی پڑے گا اب تو صحافی اور فوٹوگرافر بھی آ چکے ہیں۔ ہم آپ کو یوں جانے نہیں دیں گے۔ پھر آپ کی ٹیم نے تو ابھی اس گراموفون کو نہیں دیکھا ہے جو ہمیں ہمارے نانا کی طرف سے ورثہ میں ملا ہے۔ بخدا ایسا تاریخی اور یادگار گراموفون ہے کہ آپ اسے دیکھیں گے حیران رہ جائیں گے۔ کچھ لوگوں کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ یہ گراموفون اس وقت کا بنایا ہوا ہے جب ابھی سائنسدانوں نے خود گراموفون ایجاد نہیں کیا تھا۔ اگر خدا کرے یہ کسی طرح ٹوٹ جائے تو ہمارے خاندان کو کم سے کم ایک کروڑ روپے ضرور دلا سکتا ہے۔" ہماری بات کو سن کر افسرِ اعلیٰ نے پہلے تو ہم سے یہ پتہ کیا کہ گراموفون مذکور کہاں رکھا ہے اور جب اس کے محلِ وقوع کا پتہ چل گیا تو اس نے اپنے کارندوں سے کہا کہ خبردار! جو کوئی اس گراموفون کے قریب گیا تو۔ یہ ایک عجیب و غریب گھر ہے کہ یہاں ٹوٹنے سے پہلے کسی چیز کا دام تو پچاس روپے ہوتا ہے لیکن جب ٹوٹ جائے تو اس کا دام پچاس لاکھ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا چھاپہ مارنا بند کرو۔"

ہمارے بچوں نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ چھاپہ نہ ماریں، آپ کو چھاپہ تو مارنا ہی پڑے گا۔ ہم تو کب سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" ایک بچے نے کہا "میرا ایک بال پین پچھلے ایک ہفتہ سے غائب ہے آپ کو تلاشی میں ملے تو واپس کر دینا۔" ہماری بیوی نے کہا "اور ہاں! ہماری پوتی کی ایک انگوٹھی کہیں گر گئی ہے بہت تلاش کیا لیکن پتہ نہیں چلا آپ لوگ تو ماہر ہیں آپ کو یہ انگوٹھی ملے تو ضرور دے دیں۔" ہم نے کہا "ہماری بھی بعض ضروری چیزیں غائب ہیں جن کی فہرست ہم آپ کو بعد میں دیں گے لیکن پہلے وہ دیواری گھڑی کا معاوضہ طے ہو جائے۔"

ہماری بات معقول تھی اس لیے ہمارے صحافی دوستوں نے بھی اصرار کرنا شروع کر دیا کہ جب تک دیوار کی گھڑی کی قیمت طے نہیں ہو جاتی تب تک چھاپہ مار ٹیم کو یہاں سے جانے نہ دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی چھاپہ مار ٹیم کے ارکان نے بھاگنا شروع کر دیا۔ دوسرے دن اخباروں میں ہمارے گھر پر چھاپے کی تفصیلی خبریں شائع ہوئیں۔ جگہ جگہ ہمارے چرچے ہونے لگے اور لوگ ہمیں مبارکباد دینے لگے کہ اس چھاپہ کے عوض انکم ٹیکس والے تمہیں پچاس لاکھ روپے ادا کر رہے ہیں۔ ایسا تاریخی چھاپہ آج تک کہیں نہیں پڑا ہوگا اس کے بعد اچانک ہماری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو دور دور تک کسی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ہم نے بیوی سے پوچھا "چھاپہ مارنے والے کہاں چلے گئے؟" بیوی نے ہمیں ڈانٹتے ہوئے کہا "کوئی خواب دیکھا ہے کیا؟ کیسا چھاپہ اور کہاں کا چھاپہ! ابھی میں نے تمہارے پرس پر چھاپہ مارا تھا صرف دو روپے نکلے۔ یہ گڈہ اور مسور کی دال۔"

اور یہ سن کر ہم اپنی آنکھیں ملنے میں مصروف ہو گئے۔۔

□□

ڈاکٹر عباس متقی
(حیدرآباد)

ریورس گیر

"آنے دو" یہ دو لفظ ضرور سنے ہوں گے اور اس وقت یقیناً آپ نے خود کو محفوظ رکھنے یا محفوظ رکھتے ہوئے آگے نکل جانے کی کوشش ضرور کی ہوگی۔ یہ دو لفظ گویا ایک طرح کا انتباہ بھی ہے اور ہدایت بھی۔ انتباہ یوں کہ کلینر کی کرخت اور پاٹ دار آواز میں جب یہ دو لفظ خارج ہوتے ہیں تو سننے والے خبردار ہو جاتے ہیں کہ کنگ آف دی روڈ" المعروف بہ لاری پیچھے آ رہی ہے۔ اس سے اپنے آپ کو بچانا لازمی ہے۔ ہر پیچھے آنے والی شے سے آدمی خود کو بچاتا ہے خواہ خود آدمی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ اور بات ہے کہ آدمی جب پیچھے آنے لگتا ہے تو وہ آدمی نہیں رہتا۔ آدمی کی شان تو یہ ہے کہ وہ ہر دم جانب ترقی گامزن رہے جانب تنزل نہیں، افسوس کہ ہم نے انسانوں کو ایسا بھی دیکھا ہے کہ وہ ایک عمر تک گام بہ گام ترقی کرتے رہے لیکن جب بُرا وقت آگیا تو ان کی گاڑی ریورس دوڑنے لگی۔ ان کی زبان جو حقیقت شناس تھی۔ دروغ کی خوگر ہو گئی۔ قلم جو حق طرازی تھا باطل سے آنکھ ملانے لگا۔ دل جو شجاعت و شہامت کا پیکر تھا تملق کی تصویر بن گیا، ایمان و صداقت کی نیا ڈوب گئی اور شخصیت، علم، لیاقت، تصنیف و تالیف، شہرت و مقبولیت کے باوجود نذر گرداب کفر و نفاق ہو گئی۔ گویا آدمی وحید العصر ہی کیوں نہ ہو جب قسمت ریورس گیر ڈالتی ہے تو بدبختیاں پیچھے آواز لگاتی ہیں "آنے دو" "آنے دو" ——— اس آنے دو کا پکارا جب سڑک پر ہوتا ہے تو ٹریفک جام ہو جاتی ہے۔ ادھر کے لوگ ادھر، ادھر کے لوگ ادھر، آمد و رفت معطل، انسانوں کی ایک کثیر جماعت تماشائی تو ایک قلیل جماعت شکیبائی کا پیکر بنی منتظر کہ کب آنے دو کا غلغلہ ختم ہو اور کب انھیں جانے دو کا اشارہ نصیب ہو۔ بعض وقت تو لوگ جب کھڑے کھڑے بیزار ہو جاتے ہیں تو دوسرے رستے کو اختیار کرتے ہوئے راہ راست پر، اگرچہ دور راست کے مشورہ پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں۔ موٹر، لاری، بس والے بھی اتنے مستعد ہوتے ہیں کہ جب تک "آنے دو" سنتے رہتے ہیں گاڑی پیچھے

سیکھتے ہیں اگر آنے دو کی تکرار دہے تو وہ دنیا کے اس کنارے سے اس کنارے تک چلے جائیں پھر جل جوں ہی آنے دو رک گیا، گاڑی بھی دفعۃً ٹھہر گئی۔ البتہ کبھی کبھی لکنت زبان کے سبب حادثے بھی رونما ہوتے ہیں۔

ریورس گیر بھی عجیب دھوکے کی چیز ہوتا ہے۔ بڑھتا آگے ہے لیتا پیچھے ہے۔ ہم سوچتے ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ دنیا تمام کے منفی اقدار کا آئینہ دار ہو اور تمام ہی ناانصافیوں، عدم اعتدالیوں اور برائیوں کی نشاندہی کر رہا ہو۔ آدمی جب زندگی کی گاڑی چلاتے ہوئے قدرے لالچ کے سبب ریورس گیر ڈال دیتا ہے تو ضمیر کی سرخ بتی جل جل کر اسے آگاہ کرنے کی پوری کوشش کرتی ہے لیکن خود پسندی، انا اور اقتدار ایکسیلیٹر سے پاؤں ہٹانے کی مہلت دیتے ہیں نہ حرص و ہوس گیر بدلنے کا وقت۔ آدمی سوچتا ہے کہ اس کا منشا ترقی ہے لیکن نتیجہ تنزل ہوتا ہے۔ آدمی سوچتا ہے کہ وہ آگے کی جانب بڑھ رہا ہے لیکن اسے خبر نہیں کہ اس کی گاڑی پیچھے بڑھ رہی ہے۔ آدمی سوچتا ہے کہ اس کی منزل آگے ہے مگر اسے کیا معلوم کہ وہ اس طرح بہت پیچھے ہو رہا ہے اگر آدمی اس پر غور کرے تو کبھی گیر ریورس میں نہ ڈالے اور کبھی رفتارِ معکوس کی نحوست سے دوچار نہ ہو غیر سماجی غیر اخلاقی اور غیر انسانی روش پر چل کر جو دھن بٹور رہے ہیں یا الفاظ دیگر وہ اپنی مٹی خراب کر رہے ہیں۔ آخرش انہیں دونوں ہاتھوں سے اپنا خالی سر تھام کر بیٹھنا پڑے گا۔ لوگ بظاہر انھیں سکھی سمجھیں گے لیکن درحقیقت وہ دنیا کے سب سے دکھی انسان ہوں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ دائمی شے کی اہمیت ہوتی ہے۔ عارضی شے کا کوئی اعتبار نہیں، شادی خانہ اپنی چمک دمک، عرض و وسعت، عصری معیارات و سہولیات کے باوجود گھر نہیں ہو سکتا اور نہ فردوس نما "فردوس بریں"۔

ہم جب بھی کچھ ایسا منظر دیکھتے ہیں کہ ایک بڑی سی لاری چیونٹی کی رفتار سے پیچھے کھسک رہی ہے اور اس کے پیچھے ایک آدھ کلینر "آنے دو" "آنے دو" کی رٹ لگا رہا ہے تو فطری طور پر ہم رک جاتے ہیں لیکن اشہبِ خیال نہیں رکتا۔ وہ اپنی رفتار سے دوڑتا ہے بلکہ پرواز کرنے لگتا ہے۔ آدمی اگر آنکھیں کھلی اور ذہن سیدا رکھے تو سماج میں وقوع پذیر ہونے والا کوئی منظر اسے چونکنے سے باز نہیں رکھ سکتا۔ شاید سب سے مشکل اور غیر فطری کام ریورس لینا ہے۔ دونوں ہاتھ، دونوں پاؤں، دونوں آنکھیں دونوں دماغ مسلسل مستعدی سے مشغولِ کار۔ لاری چلانے والے عموماً نان میٹرک ہوتے ہیں اس لیے خصوصاً جاہلِ مطلق بھی۔ ایسا نہیں کہ ہر نان میٹرک جاہل ہوتا ہے۔ بعض لیڈر بھی نان میٹرک ہوتے اس لیے نان میٹرک کو محض جاہل کہنا جہالت کی توہین ہے۔ الغرض ایک ایسی ایسے سماری مدد ہو گئی۔ ہم سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں مگر برداشت نہیں کر سکے اور لوگ ہم سے کہتے ہیں کہ اگر تم اپنی روش پر رہنا ہی چاہتے ہو تو ملک بدر ہو جاؤ۔ ناانصافی.. کے ساتھ ساتھ اگر بداخلاقی کا جوہر بھی مل گیا ہو تو ہمارا پارا وقت سے پہلے چڑھ جاتا ہے۔ غضب تو یہ ہے کہ ہماری گفتگو کوئی سمجھتا نہیں اور ہم سب کی گالیاں سمجھ جاتے ہیں۔ اب لوگوں میں آتی اعلیٰ ظرفی کہاں کہ کم از کم ایسی گالی دیں جو سمجھ میں نہ آئے۔ وہ ہماری شخصیت کو خاطر میں نہ لاتا تھا اور ہم اپنی "سوزکیا" پر بیٹھے بیٹھے اپنی شخصیت کی پہچان کروانے فصاحت و بلاغت کے دریا بہانے لگے۔ فصاحت و بلاغت سے کہیں پہچان ہوتی ہے، [illegible] ہوتا

تو مصنفین کسی سے مقدمات لکھواتے نہ شعرا ہیش لفظ ا دیپروں اور پیڈ نیا میل دفعتہً اقبال کی مشہور نظم ایک پہاڑ اور گلہری" یاد آگئی۔ ہم نے چیخ کر کہا اے ادلاری کی اولاد اگر تو واقعی میرے مقابلہ پر اتر آیا ہے تو نادان نے اقبال کبھی تو نادان رہا" کی تقطیع کر دے۔ وہ بغلیں جھانکنے لگا جس نے ابتدائی عمر میں تختی نہ سنبھالی ہو وہ اواخر عمر میں تقطیع کیا کرے گا۔ ہم شاعر ہیں محبوب کے رخسار کے ایک حلد تل پر جب سمرقند و بخارا بخش سکتے ہیں تو کیا ایک نادان کی نادانی نہیں بخش سکتے۔ جب کر وہ پہلے کیبن سے اترنے کی تمہید باندھ رہا ہو ہم نے پہلی بار کسی کو معافی چاہنے کے لیے آستین چڑھاتے دیکھا تھا۔ بہت حیرت ہوئی۔ خدا کی شان ہے سڑکوں پر کیسے کیسے منظر دکھائی دیتے ہیں۔ فوراً اکسیلیٹر دے دیا شکر ہے ہماری گاڑی میں وہ گیر نہیں جس سے گاڑی پیچھے دوڑتی ہو۔ ریورس گیر صرف بڑی بڑی ہی گاڑیوں میں ہوتے ہیں۔ چناں چہ کبھی ہم نے سرکاری ملازم کو غبن کے ذریعہ کروڑپتی ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ البتہ منسٹروں کی بات اور ہے۔ ان کی گاڑیوں میں ریورس گیر زیادہ ہوتے ہیں اور جب فراخ دلی سے وہ ان گیرس کا استعمال کرتے ہیں تو ملک اپنی معیشت، آبرو اور مستقبل کے لیے پیچھے کی جانب دوڑنے لگتا ہے۔

یوں تو بے شمار گاڑیاں الٹی بھی دوڑتی ہیں لیکن جو بات آٹو میں ہے وہ دوسری گاڑیوں میں نہیں جب وہ الٹا چلتا ہے تو عجیب مضحکہ خیز منظر ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی شریر بچے نے مرغی کی گردن میں سگریٹ کی ڈبیہ کا پٹہ ڈال دیا ہے اور وہ اپنی گردن کو پٹے سے آزاد کرانے کی کوشش میں جدھر دم سمائے الٹی دوڑ رہی ہے۔ یہ ریورس دوڑ صرف سواریوں کی حد تک محدود نہیں۔ اس میدان میں بعض انسانوں کے علاوہ کچھ حیوان بھی سرفہرست ہیں۔

ریورس چلنے والی گاڑیاں تو مضحکہ خیز ہوتی ہی ہیں لیکن ان کے ہارن مزید مضحکہ خیز ہوتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ان سواریوں کی الٹی دوڑ کبھی ختم نہ ہو ہندوستان میں اب بہت کم مواقع پر ہنسی آرہی ہے۔ البتہ قدم قدم پر رونے کا موقع ضرور ملتا ہے۔ بعض ہارن سنکر ان کے موجد کے عاقل و بالغ ہونے میں شبہ سا ہونے لگتا ہے۔ چناں چہ ایک دفعہ لب سڑک استادہ ہم ایک طرحی مصرعہ پر گرہ لگا رہے تھے کہ دفعتہً ایک شیر خوار معصوم بچے کی چیخ پکار کرنے کی آواز آنے لگی۔ ہم بوکھلا اٹھے۔ تڑپ گئے۔ آواز کچھ ایسی تھی کہ ہلاکو اور چنگیز بھی پسیج جائیں۔ ہم تو بہرحال انسان ہیں۔ بچے کو ڈھونڈنے لگے۔ اس کی چیخوں سے دودھ کی شدید ضرورت ہویدا تھی۔ گو ہم اس کی ضرورت کی تکمیل پر قادر نہ تھے لیکن گود میں لے کر بچے کو اس کی ماں کی آمد تک چپ کروانے میں ہم اپنا جواب نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری بیگم سے خوب نبھ رہی ہے ورنہ چوٹی کے دو فنکاروں میں ازدواجی کشمکش صرف انگلینڈ تک محدود نہیں۔ الغرض ادھر ادھر چوکنے ہو کر بچے کو تلاش کرنے لگے اور پھر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی بچے کی روتی آوازیں ماروتی سے آرہی تھیں تعجب ہوا کہ اس دور کا انسان لوگوں کو چونکانے کے لیے کیا کچھ نہیں کر رہا ہے۔ مزید تعجب تو اس بات پر ہوا کہ کس بے خوفی سے ریورس الارم کے طور پر ان ہچکیوں کا انتخاب ہوا ہے۔ حالانکہ بعض بالغ آوازیں اس سے زیادہ چونکانے والی ہوتی ہیں۔ مستزاد یہ کہ آج کل ریورس الارم مختلف النوع آوازوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ مثلاً کوئل کی سنسناہٹ، توپ کی گھن گرج، مشین گن کی تسلسل آمیز فائرنگ، ٹائر انجن کی گھنٹی، ٹرانس کے قہقہے وغیرہ یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن اس موقع پر اگر کوئی موزوں آواز ہے تو بس وہی "پیچھے آنے دو" "آنے دو" "آنے دو"۔

غزل

بی۔ این۔ راز (ہریانہ)

کچھ شعر تازہ ہم نے کہے ہیں حماقتاً
سمجھیں گے عقل والے ہی ان کو ظرافتاً

کھیلی کسی سے ہولی جو ہم نے شرارتاً
منہ کالا کرکے لوٹے ہیں اپنا بھی عادتاً

وہسکی کے دام بڑھ گئے جیسے ہی دفعتاً
ٹھرّا گلے سے ہم نے اتارا کفایتاً

اک آنکھ اپنی بیٹھ گئی تاک جھانک میں
دو جی ملی تھی آیا ہے کافی روایتاً

کل ہجو ہم نے لکھی تھی جس تھانے دار کی
لکھنا پڑا ہے اس کا قصیدہ حراستاً

مانا کہ بے ایمان ہے ہر ایک پارٹی
پر ووٹ بھی تو دینا ہے ہم کو روایتاً

مولانا کیسے فرقہ پرستی یہ دور ہو
کچھ روشنی بھی ڈالیے اس پر جماعتاً

محبوب نے بھی کچے گھڑے کو اٹھا لیا
سوہنی کا ذکر ہم نے کیا جو حکایتاً

سب گھوڑے اپنی نیند میں ڈسٹرب ہو گئے
بوڑھا بچھڑے کے کھاٹ کو کھانسا جو عادتاً

اک نامور نجومی کی پیشین گوئی ہے
عزت ملے گی آپ کو آخر شہادتاً

بھارت کا لال دیکھیے فارن میں بک گیا
اک ڈاکٹر کو لے اڑی لڑکی تجارتاً

ملا ڈرا میں مہند ہو گئے ہم دیکھیے حضور
بچوں کی گھر میں رکھی تھی پسٹل حفاظتاً

معنی و لفظ موج کے ہی کیجیے خطاب
بچوں کے نام رازؔ کے ہیں سب لغایتاً

غزل

اثرؔ بدایونی (بمبئی)

دو چار ہاتھ کس کے جو مارے نہ جائیں گے
عاشق کے سر سے بھوت اتارے نہ جائیں گے

طے کر لیا کہ شربتِ دیدار کے لیے
ہم اُن کے پاس ہاتھ پسارے نہ جائیں گے

اب کیا خبر کسی کو بھیجی ہے اس کی آنکھ
ہم جانتے ہیں اس کے اشارے نہ جائیں گے

قاضی نکاح آج پڑھانے نہ آئے گا
جب تک بری کے ساتھ چھوارے نہ جائیں گے

کیوں روکتا ہے کوچۂ دلدار سے مجھے
دریا کی اُلٹی سمت میں دھارے نہ جائیں گے

اس خدمتِ مدام کا کچھ بھی نہیں مآل
گیسو کسی کے ہم سے سنوارے نہ جائیں گے

گھیرے رہیں گے سائے نحوست کے آپ کو
جب تک بلی کے بکرے اتارے نہ جائیں گے

ڈاکٹر بانو سرتاج
(چندرا پور)

ہائے موٹاپا!

ہماری صحت ابتدا ہی سے دوسروں کے لیے قابلِ رشک رہی ہے۔ جب ہم پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے تب ہمارے سُرخ پھولے ہوئے گالوں کو دیکھ کر کچھ لوگ ہمیں ٹماٹر کہہ کر پکارتے وہیں ہم سے جلنے والے ہم پر "توپ کا گولہ" کی پھبتی کسنے سے نہ چوکتے۔ برسوں بعد ہمیں میوزیم میں توپ کا گولہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تو حیرت ہوئی کہ ہمیں "توپ کا گولہ" کیوں کہا جاتا تھا... توپ کا گولہ کوئی بہت بڑا تو نہیں ہوتا!

ہماری ایک استانی صاحبہ اپنی بولی پھلی جیسی سوکھی بیٹی کو بعد حسرت دیاس تک کر ہم سے پوچھا کرتیں — "کس چکی کا آٹا کھاتی ہو بھئی؟" ہم سادگی سے بتا دیتے "ہمارے محلے میں ایک ہی چکی ہے آسارام کی... بس اسی کا پِسا کھاتے ہیں"۔

پھر جب کسی نے ہمیں بتایا کہ اس طرح پوچھنا موٹاپے پر طنز کرنا ہے تو ہم نے بے حد کوشش کی کہ ہمیں غصہ آجائے مگر آیا نہیں۔ موٹے لوگوں کو غصہ نہیں آتا۔ وہ ہنسنا ہنسانا پسند کرتے ہیں یا یوں سمجھ لیجیے کہ جو ہمیشہ خوش رہتے ہیں فکر و غصہ، بغض و حسد کو پاس نہیں پھٹکنے دیتے وہ موٹے ہو جاتے ہیں۔ بات ایک ہی ہے۔ جو صادق آتی ہو اُسے ہم پر لاگو کر لیجیے۔ ہم چھوٹی موٹی باتوں کی پرواہ نہیں کرتے۔

ہم سے بارہا یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ ہمارے تمام دن تر و تازہ رہنے اور خوش و خرم دکھائی دینے کا راز کیا ہے؟ ہمارا جواب ہوتا ہے... "ہم جلتے کڑھتے نہیں ہیں۔ کوئی ہماری بُرائی کرے تو کان نہیں دھرتے۔ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اُڑا دیتے ہیں۔ ہاں کوئی تھوڑی سی بھی تعریف کرے تو جی بھر کر خوش ہو لیتے ہیں"۔

ظاہر ہے کہ شہر کے اندیشے میں دُبلا ہونا ہمیں پسند نہیں تو موٹا ہونا ہی تھا سو ہو گئے موٹے۔ دیکھتے دیکھتے صحت ایسی بنی کہ سب کی آنکھوں میں آنے لگی۔ ہمیں مذاق کا نشانہ بنایا جانے لگا... ہم بھی کچھ کم نہیں بجائے اس کے کہ مضحکہ اُڑائے جانے پر ملول ہوتے، ہم نے طے کیا کہ دلیری سے صورتِ حال کا مقابلہ کریں گے۔ دوسروں پر ہنسنا بہت آسان ہے خود پر ہنسنا بہت مشکل۔ مگر کوشش کرنے میں حرج کیا ہے؟

حالت کی سنگینی کا احساس ہمیں اُس وقت ہوا جب ہمیں ایک پاسپورٹ سائز کے فوٹو کی ضرورت آپڑی اور ہم فوٹو اتروانے پہنچے۔

فوٹوگرافر نے ہمیں اسٹول پر بٹھایا اور پوز بنوایا یعنی گردن کو اونچا سر کو ترچھا، ناک کو نیچا اور ہاتھ کو سیدھا کروایا۔ بال سمیٹنے اور آنچل سنوارنے کی ہدایت دی۔ آنکھیں کھلی رکھنے، دانت نہ در کھنے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ سجانے کو کہا اور کیمرہ کے پیچھے، پردے کے اندر سر جو ڈالا تو نکالنے کا نام نہیں۔ اس کی 'ریڈی' سننے کے انتظار میں ہمارے کان سُن ہو گئے۔ جسم پتھرا گیا... آخر قوتِ برداشت جواب دے گئی تو ہم نے پکارا "بھائی صاحب! خیریت تو ہے؟ فوٹو اتار رہے ہیں یا مجسمہ بن جانے کی ٹریننگ دے رہے ہیں؟"

پردے کے پیچھے سے پسینے میں تر فوٹوگرافر نے سر نکالا اور کہا "اتار تو فوٹو ہی رہا ہوں، مگر کیا کروں؟ آپ پاسپورٹ سائز میں سما نہیں رہی ہیں۔"

چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ فوٹوگرافر لحاظ کے مارے نہیں ہنسا ہم حیرت کے مارے۔ پھر جو ہم نے ہنسنا شروع کیا ہے تو پوچھیے نہیں کتنا ہنسے؟؟ فوٹوگرافر کی خفت بھی دور ہو گئی۔

ایک مرتبہ کہیں جانے کے لیے ہم ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ وقت گزاری کے لیے وزن کی مشین پر جا چڑھے۔ سکہ ڈالا۔ کارڈ باہر آیا... پڑھا، لکھا تھا "براہِ مہربانی ایک ایک کر کے مشین پر کھڑے ہوں۔"

واہ رے مشین! ہمیں ڈبل سمجھ لیا۔ ہم دوسری مشین تک پہنچے۔ سکہ ڈالا۔ . کارڈ نکلا تو وزن بتایا ۷۵ کلو.. ہم سمجھ گئے کہ اس اسٹیشن کی تمام مشینیں خراب گڑبڑ ہیں۔ تہیہ کر لیا کہ منزلِ مقصود پر پہنچ کر وزن کرائیں گے۔ ویسا ہی کیا۔ اس مشین نے وزن بتایا ۷۶ کلو... اسی دن سے ہمارا ان مشینوں پر سے بھروسہ اٹھ گیا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے؟ ہر مشین اس طرح ایک ایک کلو وزن بڑھا کر بتاتی رہی تو فکر کے مارے ہم دُبلے نہ ہو جائیں؟

موٹاپا دشمنوں سے دوستی کرنے میں ماہر مانا جاتا ہے۔ ہمارے دشمنوں کے دشمن بلڈ پریشر سے اس نے ایسی یاری گانٹھی کہ ہمیں مجبور ہو کر ڈاکٹر کے در پر جانا پڑا۔ ڈاکٹر صاحب نے معائنہ کیا۔ بولے "بلڈ پریشر کوئی بیماری نہیں ہے۔ اسے بیماری نہ کہہ کر بے احتیاطی کا نام دینا زیادہ مناسب ہے۔ میرا کہنا مانیے۔ آپ صرف ایک کام کریں۔ پانچ کلو وزن کم کر کے میرے پاس آئیے۔ پھر ہم دیکھیں گے کہ آپ کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔"

ہم واپس آ گئے۔

سات ماہ بعد ڈاکٹر صاحب ہمیں ایک پارٹی میں ملے۔ بولے "آپ آئیں نہیں۔ کیا شکایت رفع ہو گئی؟"

ہم نے کہا "شکایت تو بدستور ہے۔ بلڈ پریشر کمبل کی طرح چپک گیا ہے۔ ہم دور کرنا چاہتے ہیں۔ وہ نہیں چھوڑتا۔"

"تو پھر آپ کو آنا چاہیے تھا۔ میں نے تو کہا تھا۔"

"ہاں آپ نے کہا تھا" ہم نے اعتراف کیا۔ "مگر آپ نے یہ بھی تو کہا تھا کہ وزن کم کر کے آنا۔ ہم کیا کرتے؟ کیسے آتے؟ وزن کم ہی نہیں ہوا۔"

ڈاکٹر صاحب ہمیں دیکھتے رہ گئے۔ ہمیں کیا؟ شاید ہمارے موٹاپے کو دیکھتے رہ گئے۔ ▪▪

صفدر حسین

(ریاض)

بائی پاس سرجری

بائی پاس سرجری۔ آج کل دن میں چار چھ مرتبہ یہ الفاظ کہیں نہ کہیں ضرور سنائی دیتے ہیں! جب ہم ان کی اہمیت اور افادیت پر غور کرنے لگے تو یہ ہمیں نہایت کارآمد معلوم ہوئے! ہم نے تہیہ کرلیا کہ سوسائٹی میں اپنے مرتبے کو بڑھانے کے لیے ہم انھیں ضرور کام میں لائیں گے۔ مریڈیز کار، معزز ین کے علاقے میں بڑا سا بنگلہ، ڈش اینٹینا اور آئے دن کی "کاک ٹیل" یعنی مرغ کی دُم پر مشتمل پارٹیوں کے باوجود ہم نے پتہ نہیں ایسا کیوں محسوس کیا کہ سوسائٹی میں ہماری قدر و منزلت گھٹتی ہی جارہی ہے! ہم نے سوچا کہ امیج کو بڑھانے کا واحد تیر بہدف طریقہ یہ ہوگا کہ یہ مشہور کروا دیا جائے کہ ہماری سچ مچ بائی پاس سرجری ہوچکی ہے! حسبِ توقع تیر ٹھیک "بیل کی آنکھ" یعنی نشانہ پر لگا! بائی پاس سرجری کے باقاعدہ اعلان کے چند روز بعد جب ہم ایک پارٹی ایکسپیڈنگی میں گئے تو ہمارا تعارف سرکاری طور پر اس طرح کرایا گیا: "یہ ہیں مسٹر فلاں ابن فلاں بائی پاس سرجری یافتہ (بر وزن ولایت لوٹ انعام یافتہ)! بائی پاس سرجری کیا ہوئی جیسے کوئی لارڈ کا خطاب ہوا! جب سے ہماری بائی پاس سرجری ہوئی ہے عجیب لطیفے پیش آنے لگے — ایک صاحب مزاج پرسی کے لیے تشریف لائے، بظاہر پڑھے لکھے نظر آرہے تھے لیکن انھوں نے لال موزے پہن رکھے تھے اور ان کی ٹائی بھی لال رنگ کی تھی! پاؤں میں سفید جوتے اور پیشانی پر خوشبودار تیل کی چمک تھی! کہنے لگے "خدا نے آپ کو دوسری زندگی دی ہے"! ہم نے سوچنے لگے کہ پہلی زندگی کیا گھٹیا تھی؟ پھر کہنے لگے: "آپ کی کتنی شریانوں کا افتتاح ہوا ہے"!؟ ہم حیران رہ گئے! بھی شریانوں کا افتتاح کیا ہوتا ہے؟ ہم کو اپنی اردو دانی پر شبہ ہونے لگا۔ بالآخر ہم سمجھ گئے کہ اس بندے کی بھی "سچ مچ" کی بائی پاس سرجری ہوئی ہوگی! اس کے بعد ہم نے بائی پاس سرجری کو سنبھال کر رکھنا اپنا فرض اولین بنالیا تاکہ اس کے وقار کا بلند گراف نہ گرنے پائے۔ شروع میں تو ہم نے بائی پاس سرجری کے دروغ مصلحت آمیز میں کسی کو رازداں نہیں بنایا یہاں تک کہ ہم نے اس رازِ سربستہ کو اپنی شریک مالکی زندگی سے بھی چھپائے رکھا (کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ خواتین کے پیٹ میں کوئی چیز زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکتی) جس کے نتیجے میں کھانے کی میز پر بیگم کی طرف سے ایک احتسابی مہم شروع ہوگئی۔ یعنی چکنائی کا پرہیز لیکن انھوں نے اپنی چکنی چپڑی

باتوں کو اس کا متبادل تبلایا۔ دوپہر اور شام بھی سبزیوں کے سلاد سے تنگ آکر ہم نے کہا: "بیگم شیر سلاد نہیں کھاتا!" بیگم نے پوچھا: "آپ شیر کب سے بن گئے؟" ہم نے کہا: "بائی پاس سرجری" کے بعد گیدڑ بھی شیر بن جاتا ہے"! رات دن کے پرہیز نے ہمیں ادھ موا کردیا۔ ہمارا وزن پانچ کلو کم ہوگیا جب کہ ہم کو دس کلو مزید وزن کی ضرورت تھی کیوں کہ پہلے سے ہی دھان پان تھے اور خدا کے فضل و کرم سے ہماری شریکِ حیات و ممات" یعنی شریکِ گناہ و ثواب ہماری بھرکم پاندان تھیں، ہر خاتون انھیں رشک کی نظر سے دیکھتی تھی کہ کوئی پاؤں بھاری تو نہیں ہے! آدمی خیر سے دبلا ہو لیکن اسے پتلا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ خوبی اس کی پتلی حالت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ دبلے ہونے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی فوج میں بھرتی ہونے سے بچ جاتا ہے اور دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے لیے کانٹوں پر چلنا آسان ہو جاتا ہے تیسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اگربتی کے اشتہار میں اس کی تصویر کو استعمال کیا جاسکتا ہے! ہم نے اپنی جھوٹ موٹ کی بائی پاس سرجری کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ جھوٹ بولنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ آدمی مرغن غذاؤں سے محروم کردیا جاتا ہے۔ ہماری مثال سامنے ہے! جنھوں نے بائی پاس سرجری کے دوران یا اس کے بعد دنیا میں واپس نہ آنے کو ترجیح دی ہوگی وہ یقیناً سمجھدار اور دور اندیش لوگ ہوں گے کیوں کہ اس کے بعد زندگی بے مزہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہماری مثال سامنے ہے! جب ہماری خادمہ نے دیکھا کہ ہر طرف بائی پاس سرجری کے چرچے ہو رہے ہیں تو ایک دن اس بھالی بھالی لڑکی نے کہا: "صاحب جی! آخر ہم نے کیا بگاڑا ہے؟ آپ میری بائی پاس سرجری کیوں نہیں کرواتے!؟" ہماری حاضر جوابی دیکھیے۔ ہم نے کہا: بائی پاس سرجری کے لیے میٹرک پاس ہونا ضروری ہے"! ہم نے ایک تیر سے دو شکار کیے یعنی اس طرح ہم نے بیوی کا بھی مطالبہ رد کردیا۔ ان ہی دنوں اخباروں میں یہ خبر چھپی تھی کہ لاہور کے چڑیا گھر میں شیرنی دل کا دورہ پڑنے سے چل بسی۔ ہماری بیگم نے شیرنی سے تعلق خاطر کا اظہار کرتے ہوئے ہم سے پوچھا: "اگر شیرنی کی بائی پاس سرجری ہوتی تو شاید وہ بچ جاتی!؟" ہم نے کہا: "کسی بھی مونث کی بائی پاس سرجری فی الحال ممنوع ہے خواہ وہ لاہور کے چڑیا گھر کی شیرنی ہو یا لندن کے کرچا گھر کی مسز آدم! ہاں" البتہ پوسٹ مارٹم ہوسکتا ہے" اس پر کوئی پابندی نہیں ہے"! ہماری بیگم نے برہم ہو کر کہا: "یہ تو سراسر حقوقِ نسواں کی خلاف ورزی ہے"۔ ہم نے دیکھا کہ شکست ہمارے قریب آرہی ہے تو ہم نے دبکی نامہ لکھتے ہوئے کہا: "اس مسئلہ پر ابھی اقوامِ متحدہ میں غور و خوض ہو رہا ہے۔ مغرب کی عورت ہار ماننے والی نہیں ہے"۔ ہماری بیگم کو ٹوہ میں لگے رہنے کی اچھی عادت ہے۔ ایک دن پوچھ بیٹھیں: "لوگ کہتے ہیں کہ دل کا آپریشن، میجر آپریشن ہوتا ہے۔ یہ میجر آپریشن کیا ہوتا ہے؟" ہم نے ان کے تجسس کو دور کرنے کے لیے کہا: "اگر کسی میجر صاحب کا آپریشن ہوتو اس کو میجر آپریشن کہتے ہیں اور اگر کسی سکول کے ماسٹر کا آپریشن ہوگا تو وہ ماسٹر آپریشن کہلائے گا"! بیوی کا کم تعلیم یافتہ ہونا بھی ایک نعمت غیر مترقبہ ہے!

بائی پاس سرجری کی وجہ سے ہماری بڑھتی ہوئی شہرت کو دیکھ کر لوگ رشک میں مبتلا ہوگئے۔ شامت اعمال ہمارے ایک انتہائی قریبی، با اعتماد دوست کو ہم نے ہماری جھوٹ موٹ کی بائی پاس سرجری کی کہانی سنائی تو وہ اس ترکیب کو اپنانے کے لیے تیار ہوگئے۔ ان کے اعلان کا دن اور تاریخ بھی مقرر کردی۔ شہر میں موجود

رہتے ہوئے شہر سے غائب رہنے کا پلان بھی بنالیا لیکن اللہ میاں کو ان کا زندگی کے ساتھ یہ مذاق پسند نہیں آیا۔ جس دن وہ جھوٹ موٹ کی بائی پاس سرجری سے اپنی موت یابی کا اعلان کرنے والے تھے کہ انھیں سچ مچ کی بائی پاس سرجری کے لیے اسپتال جانا پڑا! ہماری شریکِ ملالت بیگم کو ہماری خبرگیری کا ایک اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پینترا دیکھا نہ داؤ، ہم پر برس پڑیں: "مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ کی بائی پاس سرجری دراصل گیٹ پاس سرجری تھی ورنہ میں، خدا نہ کرے اس وقت تک بیوہ ہو چکی ہوتی! خدا آپ کو سچ مچ کی بائی پاس سرجری سے بچائے، آمین!"

□□

مدہوش ناگپوری

صاف صاف

لڑکیاں کھیلنے لگیں فٹ بال
ہو گیا میرا شہر بھی بنگال
اگلا P.M. ہو کون بھارت میں
ہر جگہ ایک بات! ایک سوال!!
نکشی بے ہنر نہیں آتی
سیٹھ بننا ہے تو دِوالہ نکال
بن گئی ہے جواں وہ بڑھیا
اس کو کہتے ہیں سرجری کا کمال
شیخ کالو نے مشورہ کر کے
رکھا لڑکے کا نام شیخ جمال
بن گئے آل انڈیا شاعر
جاں نشینانِ غالب و اقبال
جاری حاکم نے آرڈیننس کیا
آنے والا ہے عاشقوں پہ زوال
سننے والا کوئی غزل کا نہیں
اہلِ علم و ادب کا اِتنا کال
بن گئے کچھ کبیدار کچھ شاعر
کچھ تو قوال کے بنے ہیں دلال
سرخروئی کے خبط میں منہ پھٹ
ہم نے بھی منہ پہ مَل لیا ہے گلال

روشن لال روشن بنارسی

غزل

جس کے پاکٹ میں نوٹ ہے صاحب
اس کے ہاتھوں میں ووٹ ہے صاحب
ووٹ جو تھا وہ دے چکے ہیں ہم
اب تو بس یہ لنگوٹ ہے صاحب
بات تو فی صدی کھری ہے لیکن
آپ کے دل میں کھوٹ ہے صاحب
جس کو ساحل کی سمت جانا تھا!
اب بھنور میں وہ بوٹ ہے صاحب
حاصلِ چائے پان شعر و ادب
یا کبھی دال موٹ ہے صاحب
زخم و عدوں کے بھر ہی جائیں گے
یہ سیاست کی چوٹ ہے صاحب
یہ غزل بھی ہے ایک بم روشن
یہ قلم بھی ریوالور ہے صاحب

اقبال شانہ (حقل تبوک)

ٹھیک نہیں

رونا ماتم جشن منانا ٹھیک نہیں
شادی کے دن بینڈ بجانا ٹھیک نہیں

بن دعوت محفل میں جانا ٹھیک نہیں
دسترخوان پہ دھوم مچانا ٹھیک نہیں

لوگ بڑی دلچسپ ڈکاریں لیتے ہیں
یاروا اتنا زیادہ کھانا ٹھیک نہیں

"لیٹ" ہمیشہ ریل کی مانند آتی ہو
جانِ جاناں دیر سے آنا ٹھیک نہیں

ایسا نہ ہو کہیں شعر حلق میں پھنس جائے
ٹائی لگا کر شعر سنانا ٹھیک نہیں

یار پہلوانوں کی گلی میں رہتا ہے
یار کے گھر پر آنا جانا ٹھیک نہیں

میں اپنے سائے سے ڈرتا ہوں بیگم
خوف زدہ انساں کو ڈرانا ٹھیک نہیں

کیسے پہچانوں میں تجھ کو جانِ جاں
اتنا میک اپ تھوپ کے آنا ٹھیک نہیں

جاؤ کوئی اچھی ڈشس کھاؤ یارو
چھٹی کے دن بھیجا کھانا ٹھیک نہیں

شانہ محبوبہ کو شعر سناتے ہیں
بھینس آگے بین بجانا ٹھیک نہیں

چھتری

اقبال شانہ (حقل تبوک)

ڈر کے بارش سے کھول دی چھتری
تیز آئی ہوا گئی چھتری

ہم نے طوطے سنا ہے اُڑتے ہیں
ان کے ہاتھوں سے اُڑ گئی چھتری

کون ڈرتا ہے ابرِ باراں سے
احتیاطاً خرید لی چھتری

اڑ رہا ہوں ہوا میں تقریباً
کیسے چھوڑوں نئی نئی چھتری

بھیگنا ہے میاں بہر صورت
کیوں میں کھولوں پھٹی ہوئی چھتری

بھیگتے ہم رہے مگر صاحب
اُن کے سر پر لگا رکھی چھتری

جانے وہ کب چلے گئے شانہ
میرے ہاتھوں میں رہ گئی چھتری

ہو رہی ہے کبھی کبھی بارش
کھولتا ہوں کبھی کبھی چھتری

سخت حیراں ہوں خود بخود کیسے
اُن کو دیکھا تو کھل گئی چھتری

بارشیں بند ہو گئیں شانہ
میں نے جس دن خرید لی چھتری

سید طالب حسین زیدی
حیدرآباد

مگر لکھوائے کوئی خط اُس کو تو....

جوبلی کلب کے فیسٹیول ڈنر کے بعد تمام ممبران لان پر آبیٹھے اور پیٹ بھری باتوں ہنسی مذاق کا سلسلہ شروع ہوا، اس "زندگی زندہ دلی کا نام ہے" کے احوال میں صدر کلب نے تحریک کی کہ محفل میں رنگ بھرنے کے لیے ہر ممبر ایسے لطیفے اور قصّے سُنائے جن کو سن کر محفل لطف اندوز ہو، تحریک کی سب نے تائید کی۔ قرعہ فال سب سے پہلے ہمارے نام نکلا - - - - بچپن کی شرارت کا ایک واقعہ یاد آگیا اسی کو نمک مرچ لگا کر ہم نے پیش کردیا۔

ہمارے گھر ایک شریف برقعہ پوش خاتون کا آنا جانا تھا، جن کی آمد سے گھر میں اچھی خاصی رونق ہوجایا کرتی تھی، گھر کے بچے بڑے ان کو گھیر کر بیٹھ جاتے اور سارے شہر کی خبریں مزے لے لے کر سنا کرتے۔ ان کا تکیہ کلام تھا "کیا بولتے سو کی ماں؟" (جانے کیا کہتے ہیں اُسے ماں؟) دوران گفتگو کئی بار ایک انگلی سے سر کھجا کر اس تکیہ کلام کا ٹیکہ لگتیں اور پھر آگے کا احوال بیان کرتیں، اس ٹیکے کے بغیر ان کا راہوار سخن آگے بڑھتا ہی نہ تھا، جب بھی ان کی تشریف آتی تو ہم "بچہ لوگ" ایک دوسرے کو یوں آگاہ کرتے "کیا بولتے سو کی ماں" آئی ہیں۔ مگر آپ کی آمد ہماری ذات خاص کے لیے ایک مصیبت کا پیغام بھی لے آتی تھی۔ اپنے کسی عزیز، رشتہ دار کے نام ہم سے خط ضرور لکھوایا کرتیں۔ لکھواتیں کیا۔؟ ہمارے کھیل کود کے قیمتی وقت گھنٹے سوا گھنٹے کا ناس ہوجاتا۔ آپ یہ گمان نہ کریں کہ دس بیس صفحوں کا کوئی دفتر ہوتا ہوگا۔ جی نہیں، ہوتا تو وہ محض ایک پوسٹ کارڈ تھا مگر اس کے چار جملوں کے درمیان دس بار "کیا بولتے سو ماں" کی تکرار سوچنے کے لیے ایک انگلی سے سر کا کھجانا تب کہیں جاکر "آمدم بر سر مطلب" پر آتا۔

پتنگوں کا زمانہ تھا، تلسنکرات کی آمد آمد سارا آسمان رنگ برنگی پتنگوں سے ڈھکا ہوا، مدرسوں کی چھٹیاں سارا دن چھت پر چرخ مانجا۔ پتنگ لئے یہ کاٹا۔ وہ کاٹا۔ یہ نوشیرواں[1] چھوا شور ایسے میں ایک دن داخلی دروازے پر برقع نظر آیا ہماری جان نکل گئی اور لپک کر سیڑھیوں کو پھلانگنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ "آئی میرے چاند! اِتّی (اتنی) دھوپ میں اپّر (اُوپر) کاں (کہاں) جارئیں بیٹے؟" کی آواز نے پاؤں پکڑ لیے۔ ہم نے ادب سے سلام کیا اور ڈرتے ڈرتے پوچھا کیا بات ہے خالہ جان؟ ارشاد ہوا ذرا ایک ضروری خط لکھدیو باوا، میں تمارے صدقے جاؤں ہم نے کچھ ٹال مٹول کی اور

---

[1] ایک ہی پتنگ سے نو پتنگوں کو کاٹنے والا نوشیرواں کہلاتا تھا

دے کے خط ——— [مراسلے]

■ مصطفےٰ کمال صاحب!

السلام علیکم۔

"شگوفہ" کا شمارہ اکتوبر ۹۶ء نظر سے گزرا بہت خوب ہے۔ دلیپ سنگھ کی آخری تحریر "ڈرامہ کا آخری سین" ان کی اچھی تحریرات میں شمار ہوگی جو اپنی جگہ مکمل ہے گو وہ بقول آپ کے اس کا کلائمکس بدلنے والے تھے۔ مجتبیٰ حسین کا مضمون "دیوے گوڑہ۔ بال ٹھاکرے۔ بات چیت" دلچسپ اور طنز سے بھرپور ہے۔ سید طالب حسین زیدی کی تحریر "جان مناپے سے نوے پی ٹک" خاصے کی چیز ہے۔ ڈاکٹر معز عابد کا پیشگی خطبہ صدارت دلچسپی کا حامل ہے۔ پرویز مہدی کا مستقل سلسلہ "یہ ہے بابے میری جان" حسبِ معمول اچھا ہے۔ حصہ نظم میں ڈاکٹر مجوب راہی کی غزل نما نظم "بے چارے نرسمہا راؤ" نے بے حد متاثر کیا۔ سپٹمبر کا "شگوفہ" دلیپ سنگھ نمبر تھا آپ نے بہت کم وقت میں ان پر ایک مکمل اور حوالے کا نمبر شائع کر دیا اس کے لیے مبارکباد۔ فقط

رشید الدین، حیدرآباد

■ آداب و نیاز

نومبر کا شمارہ ملا۔ تمام مشمولات "شگوفہ" کی سابق روایت کے مطابق معیاری اور کارآمد ہیں۔

آپ کا اداریہ پڑھ کر افسوس ہوا کہ ممتاز بزرگ مزاحیہ شاعر اسمٰعیل ظریف اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ خدا ان کو غریقِ رحمت کرے۔ آمین۔

آپ کے اداریہ کا یہ جملہ دل میں اتر گیا ہمارا ملک سیاسی سماجی اور معاشی بدعنوانیوں کی گرفت میں ہے۔ جو ہماری تہذیب کو پامال کئے دے رہی ہیں۔

اس ضمن میں مجھے پاکستان کے مرحوم شاعر رئیس امروہوی صاحب کے قطعہ کا یہ شعر یاد آرہا ہے۔

فقط اردو کے ماتم سے نتیجہ
جو رونا ہے تو پاکستان کو رو

یہی شعر آج کے حالات کے پیش نظر ہندوستان کے لیے بھی قابلِ غور ہے۔ خیر۔ بقول

روشن جی کر لیجئے ہر مشکل آسان
خیر سے اب آزاد ہے اپنا ہندوستان

میری غزل میں تیسرا شعر غلط شائع ہوگیا بہرحال شعر یوں شائع فرمادیں نوازش ہوگی۔

بات سونی صدی کھری لیکن
آپ کے دل میں کھوٹ ہے صاحب

نیازمند روشن لال روشن نہاری

■ مکرمی ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال صاحب!

شگوفہ بابت ماہنامہ نومبر ۹۶ء شرف افروز ہوا۔ کلام سب ہی شاعروں کا بہت اچھا لگا، "مالِ مفت" میں مجتبیٰ حسین صاحب، ڈاکٹر بانو سرتاج اور ڈاکٹر محمد یونس صاحب کی تحریریں بہت پسند آئیں۔ اس شمارے کی جو چیز سب سے زیادہ پسند آئی وہ گوشۂ مضطر مجاز ہے لیکن صاحب اگر آپ برا نہ مانیں تو عرض ہے کہ یہ گوشہ مختصر اور تشنہ ہے۔ تاہم نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر کے مصداق یہ بھی بسا غنیمت ہے۔ مخلص

اثر بدایونی

■ شگوفہ کی بلا ناغہ اشاعت کو دیکھ کر ادبی دنیا کے بڑے بڑے دعوے دار مدیر حیرت میں پڑ گئے ہیں خدا آپ کے حوصلوں کو مزید قوت عطا کرے آمین شگوفہ کا دلیپ سنگھ نمبر دلیپ سنگھ سے آپ کی محبت کا کھلا ثبوت ہے۔ آنجہانی دلیپ سنگھ کی کمی اردو ادب میں برسوں محسوس کی جاتی رہے گی۔

منظور وقار، گلبرگہ

■ مکرمی ایڈیٹر صاحب

تسلیمات! اس ماہ کا شگوفہ پڑھنے میں آیا۔ میں ہمیشہ اس کو

چیپڑی غلاظت کے بورئیے سَمَٹ رئیے (سمیٹ رہی ہے) تاویذ (تعویذ) گنڈے کراکو، پلیتے (فلیتے) جلاکوسو رازاں مالوم کر کے بیٹے کے سرمیں زہر بھر کو ہم ماں بیٹیوں کا دشمن بنا رئیے۔ غارت ہو جاؤ۔ دشمن لو آتی سو دو نرلا ماں بیٹوں لو آؤ ....

ہم "ہنومان" اپنی خیر مناتے ہوئے سرپر "پاؤں" رکھ کر وہاں سے بھاگ نکلے۔ آخر ہوئی نا وہی جو ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے۔ "برق گرتی ہے تو سدا بے چارے معصوم سمدھنوں ہی پر" ....

اس کہانی کو سُن کر محفل میں جنھوں نے بغیر "تاویذ گنڈوں" کے سراغ پالیا تھا وہ تو قہقہہ بردوش ہو گئے تھے، مگر چند ایسے بھی تھے جو اڑوس پڑوس سے "راز کی بات" کرید کرید کر معلوم کر کے خود بھی ہنسی میں شامل ہونے کی کوشش میں مصروف تھے..

اپنی باری ختم کر کے ہم نے سندھی انجینئر سنت رام داس منگھنانی سے کہا، سائیں! اب تم بھی کوئی گل کھلاؤ۔ وہ گویا مجسم پشاور کا "بازار قصہ خوانی" ایک Instant قصے لطیفے تصنیف کرنے والا وہاں کس بات کی دیر تھی، اگر کبھی ذیزیڈ کور پشاور کے نیم لفٹنان (Lieutenant) بذلہ سنج اس کو ایک بار بھی سُن لیے ہوتے تو بیکتے کھائے بغیر ہی "ناچز" ہو جاتے ....

فوراً شروع ہو گیا بولا، وڈی، لو سنو! ایک مرتبہ "اپوا" ٹائپ (آل پاکستان ویمنس اسوسی ایشن) عورتوں نے میٹنگ بلائی کہ ساری مصیبت ہم ہی بھوگتی ہیں اور "وہ" ہمیشہ گلچھرے اڑاتے پھرتے ہیں گھر کا سارا کام نبٹانا، ہانڈی چولہا چکی، بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال یہ ساری مشقتیں ہمارے سر اور صاحب بہادر سارا دن دفتروں، دکانوں میں عیش اڑا کر بھی جب گھر آتے ہیں تو ناک بھوں چڑھا کر ہمارے ہر کام میں، مین میکھ ہی نکالتے ہیں اگر ایک دن ان کاموں سے واسطہ پڑ جائے تو مسٹر کو دن میں تارے نظر آنے لگیں۔ اس مصیبت سے چھٹکارے کا کوئی اُپائے سوچنا چاہیئے۔ انجمن کی سکریٹری نے کہا، یہ مرد ہماری کیوں سُننے لگا؟ حاکم ہے تو وہ مرد ہے، جج ہے تو وہ مرد ہے، وکیل ہے تو وہ مرد ہے، کس سے محرومئ قسمت کی شکایت کیجیے"؟ ان کے علاوہ ایک خدا بھی تو ہے۔ صدر صاحبہ نے کہا.... چلو چل کر اسی سے اپنی بپتا بیان کرتے ہیں، سبھوں نے سر جوڑ کر یہ طے کیا کہ اللہ میاں سے اس ناانصافی اور ظلم کی شکایت کرنی چاہیے کہ آدم کے بیٹوں پر تو یہ کرم فرمائیاں اور حوّا کی بیٹیوں پر سدا برق پاشیاں، کیوں؟ ..... قرارداد پاس ہو جانے کے بعد تمام شکایتوں کی ایک فہرست مرتب کی گئی اور صدر انجمن کی قیادت میں ایک وفد درخواست لے کر بارگاہِ خدا وندی میں پہنچا اور عرض گزرانی کہ جو کام ہمارے ذمے کئے گئے تھے ان کو ہم ازل سے اب تک بحسن و خوبی انجام دیتی آئی ہیں مگر اب یہ سب ہم سے برداشت نہیں ہوتا اس لیے اے قادرِ مطلق! وہ سارے کام ذائقہ بدلنے کے لیے مردوں کے حوالے کر دیئے جائیں اور ان کے کاموں کی ذمہ داری ہم کو سونپ دی جائے اس طرح میاں جی کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا...

ندا آئی! ہماری مصلحتوں کو ہم ہی بہتر جانتے ہیں، جو کچھ ہم نے کیا یہی عین انصاف ہے، اور فطرت کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ تم گھر سنبھالو اور مرد باہر محنت کریں، کمائیں اور دنیا کے کاروبار چلائیں..... مگر وہ جو تریاہٹ مشہور ہے "اپوا" والوں نے نہیں مانا اور ضد کے ساتھ التجا کی کہ اے منصفِ حقیقی! ہم آج تجھ سے اپنی بات منوا کر ہی

◆ اس وقت تک میجر بن چکے تھے

یہاں سے جائیں گی۔ ہم کو اس دن رات کے مستقل عذاب سے نجات دِلا . . . اللہ میاں نے بہت سمجھایا مگر عورتیں اپنی ہٹ سے باز نہ آئیں (اگر عورت ہٹ سے باز آنے والی ہوتی تو جنت ہی سے کیوں نکلتی اور نکالی) آخر فیصلہ ہوا اچھا! تمہاری تمام شکایتیں تو ہم نے سن لیں اب تجربے کے طور پر تم ان میں سے کسی ایک ایسی شکایت کا انتخاب کرلو جس سے فوری طور نجات چاہتی ہو ہم صرف ایک ہی کا ازالہ کریں گے اور اگر اس پر تم راضی ہو گئیں تو دوسری شکایتوں پر بھی غور کیا جائے گا۔ صدر نے کہا چلو فی الوقت ایک ہی سہی، لو لو سب سے اول کس مصیبت سے نجات حاصل کریں؟ پھر سے "جھنڈے" گڑ گئے اور طے ہوا بچے کی ولادت کے وقت جو جان لیوا تکلیف ہم سہتی ہیں اس کو ٹالا جائے، لیکن، مامتا کا تقاضہ یہ ہے کہ بچہ تو ہم ہی تولد کریں گی صرف "دردِ زہ" دوسری پارٹی کو منتقل کر دیا جائے۔ ہم کو کسی تکلیف کا احساس تک نہ ہو اور آرام سے اپنا فرض پورا کریں ——— پھر ندا آئی کم عقلو! ہماری مصلحت میں دخل دے کر خود اپنے پیروں پر کلہاڑا چلا رہی ہو، اب بھی وقت ہے مان جاؤ اور اس دنیا کے کارخانے کو جس طرح چل رہا ہے اسی طرح چلنے دو . . . . عورتیں مچل گئیں اور عرض کیا، پروردگار! تو نے ابھی ایک مصیبت سے ہم کو چھٹکارا دلانے کا وعدہ کیا تھا ہم نے بھی اپنی ایک مصیبت بیان کر دی۔ اے وعدہ پورا فرمانے والے! اپنا وعدہ پورا کر۔ فرمایا، اچھا منظور ہے۔ جاؤ جیسے تم چاہتی ہو ویسا ہی ہوگا۔

اپنی اس شاندار کامیابی سے شاداں و فرحاں وفد واپس ہوا اور عورتوں میں اس نوید کا ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ ایک اذیت ناک تکلیف سے نجات مل گئی۔ اب مردوں کو پتہ چلے گا کہ عورتیں کس قیامت سے گزارا کرتی تھیں؟ دیکھیں! اس معجزے کا ظہور ہوگا کیوں کر۔؟ ان ہی دنوں خود صدر صاحبہ امید سے تھیں ان کے پیر بھاری تھے، تمام ممبروں نے کہا ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے؟ تجربے اور ثبوت کے لیے اب آپ ہی جو سامنے ہیں . . . .

جب دن پورے ہو گئے اور نرسنگ ہوم میں داخل ہو گئیں۔ اور ڈاکٹر نے بتایا کہ بس تھوڑا سا وقت رہ گیا ہے۔ پچیس تیس منٹ کی بات ہے۔ میڈم نہایت اطمینان اور آرام سے ہنستی مسکراتی ہوئی باتیں کر رہی تھیں چہرے پر کسی تکلیف اور درد کا نشان تک نہ تھا۔ خواتین کو اطمینان ہو گیا کہ خدا نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ جذبۂ تشکر سے سرشار ہو کر آسمان کی طرف دیکھا اور "Thanks God" کہہ کر بولیں چلو اب چل کر دیکھتے ہیں کہ صاحب بہادر کس حال میں ہیں؟ دوڑی دوڑی آفس پہنچیں اس یقین کے ساتھ کہ وہ درد کی تکلیف سے دوچار تڑپ رہے ہوں گے۔ مگر . . . . . وہاں کا نقشہ دوسرا نکلا وہ تو اپنے اجلاس پر نہایت آرام سے بیٹھے ہوئے فائیلوں کا معائنہ اور دستخط کر رہے ہیں اور ان کی کسی حرکت سے رتی برابر بھی کسی اندرونی تکلیف کا اظہار نہیں ہوتا ——— خواتین کو بے حد تعجب ہوا How strange یہ کیا بات ہے؟ اللہ میاں سے قرار داد تو یہ ہوئی تھی کہ دردِ زہ کی تکلیف میں بچے کا باپ مبتلا کیا جائے گا . . . . مگر یہاں کا معاملہ تو خیریت خیر سلا کا سا نظر آ رہا ہے ہو نہ ہو یہ کسی درمیانی کلرک فرشتے کی بھول چوک اور فرائض کی ادائی میں کوتاہی کا نتیجہ ہے چلو ہمیں کیا؟ وہ آپ بھگتے گا ہمارے تو پو بارہ ہو گئے۔ اسی حیرانی کے عالم میں واپس ہوتے ہوئے آفس کے باہر پارک کی ہوئی صاحب کی کار کے قریب سے جب وہ گزرنے لگیں تو بھلوں نے دیکھا، اور کیا دیکھا! . . .

صاحب کا شوفر دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ دبائے ماہیِ بے آب کی طرح کار کی سیٹ پر تڑپ رہا ہے

اور کسی نامعلوم شدید تکلیف کی وجہ سے اس کے منہ سے چیخیں نکل رہی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
میچند انی کی اس کہانی کا کلائمکس سن کر کلب کے سارے ممبر بے ساختہ ہنسنے اور قہقہے مارنے لگے مگر سوائے ایک کے وہ تھا ہمارے برابر میں بیٹھا ہوا گینڈا سنگھ ٹھیکیدار ، ہم نے اس کی طرف دیکھا نہ ان قہقہوں سے بے نیاز صورت پر "من موہن سنگھیت" طاری کئے ہوئے ہونقوں کی طرح سوالیہ نشان بنا (؟) ہر ایک کی صورت تکے جا رہے تھا ہم نے پوچھا ، سردار جی کی گل ہے ۔ کیا تسی یہ مخول سن کر کوئی فرق نہیں آیا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بولے ، سر جی ! پہلے یہ بتلاؤ ۔ منڈے (مجھکو) یہ گل سمجھ نہیں آئی کہ صاحب دا شوفر بے خامخواہ کیوں تڑپ رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

○ گزشتہ پانچ چھ برسوں سے ٹی وی کے ذریعہ سابق وزیر خزانہ جناب من موہن سنگھ سے ہماری بھی یاد اللہ رہی ہے مگر ہم نے انہیں ہنستا نہ دیکھا ، شدید ضرورت پڑی کبھی مسکراتے بھی نہیں دیکھا جب بھی دیکھا صورت پر بارہ بجے محروم ہی [illegible]

آشوبِ چشم کے بعد

خنجر تھی کٹاری تھی دلدار تیری آنکھیں
افسوس مگر اب ہے بیمار تیری آنکھیں

کل تک تیری آنکھوں میں تھی جھیل سی گہرائی
برسات کا نالہ ہے اب یار تیری آنکھیں

یہ سُرخ تیرے دیدے تمبو سی تری پلکیں
عشاق بھی کہتے ہیں پھٹکار تیری آنکھیں

آنکھوں کو لگا چشمہ یاد آگئی ہے نانی!
جس دن سے ہوئی مجھ سے دوچار تیری آنکھیں

جو گھورتی رہتی تھی ہر وقت حسینوں کو
اب ہوگئیں ہیں وہ بھی بے کار تیری آنکھیں

اشکوں کی جگہ موتی جن آنکھوں سے بہتے تھے
برساتی ہیں اب پانی اے یار تیری آنکھیں

کنگال کو تکتی ہیں دھنواں کو نہیں تکتی
سمجھو کہ ہے بھارت کی سرکار تیری آنکھیں

ان آنکھوں پہ اب کیسے اشعار کہے پاگل
لے جائیے دواخانہ بیمار تیری آنکھیں

پاگل عادل آبادی

غزل

جب سے تو مہربان ہے پیارے
بند اپنی دوکان ہے پیارے

وہ کرپشن ہٹا کے دم لیں گے
لیڈروں کا بیان ہے پیارے

اِس نئے رام راج میں دیکھو
چور پولیس سمان ہے پیارے

بول بالا ہے بم کا اور گن کا
تیر ہے نہ کمان ہے پیارے

بارہ بچے ہیں دو دو مائیں ہیں
مختصر خاندان ہے پیارے

بک چکا ہے جہیز تو کب کا
باقی اک پاندان ہے پیارے

چور جن میں پناہ لیتے ہیں
لیڈروں کا مکان ہے پیارے

بھونکتا ہے جو دیکھ کر تجھ کو
وہ ترا قدردان ہے پیارے

پک گئے بال کنپٹی کے مگر
سسرا پھر بھی جوان ہے پیارے

اُڑ گئی چھت بھی آر سی سی کی
کتنی ڈینجر یہ تان ہے پیارے

توڑ کر مجھ کو جس طرح چاہے
تیرے قبضے میں جان ہے پیارے

فلسفہ یہ عجیب ہے پاگل
چھوٹا بڑا جہان ہے پیارے

ڈاکٹر محمد یونس بٹ

نظر...یہ

صاحب ہمیں آج پتہ چلا کہ نظریے کا نظر سے بڑا تعلق ہے جیسے منیر نیازی صاحب کی کمزور نظر نے یہ نظریہ بھی تبدیل کر دیا کہ اقبال اور فیض اس صدی کے بڑے شاعر ہیں منیر نیازی صاحب نے فرمایا کہ انہیں اس صدی میں اردو میں کوئی بڑا شاعر نظر نہیں آتا تب سے ہم متفکر ہیں کیوں کہ آخری بار جب ہم منیر نیازی صاحب سے ملے تھے تب تو ماشاءاللہ ان کی نظر اتنی تیز تھی کہ انہیں ہماری جیب میں پڑا سو کا نوٹ بھی نظر آیا تھا۔ انہیں نظر کی عینک لگوانا چاہیئے مگر بہت سے شاعر صرف اسی ڈر سے عینک نہیں لگواتے کہ پھر انہیں اپنی بیوی نظر آنے لگے گی۔

منیر نیازی سیلف میڈ بندے ہیں اور خود کو بنانے والے کی عبادت کرتے ہیں۔ سنا ہے جب سے گوپی چند نارنگ نے کہا کہ انڈیا میں منیر نیازی کی پوجا ہوتی ہے تب سے وہ بہت خوش ہیں۔ ایک دفعہ ایک مانگنے والا نیازی صاحب کے ہاں آیا، انھوں نے کہا "پھر کسی وقت آنا" اس وقت گھر میں کوئی آدمی نہیں"۔ تو اس پر فقیر بلا جھجک بولا "تھوڑی دیر کے لیے آپ ہی آدمی بن جائیں"۔ وہ جس کے بارے میں کچھ کہنا چاہیں ایک فقرہ کہہ دیتے ہیں جس کے بارے میں کچھ نہ کہنا چاہیں اسے دیباچہ لکھ دیتے ہیں۔ انہیں کے لیے کسی نے کہا تھا اچھے دوست کی تلاش سے مشکل کام ایک ہی ہے اور وہ ہے اچھا دوست بننا۔ محبوب سے اس لیے پیار نہیں ہوتا کہ وہ اچھا ہوتا ہے وہ اس لیے اچھا ہوتا ہے کہ اس سے پیار ہوتا ہے۔ محبت اور شاعری میں وہ ہمیشہ پہلے نمبر پر رہے ہمیں یاد نہیں کہ وہ کبھی دوسرے نمبر پر آئے ہوں۔ جیسے ایک پروفیسر نے کہا "جارج واشنگٹن امریکہ کا پہلا صدر تھا، جنگ میں اس کا پہلا نمبر تھا۔ قیام امن کے سلسلہ میں بھی وہ پہلے نمبر پر تھا۔ عوام میں مقبولیت کے لحاظ سے بھی پہلے نمبر پر تھا"۔ اس پہ دوسرا پروفیسر بولا "آپ درست کہہ رہے ہیں لیکن شاید یہ بھول گئے ہیں کہ اس نے ایک بیوہ سے شادی کی تھی"۔ نیازی صاحب مشاعرے یوں لوٹتے ہیں جیسے رکن اسمبلی قوم کا خزانہ۔ مشاعروں میں وہ دوسرے شاعروں کو یوں دیکھتے ہیں جیسے نصرت فتح علیخاں اپنے سازندوں کو۔ دوسرے سینئر شعراء کو اگر یہ خود سے بڑا کہیں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ انہیں خود سے عمر میں بڑا کہہ رہے ہیں فیض احمد فیض کی موت پہ کسی نے پوچھا "فیض صاحب کی موت سے ادب میں جو خلاء پیدا ہوا ہے اسے پر کرنے کے لیے

آپ کس کا نام پیش کریں گے؟" انھوں نے کہا "یہ بات میرے سوچنے کی نہیں آپ لوگوں کے سوچنے کی ہے اب تو اکثر شعراء کے زندہ رہنے سے ہی ادب میں خلا پیدا ہو رہا ہے۔"

پہلے خاص لوگ لکھتے اور عام لوگ پڑھتے تھے اب تو عام لوگ لکھتے ہیں اور خاص لوگ ہی پڑھتے ہیں۔ ویسے تو دوسرے کی شاعری اور بیوی صرف اس لیے ہوتی ہے کہ اسے ایک نظر دیکھا جائے اور تعریف کی جائے لیکن منیر نیازی کو خراجِ تحسین کو اخراجِ تحسین سمجھتے ہیں۔ اپنے ایک تازہ ترین انٹرویو میں انہوں نے فراز کو بھی نشیب کر دیا ہے۔ قتیل شفائی کے بارے میں انہوں نے کہا ہے کہ فلمی شاعری میں کوئی اچھی لائن نکال لیتا ہے۔ قتیل کو سب فلمی شاعر مانتے ہیں جو نہیں مانتا وہ خود فلمی شاعر ہوگا۔ ریمانڈ چینڈلر نے کہا تھا اگر میری کتابیں بہت بری ہوتیں تو مجھے ہالی ووڈ والے کیوں بلاتے اگر بہت اچھی ہوتیں تو میں وہاں کیوں جاتا۔ کراچی کے بارے میں بھی منیر نیازی صاحب نے کہا ہے کہ وہاں کوئی سرے سے شاعر ہی نہیں۔ کراچی میں آج کل چھٹی سے مراد یہ ہے کہ آج ہڑتال کی چھٹی ہے۔ وہاں کے لوگ یوں حیرت اور خوف زدہ پھرتے ہیں جیسے انھوں نے منیر نیازی کا کلام پڑھ رکھا ہو۔ ایسی فضا میں شر اور شعر ہی پروان چڑھ سکتا ہے۔ ویسے تو شروع ہی سے کراچی کا موسم ایسا رہا ہے کہ وہاں تاجر اور مہاجر کے علاوہ اگر کوئی زندہ رہ سکتا ہے تو وہ شاعر ہے وہ بھی اس صورت کہ اپنا کلام نہ پڑھے۔ وہاں تو کسی کمزور شخص کو دیکھ کر یہی لگتا ہے یا تو یہ بیمار ہے یا شاعر۔ کراچی کے لوگ بحث بھی کر رہے ہوں تو لگتا ہے شاعری کر رہے ہیں، لاہوری شاعری بھی کر رہے ہوں تو لگتا ہے بحث کر رہے ہیں۔ نیازی صاحب کو پوری صدی اور کراچی میں کوئی شاعر نظر نہیں آتا اس سے ہمیں یقین آتا ہے کہ ان کی نظر واقعی خراب ہے اور نظر خراب ہونے میں برائی یہ ہے کہ بندہ جس پر بھی ڈالتا ہے "خراب نظر ہی ڈالتا ہے"۔

▭▭

دلشاد رضوی
(حیدرآباد)

چھینک بن گئی بھوت

عرصہ ہوا ہم نے ایک دن جب صبح صبح اخبار کھولا تو اس میں ایک انتہائی معلومات آفریں مراسلہ دیکھا۔ مراسلے میں ایسے ایسے انکشافات تھے کہ ہماری تو آنکھیں ہی پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ہم نے سوچا کہ اتنی کام کی باتیں مراسلے میں لکھی ہوں اور ہمارے دوست احباب رشتے دار وہی خواہ غرض تمام کے تمام ان سے لاعلم رہ کر نہ تو فائدہ حاصل کریں نا ہی آفات و بلیات سے محفوظ رہنے کی تدابیر کر پائیں۔ انسان تو وہ ہے جو نیوٹن کی طرح کچھ ایسا پائیدار کام کرے جس سے بنی نوع انسان کو رہتی دنیا تک فائدہ پہنچے۔ اگر کر سکنے پر بھی ہم نے کچھ بڑا کام نہ کیا تو لعنت ہے ایسے جینے پر۔ چناں چہ ہم نے فوٹو اس کے ایک ہزار پمفلٹ چھپوائے۔ گلی کے چار لونڈوں کو جمع کیا۔ ہر ایک کو محض ثواب جاریہ کی خاطر نقد پانچ پانچ روپے دیے اور سخت تاکید کی کہ وہ پمفلٹ اپنے اور پرایوں میں تقسیم کر دیں کچھ ہم نے بھی رکھ لیے تاکہ سند رہیں اور بوقت ضرورت کام آئیں۔

ظاہر ہے کہ اس کار خیر کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ عوام الناس کی ایسی کچھ خدمت ہو جو آج کل بڑے بڑے لیڈر بھی نہیں کر پاتے۔ مراسلے میں صاف اور صریح الفاظ میں لکھا تھا کہ اگر منگل کو شمال سے چھینک کی آواز آئے تو آدمی راتوں رات کروڑپتی بن جائے اور اگر خدانخواستہ چہارشنبہ کو جنوب سے چھینک سنائی دے تو عنقریب موت کو یقینی سمجھے۔ اب بھلا ہمیں کیا پڑی تھی کہ ہم چہارشنبہ کا انتظار کرتے ہم نے فوراً ایک عدد قطب نما خریدا احتیاطاً سری امسال نامی کی ڈبیا بھی خرید لی اور بے چینی سے منگل کا انتظار کرنے لگے کہ اب منگل آئے تو شمال سے کوئی چھینکے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہمارا سارا افلاس دور ہو جائے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ پروگرام میں اسی دن ایک عدد بنگلے اور ماروتی کار کی خریدی بھی شامل کر لی۔ پہلی منگل کی رات تو ایسی کٹی جیسی ہجر کی رات کٹتی ہے۔ جیسے ہی دن نکلا ہم سیدھے سڑک پر نکل گئے۔ جیب سے قطب نما نکالا دیکھا تو سامنے ایک فقیر کھڑا تھا۔ ہمیں نہ تو فقیر کی فقیری سے کام تھا نہ ہی کسی بادشاہ کی بادشاہ

سے ہم تو بس ایک چھینک کے محتاج تھے۔ قطب نما کی مدد سے ایسے کھڑے ہو گئے کہ فقیر بالکل ہمارے شمال میں آ جائے۔ اس غریب نے سمجھا کہ ہم اسے کچھ خیر خیرات کرنے آئے ہیں ٹکٹکی باندھ کر ہمیں گھورنے لگا۔ وہ بھلا کیا جانتا تھا کہ ہم تو اس کی چھینک کی بھیک مانگنے کھڑے تھے۔ اب عالم یہ تھا کہ دونوں ایک دوسرے کو گھورے جا رہے تھے کہ کون کار خیر میں پہل کرتا ہے۔ ہم نے بہت انتظار کیا لیکن جب اس کی چھینک کے کوئی آثار نہیں دیکھے تو پہلے تو اس کی نظر بچا کر آہستہ سے پیر سے گرد اڑائی کہ گرد و غبار کی بدولت ہی اسے چھینک آ جائے لیکن جب دیکھا کہ اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تو جیب ہی میں ناس کی ڈبیا کھولی اور چٹکی بھر ہوا میں بکھیر دی۔ صد افسوس کہ اس سخت جان فقیر پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا الٹے ہمارا ہی چھینکتے چھینکتے برا حال ہو گیا لیکن ہم نے ہمت نہیں ہاری اور ہر منگل کو اپنا یہی معمول بنا لیا۔ ایسے ہی کئی منگل گزر گئے یہ کیا مجال کہ کوئی شمال کی جانب سے چھینکا ہو۔ ویسے ہم بہت محتاط رہتے تھے کیونکہ اگر مخالف سمت سے کوئی بھلا مانس چھینک دیتا تو مذکورہ مراسلے کے بموجب ہم پر اس کے بڑے نحس اثرات مترتب ہو سکتے تھے۔ جب کئی منگل گزر گئے تب بات ہماری سمجھ میں آ گئی کہ ہنری فورڈ کی طرح کروڑپتی بن جانا ہر ایک کے مقدر میں نہیں۔ تب ہم نے منگل کا چکر ہی چھوڑ دیا۔

ایک صبح چہل قدمی کے بعد جب ہم گھر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے عزیز ترین دوست جنھیں ان کی جسامت کا لحاظ کر کے ہم سب پیار سے چنو میاں پکارتے تھے۔ ہمارے دیوان خانے میں بیٹھے ہیں۔ ہمیں ان کی معصوم صورت ابھی تک یاد ہے۔ ہائے کیا شگفتہ چہرہ تھا۔ گویا صورت پر رونق کے پھول برس رہے ہوں۔ بات ہی کچھ ایسی تھی کہ انھیں خیر سے باہر کا ویزا آیا تھا۔ اور وہ معقول تنخواہ پہ کل کی فلائیٹ سے جانے والے تھے۔ وداعی ملاقات کے لیے آئے تھے۔ دیکھتے ہی بغل گیر ہو گئے۔ ہائے کیا گرم جوشی تھی۔ چنو میاں نے ہم سے وعدے وعید لیے کہ ان کے غیاب میں ہم ان کے گھر کا نیز بیوی بچوں کا ضرور خیال رکھیں گے ہم کو بھی بھلا کہاں انکار تھا۔ لیکن باتوں باتوں میں چنو میاں نے یہ سنسنی خیز خبر سنائی کہ آج چہارشنبہ کو جب وہ ہمارے یہاں آ رہے تھے تب انھیں جنوب کی سمت سے چھینک کی آواز سنائی دی۔ یہ سنتے ہی ہمارے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ہائے یہ کیا ہو گیا۔ ہمارے دل کی حرکت بند ہونے لگی۔ ہم نے دل ہی دل میں کہا کہ چنو میاں اب تم بھلا کیسے جاؤ گے۔ کیونکر کاؤ گے اپنے پھول جیسے معصوم بچوں کو دوبارہ کیسے دیکھ پاؤ گے۔ ہائے جنوب سے چھینک بھی آج چہارشنبہ ہی کو ہونی تھی۔ لیکن منہ پر جیسے تالہ لگ گیا ہو۔ بولتے تو کیسے بولتے۔ باہر کا ویزا ہر ایرے غیرے کو تھوڑا ہی مل جاتا ہے۔ ہم قسم کھا کر بھی کہتے تو وہ یہی سمجھتے کہ ہم ان کے ویزا سے جل گئے تاہم دوستی دوستی ہے۔ دوست کی جان خطرے میں ہو اور ہم چپ چاپ سادھے رہیں۔ بھلا ایسے کیسے ہو سکتا تھا۔ بہت سوچ بچار کر ہم نے ایک عدد پمفلٹ آہستہ سے ان کی جیب میں ڈال دیا کہ شاید وہ پڑھ کر ہی اپنا ارادہ بدل دیں۔ لیکن دل ہی دل اندر رو رہا تھا کہ چنو میاں جیسا عزیز ترین دوست چہارشنبہ کو جنوب سے چھینک کی آواز سن کر بھی رخت سفر باندھ رہا تھا اور وہ بھی کیسے ہوائی جہاز جیسی خطرناک سواری کے ذریعے۔ سوچ سوچ کر بالآخر ہماری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ وہ غریب سمجھے تو یہ سمجھے کہ ہم ان کی اس عارضی جدائی کے تصور سے افسردہ

خاطر ہو رہے ہیں۔ بھلا وہ کیا جانتے تھے کہ اصل بات کیا تھی کیونکہ نہ تو انھیں خود مراسلے کی خبر تھی نہ ہی ہم نے انھیں بتلایا تھا۔ خیر ہم نے سمجھ لیا کہ اب آخری ملاقات ہے۔ دل کھول کر چنو میاں کی خاطر مدارات کی۔ بھلا چالا معاف کروالیا اور خود بھی دل و جان سے ان کے سارے خطا و قصور بخش دیئے۔ یہی نہیں ان کی مغفرت کے لیے بھی دعائیں کیں۔ کیونکہ ویسے بھی وہ بڑے نیک سیرت و نیک طینت آدمی تھے۔

بڑی دیر بعد با دیدۂ نم و با دلِ ناخواستہ انھیں وداع کیا۔ تاہم مارے غم کے رات بھر نیند نہیں آئی۔ صبح ان کی اڑان تھی۔ وہ جہاز میں سوار ہو گئے۔ اب ہمارے دل کو بھی صبر آگیا کیونکہ ہونی کو بھلا کون ٹال سکتا تھا لیکن وہی ہوا جس کا ہمیں یقین تھا۔ دوسرے دن جب اخبار کھولا تو پہلی خبر یہی تھی کہ ہوائی جہاز کے سامنے مسافر جب ہوائی جہاز سے اتر کر بس سے جا رہے تھے . . . . تو بس حادثے کا شکار ہو گئی اور سارے کے سارے مسافر جاں بحق ہو گئے۔ ہمیں تو خیر یقین ہی تھا کیونکہ ہم نے تو پہلے ہی مراسلہ پڑھ لیا تھا لیکن بھابی کا غم کھائے جا رہا تھا۔ کاش ہم انھیں مراسلے کی کاپی بتلا دیتے یا کم از کم چپکے سے کہہ ہی دیتے کہ بھابی دیکھو چنو میاں نے چہارشنبہ کو جنوب سے چھینک کی آواز سن لی ہے اب اپنے اور اپنے معصوم بچوں پر رحم کر کے چنو میاں کو روک لو لیکن افسوس کہ مقدر کا لکھا ٹالا نہیں جاتا ہم نے نہ مراسلہ بتلانا تھا نہ بتلایا۔ جب ہم مرحوم کے گھر گئے تو بھابی کا حال ہم سے دیکھا نہیں گیا۔ بچے الگ بلک بلک کر رو رہے تھے۔ گھر میں صفِ ماتم بچھی تھی۔ ہم اپنی سفاکی پر پشیمان تھے۔ ساری غلطی تو ہماری ہی تھی۔ اگر ذرا سی غفلت نہ برت کر مراسلہ کی کاپی بتلا دیتے تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ جی چاہتا تھا کہ دھاڑیں مار مار کر روئیں، جی بھر کر اپنے آپ کو کوسیں لیکن ایک خاتون کے سامنے یہ بھی ہم سے نہ ہو سکا۔ تیسرے دن فاتحہ سیوم تھی۔ لیکن ہمیں بریانی بھی زہر لگ رہی تھی۔ ہم اگر کوشش کرتے تو مراسلہ بتلا کر چنو میاں کی جان بچا سکتے تھے۔ لیکن پھر ہم نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر ڈھارس دی کہ جب کسی کا وقت آجاتا ہے تو ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ ہماری بھلا کہاں مجال تھی کہ چنو میاں کے آئے ہوئے وقت کو ٹال دیتے لیکن ضمیر تھا کہ برابر ملامت کرتا جا رہا تھا۔ ایسے میں دو دن اور گزر گئے۔ ملال تھا کہ کم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔ چھٹے دن صبح صبح کال بل کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ دروازہ کھولا تو ہوش اڑ گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ سفید دودھ جیسے کپڑے پہنے چنو میاں کی روح عین ہمارے سامنے کھڑی ہے۔ ہم نے بے اختیار چیخ ماری ــــ بھوت ــــ بھوت۔ اور اندر بھاگے۔ بیوی ہمیں دیکھ کر بوکھلا گئیں، پوچھیں کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ ہمارے منہ سے ایک ہی بات نکل رہی تھی بھوت ــــ بھوت۔ یہ کہتے ہوئے ہم نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ بیوی نے جیسے ہی دروازے کی طرف دیکھا، چیخ مار کر بے ہوش ہو گئیں۔ اب تو چنو میاں کی روح سٹپٹائی اور اس نے باآواز بلند ہمیں مخاطب کر کے خیریت پوچھی۔ ہو بہو زندہ انسانوں جیسی آواز سن کر ہم چونک پڑے۔ ہوش و حواس یکجا کر کے اور ہمت کر کے رکتے رکتے پوچھا۔ چُ۔ نو۔ میاں۔ تم کیسے آگئے۔

روح نے کہا کہ بھائی میں پاسپورٹ یہیں بھول گیا تھا۔ کچھ دن بمبئی میں گھوم پھر کر واپس آرہا ہوں۔

سہاگ سے ملتا ہوا گھر جاؤں لیکن تم اتنا گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔ اب ہر بات دھیرے دھیرے ہماری سمجھ میں آگئی۔ ہم نے دوڑ کر چنو میاں کو گلے سے بھینچ لیا۔ دوسرا کام یہ کیا کہ مذکورہ مراسلہ اور اس کی بچی کھچی ملاقا کا پہلا یک لخت جلا ڈالیں تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری — اس واقعے کو برسہا برس گزر گئے۔ چنو میاں گئے بھی اور خوب کما دھما کر واپس بھی آگئے لیکن آج بھی جب چنو میاں ملتے ہیں تو ہمیں چھینک والا بھوت ضرور یاد آجاتا ہے چھینک — ہائے چھینک ۔ ●●

ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم
(جگتیال اے پی)

چشمِ یاہو

بھارت میں وبائیں پھیلنا ایک عام بات ہوگئی ہے۔ جب بھی کوئی وبا پھوٹتی ہے تو تمام شہری دامے درمے سخنے تعاون کرتے ہیں اور اس کے فروغ میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ پلیگ کی وبا پھیلی تو سارا ملک پلیگ زدہ بن گیا تھا۔ اور بھارت کو ساری دنیا میں ایک ممتاز مقام عطا ہوا۔ فسادات پھوٹتے ہیں۔ گھر بلوہ جلائے جاتے ہیں تو پورے دیش میں دیوالی کا سا سماں دکھائی دینے لگتا ہے۔ اسکینڈلوں کی وبا پھیلی تو دیش کی ہر ریاست سے نت نئے اور اچھے اسکینڈل منظرِ عام پر آنے لگے اور لوگوں کی حیران کن معلومات میں اضافہ ہوا گویا ہم جو بھی کام (اچھے سے زیادہ برے) کرتے ہیں تو مل جل کر کرتے ہیں۔ تبھی تو یہ دیش قومی ایکتا کی زندہ مثال بن گیا ہے۔

گزشتہ دنوں حیدرآباد میں آشوبِ چشم کی وبا پھیلی تو دیکھتے ہی دیکھتے ساری ریاست میں رنگین چشموں کا ایک دریا ابل پڑا۔ سینکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد اس نعمتِ غیر مترقبہ سے مستفید ہونے لگے لیکن حیدرآبادیوں کو یہ احساس شدت سے ستانے لگا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس نعمت سے ہم ہی مستفید ہو رہے ہوں۔ کہیں ہم دوسرے شہریوں کی حق تلفی تو نہیں کر رہے ہیں؟ ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے یہ یقین دہانی کرائی کہ یہ وبا نہ صرف آندھرا پردیش میں بلکہ پورے دیش میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس یقین دہانی پہ حیدرآبادی مطمئن ہوئے اور آشوبِ چشم کو قومی پالیسی کا ایک حصہ جان کر اس کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

آشوبِ چشم کے لیے ہم نے "چشمِ یاہو" کی اصطلاح وضع کی ہے گو کہ یہ نئی اصطلاح بنیاد پرستوں (مذہب کے نہیں) کو ناگوار گزرے گی اور وہ اس سلسلے میں طوطا چشم بن جائیں گے۔ نہ صرف آنکھیں دکھائیں گے بلکہ آنکھیں لڑائیں گے اور اس اصطلاح کی وہ درگت بنائیں گے کہ بے چاری آنکھ اٹھانے کے لائق نہیں رہے گی ایسے یہ دو متبادل یا مترادف کا الجھم

کسی کو کوئی چیز پسند نہ ہو تو اس کا متبادل پیش کیجیے۔ وہ فوری قبول کرے گا۔ تبھی لوگ آشوبِ چشم کو بخوشی بخوبی رغبت سے قبول نہیں کرتے کیوں کہ اس اصطلاح میں کراہت، حماقت اور خوف کا پہلو پوشیدہ ہے

اس کے برخلاف چشم یا ہو میں ادبیت ہے، موسیقیت ہے اور متانت و نزاکت ہے۔ انقلاب، جوش اور خوشی کی کیفیت ہے۔ اس لیے لوگ چشم یا ہو کو نہ صرف قبول کریں گے بلکہ چشم پوشی کا مظاہرہ کریں گے۔

ہمارے ادبا و شعراء دراصل اس قدر قدامت پرست ہیں کہ وہ کسی بھی تبدیلی کو گوارا نہیں کرتے۔ برسوں پہلے انھوں نے ایک اصطلاح "چشم آہو" وضع کی اور اسی کو سجدہ کرتے گئے۔ بھئی اگر آپ کی محبوبہ کی آنکھیں نہایت خوب صورت ہیں تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ان آنکھوں کا جانوروں کی آنکھوں سے مقابلہ کریں۔ اس قسم کا تقابل انسانوں اور جانوروں کے پرسنل لا میں راست مداخلت متصور کیا جائے گا۔ ایسا بھی ہرگز نہیں ہے کہ اردو کا دامن تنگ ہے۔ چشم آہو سے پہلے کرچشم بے آب، چشم پرنم، چشم بلبل، چشم بیمار جیسی کئی ایک چشم ہیں جن کو وقت ضرورت استعمال کیا جا سکتا تھا مگر ان لوگوں نے صرف چشم آہو کو ہی مشق سخن کا ذریعہ بنایا۔

چشم آہو ہر ایک کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے مکمل وحشی ترین ہونا پڑے گا۔ چوکڑیاں بھرنے کے فن سے واقفیت لازمی ہے۔ ڈر و خوف کی فضا میں سانس لینا ضروری ہے کیوں کہ اس سے آنکھوں کی دوشیزگی نکھر کر سامنے آتی ہے پھر ان کم بخت آنکھوں نے کبھی کوئی نیک کام کیا ہے! اچھے لوگ ان آنکھوں میں ڈوب جاتے ہیں اور نکمے بن جاتے ہیں۔ رقیبوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔ نتیجے کے طور پر دنگا و فساد ہونے لگتے ہیں اور امن و امان کو شدید خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ ان آنکھوں کی وجہ سے پینے پلانے کی روایات تازہ دم ہو جاتی ہیں۔ بے ایمانیاں اور دھاندلیاں ان آنکھوں کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ اگر کسی وجہ سے ایک آنکھ خراب ہو جائے تو آنکھ کی تبدیلی مسئلہ بن جائے گی اور مجبوراً اپنے جوڑ آنکھ کے ساتھ نباہ کرنا پڑے گا۔

چشم آہو کے برخلاف چشم یا ہو میں اللہ نے کیسی کیسی خوبیاں پوشیدہ رکھی ہیں۔ یہ جہاں جاتی ہیں ان کے ساتھ ایک زمانہ جاتا ہے۔ ان کے لیے کوئی جھگڑا، کوئی فساد نہیں ہوتا۔ ان آنکھوں کی بدولت ہندو مسلم سکھ عیسائی سب آپس میں بھائی بھائی کی طرح نظر آتے ہیں۔ یہ آنکھیں انسان کو شرافت، متانت اور وقار بخشتی ہیں۔

"چشم آہو کا یہ روپ زندگی بھر نہیں رہتا۔ انسان چونکہ یکسانیت سے اکتا جاتا ہے اس لیے چشم یا ہو موڈ بدلنے بلکہ خوش گوار بنانے میں بہترین رول نبھاتی ہیں۔ ان آنکھوں کی بدولت رنگین چشموں کی فروخت بڑھ جاتی ہے چشمہ سازی کی صنعت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ جنٹا مائی سن جیسی دواؤں کو پر لگ جاتے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونے لگتی ہیں۔ ڈاکٹروں کی ڈاکٹری چمک اٹھتی ہے۔ آج جب کہ بے روزگاری آسمان کو چھو رہی ہے وہیں چشم یا ہو کی وجہ سے ہزاروں لوگوں کو روزگار نصیب ہوتا ہے۔

کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو چشم یا ہو سے سرفراز ہوتے ہیں۔ آنکھوں کا ابھرا پن چہرے کو پر وقار بنا دیتا ہے (چال چلن بھی) میں ایک بانکپن آجاتا ہے۔ آداب و نشست میں کچھ ایسی متانت آجاتی

ہے کہ انشاءاللہ ـــــ کوئی ایسا شخص نہیں ملے گا جو ان سے آنکھیں ملا سکے یا لڑا سکے۔ ہر کوئی ادب و احترام کے ساتھ آپ سے دو چار گز دور کھڑا رہے گا۔ اس کی وجہ سے آرام ہی آرام نصیب ہوتا ہے۔ آفس میں آن ڈیوٹی رخصت دی جائے گی اور گھر (جو آرام کی ضد ہے) جنت کا نمونہ لگنے لگے گا۔ نہ بیوی تنگ کرے گی نہ بچے آئس کریم کے لیے شور شرابہ کریں گے۔ چشم یا ہو خصوصاً ایسے شوہروں کے لیے حوصلے کا باعث بنے گی جو زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ اپنی بیوی پر رعب جمانے کی حسرت رکھتے ہوں۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کی بیوی چپ چاپ سر جھکائے دور کھڑی ہوگی۔ آپ جو چاہیں حکم دیں۔ خوشی تعمیل کردی جائے گی۔ اگر آپ چشمہ نکال کر آنکھیں دکھائیں تو وہ سہم جائے یا لرز جائے گی اور اپنی غلطیوں کی معافی کی درخواست کرے گی۔ حتیٰ کہ مہر بھی معاف کردے گی۔ بچوں کو یہ آنکھیں بہت مرغوب ہیں کیونکہ انھیں آسانی سے ایک ہفتہ کی چھٹی مل سکتی ہے۔ کچھ لوگ جو اس نایاب دولت سے محروم ہیں وہ چشم یا ہو کے سامنے سر جھکا کر اور منہ چھپا کر اس تیزی سے گزر جاتے ہیں جیسے وہ نہایت پسماندہ اور پچھڑے ہوئے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹروں نے ایسے افراد کے لیے یہ تجویز رکھی کہ وہ بھی جنتا مائی سن قسم کی دوائیں استعمال کریں تاکہ وہ احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوں۔ حاصل مطالعہ یہی ہے کہ قدرت نے چشم یا ہو میں ایسی ایسی خوبیاں اور اعلیٰ صفات بھری ہیں کہ اگر ان تمام باتوں سے آگہی ہو جائے تو ہر کوئی اسی کی تمنا کرے گا۔

جس طرح ہر قوم میں ایک سے زائد گروہ قوم کی تعمیر و تخریب میں مصروف رہتے ہیں۔ اسی طرح شاعروں میں بھی ایسا گروہ موجود ہے جس نے شعوری و لاشعوری طور پر چشم یا ہو کو مشق سخن کا ذریعہ بنایا ہے۔ میر و سودا سے لے کر تا حال شاعری کا ہر قسم کا جائزہ (بشمول ساختیاتی و پس ساختیاتی وغیرہ) لیا جائے تو یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ چشم یا ہو کو چشم آہو سے بہتر طور پر برتا گیا ہے۔ سودا جاہ و حشمت کے شاعر تھے اور چشم یا ہو کے قائل تھے۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو جو چشم یا ہو کی جملہ کیفیات کا احاطہ کرتا ہے۔

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

اس کے علاوہ میر چشم یا ہو کی سرخی، شوخی اور کیف و مستی سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں؛

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

غالب کے تعلق سے کیا کہا جائے وہ ہر وہ چیز قبول کر لیتے تھے جو مفت میں ملتی ہو۔ ایسے میں وہ چشم یا ہو سے بے پروا کیسے ہو سکتے تھے۔ چشم یا ہو کے تعلق سے کہتے ہیں؛

مجھے ہے جلوہ گل ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر حال میں وا ہو جانا

الغرض شاعر و ادبا کا ایک خاص طبقہ ایسا ہے، جو چشم یا ہو کا قائل ہے۔ ریسرچ اسکالرز کے لیے یہ ایک بہترین موضوع ہے جس پہ مقالے لکھ کر یا لکھوا کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس کے باوجود اگر ہمارے کچھ تنگ نظر اور کوتاہ بیں شعرا و ادبا چشم یا ہو کے لیے اپنے ذوق کی کھڑکیاں و دروازے بند رکھیں گے تو جی چاہے گا کہ ہم اپنی آنکھیں پھوڑ لیں اور زار زار رو کر آنسوؤں سے منہ ہاتھ پیر دھو لیں تاکہ ان لوگوں کی آنکھیں کھل جائیں۔ ●

محمد عظیم الدین
(گلبرگہ)

ترے ہاتھ میں مرا ہاتھ ہو

ادھر کچھ دن ہوئے ہم مرزا سے کچھ یوں چھپتے پھر رہے تھے جیسے کہ ہم ان کے قرضدار ہوں۔ لیکن برخلاف اس کے ان کی ملاقاتوں کی نوازشیں تو ہم پر سمندر کی موجوں کی طرح مسلسل امڈی ہی چلی آرہی تھیں۔ جبکہ ہمارے نزدیک ان کی حیثیت محض ایک شناسائی کی سی تھی۔ اب یہ بات اور ہے کہ ہم نے انھیں کرایہ کا ایک عدد مکان دلوا دیا۔ بس یہی ایک غلطی ہم سے ہوئی جس کی وجہ سے ہم کافی دنوں تک خواہ مخواہ کھسیانے و خجل بھی رہے۔

مرزا کی ملاقات سے پہلے ہم نے مصافحہ کی دنیا کو اس قدر قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ ہمیشہ کسی نہ کسی خاص شخص سے ملاقات کرنے اور کرانے کا ان پر ایک خبط سا سوار تھا۔ یہ خدا ہمیں ان مصافحوں سے کوئی اعتراض یا چڑ نہیں جو صرف مصافحے ہی ہوا کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں اور ہاں وہ باتصویر مصافحے بھی ہمیں بڑے بھلے لگتے ہیں جو کہ آئے دن اخباروں یا رسائل میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ آپ سبھی نے ٹیلی ویژن پر بھی دیکھا ہوگا کہ جب کسی دو مختلف ملکوں کے سربراہ آپس میں ملاقات کرتے ہیں تو ان کے چہروں پر کیسی بھلی اور دلفریب مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے اور ان کا مصافحہ بھی کس قدر جامع اور طویل ہوتا ہے لیکن خاص کر وہ منظر بڑا ہی دلچسپ دکھائی دیتا ہے جب کسی ملک کا سربراہ اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجائے ایک باوقار انداز سے ہوائی جہاز کی سیڑھیوں پر اپنے پیر رکھتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور بعض سربراہ تو مسکراتے ہوئے اتنی تیز رفتاری سے جہاز کی سیڑھیاں پھلانگنے لگتے ہیں کہ ان کا بس چلے تو ساری سیڑھیوں کو یکلخت پھاند کر سیدھے نیچے ہی کود پڑیں۔ یہاں پر ہمارا ارادہ کہیں بھی سربراہ مملکت کی مسکراہٹ یا استقبالیہ پر تنقید کرنا نہیں ہے بلکہ ہم یہ بات واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ مسکراہٹ اور مصافحہ ان دونوں کا ہمیشہ سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور ہاں اگر کسی کو رنجیدہ یا کبیدہ خاطر کرنا ہی مقصود ہو تو سپاٹ چہرے کے ساتھ ایک عدد مصافحہ کافی ہوگا لیکن کبھی یہ نہ سمجھنا کہ مسکراہٹ اور مصافحہ کا تناسب ہمیشہ اور ہر جگہ یکساں ہی رہتا ہے اور اگر مصافحہ جھٹکے دار ہو اور سخت جاں گسلی اختیار کرنے لگے تو پھر نا

آپ کے چہرے کی مسکراہٹ بھی غائب ہوتی چلی جاتی ہے اور آپ خود بھی "الحفیظ والامان" کا ورد کرتے ہوئے جائے فرار دلانے نو دو گیارہ ہو جانے کی راہیں تلاش کرنے لگتے ہیں۔

جب یہاں سخت جان بلب مصافحے کا ذکر نکل ہی آیا تو لگے ہاتھ یہ بھی سنتے چلیے کہ ایسے مصافحے صرف ایک ہی جگہ پنپ سکتے ہیں۔ اور وہ ہے کشتی کا میدان، جہاں پر دو پہلوان آمنے سامنے کھڑے ہو کر مقابلے کے لیے للکارتے ہوئے ایک دوسرے کا ہاتھ مانگتے دکھائی دیتے ہیں اور جوں ہی ایک پہلوان کا ہاتھ دوسرے کی پکڑ میں آجائے تو بخدا اسے ہرگز دوستی والا یا عام آدمی کا مصافحہ ہرگز نہ سمجھیے گا کیوں کہ اب مدمقابل کے ہاتھ کو انتہائی تکلیف دہ ویچ پیچ مروڑ کچھ اس طرح دی جاتی ہے کہ ایسا پہلوان کبھی الٹی تو کبھی سیدھی پھلکیاں کھاتا نظر آتا ہے۔

بہت دنوں تک یہ بات ہماری سمجھ میں نہ آئی تھی کہ محض اپنا ہاتھ یوں دوسرے کے ہاتھ میں دے دینے سے بھرے، ہجوم میں یوں ذلت و رسوائی ملتی ہے تو کیوں وہ لوگ اپنا ہاتھ مدمقابل کو دینے کی غلطی کرتے ہیں۔ لیکن ہماری سوچ زیادہ دنوں برقرار نہ رہی کیوں کہ ایک دن ہمارے گبرو پہلوان نے اس طرز کی کشتیوں کی بابت مفصل روشنی ڈالی۔

انھوں نے اس قسم کی کشتیوں کو کھڑی کشتی کا نام دیا ہے اور اپنی اسٹائلش نما مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا "میاں یہی ایک کشتی ہے جو مردانہ کہلاتی ہے۔ دوسری طرح کی کشتیاں بھی کوئی کشتیاں ہیں جہاں اچھے سے اچھے پہلوان کو میدان کی دھول چاٹنی پڑتی ہے اور یہی نہیں بلکہ سارے مجمع کے سامنے کئی بار اوندھے منہ زمین پر گر کر اپنی ناک بھی رگڑنی پڑتی ہے۔" پھر اپنے خوف ناک چہرے پر مایوسی کے آثار لاتے ہوئے گویا ہوئے۔ "اجی خاک ڈالیے ایسی کشتی پر۔" ان کی اس تمہید پر اکتفا نہ کرتے ہوئے ہم نے مزید استفسار ان سے یوں کیا۔ "گبرو جی ہم نے اب بھی نہ سمجھا کہ کھڑی کشتی کیا ہوتی ہے۔۔۔"

بس اتنا سننا تھا کہ انھوں نے ہم سے ہمارا ہاتھ مانگا اور ہماری عجیب سی گوناگوں کیفیت کو دیکھتے ہوئے بڑے ہی مشفقانہ و دل فریب انداز سے ہنستے ہوئے ہم سے یوں گویا ہوئے

"میاں ڈریئے نہیں! آپ پہلوان تھوڑے ہی ہیں بہ خدا آپ تو میرے دوست ہوئے نہ تو میں آپ کا ہاتھ مروڑوں گا اور نہ ہی پچھاڑوں گا۔ بس اب آپ اطمینان سے اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔۔۔"

ہم نے اپنی سانسیں روک کر آنکھیں بند کر لیں۔ اب واقعی اپنے آپ کو گبرو کے حوالے کرنے کے سوائے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ اس کے بعد انھوں نے ہمیں کب اپنے ہاتھوں میں لیا اور کب ہوا میں چکر دے کر ہمیں واپس زمین پر لے آئے، اس کا ہمیں بالکل پتہ ہی نہیں ہوا۔

اور پھر ایک دن مرزا ہمیں ایک بیمار کی مزاج پرسی کے لیے اس خانۂ بیمار پہ لے پہنچے جہاں اُن کا دوست کریم بخش پتہ نہیں بیمار تھا بھی یا نہیں، ایک پلنگ پر بڑے ہی آرام سے بیٹھا اپنے پیروں کو ہلاتا ہوا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی کریم بخش نے اپنی کتاب ایک طرف پھینک دی اور

اخلاقاً کھڑے ہو کر ہم نے نہایت مسرت کے ساتھ بغل گیر ہوا اور فوراً ہمارا ہاتھ بغرض مصافحہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور اس کی گرم جوشی کچھ اس طرح رہی کہ کافی دیر تک ہمارے ہاتھ ملتے ہی رہے۔ ہم نے محسوس کیا کہ اب مصافحہ کی حدیں کافی حد تک ختم ہو چکی ہیں تو ہم نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لینا چاہا مگر افسوس مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ مرد بیمار سند باد جہازی کے پیر تسمہ پا کی طرف سخت جان اور ڈھیٹ ثابت ہوگا۔ ہاتھ چھوڑنا تو کجا الٹے اپنی گرفت ہمارے ہاتھ پر اور مضبوط کرتے ہوئے تاریخی، سیاسی یہاں تک کہ اخلاقی موضوعات پر بھی عجیب تکرار نما بحث کرنے لگا۔ اب ہمیں غصہ آنے لگا تھا ارادہ ہوا کہ دو ٹوک انداز میں جھڑک کر اپنا ہاتھ واپس لے لیں برا ہو، مرزا کا کہ انھوں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے ہمیں خاموش رہنے اور سہہ لینے کا بھی اشارہ کیا۔ اور اپنے بیمار دوست کریم بخش سے چائے پینے کی خواہش ظاہر کی۔ جواباً کریم بخش نے اپنی دوائی کے چمچ سے اپنے پلنگ کے ایک آہنی سرے کو بجانا شروع کر دیا۔ جس کے نتیجے میں ایک لڑکا چائے کی تھرموس لیے حاضر ہوا۔ موقع غنیمت جان کر ہم نے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا لیکن انھوں نے ہم سے کہا "میاں رہنے بھی دو اب تو ہم آپ کے دوست ہو گئے۔ آپ کو میں اپنے ہی ہاتھوں سے چائے پلا کر رخصت کی اجازت دوں گا۔ ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا چنانچہ ایک ٹھوس اور کڑی کارروائی کا قوی ارادہ کرتے ہوئے غالب کا یہ شعر باآواز بلند پڑھا۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

یہ شعر سنتے ہی مرزا یک لخت خاموش سے ہو گئے۔ شاید وہ اس شعر کا عملی مفہوم جاننے کی کوشش کر رہے تھے مزید وقت کھوئے بغیر مرزا کی ایسی گمبھیر خاموشی کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے کراٹے کی قسم کی ایک اچھی خاصی کھڑی ضرب ان کے ہاتھ پر ایسی لگائی کہ انھوں نے فوراً ہمارا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور ہم انھیں یوں ہی روتا بلکتا ہوا چھوڑ کر اپنے گھر واپس آ گئے۔ اس واقعے کے رونما ہونے کے بعد سے اب تک مرزا سے ہماری ملاقات نہیں ہوئی اور نہ ہی اس کے امکانات ہیں۔ ●●

میں ایسے بھارت کی تعمیر کے لئے کام کروں گا جس میں غریب ترین لوگ یہ محسوس کریں کہ یہ ان کا ملک ہے؛ جس کی تعمیر میں ان کی آواز کو بھی وزن حاصل ہے؛ ایک ایسا بھارت جس میں کوئی اونچا طبقہ اور نچلا طبقہ نہ ہو؛ ایک ایسا بھارت جس میں تمام فرقے، مکمل ہم آہنگی کے ساتھ رہیں۔
مہاتما گاندھی
مہاتما گاندھی کی
127 ویں سالگرہ
2 اکتوبر 1996

مسیح انجم
(حیدرآباد)

مولانا مضطر مجاز + ی
پنج وقتہ نمازی

برسوں پرانی بات ہے۔ یہی کوئی پندرہ بیس برس پہلے کی۔ مضطر مجاز محکمۂ مسکیات میں ڈپٹی رجسٹرار کواپریٹیو کے عہدے پر مامور تھے۔ اُن کا آفس حسین ساگر بند کے ایک سرے پر واقع تھا اور ان کے آفس سے بالکل متصل فشریز ڈیپارٹمنٹ کی کینٹن تھی، جہاں سے مچھلی کے تلن اور فش کٹلیٹ کے سوندھے سوندھے بھپکے بلند ہو کر مضطر مجاز کے کمرے کا رُخ کرتے اور وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کی قوتِ شامّہ کو بیدار کر کے بھوک کو بے قابو کر جاتے اور یہ ساری افراتفری عین لنچ کے وقت ہوا کرتی تھی۔ ایک تو حسین ساگر کا کنارہ، پانی کی لہریں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اور اس پہ قیامت مچھلی کے تلن کی مہک — گویا وہ مضطر مجاز کا دفتر نہ تھا بلکہ اچھا خاصہ پکنک اسپاٹ (Picnic spot) تھا۔ یہ چیز بھلا مضطر مجاز کے دوستوں سے کیسے چھپی رہتی!؟ چنانچہ ڈاکٹر یوسف کمال، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، رؤف خیر، رضا وصفی اور بہت سارے شاعر دوستوں نے لنچ کے اوقات میں ادھر ادھر آتے جاتے، مضطر مجاز کے دفتر میں حاضریاں دینی شروع کر دیں۔ بہانہ یہ ہوتا کہ شعر سُننے اور سُنانے آئے ہیں۔ اگر مضطر مجاز کی جگہ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال ہوتے تو یہ لکھ کر لگاتے کہ "یہاں جو لوگ مچھلی کھانے کی نیت سے آتے ہیں، وہ براہ کرم شعر و شاعری پر کفنت گو نہ فرمائیں اور جنھیں شعر و شاعری کا چسکا ہے وہ براہ کرم مچھلی کا خیال چھوڑ دیں۔" لیکن مضطر مجاز ٹھہرے خلوص کے آدمی۔ وہ لنچ پر آ کر ملنے والے ہر شاعر و ادیب کی مچھلی کے تلے ہوئے قتلوں سے ضیافت کرتے، اور یار لوگ مچھلی کے اُن تلے ہوئے قتلوں کو باجماعت کھا کر دوسرے غیر موجود دوستوں کی غیبت اور مضطر مجاز کے خلوص کی تعریف کرتے (وہ دور مضطر مجاز کی قلاّشی کا دور رہا ہوگا۔) اُڑتی اُڑتی یہ بات کسی نہ کسی طرح راقم الحروف تک پہنچی۔ سوچا کہ چلو چل کر دیکھتے ہیں کہ مضطر مجاز نے شاعری میں کتنی ترقی کی ہے؟ چنانچہ ایک دن ٹھیک لنچ ٹائم پر مضطر مجاز کے خلوص کو آزمانے کے لیے میں اُن کے آفس پہنچ گیا۔ وہاں یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ ایک ولین قسم کا چپراسی ملنے پر پہرا دے رہا

[illegible] تھا۔ اس کو خوش کرنے کے لیے اسی کی مادری زبان تلگو میں پوچھا:

"ఇక్కడ ముస్తర్ మజాజ్ గారు ఎక్కడుంటారండీ?"

(یہاں مُضطر مجاز کہاں پائے جاتے ہیں؟)

وہ بیزارگی سے بولا:

"ఇక్కడ ముత్తర్ ఉత్తర్ ఎవరుండరు!"

(یہاں مضطر وضطر کوئی نہیں رہتا!)

میں نے فری ہینڈ ڈرائنگ قسم کا حلیہ بیان کیا:

"బక్కగా, సన్నగా, చాలపొడవుగా,

ఒక కట్టెలాగుంటాడు!"

(دبلے سے، پتلے سے اور بہت لمبے سے "لم چھڑ" سمان ہوتے ہیں!)

چند لمحے سوچ کر بولا:

"ఆఁ! ఇటువంటి వారొకరున్నారండి, తన

మిత్రులకు చేపలు తినిపిస్తాడు. కాని అతనిపేరు గులామ్‌హుసేన్"

(ہاں! اس قسم کے ایک صاحب یہاں پائے جاتے ہیں جو اپنے دوستوں کو مچھلی کھلایا کرتے ہیں۔ لیکن ان کا نام غلام حسین ہے؟)

میں اس وقت تک مضطر مجاز کے اصلی نام سے واقف نہیں تھا۔ للٰہذا میرا مایوس ہو جانا ضروری تھا لیکن چپراسی نے چوں کہ مچھلی کا حوالہ بھی دیا تھا، کچھ اُمید سی بندھی۔ چناں چہ یہ سوچ کر کہ ایک نظر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے، میں نے چپراسی سے کہا "چلو انھیں سے ملاؤ، کہاں بیٹھتے ہیں وہ؟" چپراسی نے انگلی کے اشارے سے غلام حسین صاحب کے کمرے کی نشان دہی کی۔ اس کے اشارے پر میں کچھ جھجکتے اور بے دلی سے غلام حسین صاحب کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس وقت وہ لنچ کی تیاری کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے: "آئیے مسیح بھائی! ٹھیک وقت پر آگئے۔ میں آپ کو شان دار تلی ہوئی مچھلی کھلاؤں گا!" "مچھلی میرا من بھاتا کھاجا ہے۔" میں "ناں" "ناں" کہتا ہی رہا لیکن مولوی غلام حسین متخلص بہ مضطر مجاز نے دو پلیٹ مرل کے تلے ہوئے قتلے منگوا ہی لیے۔ آخر وہی ہوا جو پلیٹ کے سامنے آجانے پر پیٹ کا ہوتا ہے۔

یوں بھی مضطر مجاز کھلانے پلانے (پلانے سے مراد چائے وغیرہ) کے معاملے میں بڑے فراخ دل واقع ہوئے ہیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ان کے گھر آیا ہوا دوست بغیر کچھ کھائے پیے چلا جائے۔ ان کا دسترخوان خلوص کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ دوست بیٹھے ہی رہتے ہیں کہ اچانک مضطر مجاز تالی بجاتے ہیں۔ جس کے ساتھ ہی ان کا کوئی نہ کوئی لڑکا "کیا حکم ہے میرے پپا حضور" کے مصداق بڑے ادب سے آکھڑا ہوتا ہے۔ مضطر مجاز اشاروں کنایوں میں کچھ فرما دیتے ہیں۔ جس کے ساتھ ہی سروسنگ شروع

ہو جاتی ہے جیسے' مضطر مجاز کی اُس تالی پر وہ تالی یاد آجاتی ہے جو ختم قرآن کے موقع پر مسجد میں بطور حمایت بجائی جاتی ہے کہ "اب پارون کی تلاوت روک دیجیے' فاتحہ پڑھی جانے والی ہے!" مسجد میں بجائی جانے والی تالی میں آداب مسجد کا خیال رکھا جاتا ہے لیکن مضطر مجاز جو تالی بجاتے ہیں' اس میں بحر اور وزن کے ساتھ ساتھ خلوص کی گرمی بھی شامل رہتی ہے۔ اب اس قسم کی تالی بجاکر دوستوں کی خاطر مدارات کرنے والے کم یاب ہی نہیں نایاب ہیں۔

مضطر مجاز کا حافظہ بڑا غضب کا ہے۔ انھیں قدیم و جدید شعرا کے سیکڑوں شعر یاد ہیں۔ حتی کہ ڈاکٹر یوسف کمال کی ڈیڑھ سو غزلیات بھی انھیں یاد ہیں۔ لیکن انھیں اپنے شعر یاد نہیں رہتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مشاعرہ میں وہ اپنے شعر بھول بھول جاتے ہیں اور گھڑی گھڑی کاغذ کو الٹ پلٹ کرنے لگ جاتے ہیں۔ تعجب ہے کہ یہ دوسروں کے شعر نہیں سنا دیتے! پتہ نہیں، کس نے انھیں یہ کہہ دیا ہے کہ وہ مشاعرہ شاعر نہیں ہیں۔ میں نے خود انھیں دہلی میں دونوں ہاتھوں سے مشاعرہ لوٹتے دیکھا ہے اس مشاعرے میں جتنی داد مضطر مجاز کو ملی تھی اتنی داد غزل کے مقبول و مشہور شاعر احمد فراز کو بھی نہیں ملی تھی۔ میری اس بات کی گواہی ڈاکٹر مصطفیٰ کمال اور طالب خوندمیری بھی دے سکتے ہیں۔ کیوں کہ وہ بھی اس "لوٹ مار" والے واقعہ کے چشم دید گواہ ہیں۔ پتہ نہیں، حیدرآباد کے بڑے مشاعروں میں انھیں کیا ہو جاتا ہے کہ بالکل نروس سے ہو جاتے ہیں۔ انھیں کسی سائیکاٹرسٹ سے رجوع کرنا چاہیے۔

بظاہر مضطر مجاز مشاعرہ گریز و مشاعرہ بیزار شاعر نظر آتے ہیں۔ اور ظاہر بھی یہی کرتے ہیں کہ وہ مشاعروں سے بیزار ہیں لیکن ان کی "مشاعرہ بیزاری" اور بے نیازی اُس وقت دھری کی دھری رہ جاتی ہے جب انھیں مشاعرے کا دعوت نامہ مل جاتا ہے۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ مشاعروں اور متشاعروں کو کوسنے والا شاعر آخر کیوں کر راضی ہو گیا؟

مشاعرے میں جانے سے پہلے غزل کا انتخاب مضطر مجاز کے لیے ایک ایسا مسئلہ ہوا کرتا ہے جیسے "بدھاوا" کے موقع پر سوٹ کا انتخاب! وہ گھنٹوں تذبذب کا شکار رہتے ہیں۔ اور بالآخر ڈاکٹر یوسف کمال سے مشورہ کرنے کے لیے ان کے گھر چلے جاتے ہیں' جبکہ یوسف کمال خود ایک مشاعرہ بیزار آدمی ہیں۔ لیکن مضطر مجاز ان سے مشورہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ اگر نہ ملیں تو شاید وہ ' اپنی ٹوپی سے مشورہ کرنے لگ جائیں! بہرحال مضطر مجاز مشورہ کو ضروری سمجھتے ہیں۔ یوسف کمال نہ ملیں تو اپنی دیرینہ رفیق ٹوپی ہی سہی۔

دو تین سال اُدھر کی بات ہے کہ ان کو "شنکر جی" مشاعرے کا دعوت نامہ ملا تھا۔ اب ان کے لیے غزل کے انتخاب کا کٹھن مسئلہ درپیش تھا۔ میں نے یوں ہی پوچھ لیا کہ "مضطر بھائی، آپ کون سی غزل سنائیں گے؟" اس وقت ان کے پاس ایک تازہ غزل تولد ہوئی تھی جو خاصی صحت مند تھی اور مشاعرے میں سب کے کلام پر بھاری پڑ سکتی تھی۔ اُس غزل کے دو تین شعر تو میں آگے چل کر سناؤں گا۔ فی الحال مضطر مجاز کے تذبذب و تشکیک کا ذکر ہو جائے۔ ہاں تو جب غزل کے انتخاب کا مسئلہ آیا تو میں نے کہا کہ "مضطر بھائی آپ وہ غزل سنائیے جس کے مطلع کا پہلا مصرعہ ——— "یوں کبھی . . . . . سے شروع ہوتا ہے۔"

ہنس کر بولے: "پو پھٹی ——— پو پھٹی" پڑھ ہی رہوں گا کر سامعین پوچھیں گے ——— بلکہ چلائیں گے کہ "کیوں پھٹی .... کیسے پھٹی ....؟ اور پھر میں آگے پڑھ نہیں پاؤں گا!" چناں چہ انھوں نے مشاعرے میں جدید لب و لہجے کی وہ مرصّع غزل نہیں پڑھی۔ اس غزل کے تین شعر پیش ہیں:

پو پھٹی کہ صبح کی توقیر گھٹ گئی — سورج چڑھا تو دھوپ اندھیروں میں بٹ گئی
اتنا مچایا شور بُتوں نے درونِ سنگ — پتھر کی میٹھی نیند بھی آخر اُچٹ گئی
محفوظ جس میں تھی تری دُزدیدہ اک نظر — بازارِ زندگی میں وہی جیب کٹ گئی

جب مضطر مجاز نے یہ غزل رد کر دی تو میں نے کہا کہ "آپ وہ غزل سنا دیجیے جس کا مطلع ہے:

پھرتے ہیں دندناتے ہوئے فیل چپ رہو!
غائب ہیں آسماں سے ابابیل چپ رہو

مسکرا کر فرمایا: "مطلع پڑھتے ہی سامعین چلائیں گے ——— "ارے چپ .. !اب چپ بھی رہیے ..!" وغیرہ وغیرہ۔

اتنے سارے اندیشوں اور وسوسوں کے ساتھ جب شاعر، مشاعرہ میں اپنا کلام سنانے جائے گا تو اس کا جو حشر ہوگا، آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مشاعرہ گاہ تک تو مضطر مجاز خوشی خوشی چلے جاتے ہیں لیکن مشاعرہ گاہ میں داخل ہوتے ہی ان پر بیزارگی کا سایہ مسلط ہو جاتا ہے۔ چہرے پر تذبذب و تشکیک کے سائے لہرانے لگتے ہیں۔ آپ کو یوں معلوم ہوگا جیسے کسی اسکول بیزار لڑکے کو پکڑ دھکڑ کر مدرسے میں لا کھڑا کیا گیا ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسٹیج پر پہنچتے ہی مضطر مجاز اسٹیج اور مشاعرہ گاہ سے قطعی بے تعلق سے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور پھر جو اپنی گردن ڈال دیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسٹیج پر صرف دھڑ بیٹھا ہوا ہے اور سر غائب ہے۔ اگر کوئی نیا آدمی مضطر مجاز کو اس پوزیشن میں دیکھ لے تو گھبرا کر ان کا سر ٹٹولنے لگ جائے! یہ تو مضطر مجاز کی مجبوری ہے کہ ان کی کمر میں ایک پٹہ لگا رہتا ہے جو ان کو سیدھا بٹھاتا رہتا ہے۔ اگر یہ کمر پٹہ نہ ہو تو مضطر مجاز بالکل جھک کر "و" (واؤ) بن گئے ہوتے۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ ان کی گردن میں بھی ایک پٹہ ڈال دینا چاہیے کہ گردن صحیح پوزیشن میں رہے اور جھکنے نہ پائے۔ مشاعرے میں مضطر مجاز اپنا کلام کچھ اس بے دلی سے سناتے ہیں کہ جیسے سامعین پر احسان فرما رہے ہوں۔ کلام سناتے وقت ان سے کچھ ایسی حرکات و سکنات سرزد ہوتی رہتی ہیں کہ جیسے سامعین سے کہہ رہے ہوں کہ "یہاں کیوں بیٹھے ہو، گھر میں کچھ کام نہیں ہے؟" ——— ان تمام باتوں کو اپنا کر مضطر مجاز خود اپنے خلاف ایک محاذ بلکہ متحدہ محاذ تیار کر لیتے ہیں۔

مضطر مجاز کی دو کمزوریاں ہیں جو علانیہ سب کو نظر آتی ہیں۔ ان میں سے ایک بڑی کمزوری لنڈن میں رہتی ہے۔ صیغہ "تانیث" "رہتی ہے" سے غلط فہمی کے پیدا ہونے اور مضطر مجاز کے کردار کو مشکوک کرنے کا احتمال ہے۔ کیوں نہ میں بلا تاخیر اس کی وضاحت کر دوں کہ وہ کمزوری ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب ہیں جن سے پوری اردو دنیا واقف ہے۔ مضطر مجاز نے اپنے دوسرے شعری مجموعے کا انتساب ڈاکٹر صاحب

کے نام ہی کیا ہے۔ مضطر مجاز نے یہ انتساب لکھ کر گویا قلم کی نب توڑ دی ہے بلکہ قلم ہی توڑ دیا ہے۔ اس انتساب کو پڑھنے کے بعد کسی ادیب یا شاعر میں شاید ہی ہمت پیدا ہو کہ اس سے بڑھ کر انتساب لکھے۔ انتساب یوں ہے :

مورخ و محقق و مترجم و مصنف و مرتب

معلم و مبلغ و مجاہد اردو

و

ماہر لسانیات و نقّاد و شاعر

اور میرے

دیرینہ رفیق و رہنما

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین احمد شکیب

کے نام

ابھی انتساب ختم نہیں ہوا ہے۔ ذرا دم لیجیے۔ اختتام پر ایک فارسی مصرعہ بھی درج ہے :

فغاں کشید وہ روئے زمانہ آخت مرا

چناں چہ جب میں نے اس انتساب والے کیس کو مضطر مجاز کی دوسری کمزوری (یعنی) ڈاکٹر یوسف کمال سے رجوع کیا تو ہنس کے بولے :

"مضطر مجاز ہر کام اپنے قد کی مناسبت سے کیا کرتے ہیں۔ البتہ صرف اپنی شریکِ حیات کے انتخاب میں ڈمارے گئے۔ کیونکہ اس میں ان کا کوئی عمل دخل نہ تھا اور ان کے والدین نے ان کی سعادت مندی کو دیکھ کر ان سے مشورہ کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔"

اپنی ذات و شخصیت کے بارے میں مضطر مجاز اکثر فرمایا کرتے ہیں کہ "بھئی، میں تو ایک کھلی ہوئی کتاب ہوں" میں نے ان سے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ یہ جو کھلی کتاب ہے، ڈیمائی سائز کی ہے یا کراؤن سائز کی، یا پاکٹ سائز کی؟ مجلّد ہے یا غیر مجلّد؟ البتہ جب میں اس "کھلی کتاب" کا جائزہ لیتا ہوں تو مضطر مجاز کی ملازمت کے زمانے کو انتہائی بے داغ پاتا ہوں۔ حالاں کہ مضطر مجاز کا تعلق کوآپریٹیو ڈیپارٹمنٹ سے تھا، جہاں امداد باہمی کے اصول پر "میں تیری مدد کرتا ہوں، تو میری مدد کر" کی بنیاد پر ہزاروں میں کھیلنے کے مواقع تھے لیکن مضطر مجاز رشوت کے ایک پیسے کے روادار نہ تھے بلکہ اہل غرض کی کلفت دور کر کے الٹا اس کو اپنے پیسوں سے چائے پلاتے اور خوشی خوشی رخصت کرتے وہ اپنے آفس میں داخل ہوتے ہی سید غلام حسین رضوی بن جاتے اور مضطر مجاز کو بالکل فراموش کر دیتے۔ میں نے کئی ادبا و شعرا ایسے بھی دیکھے ہیں جو دفتروں میں بھی ادب کو اوڑھے ہوئے ہوتے ہیں اور کوڑی کا کام نہیں کرتے۔

مضطر مجاز جب تک ملازمت میں رہے، سخت محنت اور حلال کی کمائی کھائی اور نہایت ہی مطمئن و مسرور رہے، جس کے ثمرات انھیں نیک اولاد کی شکل میں ملے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ مضطر مجاز کی زندگی ایک کھلی کتاب ہے لیکن اس کتاب کے ابواب میں ایک باب ایسا

بھی ہے جو "ڈیبونائر" سے عبارت ہے۔ جب بات کتاب اور مطالعہ کی آہی گئی ہے تو یہ بتاتا بھی چلوں کہ مضطر مجاز کا مطالعہ نہایت وسیع ہے۔ ان کو انگریزی لٹریچر کا مطالعہ کیے بغیر نہ تو چین آتا ہے اور نہ نیند۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ خواب بھی انگریزی میں دیکھتے ہوں گے۔ جہاں تک "ڈیبونائر" کا تعلق ہے، اس میں بعض ایسے اچھوتے موضوعات پر مضامین ہوتے ہیں جو ہمارے ملک کے، انگلیوں پر گنے جانے والے اردو رسالوں میں بالکل ناپید ہوتے ہیں۔ مضطر مجاز ٹھہرے متنوع و متنازعہ موضوعات کے متلاشی۔ لہٰذا وہ ان اچھوتے مضامین کی خاطر بازار سے بدنامی خرید لاتے ہیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی جیسے کوئی پارسا کسی تاڑ بن سے گزرے تو "تاڑی ماسٹر" کہلائے۔ اور سیندھی کے بن سے گزرے تو "سیندھی ماسٹر" میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ "ڈیبونائر" میں کی تصویریں مضطر مجاز ہم جیسے اردو والوں اور اردو پروفیسروں کے لیے چھوڑ دیتے ہیں کہ "میاں ذرا تم ان تصویروں کا مطالعہ کرتے رہو، تب تک میں نماز پڑھ لیتا ہوں۔"

ان کا اصلی نام سید غلام حسین رضوی ہے اور تخلص مضطر مجاز۔ لیکن ان کا ایک اور خود ساختہ نام "زیچ زمہریری" بھی ہے۔ اس نام سے وہ چھپ کر طنزیہ و مزاحیہ شاعری فرمایا کرتے ہیں۔ جب ادارۂ "حلف" کے اراکین کو اس کی اطلاع ملی تو، بعض اراکین نے مضطر مجاز کا حقہ پانی بند کر دینے کی دھمکی دی۔ تو مضطر مجاز نے اپنا بوریا بچھونا سنبھال، ادارۂ "شگوفہ" کی راہ لی، جہاں ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے ان کی خاطر خواہ پذیرائی کی، اور دفتر "شگوفہ" میں ان کے لیے ایک تخت بنوایا کہ وہ اس پر سکون سے نماز پڑھ سکیں لیکن اب مصطفیٰ کمال یہ سوچ کر گھبرایا کرتے ہیں کہ کہیں مضطر مجاز جوش ایمانی میں دفتر شگوفہ کو اوقاف کی جائیداد ثابت نہ کر دیں ۔۔۔ مضطر مجاز میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کوئی نماز قضا نہیں کرتے۔ وہ پنج وقتہ نمازی ہیں۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اقبال کے فارسی کلام کا منظوم ترجمہ کرنے کے لیے ایک مترجم کا باطہارت ہونا بھی نہایت ضروری ہے اور اس اصول پر مضطر مجاز بالکل کھرے اترتے ہیں۔ کاش کہ مضطر مجاز نا اقبال کے فارسی کلام کے منظوم اردو ترجمہ کے لیے ایک اور تخلص ایجاد کر لیتے تو انھیں کوئی روکنے والا نہیں تھا، اور چوتھے نام کی شرعی گنجائش بھی تھی۔ یہاں شبہ کی تھوڑی سی گنجائش نکل آتی ہے کہ مضطر مجاز ریٹائرمنٹ سے پہلے نماز نہیں پڑھتے تھے۔ نماز تو وہ ضرور پڑھا کرتے تھے، لیکن ذرا گنڈے دار قسم کی۔ اب تو وہ اس منزل پہ پہنچ گئے ہیں کہ کھانا ناغہ کر سکتے ہیں لیکن نماز ناغہ نہیں کر سکتے۔

مجھے یہ نہیں معلوم کہ مضطر مجاز نے کہاں تک فارسی پڑھی ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ انھوں نے "پڑھیں فارسی، بیچیں تیل" والے مقولے کو غلط ثابت کر دکھایا ہے۔ اور اپنے دماغی تیل کو جلا کر علامہ اقبال کے فارسی مجموعۂ کلام "پیام مشرق" کا منظوم اردو ترجمہ کر کے اردو کے نقادوں اور ماہرین اقبالیات کے لیے ایک مستقل روزگار کا ذریعہ فراہم کیا ہے۔ مضطر مجاز پچھلے کئی برسوں سے اقبال کے فارسی کلام پر ہاتھ صاف کرتے آ رہے ہیں اور وہ اس قدر منجھ گئے ہیں کہ ان کے ترجمے پر طبع زاد کلام ہونے کا گمان ہوتا ہے ویسے ترجمہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ "آئینہ" کو "آم" اور "گوش" کو کان لکھ کر بری الذمہ ہو جانا ترجمہ نہیں

کہلاتا ــ جب "گوشت" کے ساتھ بطور سابقہ "خر" لگا دیا جائے تو مترجم کو سوچنا پڑتا ہے کہ "گدھا کان" لکھوں، یا گدھے کا کان لکھوں"، یا گدھے کے سے کان رکھنے والا جانور" لکھوں۔ ان تین ترجموں میں جہاں "سے" آیا ہے، وہی ترجمے کی جان ہے۔ ایسی باریک باتوں پر جب مترجم کی نظر رہتی ہے تو ترجمے میں طبع زاد کی سی شان پیدا ہوتی ہے۔ مجھے اتنی فارسی تو نہیں آتی کہ فارسی کے اردو تراجم کے محاسن و معائب پر روشنی ڈالوں۔ البتہ راقم الحروف کو تلگو سے اردو ترجمہ کرنے کا تھوڑا بہت تجربہ ضرور ہے کہ ابتدائی ملازمت کے دنوں میں ذریعہ معاش یہی تھا۔ اسی لیے میں یہ کہنے کے موقف میں ہوں کہ ترجمے کے دوران بعض ایسی دشوار گزار گھاٹیاں آتی ہیں کہ جنھیں عبور کرتے وقت مترجم کو منہ کے بل گرنے اور شکل بگاڑ لینے کا قوی اندیشہ رہتا ہے۔

جب فارسی ترجمے کا ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو کیوں نہ میں تفریح طبع کے لیے وہ چھوٹا سا واقعہ سناؤں جو ابن انشا کو ایران کی سیاحت کے موقع پر پیش آیا تھا۔ ابن انشا نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ ایک شام وہ اصفہان کی ایک سڑک سے گزر رہے تھے کہ دو موٹے تازے آدمی ان کے قریب آئے اور علیک سلیک، کے بعد مصافحہ کیا۔ لیکن معانقہ کی منزل پر انھوں نے ابن انشا کے ہاتھ سے ان کی قیمتی گھڑی اتارنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ابن انشا نے خطرے کو بھانپ کر راہ گیروں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کروانے کے لیے اپنی تھوڑی بہت فارسی میں چلانا شروع کیا، "ایں سارق است، بگیرید، بگیرید"۔ حالاں کہ فارسی میں چور کو "دزد" کہتے ہیں لیکن اس وقت ابن انشا کو بقول انھیں کے یہ سامنے کا لفظ یاد نہ آسکا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی بھی شخص ان کی مدد کو نہ آیا۔ اور ادھر ابن انشا کی فارسی بھی تمام ہو چلی تھی۔ چنانچہ انھوں نے یہ سوچ کر خاموشی اختیار کر لی کہ "اگر لوگوں نے چور کو پکڑ بھی لیا تو اردو فارسی بولنی پڑے گی"! تو صاحبو! مضطر مجاز جیسے باشعور مترجم کو "سامنے" اور "پیچھے" کے وہ تمام الفاظ و محاورے یاد ہیں، اور وہ انھیں سلیقے سے برتنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔

الفاظ کو برتنے کے ضمن میں مضطر مجاز نے کیا خوب شعر کہا ہے، اور ایسا شعر مضطر مجاز جیسا حساس شاعر ہی کہہ سکتا ہے:

لُٹ جاتی ہے شاعر کی عزت مضطر
اک چھوٹے سے لفظ کی نافرمانی سے

الفاظ کو برتنے میں جس شاعر کے احساس کی شدت کا یہ عالم ہو تو غور کیجیے کہ مضطر مجاز نے اقبال کے فارسی کلام کے منظوم اردو ترجمے کے وقت کتنی احتیاط برتی ہوگی اور کتنی دشوار گزار گھاٹیوں کو سر نہ کیا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ علامہ اقبال کے فارسی مجموعۂ کلام "پیام مشرق" کا منظوم اردو ترجمہ "اقبالیات" میں ایک اہم اضافہ ثابت ہوگا۔ ●●

نوٹ:۔ ممتاز شاعر جناب مضطر مجاز کے منظوم اردو ترجمہ "پیام مشرق" کی رسم رونمائی جو ۴ ہر اگست ۱۹۹۶ء کو بہ نائش کلب پر عمل میں آئی تھی، کے موقع پر یہ خاکہ پڑھا گیا (م۔ ا)

رؤف خیر
حیدرآباد

مزاجِ مُضطرمجاز

دُنیا کبھی اہلِ کمال سے خالی نہیں رہتی نسلِ انسانی اولاد سے چلتی ہے مگر فن میں ہمیشہ "ابوالکمال" پیدا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زور اور صفی اورنگ آبادی جیسی نابغہ روزگار شخصیتیں نہ رہیں تو حیدرآباد خالی خالی نہیں رہ گیا۔ مخدوم محی الدین، خورشید احمد جامی، اوج یعقوبی اور شاذ تمکنت جیسے صاحبِ کمال ارضِ دکن کی آبرو بنے رہے ان کے اُٹھ جانے سے ادبی دنیا کے نقشے سے حیدرآباد کا نام محو نہیں ہوا کچھ اور جیالوں نے اس شہر کے حوالے سے اپنی پہچان بنائے رکھی ان میں جناب مضطر مجاز کا نام نمایاں ہے۔

مضطر صاحب کی خوش گفتاری ان کے پرتکلف مزاج کا خاصہ ہے اور یہی خوش گفتاری ان کی پرتکلف تخلیقات سے بھی نمایاں ہے۔ "طنز" مضطر صاحب کا خاص اسلوب ہے گفتگو میں بھی یہ رنگ غالب رہتا ہے ان کی نثر میں بھی زیریں لہر کی طرح کار فرما رہتا ہے مگر ان کے شعر میں یہ اُبھر کر آتا ہے۔ جدید غزل کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ہر قسم کے سنجیدہ غیر سنجیدہ طرز کو ساتھ ساتھ پیش کر دیتی ہے۔ غالب کی شوخی بھی اس کی غزل کی سنجیدگی میں کہیں کہیں در آتی تھی تو تفننِ طبع کا مظہر سمجھی جاتی تھی جیسے ؎

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب ؛ آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

یا پھر ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق ؛ آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

اور اقبال جیسا سنجیدہ فلسفی شاعر بھی کبھی طنز کے کوچہ کا آدمی رہا ہے اس کوچہ گردی نے "اکبری اقبال" کا روپ دھار رکھا تھا۔ مضطر صاحب بھی اسی میدان کے آدمی ہیں۔ کچھ تو فطری مناسبت، کچھ جدید غزل کی پذیرائی اور کچھ غالب و اقبال کی اتباع نے مضطر مجاز صاحب کے فکروفن میں طنز کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ مضطر صاحب در اصل غزل سے زیادہ اینٹی غزل کے آدمی ہیں ان کا لہجہ تابع مہمل سہی مہمل نہیں ہے ؎

کام زباں ہی لیتے ہیں سارے مہذب لوگ ؛ طنز کا اک نشتر کافی ہے پتھر دے مار کیا!

ان کا طنز دل نہیں دکھاتا بلکہ لمحۂ فکر عطا کرتا ہے۔ یوں بھی مضطر صاحب ایک تشکیکی آدمی ہیں جو حدود ادب کا ہر سطح پر پورا پورا خیال رکھتے ہوئے ہر چند کہ ان کے طنز کا نشانہ اپنے پرائے سبھی ہوتے ہیں یہ بے باکی سفاکانہ

نہیں بلکہ مخلصانہ ہوتی ہے۔ فرد ہو کر سماج ان کا رویہ ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔
برخود غلط اُمّی شاعروں کی تصویر ملاحظہ فرمایئے ؎

تھوڑی بہت بھی آتی ہوگی جکو نوشت و خواند ٭ اپنے وقت کا غالب اور اقبال کہائے گا
مَیں بھی مفظر شاعر بن کر گاڑوں گا جھنڈے ٭ جس دن اپنا نام مجھے لکھنا آجائے گا

مفظر صاحب نے مشاعروں اور مشاعرہ بازوں کا نقشہ بھی خوب کھینچا ہے۔ آج کل سرکاری و غیر سرکاری محفلوں کے انعقاد میں اقربا پروری کے مظاہرے اور کچھ درج فہرست شعرا کی بالالتزام شمولیت پر خوب چبھتا ہوا طنز کیا ہے ؎

جمن میاں بھی تھے وہاں بنواڑی لال بھی ٭ مفظر غزل سنانے کا ہم کو ہی حک نہ تھا

غزل کو گجل اور حق کو حک کہنا بھی بھرپور طنز ہے یہ اس لیے کہ ؎

نوابی کوؤں میں بٹ گئی تھیں ٭ زباں کے لالے پڑے ہوئے تھے

مفظر صاحب کو اس کا بھی احساس ہے کہ مشاعروں میں لوگ شعر سے زیادہ ترنم کی داد دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

ہے شاعری کا شوق تو مفظر بہم کرو ٭ تھوڑی بہت تو مشق ترنم جناب من

جنھیں ماورائے سخن کا چسکا ہو انھیں حرف بافوں کی یہ صورتِ حال بھلا کیا پسند آئے گی۔

چل رہے ہیں کارخانے شعر کے ٭ کونسا ہے مال جو کھلتا نہیں
وزن بھی ہے قافیہ بھی بحر بھی ٭ شعر کہتے ہیں جسے ملتا نہیں

ہنستے ہنستے مفظر صاحب بڑے غضب کی چٹکی بھی لیتے ہیں ؎

یہ ہم زمیں پہ چل کر رواروی میں گرے ٭ یہ آپ اتنی بلندی سے کس خوشی میں گرے
ہوا کے زور پہ اُڑتے تھے آسمانوں میں ٭ ہوا کے رکتے ہی ردی کی ٹوکری میں گرے

دیکھا گرنے پہ آتا ہے تو آدمی کس قدر گر جاتا ہے۔
شاعر کبھی کبھی سخن وری کو بہانہ بنا کر وہ بات کہہ گزرتا ہے جو بین السطور ہوتی ہے اور قیامت ڈھاتی ہے بقول شاعر ؎

وفا کے نام پہ تم کیوں سنبھل کے بیٹھ گئے ٭ تمہاری بات نہیں بات ہے زمانے کی

مفظر صاحب کے ہاں یہ رنگ بھی خوب نکھر کر سامنے آتا ہے ؎

جلتے ہوئے مکاں ہیں مکیں خیریت سے ہیں ٭ مر مر کے زندگی کے امیں خیریت سے ہیں
اور ببکر ببول ناگ پھنی سب مزے میں ہیں ٭ بجلی تو شاخِ گل پہ گری سب مزے میں ہیں
سب کے لیے امان ہے کوفہ کہ کربلا ٭ یاں بجز حسین ابن علی سب مزے میں ہیں
اک شاعری کی جان پہ طاری ہے بے کسی ٭ صنعت گرانِ حرف روی سب مزے میں ہیں

واعظ، زاہد، شیخ وغیرہ کا کردار تو اردو شاعری میں ازل سے نشانۂ ملامت رہا ہے مفظر صاحب کیوں پیچھے رہتے ؎

عجیب مشغلہ ہاتھ آگیا ہے زاہد کو ÷ کہ دو قفے وقفے سے اٹھ کر چلا ہے مسجد کو

یہ وہی غزل ہے جسے وہ کراچی جاکر عبدالعزیز خالد کو سنانا بھی چاہتے ہیں۔

غزل یہ وہ ہے کراچی اگر ہوا جانا ÷ تو میں سناؤں گا عبدالعزیز خالد کو

اپنی سلیقہ مندی سے وہ ناپسندیدہ گفتگو کا رُخ کچھ یوں موڑتے ہیں ۔

بجائی کا گوشت کھانے سے بہتر ہے میرے بھائی ÷ چل کر شراب خانے میں بیٹھیں پئیں شراب

مظفر مجاز کا ایک DEBONAIRIC شعر سنیئے جس سے ان کی پسند ناپسند کا اظہار ہوتا ہے

غزلوں کی بھرمار نہ ان میں ساختیات کی بحثیں ÷ رنگیں تصویروں کے رسالے اچھے لگتے ہیں

یہ طنز دو دھاری ہے محض رنگین تصویروں سے بہلنے والوں پر بھی اور غزل اور ساختیات کی علمی بحث سے دامن بچانے والوں پر بھی ۔

ویسے خود مظفر مجاز صاحب کی ذات میں شاہین و نرگس دونوں سانس لیتے ہیں آج اگر وہ کسی موضوع کی کھل کر تائید کرتے ہیں تو کل اسے مدلل انداز میں رد بھی کر دیتے ہیں ساحر لدھیانوی کو ناشاعر اور کرشن چندر کو نان رائٹر (NON - WRITER) قرار دے کر اس پر ابن صفی کو فوقیت بھی دیتے ہیں اور مزے کی بات یہ کہ نہ تو انھوں نے ابن صفی کو پڑھا ہے اور نہ کرشن چندر کو ۔

شفیق فاطمہ شعریٰ کے شعری مجموعے (غالباً آفاق نوا) کی رسم اجراء کے موقع پر پروفیسر مغنی تبسم نے جہاں شعریٰ کو اقبال کے بعد نظم کی سب سے بڑی شاعرہ قرار دیا وہیں یہ اعتراف بھی کیا کہ ان کی نظمیں کئی کئی بار پڑھنے پر بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتیں اور مظفر مجاز صاحب نے بھی مغنی تبسم صاحب کی تائید فرماتے ہوئے کہا کہ یقیناً شفیق فاطمہ شعریٰ نظم کی بہت بڑی شاعرہ ہیں مگر ان کی بعض نظمیں ان کی سمجھ میں بھلا نہیں آتیں ۔ (جو چیز سمجھ ہی میں نہ آئے وہ بڑی کیسے ہو گئی ؟)

دراصل مظفر صاحب میں مرعوب ہو جانے کی بھی اتنی ہی صلاحیت ہے جتنی مرعوب کرنے کی یعنے جہاں وہ اپنی سنجیدہ فکر سے مرعوب کرتے ہیں وہیں اپنی غیر سنجیدگی کی وجہ سے مرعوب ہو جاتے ہیں ۔ وہ بعض اہم معاملات کو سنجیدگی سے نہیں لیتے اور ان کے بیشتر ریمارکس لمحاتی اور خوش کن ہو جاتے ہیں ۔ یہی غیر سنجیدہ رویہ وہ اپنے مصرعوں کی شکست و ریخت اور در و بست میں بھی روا رکھتے ہیں ورنہ وہ زبان و بیان میں درجۂ استناد کو پہنچ جاتے ۔ یہی غیر سنجیدگی انھیں سند بننے نہیں دیتی ۔

مظفر صاحب آنکھوں کے آگے کبھی ایسا منظر کھینچ کے رکھ دیتے ہیں کہ آدمی ہکا بکا ہو کے رہ جاتا ہے ۔

نماز پڑھنے کو اُٹھے تو وقت ہی نہ رہا ÷ شراب پینے کو بیٹھے تو جام غائب تھے

بیشتر جانوروں کے استعاروں میں بھی مظفر صاحب نے انسانی نفسیات پر چوٹ کی ہے ۔ سانپ، مینڈک، گائے، بھینس، لومڑی اور سارس کے "دعوتی امور" بھی ان کی نظر میں ہوتے ہیں ۔

ہو جاتے ہیں کتنے دکھی کتنے بے بس ÷ لومڑی ان کی دعوت میں آکر سارس

مگر لومڑی کو بھی آخر کار سارس کی دعوت کا مزہ چکھنا ہے یہ الگ بات ہے کہ

بھولتی جاتی ہے دھیرے دھیرے ÷ لومڑی دعوتِ سارس کا مزہ !

قوم کی حالت زار پر مظفر صاحب مولانا حالی سے زیادہ دکھی لگتے ہیں ؎

سو گئی قوم بالآخر مضطر ÷ رہ گیا منہ پہ مسدس کا مزہ

بلکہ قوم کی گراں خوابی کا وہ عالم ہے کہ اب اس کے منہ پر مسدس کا مزہ بھی نہیں رہ گیا۔

مظفر صاحب کی طنز نگاری میں دراصل کئی سیاسی و سماجی مسائل پر چوٹ ہے۔ ہر دور کے شاعر کی آنکھ سے یہ مناظر بچ نہیں پاتے اور شاعر کو اس کے مزاج کی مناسبت سے یہ انگیز کر جاتے ہیں۔ اپنے آپ پر طنز کرنا تو بڑے ظرف کی بات ہے۔ مظفر صاحب خود اپنے حوالے سے اک دردناک کیفیت کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

جب میرا شعر خود میرے بچے نہ پڑھ سکیں ÷ پھر ایسی جائیداد پہ میرا بھی حق نہ تھا

دانشوروں کا حال بھی کچھ مختلف نہ تھا ÷ چیرا تو ان کے پیٹ میں بھی اک الف نہ تھا

شعر و ادب میں نام نہاد نقادوں سے صداقت نامہ توصیفی حاصل کرنے کے رواج پر بھی مظفر صاحب کی چوٹ بڑی کاری ہے۔

فاروقیوں کی جنبش ابرو پہ رکھ نظر ÷ پھر شعر کہہ کے جانب نارنگ دیکھنا

شعری و ادبی صورت حال، شاعروں کی سیاست کے علاوہ مظفر صاحب کے طنز کی زد فرقہ وارانہ تعصب کو ہوا دینے والوں پر بھی پڑتی ہے اور یہ ایسا موضوع ہے جس سے سارا اردو ادب بھرا پڑا ہے کہ اردو والوں کو ہی یہ سب کچھ بھگتنا پڑتا ہے۔ ؎

نہ غمخواری نہ دلداری ملے گی ÷ اب ان شہروں میں خوں خواری ملیگی

ملے گا گوشت سستا آدمی کا ÷ گراں قیمت پہ ترکاری ملیگی

(یہی خیال اک اور غزل میں یوں آیا ہے ع

گوشت تو ہے انسان کا سستا اور گراں ہے ترکاری)

شوخی اور طنز تقریباً ہر قابلِ ذکر شاعر کے پاس مل ہی جاتا ہے۔ خاص طور پر غالب اور اقبال کے کلام میں بے شمار ایسی مثالیں مل جائیں گی۔ مظفر صاحب کے فکر و فن میں شوخی اور طنز نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اس لیے ان کے اس خاص پہلو کی طرف میں نے اشارے کئے۔ اسی اسلوب نے مظفر صاحب کی غزل کو اینٹی غزل کا درجہ دیا۔ یوں بھی اب ہجر و وصال کے قصوں کے لیے ادب میں گنجائش کم رہ گئی ہے ورنہ ایک دور تھا کہ جگر کے اس قسم کے اشعار پر پھبتیاں اڑتی تھیں ؎

وصل نے شاد کیا ہجر نے ناشاد کیا ÷ اس نے جس طرح سے چاہا مجھے برباد کیا

جس پر جوش ملیح آبادی نے طنز کرتے ہوئے کہا تھا ؎

کچھ نہیں اس کے سوا جوش حریفوں کا کلام ÷ وصل نے شاد کیا، ہجر نے ناشاد کیا

مظفر صاحب کے فکر و فن پر پروفیسر مغنی تبسم کی یہ جامع اور دلچسپ رائے بہت معنی خیز اور مظفر صاحب کی پوری شخصیت کا احاطہ کرتی ہے کہ "(مظفر صاحب کا) یہ اسلوب سنجیدہ غیر سنجیدگی اور غیر سنجیدہ سنجیدگی سے عبارت ہے"

چونکہ زبان و بیان کے معاملے میں مظفر صاحب خاصے آزادہ رو LIBERAL واقع ہوئے ہیں کہیں کہیں تو اوزان و بحور سے بھی انھوں نے کھلواڑ کی ہے، کہیں ضرورتاً صوتی قافیے بھی برتے ہیں اور کہیں کہیں چونکانے میں وہ جدید ترلب و لہجہ اختیار کرتے ہیں اس لیے یہ غزل سے زیادہ اینٹی غزل کے شاعر لگتے ہیں۔ اور اینٹی غزل کا شاعر اپنے اسلوب میں سنجیدگی کے بجائے غیر سنجیدہ طرز فکر کے قبیلے کا آدمی ہوتا ہے۔ مظفر صاحب کا یہ ایک غالب پہلو ہے ورنہ ان کی سنجیدہ تخلیقات اور اینٹی غزل میں وہی فرق ہے جو اقبال اور "اکبری اقبال" میں ہے۔

□□

انتخاب کلام

مضطر مجاز

کیا خوب خدا کو بات سوجھی
لے دے کے مری ہی ذات سوجھی
جلتے ہوئے مہر و ماہ و انجم
مِٹتی ہوئی کائنات سوجھی
سوجھا نہیں اور کام کوئی
بس مشقِ تجلّیات سوجھی
ہر شئے کو بنا کے کُلُّ ھالک
ہر چیز ہی بے ثبات سوجھی

●

مجنّوں میاں بھی تھے وہاں پنواڑی لال بھی
مضطر "گجل" سُنانے کا ہم کو ہی "حک" نہ تھا

●

ہوا کے زور پہ اُڑتے تھے آسمانوں میں
ہوا کے رُکتے ہی ردّی کی ٹوکری میں گرے

●

اُگ رہی ہیں، قحط غزلوں کا نہیں
بُھک مری کا کوئی اندیشہ نہیں
چل رہے ہیں کارخانے شعر کے
کونسا ہے مال جو گلتا نہیں

●

کہتی تھی لومڑی ہے کلیلوں میں کیا مزہ
جنگل کے شیر گھاس جو چرتے تو دیکھتے

●

میں قاش فروشِ دلِ صد پارہ ہوں مضطر
اور لوگ چنا جور گرم مانگ رہے ہیں

●

ناگ پھنیوں کی بھی دھوم! چنا جور گرم!!
گُل ہوئے باغ سے معدوم چنا جور گرم
الحمدللہ کہ ٹھہرا ہے ہر اک لوک و لنگ
فاتحِ سلطنتِ روم! چنا جور گرم
کیوں نہ دیں دادِ مبارز طلبی زید و بکر
وارثِ جامیؔ و مخدومؔ چنا جور گرم
شاعری چھوڑ چنے بیچیے مضطرؔ صاحب
تابہ کے نالۂ منظوم چنا جور گرم

●

املا بھی نہیں درست، لیکن
فرہنگ کا باب لکھ دیا ہے
سب اہلِ لغات دم بہ خود ہیں
بلبل کو غراب لکھ دیا ہے
تم اپنی سنبھالو لائبریری
ہم نے تو جناب لکھ دیا ہے
جغرافیہ پڑھ کے زندگی بھر
ستلج کو چناب لکھ دیا ہے

جلتے ہوئے مکاں ہیں، مکیں خیریت سے ہیں
مرمر کے زندگی کے امیں خیریت سے ہیں

میرٹھ میں گھر ہیں اور بڑودے میں کاروبار
تکلیف ہم کو کوئی نہیں خیریت سے ہیں

تم بھی اٹھا رہے ہو مزے بیچ کر ضمیر
ہم بھی لٹا کے نقدِ یقیں خیریت سے ہیں

کابل ہو، کوریا ہو، کراچی ہو یا کویت
مشرق کے مستِ حال مکیں خیریت سے ہیں

مضطر بڑے مزے سے گزرتی ہے زندگی
ہر در پہ جھک رہی ہے جبیں خیریت سے ہیں

●

جوہر کی بات اور ہے فن اور علم اور
لیکن سند سند ہے وہ جعلی ہی کیوں نہ ہو

●

اس بھک مری میں اس کو غنیمت ہی جانیئے
یاروں کی جوتیوں میں اگر دال بٹ گئی

●

سن لو رباعی یا غزل، سہرا قصیدہ یا ہزل
اس شہر میں ہر گام پہ ہے اک سے اک شاعر پڑا
تحقیق سے ثابت ہوا، دیوار تو معصوم تھی
سایہ ہی اپنے دوش پہ دیوار لے کر گر پڑا

●

بہ صد فر و تزک و احتشام غائب تھے
پڑا جو رن تو سب عالی مقام غائب تھے
مشاعرے ہوئے ایسے بھی شہر میں مضطر
کہ شاعروں ہی کے فہرس سے نام غائب تھے

●

کچھ ناقدوں کے واسطے بھی نقل و اکل و شرب
نام آوری ادب میں اب ان کے ہی بس میں ہے

●

الفاظ کے سیلاب ادھر کشتِ سخن میں
اور ملکِ معانی میں ادھر کال پڑا ہے
پڑھ سکتے نہیں شعر بھی جو بحر میں مضطر
وہ لوگ بھی منہ آئیں تو کیا طرفہ مزا ہے

●

عجیب مشغلہ ہاتھ آ گیا ہے زاہد کو
کہ وقفے وقفے سے اٹھ کر چلا ہے مسجد کو

●

لفظِ 'ساز' اس نے صاد سے لکھا
زمرہ لکھا تو ضاد سے لکھا
ہو غلط یا صحیح، اس نے مگر
جو لکھا اعتماد سے لکھا

●

دانش وروں نے چاٹ لیں سب لائبریریاں
دیمک کے واسطے کہیں آدھا ورق نہ تھا

●

نہ لگی آگ ہی اُن میں نہ لٹے مال و متاع
ابھی اس شہر میں باقی ہیں کئی گھر ایسے

●

پی گیا اپنا ہی پانی، دریا!   کھا گیا سارا خزانہ، خازن
شرطِ اول ہے کہ اُجلی ہو قمیض   میلی کتنی ہی سہی بنیائن

●

بو کے گندم ہے کاٹنا اب جَو   دفعتاً آ گئی ہے فصلِ دِرَو
لطف تو یہ ہے ایک حرف نہ تھا   تھے تو صفحے کتاب کے دو سَو
سانپ کے پاس اور سورج رہن؟   تو چراغوں کے پاس چاند گِرو
سر میں بھینسوں کے بین کا سودا   لب پہ زاغوں کے نغمۂ خسرو
ہائے کیا نکتہ آفرینی تھی   ضو کو اک دوست پڑھ رہے تھے ضَو

●

گیا وہ جیب میں تقسیم کرنے والوں کی   جو لوٹ مار میں تھا حصۂ رسد میرا
ہر ایک بونے کے جھک جھک کے لے رہا ہے قدم   تو کیا یہی ہے وہ شہرِ دراز قد میرا
اگر نصیب سے برخود غلط نہ ہوتا میں   کہا ہوا کبھی ہوتا نہ مستند میرا

●

یہ اور بات ہے کہ کوئی مانتا نہیں   شاعر تو ہو بہت ہی بڑے تم جنابِ من
اپنی انا کے غار سے نکلو گے کس طرح   یہ ہم تو کہنا بھول گئے تم جنابِ من
ہے شاعری کا شوق تو مضطر بہم کرو   تھوڑی بہت تو مشقِ ترنم جنابِ من

●

عجیب صورتِ حالات ہے جنابِ شیخ   کہ مسجدوں میں نمازیں ہیں کم، اذاں بہت
محلے بھر کے مکانوں کو جگمگا دے گا   ہے ایک آدھ بھی جلتا ہوا مکان بہت
مگر سیاہیاں راتوں کی چھٹ نہیں پاتیں   اگرچہ کرتے ہیں کوشش تو چندر بھان بہت

●

دانش وروں کا حال بھی کچھ مختلف نہ تھا   چیرا تو ان کے پیٹ میں بھی اک الف نہ تھا

●

یہی نہیں ہے کہ اُگ رہے ہیں عمارتوں کے مہیب جنگل   مزہ تو یہ ہے کہ بستے جاتے ہیں ڈھور ڈنگر بھی بن میں آکر
الف کا ہم نام لے رکھیں گے نئے نئے ذائقے چکھیں گے   کہ لفظ چولا بدل رہے ہیں ہماری فردِ سخن میں آکر

●

معتبری چاہیے تو بینک میں کھاتہ کھول   شعر شاعری کارِ فضول، ہیچ و پوچ
زور آور سے دوستیوں کا ہاتھ ملا   ڈھول دھمکا کر کے کم لوگوں کو دبوچ
آئینہ نردوش ہے آئینے کو نہ توڑ   آئینے کو نہ توڑ، اپنا چہرہ نوچ

●

سنہ ہم جہل کی اک جامعہ سے لائے ہیں مضطر   زباں ہم ہیں، بیاں ہم ہیں، لغت ہم اور منجد ہم

●

فن کار ہے تو اپنے ہنر کی بھی جانچ کر   دو اور دو کو چھ نہیں کرتا تو پانچ کر
سچ بولنے کی تاب نہیں ہے تو کم سے کم   اے عقل مند! جھوٹ کو چمکا کے سانچ کر
ہیرے کو کون پوچھنے والا ہے اے عزیز   ہیرے کو چھیل چھال کے چمکا کے کانچ کر
مضطر اڑا کہیں سے کوئی مصرعِ طرح   اپنی غزل پھر ایک بنا کھینچ کھانچ کر

●

کیکر، ببول، ناگ پھنی سب مزے میں ہیں   بجلی تو شاخِ گل پہ گری سب مزے میں ہیں
حور و فرشتہ جنّ و پری سب مزے میں ہیں   افتاد تو ہمیں پہ پڑی سب مزے میں ہیں
کابل سے لے کے تا بہ سوادِ یروشلم   آتی ہے روز خوش خبری سب مزے میں ہیں
اک شعر ہی کی جان پہ طاری ہے بے کسی   صنعت گرانِ حرف روی سب مزے میں ہیں
چکی میں پس رہا ہے تو بس ایک گھن غریب   گندم، جوار، موٹھ، مکئی سب مزے میں ہیں
میرٹھ میں خوں کا پھاگ بڑودے میں آگ راگ   ہے شہر شہر رنگ رلی سب مزے میں ہیں

مضطر کسی دن اُس کو ٹھکانے لگا بھی دے
اپنا ضمیر بیچ کے ہی سب مزے میں ہیں

●

فاروقیوں کی جنبشِ ابرو پہ رکھو نظر   پھر شعر کہہ کے جانب نارنگ دیکھنا
مضطر یہ جاننا کہ کھلے تیرے سر کے بھاگ   ہاتھوں میں دوستوں کے اگر سنگ دیکھنا

●

یہ کیا ضرور کہ سب ٹھیک ٹھیک شعر کہو!   مشاعروں کے لئے کچھ رکیک شعر کہو
اگرچہ وقت انھیں ڈسٹ بن میں پھینکے گا   سمجھ کے خود کو مگر والمیک شعر کہو
رسالے، ریڈیو، ٹی وی سبھی سے پینگ بڑھاؤ   ہر اک سے رکھ کے علیک و سلیک شعر کہو
لکھو کہانیاں لیٹن[1] میں تاکہ سمجھے نہ کوئی   اسی طرح بہ زبانِ گریک[2] شعر کہو

---

1. LATIN, 2. GREEK

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

[اداریہ]

ممتاز بزرگ مزاحیہ شاعر جناب اسمٰعیل ظریف کا گذشتہ مہینے انتقال ہوگیا۔ وہ ایک طویل عرصہ سے علیل تھے۔ لیکن یہ علالت ان کی زندہ دلی اور تخلیقی عمل کو متاثر نہ کرسکی۔ ان کا کلام شگوفہ میں پابندی سے چھپتا رہا۔ اپریل ۹۶ء میں منعقدہ زندہ دلان حیدرآباد کے مشاعرہ میں البتہ وہ شریک نہ ہوسکے۔ مشاعروں میں وہ اپنے مخصوص انداز میں قطعات اور نظمیں سنایا کرتے تھے۔ اور بے حد پسند کئے جاتے تھے۔ ظریف صاحب کے انتقال سے حیدرآباد میں ظرافت کی صحت مند روایت کو سخت نقصان پہنچا۔ ایک بلندپایہ مزاحیہ شاعر سے ہم محروم ہوگئے۔ "شگوفہ" سے بھی ان کو خاص قلبی لگاؤ تھا۔ تقریباً ہر مہینہ بالالتزام دوسطری خط کے ساتھ وہ اپنا کلام ارسال کرتے تھے۔ ان کے سانحۂ ارتحال پر ہم ان کے پسماندگان کے غم میں شریک ہیں، خدا غریق رحمت کرے۔

شگوفہ کے آئندہ شمارہ کے ذریعہ ہم اپنے دیرینہ بزرگ رفیق اسمٰعیل ظریف کو خراج عقیدت پیش کریں گے۔

● شگوفہ کے اس شمارہ میں رکن مجلس ادارت اور نامور شاعر مظفر مجاز کے طنزیہ کلام کے ساتھ ان کی طنزیہ شاعری پر ایک مضمون اور ایک خاکہ شامل اشاعت ہے۔ مظفر مجاز یوں تو سنجیدہ شاعر ہیں لیکن ان کی گفتگو صرف مشاہدہ کا عکس نہیں، اس میں شاعر کے اندر چھپے ہوئے مضطرب مبصر کی رائے بھی شریک رہتی ہے۔ اور مظفر مجاز جانتے ہیں کہ طنز و شوخی کے بغیر جو ان کے مزاج کا خاص وصف بھی ہے، بات بنتی نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آئندہ بھی شگوفہ میں ایسے سنجیدہ شعرا کا خاص طور سے ذکر ہو، جن کے کلام میں طنز کا عنصر حاوی اور مزاح کی ہلکی جھلک ہوتی ہے۔

ہمارا ملک سیاسی، سماجی اور معاشی بدعنوانیوں کی گرفت میں ہے۔ اس ضمن میں ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کی بے حسی کا نامور افسانہ نگار جیلانی بانو نے ایک مضمون میں ذکر کیا ہے۔ اکثر ادیب اور شاعر اس آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ رہے ہیں۔ لیکن شگوفہ کے صفحات شاہد ہیں کہ طنز و مزاح نگار ان برائیوں کے خلاف کسی ہدایت، فرمائش یا تحریک کے بغیر مسلسل لکھ رہے ہیں!

● شگوفہ کی سالانہ خریداری میں دسمبر ۱۹۹۶ء سے اضافہ کیا جارہا ہے۔

اب سالانہ خریداری ۱۲۰ روپے ہوگی۔

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد : ۲۹

شمارہ : ۱۲

ڈسمبر : ۱۹۹۶ء

مدیر : ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

ایڈیٹر اوورسیز: ڈاکٹر عابد معز (ریاض)

اوورسیز کمیٹی: مصلح الدین سعدی، جدہ
شجاع الدین غوری، جدہ
سعید شوکت، جدہ
ایس یم حسینی، آسٹریلیا
غلام نجم الدین، دوبئی

مجلس مشاورت:
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین
یوسف ناظم
نعمت اللہ

مجلس ادارت:
مصطفیٰ مجاز
طالب خوندمیری
صلاح الدین نیر
رحیم الدین توفیق

کتابت : محمد غالب، محمد عبدالرؤف
طباعت : دائرہ الکٹرک پریس، چھتہ بازار
قیمت : ۱۰ روپے
سالانہ خریداری : ۱۲۰ روپے
بیرونی ممالک سے : ۳۰ ڈالر

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ:
[illegible] معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد-۱
فون آفس: 595718 رہائش: 4576084

ماہنامہ شگوفہ
کا آئندہ شمارہ
سالنامہ
ہوگا
نامور طنز و مزاح نگاروں کی تخلیقات
انشائیے، خاکے، افسانے، ڈرامے اور رپورتاژ
کارٹون، لطیفے
طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ
منتخب تصویریں
قیمت ۵ روپے
صفحات ایک سو سے زائد
سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف ولایت کا اچھا ہے یہ
کشمیری قوام
نقل اور ملتے جلتے مال سے بچنے اور اصلی کشمیری قوام خریدنے کے لیے
اس کے ڈبے اور پیکنگ کو بغور دیکھئے
تیار کنندگان:
پورن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس (گلزار حوض حیدرآباد-۲)

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

گوشہ اسمٰعیل ظریف

جناب اسمٰعیل ظریف

پیدائش ۱۰/اکتوبر ۱۹۱۹ء

وفات ۵/اکتوبر ۱۹۹۶ء

شکاگو میں مزاحیہ مشاعرہ

ہنسنے ہنسانے کی ایک یادگار شام ۔ طنز و مزاح کے ممتاز شعراء کو اعزازات

رپورتاژ — احمد دکنی، شکاگو

امریکہ کی مصروف ترین زندگی میں دن بھر کی ذہنی و جسمانی تکان کے بعد اگر شام کو ہنسنے ہنسانے اور رات کو خوش و خرم رہنے کا بندوبست ہوجائے تو اس کو اک نعمت غیر مترقبہ اور خدائی دین ہی سمجھنا چاہیئے ۔ تیز رفتار اور ترقی یافتہ ممالک میں جن انسانوں کو یہ مواقع اکثر و بیشتر نصیب ہوتے رہتے ہیں وہ اپنے آپ کو یقیناً خوش نصیب تصور کرتے ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ ہنسنے سے انسان کی عمر میں اضافہ ہوتا ہے اور جتنہ دل سے ہونٹوں تک پہنچنے والی ایک ہنسی سو غموں کو کافور کردیتی ہے ۔ اس کہاوت کو لوگ مانیں یا نہ مانیں مگر امریکہ میں ہنسنے ہنسانے کی فطری ضرورت و اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے انٹرٹینمنٹ اسوسی ایشن آف نارتھ امریکہ ۔ شام برگ / شکاگو (EANA - SCHAUMBURG / CHICAGO) نے گلین رمین ہالی ڈے ان کے مخصوص ہال میں اک شاندار مزاحیہ مشاعرہ کا اہتمام کیا تھا ۔ مزاحیہ مشاعرہ کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ شائقین کے بے حد اصرار پر منتظمین کو ڈیڑھ ماہ کی قلیل مدت کے بعد یہ مشاعرہ عوام کے لئے دوبارہ منعقد کرنا پڑا ۔ اس سے قبل اینا (EANA) کی جانب سے یہ کامیاب مزاحیہ مشاعرہ، امریکہ میں پہلی مرتبہ ۔ انڈو امریکن سنٹر ۔ شکاگو میں منعقد کیا گیا تھا جس کو عوام و خواص نے بے حد پسند کیا تھا ۔

بالی ڈے ان کے مزاحیہ مشاعرہ کا آغاز جناب خلیل الزماں خاں ۔ صدر ایغا کے استقبالیہ کلمات سے ہوا جنہوں نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے مشاعرہ کی کاروائی کے آغاز کے لئے جناب توفیق انصاری احمد کو مائیک پر آنے کی دعوت دی جناب توفیق انصاری احمد نے شکاگو میں مشاعروں کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا "مشاعرے ہماری ادبی و سماجی زندگی کا اہم جز بن چکے ہیں اور شکاگو کے ادبی و عوامی حلقوں نے ہمیشہ کھلے دل سے اہل علم و ہنر کی خدمات کا اعتراف کیا ہے" انہوں نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے طنز و مزاح کے منفرد مہمان شعراء ۔ جناب عظمت بھلاواں ، جناب مرزا مصطفیٰ علی بیگ کو پیش کیا اور مشاعرہ کی صدارت کے لئے شکاگو کی ممتاز ادبی و سماجی شخصیت ، نمائندہ دکن جناب حسن چشتی کے نام کا اعلان کرتے ہوئے صدر مشاعرہ سے شہ نشین پر تشریف لانے کی درخواست کی ۔ اس مزاحیہ مشاعرہ میں خادم اردو جناب مسعود صوفی سید نے مہمان اعزازی اور امتیاز دکن جناب ہاشم علی اختر سابق وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت فرمائی ۔ نظامت کے فرائض شکاگو کی جانی پہچانی شخصیت ، جناب ملک سعیدی نے انجام دیئے ۔

مشاعرہ کے آغاز سے قبل ، بالی ڈے ان کا خوبصورت ہال میزبان و مہمان شاعروں ، ادبی شخصیتوں اور اہل ذوق سامعین سے کھچا کھچ بھر چکا تھا ۔ مشاعرہ میں شرکت کی خاطر ۔ کئی شائقین ، دوسرے اسٹیٹس سے طویل ڈرائیو کر کے شکاگو پہنچے تھے ۔ اس مشاعرہ میں خواتین کی بھی اچھی خاصی تعداد دیکھنے میں آئی ۔ جس سے مزاحیہ شاعری میں ، خواتین کی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے ۔

عظمت بھلاواں کے بعد جناب مرزا مصطفیٰ علی بیگ نے مائیک سنبھالا اور پھر جب وہ اپنے خاص اسٹائیل میں غزل سرا ہوئے تو ہال ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئی ۔ اردو کے ساتھ انگریزی الفاظ کی ملاوٹ کا صحیح لطف سامعین کو اس وقت آیا جب انہوں نے انگلش و امریکن اسٹائیل میں غزلوں کو خاص اتار چڑھاؤ کے ساتھ گانوں کے انداز میں ، ترنم سے پیش کیا ۔ اس طرح امریکن ماحول میں اردو غزل سرائی کا لطف دو بالا ہو گیا اور اردو کی معمولی سدھ بدھ رکھنے والے بھی غزل کا مطلب اور اسٹائل سمجھ کر کلام کی داد دینے پر مجبور ہو گئے ۔ مرزا مصطفیٰ علی بیگ ، جب اپنا جادو جگا کر مائیک سے ہٹے تو ناظم مشاعرہ جناب ملک سعیدی نے جناب محمد حمایت اللہ کے نام کا اعلان کیا ۔ حمایت دکنی زبان کے خاص شاعر ہیں ۔ سیدھا سادھا ، رواں دواں ، اور موضوعات کا انتخاب دلچسپ ہے

[illegible]

جناب محمد حمایت اللہ کی دکنی حمایت و طرفداری کے بعد مشاعرہ کی گرما گرمی میں کافی اضافہ ہو چکا تھا اس لئے ماحول کو متوازن کرکے بام عروج پر پہنچانے کے لئے جناب ملک سعیدی نے بمبئی سے آنے والے طنز و مزاح کے ممتاز شاعر جناب خواہ مخواہ حیدرآبادی کو دعوت سخن دی۔ خواہ مخواہ حیدرآبادی کو غزل و نظم دونوں میں ملکہ حاصل ہے مگر قطعات میں ان کا جواب نہیں۔ سیدھا سادھا انداز، اچھوتے مضامین، بے ساختہ بندشیں اور الفاظ کا بہاؤ دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک ایک لفظ نگینہ کی طرح ہر مصرعہ میں پیوست ہے اور ہر قطعہ لطف سے بھرپور ہے۔ خواہ مخواہ اس سے قبل شکاگو میں مشاعرے پڑھ چکے ہیں اس لئے اس جانے پہچانے مقبول شاعر کا استقبال پبلک نے بڑی گرمجوشی سے کیا۔ خواہ مخواہ حیدرآبادی نے قطعات کے علاوہ کئی ایک عمدہ غزلیں و نظمیں سنائیں اور سامعین سے داد حاصل کرکے اک سماں باندھ دیا۔

مشاعرہ کے پہلے دور کے اختتام سے قبل اینا (EANA) کی جانب سے اعزازت کا اعلان کیا گیا۔ یہ اعزازت صدر اینا جناب خلیل الزماں خاں نے مہمان خصوصی امتیاز دکن جناب ہاشم علی اختر کے توسط سے مہمان شعراء کی خدمت میں پیش کئے۔ قبل ازیں نمائندہ دکن جناب حسن چشتی نے شعراء کرام و مہمان خصوصی کی گلپوشی فرمائی۔ عظمت بھلاواں کو "شاعر قہقہہ"۔ مرزا مصطفی علی بیگ کو "شاعر کامبی نیشن" محمد حمایت اللہ کو "شاعر لطافت" اور خواہ مخواہ حیدرآبادی کو شاعر ظرافت" کے خصوصی اعزازات عطا کئے گئے۔ حاضرین نے بار بار کھڑے ہوکر تالیوں کی گونج میں شعراء کے کلام و مقام کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس موقعہ پر ڈاکٹر خورشید خضر نے مہمان شعراء کی خدمت میں اک اعترافی قطعہ بھی پیش کیا۔

مختصر وقفہ کے بعد مزاحیہ مشاعرہ دوبارہ شروع ہوا جس میں مہمان شعرا کو جی بھر کر سنا گیا اور پھر آخر میں صدر مشاعرہ جناب حسن چشتی نے اپنی صدارتی کلام پیش فرمایا۔ اس طرح طنز و مزاح لطافت ظرافت گدگدیوں قہقہوں، کامبی نیشن، اپری شی ایشن اور ہنسنے ہنسانے کی یہ دلچسپ حسین و یادگار شام رات دیر گئے ہنسی خوشی اختتام کو پہنچی۔

مجتبیٰ حسین

مرزا غالب اور مرزا غالب

{ مرزا غالب اپنی شاعری کے علاوہ مکتوب نگاری کے لیے بھی عالمی شہرت رکھتے ہیں۔ ہمارے نام ان کے ایک مکتوب کی پیروڈی ملاحظہ فرمائیں۔ }

برخوردار سعادت اطوار میاں مجتبیٰ! خوش رہو (چاہے کتنے ہی آلام و مصائب کا سامنا کیوں نہ ہو) آج بدھ کا دن، بیس تاریخ نومبر کی، ڈیڑھ پہر دن گئے ڈاک کا ہرکارہ آیا، حسب توقع تمہارا نامہ نہیں لایا۔ ادھر کئی عشروں سے ہندوستان جنت نشان سے ڈاک نہیں آئی۔ خارجاً مسموع ہوا ہے کہ پچھلے دنوں وہاں ڈاک کے ہرکاروں کی ہڑتال چل رہی تھی۔ بھئی! یہ ہڑتال کیا بلا ہے۔ ہمارے زمانے میں اس کا چلن نہیں تھا۔ ہندوستان سے اردو کے اکثر شاعر اور ادیب یہاں آتے رہتے ہیں بلکہ اب تو سب سے زیادہ یہی لوگ آنے لگے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک نے بتایا کہ سوائے شاعری کے ہر شعبۂ زندگی میں ہڑتال کا چلن عام ہوگیا ہے۔ آخر یہ اردو شاعر ہڑتال کیوں نہیں کرتے ہیں تو زمانہ کے ساتھ چلنا چاہیئے اور کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہیئے۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ اس وقت ایک فرودی امر کے تحت تمہیں یہ نامہ لکھ رہا ہوں۔

کل ایک صاحب دہلی سے عالم بالا میں وارد ہوئے ہیں۔ سرِراہ مل گئے تو میں نے ان سے دہلی کا حال جاننا چاہا۔ پتہ چلا ان دنوں دہلی میں میرے اور استاد شاہ شیخ ابراہیم ذوق کے مزاروں کا چرچا عام ہے اور ہم دونوں جن مکانوں میں رہتے تھے ان کا تذکرہ بھی جگہ جگہ ہونے لگا ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے بھائی؟! مجھے اس امر پر تشویش ہے۔ میں گلی قاسم جان کے جس مکان میں رہتا تھا وہ کرایہ کا مکان تھا۔ یہ بھی سوا سو، ڈیڑھ سو برس پرانی بات ہے۔ اگرچہ اس وقت قویٰ مضمحل ہو چکے تھے پھر بھی یاد پڑتا ہے کہ اس مکان کا کچھ کرایہ مجھ پر واجب الادا تھا۔ تم تو جانتے ہو کہ قرض کی مے پینے اور ادھار کی زندگی جینے کا مجھے کتنا شوق تھا مگر اپنی کلاہ کج سے بانکپن میں فرق نہ آنے دیا۔ مبادا کہیں ایسا تو نہیں کہ میرے مالکِ مکان کے ورثا نے کرایہ کے بقائے کی وصولی کے لیے مجھ پر نالش کر دی ہو۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا مقدمہ وہاں کی عدالت العالیہ میں زیرِ دوران ہے اور جسٹس کلدیپ سنگھ اور جسٹس منیر احمد اس مقدمہ کی سماعت کر رہے ہیں۔ عزیزی منعم محی الدین نے بتایا کہ جسٹس منیر احمد سے تمہاری شناسائی ہے۔ اللہ رے تم ان کے دستِ مبارک سے "مخدوم ایوارڈ" بھی لے چکے ہو۔ یہ بھی کسی نے بتایا کہ جسٹس منیر احمد نے تمہیں کا میرے مکان اور میرے

مزار کے بارے میں استفسار کیا ہے۔ آخر یہ کیا معاملہ ہے؟ میرے مرنے کے اتنے برس بعد اگر میرے مالکِ مکان نے کرایہ کے بقائے کی وصولی کے لیے نالش کی ہے تو یہ سراسر زیادتی ہے۔ چونکہ قرض کی زندگی جیتا تھا اس لیے یہاں آتے ہوئے وہاں ڈھنگ کے ورثا بھی نہیں چھوڑ آیا تھا کہ بعد کو ناحق پریشان ہوں گے۔ اتنی دور اندیشی تو مجھ میں ہمیشہ رہی۔

یہی صاحب بتا رہے تھے کہ بستی حضرت نظام الدین میں میرے مزار کے اطراف جو دکانیں تھیں انہیں اب ہٹا دیا گیا ہے۔ اب یہاں کوئی یادگار تعمیر کی جائے گی۔ میاں مجتبیٰ! ذرا میرے پاس آؤ اور میری باتیں غور سے سنو۔ میں اپنے مزار میں تو صرف چند دن ہی رہا۔ بعد میں دیکھا کہ میری قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے کوئی نہیں آتا تو میں ہی کبھی کبھار شرما شرمی میں اپنی ہی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے چلا جاتا تھا۔ خدا بھلا کرے برخوردار سہراب مودی کا کہ انھوں نے میرے نام سے ایک فلم بنائی۔ میں نے تو نہیں دیکھی مگر لوگ کہتے ہیں کہ یہ مجھ سے زیادہ چلی اور انھیں منافع ملا تو اس منافع میں سے میرے مزار کی مرمت کروا دی۔ بعد میں ہمدرد کے عزیزی حکیم عبدالحمید نے اس کے اطراف حصار باندھ دیا اور میرے نام سے ایک ادارہ بھی وہاں قائم کر دیا۔ اب وہاں سال کے سال میری برسی پر پھولوں کی چادر چڑھائی جاتی ہے مگر وہاں فاتحہ پڑھنے کے لیے خاص خاص ہی لوگ آتے ہیں۔ تمہیں دہلی میں رہتے ہوئے پچیس برس بیت گئے اس لمبے عرصہ میں تم بھی صرف دو بار میرے مزار پر آئے۔ ایک بار برخوردار صادقین کے ساتھ اور دوسری بار روس کی اردو اسکالر لا میلا داسی لیوا کے ساتھ۔ اگر یہ لوگ دہلی نہ آتے تو شاید تم کبھی میری قبر پر نہ آتے۔ میرے مزار کے سامنے سے اب بھی چوری چھپے نکل جاتے ہو۔ بھائی میرے! میرے مزار کے اطراف جو دکانیں لگ گئی تھیں انھیں ہٹانے کی کیا ضرورت تھی۔ ان سے کچھ تو رونق لگی رہتی تھی، دل بہلا رہتا تھا۔ ہم شاعروں اور فنکاروں کو تو تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے کی فکر لگی رہتی ہے۔ اب یہاں سرِشام ویرانی سی چھا جاتی ہے۔ سچ پوچھو تو مزار کو میں زیادہ اہمیت نہیں دیتا میں نے تو جیتے جی ہی کہا تھا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا ÷ نہ کہیں جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

اب اگر میں بدقسمتی سے غرقِ دریا نہیں ہوا تو میرے مزار کو لے کر اتنا ہنگامہ کیوں ہو رہا ہے۔ میں نے تو اپنی شاعری کو ہی ذریعۂ عزت نہیں جانا تو اب اپنے مزار کے لیے بھلا کیوں ہلکان ہوں گا۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ استاد شاہ شیخ ابراہیم ذوق کے مزار کی حالت تو اور بھی دگرگوں ہے۔ کیا ان کی زندگی پر کسی نے کوئی فلم نہیں بنائی تھی — ہو سکتا ہے بنائی ہو اور یہ نہ چلی ہو ورنہ منافع میں ان کے مزار کی بھی مرمت ہو جاتی۔ جب تک ہم دونوں دنیا میں حیات رہے "معاصرانہ چشمک" میں مبتلا رہے مگر عالمِ بالا میں آنے کے بعد احساس ہوا کہ یہ سب جہالت کی باتیں تھیں۔ محرومیاتِ زندگی نے ہمیں گمراہ کر رکھا تھا۔

بہادر شاہ ظفر جو کبھی شہنشاہ ہندوستان تھے یہاں بھی اکثر ملتے رہتے ہیں۔ یہاں ایک ایسی بادشاہت کی حکمرانی ہے کہ مجھے بہادر شاہ ظفر کا مصاحب بن کر اتراتے پھرنے کی حاجت نہیں رہی۔ ان سے میں عام سطح پر ملتا ہوں اور کبھی ان کا کوئی مصرعہ بحر سے خارج ہوتے اشاروں اور کنایوں میں اس کی نشاندہی کرنے کی بجائے برملا اس کا اظہار کر دیتا ہوں۔ پہلے کی طرح قبلہ قبلی نہیں کرتا۔ عالمِ بالا میں رہنے کے بھی تو فائدے ہیں

کہ یہاں کسی کا قصیدہ نہیں پڑھنا پڑتا۔ خیر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ معلوم ہوا ہے کہ ابراہیم ذوق کے مزار کو لوگوں نے مسمار کر دیا ہے اور اس پر بیت الخلاء تعمیر کر دیئے ہیں۔ یہ سن کر مجھے تو بہت دکھ ہوا لیکن خود شیخ ابراہیم ذوق کی رائے اس معاملہ میں ذرا مختلف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب تک ان کا مزار برقرار رہا وہاں فاتحہ پڑھنے کے لیے کوئی نہیں آتا تھا۔ اب اگر لوگ "ضرورت شعری" کے تحت نہ سہی کسی اور "ضرورت" کے تحت یہاں آتے ہیں تو انھیں بھی روک دینا مناسب نہیں ہے۔ لوگوں کا آنا جانا بہر طور لگا رہنا چاہیئے۔ نیچے کی دنیا میں چہل پہل ہی تو سب کچھ ہے ورنہ عالم زیریں کی زندگی میں رکھا کیا ہے۔ ذوق کے ذکر کو یہاں چھوڑتا ہوں تاکہ تم یہ نہ سمجھو کہ مرنے کے اتنے برس بعد بھی میں "معاصرانہ چشمک" کے مرض میں مبتلا ہوں۔

بھئی میرے۔ یہ سب نیچے کی دُنیا کی باتیں ہیں۔ اُوپر آؤ گے تو پتہ چلے گا کہ یہ سب بیکار کی باتیں ہیں (کب آ رہے ہو؟ ضرور لکھو۔ تمہارے بھلے کے لیے یہ کہہ رہا ہوں) اور ہاں یہ میرے مکان کا کیا قصہ ہے۔ میرے مرنے کے بعد تو اس مکان میں لکڑی کی ٹال قائم ہوگئی تھی۔ کیا یہ اب تک موجود ہے اگر موجود ہے تو بھائی اسے رہنے دو۔ لکڑی بڑے کام کی چیز ہوتی ہے۔ اس سے گھروں میں چولھے جلتے ہیں۔ 1857ء کے ہنگاموں میں بعض اوقات تو خود میرے گھر میں چولھا نہیں جلتا تھا۔ معلوم ہوا کہ میرے مداح اس مکان کو ایک یادگار کے طور پہ محفوظ رکھنا چاہتے ہیں گھر کا جو تصور میرے ذہن میں تھا اس پر یہ گھر تب بھی پورا نہیں اُترتا تھا۔ میں نے تو ہمیشہ بے در و دیوار سا ایک گھر بنانے کی آرزو رکھی تھی۔ میرے جس گھر کو میرے مداح اب یادگار کے طور پر محفوظ کرنا چاہتے ہیں اس گھر کی چھت کے بارے میں لکھ چکا ہوں کہ برسات کے موسم میں ایک گھنٹہ بارش ہوتی تھی تو اس کی چھت چوبیس گھنٹوں تک ٹپکتی تھی۔ اب ایسے گھر کی یادگار بنا کر تم لوگ کیا کرو گے۔

بھائی میرے میری بات مانو تو گھر اور مزاروں کے چکر میں مت پڑو، ہو سکے تو اس زبان کی حفاظت کے جتن کرو جس میں میں نے اور ذوق نے شاعری کی تھی۔ مجھے تو اس زبان کی فکر یہاں بھی رہتی ہے اور تم لوگ میرے مزار کے چکر میں پڑے ہو۔ یوں بھی میں مکانوں اور مزاروں میں زندہ رہنے کا قائل نہیں ہوں۔ جس زبان میں میں نے شاعری کی ہے اگر وہ زندہ رہے گی تو میں بھی زندہ رہوں گا۔ باقی سب ذیلی باتیں ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ میرے مداح اس نکتہ پر ضرور غور کریں گے میرے تھوڑا لکھے کو بہت جانو۔ نامہ کافی طویل ہوگیا ہے۔ مرزا تفتہ اور میر مہدی مجروح بھی پاس ہی بیٹھے ہیں تمہیں دُعائیں لکھواتے ہیں ــــ تم سے نجات کا طالب۔

غالب۔

۱۲

یوسف ناظم

ادبی صحافتی دو عملی

صحافی اور ادیب دو ہم پیشہ شریک بھائی ہیں اور عملی زندگی میں یہ ایک دوسرے کے ہمدوش رہتے ہیں لیکن ان کے اس اتحاد میں عجیب بات یہ ہے کہ اتفاقِ رائے کا دخل نہیں ہے۔ کشادگیِ قلب کا اس سے بہتر مظاہرہ اور کسی شعبۂ حیات میں نہیں ہوتا۔ تمام اہلِ قلم ایسے تمام پرچوں اور رسالوں میں چھپنے کا شوق رکھتے ہیں جن کے مدیران کی تخلیقات چھاپتے تو ہیں لیکن ان سے متفق نہیں ہوتے اور متفق نہ ہونے کا باضابطہ اعلان کرکے خوش ہوتے ہیں۔ یہ جملہ کہ مدیر کا مضمون نگار سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے، جملہ نہیں ایک اچھا خاصا مقولہ ہے جس کی ولادت، صحافت کی ولادت کے ساتھ نہیں تو فوراً بعد عمل میں آئی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ادب باقی رہے نہ رہے یہ مقولہ بہر حال باقی رہے گا۔ اس پر یقیناً کسی بزرگ کا سایہ ہے۔ اہلِ قلم صحافی حضرات کے اس مقولے کا قطعی بُرا نہیں مانتے بلکہ شکر ادا کرتے ہیں کہ ان کا احسان ان کے سر نہیں ہے اہلِ قلم حضرات کا مدیرانِ جرائد سے برادرانہ تعلقات برقرار رکھنے کی وجہ اکثر لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ خود تمام اہلِ قلم آپس میں اتنے اختلافات رکھتے ہیں کہ کسی اور سے اختلاف کرنے کی سکت ان میں باقی نہیں رہتی۔ مدیرانِ جرائد ایسی صورتِ حال سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور دو چار اہلِ قلم کو کسی ایسے ادبی یا لسانی مسئلے پر جو برسوں پہلے طے ہو چکا ہو، اظہارِ خیال کرنے پر اکساتے، ورغلاتے اور اندر ہی اندر ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور جب نوبت یہ آجاتی ہے کہ ادیبوں کی دراز قلمی، خانۂ ادب کی حدوں سے نکل کر ادیبوں کے "اندرونِ خانہ" حالات تک پہنچ جاتی ہے تو مدیرِ محترم اپنی فتح یابی سے مطمئن ہو کر یہ اعلان کر دیتے ہیں کہ یہ بحث اب ختم کی جا رہی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ مدیرِ محترم یہ بحث صرف اس لیے ختم کر رہے ہیں کہ آرام کے وقفے کے بعد کسی دوسرے فرسودہ موضوع پر ایک نئی بحث کی رسمِ اجرا انجام دیں (صحافت میں ہمیشہ انجام ہی سے آغاز کی ابتدا ہوتی ہے)

ادبی بحثوں کا سلسلہ جسے سیریز کہنا چاہیے ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔ ادبی بحثوں میں بھی یک روزہ میچ ہوتے ہیں۔ لیکن سیمینار کی صورت میں چونکہ معاملہ ادب کا ہوتا ہے جس کا کینوس، کھیل کے میدان سے کافی بڑا ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں اہلِ قلم حضرات کے علاوہ سامعین کو بھی اپنی اپنی اہلیت کے اظہار کا موقع دیا جاتا ہے۔

(یہ بات طے ہو چکی ہے کہ جتنی اہلیت اہلِ قلم میں ہوتی ہے اتنی سامعین میں بھی ہوتی ہے) کچھ سمینار ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں سامعین کو سوالات کرنے کی اجازت دی جاتی ہے اور اس موقع پر بعض سامعین جب سوالات کرنے کھڑے ہوتے ہیں تو پھر بیٹھتے نہیں ہیں۔ ان کا سوال اہلِ قلم کے مقالے سے زیادہ طویل ہوتا ہے اور سوال سن کر مقالہ نگار کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔ اس کے جواب دینے سے پہلے ہی سمینار کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ سمینار ہال اصل میں میدانِ کارزار ہوتا ہے اور شاذ و نادر ہی کوئی مقالہ نگار غازی بن کر باہر نکلتا ہے ورنہ عام طور پر سامعین ہی خرم و شادماں نظر آتے ہیں۔ بعض وقت تو ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ سوال کرنے والا اہلِ سماعت مقالہ نگار پر تقریباً یلغار کرتا ... دکھائی دیتا ہے اور اگر دونوں کے درمیان فاصلہ نہ ہوتا تو شاید سمینار ہال میونسپل کارپوریشن ہال میں تبدیل ہو جاتا۔ جیسے کچھ ممبر میدانِ حشر سمجھ کر ایک دوسرے کے دامن پر (جو مختلف وجوہ کی بنا پر کافی داغ دار ہو جاتا ہے) ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔ ادیب ابھی اس منزل پر نہیں پہنچا ہے (کچھ لوگ تو یہ تک کہتے ہیں کہ اگر ہاتھا پائی اور دھول دھپے ہی سے ملک و قوم کی خدمت کرنی ہے تو اس کے لیے اسمبلی کا ممبر بننا کیا ضروری ہے)

ادیبوں اور ایڈیٹروں کو ایک ہی سکے کے دو رخ اس لیے سمجھا جا سکتا ہے کہ جہاں تک آزادیٔ خیال کا تعلق ہے دونوں کے حقوق تقریباً برابر برابر ہیں۔ خاص طور پر ایڈیٹروں کو تو دنیا کی ہر مخلوق پر فوقیت حاصل ہے۔ پریس کی آزادی کا جب نام آجاتا ہے بڑے بڑوں کی گھگھی بندھ جاتی ہے۔ ادیبوں کی آزادیٔ خیال تو خیر ایک نظریہ ہے لیکن پریس کی آزادی نہ فلسفہ ہے نہ شاعری بلکہ کرکٹ کے تھرڈ امپائر کا صادر کیا ہوا فیصلہ ہے۔ سیاست کار لوگ جو خود کسی وجہ سے صحافی بھی رہے ہیں اس آزادی کا سدِ باب کرنے کے لیے جان توڑ کوشش کرتے ہیں۔ صحافیوں کے کیمرے اور کبھی کبھی منہ توڑ دیتے ہیں ادیبوں کی البتہ ایسی عزت افزائی ابھی تک نہیں ہوتی ہے اور اسی لیے ادیب ایڈیٹروں کے مقابلے میں پسماندہ نظر آتے ہیں۔ صحافیوں کے اغراض و مقاصد (جو سب پر عیاں ہیں) کی ترویج و اشاعت اور ان کی سلامتی وادر حفاظت کے لیے جگہ جگہ پریس کاؤنسل بنی ہوتی ہیں۔ پریس کاؤنسل کے اجلاسوں میں جھوٹ سچ کا فیصلہ ہوتا ہے اور اکثر و بیشتر موقعوں پر جھوٹ کی فتح ہوتی ہے۔ پریس کاؤنسل میں ایک فریق جب معافی مانگ لیتا ہے تو دوسرا فریق زبانی تبع خرچ سے مطمئن نہیں ہوتا اور تحریری معافی نامہ کا نہ صرف مطالبہ کرتا ہے بلکہ اصرار کرتا ہے کہ یہ معافی نامہ اخبار میں شائع ہونا چاہیے۔ معافی نامہ تو چھپ جاتا ہے۔ لیکن یہ بات فریقِ اول کے دل میں بیٹھ جاتی ہے اور سینہ بہ سینہ اختلاف میں منتقل ہوتی رہتی ہے اور اس کا نتیجہ کئی سال بعد منظرِ عام پر آجاتا ہے۔ اس پورے ڈرامے میں ادیب کی خدمات صرف آخری سین میں درکار ہوتی ہیں۔ جب ایسے معافی نامے کا مسودہ لکھوایا جاتا ہے۔ ادیب کی یہ پہلی تحریر ہوتی ہے جو بہت شوق سے پڑھی جاتی ہے لیکن اس پر ادیب کا نام نہیں ہوتا۔ خود ادیب کو جگہ جگہ جا کر بتانا پڑتا ہے کہ اس مشہور و معروف معافی نامے کا خالق وہ ہے کوئی دوسرا نہیں لیکن وہ یہ نہیں بتاتا کہ اس مسودے کے کتنے ... مسودے تیار کرنے پڑے تھے۔

ادیبوں کی شہرت یوں تو آہستہ آہستہ ہوتی رہتی ہے (جس سے ادیب مطمئن نہیں ہوتے) لیکن ان کی شہرت اس وقت بامِ عروج پہ پہنچ جاتی ہے۔ جب وہ دانستہ طور پر کوئی قابلِ اعتراض تحریر لکھتے ہیں اور خود ہی اس تحریر کے خلاف ایک اور تحریر لکھ کر اخبار میں چھپواتے ہیں اور پھر اچانک باڑھ آ جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے امریکہ کے واٹرگیٹ یہاں کھل گئے ہیں۔ قدامت پسند، رجعت پسند، انتہا پسند، متوسط الخیال، معتدل المزاج اور اس نوع کے کئی طبقے صفحۂ قرطاس پر ابھر آتے ہیں۔ صحافت اسے اچھالتی ہے۔ دوسری وضع کی صحافت اسے گراتی ہے۔ ملک کا دانشور طبقہ سوتے سوتے جاگ پڑتا ہے۔ اور اس کے بعد سرکار کے جاگنے کی نوبت آتی ہے۔ خود سرکار دو حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ اس زیرِ بحث تحریر کے سات آٹھ زبانوں میں ترجمے ہوتے ہیں جو سب ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اور ان ترجموں کی وجہ سے ان لسانی قبیلوں کے جذبات بھی مجروح ہونے لگتے ہیں جو اب تک مجروح نہیں ہوئے تھے۔ (ترجمے کو اسی لیے ادب کی خطرناک صنف کہا جاتا ہے) اور ادیب جو پہلے ہی سے اپنے وطن میں غریب الوطن ہوتا ہے تبدیلیِ آب و ہوا پر مجبور ہو جاتا ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس اہلِ قلم کو کئی ڈاکٹر اس سے قبل کئی مرتبہ تبدیلیِ آب و ہوا کا مشورہ دے چکے تھے لیکن اس مشورے پر عمل کرنے کی صورت یوں پیدا ہوئی کہ پھر برسوں پتہ نہیں چل سکا کہ اہلِ قلم گیا کہاں ہے۔ (قدرت کب مہربان ہو جائے گی کوئی نہیں کہہ سکتا)

جب سقراط کے پیالے کی داستان مشہور ہوئی تھی دنیا کے سارے اہلِ قلم حضرات نے (جن میں خواتین شریک نہیں ہیں) یہ طے کر لیا تھا اب سچ کہنا اور سچ لکھنا ترک کر دینا چاہیے (ویسے سچ لکھتے ہی کتنے لوگ تھے) یہ ایک ان لکھا سمجھوتہ تھا جسے سارے ادیبوں نے ذہنی طور پر قبول کر لیا تھا۔ اب صورت حال بدل گئی ہے۔ اس وقت سچ لکھنا معیوب تھا اور وہ تو اب بھی معیوب ہے لیکن آج جھوٹ لکھنا بھی معیوب ہو گیا ہے اور سارے اہلِ قلم حیران پریشان ہیں کہ وہ لکھیں تو کیا لکھیں۔ ادب میں انتشار کی یہی وجہ ہے اور جمود کی بھی یہی۔ جہاں تک قاریوں کا تعلق ہے وہ عموماً اس وقت زیادہ خوش و خرم رہتے ہیں جب ادب میں جمود طاری ہو۔ جمود کی کیفیت اس وقت . . . . . پیدا ہوتی ہے جب اہلِ قلم اور مدیرانِ جرائد باضابطہ متحد ہو کر کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جنگی پیمانے پر شروع کر دیتے ہیں اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ کتابوں کی بیماری پھوٹ پڑی ہے۔ کتابوں کی اشاعت سے بھی ادبی جمود کے برقرار رہنے میں سہولت ہوتی ہے۔ ان کتابوں میں کچھ کتابیں مصنف کی حقیقی اولاد نہیں ہوتیں۔ انھیں ٹیسٹ ٹیوب بے بی تو کہنا مناسب نہیں لیکن یہ ہوتی کچھ اسی قسم کی ہیں۔ یہ سرقے کی ایک نئی قسم ہے۔ اس اکتسابی تخلیق کو متبنیٰ اولادِ معنوی کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کتاب کے کچھ حصے جس رسالے میں اس اعلان کے ساتھ شائع ہو چکے ہوتے ہیں کہ ایڈیٹر کا مضمون نگار سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے اسی رسالے کے ایڈیٹر کا مقدمہ اس کتاب میں موجود ہوتا ہے۔ کتاب میں تو کتابت کی غلطیاں ہوتی ہیں لیکن مقدمے میں نہیں ہوتیں۔ اس کی پروف ریڈنگ خود ایڈیٹر کرتا ہے۔ بعض ایڈیٹر واقعی محنت کرتے ہیں۔ ویسے کچھ ایڈیٹروں کے بارے میں اکثر اہلِ قلم (اپنے دل میں) یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہ کسی ڈکیتی یا قتل کی واردات سے کم نہیں ہوتے۔ یہ رائے رہتی تو اہلِ قلم کے دل میں ہے لیکن دل کی بات کبھی

نہ کبھی زبان پر آہی جاتی ہے۔

اہلِ قلم اور ایڈیٹر اصل میں ان دو دوستوں کی طرح ہوتے ہیں جنھوں نے ایک سفر کے دوران سندیلے کے ۳ لڈو خریدے۔ ڈیڑھ تو اسی وقت کھالیے اور ڈیڑھ اٹھا کر رکھ دیئے کہ صبح میں کھائیں گے۔ نیت دونوں کی ایک تھی کہ رات میں جب دوسرا سو جائے تو وہ اٹھ کر یہ لڈو کھالے (سندیلے کے لڈوؤں کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ یہ لڈو چرا کر کھائے جائیں تو ان کی لذت دگنی ہو جاتی ہے) صبح اٹھ کر جب دونوں دوست لقمہ کھانے بیٹھے تو دونوں نے حیرت کا اظہار کیا کہ لڈو کہاں چلے گئے۔ یہ قضیہ تو بعد میں ایک معمہ بن گیا اور مدرسوں میں استاد اپنے طالب علموں سے پوچھنے لگے کہ تم میں سے کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ اہلِ قلم اور ایڈیٹر دونوں میں سے کون زیادہ اہل ہے۔ کہتے ہیں' ایک طالبِ علم نے جو جواب دیا وہ ناقابلِ اشاعت تھا۔

نتیجہ: سرقہ تو بری بات ہے ہی لیکن مسروقہ مال خریدنا بھی اتنا ہی برا ہے۔

اور یہ بات کہنے کی نہیں ہے کہ ادب اور صحافت تو آکسیجن اور نائٹروجن ہیں ہی لیکن اگر اس پر سیاست نام کی چیز شامل ہو جائے تو اس کا نتیجہ ایک ہائیڈروجن بم کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور میڈیکل سائنس نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ ان تخلیقات کو سرجری کے ذریعے ایک دوسرے اور تیسرے سے علحدہ کر سکے۔

صبح سویرے لوگ جب اخبار لینے بک اسٹال پر جاتے ہیں تو اخبار نہیں مانگتے کہتے ہیں آج کا میزائیل تو دینا۔

فریدسحر (درساپور)

مضمون نگاری سے نامہ نگاری تک

مثل مشہور ہے کہ گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رُخ کرتا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم یہ بات کس حد تک درست ہے لیکن ہماری جو شامت آئی تو ہم نے مضمون نگاری کو چھوڑ کر نامہ نگاری کی طرف کوچ کیا۔ یہ سچ ہے کہ مضمون نگاری کوئی فعلِ بد تو ہے نہیں کہ شیطان پر لعنت بھیجتے ہوئے فوراً ترک کر دی جائے۔ لیکن چونکہ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں لہٰذا بیک وقت واحد میں مضمون نگار اور نامہ نگار کا دوغلہ کردار ہمارے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا کہ عارضی طور پر نامہ نگاری کو شریکِ حیات بنالیں۔ یوں بھی ان دنوں اردو ادیبوں اور شاعروں پر بڑا کٹھن وقت آن پڑا ہے۔ پچھلے دو تین ماہ کے عرصہ میں دیکھتے ہی دیکھتے اردو کے چند مایہ ناز ادیب، شاعر اور مزاح نگار پاسپورٹ اور ویزا کے بغیر کچھ اس طرح ملک عدم کو پرواز کر گئے کہ یقین مانیے ہمارے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور ہمیں بار بار یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ اب ہماری ہی باری ہے۔

رفیقو! آپ کا اعتراض بجا کہ ہم کوئی عظیم، جواں سال اور مشہور مزاح نگار تو نہیں لیکن کیا عجب کہ ملک الموت کو ہمارا کوئی معمولی سا مضمون ہی پسند آجائے اور وہ ہمیں کسی مہلت کے بغیر ایک دن اچانک اپنے ساتھ بھگا لے جائے۔ بس اسی ڈر اور خوف نے ہمیں اپنی پچیس سالہ مضمون نگاری کو ترک کرنے پر مجبور کیا اور نامہ نگار بنا دیا۔ ویسے بھی ہمیں پتہ ہے کہ نامہ نگار بعد سے موت بھی بغلیں جھانکتی ہوگی۔ نامہ نگار بننے سے پہلے ہم نے کئی اخبارات کا مطالعہ اور تجزیہ کیا تو ہمیں محسوس ہوا کہ "خبریں" بھی اپنے اندر حسین اور خوبصورت دوشیزاؤں کی طرح بڑی کشش اور جاذبیت رکھتی ہیں۔ یہ بھی بولتی ہیں، گاتی ہیں، ناچتی ہیں اور مسحور کرتی ہیں۔ خصوصاً چٹ پٹی اور سنسنی خیز خبریں تو قارئین کو اپنا عاشق بنا لیتی ہیں۔ ہم نے یہ بھی محسوس کیا کہ خبروں کو لکھنے کا انداز بھی عجیب اور دلکش ہوتا ہے۔ مثلاً کم سے کم الفاظ میں واضح مطلب ایک اچھی خبر کی شان اور پہچان ہوتی ہے۔ گویا دریا کو کوزہ میں بند کرنا دراصل اخبار والوں کا ہی کارنامہ بلکہ ایجاد ہے۔ ایک اچھے اور معتبر نامہ نگار بننے کے لیے ہماری مضمون نگاری ہمارے بڑے کام آئی۔ چنانچہ ہم نے شہر کے ایک مشہور روزنامہ کو اپنی فراہم کردہ "نیوز" کی پہلی کھیپ روانہ کرتے ہوئے لکھا کہ راقم اپنی سرکاری مصروفیت کے باوجود بطور اعزازی نامہ نگار اپنی خدمات پیش کرتا ہے۔

دو دن بعد ہی اخبار میں ہماری روانہ کردہ نیوز شائع ہوئی تو ہمارے علاقہ میں جیسے خوشی و مسرت کے پھول بکھرنے

لگے قارئین کی ایک بڑی تعداد "نامہ نگار" کی تلاش میں نکل پڑی کیوں کہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ ہمارا کارنامہ ہے۔ خصوصاً وہ حضرات جن کے نام اخبار کی زینت بنے تھے سینہ تان کر اپنے گھروں سے نکل پڑے کہ وہ بھی ملک کے نامی گرامی لوگوں میں شمار ہونے لگے۔ خود ہم بھی بے حد خوش تھے کہ ہماری روانہ کردہ خبریں بے کم و کاست شائع ہوگئی تھیں۔ جب وقفہ وقفہ سے خبروں کی اشاعت کا سلسلہ چل پڑا تو لوگوں کو معلوم ہو ہی گیا کہ ان حرکات کا ذمہ دار کون ہے۔ اب عوام الناس سے ہمارا رابطہ خاص ہوگیا۔ سرکاری محکموں، خانگی اداروں اور عوامی نمائندوں کے علاوہ مجرموں کی ٹولی سے بھی ہماری جان پہچان ہوگئی۔ ہر کوئی ہم سے روابط استوار کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھنے لگا۔ سیاسی قائدین تو بطور خاص ہمیں عزت دینے لگے۔ شاید انہیں اندازہ نہیں کہ ہم "اردو" کے نامہ نگار ہیں جو بےضرر، مظلوم اور شریف النفس ہوتے ہیں۔ بالکل "اردو" کی طرح۔

ہماری روانہ کردہ خبریں ایک خاص معیار کی ہوتیں اور پسند بھی کی جاتیں۔ چٹ پٹی، سنسنی خیز اور متنازعہ خبروں سے ہم دامن بچاتے رہے اور یہی بات بعض لوگوں کو ناگوار خاطر ہوتی۔ ایک صاحب نے کہا "نامہ نگار صاحب آپ کی فراہم کردہ نیوز مالکان اخبار کے لیے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتیں"۔ ہم نے پوچھا "وہ کیسے"؟ بولے "ایسی سیدھی سادھی خبروں سے اخبار کو کوئی ترقی نہیں ملے گی۔ کچھ چٹ پٹی اور مزیدار خبریں چھپوایئے پھر دیکھئے آپ کا اخبار کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے"۔ ہم نے کہا "لیکن یہ تو صحافتی آداب اور اصول کے خلاف بات ہے۔ ویسے بھی ہم سے جھوٹ نہیں لکھا جاتا"۔ "ارے چھوڑیئے جناب! ہم کب آپ سے جھوٹ لکھنے کو کہہ رہے ہیں؟ وہ بولے۔ "پرسوں کے واقعات کیا غلط تھے؟ آپ ہی کے محلہ کے ایک شریف زادے اپنی سالی کے ساتھ تین دن سے غائب ہیں۔ فلاں دفتر کا عہدیدار اپنی ماتحت کو چھیڑتے ہوئے پکڑا گیا ـــ اور فلاں اسکول کے ٹیچرس بچوں کو سربراہ کیا جانے والا چاول خود ہڑپ کر گئے"۔ پھر اُنہوں نے آخری تیر بھی چھوڑ دیا۔ "آپ بزدل ہیں اور حقیقت سے نظر ملانے سے ڈرتے ہیں"۔ ہمیں لگا جیسے انھوں نے برسرِ عام ہماری پٹائی کردی ہو۔

ہم نامہ نگار کیا بن گئے ہر ایرا غیرا نتھو خیرا ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گیا کہ ایکبار صرف ایکبار اُس کا نام اخبار میں چھپ جائے۔ ایک صاحب کے مسلسل تنگ کرنے پر ہم نے جھلا کر مشورہ دیا کہ وہ کسی کی جیب کاٹ کر فرار ہو جائیں تب ہم ضرور اُن کا نام اخبار میں شائع کریں گے۔ یہ سُن کر موصوف بگڑے نہیں بلکہ بہت خوش ہوگئے اور اچانک ہم پر ہلا بول دیا ہمیں دھکیل کر نیچے گرا دیا اور ہماری جیب سے بٹوہ نکال چلتے بنے جاتے جاتے دھمکی دے گئے کہ جب تک ان کا نام اخبار میں شائع نہ ہوگا ہمارا بٹوہ انکے پاس محفوظ رہیگا۔

ایک صاحب کی دختر کی شادی کی خبر جب اخبار میں چھپی تو وہ ہمارے گھر تشریف لائے۔ ہمیں اپنے گھر لے گئے ناشتہ کرایا اور شکریہ ادا کرتے ہوئے کہنے لگے "نامہ نگار صاحب! آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ نے میری لڑکی کی شادی کی خبر شائع کروائی۔ آپ سے مزید گزارش ہے کہ اگلے ہفتہ میری بڑی لڑکی کا چھلّہ مقرر ہے۔ براہ کرم یہ خبر بھی روانہ کردیں تو عین نوازش ہوگی"۔ یہ سُننا ہی تھا کہ ہمیں اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ لیکن ہم نے ضبط سے کام لیا اور انھیں سمجھانے کی کوشش کی تو کہنے لگے "نہیں صاحب۔ آپ چاہیں تو یہ خبر بھی ضرور شائع ہوگی۔ ورنہ یاد رکھیے اگر میری بڑی لڑکی کا نام اخبار میں نہ آیا تو وہ بہت نروس ہو جائے گی کیوں کہ وہ بہت حساس لڑکی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے داماد بھی ناراض ہو جائیں گے"۔ ایسے میں ہم دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر بیٹھ گئے۔ ہم نے خواب میں بھی نہیں

سوچا تھا کہ ہماری نامہ نگاری کا یہ انجام ہوگا۔

ایک دن علی الصبح گھر پر دستک ہوئی۔ ایک صاحب نے اپنے والد کی فاتحہ چہلم میں شرکت کی دعوت دے کر فرمائش کی کہ آئندہ ہفتہ ہونے والی دعوت چہلم کی خبر اخبار کو روانہ کی جائے۔ ہم نے ٹالنے کی خاطر کہہ دیا کہ ہمارے اخبار میں عموماً دعوت عام کی اور وہ بھی صبح تا نصف النہار دی جانے والی دعوت کی خبریں ہی شائع ہوتی ہیں۔ یہ سن کر وہ جھٹ خفا ہو گئے اور جاتے جاتے یہ کہہ گئے "تو پھر آپ کی دعوت بھی کینسل (cancel) اور اب آپ آنے کی زحمت بھی نہ کریں"۔

صاحبو، ہر اخبار کی اپنی ایک پالیسی ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ ایک نامہ نگار کی ارسال کردہ ہر خبر شائع ہو۔ بعض خبریں ردی کی ٹوکری میں بھی سجائی جاتی ہیں۔ لیکن اس سے عام لوگوں کو کیا مطلب؟ ایک صاحب کے اعزاز میں جلسۂ تہنیت منعقد ہوا۔ سلک کی ایک قیمتی شال اوڑھا کر انھیں اعزاز دیا گیا۔ حسب معمول ہم نے "نیوز" روانہ کر دی۔ شومیٔ تقدیر کہ وہ "نیوز" ردی دان کی زینت بن گئی۔ دو تین دن انتظار کے بعد وہ صاحب دندناتے ہوئے ہمارے ڈرائینگ روم میں گھس آئے اور یوں گویا ہوئے۔ "واہ نامہ نگار صاحب، کیا کہنے آپ کی نامہ نگاری کے؟ ہمیں سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں اتنا بڑا اعزاز عطا کیا گیا اور آپ کا اخبار خاموش ہے؟ اگر آپ سلک کی شال کا حوالہ نہیں دے سکتے تھے تو کم از کم "ساٹن کی چادر" تو لکھ سکتے تھے"۔ دراصل وہ سمجھے تھے کہ اُن کو دیا گیا اعزاز ہم سے برداشت نہ ہوا اور اسی لیے ہم نے اس نیوز کو اپنے حسد کی تلوار سے قتل کر دیا۔ ہم انھیں کیا جواب دیتے۔ بس اتنا ہی کہا "مناسب ہوگا آپ ایڈیٹر صاحب سے رجوع ہوں"۔ وہ بولے "آپ کے مشورہ کی ضرورت نہیں۔ آپ کی نامہ نگاری اور آپ کا اخبار دونوں کو برخواست نہ کروایا تو میرا نام بھی فلاں ابن فلاں نہیں"۔

یہاں تک تو خیر گوارہ تھا لیکن ایک نوجوان نے تو غضب ہی کر دیا جس کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی۔ سر راہ ملاقات ہوئی تو سلام علیک کے بعد ہمیں ایک کونے میں لے گیا اور سرگوشی کرتے ہوئے کہنے لگا "جناب کل سے ہماری بیگم کے اُلٹیاں ہو رہی ہیں، اگر آپ کوئی خیال نہ کریں تو اخبار میں ....!!" اب ہم سے مزید ضبط نہ ہو سکا اور چٹاخ کے ساتھ ہم نے ایک بھرپور تھپیڑ خود اپنے گال پر عرض کر دیا۔ وہ نوجوان ہکّا بکّا ہو گیا اور ہماری اس حرکت کی وجہ جاننے کی کوشش کرنے لگا تو ہم نے چلا کر کہا "او پرنس آف ویلز کی اولاد اب جاتا بھی ہے یا ....؟ ہماری دھاڑ سنتے ہی وہ نوجوان سر پر پاؤں رکھ کر فرار ہو گیا۔ آپ کو ہم مزید کیا بتائیں صاحب؟ ایسے ایسے نمونوں اور ماڈلس سے سابقہ ہے کہ خدا کی پناہ۔ بعض حضرات تو باضابطہ بحث و تکرار پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ اُن کا نام اخبار میں کیوں نہیں چھپتا۔ ایک صاحب نے یہ کہہ کر برسرِ عام ہماری پگڑی اچھال دی کہ ہم صرف اُن ہی لوگوں کے بارے میں نیوز روانہ کرتے ہیں جو آئے دن ہماری دعوتیں کرتے ہیں یا پھر ہماری مدح سرائی یعنی چمچہ گری کرتے ہیں۔ اب تو ہمارا یہ حال ہو گیا ہے کہ ہم ہر اس شخص سے منہ چھپائے پھرتے ہیں جس کے بارے میں آج تک کوئی نیوز شائع نہ ہوئی ہو اور ایسے لوگوں کی تعداد روپیہ میں پندرہ آنے سے کم نہیں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ جو شخص ننانوے فیصد آبادی سے منہ چھپا رہا ہو وہ کس قدر اکیلا، تنہا اور قابلِ رحم نہ ہوگا؟

بہرحال آج ہم سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں کہ کیوں نہ اس "آفت" سے رشتہ توڑ لیں۔ لیکن ہم مجبور ہیں۔

کیونکہ چھٹتی نہیں ہے کافر منہ سے لگی ہوئی کے مصداق یہ نامہ نگاری ہم سے کچھ اس قدر گھل مل گئی ہے کہ "نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن" کا معاملہ ہے۔ اس کے علاوہ مضمون نگاری یا مزاح نگاری کی طرف لوٹ کر ہمیں اپنی جان عزیز کو خطرہ میں ڈالنا بھی تو نہیں ہے۔ کیونکہ ہمیں ابھی مرنے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ ایسے میں ہم ہر اس شخص کا نام اخبار میں شائع کرنے کا وعدہ کرتے ہیں جو خود اخبار خرید کر پڑھنے کا وعدہ کرتا ہو۔ یہ شرط ہم اس لیے عائد کر رہے ہیں یہ کوئی آسان شرط نہیں۔ کیونکہ اردو کا قاری اتنی آسانی سے اخبار خرید کر نہیں پڑھے گا۔ ایسے انقلاب کے لیے ایک صدی درکار ہے۔ اور یہی ایک صدی ہمارے جینے کے لیے ایک عظیم نعمت سے کم نہیں!
□□

مطبوعات، مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈیمی

مراٹھی آموز	ڈاکٹر عصمت جاوید	25 روپئے
ایک ہی پیالہ (ڈرامہ)	رام گنیش گڈکری مراٹھی ترجمہ خلیل مظفر	20 روپئے
ناگپور میں اردو	ڈاکٹر شرف الدین ساحل	50 روپئے
علم الامراض	ڈاکٹر کرنل محمد غفران	90 روپئے
چاند تارے	اسحاق خضر	15 روپئے
کمپیوٹر اور اس کی بیسک زبان	عبدالباری مومن	20 روپئے
تھوور سنگیت سمار	بی آر یودھ مراٹھی سے ترجمہ دستگیر شہاب	25 روپئے
اسکان مراٹھی عصری ادب کا انتخاب (اردو)		40 روپئے
اسکان مراٹھی عصری ادب کا انتخاب (اردو)		25 روپئے
اسکان ایک بابی ڈرامہ (خصوصی شمارہ)		10 روپئے
اسکان سراج اورنگ آبادی (خصوصی شمارہ)		20 روپئے

ملنے کے پتے:- مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈیمی۔ فون: 2672708
اولڈ کسٹم ہاؤس ڈی لاڈی بلڈنگ، شہید بھگت سنگھ مارگ بمبئی 400023

2. مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ جے جے اسپتال، بمبئی 400008

محمد تاج الدین احمد
(لکچرر مینٹ ڈگری کالج کھمم)

ماسٹر

پانچ مہینے کے اندر اندر جب تین ملازم ملک آؤٹ کر گئے تو ہمیں سخت حیرت ہوئی کہ سیاست کے یہ جراثیم ان میں کہاں سے آ گئے لیکن اس پر غور و فکر کرنے سے پہلے ہمیں ایک اور ملازم کو تلاش کرنا ضروری تھا۔ ورنہ گھر میں خاموش احتجاج کا سماں نظر آنے لگتا حالاں کہ اس میں بھی مختلف آوازیں کارفرما ہوتی ہیں۔ باورچی خانے میں برتنوں پر اتنا غصہ اتارا جا رہا ہے کہ بے زبان برتن تک اس ظلم پہ چیخ اٹھتے ہیں چیخ و پکار کے ساتھ بچوں کی آوازیں الگ پریشان کرتی ہیں کہ ممی میرے جوتے کہاں ہیں؟ ممی میرے کپڑے استری نہیں ہوئے ممی اسکول کا وقت ہو رہا ہے ممی مجھے دیر ہو رہی ہے اور ممی کے جواب عقلمند کو اشارہ کافی کی تفسیر ہوتے ہیں۔ یعنی جواب تو وہ بچوں کو دیتی ہیں لیکن مطلب ہماری سمجھ میں آتا ہے۔

اس لیے تیسرے ملازم کے جانے کے بعد ہم محلے کے راجو دادا سے رجوع کیا صاحب آپ لفظ رجوع پر مت جائیے کیوں کہ "رجوع کرنا" ہماری قومی عادت بنتا جا رہا ہے۔ آج کل ملک میں بڑے پیمانے پر رجوع کرنے کا کام چل رہا ہے۔ خاص کر سرکاری اداروں میں تحت کے عہدیدار کوئی بھی کام بعد میں کرتے ہیں، پہلے ہر کام کو اپنے اعلیٰ افسر سے رجوع کرتے ہیں اور اعلیٰ افسر اپنے افسر اعلیٰ سے رجوع کرتا ہے۔ اور یہ سلسلہ باہم تو ٹاپ چلتا ہے اور بالآخر حکومت عالیہ، عدالت عالیہ سے رجوع کرتی ہے گمبھیر سے گمبھیر مسائل سرد خانے کی نذر ہو جاتے ہیں۔ یعنی موضوع بحث کو خارج از بحث کرنے کا آسان طریقہ ہے "رجوع کرنا"۔

بہر حال ہم راجو دادا سے ملے جو عمر میں تو ہم سے چھوٹا تھا لیکن دادا کہلاتا تھا۔ حالات کا مارا ہوا تھا۔ دو تین مرتبہ سرکاری مہمان بھی بنا تھا اسی لیے محلے کے شریف نما بدمعاش اس سے دبے رہتے۔ غریب اور متوسط طبقے میں اسے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ غم ہو یا خوشی، انفرادی مسئلہ ہو یا اجتماعی، وہ ہر ایک میں برابر کا شریک رہتا ہے۔ جب ہم اس سے ملے اور مسئلہ بیان کیا تو وہ

ہنسنے لگا اور کہا بابوجی لوگ ملازمتوں کی تلاش میں پھرتے ہیں اور آپ ہیں کہ ملازم ...... کی تلاش میں نکلے ہیں۔ ہم نے پوچھا کہ کیا ہمارا کام نہیں ہوا۔ اس نے کہا جی نہیں۔ دو چار دن میں کوشش کروں گا۔ ہم مشکور چلے آئے۔

پھر ایک ہفتے کے بعد کا واقعہ ہے کہ ہم دفتر میں مصروف تھے کہ راجو دادا کا فون آیا۔

" ہیلو! کون؟ ارشد صاحب ہیں؟ دوسری طرف راجو ہی تھا۔

" ہاں، میں ہی ہوں " ہم نے جواب دیا۔

" بابوجی، آپ کا کام ہو گیا ہے "

یعنی ملازم مل گیا ہے "

" جی ہاں، مل گیا ہے لیکن .....

لیکن، کیا؟ ہم نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

لیکن، یہ کہ اس کی کچھ شرائط ہیں۔

کیا ملازم شرائط پیش کر رہا ہے۔

جی ہاں، وہ ایک خاندانی ملازم ہے ——— " کیا مطلب "

وہ ایک کنور کا ملازم تھا۔ کنور کے انتقال کے بعد ورثا نے دولت و جائیداد کو برباد کر ڈالا۔ اس لیے اسے بھی جاگیر چھوڑنی پڑی۔ اور اب وہ یہاں ملازمت کے لیے آیا ہے۔

آدمی کیسا ہے؟

آدمی بڑا دلچسپ ہے۔ عمر کوئی پچاس کے قریب ہو گی۔ کہتا ہے کہ بیوی عرصہ ہوا مر گئی۔ اور وہ لاولد ہے۔

ٹھیک ہے شام کو گھر پر بھیج دینا، مل لوں گا " میں نے کہا اور فون رکھ دیا۔

شام کو پانچ بجے اطلاعی گھنٹی بجی تو بڑے لڑکے ناہد نے دروازہ کھولا اور چند لمحوں کے بعد ایک وزیٹنگ کارڈ لیے آیا۔

کون ہے؟ ہم نے کارڈ لیتے ہوئے پوچھا۔

راجو دادا کے پاس سے کوئی آیا ہے۔ ناہد نے کہا۔

اندر بلاؤ۔ یہ کہہ کر ہم نے کارڈ پر نظر ڈالی، اس پر صرف ایک لفظ " ماسٹر " لکھا تھا۔

ہم نے سوچا یہ بھی اپنی قسم آپ لگتا ہے۔ گھریلو ملازمت کے لیے پھر رہا ہے اور ملاقاتی کارڈ بھی رکھتا ہے۔ طرفہ یہ کہ شرائط بھی ہیں گھریلو ملازم نہ ہوا مرکزی حکومت کا کوئی او۔ ایس۔ ڈی (آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی) ہو گیا۔ یہ ملازمت کیا کرے گا، اچانک تو پوری لیڈروں اور بیوروکریٹ کی سی ایپ۔ اور جب ناہد اسے اندر لے کر آیا تو ہمارے ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں سکڑ گئے۔ وہ سفید کپڑوں میں ملبوس، تحلین شیو تھا، کافی بارعب لگ رہا تھا۔ گا .... کوئی انجان فرد اسے

لباس۔ دیکھنے سے تو کم از کم اسے گزیٹیڈ ٹیر رینک کا کوئی عہدیدار سمجھ سکتا تھا۔ شاید کنور کی ملازمت سے جاگیردارانہ رکھ رکھاؤ بھی آگیا تھا۔

تو آپ ماسٹر ہیں؟ ہم نے عمر کا لحاظ کرتے ہوئے آپ سے مخاطب کیا۔

جی ہاں! اس کی آواز بھی گونج دار تھی۔

کس میں ماسٹری کی ہے؟

جی میرا نام ہی ماسٹر ہے۔

بہت خوب! کیا اصل نام بھی یہی ہے؟

جی نہیں، رحمت خاں میرا اصلی نام ہے لیکن آپ مجھے ماسٹر ہی کہیں گے۔

کیوں؟

اس لیے کہ یہ کنور صاحب کا دیا ہوا نام ہے اور یہی میری ملازمت کی پہلی شرط ہے۔

اوہ! اور اگر ہم ماسٹر نہ کہیں تو؟

تو میں یہاں ملازمت نہیں کروں گا۔ ویسے اس کے علاوہ بھی کچھ شرائط ہیں۔" اور کسی شرط سے انکار ممکن نہیں ہے"؟ ہم نے پوچھا۔

جی ہاں!

خیر، تم کام کیا کیا کر سکتے ہو؟

آپ جو کہیں وہ کرنے کے لیے تیار ہوں، لیکن . . . . .

لیکن کیا؟

میں کپڑے دھونے اور جوتے پالش کرنے کا کام نہیں کروں گا۔

وہ کیوں؟

یہ میری دوسری شرط ہے۔

پڑھائی کہاں تک کی ہے؟ ہم نے پوچھا۔

بی اے فیل ہوں۔

بی اے فیل ہو اور گھریلو ملازمت کرتے رہے۔

صاحب جی! کنور صاحب کے گھریلو ملازم بھی افسروں کی شان سے رہتے تھے۔ اب باہر کا کام کروں تو کوئی منشی رکھ لے یہی تو بہت ہے۔

"پھر تمھیں یہاں کیا ملے گا؟ یہ تو کسی کنور کی ریاست نہیں ہے"۔ "میں تنخواہ کے بغیر یہاں کام کروں گا"۔ ؟ ہم چکرا کر رہ گئے۔

جی ہاں! میری تیسری شرط یہی ہے۔

تنخواہ کے بجائے آپ کیا لیں گے؟ ہمارے لہجے میں طنز کو شاید اس نے بھی محسوس کیا ہوگا۔
آپ کو صرف میری ضرورتیں پوری کرنی ہوں گی۔
اور وہ ضرورتیں بھی کچھ کم نہ ہوں گی۔
جی نہیں! مجھے سگریٹ، شراب یا کوئی دوسری بری عادت نہیں ہے، اس نے کہا۔
اب ہم اسے کیا سمجھاتے کہ چند اچھی عادتیں بھی خطرناک ہوتی ہیں مثلاً بیوی کا ہر مہینے شاپنگ کرنا وغیرہ۔
پکوان میں کتنی مہارت ہے؟ ہم نے پوچھا۔
مہارت کا اندازہ تو آپ کو ملازمت دینے کے بعد ہی ہوگا لیکن اس سلسلے میں میری دو شرطیں ہیں۔

ہاں! ہاں وہ بھی بتائیے" ہمارے لیے طنزیہ لہجے پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔
پہلی شرط یہ کہ پکوان میں اپنی مرضی سے کروں گا اور دوسری یہ کہ پکوان کے بعد کھانا پہلے میں کھاؤں گا۔ باقی لوگ بعد میں کھائیں گے۔
کیا کہا؟ ہم نے غصے کے پریشر پہ کافی کنٹرول کیا۔ کم بخت وقار کو للکار رہا تھا۔
ہم نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی کہ کہیں وہ ہمیں الو تو نہیں بنا رہا ہے لیکن اس کے چہرے پر وہ سسرالی آثار نظر نہیں آئے جو داماد کو الو بناتے وقت ساس، سسر اور دیگر رشتہ داروں کے چہروں پہ جھلک جاتے ہیں لیکن داماد انھیں دیکھ نہیں پاتا کیوں کہ وہ اکثر ایسے موقعوں پر سر جھکائے الو بن جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں اسی کا فائدہ ہوتا ہے۔
اچانک ہمارے دل میں ایک خیال آیا اور ہم نے اس سے پوچھا:
کیا کھانا ڈائننگ ہال میں کھاؤ گے؟
کنور صاحب کے یہاں تو تمام ملازموں کے لیے علاحدہ ڈائننگ ہال ہوتا تھا۔ اب آپ کے یہاں ..... باورچی خانے پر اکتفا کروں گا۔
ہم نے سوچا شکر ہے کہ یہ ایک اور شرط نہ بن گئی۔
اور بھی کچھ شرائط ہوں تو بتلاتے جائیے، ہم نے کہا۔
جی نہیں! بس اتنی ہی ہیں۔
ٹھیک ہے میں کل تک شرائط پر غور کر کے راجو داد کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں گا۔
ہم نے کہا اور وہ سلام کر کے چلا گیا۔ ہم اس حادثاتی ملاقات پر غور و فکر میں کھو گئے۔
چائے پیجیے کی آواز پر ہم چونک اٹھے۔ دیکھا تو بیگم پیالی ہاتھ میں لیے ٹھہری ہیں اور کچھ زیادہ ہی مسرور نظر آ رہی ہیں۔ ہم ٹھٹھک سے گئے۔

بیگم! ہم نے بڑے پیار سے آواز دی۔
کہیے! انھوں نے میز پر پڑے کاغذات اور فائیلوں کو ترتیب سے رکھتے ہوئے جواب دیا۔
نہ آج پہلی تاریخ ہے اور نہ تمھیں مائکے جانا ہے۔
تو؟
تو یہ اتنی مسرت کیوں جھلک رہی ہے؟
امی جان آئی ہوئی ہیں!! بیگم نے ہمیشہ کی طرح ہماری چہرہ شناسی کی داد دیئے بغیر کہا۔
کب؟ ہم نے پوچھا، چائے اچانک اپنا ذائقہ کھو بیٹھی تھی۔
زاہد بتا رہا تھا کہ آپ کسی سے ملاقات میں مصروف ہیں۔ اسی دوران آئی ہیں۔
اللہ رحم کرے۔ ہم زیر لب بڑبڑائے۔
جی؟
جی کچھ نہیں۔
چائے پی کر ذرا مارکٹ تک ہو آیئے گا۔ تب تک میں امی سے بات کرتی ہوں۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئیں۔
خدا خوش دامن صاحبہ کے ذریعہ امن فراہم کرے ہمیشہ ایسے وقت پر نازل ہوتی ہیں۔ جب کسی نہ کسی کام کے کلائمکس سے دوچار ہوں۔ جیسے ہندی فلموں میں عین وقت پر پولس آموجود ہوتی ہے۔ فلم بینوں کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ پولس کو اطلاع کس نے دی اور فلم کے آخر میں سبھی پولس میں فرض شناسی کہاں سے آجاتی ہے؟
رات کے کھانے پر ملازم کے تعلق سے بحث شروع ہوئی، خوش دامن صاحبہ کا خیال تھا کہ کنوار کا ملازم رہا ہے تو تنخواہ بھی بڑی طلب کرے گا۔
وہ بغیر تنخواہ کے کام کرے گا" ہم نے کہا۔
کیا؟ ماں بیٹی نے ایک آواز ہو کر پوچھا۔
اس کی کچھ شرائط ہیں، ہم نے ان کی حیرت دور کرنے کے لیے کہا۔
کیا شرائط ہوں گی، بس یہی ناکہ اس کی ضرورتیں پوری کردو، ساس صاحبہ نے جہاں دیدہ انداز میں کہا۔
اس کے علاوہ بھی کچھ ہیں۔
وہ کیا؟
اس کی ایک شرط یہ ہے کہ وہ اپنی مرضی سے پکوان کرے گا۔
یعنی وہ جو پکائے گا وہی ہم کھائیں گے؟ بیوی نے مزید استفسار کیا۔
جی ہاں!

"لیکن، ابو! اگر اس نے چینی ڈشیں تیار کیں تو؟" زاہد نے پوچھا۔

"چینی ڈشیں کیا ہوتی ہیں ابو؟" آٹھ سالہ خالد ہم سے مخاطب ہوا۔

"جیسے چینی کے افراد کی مرغوب غذائیں مینڈک اور سانپ وغیرہ ہیں۔" ہم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اوغ! ایسی گندی باتیں مت کیجیے،" بیوی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"اس کی دوسری شرط یہ ہے کہ پکوان کے بعد سب لوگوں سے پہلے وہ کھانا کھائے گا۔" ہم نے بیوی کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

خوش دامن صاحبہ نوالہ لیتے ہوئے رک گئیں۔ جیسے اب بھی ملازم کے کھانے کے بعد ہی بچا کھچا ہم سب کھا رہے ہوں۔

"آگ لگے اس کے پکوان کو اور اس کی ملازمت کو، کیا زمانہ آگیا ہے۔" خوش دامن صاحبہ نے جھلا کر کہا۔

"تو اس میں برائی کیا ہے نانی ماں! ملازم کو پہلے کھلائیں گے اور ہم بعد میں کھائیں گے تو لوگ ہم کو لیڈروں اور بڑے آدمیوں میں شامل کریں گے کیونکہ وہ لوگ بھی ملازموں کو جھوٹا کرنے تک کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتے۔" زاہد نے اپنی جنرل نالج کی دھونس نانی پر جمانے کی کوشش کی۔

"تو چپ کر لونڈے، بکواس کیے جاتا ہے۔" خوش دامن کی جھلاہٹ بدستور برقرار تھی۔

"آپ نے دیگر شرائط نہیں سنیں،" ہم نے ان کی جھلاہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی بتائیے۔" بیوی نے بیزاری سے کہا۔

"وہ تمام کام کرے گا سوائے کپڑے دھونے اور جوتے پالش کرنے کے اور ہمیں اسے ماسٹر کہنا ہوگا۔" ہم نے یک لخت تمام شرائط سنا دیں۔

"ارشد میاں کہیں آپ پر مزاح کا بھوت تو طاری نہیں ہے۔" خوش دامن صاحبہ نے پوچھا۔

"واللہ امی جان، یہ تمام شرائط ملازم کی ہی پیش کردہ ہیں۔ اس میں ہماری شرارت کو دخل ہے نہ ظرافت کو۔" ہم نے شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"تو پھر کوئی ماسیئے اسے اور دوسرے ملازم کو تلاش کیجیے۔" انھوں نے فیصلہ سنایا اور ساتھ ہی اٹھ کر چلی گئیں۔ ان کی تقلید بیگم صاحبہ نے بھی کی۔ یعنی ملازم کی تقرری کا فیصلہ ایک نسبت دو کی اکثریت سے مسترد کر دیا گیا۔

"ابو! آپ اس ملازم کو ضرور رکھیے بڑا مزہ آئے گا،" زاہد اور خالد نے کہا۔

"چپ رہو، بدمعاش کہیں کے" مصنوعی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے ہم بھی اٹھ کھڑے ہوگئے۔

کچھ دنوں بعد ہم نے ایک اور شخص کو ملازم رکھ لیا لیکن وہ بھی زیادہ عرصے تک ٹک نہ سکا۔ اسی دوران راجو دادا سے معلوم ہوا کہ ماسٹر نے اپنے پاس جمع دو ڈھائی ہزار کی پونجی سے ایک چھوٹی سی ہوٹل کھول لی ہے۔ جہاں اسے سب ماسٹر کہہ کر ہی بلاتے ہیں اور اس کی دیگر شرائط بھی پوری ہوگئیں۔ ہم ماسٹر کی ماسٹری کے قائل ہوگئے کہ اس نے ایک تیر سے پانچ نشانے والا کام کیا۔ ویسے ہم ہیں کہ آج بھی ایک اچھے ملازم کی تلاش میں ہیں۔ آپ کی نظر میں کوئی شخص ہو تو بتائیے نا! لیکن شرط یہ ہے کہ وہ شرائط والا نہ ہو۔

منظور وقار (گلبرگہ)

داستان دانتوں کی

مشہور محاورہ ہے کہ "کھانے کے دانت کچھ اور ہوتے ہیں، دکھانے کے دانت کچھ اور" ہم اگر اس محاورے کی سچائی کا خود اپنی آنکھوں سے اندازہ کرنا چاہیں تو ہمیں ہمارے ملک کے چند وزراء کے حالات زندگی پر نظر ڈالنی پڑے گی. کسی ریاست کا وزیر اعلیٰ ماہانہ صرف ایک روپیہ تنخواہ لے کر عوام کی خدمت کا دعویٰ کرتا ہے تو کوئی نیا گیروا لباس پہن کر یا کوئی قائد شیروانی زیب تن کر کے صرف عوام کی خدمت کی خاطر اپنے آپ کو "سیاست" میں جھونکنے کا ناٹک کرتا نظر آتا ہے لڑائی جھگڑے اور مار پیٹ جیسے اہم کارنامے انجام دیتے وقت لوگوں کو اس طرح کی دھمکیاں دیتے ہوئے آپ نے اکثر دیکھا ہوگا "اگر ہاتھ بھی لگایا تو تیرے منہ میں ایک دانت بھی نظر نہ آئے گا" "زیادہ بک بک کرتا رہا تو دانت توڑ کر ہاتھ میں تھما دوں گا" دانت سلامت رکھنا ہے تو مجھ سے ٹکرانا مت حالانکہ اس طرح کی دھمکیاں دینے والے کسی کے دانت توڑنا تو بڑی بات ہے بال بھی بیکا نہیں کر سکتے. بلکہ اکثر اپنے مخالف کے ہاتھوں اپنے ہی دانت تڑوا لیتے ہیں! اگر منہ میں دانت نہ ہوں تو نوجوان بھی ضعیف نظر آنے لگتے ہیں. اس لیے اکثر لوگ نقلی دانت کی بتیسی منہ میں لگا کر بات بات پر "ہاتھی کے دانتوں" کی نمائش کرتے رہتے ہیں. جو لوگ نقلی دانت لگاتے ہیں وہ دانت پیس کر اپنے غصہ کا اظہار کرنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو جاتے ہیں اگر کسی پر شدید غصہ آ جائے تو دانت پیس کر اپنے غصہ کا اظہار کرنے کا لطف کچھ اور ہی ہوتا ہے. اور تو اور نقلی دانت لگانے والے نہاری بریانی کے گوشت کو نوچنے اور ہڈیوں کو چبانے کی لذت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں تاہم چند لوگ گوشت کے ایسے دیوانے ہوتے ہیں کہ منہ میں دانت نہ ہونے کی صورت میں بوٹیوں کو یوں نگل جاتے ہیں جیسے ہمارے ملک کے فسادات معصوم افراد کو ہر خطہ ارض پر بسنے اور رینگنے والے انسانوں اور جانوروں کے دانتوں کا رنگ سفید ہی ہوتا ہے تاہم بعض انسان سفید دانتوں کو رنگین بنانے کے لیے بڑی سخت محنت کرتے ہیں. مثلاً دن بھر پان چباتے رہتے ہیں. پان مصالحہ، پان پراگ، اسٹار میٹھا، گٹکا، زردہ وغیرہ کی جگالی کرتے ہیں ان دانتوں کو رنگ بدلنے کا موقع ہی نہیں دیتے اس تگ و دو کا خاطر خواہ فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دانت سرخ زرد اور مٹیالے رنگ میں بدل جاتے ہیں. چند لوگوں کے دانت قیمتی ٹوتھ پاؤڈر اور ٹوتھ پیسٹ سے صاف کرنے کے باوجود سرخ معلوم ہوتے ہیں یہ لوگ سیٹھ ساہوکار لیڈر اور سماج سیوک کہلاتے ہیں کیونکہ ان کے دانت غریب پیشہ مزدور، بے بس انسانوں اور بھولے بھالے عوام کا خون چوس چوس کر سرخ ہو جاتے ہیں.

سونے پر سہاگہ یہ لوگ اپنے دانتوں پر سونے کا رنگ بھی چڑھاتے ہیں۔ مشہور کمپنیوں، فرموں اور فائیو اسٹار ہوٹلوں کے استقبالیہ پر کام کرنے والی لڑکیوں کے دانت انتہائی سفید اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ دراصل انہیں اپنے دانت سفید رکھنے کی تنخواہ بھی ملتی ہے۔ ان لڑکیوں کی ملازمت کا دارومدار ہی ان کے سفید اور خوبصورت دانتوں پر ہوتا ہے۔ ڈراموں، ناٹکوں اور فلموں میں اداکاری کرنے والی لڑکیوں کی کامیابی ان کے خوبصورت اور سفید دانتوں پر منحصر ہوتی ہے۔ اسی طرح ایر ہوسٹس کو بھی اپنے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے مسافروں کا دل بہلانا ضروری ہوتا ہے ورنہ ان کی ملازمت ان کے اپنے ہوائی جہاز کی طرح ہر وقت خطرے میں رہتی ہے۔

دانت ایک ہی صف میں استادہ ہوتے ہیں یہ وہ مقام ہے جہاں محمود و ایاز کندھے سے کندھا ملا کر ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ پھر بھی چند لوگوں کے دانت تیسی سے بغاوت کرتے ہیں اور محمود و ایاز ایک دوسرے کے آگے پیچھے کھڑے ہو جاتے ہیں اس صورت میں تیسی بڑی .. بھیانک بن جاتی ہے اچھا خاصا انسان خونخوار درندہ نظر آنے لگتا ہے۔

ہمارے ملک کی تباہ ہوتی ہوئی معیشت اور صنعت کا دانت ہی سہارا بنے ہوئے ہیں۔ ملک کی پچاس فیصد کمپنیاں اور حکیم و وید ٹوتھ پیسٹ ٹوتھ برش ٹوتھ پوڈر تیار کر کے ہی زندہ ہیں اگر ان کمپنیوں کے اشتہارات دوردرشن کو نہ ملیں تو دوردرشن کی ایسی درگت ہو جائے گی کہ وہ کسی بھی قسم کے درشن کے قابل ہی نہ رہے گا مشاعروں میں جن شعراء کو غزل سنانے کی مشق نہیں ہوتی ایسے شعراء اسٹیج پر پہنچتے ہی دانت دکھانے لگتے ہیں عمر رسیدہ شعرا کے لیے غزل سنانا بڑا کٹھن کام ہوتا ہے پوپلے منہ سے غزل سنا کر سامعین سے داد حاصل کرنا دانتوں تلے پسینہ لانے کے برابر ہوتا ہے۔ اردو شعراء نے دانتوں پر بہت کم توجہ دی ہے ان کی شاعری میں جہاں محبوبہ کی کمر آنکھیں پلکیں ہونٹ گال اور بال کا ذکر جا بجا ملتا ہے وہیں محبوبہ کے دانتوں کا ذکر دور دور تک دیکھنے کو نہیں ملتا۔ چند لوگوں کو اپنی تیز طرار اور کیلی باتوں سے اپنے مخاطب کے دانت کھٹے کرنے کا فن خوب آتا ہے۔ اکثر بیویاں دن میں کئی کئی بار اپنی کیلی اور کڑوی باتوں سے شوہروں کے دانت کھٹے کیا کرتی ہیں۔ لہٰذا شوہر اپنے کھٹے دانتوں کو نارمل بنانے کے لیے دن بھر پان چباتے رہتے ہیں۔ طلبا بھی اساتذہ کے دانت کھٹے کرنے میں بڑے ماہر ہوتے ہیں تقریباً تمام چرند پرند اور جانداروں کے منہ میں دانت ہوتے ہیں لیکن لوگ سانپ اور کتے کے دانتوں سے ہمیشہ گھبراتے ہیں کیوں کہ سانپ کے دانت اگر کسی انسان کے جسم میں گڑ جاتے ہیں تو انسان دنیا کی الجھنوں مشکلات اور مسائل سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے۔ اگر انسان کے جسم میں کتے کے دانت گڑ جاتے ہیں تو وہ بھی کتے کی طرح بھونکنے لگتا ہے بسا اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کو کاٹتا ہے تو مریض نہ مر سکتا ہے اور نہ جی سکتا ہے بس زندگی بھر درد سے تڑپتا رہتا ہے! ایسا انسان سب سے خطرناک اور زہریلا جانور کہلاتا ہے۔ جہاں ہر قسم کی غذا کے لیے دانتوں کی ضرورت ہوتی ہے وہیں سرکاری مال اور چندے کی رقم کھانے کے لیے دانتوں کی نہیں دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ آئے دن سنتے ہوں گے کہ "دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے گھور گھور کر جوان لڑکیوں کو گھور گھور کر دیکھ رہا ہے یا والدین کو آنکھیں دکھانے لگا ہے" دودھ کے دانت کیا ہوتے ہیں ان کا راز ہم پر ابھی تک افشا نہ ہو سکا البتہ ایک دن ہم نے ہمارے بزرگ دوست علامہ پاکھنڈی سے پوچھا علامہ دودھ کے دانت کیا ہوتے ہیں علامہ ہمارے سوال کو سن کر پہلے تو ہنس پڑے پھر جواب دیا "قبلہ تم چار بچوں کے باپ بن کر بھی دودھ کے دانت سے واقف نہیں گویا تمہارے منہ میں ابھی تک دودھ کے دانت موجود ہیں۔ علامہ کا جواب سن کر ہم دانتوں تلے انگلی دبا کر رہ گئے۔

آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن

رجسٹرڈ آفس :- 5/825-1-4 سکنڈ فلور حکیمی اسٹیٹ عابڈس حیدرآباد

حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے چلایا جانے والا ادارہ جہاں ریاست سے تعلق رکھنے والے اقلیتی افراد مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین اور بدھسٹ کو قرضہ جات کی فراہمی عمل میں آتی ہے۔ یہ قرضہ جات 2 اسکیموں کے تحت دیئے جاتے ہیں [1] غربت ہٹاؤ اسکیم۔ [2] خود روزگار اسکیم ـــ غربت ہٹاؤ اسکیم کے تحت دس ہزار روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار تک کے لیے جیسے کرانہ اسٹور، سیکل ٹیکسی، بک بائنڈنگ، ترکاری فروشی، میوہ فروشی، اگربتی کا کارخانہ وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 25% کارپوریشن سے دیا جاتا ہے اور اس کو 20 آسان ماہانہ اقساط میں شرح سود 4% کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور ماباقی بنک کے ذریعہ دلایا جاتا ہے اور اس اسکیم میں درخواست گزار کی سالانہ آمدنی چھ ہزار 6000 روپے سے کم ہونی چاہیئے۔

خود روزگار اسکیم کے تحت 2,50,000 روپے کی جملہ لاگت کے کاروبار کے لیے جیسے چھوٹی صنعتیں پرنٹنگ پریس، میڈیکل شاپ، زیراکس مشین، آٹو رکشہ، آٹو ٹرالی، کمپیوٹر سنٹر، جنرل اسٹور وغیرہ کے لیے قرضہ جات دیئے جاتے ہیں۔ اس جملہ لاگت کا 20% کارپوریشن کی جانب سے بطور مارجن منی شرح سود ½6% پر دیا جاتا ہے۔ کارپوریشن مندرجہ بالا دو اسکیموں کے تحت اپنے قیام سے لیکر 7 مارچ 96ء تک 57837 افراد میں 12,66,69,000 روپے بطور مارجن منی قرض جاری کرچکا ہے جس کی جملہ لاگت 56,98,15,000 روپے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جاریہ سال 96-95 سے مرکزی حکومت کا قائم کردہ نیشنل اقلیتی ڈیولپمنٹ اینڈ فینانس کارپوریشن کے اشتراک سے اب تک جملہ 868 افراد میں (16) منظور کردہ اسکیمات کے تحت 106,50,000 روپیہ ٹرم لون قرض مزید جاری کرچکا ہے جس کی جملہ لاگت 270,03,000 روپے ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ کارپوریشن 93ء سے اقلیتی طبقہ کے نوجوانوں کو سالانہ مفت ٹریننگ مختلف ٹریڈس میں دے چکا ہے۔ حیدرآباد میں 531 نوجوانوں کو نظام آباد میں 192، گنٹور میں 243 افراد کرنول میں 76 نوجوانوں کو تقریباً 10 لاکھ روپے کے صرفہ سے کمپیوٹر میں، موٹر ڈرائیونگ، الیکٹریشین ٹیلرنگ ٹائپ رائٹنگ وغیرہ میں ٹریننگ کرایا گیا ہے۔

محمد علی رفعت

ایم کام۔ ایل ایل۔ ایم

نائب صدرنشین و منیجنگ ڈائرکٹر

- ○ کارپوریشن کی شاخیں اضلاع کے ہیڈکوارٹر پر کام کر رہی ہیں
- ○ خواہشمند حضرات کارپوریشن کے دفاتر سے ربط پیدا کریں۔

جہاں دار افسر

اسماعیل ظریف

سب کا حلیف کسی کا حریف نہیں

اسماعیل ظریف جیسے دیدہ ور کے اس دنیا سے اٹھ جانے کے باعث صرف مجھے ہی نہیں بہت سے ان کے قدردانوں کو ایک خلا سا محسوس ہو رہا ہے۔ مغل پورہ جو حضرت رضی الدین حسن کیفی۔ حضرت حکیم وحیدالدین عدیل اور حضرت صفی اورنگ آبادی کے سبب علم و فضل کی بستی کہلاتی تھی۔ اس تاریخی بستی میں شعر و ادب کی فضا بعد میں حضرت تاج قریشی۔ حکیم یوسف حسین خاں اور حضرت اسمٰعیل ظریف کے دم سے سلامت رہی۔ جناب سید نذیر علی عدیل نے بھی اپنی آخری سانس تک شعر و ادب کا چراغ اپنے خونِ جگر سے جلائے رکھا تھا۔ اب بھی وقار خلیل، حمید ارموری، بشیر انور، معین فیاضی، رشید ارشد مظہر محی الدین اور ڈاکٹر راہی ان بزرگوں کی یادگار محسوس ہوتے ہیں۔

اسمٰعیل ظریف سے میری شناسائی اور پھر دوستی تقریباً پانچ دہوں پر محیط تھی۔ ان کے خسر محترم حضرت باقی میرے استاد بھائی اور حضرت صفی کے ارشد تلامذہ میں شامل تھے۔ ابتداً ظریف سے میں اس لحاظ سے ملتا تھا کہ یہ بہرحال میرے دوست کا داماد ہے مگر ظریف کی ظرافت نے بہت جلد دوری دور کر دی اور ہم دونوں آپس میں بے تکلف دوست ہو گئے۔ مخدوم محی الدین۔ ڈاکٹر راج گوڑ اور اختر حسن کے اسمبلی امیدوار بننے کے دوران اس صدی کے پانچویں اور چھٹے دہے میں ہماری بھی محفلیں حکیم یوسف حسین خاں کے دارالعلوم میں سجتی تھیں۔ مخدوم نے ایک ایسی ہی محفل میں حکیم صاحب سے کہا تھا کہ آپ نے ہاؤز آف کامن کو ہاؤز آف لارڈز بنا دیا ہے۔ یہ محفلیں عام طور پر ڈنر پر اختتام کو پہنچتی تھیں۔ ڈنر میں مخدوم کی پسندیدہ جواری کی روٹیاں اور ہری مرچ کی چٹنی ضرور ہوتی۔ ہم سب ایسی محفلوں میں ظریف صاحب کی ظرافت و شاعری سے بھی محظوظ ہوتے تھے۔

اس صدی کے چھٹے دہے کے اوائل میں اسمٰعیل ظریف نے ایک ارادت مند داماد کی طرح اپنے خسر کے نام سے ایک ادبی تنظیم بزم باقی قائم کی تھی جس کا افتتاح بزرگ مجاہد آزادی نواب میر

احمد علی خاں سابق وزیر داخلہ نے کیا تھا۔ اس بزم کی طرف سے برسوں شعری محفلوں کی سج دھج کا
اہتمام ہر ماہ بیت الظریف میں ہوتا رہا۔ جس میں اس زمانے کے تمام سرکردہ شعرا پابندی کے ساتھ
شریک ہوتے اور اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کرتے تھے۔ ظریف حیدرآباد کے بزرگ ترین شعرا
میں حضرت قدر عریضی کے بڑے مداح اور قدردان تھے اور ان کی اپنے استاد کی طرح قدر کیا کرتے
تھے۔

اگرچہ ظریف کا جنم مہاراشٹرا کے ضلع ناندیڑ میں ہوا تھا مگر حیدرآباد سے ان کا شروع سے
قلبی لگاؤ رہا۔ حیدرآباد جب ان کا سسرالی شہر بنا تو وہ حیدرآباد ہی کے ہو کر رہ گئے۔
جب حیدرآباد کی میئر رانی کمودنی دیوی ہوئیں تو گلشن اطفال مغلپورہ میں یوتھ لٹریری
اسوسی ایشن کا افتتاح کرنے آئیں۔ تقریب کے صدر ڈاکٹر حسینی شاہد اور مہمان خصوصی سرور ڈنڈا
تھے۔ جب ظریف نے جلسہ میں طنز و مزاح کے تیر چلانے شروع کیے تو جلسہ گاہ نعرہ ہائے تحسین
سے گونجنے لگا۔ میئر حیدرآباد کے علاوہ ڈاکٹر حسینی شاہد نے بھی ظریف کی فن کارانہ صلاحیتوں کو
بے حد سراہا۔ سرور ڈنڈا نے ظریف کو گلے سے لگا لیا اور اپنے مخصوص انداز میں کہا "باشا تو تو آج کمال
کر دیا ہے۔" اسی طرح حلقۂ فکر و نظر کے سالانہ مشاعرہ سال نو میں جس کی صدارت ہمیشہ مخدوم کرتے
تھے اسمٰعیل ظریف کے نام کے اعلان کے ساتھ ہی زندہ دلی کی ایک نئی انگڑائی محفل میں محسوس
ہوتی تھی۔ اردو ہال۔ ایوان اردو اور اندر گھر کے مشاعرے بھی ظریف برسوں لوٹتے اور داد تحسین
کے دامن میں سمیٹے باہر نکلتے تھے ـــ زندہ دلانِ حیدرآباد کے سینیئر شعرا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ زندہ
دلانِ حیدرآباد کے کل ہند مشاعروں کے بھی وہ اپنی خرابی صحت تک ایک کامیاب اور پسندیدہ شاعر
رہے ـــ ایمرجنسی کے دوران عادل آباد میں جناب اسماعیل قریشی ایڈوکیٹ صدر انجمن تعمیر ادب نے
ایک سالانہ مشاعرہ منعقد کیا تھا جس میں سلیمان اریب، شمس الدین تاباں۔ ابو احمد تاب۔ تاج
مہجور۔ علی سرور۔ اسمٰعیل ظریف اور راقم الحروف مدعو تھے۔ شعرا کا یہ قافلہ جب ایک کار کے ذریعے نرمل
سے آگے بڑھا تو عادل آباد کی خوف ناک گھاٹیوں اور پیچیدہ راستوں میں اچانک کار کا بریک فیل
ہو گیا اور گاڑی تیزی سے پیچھے گہرے غار کی طرف چلنے لگی ایسے میں تاب اور تاج مہجور کار سے کود
پڑے اور گاڑی کے عقبی پہیوں کو فوری پتھر لگا کر روک دیا۔ ورنہ تقریباً ۲۵ سال پہلے ہم سب کی
اجتماعی موت واقع ہو جاتی ـــ افسوس کہ اس وقت کے تمام رفقا میں صرف میں ان سبھوں کے لیے تنہا
زندہ ہوں۔

فرقہ وارانہ جنون کے آزمائشی زمانوں میں بھی میں نے ظریف کو ایک صحیح الدماغ انسان محسوس
کیا۔ وہ جمہوری اور سیکولر اقدار کے ہمیشہ ساتھی اور طرف دار رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مقبولیت
بلالحاظ مذہب زبان اور علاقہ سب میں یکساں رہی۔ ان کے شیدائیوں میں ڈاکٹر گوپال رائے محبوب نارائن

اور ماسٹے منوہر راج سکسینہ بھی یکساں شامل تھے ۔
حیدرآباد خاص طور سے پرانے شہر میں شعرا کی گروہ بندیاں کسی سے ڈھکی چھپی نہیں مگر اس ماحول
میں بھی اسمٰعیل ظریف سب کا یار غار رہا اور کبھی کسی کے لیے بار خاطر نہیں ہوا ۔ وہ سب کا حلیف
تھا کبھی کسی کا حریف نہیں بنا وہ ترسیل و ابلاغ کے المیے کا شکار نہیں رہا ۔ وہ عوام کے دلوں کی دھڑکنوں
کو محسوس کرنے والا شاعر تھا وہ ایسے شعر کہتا تھا جو اس کے دل و دماغ سے نکل کر عوام کے دل و دماغ
میں اتر جاتے تھے ۔ وہ بلاشبہ ایک عوامی شاعر تھا جسے عام لوگ اور دانش ور اپنا آدمی جانتے اور مانتے
تھے ۔

ظریف کی علالت کے دوران بھی ہماری اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں ۔ انتقال سے ہفتہ عشرہ
قبل میں ان سے ملنے پہنچا تو ان کے نواسوں نے اطلاع دی کہ وہ سو رہے ہیں ۔ میں ملاقات کیے بغیر واپس
آگیا ۔ پھر ایک دن اخبار پر نظر پڑی کہ اسمٰعیل ظریف اس دنیا میں نہیں رہے کسی رفیق دیرینہ کا بچھڑ جانا
کوئی کم سانحہ نہیں ہوتا میں سہم کر رہ گیا ۔ بعد ظریف سے اپنی قدیم و عظیم دوستی کی ایک ایک بات مجھے
یاد آنے لگی ۔ میں نے یہ سوچ کر خود کو ڈھارس دی کہ موت بہرحال زندگی کا لوازمہ ہے ۔ آج وہ کل ہماری
بھی باری یقینی ہے ۔ برحق سہی مگر کیا جسمانی موت سے روح بھی مر جاتی ہے ۔ جب تک دنیا کی ہر زبان
میں کوئی ایک شاعر بھی عوام کو درپیش مسائل کو اپنا موضوع سخن بنائے گا ظریف کے زندۂ جاوید
نظریات کا وجدان اسے دعائیں دیتا رہے گا ۔ جب تک ظریف کی شاعری اور اس کے زبان زد خاص
و عام مصرعے عوام کی نوکِ زبان پہ مچلتے رہیں گے ۔ ظریف زندہ رہے گا طنز و مزاح کی شاعری ایک
مشکل ترین فن ہے مگر اس فن میں بھی ظریف کو یدِ طولیٰ حاصل تھا ۔ اس کے فکر و فن کا یہ کمال اور اس
کے لب و لہجے کی شائستگی کا یہ جمال تھا کہ جنھیں وہ اپنے طنز کا نشانہ بنایا وہ بھی اسے بے ساختہ
داد دینے پہ مجبور ہو جاتے اور اس کے کمال سخن کے معترف ہوتے تھے ۔
میں نے اوپر کہیں تذکرہ کیا ہے کہ ظریف کی حیات میں جب آخری بار اس کے گھر گیا تھا تو
مجھے اس کے خواب ہونے کی خبر ملی تھی ۔ آج بھی مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا
ہے ۔ میرا احساس اب بھی یہی ہے کہ وہ دنیا کی بے مہری سے اکتا کر کہیں اور محو خواب ہے اس کی
آنکھیں اب ہماری بے چینی اور بے کیفی کو نہیں دیکھ سکتیں مگر اس کی روح کی آنکھیں ہنوز اپنے
تمام چاہنے والوں کے حق میں چشم نگراں بنی ہوئی ہیں ۔
جب ظریف کے بچے کبھی فون پر مجھ سے مخاطب ہوتے ہیں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے
جیسے ظریف اپنے مکمل احساس خلوص کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہیں جس سے میرا یہ خیال اور
تقویت پاتا ہے کہ انسان مر جاتا ہے مگر اس کی آواز کسی نہ کسی شکل میں زندہ اور رخشندہ رہتی ہے ۔
رابرٹ فاسٹ نے شاعری کو مسرت سے بصیرت تک کا ذہنی سفر قرار دیا ہے ۔ ظریف کی شاعری بھی
مسرت و بصیرت سے عبارت رہی اگر اس کا کلام یکجا کیا جائے تو ہمیشہ عوام کے لیے مسرت و بصیرت

کا پیام بنا رہے گا۔

مجھے یقین ہے کہ مدیر شگوفہ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال ۔ مجتبیٰ حسین ۔ حمایت اللہ ۔ مصطفیٰ علی بیگ ۔ طالب خوندمیری ، مسیح انجم وغیرہ زندہ دلان حیدرآباد کی طرف سے اسمٰعیل ظریف کے کلام کا ایک خوب صورت انتخاب بھی ضرور شائع کریں گے کیونکہ استاد شیخ ابراہیم ذوق نے کہا تھا کسی شاعر کو اگر وہ صاحب اولاد ہو تو اس کی دو چار نسلیں ہی یاد رکھتی ہیں مگر اس کی تخلیقات پر مشتمل کوئی کتاب ہو تو وہ اس شاعر کو صدیوں زندہ رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور خود ظریف کے متعلقین بھی ضرور رہنمائی و تعاون کر سکتے ہیں۔

میں نے غالباً ۱۹۷۵ء میں ظریف پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں اُسے ازراہ مذاق ایک ہینگر کا نام دیا تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ ظریف ہم سب چاہنے والوں کو ہینگر پر لٹکا کر یادوں کے جھولوں پر ہمیشہ جھولنے کے لیے چھوڑ جائے گا۔ اسمٰعیل ظریف کا کلام اس قابل ہے کہ اس کا ترجمہ دیگر زبانوں جیسے ہندی، تلگو اور مراٹھی میں بھی ہو۔ اگر ایسا ہو تو یہ محض ظریف کی ارجمندی نہ ہوگی بلکہ اس طرح اردو کی بھی فیروز مندی ہوگی۔ منتخب کلام کے ترجمے قلیل ہی سہی مگر اس کے مقاصد و نتائج انتہائی جلیل ہوں گے۔ ■
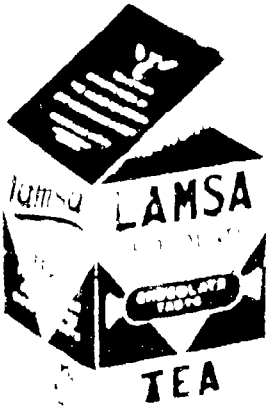
ڈاکٹر عقیل ہاشمی
صدر نشین بورڈ آف اسٹڈیز شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ

اسمٰعیل ظریف ۔ زندہ دلی کا شاعر

اردو زبان وادب کے ابتدائی دور میں شعراء نے اپنے شگفتہ اسلوب سے واقعاتی تاثرات یا صرف غم و غصّہ کے اظہار میں، مزاح کو جگہ دی اپنی فطری صلاحیتوں کی مدد سے ہنسی دل لگی کے مواقع پیدا کیے لیکن اس میں ظرافت سے زیادہ ہجو (PUNCH) تضحیک (SCOFF) بلکہ کبھی کبھی دل آزاری، پھکڑ بازی سے کام لیتے تھے اکثر اس میں گالی گلوچ (APRUSE) اور فحش نگاری بھی دکھائی دے گی اور یہ سب "مزاح" سمجھا جاتا تھا.

پروفیسر کلیم الدین احمد کا کہنا ہے کہ

"بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ ذاتی جذبہ محض ذاتی نہ رہے بلکہ عالمگیر ہو جائے"۔ (سخنہائے گفتنی ص ۱۲۰) یعنی زندگی کی ناکامی ناموزونیت یا خامی کے احساس کے بعد کا اظہار ظرافت ہے اگر اس خامی یا احساس زیاں کو دور کرنے کی کوشش کو آگے بڑھایا جائے تو وہ طنز کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور یہ مذاق سخن اپنا رنگ بدل دیتا ہے وہ ظرافت، ظرافت نہیں رہتی یوں محض ظرافت میں طنز کا شامل ہونا ضروری نہیں لیکن طنز میں ظرافت کا وجود ضروری ہے بالفاظ دیگر خالص ظرافت کے مقابلے میں طنز و ہجو، زیادہ مفید، کارآمد اور موثر چیز ہے اور تخلیقی صلاحیتوں کے حامل بھی،

ہمارے مزاحیہ ادب کا شاید پہلا ظریف شاعر جعفر زٹلی ہوگا لیکن زٹلی ظریف کم اور ہجو نگار زیادہ تھے اور اس ہجو میں ان کا جذبہ انتقامی کارفرما تھا انھوں نے اپنی شاعری کے محور کو تعلقات خاطر سے جوڑ دیا تھا اسی طرح مرزا رفیع سودا قصیدہ گو ہونے کے ساتھ ساتھ صاف ہجو نگار نظر آتے ہیں ان کی شاعرانہ استعداد غیر معمولی تھی اس لیے اپنی فطری شگفتہ مزاج زندہ دلی کو سنجیدہ ہونے نہیں دیا پھر سلسلۂ کئی ایک شاعروں نے شاعری کے اس پہلو کو ہاتھ سے جانے نہ دیا حتیٰ کہ میر جیسا ثقہ شاعر بھی اس "انداز گفتگو" سے بچ نہ سکا مزید سماجی اور تہذیبی اقدار کی شکست و ریخت نے نفسیاتی اعتبار سے شاعر خوش کلام کو موضوعات کے تحت "ظریفانہ" شاعری پر اکسایا اس کی ایک اچھی مثال نظیر اکبر آبادی کی ہے نظیر کے یہ فحش نگاری ناگزیری شے بن جاتی ہے لیکن نظیر نے اپنے کلام میں ہر جگہ طنز کے تیر و نشتر سے کام لیا اور اپنی بے ساختگی اور مزاح کی چاشنی کے ساتھ، نظیر اکبر آبادی کے بعد اکبر الہ آبادی اردو کے خالص مزاحیہ شاعروں میں گردانے جا سکتا

مطمح نظر معاشرے کی اصلاح اور مغرب زدگی کا سدباب تھا اکبر نے طنز و ظرافت کے ذریعہ ملک و قوم کی کمزوریوں کی چھان بین کی ان کی شاعری میں طنز بہت واضح ہوتے ہوئے بھی زہرناک نہیں بلکہ اس میں مزاح کا روشن پہلو بھی شدت سے نظر آتا ہے شوخی شگفتگی کے ہمراہ طعن تشنیع پر اُن کو کامل دسترس حاصل تھی جبکہ اس طنز و مزاح کے ساتھ ساتھ احساس ملی مشرقیت کا زاویہ نگاہ اس کی مقصدیت اور افادیت صاف جھلکتی ہے حقیقت یہ ہے کہ شعراء طنز و ظرافت کے انداز میں جس بات کو کہتے ہیں وہ بجائے خود اہم نہیں ہوتی بلکہ اصل اہمیت تو ان باتوں کی ہوتی ہے جو کہنے میں نہیں آئیں شاعر نے رمز و کنایہ کے ذریعہ اپنے دور کے مسائل کی جانب توجہ دلائی ہے اخلاقی پستی ہو کہ معاشرتی تفاوت حالات سے روگردانی یا بے راہ روی زندگی کے ہر موڑ پر رونما ہونے والے حادثات کی عکاسی چنانچہ طنز و مزاح کا یہ سرمایہ شاعری ابتدا ہی سے ہماری بہترین شاعری کا لازمی حصہ ثابت ہوا۔ یوں بھی اصناف شاعری میں باعتبار معنیٰ طنزیہ کلام کی اتنی ہی اہمیت ہوگی جتنی کہ مدحیہ کلام کی۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے بعد اور پھر تقسیم ملک کے بعد ادب شعر میں جو تبدیلیاں ہوئیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں سنجیدہ مزاج و مرتبہ کی تحریکات کے دوران مزاحیہ شاعری اور ادب نے کسی نہ کسی طور اپنا وجود برقرار رکھا گو اس طرز و اسلوب کو نہ جانے کیوں "ثانوی" درجہ دیا گیا اور کیوں کر مزاحیہ ادب خصوصاً شاعری کو اس کا مستحقہ مقام نہیں دیا یہ ایک علٰحدہ سوال ہے اس پر بجا طور پر گفتگو کی جا سکتی ہے اور کی جانی چاہیئے، چنانچہ اردو ادب میں مزاحیہ شاعری کے موجودہ رنگ و آہنگ کو سمجھنے کے لیے قدیم طرز یا انداز سخن کو سمجھنا ضروری ہے۔ زبان و لفظیات معنی کی نازک بیانیاں موضوعات کی ندرت شستگی و برجستگی کا صحیح اندازہ کیا جانا لازمی ہے اس طرح ہندوستان کی آزادی یا تقسیم ملک سے پہلے بیسویں صدی کی شروعات میں شمال اور جنوب میں نثری مزاح نگاروں کے ساتھ نظم نگاروں کی ایک بڑی تعداد سامنے آئی نثر میں "اودھ پنچ" کو خاص اہمیت حاصل تھی ادھر جنوب میں جامعہ عثمانیہ کے زیر اثر تعلیمی تحریک نے اچھے خاصے شاعر و ادیب پیدا کیئے خصوصیت سے مزاحیہ پہلو لئے شاعرانہ اوصاف کو اُجاگر کرنے میں اکبر و فانی، امجاد حسین کھٹا، نذیر دہقانی کے علاوہ بہت جلد حیدرآباد کی علمی ادبی فضاء میں علی صاحب میاں سلیمان خطیب، سرور ڈنڈا کے نغمات گونجنے لگے یہ صحیح ہے کہ ان لوگوں نے بطور خاص دکن کی زبان و بیان کو اپنایا اور کبھی کبھی سیدھی سادی اردو کو، اس زمانے میں دکنی طرز اظہار ہی نہ صرف قابل توجہ تھا بلکہ شوخی نکتہ سنجی چلبلاپن کا وصف اس قدر جادو جگا رہا تھا کہ مخدوم محی الدین جیسے انقلابی شاعر نے بھی "پیلا دوشالہ" لکھا، کلام میں جدت اور تنوع کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں وہ اس بات کی متقاضی تھی کہ شمال اور جنوب میں مزاح کا منفرد انداز اکبر آبادی احمق اور ظریف لکھنوی کی صورت سے اُبھرا اور جنوب میں برق آشیانوی، شریف اسد انصاری اور اسمٰعیل ظریف کی شکل اختیار کرلی دیکھتے ہی دیکھتے اس کارواں میں دیگر سازوں کی شمولیت نے سفر کی راہیں اور وسیع کردیں مجید لاہوری، ضمیر جعفری، راجہ مہدی علیخاں، دلاور فگار، رضا نقوی واہی کے ساتھ ساتھ دکن میں گرہڑ حیدرآبادی بوگس حیدرآبادی، حمایت اللہ، مصطفےٰ علی بیگ اور ان کے بعد طالب خوندمیری، رؤف رحیم وغیرہ ہم سے نے

مزاح کے ذریعہ سماجیات اور حالاتِ حاضرہ پر کھلی تنقید کی۔ ان لوگوں نے پیروڈی سے بھی کام لیا، اور زندگی کے ہر شعبہ پر گوناگوں رنگوں کی بارش کردی۔

اسمٰعیل ظریفؔ مختصر تعارف یہ ہے کہ وہ بھی اوائل عمری سے شعروادب کا ذوق رکھتے تھے اور شاید اردو ادب کے تیسرے یا چوتھے ظریف ہوں گے میری مراد ظریفؔ لکھنوی، ظریفؔ جبلپوری اور کہتے ہیں مشہور شاعر ماہر القادری کے والد بھی ظریفؔ تخلص فرماتے تھے اور ان کے بعد ہمارے یہ ظریفؔ، موصوف کی شاعری نے حیدرآباد کی ادبی فضاء میں اپنے جوہر نکالے، عام طور پر دیکھا گیا کہ وراثت میں اس طرح کی باتیں دہرائی جاتی ہیں لیکن ظریفؔ صاحب کو شاعری کا اثاثہ سسرال سے ملا محترم سید محمد حسینی المتخلص بانی ظریفؔ کے خسر تھے ان کی اس دین و عطا کو انہوں نے اس طرح خراج ادا کیا کہ ان کے بعد ان کے نام سے ایک بزم کی بناڈالی، شاعرانہ مزاج کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ ایک حساس اور بیدار دل اور مشاہدہ و مطالعہ کی عادت نے طنز و مزاح کی آڑ لیکر جذباتِ دل بیان کرنے میں تساہل سے کام لیا، اسمٰعیل ظریفؔ کے کلام میں بالعموم میانہ روی و صلح پسندی، خیر اندیشی اور شائستگی نمایاں ہوگی انہوں نے بیشتر طنز و تنقید میں ہجو نگاری کا انداز اختیار نہ کیا اپنی خاموشی کم سخنی بلکہ آمیزی کے باوصف حالات اور واقعات سے کماحقہٗ آگاہ و باخبر رہتے سیاسی سرد و گرم پر گہری نظر رکھتے جب کہ ادبی نوک جھونک، مناقشات وغیرہ کو بڑی سوجھ بوجھ سے رقم کرتے ان کا اندازِ فکر، اسلوب اپنے معاصرین سے قدرے جداگانہ رہا، حیدرآباد میں خصوصاً نذیر دہقانی اور سلیمان خطیب نیر، علی صائب میاں کی شاعری کے رسیا اور قدردانوں کے درمیان اپنی آواز کو بڑے اعتماد اور مضبوط طریقہ پر ابھارا، دہقانی، علی صائب میاں، اور سلیمان خطیب کا رنگ و آہنگ دکنی زبان اس کے محاورے، داخلی موضوعات سے متعلق تھا مگر ظریفؔ نے اپنے کلام کا خمیر WIT اور HUMOUR کی اساس پر گوندھا انہوں نے ہجو و تضحیک یا پھر دل آزاری نہ کی عام طور پر وہ طرحی شاعروں سے استفادہ کے قائل تھے اور قدیم ادب سے بے اتفاقی کو پسند نہ کرتے چنانچہ ان کے کلام کا قابل لحاظ حصہ شہر اور اضلاع میں منعقد ہونے والے مشاعروں کی دین ہے اپنی کسر نفسی کے باوجود سخن گسترانہ انداز ظریفؔ کے کلام کا خاصہ ہے اور شاید یہی ان کی شاعرانہ انفرادیت کہی جاسکتی ہے ؎

کسی کا کس طرح خانہ خراب ہوتا ہے ÷ یہ تجربہ ہوا ہم کو بھی گھر بسانے پر

اے کالے دھن کے پرستار غور سے سن لے ÷ پڑے گا جلد ہی دھاوا ترے خزانے پر

تیری گلی میں جانے کی ہمت نہیں مگر ÷ پھرتے ہیں آس پاس تجھے دیکھنے کے بعد

سر پھوڑ کر بھی قیس کو لیلیٰ نہ مل سکی ÷ رہتے ہیں دور اس لیے اب سنگ در سے ہم

ترقی یافتہ ماحول پر جو ناز کرتے ہیں ÷ وہاں اکثر بلا عنوان افسانے نظر آئے

غزل میں اچھے اچھے قافیے سب آگئے لیکن ÷ دھرا نے نظر آئے نہ ہرجانے نظر آئے

اے دعا مانگنے والو یہ بتاؤ ہم کو ÷ لاٹری کے لیے مخصوص دعا کونسی ہے

احباب نے خراب کیا ہے میرا دماغ ÷ میں کیا ہوں کیا نہیں ہوں یہی سوچتا ہوں میں

آپریشن انکی غزلوں کا بھی کرلیتا ہوں میں ÷ کیونکہ زندہ حضرت غالبؔ نہ حضرت میرؔ

چمن کو چھوڑ کر فٹ پاتھ پر یہ تتلیاں کب تک ؛ سرِ بازار یہ بھونروں کی آہوں کا دھواں کب تک

میرے خیال میں ظریف کی شاعری کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے کیوں کہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے حیدرآباد میں ۵۵ء اپنا کلام شائع کروایا اور ۶۹ء میں ادارہ "زندہ دلانِ حیدرآباد" کے اہم شاعر ثابت ہوئے ویسے بھی ظریف کی شاعری میں خصوصیت سے بعض موقعوں پر عامیانہ پن جھلکتا ہے یا پھر مقامی تاثرات اور سستی کیفیات کا اندراج دکھائی دیتا ہے گو اپنے انفرادی رنگ کی وجہ سے وہ اپنے معاصرین میں ممتاز رہتے تاہم ظرافت کی گہرائی اور تغزل کی دل نشینی متاثر ضرور ہوئی۔

جو سلسلہ شروع میں جاری ہے ہر برس ؛ ہر سال اپنے گھر میں بھی اک نونہال ہو'
نہ ہم مضطرب ہیں نہ بے چین ہیں وہ ؛ دکھاوے کی یہ سب اداکاریاں ہیں'
لوٹ آئے گی جوانی انہیں رنگوا لیجئے ؛ فرق پڑتا نہیں کچھ بالوں کے پک جانے سے

ظریف کی شاعری میں اخلاقی درس یا نصیحت کی بازگشت نہیں البتہ طنز کے تیر و نشتر ماں پڑھے جائیں گے اس ضمن میں انہوں نے موجودہ معاشرت اور معیارِ زندگی کے تفاوت اور نت نئے طریقوں کی تلاش کی ہے وہ اپنے اطراف پھیلے ہوئے "نو دولتیوں" کے حرکات و سکنات پر بھی نظر رکھتے ہیں اور اپنی فکر رسا سے ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ قاری یا سامع بے ساختہ جھوم اٹھتا ہے اور طنز کا بھرپور وار خالی نہیں جاتا۔

بھیگی بلی جو نہیں بنتا ہے گھر میں دوستو ؛ آج کل ایسا تو کوئی شیر خاں ملتا نہیں
ہوٹل میں کل ڈنر کا کیا ہے نے اہتمام ؛ دعوت قبول کیجئے تشریف لائیے !
غالب کی طرح بھیس فقیروں کا بنا کر ؛ دوکان پہ راشن کی کوئی کیو میں کھڑا ہے
موجودہ اس گرانی کی گرمی سے آج کل ؛ کچھ موٹے تازے لوگ بھی یار دبکھل گئے
ناسمجھ کوراہی لوٹ آتا ہے باہر جا کر ؛ جو سمجھ دار ہے وہ ہو کے نہال آتا ہے

ظریف نے جیسے جیسے شاعری کے انداز سے بدلے خود کو نہیں بدلا اقدار اور معیارِ ادب کو اپنے تئیں یکسوئی اور ذمہ داری سے نبھایا۔

قطعہ

کلام کہہ کے سُنانا کوئی مذاق نہیں ؛ خصوصی داد کا پانا کوئی مذاق نہیں
مزاح نگاری بھی اک صنف ہے ادب کی ظریف ؛ ادب میں رہ کے ہنسانا کوئی مذاق نہیں

انھوں نے اصناف شاعری میں غزل اور پھر قطعہ یا رباعی میں اپنی دلچسپی کو مرکوز رکھا کبھی کبھی نظم اور وہ بھی آزاد نظم میں دو چار چیزیں کہیں ان کی نظم "چار مینار" بہت مشہور ہوئی جب کہ "مشورہ" کے عنوان سے ان کی نظم کے تیور دیکھئے۔

عاشق نے اپنی چنچل محبوب سے ایک دن
میں کرنا چاہتا ہوں' مشورہ شادی کے بارے میں
شریک زندگی میں ایسی لڑکی کو بناؤں گا
سلیقے سے جو کرسکتی ہو گھر کے کام ہاتھوں سے
کہا لڑکی نے یہ سن کر بہت اچھا ارادہ ہے

خیالات اور یہ جذبات بے شک ہیں بہت اونچے
تمہیں کل ہی ملادوں گی میں اپنی نوکرانی سے ـــــ !!!

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ظریف کی شاعری کا محور عمومی طور پر طرحی مشاعرے ہیں اور ان مشاعروں میں وہ پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ حیدرآباد میں ادارۂ قدرِ ادب ادارہ ادبِ اسلامی اور دوسری انجمنوں کے منعقدہ طرحی مشاعروں کی وجہ سے انھوں نے رباعیات بھی کہی ہیں قطعات اور دیگر اصناف میں سلام، نعت اور منقبت پر بھی طبع آزمائی کی ان کی زود گوئی اور مذاقِ سخن نے انھیں "عندلیبِ ظرافت" کا اعزاز بھی دلایا اس کے علاوہ ریڈیو اور ماہناموں اور روزناموں کے لیے بھی اپنا کلام شائع کرواتے خصوصیت سے شگوفہ میں رباعی ہو یا قطعہ وہ اپنی صاف گوئی طنز و ظرافت سے سدابہار بنادیتے ـ

کوچہ سے حسینوں کے گزرنا سیکھو ؛ ان پر نئے انداز سے مرنا سیکھو
غیروں کی ہری گھاس کو تکنے والو ؛ رہ کر حدِ مخصوص میں چرنا سیکھو

آج کل سا کوئی عاشق آہ بھر سکتا نہیں ! ؛ اس زمانے میں کسی پر کوئی مر سکتا نہیں
ایک کرتہ سو روپے سے کم میں ملتا ہے محال ؛ کوئی عاشق اب گریباں چاک کر سکتا نہیں

قابل ہے کوئی آپ کا بیٹا تو پھر حضور ؛ باہر نہ بھیجئے اُسے لیڈر بنائیے
ٹیچر ہو یا وکیل ہو یا کوئی ڈاکٹر ؛ ان سب کو آپ گھر کے شاعر بنائیے

اسمٰعیل ظریف نے اپنے عقائد اور مذہبی اقدار کا بھی پاس و لحاظ رکھا ایک پختہ مشق سن رسیدہ آزمودہ کار شاعر طنز و مزاح کی حیثیت سے [illegible] زندگی کے آخری ایام تک کچھ نہ کچھ کہتے رہے اصنافِ شاعری میں ان کو غزل زیادہ پسند تھی اور اسی طرزِ اظہار میں نعت و منقبت کا بھی اہتمام کرتے تھے اپنی روانیٔ طبع لطفِ زبان، رجحان و رعایت لفظی کا بڑا خیال رکھتے حمد و نعت کے اشعار پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں مذہب کا کتنا اعتبار تھا جب کہ اس کے اظہار میں ان کی زبان و بیان سلاست معنی آفرینی میں کس قدر احتیاط آجاتی ہے حمد کا کیا شعر ہے

کوئی حاکم ہے یہاں نہ تو ہے محکوم کوئی ؛ ہے حقیقت میں دو عالم پہ حکومت تیری

اسی طرح سرکارِ دو عالمؐ داعیٔ اسلام سے اپنی محبت اور عقیدت کے لیے کتنے جذباتی اور شاداں ہیں ـ

بخشوائیں گے وہ اُمت کو خدا سے بیشک ؛ ہیں جو سردارِ دو عالم مرے آقا تنہا
میں جب پڑھوں گا یہ مصرعے تو سب کہیں آمین ؛ خدا نصیب کرے حاضری مدینے کی
اہلِ دل اہلِ نظر اہلِ بصیرت کے لیے ؛ مشعلِ راہ بن گئی ہے ہر ہدایت آپ کی

میں جس حالت میں ہوں جیسا بھی ہوں جو کچھ بھی ہوں لیکن
تمہارا ہوں تمہارا ہوں تمہارا یا رسول اللہ

مختصر! اسمٰعیل ظریف نے کوئی چار ضخیم جلدیں اپنی یادگار چھوڑیں جن میں بیشتر کلام طرحی

مشاعروں کا ہے اپنے نظریہ شاعری کی وساطت سے وہ روایاتِ شعری سے منحرف نہ ہوئے اور نہ ہی ادبی معرکوں کے خوگر رہے جب کبھی جہاں کہیں بھی کچھ انوکھی بات محسوس ہوئی مشاہدہ میں آئی بڑی چابکدستی اور تیزی سے شعر موزوں کر دیے بسا اوقات شاعروں میں بھی برجستہ برمحل فی البدیہہ اشعار کہہ دیتے تھے ظریف صاحب کے کلام کا ایک دقیع انتخاب ان کے مقام و مرتبہ کے تعین میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے گو مرحوم کے یہاں موضوعات کی فراوانی نہیں لیکن سہل الممتنع سیدھی سادی زبان میں جذبات واحساسات کی ترسیل ان کا وصفِ خاص تھا انھوں نے کبھی بھی شاعری میں صناعی کی کوشش نہ کی بلکہ مقبول اور رائج لفظیات کو استعمال کرتے قدامت پسندی کا رُجحان ان کے کلام میں ہمیشہ نمایاں رہا۔ مبتذل الفاظ یا رکیک اشعار کے اجتناب سے طنز و مزاح میں ندرت و کمال پیدا کرنے کو پسند کرتے تھے ان کے انتقال سے دُنیائے شعر و ادب میں بظاہر کوئی کمی نہیں ہوئی مگر ظرافت، خوش دلی رنگا رنگی زندہ دلوں کے لیے احساسِ زیاں ضرور ہوگا، بہرحال اجراعیہ اُردو ادب کے ایک بزرگو مخلص شاعر کی جُدائی سے شگفتگی برجستگی بے ساختگی کے مضامین (شاعری) سے محرومی مقدر ہوگئی بطور خراجِ عقیدت میں اسمٰعیل ظریفؔ کے اس شعر پر اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں ؎

مانا مرے کلام میں کچھ خامیاں بھی ہیں
یہ بھی تو آپ دیکھیے فنکاریاں بھی ہیں

□□

ڈاکٹر فریدہ وقار
لکچرر اورینٹل اردو کالج ہمایت نگر حیدرآباد

ظریف اپنے شعری ظرف کے آئینے میں

نجابت اور شرافت تو اپنی جگہ مسلّم ہیں پر سنجیدہ ظرافت میں ظریف کا ثانی شاعر مشکل ہی سے ملے گا۔ اسماعیل ظریف ہندوستان میں آباد جہانِ طنز و مزاح کے گراں مایہ شاعر تھے جنھیں گرانی نے تو نہیں طبعی موت نے آدبوچا۔ یہ اور بات ہے کہ آزاد ہندوستان میں گرانی بہت ہی دبے پاؤں داخل ہوئی اور ایسی سبز قدم ثابت ہوئی کہ الاماں الحفیظ یہ صرف اشیائے ضروریہ کی گرانی نہیں تھی بلکہ ملی جلی تہذیب کے دھارے بھی گراں ہونے لگے زبان کے چٹخارے والوں کو گرانی کا جو احساس تھا وہ صرف لقمۂ تر کے ہضمی نظام سے وابستہ تھا اور یہ کبھی طویل اور کبھی مختصر ڈکار کے ساتھ تحلیل ہوجایا کرتا تھا۔ لیکن ایک ٹھیٹ قدم بلکہ دم بخت تہذیب جو اردو کی ادبی روایتوں اور وضع داریوں کے پیدا کردہ ذوق کی غماز تھی بتدریج گراں ہوتی گئی اور اس گرانی کا ہر ادیب اور شاعر کو احساس ہوتا رہا۔ کسی نے احباب کی محفلوں میں آنسو بہائے تو کسی نے صبر و تسلیم سے کام لیا۔ ظریف نے اپنی روشنائی بہائی اور صفحۂ قرطاس پر مسکراہٹیں بکھیر دیں۔

میرے اشعار پڑھ کر ہنس پڑے بے ساختہ وہ بھی ؎ ظریف خوش طبیعت یہ غزل تو نے کہی اچھا
تمہاری شاعری بھی کیا غضب ہے ؎ ظریف ہر شعر گویا پھلجھڑی ہے
مرنا خوشی سے کس کو گوارا ہے دوستو ؎ بے موت اس گرانی نے مارا ہے دوستو

اس گرانیٔ ذوق کے دور میں گراں لب و لہجہ کا شاعر ظریف کو گرانی کا مارا ضرور تھا مگر مذکورہ طویل یا مختصر ڈکار سے وابستہ نہیں تھا۔ ناندیڑ کے ایک آسودہ حال تاجر گھرانے کے چشم و چراغ ظریف ابتداء ہی سے شعر و سخن کی طرف مائل تھے تاہم یہ پتہ ہنوز نہیں چل سکا کہ ان کی گھٹی میں شاعری کس نے گھولی تھی۔ ان کا خود کا کہنا ہے۔

شاعری میں نے لڑکپن ہی سے اپنائی ہے ؎ یہ ظرافت تو مرا ورثۂ آبائی ہے

ظریف کے تخیل کی پرواز اور اس کی ندرت اور شعر و ادب سے ان کی بے پناہ محبت کی انتہا یہ تھی کہ جب چاند پر اپولو خلا بازوں نے اپنے قدم میمنت رنجہ فرمائے تو شعر و ادب کا چاند کی تمثیل کو ملحوظ رکھ کر

انھوں نے شعر و ادب کی دودھیائی کیفیت کا چاند کی دودھیا کرنوں سے رشتہ پختہ تر کردیا اور بے ساختہ یہ شعر کہہ گئے۔

اب عنقریب چاند میں ہوگا مُشاعرہ ؛ اردو کا اک وہاں بھی ادارہ ہے دوستو

صرف یہی نہیں بلکہ انھیں چاند سے ایک عجیب والہانہ وابستگی تھی۔ تیز کو جنون میں، چاند میں کوئی شکل نظر آئی تھی اس کے برخلاف ظریف کی شاعری میں ہیں جا بجا چاند نظر آتا ہے اور لگتا ہے کہ وہ مسلسل اس کی تسخیر میں لگے ہوئے ہیں۔

گردِ تیر ہی سہی خار ہی کچھ بھی سہی ؛ چاند اپنا ہے وہاں راج کریں گے اک دن
قرض لینے ہی کی نوبت اگر آجائے ظریف ؛ چاند کا چاندی پہ راج کریں گے اک دن
اس دورِ ارتقاء میں بھی نہیں ہوں پیچھے ؛ راکٹ کے اور خلا کے نقشے بنا رہا ہوں
اب چاند پہ جانے کا اپنا بھی ہے ارادہ ؛ ہے دور بہت منزل آٹو سے جا رہا ہوں

ظریف کی حساس طبیعت نے اپنے ماحول کی پوری حقیقت شناسی کے ساتھ عکاسی کی ہے انھوں نے اپنے جذبات کو کبھی ماحول سے الگ نہیں کیا اور اپنے اظہار میں ان ذائقوں کو بھی شامل کردیا جو ہر دور میں نوکِ زبان پر رکھے ہوتے ہیں۔ ہے کوئی ایسا، جو کشفِ اختیاری کا حامل ہو اور اپنے کشف سے یہ بتا سکے وہ اس وقت ڈنر میں کیا کھا رہے ہوں گے اس کا ادراک تو خود ظریف کے قلم سے عرفان کی منزلیں آج بھی طے کر رہا ہے یہ اور بات ہے کہ اس قلم کی روشنائی اس مادی دنیا کی وسعتوں تک محدود ہے۔ اور ہر مادے کی حقیقت کلیجہ کی جلن سے کبھی آگے نہ بڑھ سکی اور اس حقیقت سے یہ کہہ کر ظریف نے پردہ اٹھایا۔

قسمت کی بات ہے جو اڑاتے ہیں وہ ڈنر ؛ اپنے نصیب میں تو بگھارا ہے دوستو

ظریف کی ظرافت اپنی جگہ مسلم مگر شرافت بھی کم نہ تھی اور شاعر کی حیثیت سے ان کی انا کا انکار ممکن نہیں خود اپنی انا کا ادراک رکھنے والا ظریف جس قدر گہرائی اور گیرائی کے ساتھ بذلہ سنج تھا اسی قدر عمیق اور پرت در پرت خودداری بھی فکرِ شاہجہاں کا امین کہتا ہے۔

ظریف اکثر خیالوں کے محل تعمیر کرتے ہو ؛ تمہاری فکر فکرِ شاہجہاں معلوم ہوتی ہے
اب ایسی ویسی بات نہ پوچھو ظریف ؛ جو کچھ بھی عرض کرنا تھا فرما چکا ہوں میں
جانے کیوں خواہ مخواہ ظریف سے ؛ بعض بگڑے دماغ جلتے ہیں
واقعی داد کے قابل ہے غزل تیری ظریف ؛ تیرے اشعار پہ ان کو بھی ہنسی آئی ہے

بقول کسے

جو اس جہاں سے ہیں چل بسے انھیں کیا ملا یہ کسے خبر ؛ یہ تو رب جانے ہیں کے ماحضے نہ ثواب ہے نہ عذاب ہے

کے برخلاف ظریف اپنے عقیدے کے مطابق فری اسٹائل میں اپنی پوری لطافتوں کے ساتھ دلِ عاشق کی بہشت سے شناسائی کا جلوہ میں جاسوسی کر رہے ہوں گے اور اگر فری اسٹائل کی نوبت بھی آئی تو دلِ عاشق بھلا کب مانتا ہے ظریف جی کے بھولے تھے اور منہ پوچھنے سے پہلے ہی اپنے ابدی گھر چلے گئے جس کا احساس انہیں شروع تھا ہے

رہا تھا اور یہ شعر کی صورت اختیار کر گیا۔

نہ کوئی خط نہ کوئی انکی خبر آئی ظریف ؛ آج تک جنتوں کا اب دنیا سے رشتہ ٹوٹا

اِن اشعار میں دیکھئے وہ کس قدر سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔

کوئی فنکار ہو یا بڑی شخصیت زندگی میں کوئی قدر و قیمت نہیں

بعد مرنے کے ہوتی ہے آہ بکا اور کرتے ہیں ہم برسیاں دوستو

دوستو چار دن کی ہے یہ زندگی خواہ مخواہ کیوں ہے آپس میں رسہ کشی

ہے غنیمت یہ آپس میں مل بیٹھنا ورنہ پھر تم کہاں ہم کہاں دوستو

تاج پوشی حیدرآباد کا ایک مخصوص محاورہ ہے۔ اور ظریف کو تاج پوشی کے لفظ کا جو والہانہ دلگاؤ تھا اُن کے اشعار سے عیاں ہوتا ہے۔

ہو جائے تاج پوشی نہ کالج کے گیٹ پر ؛ ہیرو کے واسطے یہ اشارہ ہے دوستو

وہ اس اشارے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں۔

تاج پوشی سرِ بازار نہ ہوگی جب تک ؛ ہیرو مانے گا نہیں اس طرح سمجھانے سے

انھیں لطافت اور کثافت میں فرق کرنا بھی خوب آتا تھا۔ دیکھئے لطافت اور کثافت کو کس خوبی کے ساتھ جڑواں بیلوں کی طرح دراز بھی کیا اور اس پر ٹیپ کا بند بھی لگا گئے نہ صرف یہ کہا بلکہ اس کی بڑھتی لڑکوں کو بھی نص قطعی کی طرح برکس بھی دیا اُن کی اُنگلیوں میں دبا قلم یوں رقصاں ہوا۔ قطعہ دیکھئے۔

محفل شعر ہے یاں پاس ادب ہے لازم ؛ حد مخصوص میں رہ کر ہی بسنا سیکھو

کسی فنکار پہ کیوں تیر چلاتے ہو میاں ؛ طفل مکتب ہو ابھی آپ نشانہ سیکھو

اور یہ چھوٹی سی نظم نو منزلہ دیکھئے۔

رو رہا تھا بیٹھ کر شیطان اک فٹ پاتھ پر ؛ جب سبب پوچھا گیا تو یہ وضاحت اس نے کی

حضرت انسان ہی نے مجھ کو دھوکا دے دیا ؛ سامنے بلڈنگ کھڑی ہے جو نو منزلہ

میرے پیسوں سے بنا کر فضلِ ربی لکھ دیا

اپنے عصر سے آگہی بھی ان کے ہاں خوب ملتی ہے۔ اور ظریف اپنی عادت سے مجبور تھے وہ سچ پر پردہ نہیں ڈال سکتے تھے۔ پارسائی ثابت کرنے کا یہ انوکھا طریقہ ان کی ایجاد ہے۔

کسی کی پارسائی قابلِ تسلیم تب ہوگی ؛ قسم کھا کے وہ چھوڑے ہاتھ سے بجلی کے تار کو

اپنی شاعری کے انداز میں یکہ و تنہا ظریف ببانگِ دہل یہ بھی کہہ گیا۔

مال غیروں کا میں اپناتا نہیں ؛ شاعری کو اپنی دفناتا نہیں

بھلا بتایئے جو شاعر انیسویں صدی کے آخری دہے کے نصف سے زائد تک زندہ رہا ہو جس نے وار گیٹ سے ہندوستان کے ٹیلی کام گیٹ کے دروازے کھلتے دیکھے ہوں۔ صبح بنارس کی طرح ایمرجنسی کی صبح بھی دیکھی ہو جس کی زندگی ہی میں سینٹ کیٹس کی بقچی کھل چکی ہو۔ مگر پھر بھی اس شاعر نے اپنے زجاج انا پر بال بھی نہیں

آنے دیا ہو تو پھر تا ہے یہ کہاوت کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے کس خانے میں فٹ ہوگی سرد خانے میں یا خشک وتر خانے یا پھر بات زہریہ کا معدن کر رہ جائے گی بہر حال یہ ایک الگ اور طویل تر گفتگو کا پیش خیمہ ہوگا۔ تاہم ظریف کی شاعرانہ گفتگو ظاہر کرتی ہے کہ وہ زہریہ سے پناہ ہی مانگتے رہے۔

شعراء کی محفلیں ظریف کی زندگی میں بھی سجیں اور بعد میں بھی سجتی رہیں گی یہ اور بات ہے اب وہاں ظریف نہ ہوں گے اور یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ ان کی انا منفرد تھی ماحول کی اچھائی برائی زندگی کے نشیب و فراز رشتوں سے جذباتی لگاؤ وغیرہ وغیرہ سب ہی کچھ ان کے ہاں مل جاتا ہے

محفل شعر میں شاعر کہیں کھو جاتا ہے ؛ گھر میں شاعر کے لیے ٹاپتی رہتی ہے غزل
شب کے سناٹے میں تنہائی کا احساس لیے ؛ مصرعے سو جاتے ہیں جاگتی رہتی ہے غزل
جہاں کشمکش ہے ضمیر سے وہاں تنگدستی بحال ہے ؛ جہاں دھاندلی پہ ہے دھاندلی وہیں آج کل ترقی آگئی ہے

دھاندلی کے خلاف آواز اٹھانے والا شاعر ظریف نہ تنگدست تھا نہ کوتاہ دست اس دراز قد شاعر کی دراز قلمی ملاحظہ کیجیے کہ جناب کو اضطراب قلب کی بھی فکر تھی اور جینے مرنے پر بھی نظر رکھتے تھے۔ مگر اوروں کی طرح نہیں بلکہ اپنی منفرد فکر سے جس کی قدریں پامال کے زمرے میں نہیں آتیں بلکہ اظہار کی بے ساختگی ان کی بوقلمونی کا مظہر ہے اور ان کے کلام کا دو آتشہ پن ہی ان کی انفرادیت کا پتہ دیتا ہے۔ مختلف انداز کے چند اشعار ملاحظہ کے لیے پیش ہیں۔

پٹی پڑھا کے لوگوں کو محفل میں لائیے میاں ؛ چھا کر غزل سنائیے اور چھت اڑائیے میاں
بور کر رہے ہو ہیں خواہ مخواہ ظریف ؛ بکواس بند کیجیے مقطع سنائیے

موت اپنی حیات اپنی ہے ؛ دن بھی اپنا ہے رات اپنی ہے
جو کچھ بھی ملے اسکو مقدر نہ سمجھ ؛ ہو لے یہ کل کائنات اپنی ہے

ان کے کلام میں لفظی مناسبی اور بازی گری نہیں ملتی بلکہ یہ انسانی ذہن کو چابک لگاتے ہیں لیکن نہایت سیدھے سادے انداز میں

یہ لیڈری بھی کھیل نہیں ہے کوئی حضور ؛ پبلک جہاں بگڑ گئی جوتوں کا ہار ہے

اور لو اور ظریف کی دیدہ دلیری دیکھیے خود اپنا محاسبہ کر بیٹھے یہ اور بات ہے کہ یہ محاسبہ اپنی پوری انکساری کے ساتھ اپنے منافع پہ اس طرح چھوڑا ہے کہ وہ اپنے تدبر کو اور ارفع کر گئے۔

ظریف اپنا بھرم بھاری تیا نا چھوڑ دو کیونکہ ؛ سمجھ لیتا ہے ہر اہل نظر خالی پٹاروں کو

جب خالی پٹاروں کی بات چل نکلی ہے تو ذرا پٹاروں کی چند قسمیں بھی دیکھتے چلیں مثلاً ہرجائی شاعر کا پٹارہ نئی تہذیب کے دلدادا شاعر کا پٹارہ شاعر کا وہ پٹارہ جس میں اُن کے ناقد بند رہتے ہیں یوں تو اور بہت سارے پٹارے ہیں لیکن ظریف نے ان سارے پٹاروں کو اپنے پٹارے میں بند کر دیا ہے۔ لیکن اس طرح سے کہ بوجھ بڑھنے نہ پائے بلکہ کم ہو جائے ایسا اس لیے کہ ان جیسا حقیقت پسند جب کبھی نئے تجربے یا مشاہدے سے گزرتا ہے تو اس بوجھ کو اپنے سر سے اتار پھینکتا ہے۔

جو ہر جائی ہے یارو آپ اسکو دل ربا سمجھے ؛ جو ہے جانِ غزل گھر میں اسے بے جا سمجھے
سمجھنے والے ایسے بھی ادب میں ہوگئے پیدا ؛ رباعی کو غزل سمجھے غزل کو مرثیہ سمجھے
پہلے اساتذہ سے پکارا گیا ظریف ؛ کچھ تو لحاظ کیجئے اسکے مقام کا

نسوار سے ظریفانہ چھیڑ بالکل ایسی ہے جیسے " یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ "
اب یہ تصفیہ آپ ہی کے ذمہ ہے ظریف کی یہ ہمدردی نسوار سے تھی یا ناک سے۔

ناس یوں ناک میں بے طور نہ ٹھونسا کیجئے ؛ یہ دو نالی کہیں بھرمار نہ ہونے پائے

اب دیکھئے کہ اس بھرمار کی گھن گرج کو ظریف شہنائی میں یوں بدلتے ہیں۔

ناس لینے کے بھی انداز جدا ہیں سب کے ؛ ناک والوں نے بھی کیا خوب ادا پائی ہے
آپ کی ناک کا کیا پوچھتے ہو حال ظریف ؛ ناک کی ناک ہے شہنائی کی شہنائی ہے

صرف یہی نہیں ظریف نے سائنسی تجربات کو بھی اپنے شعری آئینے میں دیکھا ہے۔

ایکسرے میں کچھ اسکا پتہ چلتا نہیں ظریف ؛ خواہ مخواہ کیوں کھینچتے ہو دل میں ہے تصویر یار
ایکسرے لینے پہ ظاہر ہوئی یہ بات ظریف ؛ ٹھیس نظروں کی لگی آئینہ دل کا ٹوٹا

انداز میرؔ اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

کوئی بھری محفل میں آکر راز کسی کا کھولے ہے ؛ کوئی ڈنڈی مار کے سودا منڈی میں کم تولے ہے
کیا تیرے بھیجے میں خلل ہے کیا سوجھی ہے تجھ کو ظریف
اپنی بولی چھوڑ کے جو تو میرؔ کی بولی بولے ہے۔ ▫▫

تعزیت

مزاحیہ شاعر جناب فیض الرحمن فیض رائچور نے مقبول عام مزاحیہ شاعر جناب اسمٰعیل ظریف کے انتقال پُر ملال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے پسماندگان سے اپنی گہری ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ جناب فیض نے اپنے تعزیتی پیام میں کہا ہے کہ جناب اسمٰعیل ظریف نے پچھلے ۴ دہوں سے طنز و مزاح کے ذریعہ سماجی ناسور پر مرہم رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے ظریف کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے زندہ دلانِ حیدرآباد سے ظریف کے کلام کی اشاعت کی جانب غور کرنے فیض نے اپیل کی ہے۔

نفیس ابراہیم خان
ایم۔ اے۔ ایم فل (عربی) عثمانیہ [illegible]

میرے پاپا
اسمٰعیل ظریفؔ اور بیت الظریف

اسمٰعیل ظریفؔ صاحب کے انتقال سے نہ صرف دُنیائے شعر و ادب کو ان کی شاعری سے محروم ہونا پڑا بلکہ ان کا خاندان بھی ان کی سرپرستی سے محروم ہوگیا۔ ۱۶ سال قبل ہم اپنی اس عزیز ترین ہستی کو کھو دیا۔ جس نے ہمیں جنم دیا تھا ان کا نام تھا اشرف النساء بیگم جس کے بعد ہمارے پاپا ہی ہمارے لیے سب کچھ تھے۔ ہماری زندگی کو عزم و حوصلہ دینے والی شخصیت چپ چاپ ہفتہ کی رات ۵ ر اکتوبر ۹۶ء کو پونے تین بجے اس دنیا سے رخصت ہوگئی اور ہمارے سر سے سایۂ پدری بھی اٹھ گیا جس کے سائے تلے تین لڑکیاں اور ایک لڑکے کا بسیرا تھا۔ میری بڑی بہن قمر جبین گریجویٹ ہیں جو خواجہ عبدالرحمٰن صاحب سے بیاہی گئیں جن کا پیشہ زراعت ہے ان کے ایک لڑکی اور تین لڑکے ہیں۔

میرا نمبر دوسرا ہے نام نفیس تبسم رکھا گیا۔ میرے شوہر ایمپلائمنٹ آفس میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہیں۔ میں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے عربی میں ایم۔ اے ایم فل کیا ہے۔ شاعری کرنے کی گستاخی تو مجھ سے نہ ہوسکی البتہ نثر نگاری کی طرف میری طبیعت مائل رہی۔ میرے تین لڑکے ہیں۔ میری تیسری بہن افسر شاہین گریجویشن کرنے کے بعد مقامی اسکول میں ٹیچر ہے۔ میرا چھوٹا بھائی جو مجھ سے بارہ سال چھوٹا ہے انٹرمیڈیٹ کے بعد ایئر کنڈیشن اور ریفریجریشن کے ڈپلوما حاصل کر چکا ہے۔

ظریفؔ صاحب اپنے چھ نواسوں اور ایک نواسی کو یکجا دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ ان بچوں کو اپنے طالب علمی کے دور کے قصے سُنا کر ہنساتے، ہمت و جوشش پیدا کرنے والی باتیں کرتے۔ بچے اُن کی گفتگو بڑے شوق اور جستجو سے سُنتے ان سے سوالات کیا کرتے۔ ان کا انداز بیان بہت پُر لطف ہوتا تھا۔ نہ صرف بچوں کو بلکہ تمام افراد خاندان کے سامنے بزرگوں کے قصے اور احباب کی پُر لطف صحبتوں کا ذکر کرتے تھے۔ ادبی حلقوں میں بھی وہ اپنی بذلہ سنجی اور خوش گفتاری کے لیے مشہور تھے۔ ایک ملنسار اور بے ضرر انسان تھے حیدرآباد میں خصوصاً محلہ مغلپورہ میں شاعروں کی کئی بڑی گروہ بندیاں تھیں لیکن وہ ہر گروہ کے لوگوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ ہر ایک کا احترام [illegible]۔ تعصب ان کی طبیعت میں نہ تھا۔ اسی بنا پر کئی انجمنوں اور [illegible] سے وابستگی رہی۔

ہندی کوی سمیلن میں بھی مدعو کیے جاتے تھے۔ پرائیویٹ محفلوں مقامی مشاعروں اور اضلاعی آل انڈیا شاعر و مزاحیہ مشاعروں میں انھیں احترام کے ساتھ مدعو کیا جاتا تھا۔ اپنی شعری صلاحیتوں اور ظریفانہ ندرتوں کی وجہ سے داد و تحسین حاصل کر کے نمایاں مقام پایا۔

پاپا سنجیدہ اور کم سخن ضرور تھے لیکن وہ بھرپور انداز میں جینے کا سلیقہ بھی رکھتے تھے ۔ اور ہنسی خوشی زندگی گزارنے کے وہ قائل تھے۔ مہاراشٹرا کے ضلع ناندیڑ میں پاپا کی جوتوں اور کپڑوں کی دکانیں تھیں۔ نیز صابن کا کارخانہ تھا جس میں ناگ چھاپ اور گھوڑا چھاپ صابن تیار ہوتا تھا جو کافی مشہور تھا بسکٹ کا کارخانہ بھی تھا۔ یہ شیخ چاند اینڈ کمپنی کے نام سے وہ اپنا کاروبار چلاتے تھے۔ شیخ چاند میرے نانا تھے۔ ظریف صاحب نے دو طرح کے سفر کیے ایک تجارتی اور دوسرا ادبی۔ تجارتی سفر ۲۰ سال کی عمر سے ہی شروع ہوا دہلی آگرہ۔ کانپور، بمبئی، کلکتہ، لکھنؤ، شولاپور اور پٹنہ وہ جاتے آتے تھے۔ جب بھی آگرہ جاتے تھے ضرور تاج محل دیکھ کر آتے۔ تمام مذکورہ بالا جگہوں پر پاپا نے ادبی محفلوں کو گرمایا ہے اور اپنی ظرافت کے پھول بکھیرے ہیں۔

بیتُ الظریف : ہم حیدرآباد میں پیدا ہوئے جب ہمیں ناندیڑ لے جایا گیا تو وہاں کی آب و ہوا ہمیں راس نہ آئی۔ پاپا نے اپنی اولاد کی چاہت میں اپنے پیدائشی مقام ناندیڑ کو خیرباد کر کے حیدرآباد میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ چنانچہ محلہ مغلپورہ میں ایک کشادہ وسیع مکان خرید لیا۔ اور اپنے کاروبار کو جاری رکھنے کے لیے نیا پل سے قریب شوزنگ ہال کے نام سے ایک دوکان لگالی۔ بیت الظریف میں بہت سی تقاریب منعقد ہوتی رہیں جس میں ہم لوگوں کی تسمیہ خوانی، عقیقہ، سالگرہیں شامل ہیں۔ ان میں خاص طور پر میراثنیوں کو بلایا جاتا تھا۔ ان سے فرمائشی غزلیات سنی جاتیں۔ رات دیر گئے ڈھائی تین بجے محفلیں برخاست ہوتیں۔ گیارھویں شریف میں قوالیوں کا بھی اہتمام ہوتا جس میں عزیز احمد وارثی، کریم قوال۔ اقبال قوال کو سننے کا موقع ملا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں میرے نانا سید عمر حسینی باقی مرحوم کے نام سے پاپا نے بزم باقی قائم کی۔ ہر ماہ پابندی سے طرحی مشاعرہ ہوا کرتا کہا جاتا ہے "بچپن کی بات پتھر کی لکیر ہوتی ہے"۔ اس لیے مجھے پہلے طرحی مشاعرہ کا وہ مصرعہ آج بھی یاد ہے جس پر شاعروں نے بڑی دھوم مچائی تھی وہ یہ تھا ؎

ع انگلیوں پر زندگی کے دن گنے جانے لگے

ہم نے سب سے پہلے اپنے ہی گھر میں محفل شعر و ادب کو منعقد ہوتا ہوا دیکھا۔ آداب محفل کا شعوری طور پر ہم میں احساس پیدا ہونے لگا اور شعر سے دلچسپی بھی پیدا ہوئی۔ مشاعرے کے لیے ہمارا دیوان خانہ اور کبھی دالان کا انتخاب کیا جاتا۔ ہر دو جگہوں کو سنوارتے ہیں میرے پاپا بڑی دلچسپی لیتے ہم بھی ان کی مدد کرتے فانوس باری باری شعرائے کرام کے سامنے رکھنے کا اہتمام ہوتا۔ چائے کے دور چلتے۔ خواتین کے لیے علحدہ انتظام کیا جاتا۔ تقریباً ڈیڑھ دو سو افراد کا اجتماع رہتا۔ اس زمانے کے سب بڑے بڑے نامی گرامی شعراء شرکت کرتے تھے۔ محفل سنجیدہ شعراء سے ہی بھری رہتی تھی ان میں تنہا میرے پاپا مزاحیہ شاعری سے محفل کو لالہ زار بنا دیتے تھے۔ مشاعروں کے یہ سلسلے تقریباً دس گیارہ سال تک چلے۔ آہستہ آہستہ وقت اور حالات نے

اسے جاری رکھنے نہ دیا۔ پاپا اپنے بے تکلف دوستوں میں بھی آداب نشست کا خاص خیال رکھتے کبھی زوردار قہقہہ نہیں لگاتے۔ زیادہ تر بھرپور مسکراہٹ ہی قہقہہ کا بدل ہوتی۔ بہت کم آواز میں بات کرتے۔ خود کم بولتے سامنے والے کو بولنے کا موقع دیتے دوران گفتگو میں مداخلت انہیں ناگوار گزرتی تھی ان باتوں کا ہمیشہ احساس دلاتے رہتے اسی لیے ان کی شاعری میں کئی جگہ آداب محفل پر تادیبی اشعار ملتے ہیں۔ پاپا پودوں کے بڑے شوقین تھے اسی وجہ سے "بیت الظریف" ایک زمانے تک چھوٹا سا باغیچہ بنا رہا۔ انگور، انار، انجیر، جام، پپئی، سپوٹا، نارنگی، اور موز کے قدآور جھاڑ ہمارے آنگن میں سایہ فگن رہے۔ ان کے علاوہ پھولوں کے پودے بھی تھے گلاب، موتیا اور رات کی رانی کی خوشبو سے ہمارا گھر معطر رہتا تھا۔ کروٹن کی بہت سی قسمیں بھی نرسری سے لاتے رہتے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے کیاریاں بناتے کانٹ چھانٹ کرتے اور پانی کا انتظام کرتے تھے۔ پاپا کو جانور پالنے کا بھی بہت شوق تھا۔ اعلیٰ نسل کے آل سیشن کتے پالتے چن چن کر ان کے نام رکھتے تھے۔ بلیاں بھی پالتے تھے یہ ان کا خاندانی شوق رہا ہے زندگی کی آخری سانس تک بلی ان کے قدموں سے چمٹی رہی۔ اب بھی ان کے آرام کی جگہ بیٹھ کر آواز دیتی رہتی ہے۔ کبوتر پالنے کا بھی شوق تھا کبوتروں کے اقسام و خوبیوں کا ذکر کرتے تھے مگر بلیوں کی وجہ سے یہ شوق دیرپا نہ رہ سکا۔

پاپا بہت نرم طبیعت کے مالک تھے۔ کبھی کسی کو جھڑک کر بات نہیں کی۔ ان کے چہرے پر کبھی غیظ و غضب کی جھلک نہیں دیکھی۔ کبھی ان کی جبین شکن آلود نہ ہوئی۔ غلطی کرنے والے کو بڑی نرمی اور محبت سے سمجھاتے۔ معاف کردینے والی صفت بدرجہ اتم ان میں موجود تھی۔ کبھی بدلہ نہیں لیا۔ چیونٹی اور مچھر کو بھی نہیں مارا۔ ہاتھ سے ہٹا دیا کرتے تھے مشرقی اقدار و تہذیبی روایات کے پابند تھے۔ مغرب زدگی اور مغربی کلچر کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں کئی جگہ مغربی تہذیب کی برائیوں کی طرف اشارہ ملتا ہے لباس پر اپنی جوانی میں خاص خیال رکھا تھا۔ کوٹ پتلون پہنتے تھے حیدرآباد آنے کے بعد بھی کچھ عرصے تک کوٹ ہی ان کی روزمرہ زندگی کا لباس تھا۔ شیروانی صرف ادبی محفلوں کے لیے پہنی جاتی تھی۔ پاپا کی غذا بہت سادہ تھی کبھی مرغن غذاؤں کی فرمائش نہیں کی۔ اس حدیث پر آخری دم تک عمل پیرا رہے کہ "کھانا جب سامنے آئے تو اسے بُرا مت کہو"، زندگی کے ہر معاملے میں میانہ روی اور اعتدال پسندی سے کام لیتے اور اس پر کاربند رہنے کی ہمیں بھی تلقین کرتے رہتے تھے۔ انکی قوت ارادی بہت مضبوط تھی۔ جو موت کے دروازے پر پہنچنے تک قائم رہی۔ وہ اپنے آپ کو بوڑھا اور کمزور نہیں سمجھتے تھے۔ کمزور خیالات دل میں پیدا کرنا انھیں پسند نہیں تھا حالات سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا کرنے اور ماضی کو بھول جانے کی تلقین کرتے تھے بشستہ ۱۹۹۳ء میں تلنگ کے اکسیڈنٹ میں کولھے کی ہڈی سرک گئی۔ اس وقت عمر ۷۳ سال تھی۔ دو سال کے اندر چلنے پھرنے کے قابل ہوگئے صرف قریب کے مقامی مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ انتقال سے ایک ماہ پہلے تک قلم کاغذ ہاتھ میں رہا۔ اپنی گرتی ہوئی حالت کا انھیں اندازہ تھا۔ انتقال سے ایک ہفتہ پہلے تک بھی وہ اخبار کا مطالعہ کرتے رہے۔ موت کے تیرہ گھنٹے قبل بالکلیہ دنیا سے رشتہ توڑ لیا۔ یادِ الٰہی میں لگے رہے زبان سے صرف اور صرف لفظ اللہ ہی نکل رہا تھا۔ اور یہی کہتے کہتے ہماری نظروں کے سامنے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

اسمٰعیل ظریف

انتخاب کلام

(نظم)

چار مینار

قطب مینار کو گر چار سے دی جائے ضرب
حاصلِ ضرب جو آئے گا وہ ہے چار مینار
دل کشی تاج محل میں بھی بہت ہے لیکن
حسنِ مردانہ میں اس کا نہیں ثانی کوئی
کمپنی والوں نے سگریٹ کا سہارا لے کر
اس کی تصویر کی عظمت کا اڑایا ہے مذاق
اس کے ہر سمت ہیں تنصیب نرالی گھڑیاں
دورے پڑتے ہیں تو بے ہوش بھی ہو جاتی ہیں
بعدِ مدت انھیں پھر ہوش میں لاتا ہے کوئی
مشرقی وقت بتاتی ہے وہ مشرق کی گھڑی
مغربی ٹائم کی پابند ہے مغرب کی گھڑی

○

آیئے اب ذرا اوپر کی طرف چلتے ہیں
چڑھ کے مینار پہ نیچے کا نظارہ کر لیں
اب ذرا دیکھیے نیچے کی طرف
گاڑیاں رینگ رہی ہیں ایسے
جیسے بچوں کے کھلونے ہوں کوئی
ہاں ذرا خود کو سنبھالو ورنہ
ایک ہی جست میں منزل پہ پہنچ جاؤ گے
جاتے جاتے کسی رہرو کو بھی لے ڈوبو گے

○

وریا بس اسٹاپ

دھوپ میں لوگ پریشاں ہیں ڈبل بس کے لیے
ان میں شرفا کے سوا
چار سو بیس ہے کوئی تو کوئی پاکٹ باز
ایک ہی کیو میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
بس کے اڈے پہ جو پہنچے تو سبھی ایک ہوئے
دیکھیے وہ کوئی رکشا سے اتر آیا ہے
کیو میں اک دوست کھڑا ہے اس کا
آنے والے نے کہا یار اک مشورہ کرنا ہے ضروری تم سے
تین بجنے کو ہیں جیسے بجے لوٹ کے میں آؤں گا
کہو گھر ہی پہ ملو گے یا کسی اور جگہ
یہ دیا اس نے جواب
بس کے آنے میں ابھی دیر ہے اتنی باقی
لوٹ کر بھی اسی کیو میں یہیں پاؤ گے مجھے
پھر یہ پوچھا اس نے میاں صاحب بتا دے
وہ جو رکشا میں ترے ساتھ ہے بیٹھا کوئی
آج بھی پھر نیا اُلّو تو نہیں پھانسا ہے
یہ دیا اس نے جواب ارے پاگل وہ مرے مخبر ہیں
بالغوں کے لیے پکچر جو لگی ہے انگلش
وہ دکھاتا ہے انھیں

○

لاڈ بازار کا منظر بھی بہت دل کش ہے
پائی جاتی ہے یہاں چاندنی چوک سی دہلی کی جھلک
چوڑی والوں کی یہاں بھیڑ بہت ہے لیکن
یہاں پردے کی کوئی قید نہیں
یوں تو دو کانوں میں شوروم ہیں لیڈیز مگر
سیلز من جنٹس ہوا کرتے ہیں
چوڑیاں پہنے ہوئے بیٹھے ہیں شاید یہ لوگ

○

وہ رہی سامنے مکہ مسجد
جہاں ہر ملک کے سیاح بطورِ تفریح
گھومتے پھرتے ہیں ہر روز نمائش کی طرح
اس طرف دیکھئے یونانی شفاخانہ ہے
کئی بیمار یہاں آ کے شفا پاتے ہیں
کئی بیماروں کے یاں فیوز بھی اڑ جاتے ہیں
وہ گزر جاتے ہیں یہ کہتے ہوئے
چار مینار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ پلنگ ہم تو سفر کرتے ہیں

○

غزلیں

اب شور نہ مچاؤ غزل کہہ رہا ہوں میں — خاموش بیٹھ جاؤ غزل کہہ رہا ہوں میں
ایسے نہ مسکراؤ غزل کہہ رہا ہوں میں — کچھ کھل کے ہنہناؤ غزل کہہ رہا ہوں میں
دو کوس دور بیٹھے ہوئے دوستو ذرا — اب تو قریب آؤ غزل کہہ رہا ہوں میں
اطراف کے پڑوسی جو اب محوِ خواب ہیں — جا کر انھیں جگاؤ غزل کہہ رہا ہوں میں
یوں خامشی سے کام چلے گا نہیں حضور — مصرعے ذرا اٹھاؤ غزل کہہ رہا ہوں میں
جو شاعری کو کہتا ہے بے کار چیز ہے — اس کو پکڑ کے لاؤ غزل کہہ رہا ہوں میں

جو شاعروں سے دوستی کرتا نہیں ظریفؔ
شاعر اُسے بناؤ غزل کہہ رہا ہوں میں

○

ٹال لکڑی کی نمائش میں لگا اب کے برس — لکڑی لندن سے جلانے کی منگا اب کے برس
پھول گلشن میں دھتورے کے کھلے ہیں اکثر — اب کوئی اور نئے گل نہ کھلا اب کے برس
تیرے ڈبلوں سے کوئی کام نہیں بن سکتا — کام جھجوں ہی سے بنتا ہے بنا اب کے برس
تاج پوشی جو ہوئی کافی ہے عبرت کے لیے — بھول کر اب کسی کوچہ میں نہ جا اب کے برس
اب نئے پل کی بھی کچھ رہ گئی حالت یارو — اب نئے پل پہ سے رکشا میں نہ جا اب کے برس

شاعری سے تری کچھ لوگ ہیں بیزار ظریفؔ
چاند پہ جا کے غزل اپنی سنا اب کے برس

جس کو راس آگئی باہر کی ہوا پچھلے برس
اس کو چھت پھاڑ کے مالک نے دیا پچھلے برس

دوستو ہم نے بھی کیا کیا نہ کیا پچھلے برس
ہاتھ آپس ہی میں اپنوں کو دیا پچھلے برس

ویسے ملنے کو پچاسوں ملے مخلص لیکن
ایک ہمدرد بھی ہم کو نہ ملا پچھلے برس

قرض دے بیٹھے سمجھ کر جسے اپنا مخلص
اسی مخلص نے دیا ہم کو دغا پچھلے برس

آپ فرماتے ہیں ہم کچھ نہیں سمجھتے لیکن
کچھ نہ سمجھتے ہوئے کیا کچھ نہ کہا پچھلے برس

سستی شہرت ہی سہی مل تو گئی ہے یارو
مہنگی شہرت کا تصور ہی رہا پچھلے برس

واقعی تم بھی بگڑتے ہوئے فن کار ظریف
کام باریک بہت تم نے کیا پچھلے برس

○

گرتے گرتے جو سنبھل جاتا ہے
گویا سانچے میں وہ ڈھل جاتا ہے

عشق کی راہ میں منزل کے قریب
پاؤں عاشق کا پھسل جاتا ہے

منہ سے جب بات نہیں بن سکتی
کام آنکھوں سے بھی چل جاتا ہے

شمع کے واسطے پروانوں میں
جوتا آپس میں بھی چل جاتا ہے

دل کا سودا ہے دیکھیے بولی
لیجیے تاج محل جاتا ہے

پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے
سانپ مینڈک کو نگل جاتا ہے

آتشیں رخ کی حرارت سے ظریف
دل بھی عاشق کا پگھل جاتا ہے

○

آج حلیہ ہے بدلا ہوا ایک سے، کون کرتا ہے دو بیویاں دوستو
آج فی گھر یہ اوسط ہے اولاد کا، تین لڑکے تو چھ لڑکیاں دوستو

کرکے فرمائشیں فلمی گانے سنو کتنی میٹھی ہے اردو زباں دوستو
بعض گانوں میں جسم عریانیت ہی سہی پھر بھی دل کش ہے حسن بیاں دوستو

جب کہ بھارت میں پیدا ہوئی یہ زباں، پیچھا چھوڑے گی اب آپ کا یہ کہاں
بس یہ اردو کی تختی نہیں نہ سہی پکچروں میں ہے اردو زباں دوستو

آج کل کے جو لڑکے ہیں اور لڑکیاں، دودھ ڈبے کا پی کر ہوئے ہیں جواں
کم سنی میں ملی جس کو اصلی غذا وہ بڑھاپا ہے اب تک جواں دوستو

آج کیسی یہ الٹی ہوا چل گئی اپنے مرکز پہ کوئی بھی [illegible] نہیں
ایسا لگتا ہے مرغے کوئل ہو گئے، بانگ دینے لگیں مرغیاں دوستو

دوستو چار دن کی ہے یہ زندگی خواہ مخواہ کیوں ہے آپس میں رسہ کشی
ہے غنیمت یہ آپس میں مل بیٹھنا ورنہ پھر ہم کہاں تم کہاں دوستو

بات بنتی نہیں کام ملتا نہیں، اس لیے دل ظریفؔ اب بہلتا نہیں
پال رکھے ہیں مصروفیت کے لیے، کچھ کبوتر ہیں کچھ مرغیاں دوستو
شاعری کے لیے وقت درکار ہے اتنی فرصت کسی کو کہاں دوستو
یہ سنا ہے کہ صنعت نگر میں کہیں شاعری کی کھلی ہے دکاں دوستو
ان کے احباب ہوں یا کوئی اجنبی ہاتھ دیتے ہیں سب کو جھجکتے نہیں
اپنے ہی ملنے والوں میں موجود ہیں ایسی بخشی ہوئی ہستیاں دوستو
نغمہ مشرق کا مغرب میں ضم ہو گیا کیا بھارت کے فن پر ستم ہو گیا
میوزیکل شو سے آتی ہے آواز یوں، جیسے لڑتی ہوں دو بلّیاں دوستو
کوئی فن کار ہو یا بڑا آدمی، زندگی میں کوئی قدر و قیمت نہیں
بعد مرنے کے ہوتی ہے آہ و بکا اور کرتے ہیں ہم برسیاں دوستو
باغباں چھوٹ گیا باغ بھی لٹ گیا، یہ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہو گیا
نہ تو آندھی اٹھی نہ تو بجلی گری، جل گیا خود بخود آشیاں دوستو
جا رہے تھے ظریفؔ ہم کسی کام سے لوٹ کر آ رہے تھے وہ سسرال سے
کوئی سالہ انھیں پوچھتا تک نہیں پھر بھی جاتے ہیں بھائی میاں دوستو

○

انہیں پا کر بھی کوئی سکھ نہ پائے کئی ٹکٹی لگا کے دکھ اٹھائے
وہ آکر قبر پر شمع جلائے جو باقی تیل تھا سر میں لگائے
سلامت وہ شفا خانے سے آئے پھر ایک ننھی مصیبت ساتھ لائے
نکل بھاگی ادھر بلّی کہیں سے ادھر دھوکا ہوا شاید وہ آئے
ہے گھر میں چاند تاروں کا نظارہ بہت عرصہ ہوا چھت کو چھوائے
بلاؤ طائرِ برگشتہ کو بلاؤ! قفس کی آنچ گلشن پر نہ آئے
غزل کہتے ہیں خونِ دل جلا کر یہ مت سمجھو کہ ہم لکھوا کے لائے

ظریفؔ ہم نے سنا ہے آپ نے بھی
جوانی میں بہت سے گل کھلائے

○

گر مفت ہاتھ آئے تو وہ شئے بری نہیں مرغی کسی کی آئی ہے گھر میں چھری نہیں
نانا کے مال پر بھی نواسے کی ہے نظر مجبور اس لیے ہے کہ نانی مری نہیں
[illegible] کے ساتھ وہ [illegible] [illegible] سے اپنے گھر میں کوئی [illegible] نہیں

جو ڑے کی اس کو دے کے رقم کیجیے مدد　　لڑکے کو نوکری کہیں اب تک ملی نہیں
یکو اسیت کا نام ظرافت نہیں ظریفؔ
جو دل کو گدگدا نہ سکے شاعری نہیں

○

لڑاؤ مرغ لڑاؤ مگر سلیقے سے　　کسی کو جھانپ میں لاؤ مگر سلیقے سے
ہو بات ایسی کہ سن کر یقین آجائے　　لگاؤ گپ بھی لگاؤ مگر سلیقے سے
کسی کا قرض کبھی بھول کر نہ لوٹاؤ　　بس اس کو گول پھراؤ مگر سلیقے سے
جہیز میں تمھیں مال غنیمت آئے جو ہاتھ　　ابھی کو چکلے لگاؤ مگر سلیقے سے
سلیقہ مند نہ ہو گر کوئی شریک سفر　　سلیقہ اس کو سکھاؤ مگر سلیقے سے
ظریفؔ آپ ولیمہ ہو یا کہیں چوتھی
ڈنر پہ ویسے ہی جاؤ مگر سلیقے سے

○

نئے فیشن میں وہ ہر بار نظر آتے ہیں　　حالی ہوتے ہوئے کلدار نظر آتے ہیں
گھر کے لوگوں سے وہ بیزار نظر آتے ہیں　　خود کی بربادی کے آثار نظر آتے ہیں
آج بھی صاحب کردار ہیں موجود مگر　　چار سو بیس میں دو چار نظر آتے ہیں
جو مناظر تھے فسانوں ہی کی حد تک محدود　　اب وہ منظر سر بازار نظر آتے ہیں
نئے انداز سے کہہ جاتے ہو ہر بات ظریفؔ
آپ بجتے ہوئے فن کار نظر آتے ہیں

○

ایسے ویسوں سے کہیں پیار نہ ہونے پائے　　تاج پوشی سر بازار نہ ہونے پائے
فالتو چیزوں کا انبار نہ ہونے پائے　　گھر جمعرات کا بازار نہ ہونے پائے
دیکھو آواز سے گفتار نہ ہونے پائے　　طفل خفتہ کہیں بیدار نہ ہونے پائے
انگلیاں ناک میں بے طور نہ ٹھونسا کیجے　　یہ دو نالی کہیں بھر مار نہ ہونے پائے
یہ دعا کرتی ہے فن کار کی بیوی اکثر　　میرا بچہ کبھی فن کار نہ ہونے پائے
چائے بے وقت بھی گر پیش کرے کوئی ظریفؔ
وقت کہتا ہے کہ انکار نہ ہونے پائے

○

اگر جاری غزل سے خواہ مخواہ تکرار ہو جائے　　یقیناً گلشن شعر و سخن گلزار ہو جائے
سجاؤ محفلیں اپنی جگاؤ رات بھر اس کو　　بلا سے آپ کی شاعر اگر بیمار ہو جائے
سنا تا ہے غزل کوئی ان کی محفل میں مجھے لیکن　　غزل تیار ہو جائے تو بیڑا پار ہو جائے

مزہ ہے پان کھانے کا تبھی خود اپنے ہی گھر میں
صحن کو چھوڑیئے دیوار بھی گلنار ہو جائے

ظریف اس دور میں مخلص کو لوگ احمق سمجھتے ہیں
تو مخلص کو بھی لازم ہے کہ وہ بیدار ہو جائے

○

مت پوچھیے جو حال ہمارا ہے دوستو
بے موت اخراجات نے مارا ہے دوستو

اب ہم کو رہبروں کی ضرورت نہیں رہی
خود کار سگنلوں کا سہارا ہے دوستو

جو شے کی آرزو میں جوانی گزار دی
وہ شخص آج تک بھی کنوارا ہے دوستو

ماموں کی بکریاں نہ چرائیں تو کیا کریں
نانا کا مال بھی تو ہمارا ہے دوستو

بے راہ روی پہ جو اُتر آئے ہیں ظریف
ان کا نہیں قصور ہمارا ہے دوستو

○

ظریف زورِ قلم ذات سے دکھاؤ میاں
اگر ہے ذوق تو ذاتی غزل سناؤ میاں

ہمیشہ چائے پلا کر نہ دل جلاؤ میاں
کبھی کبھی تو کوئی اور شئے پلاؤ میاں

پڑھا کے بیٹیاں لوگوں کو ساتھ لاؤ میاں
اسی طریقے سے محفل میں چھت اُڑاؤ میاں

ہمیشہ تازہ غزل ہی سنا رہے ہو حضور
کبھی تو باسی غزل بھی ہمیں سناؤ میاں

جو اور لوگوں کو لاتے نہیں ہیں خاطر میں
تم ایسے لوگوں کو اب آئینہ دکھاؤ میاں

میں دیر ہی سے سہی جب بھی آؤں محفل میں
جنابِ صدر کے بازو مجھے بٹھاؤ میاں

وہ مجھ سے پہلے ہی پڑھ لیں تو یہ مناسب ہے
اساتذہ کو مرے بعد مت پڑھاؤ میاں

بڑے بڑوں کو وہ چھانسے میں لا چکے اب تک
ہمارے بھائی کے چکر میں تم نہ آؤ میاں

تمھارے ساقی کا حلیہ بگڑ چکا ہے وہاں
اب ان کے کوچے میں تم بھول کر نہ جاؤ میاں

یہ روز روز کی کھٹ پٹ سے کچھ نہیں حاصل
ہے نیک مشورہ اک اور گھر بساؤ میاں

ہے صرف عقد کی دعوت تو مت کرو شرکت
ڈنر پہ چوتھی کے لیکن ضرور جاؤ میاں

کہا یوں باپ نے بیٹے سے جب وہ فیل ہوا
اب اپنے ماموں کے تم بکریاں چراؤ میاں

محلے والے جو ڈرتے نہیں ہیں اب تم سے
ڈرانے اُن کو اکھاڑے میں لٹھ گھماؤ میاں

بگڑ کے بیٹھے ہیں جا کر حسین ساگر پہ
بڑے میاں کو منا کر وہاں سے لاؤ میاں

سکونِ قلب کی خاطر کسی بھی گلشن میں
کبھی کبھی سرِ مغرب ضرور جاؤ میاں

میاں سے ملنے کی بھائی میاں کو ہے خواہش
میاں سے بھائی میاں کو ذرا ملاؤ میاں

کسی کو چار بجے چائے پر بلا کے ظریف
پلا کے چائے پہ غزل سناؤ میاں

وہ سو رہے تھے تکیہ پہ گیسو بکھر گئے بیدار ہو کے بچوں نے دیکھا تو ڈر گئے

احمد نگر گئے نہ تو آصف نگر گئے مولانا پیٹ پالنے شاید قطر گئے

خود ساختہ کچھ ایسے بھی شاعر نکل پڑے جب بے چرا کے غیروں کا جھوٹا ہی چر گئے

فٹ پاتھ پیر لڑھک گئے دروازہ بند تھا بھائی جوبات دو بجے محفل سے گھر گئے

صاحب وہاں بھی جا کے کوئی سکھ نہ پا سکے اپنے محل کو چھوڑ کے دل سکھ نگر گئے

بھائی کو گپ نوازی کی عادت سی ہو گئی ملنے کو آج آئے تھے گپ ہانک کر گئے

ایسی ہی تربیت کی ضرورت ہے آج کل پکچر میں ساتھ باو لکے نور نظر گئے

ہم کو بیدار نے بل سے کوئی بس نہ مل سکی بیدل ہی ٹلپتے ہوئے آصف نگر گئے

مجھ جیسے بے ضمیر ہی زندہ ہیں آج کل خود دار اس زمانے میں بے موت مر گئے

اب بھوک کا سوال ہے دنیا کے سامنے کچھ لوگ روٹیوں کے لیے چاند پر گئے

چوتھی میں دیر سے گئے جب اہلیِ ظریف
بریانی کھانے آئے تھے کھا کر بگڑ گئے

قطعات

ویسے یہ بات میں نے کسی سے کہی نہیں کچھ لوگ کہہ رہے ہیں غزل آپ کی نہیں
بکواسیت کا نام ظرافت نہیں ظریف جو دل کو گدگدا نہ سکے شاعری نہیں

○

اُن کے کوچہ سے گزر ہو تو غزل کہہ لیجے یا کوئی پیش نظر ہو تو غزل کہہ لیجے
ایک محبوب کی چاہت سے بھلا کیا ہوگا دل میں محبوب نگر ہو تو غزل کہہ لیجے

○

کسی دن اپنی کار سے ڈبہ گل نہ ہو جائے اگر مر جائیں سب انسان تو شیطانوں کا کیا ہوگا
وہ میڈم کو بھی لے کر چاند پر اب جانے والے ہیں نہ ہوں گی چاندنی راتیں تو ارمانوں کا کیا ہوگا

○

نمازوں سے غافل رہے مہینہ بھر سمجھ رہے ہیں کہ یہ تو کوئی خطا نہ ہوئی
ظریف عید مبارک کہو گے کس منہ سے نمازِ عید بھی تم سے صحیح ادا نہ ہوئی

○

شعبان میں جب آتی ہے شعبان کی عید شوال میں کیوں آتی ہے رمضان کی عید
ہر سال رہا کرتا ہے جھگڑا اس کا ہے چاند کے چکر میں مسلمان کی عید
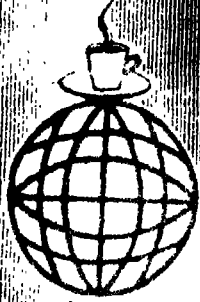
◎

ھائی ویاچائے
برانچ
قریب کرانہ بازار
گلبرگہ کرناٹک
فون: 21102
نیشنل ٹی ڈپو نامپلی بازار حیدرآباد ۔۔۔ ۵ فون: 229476

نہ لوٹتے ۔ نہ ہینگ لگی اور نہ پھٹکری رنگ بھی چوکھا آگیا ۔ یہ اونگھائی ہی تو ہے جو چند لمحوں میں حسین رنگوں کی سیر کروا دیتی ہے جس کیلئے خزاں اور بہار کے رنگوں کو دیکھنے کے لیے دور تک باہر جانے کی ضرورت نہیں ۔ پیسے بھی خرچ نہ ہوئے سیاحت بھی ہو گئی ۔ یہ اونگھنا ہی تو ہے جس کی دولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کتنے جانور اپنا پیٹ بھرتے ہیں جنگ کے محاذ پر موت جیسی خاموشی اور یلغار کا پیش خیمہ ہوتی ہے ۔ وہ لوگ کامیاب ہیں جن کی آنکھیں تو بند ہوتی ہیں مگر دماغ جاگتا رہتا ہے ، پرنس سدھارتا گوتم بدھ نے اسی اونگھنے اور چھ مہینے تک آنکھیں بند نہ کر کھولنے کے بعد دنیا کے ایک بڑے مذہب کی بنیاد ڈالی تھی ۔ بڑے بڑے رہنماؤں اور سیاست والوں نے اس اونگھائی کو بہت ہی اونچے سنگھاسن پر لا کر بٹھا دیا ہے ۔ برطانیہ کے وزیرِ اعظم ونسٹن چرچل اپنے جنگ کے کمرے میں کام سے تھک کر کچھ دیر کے لیے کوچ پر بیٹھے بیٹھے یا لیٹ کر اونگھا کرتے ۔ اس اونگھائی نے دوسری جنگ عظیم کی کامیابی کے تانے بانے بننے میں ان کی مدد کی تھی ۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس کی کابینہ کے گرما گرم اجلاسوں کی صدارت کرتے ہوئے صدر ریگن بھی اس نعمت سے مالا مال ہوتے رہے ۔ پنڈت نہرو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بمشکل چار تا چھ گھنٹے سوتے تھے اور باقی نیند دورانِ سفر یا کام کے دوران اونگھ کر پورا کر لیتے اور پھر سے ہشاش بشاش تر و تازہ ہو جاتے ۔

مجھ کو ستانے اور اونگھنے کی عادت خاندانی ورثے کے طور پر اپنے والد سے ملی جو ہر روز عدالتی مقدمات سننے ، غور کرنے اور فیصلہ دینے کے بعد آدھ گھنٹے کے لیے ستاتے تھے مگر لڑکپن میں بارش ہو یا گرمی ، سردی ہو یا چلچلاتی خشک دھوپ دوپہر میں آوارہ گردی ہی سے فرصت نہ ملتی ۔ گھر میں والد کا حکم تھا کہ وہ جب ستا رہے ہوں تو کوئی انھیں نیند سے بیدار نہ کرے اور نہ شور و غل ہو ۔ اس وقت تک چھ روز کی محنت کے بعد ستانے کی حجت میری سمجھ میں نہ آئی اور سمجھ سے باہر رہی ۔ اب یہ حال ہے کہ اگر پندرہ منٹ اونگھ نہ لو تو طبیعت بحال نہیں ہوتی ، سر بھاری ہو جاتا ، مزاج الجھا الجھا سا رہتا ہے ۔ اس کی اب کوئی پرواہ نہیں کہ رات کو کس وقت نیند آتی ہے ، کتنی کروٹیں بدلی جاتی ہیں ۔ نیند کے لیے تو اتنی کشمکش کرنی پڑتی ہے لیکن کچھ لمحوں کی اونگھائی اور ستانا اس کی ساری کسر نکال دیتے ہیں اونگھائی تو بے خوابی کی شکایت رکھنے والوں کے لیے سب سے موثر ہتیار ہے ، تھوڑی سی غنودگی انھیں ایک لازوال دولت سے مالا مال کر دیتی ہے ۔ جب کبھی بزرگوں کے ساتھ میٹنی شو جانے کا موقع ملتا اور پردے پہ ہیرو ویلن اور اس کے درجنوں ساتھیوں کے ساتھ دھینگا مشتی کرتا خوب ڈشم ڈشم ہوتی تو اس ایکشن ڈرامے کو دیکھ کر میں خوب اچھلتا کودتا ۔ ہیرو کی کامیابی پر تالیاں پیٹتا ۔ میں خود بھی ہوا میں گھونسہ بازی میں شامل ہو جاتا ۔ تب میرے ساتھ والے بزرگ مزے سے اونگھ رہے ہوتے اور اتنے زبردست ایکشن کا ان پر ذرا بھی اثر نہ ہوتا بلکہ کان پر جوں تک نہ رینگتی ۔ تماشہ بینوں کی تالیوں ، چیخ و پکار ، کالی گلوچ اور ہمت افزائی کی انھیں کوئی پرواہ نہ ہوتی حتیٰ کہ جب سینما کی روشنیاں جل اٹھتیں ، دروازے کھول دیئے جاتے تو میں انھیں شانے پر ہاتھ رکھ کر جگا دیتا ۔

یورپ کی تہذیب یافتہ دنیا میں ستانے اور اونگھنے کی ایک تہذیبی روایت ہے اور ساتھ ہی

سے والدہ صاحبہ نے گھور کر دیکھا. قدم رک گئے بچنے کا کوئی راستہ نہ دیکھ کر ہم نے ہتیار ڈال دیئے اور نہایت لجاجت سے درخواست کی کہ خالہ جان! جو کچھ بھی لکھوانا ہے ذرا جلدی لکھوایئے. بولیں، اُئی باوا دو ہرفاں (حرف) لکھنے میں کتی دیر ہوتی ....؟ ہم فوراً "اوزار" سنبھال کر لکھنے کو تیار ہوگئے اور کہا، ہاں جلد فرمایئے کیا لکھوں؟ خط لکھوانے سے پہلے تاکید کی کہ یہ خط میری جانب سے نہ لکھنا بلکہ گمنام لکھا جائے وہ مائشٹی لے (داماد) کو لکھا کو اس کا دماغ درست کرنا ہے لیکن یہ مالوم اِچ (معلوم ہی) نئیں ہونا کہ میں نے لکھوایا ہے. ذرا اِتی بات کا خیال رکھ کو لکھو میرے باوا، میں صدقے جاؤں تمہارے. ہم نے کہا وہ بعد میں جاتی رہنا پہلے تو خط لکھوالو .... خط کیا تھا. ؟ داماد کی شان میں دس بیس صلواتیں اور کہا کہ جو اپنی بیوی کو ماں کے یہاں چھوڑ کر چھ مہینوں سے پلٹ کر بھی نہیں پوچھ رہا تھا کہ وہ کس حال میں ہے؟ ان دس بیس صلواتوں کے درمیان بیچ بیچ میں "کیا بولتے سو کی ماں" ______ ہم چلے بھنے اپنی پتنگ بازی کے "قیمتی" وقت کو برباد ہوتا دیکھ کر حرف بہ حرف زیر و زبر کی کمی بیشی کے بغیر جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا گیا ہم ساتوں رقم کرتے چلے گئے، آخر میں جہاں مرسل کے دستخط یا نام ہوتا ہے وہاں ایک لکیر (______) کھینچ دی. پتہ لکھا. حوالے کیا اور یہ جا وہ جا ....

ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ گزرا ہم صحن میں تھے دروازے میں اچانک "کیا بولتے سو کی ماں" کا برقع بڑی زور سے پھڑپھڑاتا ہوا داخل ہوا ہم کو روبرو دیکھ کر دونوں ہاتھ کمر پر چلے گئے اور ..... "اب دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے" کے انداز میں ایک قدم کے فاصلے پر آکھڑی ہوگئیں ہم نے ڈرتے ڈرتے سر اوپر اٹھا کر جو دیکھا تو طرف نقاب کی شکنوں سے صاف عیاں ہو رہا تھا کہ ان گنت تیوریاں اندر نقاب کے چڑھی ہوئی ہیں. ایک زناٹے سے نقاب اُلٹا، سانپ کی پھنکار سنائی دی اُوئی باوا! اچھا خت لکھ کو دیئے آج کل کے بچے ادب قایدہ (قاعدہ) سوب (سب) بھول گئے، بڑوں کی بات کو جوتی کی نوک پر رکھتیں. تم سے ہاتاں (ہاتھ) جوڑ کو بولی تھی خط میں میرا جنم جلی کا نام نکو لکھو مگر تم میری ضد سے لکھ کو میرے سر کا جھنڈا اُتارنے لگائے ناں، ہم نے پھنکار سے سہم کر کہا خالہ جان، قسم لے لیجئے ہم نے آپ کے حکم کی تعمیل میں سر مو بھی سرتابی نہیں کی اور آپ کا نام نہیں لکھا تھا (اور حقیقت بھی یہی تھی) بلکہ آپ کا کوئی ذکر تک اس خط میں نہیں تھا. آخر کیا بات ہوگئی جو اس قدر خفا ہو رہی ہو؟ ہم نے رونی صورت بنا کر اپنی صفائی پیش کردی. بولیں! تم نے نئیں لکھا تو پھر وہ اُجاڑ صورت کو کیسا مالوم پڑا کہ وہ خت میں لکھائی بول کو؟ پرسوں آ کو ایک موں سے (منہ سے) لکھتر (لاکھوں) صلاتاں (صلواتیں) سنا کو میری عزت خاک میں ملا کو گیا ناں، میں بولتے اِچ جا رئیوں، ارے نئیں رے باوا، میں خت موت کب بی نئیں لکھی مگر ادھر وہ ایک سنانہ دو سُنا پوٹی کو مار مار کو ہڈیاں توڑ دیا، بول را تھا (بول رہا تھا) لال سے ختاں لکھا کو میرے کو ڈراتے (مجھکو ڈراتی ہے)؟ دیکھ ذرا اب تیرا کیا کرتوں، تیرے کو "فارختی" (فارغ خطی) لکھ کے نئیں دیا تو میرا نام بی (بھی) شیر خاں نئیں ....

ہرام کے کو نمئے دس (دستِ دست) لگو، کھٹے خد (قد) سے کل آتی سو آج آؤ، خبرستان لیو.... میاں تم بول رئیں میرا نام نئیں لکھے مجھے شریفاں کے بچے (تم شریفوں کے بچے) ہزار دفعہ ختاں چھٹیاں لکھائی جو لی وہ اِچ (وہی) لکھ کو دیئے، میرا چاند، آپ پو مجھے پورا بھروسہ ہے، آپ کب بی (بھی) جھوٹ نئیں بولتے، سوا سو برس کے ہو کے جیو ......

اب یہ بات میرے کو سمجھ میں آرئیے، (آرہی ہے) یہ سوب (سب) اس کی لال مردار کے کرتوتاں ہیں.

سُننا چاہتے مگر اِدھر سے ایک چُپ ہزار چُپ کا معاملہ جب دیکھا تو ہار گئے اور سخت اُلجھن میں مبتلا ہوکر ایک دن جب صبر کا پیمانہ لبالب لبریز ہوگیا تو رہا نہ گیا اور بول ہی دیئے۔

"یارو ! اب تو تم لوگوں نے کہنا ہی چھوڑ دیا" ہم نے بات کی تہہ کو پاکر بھی انجان بن کر پوچھا، "کیا کہنا چھوڑ دیا ؟"..... "وہی ہماری دوسری شادی کا قصہ"۔ بڑی معصومیت سے عرض کیا، جناب ! یہ ذکر ہی تمہاری ناراضگی کا سبب ہے اور ہم کو چونکہ تمہاری خاطر بے حد عزیز ہے یوں خاموش ہیں کہ جس میں تمہاری خوشی اس میں ہماری خوشی "۔ ۔ فرمایا ! نہیں میاں، ہم کو تو اجازت بھی مل گئی ...... ہم تو پا حیران ہوکر ہم نے پوچھا، اجازت ؟ کس بات کی، اور کس سے ؟ بولے تمہاری بھابی مرحومہ خواب میں آئی تھیں اور ہم کو قسم دے کر وعدہ لیا کہ تمہاری اس آشفتہ حالی سے ہم کو قبر میں چین نصیب نہیں ہورہا ہے، اپنی نہ سہی ہماری خوشی کی خاطر وعدہ کرو کہ دوسری شادی کرلو گے تاکہ ہماری بے قرار روح کو سکون ملے ...... اور ہم نے مرحومہ کی محبت میں بکمال طیب خاطر وعدہ کرلیا ..... اور ہمارا وہ قہقہہ جو اب تک اسی بات کو سُننے کے انتظار میں رُکا ہوا تھا بڑی زور سے اچھل کر باہر نکل آیا۔

بڑی مُدت کے بعد آخر وہ شاہیں زیرِ دام آیا

اس طرح جناب فریدالحسن کمالی دوبارہ دولہا بنے اور ہنسی خوشی رہنے لگے "... اور بھابی مرحومہ کی روح کی "بے قراری کو ایسا قرار آیا" کہ وہ آج تک کبھی بھول کر بھی کمالی کو یاد نہیں آئیں .....

ذکر جناب مولانا ذکراللہ حسنی کا :

ایک طرف پنجاب یونیورسٹی کے منشی فاضل اور دوسری طرف عثمانیہ یونیورسٹی کے گریجویٹ۔ مذہبیات اور دینیات میں اچھی خاصی استعداد آٹے میں نمک کے برابر فلسفیانہ گفتگو میں ہلکی ہلکی دانائی وحکمت کی جھلک، رائے مشورے دینے میں مستعد فکر میں لقمانی حکمتوں کی ایسی آمیزش کہ ضرورت پڑنے پر بقراط کو بھی دو چار کام کی باتیں سکھا سکتے ہیں، مگر طبیعت کے جھٹ خفا اور تلون مزاج محفلوں اور مجلسوں میں اپنے آپ کو لئے دیئے رکھنے والے مزاج کی ان ہی گرہ گیریوں کے باعث مختلف کمپلکس میں مُبتلا اچھے خاصے شعر فہم مگر شاعروں کی ذات اور بہتات سے ایکدم متنفر۔ مغلوب الغضب کہنے پر آئیں تو اپنی ہی کہے جائیں دوسرے کو موقع نہ دیں، گھڑی میں یار گھڑی میں اغیار اپنی وائے اور بات کو حرف آخر سمجھ کر اڑیل ٹٹو کی طرح اڑ جانے والے۔

ایک مرتبہ ان کے ہاں کلیاتِ اقبال پر نظر پڑی ہم غائیت دلچسپی سے اس کو لے کر پڑھنے لگے صفحے اُلٹتے ہوئے جب۔ ایک دل گداز قطعہ نظر سے گزرا تو اس کو باآواز پڑھ کر مولانا کو سُنایا، آخری مصرعہ یہ تھا از :

"از نگاہِ مُصطفےٰ پنہاں بگیر"

چونکہ پنجاب سے فارسی بطور لانے کا بڑا غرّہ تھا ہم کو درست کرنے کی دھن میں فرمایا۔ صحیح پڑھا کرو یہ کوئی ایرا غیرا نتھو خیرا شاعر نہیں ہے۔ اقبال ہے اقبال، بگیر نہیں وہ بگیر ہے "ب" بالفتح۔ ہم نے عرض کیا، بگیر ہی درست ہے تو یہ بگڑ گئے اور فرمایا آپ مجھ سے اُلجھتے ہیں اور وہ بھی فارسی کے معاملے میں ؟ عرض کیا "یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے" ہم کو یقین ہے کہ آپ نے تیل نہیں بیچا ہے۔ ہم نے فارسی پڑھی ہے نہ سیکھی ہے صرف خوشہ چیں ہیں